یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ھیں

مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ھیں.

منجانب.



سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدرآباد پاکستان





۷۸۶

۹۲_۱۱۰

یا صاحب الزماں ادرکنیؑ

DvD Version

لبیک یا حسینؑ

خصوصی تعاون: نذر عباس
رضوان رضوی

اسلامی کُتب (اردو) DVD

ڈیجیٹل اسلامی لائبریری ۔

www.ziaraat.com

SABIL-E-SAKINA
Unit#8,
Latifabad Hyderabad
Sindh, Pakistan.
www.sabeelesakina.page.tl
sabeelesakina@gmail.com

شرح

أسنى المطالب

فی

مناقب علی بن ابی طالب

تصنیف

ابو الخیر شمس الدین محمد بن محمد بن محمد الجزری المقری الشافعی

متوفی ۸۳۳ھ

ترجمہ، تخریج، تحقیق، تشریح

قاری ظہور احمد فیضی

مکتبہ باب العلم

شرح

أسنى المطالب في مناقب علي بن أبي طالب عليه السلام

تصنيف

أبو الخير شمس الدين محمد بن محمد بن محمد الجزري المقري الشافعي

متوفی ۸۳۳ھ

ترجمہ، تخریج، تحقیق، تشریح

قاری ظہور احمد فیضی

مکتبہ باب العلم

جامعہ علی المرتضیٰ، لاہور

نام کتاب	:	شرح أسنى المطالب في مناقب سيدنا علي بن أبي طالب
مُصنّف	:	قاری ظہور احمد فیضی
پروف ریڈنگ	:	علامہ خلیل احمد سہروردی مدرس جامعہ علی المرتضیٰ
تصحیح وترتیب	:	محمد احمد فیضی
کمپوزنگ	:	محمد طاہر فیضی، محمد سہیل فیضی، اوچ شریف (بہاول پور)
بک ورک	:	محمد یعقوب
تعداد	:	1000
الطبعة الخامسة	:	١٤٣٨ هجری
ہدیہ	:	
پرنٹر	:	
ناشر	:	مكتبة باب العلم جامعة علي المرتضىٰ لاہور

maktbababulilm110lhr@gmail.com / Cell: 0300 41 500 21, 0321 17 8888 7

ڈسٹری بیوٹرز

ضیاء القرآن پبلی کیشنز: گنج بخش روڈ لاہور/ اردو بازار، کراچی

Ph: 042-37221953

احمد بک کارپوریشن، اقبال روڈ کمیٹی چوک، راولپنڈی

مکتبہ خورشید ملت، نزد کینال ریسٹ ہاؤس، اوچ شریف (بہاول پور)

0300-2495037

نیو منہاج بک اینڈ سی ڈی شاپ، دربار مارکیٹ لاہور

عباسی کتب خانہ، جونا مارکیٹ کراچی

يَاعَلِيُّ! مَاسَأَلْتُ اللّٰهَ مِنَ الْخَيْرِ،

إِلَّا مَاسَأَلْتُ لَكَ مِثْلَهُ.

"اے علی! اللہ تعالیٰ سے میں نے جو بھلائی مانگی ہے،

اُسی کی مانند تمہارے لیے بھی مانگی ہے"۔

(أمالي المحاملي ص٣٦٨)

لَنْ يَبْلُغُوا خَيْرًا حَتّٰى يُحِبُّوكُمْ لِلّٰهِ

عَزَّوَجَلَّ وَلِقَرَابَتِي.

''وہ ہرگز بھلائی کو نہیں پاسکیں گے جب تک کہ وہ تمہیں اللہ عزوجل

کی خاطر اور میری قرابت کی وجہ سے محبوب نہ رکھیں''۔

(مجموع فيه مصنفات ابن البختري ص١٣٤)

انتساب

یہ فقیر اپنی اس کوشش کو اُن دو ہستیوں سے منسوب کرتا ہے جو غیر تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود میرے حق میں مرشد اولین ثابت ہوئیں، کیونکہ اگر وہ مجھے کتاب وسنت کی تعلیم سے بہرہ ور نہ کراتیں تو میں از خود یہ تعلیم کیونکر حاصل کر سکتا؟ یقین فرمایئے! اِس وقت مجھ میں جتنی برائیاں اور غوایت وضلالت موجود ہے اس میں اُن کا کوئی عمل دخل نہیں ہے لیکن ظاہراً یا باطناً میرے اندر کچھ رُشد ہے تو اُس کا اولین سبب یہی دو ہستیاں ہیں۔

یا الٰہ العالمین! میرے ان بے لوث دونوں محسنین والدین پر فضل وکرم فرما، والد رحمۃ اللہ علیہ کی قبر کو جنت کا باغ بنا اور والدہ کو صحت وسلامتی عطا فرما، انہیں ہم پر راضی فرما اور اُن کی خدمت کی بدولت ہمیں جہنم سے بچا اور جنت عطا فرما، آمین! بجاہ طٰهٰ ویٰسٓ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

إهداء

یہ فقیر اپنی اس معمولی کاوش کو اُس ہستی کی بارگاہ میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہے جن کا ارشاد ہے کہ اُنہیں اپنے رشتہ داروں سے حضور ﷺ کے رشتہ دار زیادہ محبوب ہیں اور جنہوں نے عالمِ اسلام کو تلقین فرمائی کہ "ارْقُبُوا مُحَمَّدًا فِي أَهْلِ بَيْتِهِ" (سیدنا محمد ﷺ کا اُن کے اہل بیت کے بارے میں خیال رکھو) یعنی خلیفۂ اول یارِ غارِ مصطفیٰ ﷺ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ۔ اس بابرکت ہستی کے عزم و تدبر کی بدولت شجرِ اسلام نہ صرف یہ کہ بادِ صرصر سے محفوظ رہا بلکہ پھلتا پھولتا چلا گیا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی دُوررَس نگاہ اس خیر و برکت کو پہلے سے بھانپ چکی تھی، یہی وجہ ہے کہ جب اُنہیں ایک غیر ناصح مشیر نے خلافت کے متعلق کچھ مشورہ دیا تھا تو اُنہوں نے فرمایا تھا: سَلَامَةُ الدِّيْنِ أَحَبُّ إِلَيْنَا مِنْ غَيْرِهِ. (دین کی سلامتی ہمیں دوسری باتوں سے زیادہ محبوب ہے) رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ وَأَرْضَاهُ عَنَّا، وَجَزَاهُ اللّٰهُ عَنَّا وَعَنِ الإِسْلَامِ وَالْمُسْلِمِيْنَ.

بسم الله الرحمان الرحيم

مُقَدّمَة

مصنف رحمۃ اللہ علیہ کا تعارف

ہر چند کہ مصنف رحمہ اللہ عوام وخواص سب میں مشہور ہیں، چنانچہ اکثر لوگ انہیں اُن کی وظائف واعمال میں مشہور تصنیف "حصن حصین" کی وجہ سے جانتے ہیں اور مدارس سے متعلق علماء وطلبہ حضرات علمِ قراءت میں اُن کی معروف تصنیف "المقدمة الجزرية" اور دوسری تصانیف سے پہچانتے ہیں، تاہم حصولِ برکت کی خاطر اُن کا مختصر تذکرہ یہاں بھی کیا جاتا ہے۔

نام ونسب

مصنف رحمۃ اللہ علیہ کا نام اور نسب یہ ہے: محمد بن محمد بن محمد بن علی بن یوسف الجزری العمری الدمشقی ثم الشیرازی الشافعی۔

القاب وکنیت

خدا کی عطا ہے کہ مصنف رحمۃ اللہ علیہ قراءت، حدیث، اصول حدیث، علم معانی وبیان اور فقہ وغیرہ تمام علوم میں کمال رکھتے تھے، اسی لیے انہیں محقق، امام، متکلم، فن کے محرر ومُدوّن، قدوۃ المجودین، شیخ المحدثین، مجدد زمان، شمس الملۃ والدین، خاتمۃ الحفاظ والمحققین اور شیخ الاسلام وغیرہا القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اکثر اہلِ فن انہیں محقق کے لقب سے یاد کرتے ہیں، خصوصاً کتبِ علم تجوید میں جہاں "قال المحقق" آئے یا کوئی مقری دورانِ تعلیم کہے کہ محقق نے یوں فرمایا ہے تو وہاں مصنف رحمۃ اللہ علیہ مراد ہوتے ہیں۔

شیخ کی کنیت ابوالخیر اور ابن الجزری ہے۔ جزری جزیرہ عبدالعزیز بن عمر برقعیدی کی طرف نسبت ہے جو

موصل کے قریب واقع ہے اور یہ ملکِ شام میں ایک چھوٹا سا شہر ہے۔

(ماخوذ من :الضوء اللامع للسخاوي،تاج العروس للزبيدي،المشترك للحموي المنجد،روضة المناظر لأبي الوليد بن شحنة حنفي)

ولادت

مصنف رحمۃ اللہ علیہ کے والد کامیاب تاجر تھے مگر نعمتِ اولاد سے محروم تھے،اُن کی شادی کو چالیس برس گذر چکے تھے مگر کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔اللہ تعالیٰ نے اُنہیں سعادتِ حج سے نوازا تو وہ بیت اللہ کے طواف کے بعد جب چاہِ زمزم پر تشریف لائے تو وہاں دعا کی:اے خالقِ کائنات!مجھے صالح اولاد عطا فرما۔دل سے نکلی ہوئی دعا کو بارگاہِ الٰہی سے شرفِ قبول عطا ہوا،اور ہفتہ کی شب ۲۵ رمضان ۷۵۱ھ کو دمشق کے مشہور محلہ قصاعین میں بین السورین (اندرونی حصہ) میں ابن الجزریؒ کی ولادت ہوئی۔ہر چند کہ شیخ کے تذکرہ نگاروں نے باقاعدہ اُن کے خدوخال کا نقشہ نہیں کھینچا تاہم یہ سب نے لکھا ہے کہ وہ انتہائی معتدل الجسم اور حسن و جمال کے پیکر تھے۔

(ماخوذ من:غاية النهاية،المصعد الأحمد في ختم مسند أحمد،العقود الفريدة للتقي المقريزي، إنباء الغُمر بأبناء العمر،لابن حجر العسقلاني)

تعلیم وتربیت

چونکہ آٹھویں اور نویں صدی ہجری میں دمشق علوم وفنون کا مرکز تھا اس لیے مصنف کی ابتدائی تعلیم وتربیت وہیں ہوئی،سب سے پہلے قرآن حفظ کیا اور بارہ سال کی عمر میں پورا قرآن حفظ کرلیا اور تیرھویں سال میں تراویح میں سنایا۔مصنف کے مطابق انہیں اُن کے والد نے بتایا کہ اُن کے ماموں شیخ محمد بن خباز رحمۃ اللہ علیہ نے مصنف (امام جزری) کو تراویح میں قرآن سنانے کی اجازت عنایت فرمائی تھی،اور ان کی سماعت خود فرمائی تھی۔

تحصیلِ حدیث

حیران کن بات ہے کہ مصنف رحمۃ اللہ علیہ علمِ تجوید وقراءت میں امامت کے اُس مقام پر فائز ہونے کے باوجود کہ جس میں نہ صرف یہ کہ وہ اپنے دور میں یکتا تھے بلکہ بعد میں بھی اُن کا ہم پلہ کوئی نہیں ہوسکا،علم حدیث میں بھی مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔

علمِ حدیث میں مصنف کے اساتذہ

مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے علمِ حدیث مندرجہ ذیل پانچ مشائخ سے حاصل کیا:

۱۔ شیخ ابوالثناء محمود بن خلیفہ المنبجی متوفّٰی ۷۶۷ھ،

۲۔ بہاؤالدین عبداللہ بن ابوبکر الدمامینیؒ ۷۹۴ھ،

۳۔ شہاب الدین احمد بن عبدالکریم الحنبلی البعلبکیؒ متوفّٰی ۷۷۷ھ،

۴۔ خاتمۃ الحفاظ شمس الدین ابوبکر محمد بن عبداللہ محب المقدسی المعروف صامت متوفّٰی ۷۸۹ھ،

۵۔ مؤرخ اسلام، محدث شام ابوالفداء عمادالدین اسماعیل بن عمر المعروف ابن کثیرؒ متوفّٰی ۷۷۴ھ،

نیز اس سے قبل مصنف نے محدث فخر بن بخاریؒ متوفّٰی ۶۹۰ھ، حافظ شرف الدین عبد المؤمن دمیاطیؒ متوفّٰی ۷۰۵ھ اور شیخ شہاب الدین احمد بن رفیع ابرقوہیؒ متوفّٰی ۷۰۱ھ کے نامور اصحاب وتلامذہ سے بھی حدیث کا سماع کیا۔ اسی طرح ابوحفص عمر بن حسن عرف ابن امیلہ مراغیؒ متوفّٰی ۷۷۸ھ سے سنن أبی داود، جامع ترمذی، امالی ابن شمعون کا سماع کیا اور مسند الدنیا شیخ صلاح الدین محمد بن احمد الحنبلی المقدسیؒ متوفّٰی ۷۸۰ھ سے امام طبرانی کی "المعجم الکبیر" اور "مسند أحمد" پڑھیں۔ مصنف نے موصوفؒ سے مسند احمد سات برس میں پڑھی، جس کا سبب نسخہ کا نامکمل ہونا تھا۔ چنانچہ خود محققؒ اپنی کتاب "المصعد الأحمد" میں فرماتے ہیں:

"اتنی مدت لگنے کا سبب یہ ہے کہ شیخ صلاح الدینؒ کے اصل سماع والا نسخہ حافظ ضیاء الدین کے قلم سے لکھا ہوا تھا ہمیں جس کا کچھ حصہ ملا تھا اور باقی نہیں ملا تھا۔ ہمارے شیخ حافظ کبیر شمس الدین ابوبکر بن محب صامتؒ شیخ صلاح الدین سے "مسند احمد" کے سماع کی بڑی ترغیب دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ "اس میں شک نہ کرو کہ شیخ صلاح الدین نے پوری مسند فخر بن بخاری سے سنی ہے اس بنا پر تم بھی شیخ سے مسند احمد کے سننے میں مسابقت کرو"۔ پس ہم مسند احمد مدرسہ بلاذراغیہ کے وقف شدہ نسخہ سے پڑھتے تھے جو نہایت صاف اور بہت روشن خط تھا، اور بعض محدثین اس نسخہ کی بڑی حفاظت کرتے تھے۔ پس اس کا جو جزء بھی ملتا تھا بڑی دشواری سے دستیاب ہوتا تھا، اس لیے اتنی لمبی مدت لگ گئی"۔

مصنف رحمۃ اللہ علیہ کا اصل فن قراءت تھا اور گو وہ اس میں عنفوان شباب ہی سے درجۂ کمال کو پہنچ چکے تھے مگر بعد میں بھی اُن کے شغف وانہماک میں کسی طرح کمی نہ آئی۔ اس پر بعض جوہر شناس اساتذہ (غالباً ابوبکر

الصامتؒ) نے ان کا یہ شغف وانہماک دیکھ کر فرمایا: بلاشبہ قراءت سے شغف اچھا ہے مگر یہ علم "کَثِیرُ الشُّعَب" اور "قَلِیلُ الجَدْوٰی" ہے، یعنی اس میں محنت زیادہ کرنا پڑتی ہے لیکن اس سے فائدہ اٹھانے والے بہت تھوڑے لوگ ہوتے ہیں اور چونکہ تم ماشاء اللہ نہایت ذکی، فطین، فہیم اور عقیل ہو اس لیے تمہیں اس سے نافع تر علوم سے شغف رکھنا چاہیے۔ اس نصیحت پر مصنفؒ نے حدیث کی طرف توجہ کی اور سند کے ساتھ ایک لاکھ احادیث حفظ کر لیں۔

(فهرس الفهارس لعبدالحي الكتاني)

تدریس، اِقراء اور اِفتاء کی اجازت

مصنف رحمۃ اللہ علیہ اپنے علمی ذوق وشوق اور محنت وقابلیت کی بدولت بہت جلد اپنے مشائخ کی نظروں میں مقبول ہو گئے اور مشائخ نے انہیں درس وتدریس، اِقراء (تجوید وقراءت) تحدیث (روایتِ حدیث) اور اِفتاء (فتویٰ نویسی) کی اجازت دے دی۔ چنانچہ ۷۷۴ھ میں حافظ ابن کثیر نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ قبل اور ۷۷۸ھ میں شیخ ضیاء الدین القزوینیؒ نے اور ۷۸۵ھ میں شیخ الاسلام بلقینیؒ نے انہیں تدریس واِفتاء کی اجازت دی۔ ان کے علاوہ دوسرے اربابِ فضل وکمال سے بھی انہیں اجازت حاصل ہوئی، غرضیکہ ۷۸۵ھ تک اُس دور کے اکثر اکابر سے انہیں حدیث وتدریس کی اجازت مل گئی تھی۔

مصنف رحمہ اللہ کے تلامذہ

مصنف رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ کی دو قسمیں ہیں، اول تجوید وقراءت کے تلامذہ اور دوم حدیث کے تلامذہ۔ تجوید وقراءۃ کے تلامذہ کا تو ایک ایسا جہان ہے جن کے اسماء کا احاطہ کرنا دشوار ہے، اور علمِ حدیث میں بھی مصنف رحمۃ اللہ علیہ کا جو مرتبہ ہے اُس پر جہاں اُن کی تصانیف شاھد ہیں وہیں تلامذہ کی تعداد بھی اس حقیقت کا بین ثبوت ہے۔ اس مقام کو سمجھنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ حافظ الدنیا امام ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ ایسی شخصیت بھی اُن کے تلامذہ اور فیض یافتہ ہستیوں میں سے ہے۔ چنانچہ ۷۹۳ھ میں قاہرہ میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی مصنف رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے حافظ رحمہ اللہ کو دمشق کی دعوت دی اور انہیں اپنی مرویات وتالیفات کی منظوم تحریری اجازت مرحمت فرمائی۔

(كشف النظر ج ١ ص ٣٧٩)

مصنف رحمہ اللہ کی وفات

مصنف رحمۃ اللہ علیہ کے عرب وعجم میں علمی سفر، مکۃ المکرمہ اور مدینہ معظمہ کی حاضری اور وہاں کے لوگوں کو علمی فیض دینے، مختلف بلاد میں مصنف کے قائم کردہ مدارس، مساجد میں خطابت اور متعدد مرتبہ عہدۂ قضا پر فائز ہونا اور عدل وانصاف کے چرچے وغیرہ امور کے بیان سے ہم نے عمداً اجتناب کیا ہے، جن حضرات کو تفصیل درکار ہو تو وہ حافظ ابن حجر عسقلانی کی "إنباء الغمر" ابن العماد حنبلی کی "شذرات الذهب" امام سیوطی کی "طبقات الحفاظ" امام سخاوی کی "الضوء اللامع" اور مصنف کی تالیفات کے مقدمے ملاحظہ فرمائیں۔ یہاں ہم مصنف کی وفات اور اُن کی تالیفات کا ذکر کررہے ہیں۔

مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے بروز جمعہ پانچ ربیع الاول ۸۳۳ھ میں چاشت کے وقت اپنی عمر کے ۸۲ ویں سال میں وفات پائی۔ اس طرح انہوں نے ستر سال سے زائد قرآن وحدیث کی اشاعت میں خرچ فرمائے۔ "غاية النهاية" میں اُن کے ایک شاگرد نے اُن کی نمازِ جنازہ کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اُن کی وفات کی خبر بہت جلد ہر مقام پر پہنچ گئی، اور جب اُن کے جسد پاک کو اٹھایا گیا تو اعیانِ مملکت، علماء، شرفاء، امراء اور عوام وخواص اُن کے جنازہ کو کندھا دینے، چھونے، بوسہ دینے اور تبرکاً ساتھ چلنے میں ایک دوسرے پر گر رہے تھے، اتنا ہجوم تھا کہ جنازہ تک پہنچنا اور اُسے چھونا ناممکن تھا۔ چنانچہ جو لوگ جنازہ تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکے تھے تو وہ اُن لوگوں کو چھو کر برکت حاصل کررہے تھے جو جنازہ تک پہنچنے اور اُسے چھونے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ شیخ کی تدفین شیراز کے محلّہ اسکافیین (موچی محلّہ) میں اُن کے قائم کردہ مدرسہ "دار القرآن" میں ہوئی۔ سَقَى اللّٰهُ ثَرَاهُ وَجَعَلَ الْجَنَّةَ مَثْوَاهُ.

مصنف کی تصانیف

مصنف رحمۃ اللہ علیہ کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف درج ذیل ہیں:

۱۔ الإبانة في العمرة من الجعرانة.

۲۔ إتحاف المهرة في تتمة العشرة.

۳۔ الإجلال والتعظيم في مقام إبراهيم.

٤۔ الإهتداء إلى معرفة الوقف والابتداء.

٥ـ أحاسن المنن.

٦ـ أسنى المطالب في مناقب علي بن أبي طالب. (يعني فضائل مرتضوی علیه السلام میں بلند مطالب)

٧ـ إعانة المهرة فى الزيادة على العشرة.

٨ـ الأولوية في أحاديث الأولية.

٩ـ البداية في علوم الرواية.

١٠ـ تاريخ ابن الجزري. [وهو تلخيص من تاريخ الإسلام للذهبي].

١١ـ تحبير التيسير فى القراءات العشر.

١٢ـ تحفة الأخوان فى الخلف بين الشاطبية والعنوان.

١٣ـ تقريب النشر فى القراءات العشر، وهو تلخيص للنشر.

١٤ـ التعريف بالمولد الشريف.

١٥ـ التكريم فى العمرة من التنعيم.

١٦ـ التمهيد في علم التجويد.

١٧ـ التوضيح في شرح المصابيح.

١٨ـ الجوهرة فى النحو.

١٩ـ حاشية الإيضاح

٢٠ـ الحصن الحصين من كلام سيد المرسلين.

٢١ـ الدرة فى القراءات الثلاث، المتممة للقراءات العشر.

٢٢ـ الدرة المضيئة في قراءآت الأئمة المرضية.

٢٣ـ ذات الشفاء في سيرة المصطفىٰ ومَن بعده من الخلفاء.

٢٤ـ الزهر الفائح في ذكر من تنزه من الذنوب والقبائح.

٢٥ـ شرح التحصيل.

٢٦ـ شرح منهاج الوصول إلىٰ علم الأصول.

٢٧ـ طيبة النشر فى القراءات العشر.

۲۸۔ الظرائف في رسم المصاحف.

۲۹۔ عدة الحصن الحصين و جُنّة الحصن الحصين.

۳۰۔ عرف التعريف بالمولد الشريف.

۳۱۔ عقد الآلي فی الأحاديث المسلسلة العوالي.

۳۲۔ غاية الدرايات في رجال القراء ات۔الطبقات الصغریٰ.

۳۳۔ غاية الْمُنٰی في زيارة مِنی.

۳٤۔ فضل حراء.

۳۵۔ قصيدة خمسمائة بيت من بحرالرجزفي مصطلح الحديث.

۳٦۔ الكاشف في رجال الكتب الستة.

۳۷۔ كفايةالألمعي في آية يَاأَرْضُ ابْلَعِيُ.

۳۸۔ المسند الأحمد فيما يتعلق بمسند أحمد.

۳۹۔ المصعد الأحمد في ختم مسند أحمد.

٤۰۔ المقصدالأحمد في رجال مسند أحمد.

٤۱۔ المقدمة فيماعلیٰ قارئه أن يعلمه[المقدمةالجزرية]

٤۲۔ المختارفي فقه الشافعي.

٤۳۔ منجد المقرئين و مرشد الطالبين.

٤٤۔ النشر فی القراء ات العشر.

٤۵۔ نهاية الدرايات في رجال القراء ات.[الطبقات الكبریٰ]

٤٦۔ هداية المهرةفي تتمة العشرة.

٤۷۔ الهداية في ذكر الأئمة العشرة.

نوٹ

ہم نے مصنف کے حالات اور اُن کی تصانیف کی یہ تفصیل علامہ شوکانی کی کتاب "البدر الطالع" اور

مصنف کی کتب "تحبیر التیسیر، النشر" اور قاری محمد طاہر رحیمی کی کتاب "کشف النظر شرح اردو کتاب النشر" کے مقدمہ سے حاصل کی ہے۔ جن حضرات کو اس سے زیادہ اور خصوصاً اُردو میں تفصیل مطلوب ہو تو وہ آخر الذکر کتاب کا مطالعہ فرمائیں۔

کتابِ ھذا میں مصنف رحمہ اللہ کا اُسلوب

اس کتاب میں مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے مختلف کتب حدیث میں وارد شدہ فضائل و مناقب مرتضوی پر تمام احادیث کو جمع کرنے کا اہتمام نہیں فرمایا بلکہ وہ اِس میں فقط وہ احادیث لائے ہیں جن کی سند اُن سے لے کر اوپر تک مسلسل ہے۔ اگر وہ مسلسل سند کا التزام نہ فرماتے تو پھر فضائلِ مرتضوی میں ایک ضخیم کتاب تیار ہو جاتی، جیسا کہ انہوں نے آغاز کتاب میں امام احمد بن حنبل ﷺ کے قول سے اسی طرف اشارہ فرمایا ہے، اور آخر میں اسی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے:

"میں کہتا ہوں: یہ فضائل مرتضوی سمندر میں سے ایک چلو ہیں اور ان کے کثیر مناقب جلیلہ اور اوصاف جمیلہ کی بہ نسبت قلیل ہیں۔ اگر ہم تمام فضائل کا احاطہ کرنے کے درپے ہوتے تو کلام اس مقام کی گنجائش سے بہت طویل ہو جاتا، لیکن ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے امیدوار ہیں کہ وہ ہمارے لیے ایسی کتاب کو جمع کرنا آسان فرمائے گا جس میں ہم فضائل کا احاطہ کریں گے، اور اللہ تعالیٰ ہی بہتر توفیق عطا فرمانے والا ہے"۔

نیز وہ اپنی درج فرمودہ احادیث کی شرح کے درپے بھی نہیں ہوئے بلکہ فقط محدثانہ طریقہ سے ان کی فنی حیثیت پر مختصری روشنی ڈال کر آگے نکل گئے۔

کتابِ ھذا کی مصنف کی طرف نسبت کی تحقیق

راقم الحروف کے سامنے اس کتاب کے چار نسخے موجود ہیں، ان سب کے اندرونی مواد میں اور ان سب کے ٹائٹل پر مرقوم مصنف کے نام میں کوئی فرق نہیں مگر ٹائٹل پر مرقوم کتاب کے نام میں فرق ہے۔ یہاں ہم چاروں نسخوں کا الگ الگ تعارف کراتے ہیں، فرق خود معلوم ہو جائے گا۔

۱۔ مناقب الأسد الغالب ممزق الكتائب ومظهر العجائب، ليث بن غالب أمير المؤمنين أبي الحسن علي بن أبي طالب ﷺ۔

یہ نسخہ دار الکتب العلمیة، بیروت سے ۱۴۲۶ھ میں شائع ہوا، اس کے آخر میں امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "خصائص علي ﷺ" بھی شامل ہے۔ ان دونوں کے محقق شیخ علی احمد عبد العال الطهطاوی ہیں۔ اس پر مصنف کا نام یوں مرقوم ہے: الإمام الحافظ شمس الدین محمد بن عبد اللہ ابن الجزري، المتوفی بعد سنة ٦٦٠ھ۔ اس نسخہ پر مصنف کے والد کا نام اور مصنف کی تاریخ وفات غلط مرقوم ہے۔

۲۔ دوسرا نسخہ مکتبۃ القرآن، مصر سے شائع ہوا، اس کا نام بھی بعینہ وہی ہے لیکن اس پر سن طباعت مرقوم نہیں ہے اور اس کے محقق شیخ طارق طنطاوی ہیں۔ مذکور الصدر نسخہ اور یہ نسخہ اندرونی متن کے لحاظ سے برابر ہیں مگر یہ نسخہ ٹائٹل پر مرقوم مصنف کے نام اور تاریخ وفات کی دونوں غلطیوں سے پاک ہے۔

۳۔ **أسنى المطالب في مناقب سيدنا علي بن أبي طالب** كرم الله وجهه،

یہ نسخہ ۱۴۰۲ھ میں مکتبۃ الإمام أمیر المؤمنین العامة، أصفهان، إیران" سے شائع ہوا، اس کے محقق شیعہ عالم ابو علی محمد ھادی الأمینی ہیں، انہوں نے لکھا ہے کہ پہلی مرتبہ یہ نسخہ ۱۳۲۴ھ میں مکۃ المکرمۃ سے شائع ہوا تھا، اور انہوں نے اس کے ابتدائی صفحات پر بطور نمونہ "مكتبة الحرم المكي" میں موجود قلمی نسخہ کی فوٹو کاپی بھی لگائی ہے۔

٤۔ أسمى المناقب في تهذيب أسنى المطالب في مناقب الإمام أمير المؤمنين علي بن أبي طالب علیہ السلام۔

اس نسخہ کا محقق یا مہذِب محمد باقر المحمودی الشیعی ہے، اس پر سنہ طباعت ۱۴۰۳ھ لکھا ہوا ہے لیکن مطبعہ وغیرہ کچھ مرقوم نہیں۔ ہر چند کہ باقر محمودی صاحب نے اپنی کاوش کو تہذیب (خلاصہ) کا نام دیا ہے مگر انہوں نے جو کارروائی کی وہ خلاصہ نہیں بلکہ تحریف وتغییر ہے۔ چنانچہ جہاں فضائل مرتضوی کی احادیث اختتام پذیر ہوئیں اور اس سے آگے دوسرے مختلف موضوعات پر احادیثِ مسلسلہ شروع ہوئیں، اُن سے قبل انہوں نے وہ احادیث حذف کردی ہیں جن میں ذکر ہے کہ حضرت سیدنا علی المرتضیٰ علیہ السلام نے خلفاء ثلاثہ ﷺ کی بیعت فرمائی تھی اور اُن کے ساتھ تعاون بھی فرمایا تھا۔ شیخ محمد ھادی الامینی صاحب نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ ان دونوں صاحبان کی یہ کارروائی امانت ودیانت کے منافی ہے۔ ان کو اور کسی بھی شخص کو یہ حق تو از خود حاصل ہے کہ وہ کسی مصنف کی کتاب کے مندرجات سے اختلاف کریں اور دلائل کے ساتھ کسی بات یا روایت کی تردید یا تائید کریں مگر یہ حق کسی کو حاصل نہیں کہ وہ کسی کتاب کے متن میں ترمیم، تغییر، تحریف اور تحذیف کرے۔

ان دونوں صاحبان نے روایات پر جرح وتعدیل وغیرہ کے بارے میں جابجا اختلاف کیا ہے بلکہ بعض مقامات پر خوب دل کی بھڑاس بھی نکالی ہے، لیکن نظریاتی اور مذہبی معاملہ میں ایسا اختلاف ہمیشہ سے چلا آرہا ہے اور اس کے قبول ورد کا سلسلہ بھی جاری ہے مگر کبھی بھی انصاف کی دنیا میں حذف وبرید کی حوصلہ افزائی نہ کسی نے کی ہے اور نہ ہی کی جاسکتی ہے۔

کتابِ ھٰذا کے نام کی تحقیق

اول الذکر دونوں مطابع نے اس کتاب کے ٹائٹل پر جو نام لکھا ہے اُسے آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں، دراصل یہ کتاب کا نام نہیں ہے بلکہ یہ مصنف کے خطبہ میں سیدنا علی بن ابی طالب ﷛ کے القاب ہیں جنہیں ان دونوں نسخوں کے محققین نے اس کتاب کا نام بنادیا ہے۔ اِس کتاب کا اصل نام وہ ہے جو تیسرے نسخے کے ٹائٹل پر مرقوم ہے، یعنی "أسنى المطالب في مناقب سيدنا علي بن أبي طالب" اور یہی نام مکۃ المکرمۃ کے اُس ٹائپنگ شدہ نسخہ پر مرقوم ہے جو "إدارة مكتبة الحرم المكي الشريف" میں موجود ہے اور جس کا اس لائبریری میں سیریل نمبر ۴۴۲۹ ہے۔

اس کی صحت کی تائید میں اور بھی کئی شواہد موجود ہیں، مثلاً مصنف رحمہ اللہ کی دوسری تصانیف کے مقدمہ میں بھی یہی نام مذکور ہے، ملاحظہ فرمائیے: تحبير التيسير في قراءات الأئمة العشرة ص٦، النشر في القراءات العشر ج ا صفحہ بحروف ابجد "ز"۔ نیز کشف النظر ترجمہ وشرح اردو کتاب النشر ج ا ص ۳۹۷۔

علاوہ ازیں امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف میں بھی یہی نام ملتا ہے، چنانچہ وہ ایک مقام میں لکھتے ہیں:

قال الشيخ شمس الدين بن الجزري في كتاب" أسنى المطالب في مناقب علي بن أبي طالب": أضافني الشيخ محمد......

(جمع الجوامع ج١٣ ص ٣٨١ رقم ٢٧٧٨٢)

اسی طرح سید محمد عبدالحی الکتانی رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ محمود سعید بن محمد ممدوح مدظلہ العالی نے بھی یہی نام ذکر کیا ہے۔

(نظام الحكومة النبوية، المسمىٰ: التراتيب الإدارية للكتاني ج٢ ص ٢٥١، غاية التبجيل وترك

القطع فی التفضیل ص۱۹۲)

قاضی شوکانی نے یہ نام یوں لکھا ہے: أسنى المناقب في فضل علي بن أبي طالب" چونکہ مصنف کی دوسری کتب اور امام سیوطی، امام الکتانی، قاضی شوکانی، شیخ ممدوح، محمد ھادی الأمینی اور قاری محمد طاہر رحیمی، چھ شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا نام" أسنى المطالب في مناقب علي بن أبي طالب" ہے اور فقط دو حضرات نے "مناقب الأسد الغالب ممزق الكتائب و مظهر العجائب، ليث بن غالب أمير المؤمنين أبي الحسن علي بن أبي طالب ﷺ" لکھا ہے، لہٰذا ہم نے اُس نام کو لیا جس کی صحت کے شواہد زیادہ ہیں۔

مقصدِ ترجمہ و تشریح

جب ایک مخصوص اور طویل سرکاری دور میں اور سرکاری سرپرستی میں عام مجالس، جمعہ اور عیدین کے خطبوں میں اور مساجد کے منبروں پر اہل بیت خصوصاً سیدنا علی مرتضیٰ علیہ السلام پر سب و شتم کیا جارہا تھا اور اُن کی تنقیص کی جارہی تھی تو اُس وقت صحابہ کرام، تابعین عظام اور محدثین کرام ﷺ کمر کس کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور جس جس کے پاس شانِ مرتضوی میں جس قدر احادیث تھیں سب کو منظر عام پر لے آئے تھے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا تھا؟ جواباً عرض ہے کہ اُن پر ایسا کرنا لازم تھا، کیونکہ سیدنا علی ﷺ سے محبت ایمان اور اُن سے بغض منافقت ہے، اور اہل اسلام کے ایمان کی حفاظت کرنا علماء کرام کا فرضِ منصبی ہے، اس لیے کہ وہ وارثانِ انبیاء ہیں، اور پھر خصوصاً شانِ مرتضوی کو اہتمام کے ساتھ واضح اور عیاں کرنا ہمارے نبی کریم ﷺ کی سنت ہے۔ چنانچہ کتب احادیث بھری پڑی ہیں کہ جب بھی ظاہری حیاتِ نبوی ﷺ میں سیدنا علی مرتضیٰ علیہ السلام پر حرف گیری کی گئی تو نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کے حال پر شفقت فرماتے ہوئے اُنہیں سیدنا علی علیہ السلام کے مقام سے آگاہ فرمایا۔

نبی کریم ﷺ اور اسلاف کرام ﷺ کے اسی اُسوہ کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمارے اکابر نے طے کیا ہے کہ چونکہ دورِ حاضر میں ناصبیت اپنے بال و پر پھیلا رہی ہے اس لیے ہمیں چاہیئے کہ فضائل و مناقبِ اہل بیت کرام علیہم السلام کے موضوع پر اسلاف کرام کی تمام دستیاب کتب کا ترجمہ کر دیں تاکہ عوام الناس حُبِ اہلِ بیت کے پاکیزہ عقیدہ پر قائم رہیں اور ناصبیت کے فریب سے محفوظ رہیں۔

مقصدِ تشریح بھی یہی ہے لیکن یہاں یہ اظہار افسوس بھی ضروری ہے کہ کاش کتبِ عربیہ اسلامیہ کے تراجم کا آغاز ہی نہ ہوتا، کیونکہ تراجم سے دین کو نہیں سمجھا جا سکتا، اور اِس حقیقت پر اکثر مکاتبِ فکر کے علماء متفق ہیں، جیسا

کہ ہم اپنی تصنیف "أنوار العرفان في أسماء القرآن" میں ان کی تصریحات پیش کر چکے ہیں، لیکن جب یہ سلسلہ چل پڑا ہے تو اب توضیح وتشریح کی صورت میں ہر ملک کی قومی زبان میں حتی الامکان لوگوں کو حقائق سے آگاہ کرنا ناگزیر ہو چکا ہے۔

کتابِ ھذا کی تشریح کی غرض بھی یہی ہے کہ عوام الناس کے سامنے وہ تصریحات، دلائل اور اقوال لائے جائیں جن کے پیش نظر صحابہ کرامؓ سے لے کر اب تک اہل سنت ترتیبِ خلافت کو حق ماننے کے باوجود خلفاء اربعہؓ میں یا تو تفاضل کے قائل رہے ہیں یا پھر دلائل کے تعارض کی وجہ سے توقف اور سکوت میں سلامتی سمجھتے رہے ہیں، مگر کیا مجال کہ ایسے دلائل اُن کے لیے وجہِ فساد بنے ہوں۔ پھر اگر اب یہ دلائل کتبِ عربیہ سے نکل کر کسی قومی زبان میں آگئے ہیں تو یہ وجہِ فساد کیوں کر ہوں؟ سادہ اور آسان سی بات ہے کہ کسی بھی مسئلہ میں دلائل کو سامنے لانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اُن دلائل کی روشنی میں انسان اپنے نظریے اور عقیدے میں آزاد ہو اور اُس پر کوئی جبر نہ ہو۔ "لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ" لیکن اس کا یہ معنیٰ نہیں کہ وہ کسی کی گستاخی اور تنقیص وتوہین کا مرتکب ہو، جو کہ بہر حال قابلِ مواخذہ ہے۔

افسوس کہ بوجہ جہالت یا بدقسمتی سے ہمارے معاشرہ میں یہ رجحان پیدا ہو گیا ہے کہ کچھ لوگ اپنا موقف جبراً منوانے پر اتر آتے ہیں حالانکہ یہ بات جہاں شرعاً ناجائز ہے وہاں عقلاً بھی درست نہیں۔ مثلاً کسی ادارہ میں کوئی نوجوان لڑکا زیرِ تعلیم ہو اور کسی مسئلہ میں اُس کا نظریہ اور اعتقاد اربابِ ادارہ سے مختلف ہو (اور وہ لڑکا تخریب کار بھی نہ ہو) تو فقط نظریاتی اور اعتقادی اختلاف کی وجہ سے اگر اربابِ ادارہ اُسے خارج کر دیں تو کیا یہ عقل مندی ہو گی؟ نہیں، یہ عقل مندی نہیں بلکہ جبر اور بے وقوفی ہو گی، کیونکہ اُسے خارج کرنا اس بات کا عملی ثبوت ہو گا کہ اربابِ ادارہ دلائل کے لحاظ سے تہی دامن ہیں، اُن کے اندر اتنی صلاحیت اور Will power ہی نہیں کہ وہ اپنے ہاں زیرِ تعلیم بچے کی فکری اصلاح کر سکیں۔

سو اگر کوئی ادارہ اپنے سٹوڈنٹ کی اصلاح نہ کر سکے تو اُسے کیا حق حاصل ہے کہ وہ معاشرہ پر اپنی فکر ٹھونسنے کی کوشش کرے؟ منوانا تو انبیاء کرام علیہم السلام پر بھی لازم نہیں تھا، انہیں حکم تھا کہ وہ کھول کھول کر پیغام الٰہی پہنچائیں اور آخر میں فرمائیں "وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ" (یعنی ہمارے ذمہ پہنچانا ہے، منوانا نہیں) اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہماری گزارش ہے کہ اگر کوئی شخص اہل بیت کرام علیہم السلام کو افضل سمجھے یا صحابہ کرامؓ کی بہ نسبت اہل بیت سے زیادہ محبت کرے تو یہ عندالشریعۃ مکروہ ہے اور نہ ہی لوگ اسے مکروہ سمجھیں۔ تجربہ شاہد ہے کہ یہ

کراہت شیعیت بلکہ رافضیت کے پھیلاؤ کا سب سے بڑا سبب ہے۔ اکثر سنی خانقاہوں کے جانشین اور پوری کی پوری نسلیں جو شیعہ ہوگئی ہیں اس کا سب سے بڑا سبب یہی کراہت ہے۔

مقامِ غور

افسوس کہ بعض لوگوں میں اس قدر سختی آ گئی ہے کہ کوئی عام یا سید شخص خلفاء ثلاثہ ﷺ کی خلافت کو زبان و دل سے برحق مانتا ہو اور اُن کی تعظیم بھی کرتا ہو لیکن سیدنا علی ﷺ سے محبت زیادہ رکھتا ہو تو وہ ہاتھ دھو کر اُس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور اُس وقت تک اپنی کوشش جاری رکھتے ہیں جب تک کہ وہ مکمل شیعہ نہ ہو جائے۔ یعنی ایسے لوگوں کے نزدیک اپنی توانائی خلفاء ثلاثہ ﷺ کی خلافت و عظمت کے قائل مگر محبِ اہل بیت شخص کے خلاف ضائع کرنا دین ہے لیکن صحابہ کرام ﷺ سے اظہارِ بیزاری یا اُنہیں سب و شتم کرنے والے کی اصلاح پر خرچ کرنا بیکار ہے۔

حد ہوگئی ہے کہ کچھ لوگ ایسے جید سنی علماء کے خلاف اپنا علمی اور مالی سرمایہ ضائع کر رہے ہیں جو جمہور کے مطابق سیدنا ابوبکر صدیق ﷺ کی افضلیت کے قائل ہیں مگر اس پر اجماعِ قطعی کے قائل نہیں۔ بتلایئے اگر قطعیت وظنیت کے دلائل پر ہی سارا وقت و سرمایہ ضائع ہوگیا تو دوسرے بنیادی مسائل کا کیا بنے گا؟

سوال یہ ہے کہ ہمارے ماحول میں واقعی ایسا ہو رہا ہے یا نہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہو تو پھر ہماری کسی جوشیلے مقرر سے تو نہیں البتہ سنجیدہ اور فکر و تدبّر کے حامل علماء سے درخواست ہے کہ خدارا ذرا غور و فکر فرمائیں! سر جوڑ کر بیٹھیں اور پرجوش مقررین کو سمجھائیں کہ شدت، حدت اور فتووں سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، فتویٰ بازی اور شدت سے باز آئیں، اس لیے کہ شدت کا مثبت نتیجہ برآمد ہوا اور نہ کبھی ہوگا۔

اصل جرم صحابہ کرام ﷺ کی توہین و تنقیص ہے نہ کہ سیدنا علی ﷺ کی افضلیت، اگر کسی شخص کے نزدیک سیدنا علی ﷺ کی افضلیت کا قول ہی سب سے بڑا جرم ہے تو ایسے اقوال تو سیدہ فاطمہ، سیدنا امام حسن مجتبیٰ، سیدنا امام حسین، سیدنا امام زید بن علی ﷺ، متعدد صحابہ، تابعین، محدثین اور صوفیہ کرام ﷺ سے بھی منقول ہیں تو کیا آج کے متشدد کا فتویٰ اُن پر بھی لگے گا؟ خدارا کچھ غور و فکر کی زحمت گوارا فرمائیں کہ اسلاف کرام نے تو سیدنا علی ﷺ کی مطلقاً افضلیت کے قائل کو بھی رافضی نہیں کہا لیکن آج کا نام نہاد سنی اتنا تنگ نظر ہو چکا ہے کہ اُس کے نزدیک سیدنا علی ﷺ کو افضل الصحابہ قرار دینا تو کجا انہیں فقط اعلم الصحابہ کہنا بھی رافضیت ہے۔ ذرا سوچئے کہ اس غیر ذمہ داری کا برا اثر کتنا ہوگا اور کہاں تک ہوگا؟

شیعیت کا فتویٰ زود اثر کیوں؟

اہل بیت کرام ﷺ کی عظمت کو گھٹانے والے، اُن کی تنقیص کرنے والے اور اُن سے بغض رکھنے والے کو ناصبی کہا جاتا ہے اور یہ آپ پہلے جان چکے ہیں کہ خلفاء ثلاثہ ﷺ پر سب وشتم کرنے والے کو رافضی کہا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ ناصبیت بعض لوگوں کے اندر جراثیم کی طرح مخفی ہوتی ہے اس لیے ناصبیت کو کوئی مذہبی تشخص نہیں مل سکا جبکہ لفظِ شیعہ لغوی طور پر گروپ کے معنیٰ میں مستعمل ہوتا ہے اور متقدمین کی اصطلاح میں محبانِ اہل بیت کو شیعہ کہا جاتا تھا، اگرچہ وہ عقائد میں مکمل طور پر سنی ہوتے تھے۔ پھر بعد میں یہ لفظ اُن لوگوں کے لیے مخصوص ہو گیا جو صحابہ کرام ﷺ کی اکثریت سے متنفر اور فقط اہل بیت کرام ﷺ کی محبت کا دم بھرتے تھے اور اب تک یہ لفظ اُن ہی لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ سو چونکہ اس لفظ کو ایک مذہبی تشخص اور تعیّن مل چکا ہے، اس لیے اب اگر کسی شخص سے صحابہ کرام ﷺ کی مکمل تعظیم کے باوجود اہل بیت کرام ﷺ کی افضلیت تو کیا بلکہ فقط اُن کی محبت کا اظہار ہو جائے تو جھٹ پٹ اُسے شیعہ کہہ دیا جاتا ہے اور لوگ اس فتویٰ کو فوراً قبول کر لیتے ہیں، حالانکہ متاخرین کی اصطلاح میں محبتِ اہل بیت کو نہیں بلکہ بغضِ صحابہ کو شیعیت کہا جاتا ہے۔

ہمارے دور میں تو بعض لوگ اس قدر حماقت میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ اگر کوئی شخص اہل بیت کی کسی ہستی کے نام کے ساتھ "علیہ السلام" لکھے یا کہے تو اسے بھی شیعہ گمان کرنے لگتے ہیں بلکہ بعض لوگ تو حب اہل بیت میں آنسو بہانے والے شخص کو بھی شیعہ سمجھنے لگتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ماہانہ یا سالانہ مگر معمول کے ساتھ اہل بیت کے ذکر کا اہتمام کرے تو اُسے بھی شیعہ قرار دے دیا جاتا ہے، حتیٰ کہ اگر کسی خطیب کو اہل بیت کرام ﷺ پر تقریر کرنے کا کہا جائے اور وہ موضوع کا حق ادا کرتے ہوئے اہل بیت کی کسی ہستی کا ذکر کر دے اور اُس مخصوص و محدود وقت میں اہل بیت کے علاوہ کسی دوسری ہستی کا ذکر شامل نہ کرے تو اس خطیب کو بھی مشکوک سمجھا جاتا ہے۔

چنانچہ مجھ سے لاہور کے بعض سنی علماء کرام نے ذکر کیا کہ انہوں نے ۱۴۳۲ھ کے رمضان المبارک کی ۲۱ ویں شب میں سیدنا علی ﷺ کا یوم شہادت منایا جس میں شانِ مرتضوی کو منظوم کلام میں پیش کیا گیا، علماء نے تقاریر فرمائیں، مجلس میں کافی ذوق پیدا ہوا، لوگ نعرۂ تکبیر و رسالت کے ساتھ ساتھ نعرۂ حیدری بھی لگاتے رہے اور مسجد یا علی یا علی کے نعروں سے شب بھر گونجتی رہی تو دوسرے دن بعض مولوی نما لوگوں نے آ کر کہا: مولانا صاحب! آج رات آپ کی مسجد میں علی علی ہوتی رہی، کہیں آپ شیعہ تو نہیں ہو گئے؟

بعض مخلصین کا مجھ فقیر کو مشورہ

"شرح خصائص علي ﷺ" کے منظرِ عام پر آنے کے بعد بعض مخلصین نے مجھے اسی صورتِ حال سے دوچار سمجھا تو مشورہ دینا شروع کر دیا کہ میں باقی خلفاء راشدین ﷺ پر بھی کتاب لکھوں تاکہ مجھے شیعہ نہ سمجھا جائے۔ اس پر میں نے عرض کیا کہ خلفاء ثلاثہ ﷺ کے فضائل ومناقب پر کتاب لکھنا یقیناً عبادت اور قربِ الٰہی کا ذریعہ ہے، اور ان شاء اللہ میں اس موضوع پر لکھوں گا، لیکن سوال یہ ہے کہ ایسا مشورہ کسی بھی دوسرے صحابی پر کتاب لکھنے والے شخص کو کیوں نہیں دیا جاتا؟ اس "کیوں" میں آپ جتنا غور فرمائیں گے اتنا ہی آپ کو وہ بات سمجھ آئے گی جسے میں سمجھانے کی کوشش میں ہوں۔

ان شاء اللہ میں باقی خلفاء راشدین ﷺ پر بھی کتاب لکھوں گا لیکن اس نیت سے نہیں کہ مجھے زبان وقلم کے طعن سے نجات اور شیعیت کے الزام سے براءت مل جائے بلکہ فقط رضاءِ الٰہی کی خاطر، کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ یہ الزام جس پر لگتا ہے پھر اُسے چھٹکارا نہیں ملتا۔ کیا امام عبد الرزاق صنعانی، امام نسائی، امام ابن جریر طبری، امام حاکم، امام ابونعیم اصفہانی اور امام جامی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہم نے ترتیب خلافت کے مطابق خلفاء اربعہ، عشرہ مبشرہ اور دوسرے صحابہ کرام ﷺ کے فضائل ومناقب نہیں لکھے؟ لکھے ہیں اور یقیناً لکھے ہیں لیکن کیا وہ کلیۃً اس الزام سے بری ہوگئے؟

دور کیا جایئے خود دورِ حاضر میں اس ظلم کی مثالیں موجود ہیں۔ چنانچہ بعض نامور معاصرین کرام کی خلفاء ثلاثہ ﷺ کے فضائل ومناقب پر مستقل تصانیف موجود ہیں لیکن چونکہ انہوں نے سیدنا علی ﷺ کی خلافت باطنیہ کا اور اہل بیت کرام علیہم السلام کی محبت کا مستانہ وار نعرہ لگایا ہے اس لیے اُن پر رافضیت کا فتویٰ جڑ دیا گیا اور خلفاء ثلاثہ ﷺ کے فضائل ومناقب پر اُن کی تصانیف کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔

لہٰذا یہ عاجز ہو یا کوئی دوسرا شخص، ہر ایک کو دفاعی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ رضاءِ الٰہی کی خاطر کام کرنا چاہیے۔ جب اہل دنیا اور فتویٰ باز ملاؤں کے پاس کسی کو ناجی اور ناری بنانے کا کوئی اختیار ہی نہیں تو پھر دنیوی الزامات سے براءت کی فکر کیوں؟ فقط عذابِ قبر وآخرت سے نجات کی فکر کرنا چاہیے۔

فتوائے شیعیت ورافضیت ہر دور میں ارزاں رہا

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ "اَنۡزِلُوا النَّاسَ مَنَازِلَهُمۡ" کے مطابق جب کوئی شخص تمام صحابہ کرام ﷺ

کے ثابت شدہ فضائل و مناقب اور اُن کی تعظیم و تکریم کو دل سے مانتا ہو اور حسبِ موقع بیان بھی کرتا ہو تو پھر اُسے ایسے فتووں پر دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ ایسے فتوے اسلاف کرام پر بھی لگتے رہے ہیں اور انہیں شیعہ، رافضی، خبیث اور دجال تک کہا گیا ہے۔ سو جب اُن پر ایسے فتوے لگائے گئے، حالانکہ وہ کسی صحابی کے گستاخ نہیں تھے تو ہمارے لیے اُن اسلاف کرام کی ذواتِ مقدسہ میں اسوہ ہے، چنانچہ قرآن مجید میں بھی متقدمین کے جھٹلائے جانے کو متاخرین کے لیے تسلی اور نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کریم ﷺ کو ارشاد فرمایا:

وَإِنْ يُكَذِّبُوكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ.

''اور اگر یہ آپ کو جھٹلا رہے ہیں تو آپ سے پہلے بھی رسولوں کو جھٹلایا گیا''۔

(فاطر: ٤)

معلوم ہوا کہ اربابِ حق کو جھٹلانے اور اُن پر فتوے لگانے کی رسم قدیمی ہے۔ جب حبِّ اہل بیت کے معاملہ میں ائمہ متبوعین بھی رافضیت کے فتووں کی زد سے محفوظ نہیں رہ سکے تو کوئی دوسرا مسلمان کس شمار میں ہے؟ کیا امام محمد بن ادریس الشافعی رحمۃ اللہ علیہ کسی صحابی کے گستاخ تھے کہ انہیں رافضی کہا گیا؟ اگر نہیں تو پھر اُنہیں ردِ عمل میں یوں کیوں فرمانا پڑا:

إِنْ كَانَ رِفْضًا حُبُّ آلِ مُحَمَّدٍ فَلْيَشْهَدِ الثَّقَلَانِ أَنِّي رَافِضِيٌّ

''اگر واقعی اہلِ بیتِ محمد ﷺ کی محبت رافضیت ہے تو جن اور انسان گواہ ہو جائیں میں رافضی ہوں''۔

(ديوان الإمام الشافعي ص ٢٦٧؛ مناقب الإمام الشافعي لابن كثير ص ١٩٨)

انہوں نے ''حُبُّ آلِ مُحَمَّدٍ'' کے الفاظ سے واضح کر دیا ہے کہ اُن کا قصور فقط حب اہل بیت تھا کسی صحابی کی تنقیص نہیں تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ فقط ہمارے دور میں ہی نہیں بلکہ اُس دور میں بھی ایسے جلد باز لوگ موجود تھے جن کے نزدیک تنقیص صحابہ نہیں بلکہ حب اہل بیت رفض تھی۔

کیا کوئی شخص ثابت کر سکتا ہے کہ امام نسائی، امام عبد الرزاق صنعانی، امام ابن جریر طبری، امام حاکم، امام ابو نعیم اصفہانی اور امام جامی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہم میں سے کوئی محدث گستاخِ صحابہ تھا؟ اگر نہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ان میں سے بعض کو شیعہ، بعض کو رافضی اور بعض کو خبیث کہا گیا اور بعض کو تو قتل کر دیا گیا۔

بات دراصل یہ ہے کہ شروع سے ہی اہل بیت کی محبت کا دم بھرنے اور صحابہ سے نفرت کرنے والا ایک فرقہ

وجود میں آ گیا تھا، اس لیے تب سے اب تک کوئی مسلمان کتنا ہی صحابہ کرام ﷺ کا باادب ہو لیکن اگر وہ والہانہ انداز سے اہل بیت سے محبت کرتا ہو تو عاقبت نااندیش لوگ اُسے شیعہ اور رافضی کہہ دیتے ہیں۔ آیئے ہم آپ کے سامنے ماضی کے بعض عاقبت نااندیش لوگوں کی جلد بازی کا نمونہ پیش کرتے ہیں تاکہ اس کی روشنی میں حال کا جائزہ لگایا جا سکے۔

فقط ذکرِ علی ﷺ پر بعض سلوف کا حواس باختہ ہونا

علامہ سمعانی نے ابو بکر محمد بن احمد بن خنب متوفی ۳۵۰ھ کے حالات میں لکھا ہے:

''ابو کامل البصیری بیان کرتے ہیں: میں نے اپنے بعض مشائخ سے سنا کہ ایک مرتبہ ہم ابن خنب کی مجلس میں تھے تو انہوں نے اصحاب ثلاثہ ﷺ کے فضائل کے بعد سیدنا علی ﷺ کے فضائل لکھوانا شروع کیے، اس پر ابو الفضل سلیمانی اٹھ کھڑا ہوا اور چیخ چیخ کر کہنے لگا:

أيها الناس! إن هذا دجال من الدجاجلة، فلا تكتبوا عنه، وخرج من المجلس لأنه ما سمع منه فضلَ أبي بكر وعمر وعثمان رضي الله عنهم أجمعين.

لوگو! یہ شخص دجالوں میں سے ایک دجال ہے، اس سے حدیث مت لکھو، یہ کہتے ہوئے وہ مجلس سے چلا گیا، یہ حرکت اُس نے اس لیے کی کہ اُس نے حضرات ابو بکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کے فضائل نہیں سنے تھے''۔

(الأنساب للسمعاني ج٢ ص٤٠٤)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو الفضل سلیمانی خلفاء ثلاثہ ﷺ کے فضائل کے بعد مجلس میں پہنچا تھا۔ میں کہتا ہوں: اگر وہ آغازِ املاء سے ہی مجلس میں موجود ہوتا اور حضرت ابن خنب فقط سیدنا علی ﷺ کے ہی فضائل املاء کراتے تو پھر بھی یہ بات قابل اعتراض نہ ہوتی، کیونکہ صرف ذکر مرتضی ﷺ کرنا شریعت میں مکروہ و مبغوض نہیں، البتہ اگر وہاں اصحاب ثلاثہ ﷺ کی تنقیص و توہین ہوئی ہوتی تو پھر سلیمانی کا چیخنا چلانا درست ہوتا لیکن مذکورہ صورتِ حال میں اُس کا چیخنا چلانا زیادتی ہے۔ چنانچہ امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس زیادتی پر یوں تبصرہ فرمایا ہے:

قلتُ: هذا يدل علىٰ زعارة السليماني، وغلظته.

''میں کہتا ہوں: یہ بات سلیمانی کی بدمزاجی اور سختی پر دلالت کرتی ہے''۔

(سیر أعلام النبلاء للذهبي ج١٥ ص٥٢٤، وط: ص٣٢١٨)

کیا مجلس میں ذکرِ علی ؓ کی تقدیم رافضیت ہے؟

درجِ ذیل واقعہ سے بھی ایسی ہی بدمزاجی اور سختی عیاں ہے۔امام ابوالشیخ اصبہانی اور امام ابونعیم اصبہانی رحمۃ اللہ علیہما ابراہیم بن عبدالعزیز ابواسحاق المدینی کے حالات میں لکھتے ہیں:

''ایک مرتبہ وہ حدیث بیان کرنے کے لیے بیٹھے تو حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے فضائل کی تخریج فرمائی اور املاء کرایا، پھر فرمایا: اب ہم کس سے شروع کریں، حضرت عثمان ؓ سے یا حضرت علی ؓ سے؟ اس پر وہ تمام لوگ کہنے لگے:

هذا رافضي فتركوا حديثه.

یہ رافضی ہے، پھر انہوں نے اُن کی حدیث کو ترک کر دیا''۔

(طبقات المحدثين لأبي الشيخ ج٢ ص٢٨٠؛ تاريخ أصبهان لأبي نعيم ج١ ص٢١٦؛ ذيل ميزان الاعتدال للعراقي ج٨ ص١٨)

افسوس کہ ابواسحاق المدینی کی مجلس کے لوگ اس قدر کم مطالعہ اور بدمزاج تھے کہ ان کے نزدیک ذکرِ عثمان وعلی رضی اللہ عنہما میں تقدیم وتاخیر کا سوال ہی رافضیت ٹھہرا، اور انہوں نے محض اتنی سی بات پر ابواسحاق المدینی سے حدیث لینا ترک کر دی۔حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ پر خوب تبصرہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

قلتُ: وهذا ظلم بيّن، فإن هذا مذهب جماعة من أهل السنة، أعني التوقف في تفضيل أحدهما على الآخر، وإن كان الأكثر على تقديم عثمان، بل كان جماعة من أهل السنة يقدمون علياً على عثمان، منهم سفيان الثوري وابن خزيمة.

''میں کہتا ہوں: یہ کھلا ظلم ہے، بیشک یہ اہل سنت کی ایک جماعت کا مذہب ہے، یعنی ایک کی دوسرے پر فضیلت میں توقف، اگرچہ اکثر حضرت عثمان ؓ کی تقدیم کے قائل ہیں، بلکہ اہل سنت کی ایک جماعت سیدنا علی ؓ کو حضرت عثمان ؓ پر مقدم مانتی ہے، امام سفیان ثوری

اور امام ابن خزیمہ ؓ بھی اُن ہی میں سے ہیں‘‘۔

(لسان المیزان ج۱ ص۱۱۳، ۱۱٤)

علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

قلتُ: ليس تفضيل علي برفض ولا هو ببدعة، بل قد ذهب إليه خلق من الصحابة والتابعين.

’’میں کہتا ہوں: سیدنا علی ؓ کی تفضیل رفض ہے اور نہ ہی بدعت، بلکہ صحابہ اور تابعین ؓ کی ایک خلقت اِس تفضیل کی طرف گئی ہے‘‘۔

(سیر أعلام النبلاء للذهبي ج١٦ ص٤٥٧)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو اسحاق المدینی کے حلقۂ حدیث میں بیٹھنے والے لوگ اس حقیقت سے نابلد تھے، ورنہ وہ اس بات کو رفض نہ کہتے، کیونکہ وسیع المطالعہ شخص اس قدر جلد باز نہیں ہوتا، اور اگر انہوں نے باخبر ہونے کے باوجود اس بات کو رفض کہا تو پھر یہ اُن کی بدمزاجی کی دلیل ہے۔ بہرکیف ان واقعات سے یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ جب دوسری اور تیسری صدی کے لوگ فتوائے رفض لگانے میں اس قدر جلد باز اور غیر محتاط تھے تو پھر دورِ حاضر کی جلد بازی اور بے احتیاطی کا کیا رونا؟

خلاصہ یہ ہے کہ شروع سے اب تک علماء اہل سنت بلکہ ائمہ اہل سنت پر رفض وشیعیت کے فتوے لگے ہیں اور وہ فتوے عوام کی سطح پر مشہور بھی ہوئے ہیں مگر اس تناسب سے دشمنانِ اہل بیت پر ناصبیت کا کوئی فتویٰ مشہور نہیں ہوا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ جواباً عرض ہے کہ اس کی وجہ صرف وہی ہے جو اوپر ذکر ہوئی کہ شیعیت مشہور ہے اور ناصبیت غیر مشہور، ورنہ جس طرح صحابہ کرام ؓ کے بدخواہوں سے کوئی دور خالی نہیں رہا اسی طرح اہل بیت کرام علیہم السلام کے بدخواہوں سے بھی کوئی دور خالی نہیں رہا۔

افضلیت مرتضوی میں کسی صحابی کی برائی کیسے؟

یہاں یہ پہلو بھی قابل توجہ ہے کہ رفض کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ اہل بیت کرام علیہم السلام سے محبت

۲۔ صحابہ کرام ؓ سے عداوت

اُن کی پہلی صورت عیاں اور دوسری صورت مخفی ہے، لیکن حیرت انگیز بات ہے کہ کسی سنی شخص سے فقط پہلی حالت کا اظہار ہوا اور وہ دوسری صورت سے یکسر پاک ہو تو تب بھی وہ فتوائے رافضیت سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ بتلایئے! کیا یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ امام شافعی ﷺ صحابہ کرام ﷺ سے عداوت رکھتے تھے یا انہیں سبّ وشتم کرتے تھے؟ اگر نہیں تو پھر اُنہیں رافضی کیوں کہا گیا؟ اُن کا قصور اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ وہ اہل بیت کرام علیہم السلام کی محبت میں سرشار تھے اور انہیں فقط اسی محبت کے باعث رافضی کہا گیا، حالانکہ رافضی اُسے کہا جاتا ہے جو شیخین کریمین ﷺ سے براءت کا اظہار کرے اور اُنہیں سبّ وشتم کرے۔ اس کا واضح مطلب یہ نکلا کہ اُس دور کے احمق لوگوں کے نزدیک اہل بیت کرام علیہم السلام سے محبت معاذ اللہ صحابہ کرام ﷺ سے دشمنی اور اُنہیں سبّ وشتم کرنے کے مترادف تھی۔ انتہائی افسوس کی بات ہے کہ واقعی اُس دور کے کچھ احمق لوگ ایسا ہی سمجھتے تھے۔ چنانچہ اُس دور کے باریک بین علماء کرام نے اپنے دور کے احمقوں کے خیال کو یوں نظم کیا ہے:

إذا ما ذكرنا من علي فضيلة　　　رمونا لها جهلاً بشتم أبي بكر

وهل يشتم الصديق من كان مؤمناً　　　ضجيع رسول الله في الغار والقبر؟

”جب ہم سیدنا علی ﷺ کی کوئی فضیلت بیان کرتے ہیں تو لوگ بوجہ جہالت ہم پر حضرت
ابوبکر ﷺ کو سبّ وشتم کرنے کا الزام لگاتے ہیں،
بھلا کوئی مومن شخص اُس صدیق ﷺ کو سبّ وشتم کر سکتا ہے جو غار و مزار میں
رسول اللہ ﷺ کا ساتھی ہے؟“۔

(تاريخ مدينة دمشق ج ٤٢ ص ٥٣٢)

اس باریک بین شاعر نے ماضی کے بدمزاجوں کی ٹھیک عکاسی کی ہے۔ میں کہتا ہوں: اس سے قبل بھی ایسے بدمزاج لوگ موجود تھے جو شانِ مرتضوی میں تقریر وتشریح تو کیا صریح حدیث سننا بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ امام ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ امام واسطی متوفی ۳۷۳ھ کے حالات میں لکھتے ہیں:

”سلفی کہتے ہیں: میں نے خمیس الحوزی سے ابن السقاء کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے کہا: وہ مزینہ مضر سے تھے، اور وہ سقاء (ماشکی) نہیں تھے بلکہ یہ اُن کا لقب تھا، وہ واسط کے معززین اور اہل ثروت سے تھے اور قوتِ حافظہ کے مالک تھے۔ انہیں اُن کے والد نے حدیث کے لیے سفر کرایا اور ابو خلیفہ، ابو یعلیٰ الموصلی، ابن زیدان بَجلی، مفضّل جندی اور ایک جماعت

سے حدیث کی سماعت کرائی، اللہ تعالیٰ نے اُن کی عمر اور علم میں برکت رکھی تھی۔ ایک مرتبہ اُنہیں ایک سانحہ پیش آیا، وہ یہ کہ انہوں نے حدیث الطائر املاء کرائی تو لوگوں نے اُسے گوارا نہ کیا، انہوں نے اُن پر حملہ کر دیا، وہاں سے اٹھا دیا اور جہاں وہ بیٹھے تھے اُس جگہ کو دھویا۔ پس وہ چلے گئے اور گھر کے اندر رہنے لگے اور واسط کے کسی باشندے کو حدیث بیان نہیں کرتے تھے، اسی لیے اہل واسط کے پاس اُن سے مروی احادیث قلیل ہیں''۔

(تذكرة الحفاظ للذهبي ج ٢ ص ١١٧؛ سير أعلام النبلاء للذهبي ج ١٦ ص ٣٥٢)

جب اُس دور میں شدت کا یہ عالم تھا تو پھر ہمارے دور کی جہالت، بدمزاجی، سختی اور عدم برداشت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

یہاں ہم عبرت پذیری کی غرض سے اسی محدث ابن السقاء کی ذہانت، فطانت اور قوتِ حافظہ کا ایک واقعہ نقل کر رہے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ لوگ کتنے بڑے محدث کے فیض سے محروم رہ گئے۔ خطیب بغدادی اور حافظ ابن کثیر وغیرہما لکھتے ہیں:

''انہوں نے عبدان، ابو یعلیٰ الموصلی، ابن ابی داود اور بغوی سے حدیث سماعت کی، وہ فہیم اور حفیظ (یادداشت والے) شخص تھے۔ ایک مرتبہ وہ بغداد تشریف لے گئے تو بہت سی مجالس میں اپنی قوتِ حافظہ کے بل بوتے پر احادیث روایت فرمائیں، ان کی مجالس میں امام دارقطنی اور دوسرے حفاظ حدیث شرکت کرتے رہے اور کسی نے کوئی اعتراض نہ کیا، ماسوا اس کے کہ ایک مرتبہ انہوں نے امام ابو یعلیٰ سے کوئی حدیث روایت کی تو محدثین نے اعتراض کیا، پھر وہ محدثین اُس حدیث کی جستجو میں نکلے تو اسے بعینہٖ خط صبا میں پا لیا تو ابن السقاء اُس الزام سے بری قرار پائے، رحمۃ اللہ علیہ''۔

(تاريخ بغداد ج ١٠ ص ١٣٠، ١٣١؛ البداية والنهاية ج ١٢ ص ٣١٥)

اتنے عظیم حافظ الحدیث سے اہل واسط فقط اس لیے محروم رہ گئے کہ انہوں نے شانِ مرتضوی میں حدیث الطائر بیان کر دی تھی۔ یہاں راقم الحروف قارئین کرام کو دعوت دیتا ہے کہ وہ غور فرمائیں کہ کہیں عصر حاضر میں علماء سوء کسی ذکی، فہیم عالم کو محض فضائلِ اہلِ بیت کرام علیہم السلام بیان کرنے کی وجہ سے رافضی قرار دے کر پبلک کو اُن کے علم و فضل سے محروم کرنے کے مرتکب تو نہیں ہو رہے؟

وسعت و برداشت کہاں گئی؟

یہ بات حق ہے کہ مسئلۂ تفضیل یا افضلیت عوامی سطح کے مسائل میں سے نہیں۔ اس لیے اسے احاطۂ تحریر سے میدانِ تقریر میں لانا چنداں مناسب نہیں، لیکن اگر کوئی شخص اس مسئلہ کو عوام میں لاتا ہے تو اُسے چاہیے کہ وہ اس کو اِس کے تمام پہلوؤں کے ساتھ لائے، اور اس کے ظنی ہونے، اس پر سکوت ہونے اور اس پر توقف ہونے کے اقوال کو بھی سامنے لائے، اور سمجھائے کہ کسی مسئلہ پر توقف اور سکوت کیوں ہوتا ہے؟ یا ایک ہی مسئلہ میں بعض ظنیت کا اور بعض قطعیت کا قول کرتے ہیں، اس اختلاف کی وجہ کیا ہوتی ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسی وضاحت سے دلائلِ افضلیت کا تعارض سامنے آئے گا تو بالآخر بات توقف و سکوت پر آٹھہرے گی اور امام معمر بن راشد اور دوسرے ائمہ کی طرح کہنا پڑے گا کہ جو جس کو افضل سمجھے ہم اسے موردِ طعن نہیں ٹھہرا سکتے۔ اگر غور کیا جائے تو یہ قول جہالت کی دلیل نہیں بلکہ وسعتِ مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

دیکھیے! سیدنا علی ؓ چوتھے نمبر پر خلیفہ ہوئے لیکن صحابہ کرام ؓ سے لے کر اب تک کسی بھی زمانے کی کتب کھنگال لی جائیں تو کوئی دور بھی ایسا نہیں ملے گا جس میں سیدنا علی ؓ کو چوتھا خلیفہ ماننے کے باوجود اُن کی افضلیت کی بات کرنے والے یا اس مسئلہ پر سکوت و توقف وغیرہ کے قائلین نہ رہے ہوں۔

کیا قطعیت، ظنیت، سکوت اور توقف مترادف المعنیٰ ہیں؟

غور طلب پہلو یہ ہے کہ اِس مسئلہ کو اجماعی اور قطعی جنہوں نے کہہ دیا سو کہہ دیا لیکن جس کسی کی نگاہ بھی اس سے آگے گئی تو اس کا سبب لکیر کا فقیر ہونا نہیں بلکہ وسعتِ مطالعہ ہے۔ چنانچہ کتبِ اہل سنت میں اس مسئلہ کو احاطۂ تحریر میں لانے کے دو انداز پائے جاتے ہیں۔

۱۔ ایک انداز سادہ اور عوام الناس کے لیے ہے، اس میں افضلیت کی ترتیب خلافت کی ترتیب کے مطابق بیان کردی جاتی ہے اور بحث و نظر سے صَرفِ نظر کرلیا جاتا ہے۔

۲۔ دوسرا انداز عالمانہ اور محققانہ ہے، اس میں ہر ایک کی افضلیت پر قرآن و حدیث سے دلائل پیش کیے جاتے ہیں، جن کی روشنی میں کسی ایک کی دوسرے پر کسی پہلو سے افضلیت واضح ہوتی ہے اور محققین اُسے جزوی یا کلی کہہ کر قبول کرتے ہیں۔

اس کو یوں سمجھیے جیسا کہ عوام الناس کی سہولت کی خاطر اہل اسلام میں ہر فقہی مذہب کے پیرو کار اپنی فقہی

کتب سے قرآن وسنت کی روشنی میں نماز وروزہ کے مسائل پر قومی زبان میں چھوٹی سی کتاب ترتیب دے دیتے ہیں۔ مثلاً امام اعظم ابوحنیفہؓ کے پیروکاروں کی کوئی نماز کی کتاب لیجئے تو اُس میں آپ کو سادہ انداز میں مسائل کا اندراج ملے گا جنہیں بہ آسانی عوام الناس یاد کر کے اپنی نمازیں ادا کر لیتے ہیں۔

اس کے علاوہ دوسرا انداز اندراج کا نہیں بلکہ تحقیق کا ہوتا ہے اور جب بات تحقیق کے میدان میں آتی ہے تو پھر خندہ پیشانی سے ہر ایک کی دلیل کو سننا لازم ہوتا ہے اور ہر طرح کی دلیل کا جائزہ لینا بھی ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے یا نہ پڑھنے، رفع یدین کرنے نہ کرنے، ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے یا سینے پر ہاتھ باندھنے وغیرہ کا ذکر چھڑ جائے تو حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی حضرات قرآن وسنت کی روشنی میں اپنے اپنے دلائل لے آتے ہیں۔ پھر کہیں جا کر ناسخ ومنسوخ یا دوسرے پہلوؤں سے دلائل کے وزن اور ترجیحات کو پیش نظر رکھ کر کسی مسئلہ کو عملی زندگی میں لایا جاتا ہے لیکن کوئی امام کسی دوسرے امام کو یا اُس کے پیروکار دوسرے امام کے پیروکاروں کو معاذ اللہ کافر، گمراہ یا اہل سنت سے خارج نہیں سمجھتے۔

بعینہٖ مسئلۂ افضلیت کی نوعیت ہے، اگر کوئی سنی شخص نماز مترجم کی طرح خاموشی سے اس مسئلہ کے معروف پہلو پر گامزن رہے تو فبہا ورنہ عند التحقیق یہ مسئلہ ذو وجوہ ہے اور اس میں دلائل باہم متعارض ہیں۔ اگر اس میں دلائل کا باہم تعارض (ٹکراؤ) نہ ہوتا تو اس میں "سکوت، توقف اور ظنی وقطعی وغیرہ اقوال نہ ہوتے۔ کتبِ اہل سنت میں ایسے تمام اقوال کا موجود ہونا اس کے قطعی اور اجماعی ہونے کی نفی کرتا ہے، کیونکہ قطعیت، ظنیت، سکوت وتوقف معنیٰ مترادف نہیں بلکہ مختلف المعنیٰ ہیں، اور اگر کوئی شخص کسی مسئلہ میں اس قدر مختلف اقوال موجود ہونے کے باوجود "اجماعِ امت، اجماعِ امت" اور "قطعی، قطعی" کی رٹ لگاتا رہے تو محض اُس کے رٹا لگانے سے کوئی ظنی، سکوتی اور توقفی مسئلہ قطعی نہیں ہو جائے گا۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ عقائد کی جن کتابوں میں نماز مترجم کی طرح فقط عقائد کا اندراج ہے اُن میں یہ (ظنی، سکوت وتوقف کے) اقوال نہیں ہوتے بلکہ ایسے اقوال فقط شروح اور بحث ونظر والی کتب میں ہوتے ہیں، اور ایسی کتب میں ایک موقف والا دوسرے موقف والے کو کافر، گمراہ یا خارج از اہل سنت نہیں کہتا، کیونکہ اُس کے سامنے ہر طرح کے دلائل ہوتے ہیں اور اُس کی وسعتِ مطالعہ اُسے ایسے اقوالِ شنیعہ سے باز رکھتی ہے۔ کفر وضلالت وغیرہ کے اقوالِ شنیعہ فقط ایسے شخص سے سرزد ہوتے ہیں جس کا مطالعہ نماز مترجم کی طرح عقائد کی بعض کتب تک محدود ہو یا پھر وہ مذہبی تعصب کا شکار ہو۔

خلاصۂ گزارش یہ ہے کہ مسئلۂ افضلیت میں اہل سنت کا کوئی شخص نماز مترجم کی طرح معروف ترتیب پر قائم رہے تو اُس پر کوئی قدغن نہیں لیکن اگر کوئی شخص یہ جان لے کہ یہ مسئلہ قطعی نہیں، اس پر اجماعِ امت نہیں بلکہ یہ ظنی ہے اور اس پر سکوت وتوقف ہے تو وہ لٹھ بردار ٹولے سے دست بردار ہو جائے گا اور وسعتِ مطالعہ کے ہاتھوں مجبور ہو کر فتویٰ بازی اور فتویٰ بازوں سے دور ہو جائے گا۔

یہاں بندہ کی اہل علم اور اہل مطالعہ سے گزارش ہے کہ وہ مذکورہ بالا چاروں اقوال میں غور فرمائیں کہ ظنی، سکوت اور توقف کے مطلب میں کتنا فرق ہے؟ پھر یہ بھی غور فرمائیں کہ اِن تینوں اقوال کے مقابلے میں ''قطعیت'' کا قول تنہا ہے، اور اگر مزید زحمت گوارا فرمائیں تو ذرا شمار فرمالیں کہ ظنیت، توقف اور سکوت کے قائلین کتنے ہیں اور قطعیت کے قائلین کتنے ہیں؟

نیاز مند یقین سے عرض کرتا ہے کہ اگر کسی اہل علم نے اِس میں غور فرمایا تو وہ دلائل کے تعارض پر پہنچ جائے گا، اور اگر اُس نے دلائل کے تعارض میں غور فرمایا تو وہ واپس ظنیت، توقف اور سکوت کے اقوال پر آجائے گا، اور اگر کسی نے ان اقوال سے صَرفِ نظر کیا اور قطعیت پر ہی اڑ گیا تو اُس کی ساری زندگی فتویٰ بازی اور مناظرہ بازی میں گزر جائے گی، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ مناظرہ بازی سے معاملہ سلجھتا کم ہے اور الجھتا زیادہ ہے۔

اسلوبِ کتابِ ھذا کے بارے میں وضاحت

مذکورہ بالا گزارش سے ہی واضح ہو گیا ہوگا کہ کتابِ ھذا کی تشریح میں اندراجِ فضائل کا نہیں بلکہ بحث وتحقیق کا اسلوب مدنظر رکھا گیا ہے، لہٰذا اس کا مطالعہ کرنے والے انسان کو تین باتوں کا خیال رکھنا چاہیے:

۱۔ اس کتاب کا متن فضائلِ مرتضوی پر مبنی ہے،

۲۔ اس کی تشریح میں فضائلِ مرتضوی ہی کو اجاگر کیا گیا ہے اور معذرت خواہانہ انداز میں جو خلطِ مبحث کیا جاتا ہے اُس سے اجتناب کیا گیا ہے۔

۳۔ جن لوگوں نے فضائل وخصائص مرتضوی کو دھندلانے کے لیے تاویلات وتلبیسات سے کام لیا ہے ہم نے کامل متانت وسنجیدگی سے اُن کا تعاقب کیا ہے اور سنتِ نبوی ﷺ کی پیروی میں فضائل وخصائصِ مرتضوی کے بیان واثبات کا اہتمام کیا ہے۔

لہٰذا اس کا مطالعہ اسی نقطۂ نظر سے کیا جائے، اسے محض فضائل کے اندراج کا مجموعہ نہ سمجھا جائے اور اِس کو

اُس وسعتِ ذہنی وقلبی کے ساتھ پڑھا جائے جو تحقیقی مباحث کے لیے شرط کا درجہ رکھتی ہے۔ اگر کسی شخص نے اس مطلوبہ ذہنی وسعت سے عاری ہو کر اس کتاب کا مطالعہ کیا تو اُس کا حال اُس محدود المطالعہ شخص کی طرح ہوگا جس نے کسی مخصوص فقہی مذہب کے مطابق نماز مترجم یاد کر رکھی ہو پھر اُس کے سامنے دوسرے فقہی مذاہب کے مطابق نماز کی کوئی کتاب آجائے تو وہ حواس باختہ ہو کر اُسے جھٹلانے کے درپے ہو جائے اور کہنا شروع کر دے کہ: ''ہم نے تو آج تک ایسا نہیں سنا'' خود سوچیے! کیا اُس کا آج تک نہ سننا حنفی، شافعی، مالکی حنبلی اور زیدی کسی بھی فقہی مذہب کے بطلان کی دلیل ہو سکتا ہے؟

جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا کہ کچھ کتب ایسی ہوتی ہیں جن میں مسائل اور فضائل کا فقط اندراج ہوتا ہے اور بعض ایسی ہوتی ہیں جن میں ہر ہر مسئلہ یا فضیلت پر بحث ونظر کا اہتمام ہوتا ہے۔ اردو داں حضرات اندراج اور بحث ونظر کے مابین فرق کو سمجھنا چاہیں تو علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ کی مشہور کتاب ''بہار شریعت'' پھر اُن ہی کی کتاب ''فتاوی امجدیہ'' کا مطالعہ فرمائیں۔ قلیل الفرصت قارئین فقط (بہارِ شریعت جلد اول حصہ سوم ص ۱۳۳ وحصہ پنجم ص ٥٤) میں مسجد میں سوال کرنے اور سائل کو دینے کی ممانعت اور اُس کا گناہ پڑھ لیں، پھر اسی مسئلہ میں جواز کی صورتوں کے لیے (فتاوی امجدیہ ج ۱ ص ۲٥۱ تا ۲٥٥) کا مطالعہ فرمائیں۔

اس سے اُن پر واضح ہو جائے گا کہ جب کوئی مسئلہ یا فضیلت محض تذکرہ اور اندراج کے دائرہ سے نکل کر دلائل وابحاث کے میدان میں آجائے تو اس میں کس قدر وسعت آجاتی ہے اور پھر اُس کے لیے ذہنی وسعت کتنی درکار ہوتی ہے؟ یہ تو محض ایک مثال ہے، اگر انسان اس نہج پر مطالعہ کو وسعت دے اور اصل مآخذ کی طرف رجوع کرے تو یقیناً وہ تنگ نظری اور فتویٰ بازی کی لعنت سے نکل جاتا ہے۔

راقم الحروف نے محض اسی جذبہ سے سیدنا علی ﷺ کے فضائل وخصائص کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ صحابہ کرام ﷺ کے فضائل ومناقب میں اقوالِ مشہورہ کے مقابلہ میں اگر کوئی شخص محققین کے دوسرے اقوال بھی سامنے لائے تو اُنہیں خندہ پیشانی سے قبول کیا جائے اور انصاف پسند انسان اس نتیجہ پر پہنچ سکے کہ عام مقررین اور عوام الناس میں جو اقوال مشہور ہیں دلائل کی دنیا میں اُن کے مقابلہ میں دوسرے اقوال بھی ہیں، اور پھر وہ خود فیصلہ کر سکے کہ جب اس قدر دوسرے اقوال اور مواقف کی گنجائش ہے تو کسی کو رافضی، گمراہ یا خارج از اہل سنت سمجھنا کیونکر جائز ہے؟

ذکرِ اہلِ بیت سے اجتناب کی وجوہ

ہمارے اکثر حضرات دوسرے اربابِ فضل کے ذکر کے ساتھ تو اہل بیت کا ذکر کرتے ہیں مگر خالصۃً اور تنہا ذکرِ اہلِ بیت سے اجتناب کرتے ہیں، جس کی بہ ظاہر دو وجہیں ہیں:

۱۔ اولاً اس لیے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ انہیں شیعہ گمان کیا جائے گا،

کافی حد تک یہ خیال درست ہے، جیسا کہ آپ ابھی ابھی پڑھ چکے ہیں کہ ماضی بعید میں بعض لوگوں نے اپنے محدث کو تنہا ذکرِ علی ﷺ کرنے پر دجال کہہ دیا، اور یہ بھی پڑھ چکے ہیں کہ حدیث الطائر املاء کرانے پر امام ابن السقاء رحمۃ اللہ علیہ پر حملہ کر دیا گیا، انہیں مجلس سے اٹھا دیا گیا اور اُن کے بیٹھنے کی جگہ کو دھو یا گیا۔

۲۔ ثانیاً اس لیے کہ اس سے شیعہ فائدہ اٹھائیں گے۔

اس سلسلے میں پہلے خدشہ کے بارے گزارش ہے کہ اس الزام سے پہلے بھی کوئی محبّ اہل بیت محفوظ نہیں رہ سکا حتیٰ کہ امام اعظم ابو حنیفہ اور امام شافعی بھی اس الزام سے نہیں بچ سکے، جیسا کہ آپ کتاب کے اندر ملاحظہ فرمائیں گے۔

دوسرے خدشہ کے بارے میں عرض ہے کہ باطل فرقوں نے اور کس بات یا کتاب سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی؟ خود قرآن کریم سے باطل فرقوں نے اس قدر ناجائز استدلال کیے ہیں جو شمار سے بھی باہر ہیں، تو پھر کیا قرآن کریم کی اشاعت روک دی جائے؟ فضائل وحقائقِ اہل بیت میں اگر کوئی بات سچ اور حق ہو تو اُس کے بیان سے فقط اس لیے رک جانا کہ اُس سے کوئی دوسرا فرقہ فائدہ اٹھالے گا کہاں کی دانشمندی ہے؟ ایسی تلقین کہ تم نے فلاں بات جو بیان کی ہر چند کہ حق ہے لیکن اسے اس لیے بیان نہیں کرنا چاہیے تھا کہ اس سے فلاں فرقہ کو فائدہ پہنچے گا، کوئی نئی بات نہیں، اس سے پہلے بھی ایسے لوگ گزر چکے ہیں جو کسی فرقہ کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسی حق بات کے بیان کو پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ صحیح مسلم اور سنن اربعہ کے راوی سلمہ بن شبیب متوفّٰی ۲۴۷ھ نے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو کہا:

> ”اے ابو عبداللہ! آپ نے رافضیوں کے دلوں کو قوی کر دیا جب آپ نے اہل خراسان کو حج تمتع کے حق میں فتویٰ دیا۔ اس پر امام احمد ﷺ نے فرمایا: اے سلمہ! مجھے تیرے بارے میں خبر پہنچی تھی کہ تو احمق ہے، لیکن میں تیرا دفاع کرتا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ واقعی تو احمق ہے۔ میرے پاس حج

تمتع کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی گیارہ احادیث ہیں، کیا میں اُن سب کو تیرے قول کی وجہ سے ترک کر دوں؟"۔

(مجموعة الفتاوی لابن تیمیة ج٢٦ ص٥٤ وط: ج٢٦ ص٣٣؛ منهاج السنة النبوية ج٤ ص١٥٢، وط: ج٢ ص٦١٤)

بتلایئے! جن لوگوں کے نزدیک تنہا ذکرِ مرتضوی رافضیت ٹھہرے، جن کے ہاں شانِ مرتضوی پر مبنی حدیث الطائر کا بلا تشریح فقط املاء کرانا رافضیت ہو اور جن کے نزدیک کسی فقہی مسئلہ میں شیعہ سے موافقت ہو جانا رافضیت قرار پائے تو ایسے لوگوں کو کہاں تک راضی کیا جا سکتا ہے؟ آپ حیران ہوں گے کہ ایک مرتبہ مشہور ترین محدث امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ نے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے امام محمد بن ادریس شافعی رضی اللہ عنہ کو فقط اس لیے شیعہ قرار دے دیا کہ اُنہوں نے اپنی کتاب "الأُمّ" میں ایک مسئلہ میں فقط سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی سیرت واقوال سے ہی استدلال کیا۔ اس پر امام احمد بن حنبل نے اُن کی گرفت کی اور مسئلہ کی نوعیت واضح فرمائی تو وہ شرمندہ ہو گئے۔ مکمل تفصیل کے لیے "شرح خصائص علي رضی اللہ عنہ" الطبعة الرابعة ص١٠٤٥، ١٠٤٦ " کا مطالعہ فرمائیں۔

ماوشما کی کیا حیثیت ہے، ایسے لوگ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی راضی نہیں تھے۔ چنانچہ امام طبرانی لکھتے ہیں:

أن مروان بن الحكم أتى أبا هريرة في مرضه الذي مات فيه، فقال مروان لأبي هريرة: ما وجدتُ عليك في شيء منذ اصطحبنا إلا في حبك للحسن والحسين، قال: فتحفز أبو هريرة فجلس......".

"مروان بن الحکم حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی اُس بیماری میں اُن کے ہاں آیا جس میں اُن کا انتقال ہوا تھا تو مروان نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے کہا: جب سے آپ کی اور ہماری سنگت ہوئی ہے، میں نے آپ کے اندر کوئی عیب نہیں پایا، ماسوا اس کے کہ آپ حسن اور حسین سے محبت کرتے ہیں۔ راوی کہتے ہیں: اس پر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اچھل کر اٹھ بیٹھے، پھر حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کے ساتھ نبی کریم ﷺ کی محبت کا ایک عملی واقعہ بیان کیا اور آخر میں فرمایا: **فأنا لا أحب هذين وقد رأيتُ هذا من رسول الله ﷺ.** (تو کیا میں ان دونوں سے محبت نہ کروں، حالانکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یوں محبت کرتے ہوئے دیکھا ہے؟"۔

(المعجم الكبير ج٢ ص١٨٤ حديث ٢٥٩٠، وط: ج٣ ص٤٤، حديث ٢٦٥٦؛ الشريعة للآجري ج

۳ص ٣٠٤، حديث ١٦٩٨؛ تاريخ دمشق ج١٣ ص (٢٢١، ٢٢٢)

حافظ ہیثمی فرماتے ہیں: اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں۔

(مجمع الزوائد ج٩ ص ١٨٠ و ط: ج٩ ص٢٨٨ حديث ١٥٠٧١ و ط: ج٩ ص ٢٠٨ حديث ١٥٠٧١)

کیا سید الانبیاء ﷺ ناکام نبی تھے؟

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ محبت اہل بیت علیہم السلام کو عیب سمجھنے کی گندی ذہنیت شروع سے آ رہی ہے، لہٰذا اعتراضات سے بچنے کے لیے ذکر اہل بیت کرام علیہم السلام کو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ معیوب چیز ذکر اہل بیت، حُبِّ اہلِ بیت یا افضلیتِ اہل بیت نہیں بلکہ اُن کی محبت کی آڑ میں صحابہ کرام ﷺ کے بارے میں ناحق بات کرنا معیوب ہے۔

اس حدیث سے سیدنا ابو ہریرہ ﷺ کی حق گوئی اور اُن کی اہل بیت کے ساتھ ایسی محبت کا اظہار بھی ثابت ہوتا ہے جو اُموی گورنر مروان جیسے شخص پر بھی مخفی نہ رہ سکی، حالانکہ حضرت ابو ہریرہ ﷺ مروان کے عمال میں سے تھے۔ لیکن افسوس کہ ایسی روایات کے باوجود بعض لوگ جس طرح مروان کے ساتھ بغض رکھتے ہیں اُسی طرح حضرت ابو ہریرہ ﷺ کے ساتھ بھی بغض رکھتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے بغض رکھنے والے لوگوں کے پاس اگر عقل نام کی کوئی چیز ہوتی تو وہ ان کی تحسین کرتے، کیونکہ یہ بہت مشکل تھا کہ کوئی شخص بنوامیہ کی حکومت کا حصہ ہو اور ناصبیت سے پاک ہو۔ چنانچہ شیخ بدر بن ناصر العواد، خالد بن عبداللہ القسری کے حالات میں لکھتے ہیں:

خالد من كبار رجالات الدولة الأموية، وقل أن يسلم هؤلاء من لوثة النصب.

''خالد اموی حکومت کے کبار لوگوں میں سے تھا، اور بہت کم ہی ایسے لوگ ناصبیت کی آلودگی سے محفوظ ہوتے ہیں''۔

(النصب والنواصب ص ٣٥١)

مگر قربان جاؤں کہ سیدنا ابو ہریرہ ﷺ مروان کے عامل ہونے کے باوجود حسنین کریمین کے قدمین شریفین اپنے عمامہ سے صاف کرتے تھے، یہی محبت بھرا انداز مروان ملعون کو برا لگا تو وہ سیدنا ابو ہریرہ ﷺ پر اُن کی زندگی کے آخری لمحات میں بھی طعن سے باز نہ آیا۔ لیکن روافض سے حسنِ ظن کی امید کہاں، اُن کے مذہب کے

مطابق تو دو چار کے علاوہ باقی تمام صحابہ کرام معاذ اللہ غدار تھے۔ اگر ان عقل کے اندھوں کی بات درست ہو تو پھر تو معاذ اللہ ہمارے نبی کریم ﷺ جیسا کوئی ناکام نبی ہی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ جس ہستی نے قیامت تک کے لیے تمام امور کی اطلاع دی کیا اُنہیں اتنا بھی علم نہ ہو سکا کہ دنیا میں جو لوگ اُن کے زیادہ قریب رہے وہ خاکم بدہن اُن کی آستین کے سانپ تھے؟ ہمارا ایمان ہے کہ ہمارے نبی ﷺ بعطائے الٰہی عالم الغیب ہیں اس لیے آپ نے جن حضرات کی خلافتِ راشدہ کے متعلق اشارات و کنایات فرمائے وہ حق پر قائم تھے اور اُن کی خلافت برحق تھی اور جو لوگ اُن کے منکرین و مبغضین ہیں وہ جادۂ حق سے دور ہیں۔

حوالہ جات کے متعلق چند گزارشات

۱۔ اس فقیر نے کسی حدیث یا قول پر متعدد کتب کے حوالے قلم بند کیے ہیں، جس کتاب کا نام اولاً درج کیا گیا ہے مذکور الصدر الفاظ اسی سے منقول ہیں، اور اُس کے بعد والی اکثر کتب بھی الفاظ کے لحاظ سے اُس کے موافق ہیں اور مفہوم میں تو سب حوالے موافق ہیں۔

۲۔ چونکہ الحمد للہ میرے پاس کافی کتابوں کے متعدد ایڈیشن موجود ہیں اس لیے میں نے اکثر مقامات پر "وط:" کی رمز سے ایک ہی کتاب کے مختلف مطابع درج کر دیے ہیں تاکہ اِن میں سے کسی صاحب کے پاس جس مطبعہ کی کتاب موجود ہو وہ اسی کی طرف مراجعت کر لے۔ لہٰذا قارئین کرام کے سامنے جب ایسی صورت آئے تو وہ کتاب کے آخر میں مآخذ و مراجع میں جا کر مطلوبہ کتاب کے مطابع کی ترتیب میں غور فرمائیں۔ مثلاً "مسند أحمد" کے حوالہ جات میں سب سے پہلے اُس قدیم نسخہ کو رکھا گیا جو ترقیمِ حدیث کے بغیر ہے اور "المكتب الإسلامي" یا "المطبعة الميمنية" کا مطبوعہ ہے، دوسرے نمبر پر "عالم الكتب" کے مطبوعہ نسخہ کو رکھا گیا ہے، تیسرے نمبر پر شیخ شعیب الأرنؤوط کی تحقیق سے مطبوعہ نسخہ کو رکھا گیا ہے، چوتھے نمبر پر شیخ احمد شاکر کی تحقیق والا نسخہ رکھا گیا ہے اور بعض مقامات پر "دار المنهاج" سے شائع شدہ نسخہ کا حوالہ بھی درج کیا گیا ہے، لیکن بعض مقامات پر لائبریری سے دوری کے باعث ایک آدھ حوالہ پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔ علیٰ ھذا القیاس ہمارے پاس جو بھی کتاب متعدد مطابع کے ساتھ موجود ہے اُس کے حوالہ جات میں وہی ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے جو مآخذ و مراجع میں درج کی گئی ہے۔ إلا ماشاء الله.

اعتذار

آخر میں اس فقیر کی مجھ ایسے قارئین سے گزارش ہے کہ اُن کے سامنے کتابت وکمپوزنگ کی جو اغلاط آئیں تو وہ مجھے ضرور اطلاع فرمائیں اور اربابِ انصاف اہلِ علم سے اپیل ہے کہ اگر اُن کے سامنے میری کوئی ایسی بات آئے جو کتاب وسنت اور امت کے قطعی اجماع کے خلاف ہو تو برائے کرم تحریری طور پر مجھے ضرور آگاہ فرمائیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ مجھے باطل کو ترک کر کے حق کی طرف رجوع کرنے والا پائیں گے۔

چونکہ یہ عاجز اپنی ہر کتاب کے آخر میں یہی اپیل کرتا ہے، لہٰذا میری اپیل کو رسم نہیں بلکہ حقیقت سمجھا جائے، اور جذبۂ اصلاح کے ساتھ مجھے میرے موقف کے خطا ہونے پر آگاہ کیا جائے۔ بعض لوگ سیاق وسباق کا لحاظ کیے بغیر کسی کی تحریر سے ادھورے جملے اُچک لیتے ہیں اور اُن پر کچھ تحریر کر دیتے ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنا کام کر دیا ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ ایسی دم بریدہ تحریریں میرے خلاف بھی شائع ہوئی ہیں لیکن مجھے ایسی کسی بھی تحریر کی کوئی پروا نہیں ہے، ہاں اگر کسی پیکرِ حق نے تحریری طور پر دلائل کے ساتھ مجھ پر میرے کسی موقف کا بطلان واضح کر دیا تو میں ضرور رجوع کروں گا۔ اس لیے کہ جہاں مجھے اپنی بے بضاعتی پر یقین ہے وہیں "فَـوْقَ كُـلِّ ذِيْ عِلْـمٍ عَلِيْـمٌ" پر بھی ایمان ہے، اور ان ساری باتوں سے اہم بات یہ ہے کہ میں دنیوی آسودگی پر قبر و آخرت کی آسودگی کو ترجیح دیتا ہوں۔ وَاللّٰهُ تَعَالٰى أَعْلَمُ، وَهُوَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ.

فضائل کا تعلق بیان سے یا تنازع سے؟

آخر میں راقم الحروف کی گزارش ہے کہ فضائل بیان کرنے کے لیے ہوتے ہیں تنازع کے لیے نہیں، لہٰذا جس بلند مرتبہ ہستی کے فضائل بیان کرنا ہوں بلا تقابل اُس کے فضائل بیان کر دیے جائیں اور کسی دوسری ہستی پر تعریض وغیرہ سے کلیۃً اجتناب کیا جائے۔

عصرِ حاضر میں ہمارا ملک خصوصاً اور دنیائے اسلام عموماً خطرات سے دوچار ہے، ایسے میں ہم لوگ مزید انتشار کا سبب بنیں تو یہ کسی طرح درست نہیں۔ یا اللہ! ہمارے افتراق کو اتحاد میں اور ہماری نفرت کو محبت میں بدل دے۔ آمین، آمین، برحمتك یا أرحم الراحمین۔

> نوٹ: آئندہ سطور میں عربی اور اُس کے نیچے جو حصہ [Under line] کیا گیا ہے وہ کتاب کا متن اور ترجمہ ہے، اور جو کچھ اُس کے علاوہ ہے وہ شرح ہے۔ شرح میں فقط بعض اہم جملوں کو انڈر لائن کیا گیا ہے۔

بسم الله الرحمن الرحيم

قال سيدنا ومولانا وشيخنا الإمام، العلامة الحافظ، المقرئ المحدث شمس الدين أبو الخير محمد بن محمد بن الجزري الدمشقي، فسح الله في مدته وأعاد من بركاته.

ہمارے شیخ سیدنا و مولانا امام، علامہ، الحافظ المقری، محدث شمس الدین ابوالخیر محمد بن محمد الجزری، الدمشقی، اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں اضافہ فرمائے اور ان کی برکتیں لوٹائے، نے فرمایا:

الحمد لله على أن هدانا لِدينِ الإسلام ووفّقَنَا لِسنةِ نبيه عليه أفضل الصلاة والسلام وحبانا بمحبة أهل بيته الكرام وصحابته نجوم الهدي الأعلام عليه وعليهم أفضل صلاة وأكمل سلام إلىٰ يوم القيامة، ندخرها أماناً للفزع الأكبر من هول ذلك المقام:

اس بات پر اللہ تعالیٰ کی حمد ہے کہ اس نے ہمیں دینِ اسلام کی ہدایت سے بہرہ ور فرمایا اور اپنے نبی کریم علیہ افضل الصلاۃ والسلام کی سنت کی اتباع کی توفیق عطا فرمائی، اور آپ کے اہل بیت کرام اور نجوم ہدایت صحابۂ اعلام (آپ پر اور ان سب پر قیامت تک افضل درود اور اکمل سلام ہوں) کی محبت عنایت فرمائی۔ ہم اس محبت کو قیامت کے ہولناک دن کی بڑی گھبراہٹ کے لیے ذخیرہ کرتے ہیں۔

اہل اللہ کی محبت کامیابی کی ضمانت

مصنف رحمۃ اللہ علیہ کا یہ جملہ انتہائی عظیم اور وقیع ہے:

”ہم اِس محبت کو قیامت کے ہولناک دن کی بڑی گھبراہٹ کے لیے ذخیرہ کرتے ہیں“۔

بلاشبہ یہی چیز کام آئے گی، کیونکہ اہل اللہ کی محبت سے جتنا عرفانِ الٰہی نصیب ہوتا ہے اتنا کسی دوسرے عمل سے نہیں ہوتا۔ اسی لیے ہر نماز میں اہل اللہ کی راہ پر چلنے کی دعا کی جاتی ہے، اور حدیث پاک میں ہے کہ اہل اللہ کی محبت ہر حال میں فائدہ مند ثابت ہوگی: "اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ" (بندہ اپنے محبوب کے ساتھ ہوگا)۔ اسی لیے مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے کامل یقین کے ساتھ اس محبت کو اپنے لیے ذخیرہ کیا ہے۔ یہ بڑی مبارک نیت ہے، بلاشبہ

بعد از انبیاء کرام علیہم السلام اہل بیت کی محبت ہی دنیا و آخرت کی عظیم متاع ہے۔ دعا ہے کہ اُس ہولناک دن کے لیے اس محبت کو اللہ تعالیٰ مصنف کے ساتھ ساتھ اس احقر اور اہل محبت قارئین کے لیے بھی ذخیرہ فرمائے، آمین۔

وبعد فهٰذه أحاديث مسندة مما تواتر وصح، وحسن مِن أسنىٰ مناقب الأسدِ الغالب مفرق الكتائب ومظهر العجائب، ليث بني غالب أمير المؤمنين علي بن أبي طالب كرم اللّٰه تعالىٰ وجهه، ورضي عنه وأرضاه، أردفتها بمسلسلات من حديثه، وبمتصلات من روايته، وتحديثه، وبأعلى إسناد صحيح إليه من القرآن والصحبة والخرقة التي اعتمد فيها أهل الولاية عليه، نسأل اللّٰه أن يثبتنا على ذلك ويقربنا به إليه.

حمد وصلاۃ کے بعد عرض ہے کہ یہ چند باسند احادیث اسد اللہ الغالب، دشمنوں کے صف شکن، مظہرِ عجائب، شیرِ بنی غالب، امیر المومنین علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ ورضی اللہ عنہ وارضاہ کے بلند فضائل پر مشتمل ہیں، جن میں سے بعض متواتر، بعض صحیح اور بعض حسن ہیں۔ میں نے انہیں اُن کی احادیث مسلسلہ سے سماعاً اور تحدیثاً منتخب کیا ہے، یہ احادیث قرآن، صحبت اور خرقہ کے بیان میں اُن تک ایسی اعلیٰ اور صحیح سند کے ساتھ پہنچتی ہیں جن پر اولیاء کرام نے اعتماد فرمایا ہے۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس پر قائم رکھے اور اسی کے طفیل اپنا قرب بخشے۔

أخبرنا جماعة من شيوخنا الثقات، منهم القاضي عز الدين أبو عبداللّٰه محمد بن موسىٰ بن سليمان الأنصاري رحمه اللّٰه، فيما شافهنا به بدار الحديث الأشرفية داخل دمشق المحروسة، عن الشيخ الإمام أبي الحسن علي بن أحمد بن عبد الواحد المقدسي، قال: أخبرنا الإمام أبو الفتوح أسعد بن محمود العجلي في كتابه، أخبرنا أبو القاسم إسماعيل ابن محمد الحافظ، أخبرنا أبوبكر أحمد بن علي بن عبد اللّٰه الشيرازي، أخبرنا محمد بن عبد اللّٰه الحافظ، قال: سمعتُ أباالحسن علي بن الحسن الجراحي يقول: سمعتُ أبا حامد محمد بن هارون الحضرمي يقول: سمعتُ محمد بن منصور الطوسي، يقول: سمعتُ أحمدَ بن حنبل يقول:

ما جاء لأحد من أصحاب رسول اللّٰهﷺ من الفضائل ما جاء لعلي بن أبي طالب ؓ.

’’ہمیں ہمارے مشائخ کی معتبر جماعت نے بیان کیا ہے، اُن میں ایک قاضی عز الدین ابو عبد اللہ محمد بن موسیٰ بن سلیمان انصاری رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔ ہم نے دمشق کے اندر ’’دار الحدیث اشرفیہ‘‘ میں براہِ راست امام

ابوالحسن علی بن احمد بن عبدالواحد مقدسی سے سنا، انہوں نے فرمایا: ہمیں امام ابوالفتوح اسعد بن محمود العجلی نے اپنے ایک مکتوب میں بیان کیا، اُنہوں نے فرمایا: ہمیں حافظ ابوالقاسم اسماعیل بن محمد نے بیان کیا، انہوں نے فرمایا: ہمیں ابوبکر احمد بن علی بن عبداللہ الشیرازی نے بیان کیا، انہوں نے فرمایا: ہمیں حافظ محمد بن عبداللہ نے بیان کیا، انہوں نے فرمایا: ہمیں ابوالحسن علی بن الحسن الجراحی نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں: میں نے ابوحامد محمد بن ہارون الحضرمی سے سنا، وہ فرماتے ہیں: میں نے محمد بن منصور الطوسی سے سنا، وہ فرماتے ہیں: میں نے امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی کے اتنے فضائل نہیں آئے جتنے سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے آئے ہیں"۔

(المستدرك ج٣ص١٠٧ وط: ج٤ص٦٩، حديث٤٦٢٨؛ تهذيب التهذيب ج٥ص٧٠١؛ المنح المكية لابن حجر مكي ص٥٧٨؛ الصواعق المحرقة ص١٢٠، التراتيب الإدارية للكتاني ج٢ص ٢٥١؛ شرح سنن النسائي للسندهي ج١ص٨٦)

شانِ مرتضوی میں احادیث کی کثرت

جاننا چاہیے کہ جب کسی معتبر محدث سے ایسا دعویٰ منقول ہو تو اس سے احادیثِ صحیحہ مراد ہوتی ہیں نہ کہ احادیثِ موضوعہ، اسی لیے بعض محدثین کرام نے لفظ "أسانيد جيدة" اور "أسانيد حسان" کی تصریح بھی فرمائی ہے، چنانچہ امام ابن عبدالبر، حافظ ابن حجر عسقلانی اور دوسرے حضرات لکھتے ہیں:

قال أحمد بن حنبل وإسماعيل القاضي: لم يرو في حق أحد من الصحابة بالأسانيد الحسان [الاستيعاب] بالأسانيد الجياد [فتح الباري] أكثر ما جاء في علي، وكذلك قال أحمد بن شعيب بن علي النسائي رحمه الله.

"امام احمد اور امام اسماعیل القاضی رحمۃ اللہ علیہما نے فرمایا: عمدہ سندوں کے ساتھ جس کثرت سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شان میں احادیث آئیں اتنی کسی دوسرے صحابی کی شان میں نہیں آئیں، اور اسی طرح امام احمد بن شعیب بن علی النسائی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے"۔

(الاستيعاب ج٣ص٢١٣؛ التوضيح لابن الملقن ج٢٠ص٣٠٤؛ فتح الباري ج٧ص٤٣٤؛

جواهر العقدين للسمهودي ص ۲۵۱؛ المنح المكية لابن حجر مكي ص ۵۷۸؛ الصواعق المحرقة ص ۱۲۰؛ مرقاة شرح المشكاة ج ۱۰ ص ۴۵۳؛ فيض القدير ج ۸ ص ۴۰۴۲؛ مطلع القمرين للبريلوي ص ۵۷،۵۶؛ تحفة الأحوذي للمبارك فوري ج ۱۰ ص ۱۹۷)

بعض لوگ اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ چونکہ سیدنا علی ﷺ کے دور میں اُن کے دشمن بہت تھے اس لیے اہلِ اسلام نے اُن کی شان میں واردشدہ احادیث کو بیان کرنے میں خاصی دلچسپی لی تو اُن کے فضائل میں احادیث کی کثرت ہوگئی، ورنہ اُن سے ماقبل خلفاء ثلاثہ ﷺ کی شان میں بھی اُن کے برابر بلکہ اُن سے بھی زیادہ احادیث ہیں۔ میں عرض کرتا ہوں کہ یہ تبصرہ خلافِ واقعہ ہے، اس لیے کہ جس دور میں سیدنا علی ﷺ کی شان میں محدثین صحابہ، تابعین اور اتباعِ تابعین ﷺ احادیث کی تخریج فرمارہے تھے بالکل اُسی دور میں کذاب لوگ بعض لوگوں کی شان میں اپنی طرف سے روایات گھڑ رہے تھے۔ پھر یہ بات بھی ظاہر ہے کہ اُسی دور میں خلفاء ثلاثہ ﷺ کے دشمن بھی موجود تھے، تو کیا جب ایک طرف احادیث گھڑنے کا مشکل عمل جاری تھا تو دوسری طرف خلفاء ثلاثہ ﷺ کے فضائل میں پہلے سے موجود احادیث صحیحہ اور حسنہ کو منظرِ عام پر لانے کا آسان عمل نہیں ہوسکتا تھا؟

اس سلسلے میں صحیح اور بلا تکلف بات یہ ہے کہ سیدنا علی ﷺ کے فضائل میں احادیث صحیحہ، جیدہ اور حسنہ کی کثرت کا سبب جہاں اُن کے معاندین کا عناد ہے وہیں اس کا سبب اُن پر وہ انعام بھی ہے جسے امام محمد بن اسحاق بن یسار ﷺ متوفّٰی ۱۵۰ نے بیان فرمایا ہے، اور اُس کا مفہوم یہ ہے کہ سیدنا علی ﷺ کو اُن کے بچپن میں آغوشِ نبوی ﷺ میسر آگئی تھی، جس کی بدولت وہ ہر فضیلت میں سبقت لے گئے۔ اس حقیقت کو بعض صحابہ کرام ﷺ نے اچھوتے انداز میں بیان کیا ہے، امام محمد بن عمر ابن البختری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

أخبرنا فطر، قال: سمعت أبا الطفيل يقول: قال بعض أصحاب النبي ﷺ: لقد كان لعلي بن أبي طالب من السوابق ما لو أن سابقة منها بين الخلائق لوسعتهم خيرًا.

”ہمیں فطر بن خلیفہ نے بیان کیا کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے بعض صحابہ کرام ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: سیدنا علی بن ابی طالب ﷺ کے لیے کچھ ایسی سبقتیں ہیں کہ اگر اُن میں سے کوئی ایک سبقت مخلوق میں تقسیم کی جاتی تو وہ اُن کی بھلائی کے لیے وسیع ہوتی“۔

(مصنفات لابن البختري ص ۱۹۷ حديث ۱۶۶؛ المصنف لابن أبي شيبة ج ۱۷ ص ۱۳۴، حديث

۳۲۷۹۰،۳۲۷۹۱ و موطا: ج ۱۱ ص ۱۵۳، حدیث ۳۲۶۶۳ تاریخ دمشق ج ۴۲ ص ۴۱۸)

بعض معاصرین کا امام احمد رضی اللہ عنہ پر حملہ

بعض معاصرین (پیر سائیں غلام رسول قاسمی) کے نزدیک یہ قول تفضیلیت ہے، چنانچہ وہ تفضیلیوں کی جانب سے ساتویں سوال کے طور پر لکھتے ہیں کہ تفضیلیوں کا کہنا ہے:

''کتب حدیث میں مولا علی رضی اللہ عنہ کے فضائل دیگر تمام صحابہ کی نسبت کثرت سے بیان ہوئے ہیں۔ یہ آپ رضی اللہ عنہ کی افضلیت کا ثبوت ہے''۔

(ضربِ حیدری بار پنجم ص ۲۳۹)

پیر سائیں کے نزدیک امام احمد بن حنبل اور دوسرے محدثین کرام کا یہ قول درست نہیں۔ چنانچہ انہوں نے اس قول کی تردید کے لیے بخاری، مسلم، ابوداود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، موطا امام محمد، موطا امام مالک، مسند امام اعظم اور سنن الدارمی سے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور مولیٰ علی رضی اللہ عنہ کی شان میں واردشدہ احادیث کو شمار کیا تو سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں ایک سو ایک (۱۰۱) اور مولیٰ علی رضی اللہ عنہ کی شان میں فقط باون (۵۲) احادیث شمار میں آئیں۔ اس کے بعد پیر سائیں نے فرمایا:

''حدیث کی قدیم ترین کتب اور صحاح ستہ میں فضائل کا نقشہ آپ نے دیکھ لیا۔ باقی تمام کتابیں ان سے نچلے درجے کی سمجھی جاتی ہیں۔ ان نچلے درجے کی کتابوں کا بھی ہم جائزہ لیں تو عین ممکن ہے یہی صورتِ حال سامنے آئے''۔

(ضربِ حیدری بار پنجم ص ۲۴۰)

خیال رہے کہ پیر سائیں بڑی شدت سے ترتیب افضلیت بترتیب خلافت پر کاربند ہیں، لیکن نہ معلوم وہ فقط فضائلِ صدیقی اور فضائلِ مرتضوی پر مشتمل احادیث کے شماریاتی تقابل تک کیوں محدود رہ گئے، فضائلِ فاروق وغنی رضی اللہ عنہما کی احادیث کے تقابل کی طرف کیوں نہیں گئے؟

کیا ائمہ اربعہ رضی اللہ عنہم صحاح ستہ کے پابند تھے؟

امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ نے کسی کتاب کا نام نہیں لیا بلکہ انہوں نے مطلقاً فرمایا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شان میں دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بہ نسبت زیادہ احادیث آئی ہیں، اور مذکورالصدر محدثین کرام اور دوسرے علماء کرام (خواہ

انہیں تفضیلی کہا جائے یا کچھ اور) سبھی امام صاحب کے قول کو نقل کرتے چلے آرہے ہیں، اور بعد والے یہ تمام حضرات مکھی پر مکھی نہیں مارتے رہے بلکہ حقیقت بھی یہی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ امام احمد بن حنبل ؒ کے اس قول کو قبول کرنے کی آخر وجہ کیا ہے؟

جواباً عرض ہے کہ امام احمد بن حنبل ؒ نے صحابہ کرام ؓ کی شان میں ایک کتاب ترتیب دی تھی جس کا نام "فضائل الصحابة" ہے۔ اس وقت اُن پر یہ حقیقت عیاں ہوئی تھی کہ سیدنا علی ؑ کے فضائل میں سب سے زیادہ احادیث ہیں۔ چنانچہ ہم تقابل سے انتہائی شرم محسوس کرتے ہوئے عرض کناں ہیں کہ اس کتاب میں جدید ترقیم کے مطابق خلیفۂ بلافصل و برحق سیدنا ابوبکر صدیق ؓ کی شان میں دوسو پچھتر (275) اور مولیٰ علی ؑ کی شان میں چار سو اڑسٹھ (468) احادیث موجود ہیں۔

بعد میں جو کتابیں صحاح ستہ پر زوائد کی صورت میں وجود میں آئیں یا جو کتابیں صحاح ستہ اور دوسری کتب سے جمع کی گئیں ان سب میں بھی ایسی ہی صورتِ حال ہے۔ چنانچہ مشہور و متداول کتاب "مشكاة المصابيح" میں سیدنا ابوبکر صدیق ؓ کی شان میں پندرہ (15) اور مولیٰ علی ؑ کی شان میں بیس (20) احادیث آئی ہیں "مجمع الزوائد" میں سیدنا صدیق اکبر ؓ کی شان میں ایک سو نو (109) اور مولیٰ علی ؑ کی شان میں تین سو پندرہ (315) احادیث آئی ہیں "المطالب العالية بزوائد المسانيد الثمانية" میں سیدنا صدیق اکبر ؓ کی شان میں چوبیس (24) اور مولیٰ علی ؑ کی شان میں بتیس (32) احادیث آئی ہیں۔ نیز "المصنف لابن أبي شيبة" میں سیدنا ابوبکر ؓ کی شان میں (46) اور مولیٰ علی ؑ کی شان میں (78) احادیث آئی ہیں اور صحاح ستہ کے مصنفین میں سے مشہور محدث شہیدِ اہل بیت امام احمد بن شعیب بن علی النسائی رحمۃ اللہ علیہ نے تو مولیٰ علی ؑ کے خصائص میں مستقل تصنیف فرمائی تھی اور اسی کی پاداش میں انہیں شامی نواصب نے شہید کر دیا تھا، جدید ترقیم (نمبر شمار) کے مطابق اس میں ایک سو اٹھانوے (198) احادیث مرقوم ہیں۔

نوٹ

درج بالا کتب سے احادیثِ فضائلِ صدیقی اور مرتضوی ؑ کی یہ تعداد مکررات کا لحاظ کیے بغیر درج کی گئی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ امام احمد بن حنبل ؒ کے اس قول کو قولاً یا عملاً اُن کے مبارک دور سے لے کر اب تک کسی

نے نہیں جھٹلایا، لیکن خدا جانے کہ اب پندرھویں صدی میں سرگودھا کے سائیں پیر شیخ الحدیث والتفسیر کو کیا مجبوری پیش آئی کہ اُنہوں نے انکار کر دیا؟ خیال رہے کہ اگرچہ بوجوہ پیر سائیں نے امام احمد بن حنبل ﷺ یا کسی دوسرے محدث کا نام نہیں لیا لیکن درحقیقت انہوں نے امام احمد بن حنبل ﷺ ہی کے قول کو جھٹلایا ہے۔ یہاں یہ بھی واضح رہے کہ ائمہ اربعہ ہوں یا باقی اہل اسلام سب حدیث کے پابند تو ہیں مگر کتبِ صحاح اور سنن وغیرہ کی ترتیب کے پابند نہیں۔

پیر سائیں کو مشورہ

پیر شیخ الحدیث والتفسیر کو ہم مشورہ دیتے ہیں بلکہ مؤدبانہ گذارش کرتے ہیں کہ مذکور الصدر دس کتابوں کے علاوہ باقی کتب حدیث کو نچلے درجے کی قرار دینے سے گریز فرمائیں، کیونکہ اس سے مقلدین حضرات کو بہت سی دشواریاں پیش آسکتی ہیں، خصوصاً ہم سنی حنفی لوگوں کو، کیونکہ ہمارے ائمہ صحاح ستہ سے پہلے اور اُن کے بغیر محدثین تھے بلکہ صحاح ستہ کے محدثین کرام کے اساتذہ میں تھے۔ العاقل تكفيه الإشارة.

''ضربِ حیدری'' میں موضوع احادیث

پیر سائیں نے شانِ مرتضوی میں وارد احادیث پر ہر طرح ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کی ہے، اور اُن کی اہمیت کو گھٹانے کی خاطر کئی پیچ وتاب کھائے ہیں، مثلاً کبھی کہا: لوگوں نے شانِ مرتضوی میں احادیث گھڑ لی تھیں اور کبھی کہا: جن محدثین نے شانِ مرتضوی میں احادیث روایت کیں ان پر شیعیت کا الزام ہے وغیرہ۔

احقر عرض کرتا ہے کہ احادیثِ موضوعہ ہر باب میں اور ہر خلیفہ راشد وغیر راشد کے متعلق پائی جاتی ہیں۔ عوام الناس کو یہ تأثر دینا کہ فقط مولیٰ علی ﷺ کی ہی شان میں احادیث گھڑی گئیں، دیانت داری نہیں ہے۔ آیئے خود پیر سائیں کی تصنیف ''ضربِ حیدری'' کا ہی جائزہ لے لیتے ہیں۔ اس کتاب کا متن تو کیا اس کی تقریظات بھی احادیثِ موضوعہ سے خالی نہیں، بطورِ نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔

پہلی موضوع حدیث

پیر سائیں سیدنا ابوبکر صدیق ﷺ کی افضلیت کے ثبوت میں ایک مقام پر یہ حدیث لائے ہیں:

''ما اوحى الى شيء الاصببته في صدر ابى بكر. یعنی جو کچھ اللہ نے میرے سینے

میں ڈالا ہے میں نے وہ سب ابوبکر کے سینے میں انڈیل دیا ہے"۔

(ضرب حیدری باراول ص58وبار پنجم ص143)

یہ موضوع وجعلی حدیث لاہور کے ایک کنز العلماء مولوی نے بھی اپنی تقریظ میں لکھ ماری ہے۔

(تقریظ:ضربِ حیدري ص٧٤،ماهنامه العاقب ص٢٩محرم 1413ھ، جنوری 2010ء)

ہر چند کہ اس حدیث کو درج کرنے والے لوگ شیخ الحدیث کہلواتے ہیں یا پھر پیر سائیں قسم کے لوگ ہیں مگر بے ادبی معاف محدثین کے نزدیک یہ حدیث موضوع ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

(المنار المنيف لابن القيم ص١١٥،حديث٢٤٠،وط: ص١٠٨؛سفر السعادة للفيروز آبادي ص ٢٨٠؛شرح سفر السعادة للدهلوي ص١٥٢١؛الأسرار المرفوعة لعلي القاري ص ٣٤٢،حديث ١٣٠١؛ تذكرة الموضوعات للفتني ص٩٣؛ أسنى المطالب للحوت ص٢٧٠، حديث١٢٦٢؛ الفوائد المجموعة للشوكاني ص٣٦٠،لمحات من تاريخ السنة لأبي غدة ص ٩٩)

سائیں پیر کو بھی قولاً اور عملاً تسلیم ہے کہ یہ حدیث موضوع ہے، قولاً اس طرح کہ انہوں نے خود لکھا ہے کہ محدثین کے نزدیک یہ حدیث موضوع ہے مگر صوفیہ نے اس کو پذیرائی بخشی ہے، اور عملاً اس طرح کہ آگے چل کر انہوں نے اپنے اسی قلم سے شیخ عبدالعزیز دباغ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ:

"اس کیفیت میں سے حضرت ابوبکر (ؓ) کو ان کی برداشت کے مطابق تھوڑا سا حصہ ملا تھا"۔

چند سطور بعد لکھتے ہیں:

"حضرت ابوبکر (ؓ) مذکورہ مرتبے تک ترقی کر گئے تھے مگر اس کے باوجود نبی کریم ﷺ آخری تین سالوں میں ان سے بھی ان حقائق پر گفتگو نہیں فرماتے تھے کہ کہیں وہ پگھل نہ جائیں"۔

(ضرب حیدری باراول ص95)

یہ معمّا تو کوئی ماہر محدث یا پہنچا ہوا صاحب کشف شخص ہی حل کر سکتا ہے کہ ان دونوں باتوں میں سے کونسی بات صحیح ہے، آیا صوفیہ کی پسندیدہ مذکور الصدر موضوع حدیث یا شیخ عبدالعزیز اُمّی کا یہ کشف؟ کیونکہ مذکور الصدر حدیث میں ہے کہ جو کچھ حضور ﷺ کی طرف وحی کیا گیا وہ سب ابوبکرؓ کے سینے میں انڈیل دیا گیا، اور شیخ عبد العزیز کے کشف میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کو تھوڑا سا حصہ ملا تھا۔ یہ "تھوڑا سا" کا لفظ "جو کچھ" اور "وہ سب

ابوبکر کے سینے میں انڈیل دیا" کے الفاظ کے خلاف ہے۔ نیز یہ موضوع روایت مشہور حدیث "إني أرى ما لا ترون وأسمع مالا تسمعون" (میں وہ دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھ سکتے اور وہ سنتا ہوں جو تم نہیں سن سکتے) کے بھی خلاف ہے۔(ترمذي حديث ٢٣١٢ مسند أحمد وغيرها)

دوسری موضوع حدیث

اگر آپ غور فرمائیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ مذکور الصدر پہلی موضوع حدیث کی کوکھ سے حسب ذیل دوسری موضوع حدیث نکالی گئی، صاحب "ضربِ حیدری" لکھتے ہیں:

"ما فضلكم ابوبكر بكثرة الصلوة والصيام ولكن بالسر الذى وقر فى قلبه. یعنی ابوبکر زیادہ نمازوں اور روزوں کی وجہ سے تم لوگوں سے آگے نہیں نکلا بلکہ اس راز کی وجہ سے آگے نکل گیا ہے جو اس کے سینے میں سجادیا گیا ہے"۔

(ضربِ حیدری بار پنجم ص142 وبار اول ص58)

اس موضوع روایت کو علامہ سید ارشد سعید کاظمی حفظہ اللہ نے بھی حدیث نبوی گمان کرلیا اور اپنی تقریظ میں شامل کرلیا۔ ملاحظہ فرمائیں:

(تقریظ: ضربِ حیدری ص40)

اس موضوع روایت کو لاہور کے ایک جلالی مولوی نے بھی اپنی تقریظ میں درج کردیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

(ضربِ حیدری[تقریظ]ص٧٤،ماهنامه العاقب ص٢٩ محرم 1413ھ جنوری 2010ع)

علاوہ ازیں جن مقرظین کو اس کتاب سے مکمل اتفاق ہے (اور وہ ہمارے دور کے بڑے بڑے حضرات ہیں اور خدا جانے کس طرح ان سے تقاریظ حاصل کرلی گئیں) ان کے نزدیک بھی یہ من گھڑت روایت "حدیث" ہے، لیکن افسوس کہ یہ روایت "حدیث نبوی" نہیں بلکہ ایک غیر نبی شخص بکر بن عبداللہ المزنی کا قول ہے، خود "ضرب حیدری" کے مصنف کو بھی یہ بات تسلیم ہے مگر ان کا کہنا ہے کہ:

"صوفیاء نے اسے حدیث مرفوع اور صحیح مانا ہے"۔

اگر صاحب ضربِ حیدری فقط "پیر سائیں" ہوتے تو یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی لیکن وہ تو چشم بد دور شیخ الحدیث والتفسیر بھی ہیں اس لیے حیرت ہوتی ہے کہ وہ کیونکر محدثین کی تحقیق پر صوفیہ کے قول کو ترجیح دے رہے

ہیں، حالانکہ انہیں معلوم ہے کہ "لِكُلِّ فَنٍّ رِجَالٌ" (ہر فن کے لیے مخصوص لوگ ہوتے ہیں) اور انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ خوب سے خوب تر بات کو بھی نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب کرنا حرام اور بعض کے نزدیک کفر ہے۔
محدثین کرام لکھتے ہیں:

وذهب الشيخ أبو محمد الجويني إلىٰ أنه يكفر.

"شیخ ابو محمد الجوینی کا مذھب ہے کہ موضوع حدیث (عمداً) بیان کرنا کفر ہے"۔

(نتيجة النظر في نخبة الفكر للشمني ص ١٤٤؛ سير أعلام النبلاء للذهبي ج١٧ ص٦١٨)

ضربِ حیدری کے بعض مقرظین کا تساہل

تعجب ہے کہ ضربِ حیدری کے اولین مقرظ بھی اِسی بلکہ اس سے بھی شدید غلطی کے مرتکب ہوگئے۔
انہوں نے پہلے یہی حدیث لکھی پھر حدیث الطائر لکھی اور پھر اس کے متعلق کہا:

"ابن جوزی نے اس حدیث (حدیث الطیر) کو موضوعات میں ذکر کیا اور محدث ذہبی نے مفرد طور پر جزواً بیان کیا اور فرمایا اس حدیث کے تمام اسناد باطل ہیں، تمام لوگوں نے حاکم پر اعتراض کیا کہ اس نے مستدرک میں اس حدیث کو کیوں داخل کیا"۔

(تقریظ: ضربِ حیدری ص6)

یہی علامہ اس سے اگلے صفحہ پر لکھتے ہیں:

"شیعوں کے نزدیک حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی فضیلت پر یہی حدیث ہے لیکن اہل سنت وجماعت کے نزدیک وہ صحیح حدیث ہے جو علامہ شعرانی نے بیان کی جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے"۔

(تقریظ: ضربِ حیدری ص 7)

ہائے افسوس! کیا یہی اہلِ سنت کی ترجمانی ہے کہ کسی شخصی قول کو حدیثِ نبوی بنا کر اسے اہلِ سنت وجماعت کی دلیل بنادیا جائے اور جو سندِ حسن کے ساتھ حدیثِ نبوی ہو اُسے موضوع قرار دے کر شیعہ کی دلیل بنادیا جائے؟
اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ.
چونکہ دورِ حاضر کی ایک بڑی شخصیت نے حدیث الطیر کو موضوع قرار دے دیا ہے، اور اصول یہ ہے کہ کسی

بات کے قائل کی بڑی یا چھوٹی شخصیت کو مت دیکھا کرو بلکہ اس کے قول میں غور کیا کرو، جیسا کہ سیدنا و مرشدنا علی المرتضیٰ ؓ کا ارشاد ہے:

لَا تَنْظُرْ إِلٰى مَنْ قَالَ وَانْظُرْ إِلٰى مَا قَالَ.

"کہنے والے کو نہ دیکھا کرو! جو اُس نے کہا اُس میں غور کیا کرو"۔

(جمع الجوامع ج۱۳ ص۲۹۹ رقم ۹۷۲۹٤؛ الأسرار المرفوعة للقاري ص ۲٦٤ رقم ۱۰۰٤؛ إزالة الخفاء ج٤ ص ٤۹۳؛ حياة الصحابة للكاندهلوي ج٤ ص ۲۷۳)

اور یہ بھی ایک ضابطہ ہے کہ "اَلْـحَـقُّ أَحَـقُّ أَنْ يُتَّبَـعَ" (حق زیادہ حق رکھتا ہے کہ اس کی اتباع کی جائے) سو اِن اصول وضوابط کے مطابق ہر شخص چھوٹا ہونے کے باوجود حقیقت کو جاننے کا حق رکھتا ہے، لہٰذا آیئے جائزہ لیتے ہیں کہ حدیث الطائر کے معاملہ میں اصل حقیقت کیا ہے؟

اِن علامہ صاحب کی توجہ اس حقیقت کی طرف نہیں جا سکی کہ امام ذہبی کی اس حدیث کے متعلق یہ سابق رائے تھی جو غالباً انہوں نے اپنے مفرط استاد ابن تیمیہ سے متاثر ہو کر قائم کی تھی، بعد میں امام ذہبی کی ذاتی رائے اس حدیث کے بارے میں مثبت ہو گئی تھی۔ چنانچہ وہ اپنی ایک کتاب میں لکھتے ہیں:

وأما حديث الطير فله طرق كثيرة جداً، قد أفردتها بمصنَّف ومجموعها هو يوجب أن يكون للحديث أصل.

"حديث الطير" کی بہت زیادہ سندیں ہیں، میں نے اُن سب کو ایک مستقل رسالہ میں ذکر کیا ہے اور ان سب کا مجموعہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اس حدیث کی اصل ضرور ہے"۔

(تذكرة الحفاظ ج۲ ص ۱٦٤، وط: ج۳ ص ۱۰٤۲، ۱۰٤۳)

نیز حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ مزید لکھتے ہیں:

"حضرت انس ؓ سے اس حدیث کے کثیر طرق ہیں اور سب میں کلام ہے اور بعض سندیں سنن کی شرط پر پوری اترتی ہیں اور ان سب میں عمدہ اسناد وہ ہے جو قطن بن نُسیر (امام مسلم کے شیخ) سے مروی ہے، اور وہ یہ ہے: از جعفر بن سلیمان از عبد اللہ بن المثنیٰ از عبد اللہ بن انس بن مالک از انس ؓ۔ وہ فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں ایک بھنا ہوا

چکور پیش کیا گیا تو آپ نے دعا فرمائی: اے اللہ! اس شخص کو میرے پاس بھیج دے جو تجھے تیری مخلوق سے زیادہ پیارا ہو، وہ میرے ساتھ کھائے، الحدیث"۔

(سير أعلام النبلاء ج۲۸ ص۲۳۵)

علامہ ذہبی نے اپنی آخری تصنیف میں بھی اسی طرح لکھا ہے۔

(تاريخ الإسلام للذهبي ج۲ ص۲۲٤)

حافظ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"امام طبرانی نے یہ حدیث "المعجم الأوسط" اور "المعجم الكبير" میں ذکر کی ہے اور معجم کبیر کی سند میں حماد بن مختار ہے جس کو میں نہیں جانتا اور اس کے باقی راوی صحیح حدیث کے راوی ہیں، اور "المعجم الأوسط" میں احمد بن عیاض بن ابوطیبہ ہے اس کو میں نہیں جانتا اور باقی راوی صحیح حدیث کے راوی ہیں"۔

(مجمع الزوائد ج۹ ص۱۲۵، وط: ج۹ ص۱٦۸، حديث ۱٤۷۲۳، وط: ج۹ ص۱۱۷، حديث ۱٤۷۲۳، ۱٤۷۲٤، ۱٤۷۲٥)

حافظ ہیثمی اس حدیث کو حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"اس حدیث کو امام بزارؒ اور امام طبرانی نے اختصار کے ساتھ روایت کیا ہے اور امام طبرانی کے راوی صحیح حدیث کے راوی ہیں، ماسوا فطر بن خلیفہ کے اور وہ ثقہ ہیں"۔

(مجمع الزوائد ج۹ ص۱۲٦، حديث ۱٤۷۲۷ وط: ج۹ ص۱۱۸، حديث ۱٤۷۲۷)

امام ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے فرمایا: اس حدیث کو موضوع کہنا باطل ہے، پھر فرمایا:

فالحق ما تقرر أولاً: أنه حسن يحتج به.

"پس حق یہ ہے جیسا کہ پہلے بیان ہوا کہ یہ حدیث حسن ہے، اس سے دلیل لی جا سکتی ہے"۔

(المنح المكية ص۵۸۸)

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں:

قال الترمذي: غريب، وجاء الحاكم بأسانيد خرج بها عن غرابة المحضة.

"امام ترمذی نے فرمایا کہ یہ حدیث غریب ہے، اور امام حاکم اس کی کئی سندیں لائے

ہیں، لہٰذا یہ حدیث خالص غرابت سے نکل گئی"۔

(إزالة الخفاء ج٤ ص ٤٥٣، ٤٥٤)

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو "حسن" قرار دیا ہے۔ یہ حکم انہوں نے ایک سوال کے جواب میں لگایا تھا۔ اُن کے پاس ایک سوال آیا تھا کہ امام ابوحفص عمر بن علی بن عمر القزوینی رحمۃ اللہ علیہ نے "مصابیح السنة للإمام البغوي" کی اٹھارہ احادیث کو موضوع (جعلی) قرار دیا ہے۔ ان میں ایک حدیث "حديث الطير" بھی ہے۔ اس پر اُنہوں نے فرمایا:

"میں کہتا ہوں: یہ حدیث امام ترمذی نے از عیسیٰ بن عمر، از اسماعیل بن عبدالرحمٰن السدی، از انس روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے، میں سدی سے اس سند کے بغیر اس حدیث کو نہیں جانتا اور یہ حضرت انس ﷺ سے اس سند کے علاوہ بھی روایت کی گئی ہے اور سدی کا نام اسماعیل بن عبدالرحمان ہے، اس کا حضرت انس ﷺ سے سماع ثابت ہے۔ میں کہتا ہوں: امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اُس سے حدیث لی ہے اور ایک جماعت نے اس کو ثقہ قرار دیا ہے، ان میں حضرت شعبہ، امام سفیان بن عیینہ اور امام یحیٰ القطان ہیں۔ اس کے بعد امام عسقلانی نے امام حاکم کی سند سے یہ حدیث نقل فرمائی ہے، اور اخیر میں وہ اپنے جواب کی تلخیص میں اس حدیث کو سولہویں (١٦) نمبر پر لائے اور فرمایا: "السادس عشر: الترمذي وهو حسن" یعنی سولہویں حدیث کو امام ترمذی نے ذکر کیا ہے اور وہ حدیث حسن ہے"۔

(أجوبة ابن حجر العسقلاني على رسالة القزويني ملحق بالمشكاة ج١ ص ٥٤٧، ٥٤٩)

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر تفصیلی کلام فرمایا ہے، اور کہا ہے کہ یہ درجۂ حسن تک پہنچتی ہے، اور امام حاکم کی بعض روایات کے تمام راویوں کو ثقہ کہا ہے، ماسوا احمد بن عیاض کے لیکن اس میں بھی جرح اور تعدیل کا کوئی قول نہیں پایا گیا۔ حافظ ابن طاہر نے اس حدیث کے تمام طرق کو باطل کہا تھا، اس پر امام سیوطیؒ فرماتے ہیں:

وهو غلو منه في مقابلة تساهل الحاكم، والحكم على الحديث بالوضع بعيد جداً.

"یہ اُن کا امام حاکم کے تساہل کے مقابلہ میں انتہائی غلو ہے، اور اس حدیث پر وضع کا حکم لگانا

بہت ہی بعید ہے"۔

(قوت المغتذي علىٰ جامع الترمذي للسيوطي ج٣ص١٢٤٤، ١٢٤٥، ١٢٤٦)

فی الجملہ یہ کہ امام طبرانی کی سند سے اس حدیث کے اکثر راوی حدیثِ صحیح کے راوی ہیں، حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک امام ترمذی کی سند سے یہ حدیثِ حسن ہے اور امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی یہ حدیث حسن ہے۔

عجیبہ

حیران کن بات یہ ہے کہ ہمارے اساتذہ قسم کے علماء کرام نے محض روافض یا بعض عالمی شہرت یافتہ علماء کی ضد میں آ کر اس حدیثِ حسن کو موضوع قرار دے دیا، حالانکہ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ تمام کے تمام عشق وادب پر ہمارا ہی قبضہ ہے۔ اس کے برعکس مکتبِ فکر دیوبند کے بعض علماء نے اس حدیث (حدیث الطیر) پر "نیل الخیر بحدیث الطیر" کے نام سے مستقل ایک رسالہ لکھا ہے، جس میں انہوں نے اس حدیث کو حسن اور قریب بہ صحیح ثابت کیا ہے، اور اس رسالہ پر علامہ عبدالرشید نعمانی، علامہ ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزی اور دوسرے علماء دیوبند کی تصدیقات وتقریظات بھی موجود ہیں۔

نیز اہل حدیث لوگوں کے نزدیک بھی یہ حدیث قابل قبول ہے۔ چنانچہ قاضی شوکانی غیر مقلد نے اس حدیث کو متعدد سندوں کے ساتھ ذکر کیا ہے اور اس پر حافظ ہیثمی کی تحقیق کو مقرر رکھا ہے۔

(در السحابة للشوكاني ص٢٢١، ٢٢٢)

خدارا انصاف فرمایئے!

اپنے مکتبِ فکر کے حضرات سے ہماری گزارش ہے کہ وہ اس پہلو پر ضرور غور فرمائیں کہ جب ہمارے لوگ موضوع روایات کو بھی بیان کرنے سے دریغ نہیں کرتے اور "نزهة المجالس" اور اس جیسی دوسری وعظ کی کتابوں (جن کے پڑھنے کو امام سیوطی، ابن حجر مکی، سید علوی مالکی اور دوسرے علماء کرام نے حرام قرار دیا ہے، جیسا کہ المنهل اللطيف في أحكام الحديث الضعيف ص ٢٩ مطبعة مصطفى محمد مصر ١٣٥٧ھ، اور "الأجوبة الفاضلة للأسئلة العشرة الكاملة" ص ١٣٩ مطبعة مكتب المطبوعات الإسلامية بحلب الطبعة الثالثة ١٤١٤ھ، میں تصریح ہے) سے ہر رطب ویابس کو نقل کر دیتے

ہیں تو یہاں اس قدر سختی کیوں کہ حدیث حسن اور صحیح پر بھی ہاتھ صاف کر دیئے؟

یہ کیسی بے انصافی ہے کہ جو بات حضور ﷺ کا ارشاد ہی نہیں اسے حدیث بنا کر قبول کر رکھا ہے اور جو واقعی ارشادِ نبوی ﷺ ہے اُسے شیعہ یا اپنے ہی ایک مشہور ترین عالم کی ضد میں آ کر موضوع بنا دیا ہے۔ یا اللہ! قیامت آ کیوں نہیں جاتی!

میں حیران رہ جاتا ہوں کہ آخر یہ سراسر سوتیلا سلوک سیدنا علی ؓ کے ساتھ ہی کیوں؟ ذرا غور تو فرمایئے کہ ایک مقام پر شیخ الحدیث والتفسیر پیر سائیں غلام رسول قاسمی زید عمرہ حضرت سیدنا ابوبکر صدیق ؓ کی شان میں جعلی اور موضوع (گھڑی ہوئی) روایت کو قابلِ قبول بنانے کی کوشش میں ہیں اور دوسری طرف سیدنا علی ؓ کی شان میں واردشدہ احادیث صحیحہ اور حسنہ کی اہمیت کو گھٹانے کے درپے ہیں۔ بطورِ نمونہ ملاحظہ فرمایئے، پہلے انہوں نے ایک مقام پر درج ذیل موضوع حدیث لکھی ہے:

"مافضلکم ابوبکر بکثرۃ الصلوۃ والصیام ولکن بالسر الذی وقر فی قلبہ۔ یعنی ابوبکر زیادہ نمازوں اور روزوں کی وجہ سے تم لوگوں سے آگے نہیں نکلا بلکہ اس راز کی وجہ سے آگے نکل گیا ہے جو اس کے سینے میں سجا دیا گیا ہے"۔

پھر لکھا ہے:

"محدثین نے اسے حدیث مرفوع تسلیم نہیں کیا مگر بہت سے صوفیاء نے اسے حدیث مرفوع اور صحیح مانا ہے"۔

(ضربِ حیدری بار پنجم ص 142 و بار اول ص 58)

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ کسی روایت کے مقبول و مردود ہونے کے متعلق صوفیہ یا نام نہاد صالحین کا نہیں بلکہ محدثین کرام کا حکم لیا جاتا ہے، اس لیے کہ "لکل فن رجال" (ہر فن کے لیے مخصوص لوگ ہوتے ہیں) بہرحال خلیفۂ اول سیدنا ابوبکر صدیق ؓ کی شان میں اِس موضوع و من گھڑت روایت کو قابلِ ہضم بنانے کے اس انداز کو مدنظر رکھتے ہوئے ذرا حسبِ ذیل اقتباس کو بھی پڑھیئے! پیر سائیں لکھتے ہیں:

"یہ لوگ صدیق اکبر اور مولیٰ علی رضی اللہ عنہما میں قِدمِ اسلام کا موازنہ لے کر بیٹھ گئے"۔

(ضربِ حیدری بار پنجم ص 176)

غور فرمایئے اس جملہ کے پیچھے کس قدر گھٹن تلملا رہی ہے؟ حالانکہ اولیتِ اظہارِ ایمانِ مرتضوی پر تقریباً سولہ

[16] سے زائد احادیث وآثارِ صحیحہ اور حسنہ موجود ہیں، مگر سائیں پیر کے دل میں ان سب کے متعلق اتنی نرمی نہیں ہے جتنی سیدنا ابوبکر صدیق ﷛ کی شان میں کسی موضوع حدیث کو قبول کرنے یا اُسے قابلِ قبول بنانے میں ہے۔
إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ.

نوٹ

سیدنا علی ﷺ کے اول المومنین ہونے کی باحوالہ تحقیق کے لیے ہماری کتاب "شرح خصائص علي ﷛" میں حدیث [نمبر۴] کی تشریح ملاحظہ فرمائیں۔

تیسری موضوع حدیث

صاحبِ ضربِ حیدری لکھتے ہیں:

"ایک حدیث میں اس طرح ہے کہ ابوبکر وعمر خیر الاولین والآخرین وخیر اهل السماء وخیر اهل الارض الاالنبیین والمرسلین. یعنی ابوبکر اور عمر (﷛) تمام اگلوں پچھلوں سے افضل ہیں، آسمانوں والوں سے بھی افضل ہیں اور زمین والوں سے بھی افضل ہیں سوائے نبیوں اور رسولوں کے"۔

(ضربِ حیدری ص 53 وص 49)

اس موضوع اور جعلی روایت کو ایک اور عالم نے بھی اپنی تقریظ میں درج کر دیا ہے۔

(تقریظ: ضربِ حیدري ص 13)

مگر افسوس کہ یہ فرمانِ رسول ﷺ نہیں بلکہ موضوع روایت ہے، چنانچہ امام ذہبی اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہما جبرون بن واقد الافریقی کے ترجمہ (حالات) میں اُس سے دو حدیثیں لائے ہیں:

۱۔ کلام اللّٰہ ینسخ کلامي (اللہ کا کلام میرے کلام کو منسوخ کرتا ہے)

۲۔ اور دوسری یہی حدیث نقل کی، پھر فرمایا: وهما موضوعان. (اور یہ دونوں موضوع ہیں)۔

(میزان الاعتدال ج۲ ص ۱۱۱؛ لسان المیزان ج۲ ص ۱۶۷)

اگر یہ "موضوع روایت" حدیث نبوی ہوتی تو پھر امت اس مسئلہ میں اختلاف کیوں کرتی، اور ماضی قریب میں اہل سنت کے دو بڑے علماء کرام کے مابین افضلیتِ جبریل وصدیق علیہما السلام پر مناظرہ، مجادلہ بلکہ مخاصمہ

کیوں ہوتا؟ فی الجملہ یہ کہ احادیث فقط سیدنا علی کی شان میں ہی نہیں گھڑی گئیں بلکہ دوسرے صحابہ کرام کی شان میں بھی گھڑی گئی تھیں۔ ہر چند کہ ایسی احادیث کی شناخت و پرکھ میں تھوڑی سی مشکل ضرور ہوتی ہے تاہم جب کسی حدیث کا موضوع ہونا انسان پر واضح ہو جائے تو پھر عمداً اُسے درج کتاب کرنا اور اُس سے استدلال کرنا حرام اور بعض کے نزدیک کفر ہے۔ امام احمد رضا حنفی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس بات کی تصریح فرمائی ہے۔

(فتاویٰ رضویہ ج٦ ص ١٨٠ مکتبہ رضویہ کراچی)

امام احمد رضا حنفی رحمۃ اللہ علیہ پر ایک ظلم

یہ موضوع اور جعلی حدیث اُس کتاب میں بھی درج ہے جو آج کل "مطلع القمرین في إبانة سبقة العمرین" کے نام سے شائع کی گئی ہے، اس پر بطور مصنف امام احمد رضا حنفی رحمہ اللہ کا نام ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے مکتبہ بہار شریعت، لاہور، جون 2010ء کا مطبوعہ نسخہ موجود ہے، جس پر تقدیم، تحقیق، تخریج اور تحشیہ مفتی محمد ہاشم خان العطاری المدنی کے قلم سے ہے۔ انتہائی افسوس کی بات ہے کہ اس نسخہ کے ٹائٹل پر یہ موضوع حدیث سجادی گئی، پھر اندر صفحہ ۱۱۸، اور صفحہ ۲۳۷ پر بھی یہ موضوع حدیث مرقوم ہے۔

یاد رکھئے! ہماری ایسی بے احتیاطیوں سے بعض لوگوں کے اُس قول کو مزید تقویت ملے گی جو انہوں نے امام احمد رضا رحمہ اللہ کے بارے میں لکھا تھا کہ "علم حدیث میں اُن کی پونجی قلیل تھی"۔

لہٰذا احتیاط لازم ہے، خود سوچئے! ایسا محتاط مصنف جس کے نزدیک موضوع حدیث بیان کرنا کفر ہو، وہ خود کیونکر موضوع حدیث نقل کر سکتا ہے؟ اس لیے میں تو سمجھتا ہوں کہ بعد کے کسی شخص نے مخصوص مقصد کی خاطر یہ گھناؤنی کارروائی کی ہے، اور ایسا ظلم ہر دور میں ہوس پرست لوگ ہر مقبول و مشہور شخصیت کے ساتھ کرتے رہے ہیں کہ پوری کی پوری کتابیں لکھ کر اُن کی طرف منسوب کر دیں یا پھر من پسند مواد اُن کی تصانیف میں گھسیڑ دیا، جیسا کہ اہل مطالعہ پر مخفی نہیں۔

"مطلع القمرین" کی متضاد عبارات

میرے اس خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ خود اسی کتاب میں اسی حدیث کے برعکس موقف موجود ہے۔ وہ اس طرح کہ اس (جعلی و موضوع) حدیث کے مطابق جو افضلیت کی ترتیب بنتی ہے اس کے مطابق سیدنا ابو بکر و عمر انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ تمام اہل آسمان و زمین سے افضل قرار پاتے ہیں، اور ان

میں ملائکہ بھی شامل ہیں لیکن دوسرے مقامات پر اس حدیث کے برعکس یوں مرقوم ہے:

"سلسلۂ تفضیل عقیدۂ اہل سنت میں یوں منتظم ہوا (ترتیب پایا) ہے کہ افضل العالمین واکرم المخلوقین محمد رسول رب العالمین ہیں صلی اللہ تعالیٰ علیہ (وآلہ) وسلم، پھر انبیاء سابقین، پھر ملائکہ مقربین، پھر شیخین، پھر ختنین، پھر بقیہ صحابۂ کرام صلوات اللہ وسلامہ علیہم اجمعین"۔

(مطلع القمرين في إبانة سبقة العمرين ص١٤٤)

دوسرے مقام پر یوں مرقوم ہے:

"عزیزو! ہمیں حکم ہے کہ ہر ذی فضل کو اس کا فضل دیں جب ہم نے مرتبہ حضرت مولیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بعد ان تین حضرات کے تمام صحابہ کرام واہل بیت عظام وکافہ مخلوق الٰہی جن وبشر وملائکہ سے زیادہ جانا تو ان کا مرتبہ عند اللہ ایسا ہی تھا پھر توہین کیا ہوئی؟ توہین تو عیاذاً باللہ جب ہوتی کہ ان تین حضرات کے سوا اور کسی کو حضرت مولیٰ سے افضل بتاتے"۔

(مطلع القمرين في إبانة سبقة العمرين ص١٤٤)

ان میں سے اول الذکر اقتباس میں شیخین کریمین رضی اللہ عنہما پر ملائکہ مقربین کی افضلیت کا ذکر ہے اور یہ ترتیب مذکورہ بالا موضوع حدیث کے خلاف ہے۔ اگر امام احمد رضا حنفی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ موضوع روایت واقعی فرمانِ نبوی ﷺ ہوتا تو اُن سے کیونکر یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ وہ فرمانِ نبوی ﷺ سے اختلاف کرتے؟

دوسرا اقتباس نہ صرف یہ کہ مذکورہ بالا حدیث کے خلاف ہے بلکہ وہ پہلے اقتباس کے بھی خلاف ہے۔ اس لیے کہ پہلے اقتباس میں ملائکہ شیخین کریمین رضی اللہ عنہما پر مقدم ہیں، اور اس دوسرے اقتباس میں ملائکہ شیخین کریمین سے تو کیا مولیٰ علی علیہ السلام سے بھی مؤخر ہیں، اس طرح تو مولیٰ علی علیہ السلام شیخین کریمین رضی اللہ عنہما سے بھی افضل قرار پاتے ہیں، حالانکہ یہ بات "مطلع القمرین" کے مقصد کے بھی خلاف ہے۔ خدارا غور کیجئے! کیا ایسے ذہین وفہیم مصنف سے اس قسم کے نسیان اور اس نسیان کے باعث اتنے بڑے تضادات کی توقع کی جاسکتی ہے؟ ذرا سوچئے تو سہی کہ جو ہستی چار سو صفحات پر مشتمل کتاب کا ایک مرتبہ مطالعہ فرمائے تو زندگی بھر نہ بھولے، جیسا کہ آپ کے بعض سوانح نگار حضرات نے لکھا ہے تو ستر بہتر صفحات میں اُس سے ایسا تضاد کیونکر ہوسکتا ہے؟

اس سے تو محسوس ہوتا ہے کہ "مطلع القمرین" امام احمد رضا حنفی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہی نہیں، کیونکہ اُن کی تصانیف میں اس قدر سقم، تضاد اور کچا پن نہیں ہوتا اور اگر واقعی یہ اُن کی تصنیف ہے تو پھر ضرور کوئی گڑبڑ کی گئی

ہے اور اُس گڑبڑ کی وجہ سے یہ مدسوس کتاب ہے۔

تنبیہ

اس کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ یہ احقر امام احمد رضا حنفی رحمۃ اللہ علیہ کو معصوم عن الخطاء سمجھتا ہے، معاذ اللہ، ہرگز نہیں۔ ہر چند کہ ہمارے نزدیک اُن کا شمار معتبر ترین مصنفین کرام میں ہوتا ہے اور اللہ شاھد کہ ہمیں اُن سے انتہائی محبت وعقیدت بھی ہے، تاہم ہماری عقیدت اور ہمارا عقیدہ ہمیں اجازت نہیں دیتا کہ ہم اپنے محبوب و معتبر ائمہ اہلِ سنت کو معصوم عن الخطاً والنسیان تصور کریں۔ یہ شیعہ کا عقیدہ ہے کہ وہ اپنے ائمہ کو معصوم گردانتے ہیں۔ ائمہ اہل بیت کرام علیھم السلام صحابہ سے پہلے ہمارے ائمہ ہیں مگر جب ہم انہیں معصوم نہیں سمجھتے تو پھر کسی دوسرے کو کیونکر سمجھ سکتے ہیں؟ البتہ ہم اپنے ائمہ علماء، فقہاء، محدثین، مفسرین اور مصنفین کو حسب مراتب معتبر اور معتمد ضرور سمجھتے ہیں لیکن کسی کے معتبر اور معتمد ہونے کا معنیٰ یہ نہیں لیتے کہ وہ معصوم عن الخطاً ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے علماء اہل سنت کا کیا عقیدہ ہے؟ ذرا ملاحظہ فرمایئے!

امام ذہبی نے لکھا ہے کہ امام ابن ابی داود سے حدیث الطیر کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے کہا:

إن صح حديث الطير فنبوة النبي ﷺ باطل، لأنه حكىٰ عن حاجب النبي ﷺ خيانة [يعني أنساً] وحاجب النبي ﷺ لايكون خائناً.

"اگر حدیث الطیر صحیح ہو تو نبی کریم ﷺ کی نبوت باطل ہے، اس لیے کہ یہ حدیث نبی کریم ﷺ کے دربان [حضرت انس رضی اللہ عنہ] کی خیانت کو بیان کر رہی ہے اور نبی کریم ﷺ کا دربان خائن نہیں ہو سکتا"۔

اس کلام سے محسوس ہوتا ہے کہ محدث ابن ابی داود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عصمت کے قائل ہیں جبکہ اہل سنت کے نزدیک کوئی غیر نبی انسان معصوم نہیں ہوتا۔ اس لیے علامہ ذہبی نے اس خیال کی تردید میں پہلے تو کہا کہ ابن ابی داود کا یہ کلام ردی اور منحوس ہے، پھر چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی لغزشیں ذکر کیں اور آخر میں لکھا:

وقد أخطأ ابن أبي داود في عبارته وقوله، وله على خطئه أجر واحد، وليس من شرط الثقة أن لايخطىء ولايغلط ولايسهو، والرجل فمن كبار علماء الإسلام ومن أوثق الحفاظ، رحمه الله تعالىٰ.

"اور یقیناً ابن ابی داود نے اپنی عبارت اور اپنے قول میں خطا کی ہے، انھیں ان کی خطا پر واحد اجر ملے گا، اور معتبر ہونے کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ انسان سے خطا، غلطی اور بھول نہ ہو، یہ شخص اکابر علماء اسلام اور معتبر حفاظ حدیث سے ہے، اللہ تعالیٰ کی اس پر رحمت ہو"۔

(سير أعلام النبلاء للذهبي ج١٠ ص ٥٨٥، ٥٨٦ وط: ج١٣ ص ٢٣٣)

غور کیجیے! ابن ابی داود کو اکابرین سے تسلیم کیا، اوثق (معتبر ترین) حفاظ میں سے مانا مگر خطا، غلطی اور بھول سے معصوم قرار نہیں دیا، اور کسی بھی غیر نبی انسان کے متعلق یہی راہِ اعتدال ہے۔ خود امام احمد رضا حنفی رحمۃ اللہ علیہ نے فتاویٰ میں متعدد مقامات پر ایسی تصریحات فرمائی ہیں۔ نیز علامہ عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ محدث عقیلی کی ثقاہت کا اعتراف کرنے کے بعد اُن کی ایک غلطی پر تنبیہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

ولا من شرط الثقة أن يكون معصوماً من الخطايا والخطأ.

"اور ثقہ [معتبر] ہونے کے لیے خطا اور غلطیوں سے معصوم ہونا شرط نہیں"۔

(الرفع والتكميل في الجرح والتعديل للكهنوي ص ٤٠٩)

امام ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر اچھی روشنی ڈالی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"اے بھائی تجھ پر اصولِ شریعت میں غور و خوض ضروری ہے، اور جان لیجیے کہ جس شخص نے حدیث اور قرآن کریم کے احکامِ منصوصہ کی حفاظت کی اور فقہاء کرام کے اقوال میں غور کر کے اپنے اجتہاد میں اُن سے مدد حاصل کی اور اُن اقوال کو غور و خوض کے لیے کلید بنایا اور مجمل کی تفسیر اور معانی محتملہ کے لیے معاون بنایا اور کسی شخص کی ایسی پیروی نہ کی جیسی کہ حدیث کی بلا حیل و حجت پیروی کی جاتی ہے، اور اپنے آپ کو علماءِ حق کی مساعیِ جمیلہ، اُن کے حفظِ حدیث اور تدبرِ حدیث کی کوششوں سے بے نیاز نہ سمجھا اور ان کی بحث و نظر اور مفہوم کی پیروی کی اور اُن کے افادات و تنبیہات کی مساعی کا شکر ادا کیا، اور اُن کی اچھائی، جو اُن کے اکثر اقوال ہیں، پر اُن کی تعریف کی اور انھیں لغزشوں سے مبرا نہ جانا جیسا کہ خود انہوں نے بھی اپنے آپ کو مبراء نہیں کہا، تو ایسا شخص ہی طالب حق ہے، سلف صالحین کی راہ کو مضبوطی سے تھامنے والا ہے، اپنا نصیب حاصل کرنے والا ہے، ہدایت کو پالینے والا ہے، اپنے نبی کریم ﷺ کی سنت، صحابہ کرام کی ہدایت اور تابعین کرام رحمہم اللہ کے نقش قدم پر چلنے والا ہے، اور جس شخص نے بحث و نظر سے پہلو

تھی کی اور جو کچھ ہم نے عرض کیا اُس سے گریز کیا اور اپنی رائے کو حدیث پر ترجیح دی اور اپنی فکر کے بل بوتے پر احادیث کو رد کرنے کی کوشش کی تو ایسا شخص گمراہ اور گمراہ کن ہے"۔

(جامع بیان العلم وفضله لابن عبدالبر ج۲ ص۱۱۳۹)

ہمارے متبوع ائمہ کرام ﷭ نے تو یہاں تک تصریح فرمائی ہے کہ صحابہ کرام ﷡ کا کسی مسئلہ میں جو اختلاف ہوا، اُن میں سے ہر ایک کو بھلائی اور صحت پر ماننا درست نہیں بلکہ اُن میں سے ایک کو صواب پر اور دوسرے کو خطا پر کہا جائے گا۔ چنانچہ حضرت اشہب فرماتے ہیں:

سئل مالک عن اختلاف أصحابِ رسول اللهﷺ فقال: خطأ وصواب، فانظر في ذلک.

"امام مالک ﷫ سے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام ﷡ کے اختلاف کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: وہ خطا اور صواب پر ہوتا تھا، لہٰذا تم اس میں غور کر لیا کرو"۔

(جامع بیان العلم وفضله لابن عبدالبر ج۲ ص۹۰۵)

ایسی تصریحات امام اعظم ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام لیث، امام اسماعیل القاضی امام مزنی اور دوسرے ائمہ کرام ﷭ سے بھی منقول ہیں، اور یہی اہل سنت کا مذہب ہے کہ انبیاء کرام علیھم السلام کے علاوہ کوئی انسان خطا ولغزش سے معصوم نہیں، اس کے برعکس شیعہ کا مذہب یہ ہے کہ وہ ائمہ اہل بیت علیھم السلام کو معصوم مانتے ہیں۔

امام احمد بن حنبل ﷫ سے گریز کیوں؟

صاحب "ضربِ حیدری" نے بخاری، مسلم، ابوداود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، موطا امام محمد، موطا امام مالک، مسند امام اعظم اور سنن دارمی سے تو سیدنا ابوبکر صدیق اور مولیٰ علی رضی اللہ عنہما کی شان سے متعلقہ احادیث کا نقشہ پیش کیا ہے لیکن امام ابن ابی شیبہ کی "المصنّف" امام حاکم کی "المستدرک علی الصحیحین" اور یکے از ائمہ اہل سنت امام نسائی کی "خصائص علي" کے ذکر سے گریز کیا ہے، حتی کہ سیدنا عبدالقادر جیلانی کے امام حضرت امام احمد بن حنبل ﷫ کی "فضائل الصحابة" تو کیا اِس مسئلہ میں ان کی مشہور ترین تصنیف "مسند أحمد" کو بھی درخورِ اعتنا (لائقِ توجہ) نہیں سمجھا، حالانکہ دوسری باتوں میں پیر سائیں نے ان کتابوں سے استفادہ

کیا ہے۔ نہ جانے اس گریز کا سبب کیا ہے؟

میری دانست کے مطابق اس کے دو سبب ہو سکتے ہیں:

۱۔ ایک تو یہ کہ ان کتابوں میں دوسرے صحابہ کرام ﷺ کی بہ نسبت مولیٰ علی ﷺ کی شان میں زیادہ احادیث آئی ہیں۔

۲۔ دوسرا یہ کہ امام احمد بن حنبل ﷺ سے نہ صرف یہ کہ سیدنا علی ﷺ کی تفضیل کے اقوال ملتے ہیں بلکہ وہ اہل بیت کرام ﷺ پر کسی کو قیاس کرنے کے روادار بھی نہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ اُن سے اُن کے فرزندِ ارجمند حضرت عبد اللہ بن احمد ﷺ نے دریافت کیا:

یاأبة ما تقول في التفضیل؟ قال: في الخلافة أبو بکر وعمر وعثمان، فقلتُ: فعلي بن أبي طالب؟قال:یا بني علي بن أبي طالب من أهل بیت، لایُقاسُ بهم أحدٌ.

''ابا حضور! مسئلہ تفضیلت میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ فرمایا: خلافت میں حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان ﷺ ہیں۔ میں نے عرض کیا: پھر حضرت علی بن ابی طالب ﷺ کے بارے میں آپ کا کیا ارشاد ہے؟ فرمایا: بیٹا! حضرت علی بن ابی طالب ﷺ اہل بیت سے ہیں اُن پر کسی کو قیاس نہ کیا جائے''۔

(مناقب الإمام أحمدبن حنبل ،لابن الجوزي ص۲۱۲)

شاید پیر سائیں نے ان وجوہات کی بنا پر اس مسئلہ میں امام احمد ﷺ کی طرف توجہ نہیں فرمائی، واللہ اعلم۔

امام احمد بن حنبل ﷺ کا رتبہ

اللہ تعالیٰ نے امام احمد ﷺ کو اعلیٰ عظمتوں سے نوازا، خلق قرآن کے مسئلہ کی آزمائش میں انہیں منتخب کیا گیا اور اُن کی عظمتوں کا پرچم بلند کر دیا گیا۔ اُن کے فضائل کا مکمل احاطہ کرنا تو دشوار ہے تاہم اربابِ ذوق کے لیے یہاں تبرکاً ایک واقعہ نقل کرنا بہت مفید ہوگا۔ امام ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ متعدد سندوں کے ساتھ لکھتے ہیں:

''حضرت ربیع بن سلیمان بیان کرتے ہیں کہ امام شافعی ﷺ نے امام احمد ﷺ کی طرف ایک خط لکھا اور مجھے فرمایا: اے ابو سلیمان جلدی سے یہ خط عراق لیجاؤ اور اسے کھولنا نہیں۔ میں وہ

خط لے کر مصر سے روانہ ہوا حتیٰ کہ عراق میں امام احمد بن حنبل کی مسجد میں پہنچا تو آپ نماز فجر میں مشغول تھے، میں نے بھی آپ کے ساتھ نماز پڑھی اور میں نے ایک رکعت نہیں پائی تھی، جب سلام کے بعد وہ رکعت پوری کرنے لگا تو آپ بغور مجھے دیکھتے رہے یہاں تک کہ پہچان لیا۔ جب میں نماز سے فارغ ہوا تو آپ کو سلام عرض کیا اور خط پیش کیا، آپ خط کھولنے سے پہلے کافی دیر تک امام شافعی رضی اللہ عنہ کی خیر و عافیت دریافت فرماتے رہے، پھر خط کھول کر پڑھنا شروع فرمایا اور ایک مقام پر پہنچ کر رونا شروع کر دیا اور فرمانے لگے: امید ہے کہ اللہ تعالیٰ امام شافعی کے اس خط کو ضرور پورا فرمائے گا۔ میں نے عرض کیا: اے ابو عبد اللہ! اس خط میں کیا مرقوم ہے؟ فرمایا: امام شافعی رضی اللہ عنہ نے اس خط میں لکھا ہے کہ انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں فرمایا: اے ابن ادریس! اس نوجوان ابو عبد اللہ احمد بن حنبل کو خوشخبری سنا دو کہ عنقریب اللہ تعالیٰ کے دین میں اُس کا امتحان ہوگا اور اس سے مطالبہ کیا جائے گا کہ وہ قرآن کریم کو مخلوق کہے، پس وہ ایسا نہ کرے، اور اسے دُرّے مارے جائیں گے، اور اللہ تعالیٰ اس امتحان میں کامیابی کی بدولت اس کے پرچم کو ایسا لہرائے گا کہ قیامت تک لپیٹا نہیں جائے گا۔ میں نے عرض کیا: یہ تو بشارت ہے، لہٰذا اس پر میرے لیے انعام کیا ہے؟ آپ نے دو کپڑے زیب تن فرما رکھے تھے، ان میں سے جو ایک آپ کی جلد مبارک کو چھو رہا تھا وہ مجھے عطا فرمایا اور خط کا جواب بھی دیا۔ میں وہاں سے چل پڑا حتیٰ کہ امام شافعی رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر مکمل سرگزشت پیش کی تو اُنہوں نے فرمایا: وہ کپڑا کہاں ہے؟ میں نے عرض کیا: یہ ہے۔ فرمایا: نہ ہم تم سے یہ خریدتے ہیں اور نہ ہی تحفۃً مانگتے ہیں، البتہ تم اسے پانی میں بھگو کر اس کا نچوڑ ہمارے پاس لے آؤ۔ میں نے اس کو بھگویا اور اس کا پانی اُن کی خدمت میں لایا تو انہوں نے اس پانی کو ایک برتن میں محفوظ فرما لیا۔ میں دیکھتا تھا کہ وہ روزانہ اس پانی سے کچھ لیکر بہ طور تبرک چہرے پر ملتے تھے‘‘۔

(مناقب الإمام أحمد بن حنبل لابن الجوزي ص ۵۵۲؛ شذرات الذهب ج ۳ ص ۱۸۸)

بلاشبہ یہ خواب پورا ہوا، امام احمد امتحان میں ثابت قدم رہے اور قیامت تک کے لیے اُن کی عظمت کا پرچم بلند کر دیا گیا حتیٰ کہ مرشدنا سیدی عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ بھی اُن کے متبعین کرام میں شامل ہیں۔ پس اگر

غوث اعظم کے امام کو افضلیتِ مولیٰ علی علیہ السلام کے قائل ہونے کے باوجود کسی مستند عالم دین نے غیر سنی نہیں سمجھا تو بعد میں اگر کسی شخص کا یہی نظریہ ہو تو وہ کیونکر سنیت سے خارج سمجھا جاسکتا ہے؟

فضائل کی کیفیت وقوت کو جانچنے کا شخصی معیار

پیر سائیں نے نہ صرف یہ کہ ضرب وجمع سے، وضع حدیث کے چکروں سے اور اہل سنت کے ائمہ حدیث پر شیعیت وغیرہ کی الزام تراشیوں سے شانِ مرتضوی میں وارد شدہ احادیث کی اہمیت کو گھٹانے کی ناکام کوشش کی ہے بلکہ انہوں نے تو حد ہی کردی ہے، چنانچہ وہ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

> ''مولا علی کے فضائل جو کتب میں مذکور ہیں ان کی کیفیت اور قوت شیخین کے فضائل سے بڑھ کر نہیں ہے۔ امام اہل سنت فرماتے ہیں: بعض فضیلتیں اس درجہ قبول و رضا میں واقع ہوتی ہیں کہ وہ ایک عنداللہ ہزار پر غالب آتی ہے،......۔ (مطلع القمرین صفحہ ۲۰ قلمی)

(ضرب حيدري بار پنجم ص ٢٤١)

میں پوچھتا ہوں کہ سیدنا علی علیہ السلام کے فضائل کی کیفیت وقوت کم کیونکر ہے؟ خاکم بدہن:

۱۔ کہیں اس کا سبب عقلی کمی تو نہیں؟

۲۔ علمی کمی تو نہیں؟

۳۔ اخلاصی کمی تو نہیں؟

۴۔ کہیں خشوع وخضوع کا فقدان تو اس کا سبب نہیں؟

۵۔ جہادی معاملات سے جی چرانا تو اس کا سبب نہیں؟

۶۔ دنیوی حرص ولالچ تو اس کا سبب نہیں؟

۷۔ محبتِ الٰہی عزوجل کا فقدان تو اس کا باعث نہیں؟

۸۔ عشقِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں کمی تو اس کا سبب نہیں؟

۹۔ غلامی تو اس کا سبب نہیں؟

۱۰۔ نسبی کمتری تو اس کا سبب نہیں؟

کوئی مسلمان دوسرے مسلمانوں سے فضائل کی قوت وکیفیت کے لحاظ سے اس قدر کم ہو کہ اس کا کم ہونا

پندرھویں صدی کے پیر سائیوں پر بھی عیاں ہوتو آخر اس کی کا کوئی نہ کوئی سبب تو ضرور ہوگا۔ پیر شیخ الحدیث والتفسیر سے ہماری گذارش ہے کہ وہ قوم پر فضائل کی قوت وکیفیت کو پرکھنے کا سربستہ راز ضرور آشکار فرمائیں، تا کہ کوئی شخص دور حاضر میں اپنے ہم عصروں سے اسی طرح پیچھے نہ رہ جائے جس طرح سیدنا علی مرتضیٰ علیہ السلام اپنے ہم عصروں سے پیچھے رہ گئے تھے۔ بَیِّنُوْا وَالْأَجْرُ عَلَى اللّٰهِ.

تنبیہ:

خیال رہے کہ مطلع القمرین مطبوعہ میں صفحہ [۸۰] پر یہ عبارت تو موجود ہے مگر خط کشیدہ الفاظ میں جو پیر سائیں نے گل کھلائے ہیں وہ ان کی ذاتی فیاضی ہے، امام احمد رضا حنفی رحمۃ اللہ علیہ اس سے مبرا ہیں۔

فضائل کی قوت وکیفیت کو جانچنے کا شرعی معیار

پندرھویں صدی میں وضع کردہ فضائل کی کیفیت وقوت کو جانچنے کے اس معیار کو قبول کرنے والے لوگ ہیں، ہوں گے اور ہوتے رہیں گے مگر ہمارے لیے وہ قدیم معیار ہی کافی ہے جو چودہ سو سال قبل حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عطا فرمایا۔ ہمیں اُس معیار کی روشنی میں معلوم ہوا ہے کہ بنو ہاشم سے افضل کوئی نہیں۔ چنانچہ ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

قال رسول الله ﷺ: قال لي جبريل: قلبت الأرض مشارقها ومغاربها فلم أجد رجلاً أفضل من محمد ﷺ وقلبت الأرض مشارقها ومغاربها فلم أجد بني أب أفضل من بني هاشم.

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مجھے جبریل علیہ السلام نے بتایا کہ میں نے مکمل روئے زمین کا دورہ کیا اور گہری نظر سے دیکھا، پس میں نے (سیدنا) محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے افضل کسی شخص کو نہیں پایا، اور میں نے زمین کی مشرقوں اور مغربوں میں دیکھا لیکن میں نے بنو ہاشم سے افضل کسی خاندان کو نہیں پایا"۔

(کتاب السنة لابن أبي عاصم ص ٦١٨، حدیث ١٤٩٤)

ابن ابی عاصم کے علاوہ یہ حدیث امام احمد بن حنبل، امام طبرانی، امام ابوسعد، امام بیہقی، امام ابن مندة، امام دولابی، امام ابن جوزی، امام دیلمی، امام ابن عساکر، حافظ ابن کثیر، حافظ ہیثمی، امام سبکی، امام محب الدین الطبری،

امام سیوطی، امام سخاوی، امام ابن حجر مکی، امام عامری یمنی، امام سمہودی، امام قسطلانی، امام مناوی، امام صالحی شامی، امام متقی الہندی، امام زرقانی مالکی، امام ابن زینی دحلان مکی، امام نبہانی، شہاب الدین علوی الخضری، شیخ محمد امین بالی زادہ حنفی، سید محمد بن سید علوی مالکی، مولانا اشرف علی تھانوی، نبیل سعد الدین جرار اور صوفی محمد اقبال مدنی نے ذکر کی ہے۔

(فضائل الصحابة ج۲ ص۷۷۹، ۷۸۰، حديث ۱۰۷۳؛ المعجم الأوسط ج۷ ص۱۵۵، حديث ۶۲۸۱؛ شرف المصطفیٰ ج۲ ص۲۴؛ دلائل النبوة للبيهقي ج۱ ص۱۷۶؛ الفوائد لابن مندة ج۲ ص۱۷۷؛ الذرية الطاهرة للدولابي ص۱۲۲؛ الوفا لابن الجوزي ص۷۲؛ فردوس الأخبار ج۳ ص۲۳۴، حديث ۴۵۴۰؛ مختصر تاريخ دمشق لابن منظور ج۲ ص۱۱۰؛ السيرة النبوية لابن كثير ج۱ ص۲۵۲؛ البداية والنهاية ج۲ ص۲۱۲، وط: ج۳ ص۲۶؛ مجمع الزوائد ج۸ ص۳۹۹، ۴۰۰، حديث ۱۳۸۲۹؛ مجمع البحرين للهيثمي ج۳ ص۳۰۵، حديث ۳۵۰۲؛ السيف المسلول للسبكي ص۳۹۱؛ ذخائر العقبیٰ ص۲۱؛ الخصائص الكبرى للسيوطي ج۱ ص۶۶؛ الجامع الصغير للسيوطي، حديث ۶۰۷۴؛ جمع الجوامع للسيوطي ج۵ ص۲۷۸، حديث ۱۵۰۸۰؛ الحاوي للفتاوي للسيوطي ج۲ ص۲۱۲ وط: ج۲ ص۲۵۶؛ استجلاب ارتقاء الغرف للسخاوي ج۱ ص۲۶۱؛ الصواعق المحرقة ص۱۱۵؛ بهجة المحافل ج۱ ص۲۰؛ جواهر العقدين ص۲۱۴؛ المواهب اللدنية ج۱ ص۴۶؛ فيض القدير ج۸ ص۴۳۲۸، حديث ۶۰۷۴؛ سبل الهدى ج۱ ص۱۳۰؛ كنز العمال ج۱۱ ص۴۰۹، حديث ۳۱۹۱۳؛ شرح الزرقاني على المواهب ج۱ ص۱۳۰؛ السيرة النبوية لابن زيني دحلان ج۱ ص۱۳؛ جواهر البحار للنبهاني ج۲ ص۱۶۰ و ط: ج۲ ص۲۱۶؛ الأنوار المحمدية للنبهاني ص۱۶؛ حجة الله على العالمين للنبهاني ص۱۶۶؛ رشفة الصادي ص ۲۳۵؛ سبل السلام في حكم آباء سيد الأنام ﷺ ص ۱۰۹؛ محمد ﷺ الإنسان الكامل ص۱۳؛ نشر الطيب ص۱۹؛ العطور المجموعة للصوفي محمد اقبال مدني ص۵۸؛ الإيماء إلىٰ زوائد الأمالي والأجزاء ج۷ ص۱۶۵، حديث ۶۵۵۵)

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کے متعلق فرمایا ہے:

قال الحافظ ابن حجر في أماليه: لوائح الصحة ظاهرة على صفحات هذا

المتن.

''حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے اپنی "أمالي" میں فرمایا: اس حدیث کے متن کی صحت کے آثار بالکل واضح ہیں''۔

(الحاوي للفتاوي ج٢ص ٢٥٦ وط: ص٦١٨)

جب یہ خاندان مطلقاً روئے زمین کے تمام خاندانوں سے افضل ہے تو اس خاندان کے مومنین کا عمل بھی دوسرے مومنین کے عمل سے افضل ہوگا، الا یہ کہ خود شارع علیہ وعلی آلہ افضل الصلاۃ والتسلیم سے کوئی استثنائی صورت منقول ہو۔ اور تو اور اس حقیقت کو تو ردِ روافض میں مشہور مصنف علامہ ابن تیمیہ تک نے بھی تسلیم کیا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

فإن بني هاشم أفضل قريش، وقريشاً أفضل العرب، والعرب أفضل بني آدم، كما صح ذلك عن النبي ﷺ، قوله في الحديث الصحيح: إن الله اصطفىٰ بني إسماعيل، واصطفى كنانة من بني إسماعيل، واصطفى قريشاً من كنانة، واصطفى بني هاشم من قريش، وفي صحيح مسلم عنه أنه قال يوم غدير خُمّ: أذكِّرُكم الله في أهل بيتي، أذكِّرُكم الله في أهل بيتي، أذكِّرُكم الله في أهل بيتي. وفي السنن: أنه شكا إليه العباس: أن بعض قريش يحقِّرونهم، فقال: والذي نفسي بيده لا يدخلون الجنة حتى يحبوكم لله ولقرابتي. وإذا كانوا أفضل الخلائق فلا ريب أن أعمالهم أفضل الأعمال.

''سو بیشک بنو ہاشم قریش سے افضل ہیں اور قریش عرب سے افضل ہیں اور عرب پوری اولادِ آدم سے افضل ہیں، جیسا کہ نبی کریم ﷺ سے صحیح حدیث منقول ہے: بیشک اللہ تعالی نے اولادِ اسماعیل علیہ السلام کو منتخب فرمایا اور بنو اسماعیل سے کنانہ کو منتخب فرمایا اور کنانہ سے قریش کو منتخب فرمایا اور قریش سے بنو ہاشم کو منتخب فرمایا۔ اور صحیح مسلم میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے غدیر خم کے دن فرمایا: میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تمہیں اللہ تعالی یاد دلاتا ہوں، میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تمہیں اللہ تعالی یاد دلاتا ہوں، میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تمہیں اللہ تعالی یاد دلاتا ہوں، اور سنن میں ہے کہ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی بارگاہ میں شکایت کی کہ قریش ان

کی تحقیر کرتے ہیں تو آپ نے فرمایا: اُس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے وہ اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہوں گے جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی خاطر اور میری قرابت کے باعث تمہیں محبوب نہ رکھیں۔ سو جب وہ تمام مخلوقوں سے افضل ہیں تو لاریب ان کے اعمال بھی تمام اعمال سے افضل ہیں"۔

(رأس الحسين لابن تيمية مع استشهاد الحسين للإمام ابن جرير الطبري ص ۲۰۰، ۲۰۱، مجموعة الفتاوىٰ لابن تيمية ج۲۷ ص۲۴۸، ۲۴۹)

ہر چند کہ علامہ ابن تیمیہ ہمارے لیے حجت نہیں ہیں مگر چونکہ وہ ردِ روافض میں مشہور ہیں حتی کہ وہ اس سلسلے میں تنقیصِ مرتضوی کے مرتکب بھی ہو گئے تھے، جیسا کہ امام سبکی نے تصریح فرمائی ہے اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اُن کی تائید فرمائی ہے، لہٰذا اس تناظر میں ان کی یہ عبارت اُن تمام لوگوں پر حجت ہے جو اہل بیت اور بنو ہاشم کی خصوصیات کے منکرین ہیں۔ نیز ہمارا بھروسہ فقط اُن کے استدلال پر ہی نہیں بلکہ اِس سلسلے میں ہمارے سامنے بعض احادیث بھی موجود ہیں۔ چنانچہ امام ابن سعد رضی اللہ عنہ لکھتے ہیں:

"حضرت محمد بن عمر بن علی رضی اللہ عنہ اپنے والد گرامی سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں نے جعفر طیار رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ جنت میں اُڑ رہے تھے اور ان کے قدموں سے خون بہہ رہا تھا، اور میں نے دیکھا کہ زید رضی اللہ عنہ جعفر رضی اللہ عنہ سے نیچے نیچے اُڑ رہے تھے۔ میں نے کہا: میرا نہیں خیال تھا کہ زید رضی اللہ عنہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ سے کم ہوں گے۔ اس پر جبرائیل علیہ السلام حاضر ہوئے اور عرض کیا:

إن زيداً ليس بدون جعفر ولكنا فضلنا جعفراً لقرابته منك.

"بیشک حضرت زید رضی اللہ عنہ حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ سے کم نہیں تھے لیکن ہم نے آپ کی قرابت کی بدولت حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو فضیلت دی ہے"۔

(الطبقات الكبرىٰ لابن سعد ج٤ ص٣٣٨، وط: ج٤ ص٢٨؛ المستدرك ج ٣ ص ٢٠٩، وط: ج٤ ص ٢٢٠، حديث ٤٩٩١؛ فتاوى رضوية ج٢٣ ص٢٣٦، وج٣٠ ص٦٢٦)

ایک فضیلت عنداللہ ہزار پر غالب

پیر شیخ الحدیث والتفسیر نے امام احمد رضا حنفی رحمۃ اللہ علیہ کا درج ذیل یہ جملہ تو نقل کیا:

"بعض فضیلتیں اس درجہ قبول ورضا میں واقع ہوتی ہیں کہ وہ ایک عنداللہ ہزار پر غالب آتی ہے......"

لیکن کرم کرتے ہوئے کوئی مثال پیش نہیں فرمائی، مثال سے بات قریب الفہم ہو جاتی ہے اور مجھ ایسے ناقص العقل لوگوں کو بھی کسی حد تک سمجھ آجاتی ہے۔ خیر، اگر انہوں نے زحمت نہیں فرمائی تو یہ احقر مثال پیش کر دیتا ہے۔ مجھے ایک حدیث سے اہل بیت کرام علیهم السلام کی ایک ایسی فضیلت سمجھ آئی ہے جو ہزار فضیلتوں پر نہیں بلکہ بے شمار فضیلتوں پر غالب ہے، اور وہ حدیث یہ ہے:

إني تارك فيكم الثقلين، أحدهما أكبر من الآخر، كتابَ الله ﷻ، وعترتي أهل بيتي، فانظروا كيف تخلفوني فيهما، فإنهما لن يتفرقا حتىٰ يردا عليَّ الحوض، ثم قال: إن الله مولاي، وأنا وليُّ كل مؤمن، ثم أخذ بيد علي، فقال: مَن كنتُ وليُّه فهذا وليُّه.[۱]

"بیشک میں تم میں دو عظیم الشان چیزیں چھوڑ رہا ہوں، ان میں سے ہر ایک دوسری سے بڑی ہے، اللہ ﷻ کی کتاب اور میری اولاد، میرے اہل بیت، پس تم غور کرنا کہ ان دونوں چیزوں کے بارے میں تم میرا کتنا لحاظ رکھتے ہو؟ بلاشبہ یہ دونوں چیزیں ایک دوسری سے جدا نہیں ہوں گی، حتیٰ کہ دونوں اکٹھے میرے پاس حوض پر آئیں گی۔ پھر فرمایا: بیشک اللہ تعالیٰ میرا مولیٰ ہے اور میں ہر مومن کا مولیٰ ہوں، پھر حضور ﷺ نے سیدنا علی علیہ السلام کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: جس شخص کا میں مولیٰ ہوں تو یہ بھی اس کے مولیٰ ہیں"۔

(خصائص أمير المؤمنين علي بن أبي طالب علیہ السلام ص۱۱۲، حديث۷۸، وط: ص۹۶، حديث۷۹،

---

[۱] "حديث الثقلين" کی تردید میں مکتبِ فکر دیوبند کے ایک لکھاری محمد نافع نے "حديث الثقلين" ہی کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی، پھر اُس کی تردید میں اسی مکتبِ فکر کے عالم سید محمد لعل شاہ بخاری نے "خطبہ غدیر خم يُعْنىٰ بها وصاية النبي ﷺ بولاية علي كرم الله وجهه" کے نام سے کتاب لکھی ہے، اہل علم کو چاہیئے کہ اس کتاب کا مطالعہ ضرور فرمائیں۔

وط: ص ٨٤، حديث ٧٦؛ السنن الكبرىٰ للنسائي ج ٧ ص ٣١٠، حديث ٨٠٩٢، وص ٤٣٦، حديث ٨٤١٠، وط: ج ٥ ص ٤٥، حديث ٨١٤٨ وص ١٣٠، حديث ٨٤٦٤؛ المستدرك للحاكم ج ٣ ص ١٠٨، ١٠٩، حديث ٤٦٣٣، ٤٦٣٤، ٤٦٣٥؛ استجلاب ارتقاء الغرف للسخاوي ج ١ ص ٣٤٢)

احادیث کی رو سے قرآن کریم کی فضیلت باقی کلاموں پر ایسی ہے جیسی اللہ تعالیٰ کی فضیلت ساری مخلوق پر، اور احادیث ہی کی رو سے بنو ھاشم پوری انسانیت سے (ماسوا انبیاء کرام علیہم السلام کے) افضل ہیں اور بنو ھاشم سے اہل بیت کرام افضل ہیں۔ اس تصور کو مدنظر رکھتے ہوئے بتلایئے کہ "احدهما اكبر من الآخر" کا کیا مطلب ہے اور اگر اہل بیت (جس میں مولیٰ علی بھی شامل ہیں) کی عظمت قرآن کریم کے برابر ہے تو پھر ہے کوئی جس کی ساری فضیلتیں اس فضیلتِ عظمیٰ کا مقابلہ کر سکیں؟ حق فرمایا تھا یکے از ائمہ اہل سنت امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ نے کہ:

يا بني! علي بن أبي طالب من أهل بيت لا يُقاسُ بهم أحد.

"بیٹا! سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اہلِ بیت سے ہیں اُن پر کسی کو قیاس نہ کیا جائے"۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ افضل یا قرآن؟

بعض علماء کرام کی تصانیف میں یہ عنوان تو نظروں سے گزرا ہے کہ نبی کریم ﷺ افضل یا قرآن کریم، غالباً علامہ نبہانی رحمۃ اللہ علیہ کی بعض کتب میں یہ بحث موجود ہے لیکن حضرت خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں ایک مرتبہ یہ بحث چھڑ گئی کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ افضل یا قرآن۔ چنانچہ اُن کے ملفوظات میں ہے:

"اس کے بعد حضرت اقدس نے مولوی غلام رسول سے، جو جید عالم تھے، پوچھا کہ لفظ "احدهما اعظم من الآخر" (ایک دوسرے سے زیادہ افضل ہوگا) سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے کہا: قبلہ اس لفظ کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے سے اعظم ہے۔ اولاد کتاب اللہ سے اور کتاب اللہ اولاد سے۔ یعنی دونوں کو عظیم الشان سمجھو۔ جس کے ساتھ تمسک کرو گے گمراہ نہیں ہو گے۔ حضرت اقدس نے متبسم ہو کر فرمایا کہ اس لفظ کے معنی یہ ہیں کہ ان دونوں میں سے عترت (اولاد) زیادہ اشرف ہیں۔ اس کی دلیل حضرت علی رضی اللہ عنہ کا وہ قول ہے: انا قرآن وهذا قرآن صامت (میں بولنے والا قرآن ہوں اور یہ خاموش قرآن ہے) ظاہر ہے کہ

بولنے والا قرآن خاموش قرآن سے زیادہ افضل ہے۔ جب حضرت علی علیہ السلام اہل بیت سے ہیں اور قرآنِ ناطق ہیں تو جو شخص ان کی مانند ہے اور اہل بیت سے ہے تو وہ بھی قرآن ناطق ہے اور اس قرآن صامت سے زیادہ افضل واشرف ہے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد کتاب اللہ سے زیادہ افضل واشرف ہے۔ لہٰذا لفظ "أحدهما" سے مراد عترت (اولاد) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ اس کے بعد مولوی صاحب مذکور نے عرض کیا قبلہ قرآن مجید خدا تعالیٰ کا کلام ہے اور کلام صفات اللہ میں سے صفت ہے۔ لہٰذا حضرت علی علیہ السلام کا افضل ہونا قرآن مجید سے جو اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، موزوں نظر نہیں آتا۔ حضرت اقدس نے دوبارہ متبسم ہو کر فرمایا کہ قرآن شریف ایک صفت الٰہی ہے جملہ صفات میں سے، لیکن حضرت علی علیہ السلام میں تمام صفات الٰہی موجود ہیں، پس لازماً وہ جامع ہے تمام صفات الٰہی کا افضل واعظم ہے ایک صفت سے خصوصاً جب صفت کلام بھی بدرجۂ اولیٰ حضرت علی علیہ السلام کے وجود مسعود میں موجود ہے۔ اسی وجہ سے آپ نے خود ارشاد فرمایا کہ میں قرآن ناطق ہوں اور یہ قرآن صامت ہے"۔

(مقابیس المجالس ص ۹۳۳، ۹۳۴)

وضاحت

ہر چند کہ حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد احقر کی عقل سے ماوراء ہے، تاہم خواجہ صاحب اس فکر میں منفرد نہیں کیونکہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کا عقیدہ بھی یہی ہے بلکہ اغلب یہ ہے کہ خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہا نہیں سے متاثر ہیں۔ اس لیے کہ شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ نے "كان خلقه القرآن" (قرآن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خُلق ہے) کے تحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کلام الٰہی کی طرح سراپا صفتِ الٰہی قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

فمن أراد أن يرى رسول الله ﷺ ممّن لم يدركه من أمته فلينظر إلى القرآن، فإذا نظر فيه فلا فرق بين النظر إليه وبين النظر إلى رسول الله ﷺ، فكان القرآن انتشأ صورة جسدية يقال لها محمد بن عبد الله بن عبد المطلب، والقرآن كلام الله وهو صفته، فكان محمد صفة الحق تعالىٰ بجملته.

"پس آپ کا وہ اُمتی جس نے آپ کو نہیں دیکھا اگر وہ چاہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت

کرے تو وہ قرآن کو دیکھے۔ پس جب وہ قرآن میں غور کرے گا تو اسے قرآن کو دیکھنے اور رسول اللہ ﷺ کو دیکھنے کے درمیان کوئی فرق نظر نہیں آئے گا۔ گویا اگر قرآن صورتِ حسی اپنائے تو اسے کہا جائے گا محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب۔ قرآن اللہ کا کلام اور اُس کی صفت ہے تو سیدنا محمد ﷺ بھی حق کی سراپا صفت ہیں"۔

(الفتوحات المکیة لابن عربي ج۷ص۱۰۹ ،وط: ج۷ص۸۹)

دوسری طرف نبی کریم ﷺ نے مولیٰ علی علیہ السلام کی شان میں فرمایا کہ "علی مجھ سے اور میں اُس سے ہوں" اور کبھی علی و فاطمہ اور حسنین کریمین علیہم السلام سب ہی کی شان میں فرمایا: وہ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں۔ چنانچہ ایک طویل حدیث کے دعائیہ الفاظ میں یہ جملہ بھی آیا ہے:

اللّٰهم إنهم مني وأنا منهم.

"اے اللہ! وہ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں"۔

(مسند فاطمة الزهراء للسيوطي ص٥٤، حديث٨٤؛ جامع الأحاديث الكبير ج٢ص١٣١، حديث ٤٣٩٣؛ جمع الجوامع ج٢ص١٢٥، حديث٤٣٩٣؛ استجلاب ارتقاء الغرف ج٢ص٤٤٨؛ جواهر العقدين ص٢٩٧؛ القول البديع ص١٢٣، ١٢٤؛ الصواعق المحرقة ص٢٣٣؛ كنز العمال ج١٣ص٦٠٣، حديث ٣٧٥٤٤)

نبی کریم ﷺ تو "مِنَ اللّٰہِ نُوْرٌ" وغیرھا آیات و احادیث کی روشنی میں مظہرِ خدا ہیں ہی اور مذکورہ بالا احادیث کی روشنی میں اہل کساء علیہم السلام مظہرِ مصطفیٰ ثابت ہوتے ہیں اور چونکہ صفت سے موصوف کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور نبی کریم ﷺ سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے، لہٰذا آپ بلاواسطہ سراپا صفتِ خدا ہیں اور سیدنا علی اور دوسرے اہل کساء علیہم السلام بالواسطہ صفتِ خدا ہیں۔ لہٰذا اغلب یہ ہے کہ ایسے ہی دلائل کے پیشِ نظر خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ نے مولیٰ علی علیہ السلام کو سراپا صفتِ خدا قرار دیا ہوگا۔ واللہ أعلم.

تمام فضائل کے جامع صحابی کون؟

یہاں آخر میں ہم ایک ایسی "ضرب المثل" نقل کر رہے ہیں جس سے سیدنا امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ کے قول کی حقانیت مزید روشن ہو جائے گی۔ امام عبدالحی الکتانی الفاسی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

كان يضربُ المثل بفضائل علي في الكثرة، كما قال محمد بن مكرم لأبي علي البصير: فضولک والله أكثر من فضائل علي، وقال الجاحظ: لا يعلم رجلٌ في الأرض، متى ذكر السبق في الإسلام، والتقدم فيه، ومتى ذكرت النخوة، والذب عن الإسلام، ومتى ذكر الفقه في الدين، ومتى ذكر الزهد في الأمور، التي يتناصر الناس عليها، وكان مذكوراً في هذه الخلال كلها إلاعلي.

وكان الحسن يقول: قد يكون الرجل عالماً، وليس بعابد، وعابداً وليس بعالم، وعابداً عالماً وليس بعاقل، وسليمان بن يسار عالم عابد عاقل. قال الثعالبي في الثمار: انظر ابن تقع خلالُ سليمان من خصال علي، آه.

وقال الحافظ ابن الجزري في كتابه "أسنى المطالب في مناقب علي بن أبي طالب" (ص٥٩): انتهت إليه جميع الفضائل من أنواع العلوم، وجميع المحاسن، وكرم الشمائل من القرآن والحديث، والفقه، والقضاء، والتصوف، والشجاعة، والولاية، والكرم، والزهد، والورع، وحسن الخلق، والتقوى، وإصابة الرأي.

ونقل عن الإمام أحمد أنه قال: ما جاء لأحد من أصحاب رسول الله ﷺ من الفضائل ما جاء لعلي بن أبي طالب.

''سیدنا علی ؓ کے فضائل کی کثرت تو ''ضرب المثل'' کی صورت اختیار کر گئی تھی، جیسا کہ محمد بن مکرم نے ابو علی البصیر کو کہا: ''واللہ! آپ کے فضائل تو علی ؓ کے فضائل سے بھی زیادہ ہے'' اور جاحظ نے کہا: روئے زمین پر ایسا کوئی شخص نہیں جانا گیا کہ جب اسلام میں سبقت اور تقدم کا ذکر کیا جائے، اور جب بہادری کا ذکر کیا جائے، اور جب دفاع اسلام کا ذکر کیا جائے، اور جب دین کی فقہ کا ذکر کیا جائے، اور جب معاملات میں ایسے زھد کا ذکر کیا جائے جو دین میں مددگار ثابت ہو تو ان تمام خصائل میں وہ شخص مذکور ہو، ماسوا علی مرتضی ؓ کے۔

اور حضرت حسن بصری ؒ فرمایا کرتے تھے: کبھی کوئی شخص عالم ہوتا ہے تو عابد نہیں ہوتا اور عابد ہوتا ہے تو عالم نہیں ہوتا، اور عابد و عالم دونوں ہوتا ہے تو عاقل نہیں ہوتا لیکن سلیمان بن

یسار عالم، عابد اور عاقل تینوں صفات سے متصف تھا۔ ثعالبی نے "الثمار" میں کہا ہے: اے ابن مقفع سلیمان بن یسار کی خوبیوں کے تناظر میں ذرا خصائلِ مرتضوی میں تو غور کر!

اور حافظ ابن الجزری نے اپنی کتاب "أسنى المطالب في مناقب علي بن أبي طالب" صفحہ ۵۹ میں کہا ہے: سیدنا علیؑ پر تمام فضائل کی انتہا ہوتی ہے: یعنی علوم کی تمام اقسام، جمیع محاسن، صفاتِ حمیدہ، قرآن، حدیث، فقہ، قضاء، تصوف، شجاعت، ولایت، کرم، زھد، ورع، حسن خلق، تقویٰ اور فکری درستگی۔ اور انہوں نے امام احمد بن حنبلؒ کا یہ قول نقل کیا ہے: رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرامؓ میں سے کسی کے فضائل اتنے نہیں آئے جتنے علی بن ابی طالبؑ کے آئے ہیں"۔

(نظام الحكومة النبوية ج۲ ص ۲۵۱)

تمام فضائل میں سیدنا علیؑ کا تذکرہ کیوں؟ اس لیے کہ انہیں بچپن ہی میں آغوش نبوی ﷺ میسر آ گئی تھی اور اُس کی بدولت انہیں تمام فضائل میں کمال حاصل ہونا لازمی تھا۔ اسی کو امام محمد بن اسحاق بن یسارؒ سمیت تمام سیرت نگار حضرات نے سیدنا علیؑ پر خصوصی انعامِ الٰہی قرار دیا ہے۔

مقامِ تعجب

جس ہستی کے فضائل کی کثرت پر محاورے اور ضرب الامثال مشہور تھیں اور جن کے فضائل کی کثرت پر امام احمد بن حنبلؒ سے لے کر اب تک تمام علماء حدیث متفق ہیں، نہ جانے پندرھویں صدی میں اُن کے فضائل کی احادیث کو چند کتب حدیث سے نکال کر اور ضرب و جمع کا چکر چلا کر کم دکھلانے کی کوشش کیوں کی گئی؟





حدیث "من کنت مولاہ" کا متواتر ہونا

﴿۱﴾ اخبرنا أبوحفص عمر بن الحسن المراغي فيماشافهني به، عن أبي الفتح يوسف بن يعقوب الشيباني،أخبرنا أبو اليمن زيد بن الحسن الكندي، أخبرنا أبو منصور القزاز، أخبرنا الإمام أبوبكر بن ثابت الحافظ، أخبرنا محمد بن عمر بن بكير،أخبرنا أبوعمر يحي بن عمر الأخباري، حدثنا أبوجعفر أحمد بن محمد الضبعي،حدثنا الأشج، حدثنا العلاء بن سالم ،عن يزيد بن أبي زياد عن عبد الرحمن بن أبي ليلى قال:

سمعتُ علياً ﷺ بالرحبة، ينشد الناس من سمع النبي ﷺ يقول: من كنت مولاه فعلي مولاه، اللّٰهم والِ من والاه،وعادِ من عاداه، فقام إثنا عشر بدرياً فشهدوا أنهم سمعوا رسولَ الله ﷺ يقول ذلک.

هذا حديث حسن من هذا الوجه،صحيح من وجوهٍ كثيرة تواتر عن أمير المؤمنين علي، وهو متواترٌ أيضاً عن النبي ﷺ.

﴿۱﴾ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ فرماتے ہیں: ''رحبۃ'' میں مَیں نے سیدنا علی ﷺ سے سنا، وہ قسم دے کر لوگوں سے پوچھ رہے تھے کہ کس کس نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا تھا: ''میں جس کا مولیٰ ہوں تو علی بھی اس کے مولیٰ ہیں، اے اللہ! تو اُس سے محبت کر جو اِس سے محبت کرے اور اُس سے دشمنی رکھ جو اِس سے دشمنی رکھے'' تو اس پر بارہ بدری صحابہ کرام ﷺ نے کھڑے ہو کر گواہی دی کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا تھا۔

یہ حدیث اس سند سے حسن ہے، بہت سی سندوں سے صحیح ہے، امیر المومنین علی بن ابی طالب ﷺ سے متواتر ہے، نیز نبی کریم ﷺ سے بھی متواتر ہے۔

(مسند أبي يعلى ج١ ص٢٥٧، حديث٥٢٣، وط: ج١ ص٤٢٩، حديث٥٦٧؛ زوائد عبدالله بن أحمد ص٤١٣، حديث٩١٧؛ رسالة طرق حديث من كنت مولاه، للذهبي ص١٨، ١٩، حديث ٤٧؛ البداية والنهاية ج٥ ص٤٦١، وط: ج٧ ص٥٧٤)

حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ امام ذہبی فرماتے ہیں: میں یقین کرتا ہوں کہ یہ حدیث متواتر ہے۔

(البداية والنهاية ج٥ ص٢٩٦، ٢٩٧)

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی احادیثِ متواترہ پر اپنی ایک مخصوص تصنیف میں اس حدیث کو متواتر ثابت فرمایا ہے، ملاحظہ ہو:

(قطف الأزهار المتناثرة فی الأخبار المتواترة ص ۲۷۷ حدیث ۱۰۲)

امام مناوی نے بھی امام سیوطی سے اس حدیث کا متواتر ہونا نقل کیا ہے۔

(فیض القدیر ج ۱۱ ص ۶۰۰۱)

کیا حدیث ”من کنت مولاہ“ ضعیف ہے؟

مصنف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

رواه الجم الغفيرُ عن الجم الغفيرِ، ولا عبرة بمن حاول تضعيفه ممن لا اطلاع له في هذا العلم.

ایک جم غفیر نے اس حدیث کو دوسرے جم غفیر سے روایت کیا ہے، لہٰذا اُس شخص کی بات لائق توجہ نہیں ہے جس نے اس حدیث کو ضعیف قرار دینے میں حیلے بازیاں کیں، جس کو اس علم کی اطلاع ہی نہیں۔

غالبًا امام جزری رحمۃ اللہ علیہ کا اشارہ ابن تیمیہ وغیرہ کی طرف ہے، اس لیے کہ انہوں نے اس حدیث پر سخت حکم لگایا ہے، جیسا کہ ہم ”شرح خصائص علي ﷺ“ میں اُن کی مفصل اور مدلل تردید کر چکے ہیں، وہاں ہم نے اُن کی تردید میں امام ذہبی، ابن تیمیہ کے دوسرے تلامذہ اور اُن کے پیروکاروں کی عبارات نقل کر چکے ہیں، اور خود امام جزری بھی اُن کے بعض تلامذہ کے شاگرد ہیں۔

اس حدیث کے راویوں کی کثرت

مصنف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

فقد ورد مرفوعاً عن أبي بكر الصديق، وعمر بن الخطاب، وطلحة بن عبيد الله، والزبير بن العوام، وسعد بن أبي وقاص، وعبد الرحمن بن عوف، والعباس بن عبد المطلب، وزيد بن أرقم، والبراء بن عازب، وبُرَيدة بن الحصيب، وأبي هريرة، وأبي سعيد الخدري، وجابر بن عبد الله، وعبد الله بن العباس، وحبشي بن جنادة، وعبد الله بن مسعود، وعمران بن حصين، وعبد الله بن عمر، وعمار بن ياسر، وأبي ذر الغفاري، وسلمان الفارسي،

وأسعد بن زرارة، وخزيمة بن ثابت، وأبي أيوب الأنصاري، وسهل بن حنيف، وحذيفة بن اليمان، وسمرة بن جندب، وزيد بن ثابت، وأنس بن مالک، وغيرهم من الصحابة رضوان الله عليهم.

بیشک یہ حدیث مرفوعاً حضرات ابوبکر صدیق، عمر بن الخطاب، طلحہ بن عبید اللہ، زبیر بن العوام، سعد بن ابی وقاص، عبد الرحمان بن عوف، عباس بن عبد المطلب، زید بن ارقم، براء بن عازب، بریدۃ بن حصیب، ابوھریرہ، ابوسعید خدری، جابر بن عبد اللہ، عبد اللہ بن عباس، حُبشی بن جُنادہ، عبد اللہ بن مسعود، عمران بن حصین، عبد اللہ بن عمر، عمار بن یاسر، ابوذر غفاری، سلمان الفارسی، اسعد بن زرارہ، خزیمہ بن ثابت، ابوایوب انصاری، سہل بن حنیف، حذیفہ بن یمان، سمرہ بن جندب، زید بن ثابت، انس بن مالک اور دوسرے صحابہ کرام ﷺ سے روایت ہے۔

نوٹ

مصنف (امام جزری) رحمۃ اللہ علیہ کو راویانِ حدیث کی اِس فہرست میں کچھ ذھول سا ہو گیا، کیونکہ اُن سے اس حدیث کی سند میں بعض ایسے صحابہ کرام ﷺ کا نام بھی درج ہو گیا جو خطبۂ حجۃ الوداع سے قبل انتقال فرما گئے تھے، واللہ اعلم۔

حدیثِ ھٰذا میں قطعی خبر ہے

مصنف رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وصح عن جماعة منهم ممن يحصل القطع بخبرهم، ويثبت أيضاً أن هذا القول كان منه ﷺ يوم (غدير خم) وذلک في خطبة خطبها النبي ﷺ في حقه ذلک اليوم، وهو الثامن عشر من ذی الحجة سنة إحدى عشرة، لما رجع ﷺ من حجة الوداع ولذلک سبب سنذكره قريباً. والله أعلم.

اور ایک جماعت نے اس حدیث کو نقل کیا ہے ان میں ایسے حضرات بھی ہیں جن کی خبر سے قطعیت حاصل ہوتی ہے، اور یہ بھی ثابت ہے کہ یہ حدیث نبی کریم ﷺ نے غدیرِ خم کے دن اُس خطبہ میں ارشاد فرمائی تھی جو آپ نے سیدنا علی ﷺ کے حق میں گیارہ ہجری اٹھارہ ذی الحج کو حجۃ الوداع سے واپسی پر دیا تھا، اس ارشاد کا ایک سبب (بھی) ہے جو ہم عنقریب بیان کریں گے، اور اللہ سب سے بڑا عالم ہے۔

حدیث "مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ" کی تحقیق

اندازہ فرمایئے حدیثِ ھٰذا کے راویوں کی کثرت کی وجہ سے مصنف اور دوسرے محدثین کرام رحمۃ اللہ علیہم نے اس کو متواتر اور اس سے حاصل ہونے والی خبر کو قطعی تک قرار دیا ہے مگر حیرت ہے کہ بعض لوگوں نے شیعی استدلالات سے گھبرا کر اس حدیث کا ہی انکار کردیا ہے۔ علماء دیوبند میں سے ایک مشہور عالم علامہ سید لعل شاہ بخاری نے ایسے تمام لوگوں کا انتہائی مھذّب، متین اور مدلل رَدّ فرمایا ہے، اہل علم کے لیے اُن کی تحقیق ایک بیش بہا تحفہ ہے، جیسا کہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں۔

دراصل اس حدیث کی صحت کے منکرین کو اس کی صحت کا علم ہوتا ہے مگر وہ خرگوش کی طرح آنکھیں بند کرنے کی کوشش کرتے ہیں جیسا کہ علامہ ابن تیمیہ اور حکیم محمود احمد ظفر سیالکوٹی وغیرہ۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں احقر کی کتاب "شرح خصائص علي ﷺ" میں حدیث نمبر ۸۵ کی تحقیق ملاحظہ فرمائیں۔ وہاں ہم نے علامہ ابن تیمیہ کے تلامذہ اور تب سے اب تک اُن کے متبعین کی عبارات سے ان کی ایسی مدلل تردید کی ہے جو اہل علم کے لیے مطالعہ کی چیز ہے۔ ان کے علاوہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو اس حدیث کی سند و متن کو دلائل سے رد کرنے کی جرأت نہیں رکھتے اور بالفرض مان لینے کا تأثر دے کر طرح طرح کی معنوی تاویلات و حیلے بازیاں کر کے شانِ مرتضوی کو دھندلانے کی کوشش کرتے ہیں، جیسا کہ حکیم ظفر سیالکوٹی اور بعض معاصرین وغیرہ۔ آئندہ حدیث کی تشریح میں ایسے تمام لوگوں کی تاویلاتِ فاسدہ کا جائزہ لیا جائے گا۔

اس حدیث کے عینی شاھدین

پچھلی حدیث کے متن میں بارہ بدری صحابہ کرام ﷺ کی گواہی کا ذکر آچکا ہے کہ انہوں نے براہ راست یہ ارشاد نبی کریم ﷺ سے سنا تھا، درج ذیل حدیث میں بھی کچھ صحابہ کرام ﷺ کی گواہی کا ذکر ہے، چنانچہ مصنف رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

﴿۲﴾ كما أخبرنا شيخنا أبو عمر محمد بن أحمد بن قدامة المقدسي قراءة عليه، أخبرنا الإمام فخر الدين علي بن أحمد المقدسي، أخبرنا أبو علي حنبل بن عبد الله الرصافي، أخبرنا أبو القاسم الشيباني، أخبرنا أبو علي بن المذهب، أخبرنا أحمد بن جعفر، حدثنا عبد الله بن الإمام أحمد، حدثنا علي بن حكيم الأودي، أخبرنا شريك، عن أبي إسحاق، عن سعيد بن

وهب، وعن زيد بن يثيع، قالا:

أنشد علي رضي الله عنه الناس في الرحبة من سمع رسول الله ﷺ يقول يوم غدير خم إلا قام، قال: فقال من قِبل سعيد بن وهب سبعة، ومن قِبل زيد ستة، فشهدوا أنهم سمعوا رسولَ الله ﷺ يقول: لعلي يوم غدير خم: أليس الله أولى بالمؤمنين؟ قالوا: بلى، قال: اللّٰهم من كنت مولاه فعلي مولاه، اللّٰهم والِ من والاه وعادِ من عاداه.

﴿٢﴾ ابو اسحاق سعید بن وھب اور زید بن یثیع رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے مقام رحبہ میں لوگوں کو قسم دے کر فرمایا کہ جنہوں نے غدیر خم کے روز نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا تھا وہ کھڑے ہو جائیں، راوی کہتے ہیں: تو سعید بن وھب کے پہلو سے سات اور زید بن یثیع کے پہلو سے چھ افراد نے کھڑے ہو کر گواہی دی کہ اُنہوں نے غدیر خم کے دن رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا تھا: کیا اللہ تعالیٰ تمام مومنین کا مولیٰ نہیں ہے؟ انہوں نے عرض کیا: کیوں نہیں، آپ ﷺ نے عرض کیا: اے اللہ! میں جس کا مولیٰ ہوں تو علی اس کے مولیٰ ہیں، اے اللہ! اُس سے محبت فرما جو اِس سے محبت کرے اور اُس سے دشمنی رکھ جو اِس سے دشمنی رکھے۔

محبِ مرتضیٰ کے لیے دعاءِ مصطفیٰ ﷺ

مصنف رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

﴿٣﴾ وبه قال: حدثنا علي بن حكيم، أخبرنا شريک، عن أبي إسحاق، عن عمرو ذي مُر، بمثل حديث أبي إسحاق، يعني عن سعيد، وزيد، وزاد فيه:

وَانْصُرْ من نصره، واخْذُلْ من خذله.

هكذا رويناه في مسند الإمام أحمد من حديث ابنه، فالطف طريق وقع بهذا الحديث وأغربه، ما حدثنا به شيخنا خاتمة الحفاظ أبو بكر محمد بن عبد الله بن المحب المقدسي مشافهة.

﴿٣﴾ ایسے ہی ہمیں علی بن حکیم نے بیان کیا، انہوں نے کہا ہمیں شریک نے از ابو اسحاق از عمرو ذی مُر ابو اسحاق کی حدیث کی مانند بیان کیا یعنی سعید اور زید کی سند سے، اور اس میں یہ الفاظ زائد ہیں:

”اس شخص کی مدد فرما جو اس کی مدد کرے اور اُس کو بے سہارا چھوڑ دے جو اسے بے سہارا چھوڑ دے“۔

ایسے ہی ہم نے امام احمد کی "المسند" میں ان کے فرزند سے روایت کیا ہے، لہٰذا یہ سند اُس سند کی بہ نسبت زیادہ قریب ہے جو ہمیں ہمارے شیخ خاتمۃ الحفاظ ابوبکر محمد بن عبداللہ بن محب المقدسی نے براہِ راست بیان کی۔

(مسند أحمد ج١ ص١١٩، حديث٩٦٤، وط: محققة ج٢ ص٢٧١، حديث٩٦٤، ٩٥٠؛ زوائد عبد الله فی المسند ص٤١٨، حديث١٩٩؛ الغيلانيات ج١ ص١٦٨، حديث١٢٦؛ الأمالي للمحاملي ص٨٥، حديث٣٥، وص١٦٢، حديث١٣٣؛ المصنفات لابن البختري ص١١٦، حديث١٥؛ المعجم لابن المقري ص١٢، ١٣، حديث١٥، ١٨؛ البداية والنهاية ج٤ ص١٦٩ وط: ج٥ ص٢٩٠)

حافظ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"اس حدیث کو امام بزار اور عبداللہ بن احمد نے روایت کیا ہے اور ان کی سند حسن ہے"۔

(مجمع الزوائد ج٩ ص١٠٧، وط: ج٩ ص١٣٤، حديث١٤٦٢٧، وط: ج٩ ص ٩٢، ٩٣، حديث ١٤٦٢٧)

امام بزار کی روایت میں بھی تیرہ افراد کی گواہی کا ذکر ہے اور آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں:

واحب من أحبه، وأبغض من أبغضه، وانصُرْ من نصره، واخذُلْ من خذله.

"اور اُسے محبوب رکھ جو اِسے محبوب رکھے اور اُس سے بغض رکھ جو اِس سے بغض رکھے اور اُس کی مدد کر جو اِس کی مدد کرے اور اُسے بے آسرا چھوڑ جو اسے بے آسرا چھوڑ دے"۔

(مسند البزار ج٣ ص٣٤، حديث٧٨٦؛ زوائد عبد الله بن أحمد فی المسند ص٤١٩، حديث ٢٠٠؛ تاريخ دمشق ج٤٢ ص ٢١٠)

حافظ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"اس حدیث کو امام بزار نے روایت کیا ہے اور ان کے راوی صحیح حدیث کے راوی ہیں، ماسوا فطر بن خلیفہ کے اور وہ (بھی) ثقہ ہے"۔

(مجمع الزوائد ج٩ ص١٠٥، وط: ج٩ ص ١٣٠، حديث ١٤٦١٤، وط: ج٩ ص٨٩، حديث ١٤٦١٤، وط: ج١٨ ص٢١٢ حديث١٤٦١٦؛ كشف الأستار عن زوائد البزار ج٣ ص١٩١، حديث٢٥٤٢)

اپنی شان میں احادیث پر گواہ کیوں؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ سیدنا علی المرتضیٰ ؓ نے پہلے تو بھرے اجتماعات میں اپنی شان میں واردشدہ احادیث بیان فرمائیں پھر لوگوں کو قسم دے کر فرمایا کہ جس جس نے یہ احادیث نبی کریم ﷺ سے سماعت کی ہوں تو وہ گواہی دے کہ واقعی اس نے یہ احادیث سنی تھیں، آخر اس اہتمام کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض لوگوں نے افواہیں پھیلا کر رائے عامہ کو اس حد تک سیدنا علی المرتضیٰ ؓ کے خلاف کر دیا تھا کہ کچھ نادان لوگ انہیں سراپا برائی تصور کرنے لگے تھے، اس لیے ناگزیر ہو گیا تھا کہ سیدنا علی علیہ السلام لوگوں کے ایمان کو بچانے کی غرض سے اپنی شان میں واردشدہ احادیث پیش فرمائیں، سو اس فرض کو نبھاتے ہوئے انہوں نے پہلے احادیث بیان فرمائیں پھر اُن احادیث کی حقانیت اور اپنی صداقت پر چشم دید گواہ کھڑے کر کے اتمام حجت فرما دیا۔

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى

اللہ ﷻ کی قدرت ہے کہ وہ جنہیں زیادہ عظمتوں سے نوازتا ہے اُن کے حاسدین و معاندین بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ اُس کی مخلوق میں انبیاء کرام علیہم السلام سے زیادہ باعظمت کوئی مخلوق نہیں مگر اُن سے زیادہ دشمن بھی کسی کے نہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ.

''اور اسی طرح بنادیا ہم نے ہر نبی کے لیے دشمن شیطان انسانوں اور جنوں کو''۔(الأنعام: ۱۱۲)

پھر انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد سب سے زیادہ دشمن اُن کے ہوتے ہیں اور سب سے زیادہ مصائب کا شکار بھی وہ ہوتے ہیں جن کا رتبہ بعد از انبیاء کرام علیہم السلام سب سے زیادہ ہوتا ہے، اسی لیے اہل بیت کرام ؓ پر سب سے زیادہ مصائب و تکالیف آئیں۔ لہٰذا خود سوچیے اُس ہستی کے بارے میں جو اہل بیت کی سردار ہے، جن کا رتبہ حضور ﷺ کی بارگاہ میں ہارون علیہ السلام کی طرح ہے، جن کو سید الانبیاء ﷺ نے مثیلِ عیسیٰ ہی نہیں فرمایا بلکہ فرمایا ''علي كنفسي'' (علی میری مانند ہے) اُن کے دشمن کتنے ہوں گے؟ یقیناً اُتنا جتنا اُن کا رتبہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عظیم ہستی کے دشمن نہ صرف یہ کہ اُنہیں ان کی حیات میں جھوٹی افواہوں اور طرح طرح کے مصائب و آلام سے پریشان کرتے رہے بلکہ انہوں نے اُن کی شہادت کے بعد بھی اپنی دشمنی جاری رکھی، اور صرف جاری

ہی نہیں بلکہ اُس میں مزید شدت پیدا کردی، حتیٰ کہ مساجد کے منبروں کو بھی اس دشمنی کی نجاست سے آلودہ کرنے سے گریز نہ کیا۔

ایسے نامساعد حالات میں حق پرست فقہاء، محدثین، مفسرین اور علماء کرام ﷺ نے اہل اسلام کے ایمان کی حفاظت کی خاطر فضائلِ مرتضوی کو پھیلایا اور لوگوں کو اُن سے محبت کرنے کے اجر وثواب اور اُن سے عداوت رکھنے کے عذاب سے آگاہ فرمایا۔ یہ انتہائی مبارک فریضہ ہے، جسے اہل حق ہر دور میں نبھاتے رہے ہیں۔ آج بھی اس عظیم امام کی عظمتیں عروج پر ہیں اور اسی تناسب سے اُن کے دشمنوں اور بدخواہوں کی شرارتیں بھی زوروں پر ہیں۔ لہٰذا اہل حق کو چاہیے کہ وہ دنیوی مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر اپنی پوری توانائی کے ساتھ میدانِ عمل میں آئیں اور دامے، درمے، قلمے سخنے فضائل مرتضوی کو پھیلائیں، لوگوں کے دلوں میں محبت اہل بیت کرام علیہم السلام کو راسخ کریں اور اُن پر واضح فرمائیں کہ یہ محبت صحابہ کرام ﷺ پر بھی فرض تھی اور وہ سب محبانِ اہل بیت تھے۔ اسی محبت میں ایمان کی حفاظت ہے اور ایمان سے زیادہ قیمتی کوئی متاع نہیں۔

سیدہ سے فضائل مرتضیٰ ﷺ

﴿٤﴾ كما حدثنا به شيخنا خاتمة الحفاظ أبو بكر محمد بن عبدالله بن المحب المقدسي مشافهةً، أخبرتنا الشيخة أم محمد زينب ابنة أحمد ابن عبد الرحيم المقدسية عن أبي المظفر محمد بن فتيان بن المسيني، أخبرنا أبو موسىٰ محمد بن أبي بكر الحافظ، أخبرنا ابن عمة والدي، القاضي أبو القاسم عبد الواحد بن محمد بن عبد الواحد المديني بقرائتي عليه، أخبرنا ظفر بن داعي العلوي باستراباذ، أخبرنا والدي، وأبو أحمد بن مطرف المطرفي، قالا: حدثنا أبو سعيد الإدريسي إجازة فيما أخرجه في تاريخ إستراباذ، حدثني محمد بن محمد بن الحسن أبو العباس الرشيدي، من ولد هارون الرشيد بسمرقند، وما كتبناه إلا عنه، حدثنا أبو الحسن محمد بن جعفر الحلواني، حدثنا علي بن محمد بن جعفر الأهوازي مولى الرشيد، حدثنا بكر بن أحمد القصري، حدثتنا فاطمة بنت علي بن موسىٰ الرضا، [حدثتني فاطمة، وزينب وأم كلثوم بنات موسىٰ بن جعفر قلن: حدثتنا فاطمة بنت جعفر بن محمد الصادق، قالت: حدثتني فاطمة بنت محمد بن علي، حدثتني فاطمة بنت علي] حدثتني فاطمة

وسكينة ابنتا الحسين بن علي، عن أم كلثوم بنت فاطمة بنت النبي ﷺ رضي الله عنهم، قالت: أنسيتم قولَ رسولِ الله ﷺ يوم غدير خم؟ من كنت مولاه فعلي مولاه.

وقوله ﷺ:

أنت مني بمنزلة هارون من موسىٰ عليهما السلام.

وهكذا أخرجه الحافظ الكبير أبو موسىٰ المديني في كتابه المسلسل بالأسماء، وقال: وهذا الحديث مسلسل من وجه آخر، وهو إن كل واحدة من الفواطم تروى عن عمة لها، فهو رواية خمس بنات أخ كل واحدة منهن عن عمتها.

﴿٤﴾ سیدہ کائنات سیدتنا فاطمہ بنت رسول اللہ ﷺ ورضی اللہ عنہم فرماتی ہیں: کیا تم رسول اللہ ﷺ کا وہ ارشاد بھول چکے ہو جو آپ نے غدیر خم کے دن فرمایا تھا؟ میں جس کا مولیٰ ہوں تو علی اس کے مولیٰ ہیں، اور آپ ﷺ کا یہ قول (بھول چکے ہو): تمہاری منزلت میرے نزدیک ایسی ہے جیسی حضرت موسیٰ کے نزدیک حضرت ہارون علیہما السلام کی۔

اسی طرح حافظ الکبیر ابو موسیٰ المدینی نے اپنی کتاب "المسلسل بالأسماء" میں روایت کیا ہے، اور انہوں نے کہا ہے کہ یہ حدیث ایک اور سند سے مسلسل آئی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہر فاطمہ نامی راویہ نے اپنی پھوپھی سے روایت کیا ہے، سو پانچ راویات میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی پھوپھی سے روایت کیا۔

(نزهة الحفاظ لأبي موسىٰ المديني ص ١٠١)

مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ...... پر تاویلاتِ فاسدہ

قطع نظر اس سے کہ سیدۂ کائنات علیہا السلام نے کن لوگوں کو یہ ارشاد یاد دلایا تھا، اس سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ سیدہ کے نزدیک یہ مولیٰ علی ؑ کی دائمی اور خصوصی فضیلت ہے، اور اس سے اُس تاویل کی بھی تردید ہو جاتی ہے جو شیعہ کی تردید میں پیش کی جاتی ہے، اور جس سے یہ تأثر اُبھرتا ہے کہ یہ محض وقتی تسلی تھی جو چہ میگوئیوں اور شکایات کرنے والوں کا منہ بند کرنے کے لیے تھی۔ تردیدِ شیعہ کے جوش میں ایسی بھونڈی تاویلات کرنے والے لوگ اتنا بھی غور وفکر کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ ان کی ایسی تاویلات سے کیسی کیسی اولوالعزم ہستیوں کی عقل پر حملہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو سیدۂ کائنات کی یہ فہم ہے دوسری طرف پندرھویں صدی کے شیخ

الحدیث والتفسیر پیر سائیں غلام رسول قاسمی اِس خصوصیتِ مرتضوی پر یوں ہاتھ صاف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

''اُدھر اَلْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ کی نص قرآن میں موجود ہے یعنی تمام مومن مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے مولا ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ کی تفسیر میں امام باقر کا فرمان مولا علی کے بارے میں موجود ہے کہ عَلِيٌّ مِنَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا یعنی مولیٰ علی بھی مومنین میں شامل ہیں

(تفسیر ابنِ جریر جلد ۴ الجزء السادس صفحہ ۳۵۶، بغوی جلد ۲ صفحہ ۴۷، ابنِ کثیر جلد ۲ ص ۱۰۲)''۔

(ضربِ حیدری ص174)

امام محمد باقر بن علی کے قول کا سہارا

اس سے قبل کہ پیر سائیں کی تفسیر کا جائزہ لیا جائے یہ بتلانا ضروری ہے کہ امام باقر [محمد بن علی] کا تفسیری قول نقل کرنے میں صاحب ''ضربِ حیدری'' کو کوئی فائدہ نہیں، اس لیے کہ امام باقر نے فرمایا ہے کہ ''مولیٰ علی بھی مومنین میں شامل ہیں'' یہ بات بالکل حق ہے، اور اس سے نہ تو حدیث ''مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ'' کی خصوصیت کی نفی ہوتی ہے اور نہ ہی اس آیت کی دوسری تفاسیر کا دروازہ بند ہوتا ہے۔ کسی عام شخص کو معلوم ہو یا نہ ہو مگر اہلِ علم حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ قرآن کریم ذو وجوہ ہے، اس کی کسی آیت کو ایک ہی تفسیری قول میں بند نہیں کیا جا سکتا، الا یہ کہ شارع کسی آیت کو کسی ایک ہی تفسیر میں مقید فرما دیں یا آیت کو اس کے ظاہر پر چھوڑ دیں۔ اگر شارع سے کوئی ایسی پابندی نہ ہو تو پھر کسی آیت کی متعدد تفاسیر بھی ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ سیدنا ابو الدرداء فرماتے ہیں:

لا تفقه كل الفقه حتى ترى للقرآن وجوها كثيرة.

''تم دین کی مکمل سمجھ ہرگز حاصل نہیں کر سکتے یہاں تک کہ تم قرآن (کی تفسیر) میں وجوہِ کثیرہ کو ملحوظ رکھو''۔

(المصنف لعبد الرزاق ج۱۰ ص۲۳۹، حدیث ۲۰۶٤۰، وط: ج۱۱ ص۲۵۵، حدیث ۲۰٤۷۳؛ الزهد للإمام أحمد ص۱۹٦، حديث ۷۱۲؛ المصنف لابن أبي شيبة ج۱۵ ص۵۱۸، حديث ۳۰۷۸۹؛ الزهد لأبي داود ص۲۲۸، حديث ۲۲۹؛ نوادر الأصول ج۱ ص۷۹؛ كتاب الفقيه

والمتفقه ج١ ص١٩٨؛حلية الاولياء ج١ ص٢٧١؛جامع بيان العلم ج٢ ص٧٩؛ تفسير البغوي ج١ ص٣٥ ،وط: ج١ ص٤٦؛البرهان للزركشي ج١ ص١٩٣ ،وج٢ ص ٨٧، ٢٩٠؛الإتقان ج٢ ص ٤٦٠؛إحياء علوم الدين ج١ ص٢٧٢؛إتحاف السادةالمتقين ج٥ ص ١٣٠)

جب قرآن کریم کی وسعتِ معانی کا یہ عالم ہے تو پھر اس ہستی کے بارے میں یہ کیونکر تصور کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اس آیت کو ایک ہی تفسیر میں مقید سمجھ لیا جس کا لقب ہی "الباقر" ہے۔ باقر "بقر" سے ہے اور اس کا معنی ہے کسی چیز کا شق ہو کر وسیع اور کشادہ ہو جانا۔ امام محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب ﷺ کو باقر اس لیے کہا جاتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے مبارک سینے کو علم کے لیے کشادہ کر دیا تھا۔ چنانچہ اہلِ لغت و مفسرین کرام لکھتے ہیں:

وسمي محمد بن علي رضي الله عنهما بالباقر لاتساعه في دقائق العلم وشقه بواطنها فضلاً عن ظواهرها.

"امام محمد بن علی ﷺ کو باقر علمی مشکلات میں اُن کی وسیع معلومات کی وجہ سے کہا گیا، اس لیے کہ انہوں نے علمی دقائق کے ظاہر کو تو کیا باطن کو بھی شق کر دیا تھا"۔

(عمدة الحفاظ للحلبي ج١ ص٢٤٧؛المفردات في غريب القرآن ج١ ص٧٢)

لہٰذا اس قدر وسعت والے امام کی تفسیر کو ایک ہی قول تک محدود کرنا ستم ظریفی ہے۔

معاصر شیخ الحدیث والتفسیر کے تفسیری نکات

پیر شیخ الحدیث والتفسیر کی تفسیر دانی پر قربان جاؤں، انہوں نے "وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ" کے ترجمہ میں جو لفظ "مَوْلَا" استعمال کیا ہے اُس میں ذرا غور تو فرمائیے! ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ یہ تأثر دے رہے ہوں کہ خود صاحبِ قرآن ﷺ بھی اس معنوی گہرائی تک نہیں پہنچے ہوں گے، [معاذ اللہ] کیونکہ اگر آپ ﷺ کو اس معنوی گہرائی تک رسائی ہوتی تو آپ کیوں فرماتے "میں جس کا مولیٰ ہوں تو علی بھی اس کے مولیٰ ہیں"؟

اس سے چند آیات قبل یہ آیت بھی آئی ہے "اَلْمُنَافِقُوْنَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ" پیر سائیں کی مبارک فہم کے مطابق اس جملہ کا ترجمہ ہوگا "یعنی تمام منافق مرد اور منافق عورتیں ایک دوسرے کے مولا ہیں"۔(التوبة:٦٧)

خیال رہے کہ جب " تمام مومن مرد اور مومنہ عورتیں ایک دوسرے کے مولا ہیں" تو لازماً ہر مومن مرد دوسرے تمام مومنین و مومنات کا مولیٰ ہے اور ہر مومنہ عورت دوسرے تمام مومنین و مومنات کی مولاۃ ہے۔ لہٰذا ہر ایک شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ خود کو جمیع مومنین کا مولیٰ یعنی مولی المومنین کہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر نصِ قرآن سے یہ وسعت ثابت ہے اور رسول اللہ ﷺ پر بھی یہ معنوی وسعت عیاں تھی تو پھر آپ نے کیوں فرمایا کہ "میں جس کا مولیٰ ہوں تو علی بھی اس کے مولیٰ ہیں"؟ اِس کی توجیہ کسی شیخ الحدیث والتفسیر ہی سے معلوم کی جائے۔

درحقیقت اس بھونڈی تاویل کے موجد علامہ ابن تیمیہ ہیں، اس لیے کہ انہوں نے شیعہ کی تردید میں کئی ضخیم جلدوں پر مشتمل "منھاج السنة" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی، اس میں ان کا طرزِ تردید یہ ہے کہ شیعہ نے جن احادیث سے سیدنا علی ؓ کی خلافتِ بلافصل ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے، ابن تیمیہ نے اُن احادیث کو یا تو بلادلیل موضوع قرار دے دیا، یا پھر ایسی ہی بھونڈی تاویلات کر ڈالیں۔ علامہ ابن تیمیہ کے ایسے طرزِ عمل پر محدث کبیر امام سبکی اور حافظ الدنیا امام ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہما ایسے محتاط حضرات کو کہنا پڑا تھا کہ "تردیدِ روافض میں ابن تیمیہ تنقیصِ مرتضوی کے مرتکب ہو گئے تھے" بعینہٖ یہی صورتِ حال پیر سائیں مذکور کی ہے۔ آیئے سطورِ ذیل میں ان کی تحریر کا مزید جائزہ لیتے ہیں۔

ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا فتویٰ

اگر سیدۂ کائنات کے الفاظ میں غور کیا جائے تو واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک نہ صرف یہ کہ یہ سیدنا علی ؑ کی دائمی فضیلت ہے بلکہ خصوصیت بھی ہے۔ جبکہ روافض کی تردید میں ہمارے معاصرین اور ان کے قدیم و جدید ہمنواؤں کی تحریر نے ان دونوں حقیقتوں کو دھندلا دیا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم کس کی فہم پر اعتماد کریں، آیا اپنے زمانے اور سابقہ دور کے شیوخ الحدیث والتفسیر کی فہم پر یا سیدۂ کائنات کی فہم پر؟ ہم عجیب دلدل میں پھنس گئے ہیں، اگر ہم اپنے معاصرین وغیرہ کی بات نہیں مانتے تو ان کے نزدیک ہمارے جیسا کوئی رافضی نہیں ہے، اور اگر ہم ان کے موقف کو تسلیم کرتے ہیں تو سیدہ کائنات علیہا السلام غضبناک ہوتی ہیں اور سیدہ کے غضب میں خدا کا غضب مضمر ہے، سو ہم جائیں تو کہاں جائیں، کریں تو کیا کریں؟ ایسے میں عقل تو سود و زیاں کی کافی تصویریں دکھا رہی ہے لیکن دل کہتا ہے کہ دورِ حاضر کی فہم کی بجائے چودہ سو سال قبل کی فہم پر اعتماد کرنے میں آخرت کی بھلائی ہے اور ہم مکلف بھی اُسی فہم کے ہیں، جیسا کہ ارشاد "ما أنا عليه وأصحابي" سے ظاہر ہے۔ سیدۂ

کائنات علیہا السلام کی فہم نے "مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ" میں مولیٰ علی علیہ السلام کی خصوصیت سمجھی ہے، اور یہ وہ فہم ہے جس کی عظمت کی گواہی اُم المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بھی دی ہے اور خود سید الانبیاء والمرسلین ﷺ نے بھی دی ہے۔ام المومنین رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

إن كنت لأظن أنّ هذه من أعقل نسائنا.

"میں سمجھتی تھی کہ یہ ہماری تمام خواتین سے زیادہ عقل مند ہیں"۔

(سنن الترمذي ص٨٧٤، حديث ٣٨٧٢)

اسی عقل وفہم کی گواہی زبانِ نبوت سے یوں ملتی ہے۔امیر المومنین سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم بارگاہِ نبوت میں حاضر تھے کہ حضور اکرم ﷺ نے دریافت فرمایا:

أي شيء خير للمرأة؟ فسكتوا، فلما رجعتُ قلتُ لفاطمة: أيّ شيء خير للنساء؟ قالت: ألّا يراهن الرجال، فذكرتُ ذلک للنبي ﷺ فقال: إنما فاطمة بضعة مني.

"عورت کے لیے کون سی چیز زیادہ بہتر ہے؟ اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خاموش رہے، جب میں گھر لوٹا تو میں نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا: بتاؤ عورت کے لیے کون سی چیز زیادہ بہتر ہے؟ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا عورت کے لیے سب سے بہتر یہ ہے کہ اُسے غیر مرد نہ دیکھے۔میں نے اِس جواب کا تذکرہ نبی کریم ﷺ سے کیا تو آپ نے فرمایا: بلاشبہ فاطمہ میری جان کا حصہ ہے"۔

(مسند البزار ج٢ ص١٥٩، ١٦٠، حديث ٥٢٦؛ حلية الأولياء ج٢ ص٤٠، ٤١؛ إحياء علوم الدين ج٢ ص٤٥؛ المغني للعراقي على هامش الإحياء ج٢ ص٤٥؛ أحكام النساء لابن الجوزي ص٧٦؛ كشف الأستار ج٢ ص١٥٠، حديث ١٤٠٥ وج٣ ص٢٣٥، حديث ٢٦٥٣؛ مجمع الزوائد ج٤ ص٢٥٥، وط: ج٤ ص٤٦٨، حديث ٧٣٢٨، وط: ج٤ ص٣٣٢، حديث ٧٣٢٨ وج٩ ص٢٠٣، وط: ج٩ ص٣٢٧، حديث ١٥٢٠٠، وط: ج٩ ص٢٣٨، حديث ١٥٢٠٠؛ مختصر زوائد البزار للعسقلاني ج٢ ص٣٤٤، حديث ١٩٩٠؛ جمع الجوامع للسيوطي ج١٣ ص٨٥، حديث ٥٨٣٨؛ مسند فاطمة الزهراء للسيوطي ص١٠١، حديث ٢٧٦، ٢٧٧؛ إتحاف السائل للمناوي

ص٢٢؛ تخريج إحياء ص٩٨٦، ٩٨٧، حديث١٣٨١؛ جمهرة أجزاء الحديثية ج٥ ص١٤٢، حديث٤٤٦٥)

حضور ﷺ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ ہماری بیٹی میں ہماری عقل، ہماری فہم اور ہماری ہدایت کار فرما ہے۔ چنانچہ ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

ما رایت احداً أشبه سمتاً ودلاً وهدياً برسول الله ﷺ في قيامها وقعودها من فاطمة بنتِ رسول الله ﷺ.

''میں نے کسی کو راہِ راست پر قائم ہونے کے لحاظ سے، ہیئت و حالت اور سیرت کے لحاظ سے اُٹھتے بیٹھتے سیدہ فاطمہ بنتِ رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر حضور اکرم ﷺ کے مشابہ نہیں دیکھا''۔

(سنن الترمذي ص٨٧٤، حديث٣٨٧٢؛ سنن أبي داود ج٤ ص٤٥٨، حديث٥٢١٧؛ السنن الكبرىٰ للنسائي ج٧ ص٣٩٣، حديث ٨٣١١؛ صحيح ابن حبان ج١٥ ص٤٠٣، حديث ٦٩٥٣؛ الأدب المفرد ج٢ ص٥١٩، حديث٩٤٧ وص٤٥٠، حديث٩٧١؛ المستدرك للحاكم ج ٣ ص ١٥٢، حديث٤٧٨٥ وص١٥٩، حديث٤٨٠٧؛ السنن الكبرىٰ للبيهقي ج ٧ ص ١٠١، حديث ١٣٥٧٨؛ المهذب في اختصار السنن الكبير[للبيهقي]للذهبي ج٥ ص٢٦٧٨، حديث ١٠٨٧٩؛ شعب الإيمان للبيهقي ج٦ ص٤٦٧، حديث٨٩٢٧؛ الجامع لشعب الإيمان ج١١ ص ٢٧٠، حديث٨٥٢٩؛ الآداب للبيهقي ص١٩١، حديث ٣١٨؛ سبل الهدىٰ ج١١ ص٤٤و٤٦؛ الآداب الشرعية لابن مفلح ج١ ص٣٠٧؛ مناقب علي والحسنين ص١٨٩)

چونکہ سیدہ کائنات علیہا السلام چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے ہیئت، حالت اور سیرت کے لحاظ سے سب سے بڑھ کر حضور ﷺ کے مشابہ تھیں، اسی لیے ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے سیدہ کائنات کے متعلق اپنے عقیدہ کا اظہار یوں فرمایا:

ما رأيتُ أفضلَ من فاطمة غير أبيها.

''میں نے سیدہ فاطمہؑ سے افضل اُن کے بابا کے علاوہ کسی کو نہیں دیکھا''۔

(المعجم الأوسط ج٣ ص٣٤٩، حديث٢٧٤٢، وط: ج٣ ص١٣٧، حديث٢٧٢١؛ مجمع البحرين في زوائد المعجمين ج٣ ص٤١٤، حديث٣٨٠٢؛ استجلاب ارتقاء الغرف ج١ ص٢٥١، حديث

٤؛در السحابة للشوكاني ٢٧٧)

حافظ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: ''اس حدیث کے تمام راوی صحیح ہیں''۔

(مجمع الزوائد ج۹ص ۲۰۱،وط: ج۹ص ۳۲۵،حدیث ۱۵۱۹۳،وط: ج۹ص ۲۳۷،حدیث ۱۵۱۹۳)

اِن وجوہات کی بنا پر ہم دورِ حاضر کی فہم پر فہمِ فاطمی کو ترجیح دینے پر مجبور ہیں لیکن بہت ممکن ہے کہ کوئی سائیں یہ کہہ کر اس حقیقت کو رد کرنے کی کوشش کرے کہ یہ ایک خاتون کا اپنے شوہر کے متعلق حسنِ ظن ہے اور ہر خاتون کو حق ہے کہ وہ اپنے شوہر کے متعلق حسنِ ظن رکھے، دوسرے لوگ ایسے حسن ظن کو قبول کرنے کے مکلف نہیں ہیں، لہٰذا ہم ایسے تمام سائیں لوگوں کی خدمت میں دوسرے صحابہ کرام ﷺ کی فہم بھی پیش کر دیتے ہیں۔

مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ میں سیدنا سعد ﷺ کی فہم

یکے از عشرہ مبشرہ سیدنا سعد بن ابی وقاص ﷺ کو بھی اس حدیث سے سیدنا علی ﷺ کی خصوصیت سمجھ آئی تھی، وہ فرماتے ہیں:

> كنتُ جالساً فتنقصوا علي بن أبي طالب ﷺ،فقلت:لقد سمعتُ رسولَ الله ﷺ يقول في علي ثلاث خصال،لأن يكون لي واحدة منهن أحب إلي من حمر النعم، سمعته يقول:إنه بمنزلة هارون من موسى، إلا أنه لا نبي بعدي، وسمعته يقول : لأعطين الراية غداً رجلاً يحب اللّٰهَ ورسوله ويحبه اللّٰهُ ورسوله،وسمعتُه يقول:من كنت مولاه فعلي مولاه.

''میں بیٹھا ہوا تھا کہ (بنوامیہ کے) لوگ حضرت علی بن ابی طالب ﷺ کی تنقیص کرنے لگے تو میں نے کہا: بیشک میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ حضرت علی ﷺ کے اندر تین صفات ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی ایک صفت میرے اندر ہوتی تو وہ مجھے سرخ اونٹوں سے زیادہ محبوب ہوتی۔

۱۔ میں نے آپ کو فرماتے ہوئے سنا: بیشک علی کا رتبہ میرے نزدیک ایسا ہے جیسا کہ موسی ﷺ کے نزدیک هارون ﷺ کا، مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں

۲۔ اور میں نے آپ کو فرماتے ہوئے سنا: کل میں پرچم اس کو عطا کروں گا جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو محبوب رکھتا ہے اور اللہ اور اس کا رسول ﷺ اس کو محبوب رکھتے ہیں

۳۔ اور میں نے آپ کو فرماتے ہوئے سنا: جس کا میں مولیٰ ہوں تو علی بھی اُس کے مولیٰ ہیں"۔

(خصائص علي ص ٣٣، حديث ١٠، وط: ص ٣٨، حديث ١٢، وط: ص ٣٥، حديث ١٢؛ السنن الكبرى للنسائي ج٧ ص ٤١١، حديث ٨٣٤٣، وط: ج٥ ص ١٠٨، حديث ٨٣٩٩؛ سنن ابن ماجه ج١ ص ٨٦، حديث ١٢١، وط: ج١ ص ٥٦، حديث ١٢١؛ تاريخ دمشق ج٤٢ ص ١١٥، ١١٦)

"خصائص علی" کے محقق ابو اسحاق الحوینی الاثری نے اس حدیث کی سند کو صحیح کہا ہے۔

(كتاب الحلي بتخريج خصائص علي ص ٣٣)

اس صحیح حدیث اور فہم سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے معلوم ہوا کہ جس طرح "انت مني بمنزلة هارون من موسى" کا فرمان اور غزوۂ خیبر کی فتح مولیٰ علی رضی اللہ عنہ کی خصوصیت ہے اسی طرح "مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ" کے فرمان کی رو سے مولیٰ ہونا بھی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خصوصیت ہے۔

مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ میں فہمِ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ

خلیفۂ ثانی سیدنا عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی فہم کے مطابق بھی اس حدیث میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خصوصیت کا بیان ہے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اکرم ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے، ہم نے غدیر خم میں قیام کیا۔ وہاں نماز باجماعت کی ندا دی گئی، اور رسول اللہ ﷺ کے لیے دو درختوں کے نیچے صفائی کی گئی، پس آپ نے نمازِ ظہر ادا کی اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر لوگوں کو فرمایا: "کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میں مومنوں کی جانوں سے بھی قریب تر ہوں؟ انہوں نے عرض کیا: کیوں نہیں! آپ نے (پھر) فرمایا: کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں ہر مومن کی جان سے بھی قریب تر ہوں؟ انہوں نے عرض کیا: کیوں نہیں! راوی کہتا ہے کہ پھر آپ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: "جس کا میں مولیٰ ہوں اُس کا علی بھی مولیٰ ہے۔ اے اللہ! تو اُسے دوست رکھ جو اِسے دوست رکھے اور اُس سے عداوت رکھ جو اِس سے عداوت رکھے۔" راوی کا بیان ہے کہ

اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی اور ان سے کہا: ''اے ابوطالب کے فرزند! مبارک ہو، آپ صبح وشام (ہمیشہ کے لیے) ہر مومن ومومنہ کے مولیٰ ہو گئے''۔

(مسند أحمد ج٤ ص٢٨١، حديث ١٨٦٧١، وط: ص٤٢٠٨، حديث ١٨٧٧١؛ فضائل الصحابة ج٢ ص٧٣٨، حديث ١٠١٦ وص٧٥٥، حديث ١٠٤٢؛ المصنف لابن أبي شيبة ج ٦ ص ٣٧٥، حديث ٣٢١٠٩، وط: ج ١٧ ص١٢٨، حديث ٣٢٧٨١؛ سير أعلام النبلاء ج٢٨ ص٢٤٣؛ ذخائر العقبىٰ ص٨٣؛ الرياض النضرة ج٤ ص١٠٩؛ جمع الجوامع ج١٤ ص١٢١، حديث ٩٦٧٦؛ مناقب علي والحسنين لمحمد فؤاد عبدالباقي ص٢٩؛ البداية والنهاية ج٥ ص٤٦٤، وط: ج٧ ص ٥٧٨؛ موسوعة العشرة المبشرون بالجنة[كذا] ج١١ ص٤٦، ٤٧)

امام ذہبی فرماتے ہیں: اس حدیث کی سند حسن ہے۔

(رسالة طرق حديث: من كنت مولاه، للذهبي ص٨٦، ٨٧)

شیخ احمد شاکر نے بھی اس حدیث کی سند کو حسن فرمایا ہے۔

(مسند أحمد ج١٤ ص١٨٥ حديث ١٨٣٩١)

شیخ شعیب الأرنؤوط نے کہا ہے: "صحيح لغيره" یعنی یہ حدیث دوسری احادیث کی تقویت سے صحیح ہے۔

(مسند أحمد ج٣٠ ص٤٣٠، حديث ١٨٤٧٩)

مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ، میں حِبْرُ الأمة کی فہم

بعض نواصب نے ترجمان القرآن، حبر الامۃ، مولیٰ علی رضی اللہ عنہ کے تلمیذ ارشد سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے سامنے مولیٰ علی رضی اللہ عنہ کی شان میں نازیبا الفاظ کہے تو انہوں نے برموقعہ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے دس خصائص بیان فرمائے، جن میں ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ ہر اس شخص کے مولیٰ ہیں جس کے رسول اللہ ﷺ مولیٰ ہیں۔ اس حدیث کی تشریح کے لیے احقر کی تصنیف شرح خصائص علی رضی اللہ عنہ کے صفحات ٦٣ اور مابعدھا ملاحظہ فرمائیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ سیدۂ کائنات علیہا السلام، سیدنا سعد بن ابی وقاص، سیدنا فاروقِ اعظم اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کی فہم کے مطابق جمیع مومنین کا مولیٰ ہونا امام الاولیاء سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خصوصیت

ہے، لہٰذا ہمیں آٹھویں صدی کے نام نہاد شیخ الاسلام اور پندرھویں صدی کے پیر سائیں لوگوں کے افکار سے قدسی صفت اہلِ بیتِ عظام اور صحابہ کرام ﷺ کی فہم زیادہ محبوب ہے۔

خطبۂ نبویہ ﷺ کا سبب

وسبب هذه الخطبة في يوم الغدير ما ذكره ابن إسحاق وهو أن علياً ﷺ، لما بعثه رسول الله ﷺ إلى اليمن أميراً هو وخالد بن وليد، ورجع فوافى النبي ﷺ بمكة في حجة الوداع وقد كثرت فيه القالة، وتكلم فيه بعض من كان معه بسبب استرجاعه منهم خلعاً كان أطلقها لهم نائبه عليهم، لما تعجل السير إلى رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم، فلما تفرغ ﷺ من حجه ونزل غدير خم خطب هذه الخطبة تنبيهاً على قدر علي ﷺ ورداً على من تكلم فيه.

اس خطبۂ نبویہ ﷺ کا سبب محمد بن اسحاق بن یسار ﷺ کے بیان کے مطابق یہ ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے سیدنا علی المرتضیٰ اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہما کو حجۃ الوداع کے ایام میں امیر بنا کر یمن کی طرف بھیجا اور جب وہ لوٹے تو نبی کریم ﷺ حجۃ الوداع کو مکمل فرما چکے تھے، اور لوگوں نے مولیٰ علی ﷺ کے خلاف بہت باتیں بنا رکھی تھیں، اور بعض وہ لوگ جو مولیٰ علی ﷺ کے ساتھ تھے اور آپ نے ان کے امیر کو معزول کر دیا تھا تو انہوں نے بھی اعتراضات کیے تھے اور سرعت کے ساتھ حضور ﷺ کی بارگاہ میں پہنچ کر شکایات کی تھیں۔ پس جب آپ ﷺ حج سے فارغ ہونے کے بعد غدیر خم کے مقام پر اترے تو بطور تنبیہ مولیٰ علی ﷺ کی قدر و منزلت میں اور لوگوں کے اعتراضات کی تردید میں یہ خطبہ ارشاد فرمایا۔

مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ...... کی شانِ ورود میں شیعہ اور نواصب کی رائے

حضرت محمد بن اسحاق بن یسار ﷺ کی بیان کردہ حدیث کی اِس شانِ ورود پر شیعہ کے شدید اعتراضات ہیں، ان کے نزدیک یہ سبب درست نہیں، وہ کہتے ہیں:

لَقَدْ كَانَتِ الْخُطْبَةُ بِأَمْرٍ مِّنَ اللهِ تَعَالىٰ، وَلِإِقَامَةِ أَمْرٍ إِلٰهِيٍّ هَامٍّ .... وَهِيَ تَعْيِيْنُ الْخِلَافَةِ الإِلٰهِيَّةِ.

"یہ خطبہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے دیا گیا اور اہم امرِ الٰہی کے قیام کے لیے دیا گیا اور وہ ہے تعیین

خلافتِ الٰہیہ"۔

(أسنى المطالب ص ٥١ بتحقيق و تعليق محمد هادي الأميني)

شیعہ کے برعکس خوارج، نواصب اور ردِ روافض پر لکھنے والے لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ خطبہ محض لوگوں کی وقتی شکایات کے ازالہ کے لیے دیا گیا تھا اور اُن پر واضح کیا گیا تھا کہ تم نے جو علی کو ایک مجرم سمجھ رکھا ہے، یہ درست نہیں بلکہ وہ دوسرے مومنین کی طرح لوگوں کے مولیٰ (یعنی محبوب) ہیں، اور یہ مولیٰ ہونا ان کی خصوصیت نہیں ہے۔ جیسا کہ علامہ ابن تیمیہ، حکیم ظفر اور شیخ الحدیث والتفسیر پیر سائیں غلام رسول قاسمی کی عبارات سے یہ مفہوم عیاں ہے۔

اس کی شانِ ورود میں مذہبِ اہلِ سنت

حق ان دونوں باتوں کے بین بین ہے، یہ بات بھی درست نہیں کہ غدیر خم کا خطبہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے تعین کے لیے دیا گیا، اس لیے کہ فصاحت و بلاغت کے امامِ مطلق ﷺ سے ایسے اہم معاملہ میں ایسے کثیر احتمالات رکھنے والے الفاظ کا استعمال بعید ہے، اور یہ بھی درست نہیں ہے کہ یہ خطبہ محض وقتی اعتراضات کی تردید کی غرض سے دیا گیا تھا۔ اس لیے کہ جن لوگوں کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے شکوہ و شکایت تھی نبی کریم ﷺ نے فرداً فرداً شکایات پیش کرتے وقت ہی ہر ایک کی تسلی فرمادی تھی اور اُسی وقت اُن کے ذہن صاف ہو گئے تھے۔ چنانچہ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

> "رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن ولید کی قیادت میں یمن بھیجا اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو ایک اور لشکر پر امیر مقرر فرما کر بھیجا اور حکم فرمایا کہ اگر دونوں لشکر اکٹھے ہو جائیں تو تمام لوگوں کے قائد علی کرم اللہ وجہہ ہوں گے، اور اگر اکٹھے نہ ہوں تو ان میں سے ہر ایک اپنے لشکر کا قائد ہوگا۔ پس یمن کے علاقہ بنو زبید کے مقام پر ہم جمع ہو گئے اور مسلمانوں کو مشرکین پر غلبہ اور فتح حاصل ہوئی۔ ہم نے خوب جہاد کیا تھا اور دشمنوں کو قیدی بھی بنایا تھا، ان قیدیوں میں سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ایک لونڈی کو اپنے لیے منتخب کر لیا تھا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن ولید نے یہ معاملہ نبی کریم ﷺ کی طرف لکھا اور مجھے حکم کیا کہ میں وہ خط حضور ﷺ کی بارگاہ میں لیجاؤں۔ سو میں نے آپ کو وہ خط پیش کیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شکایت کی تو رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ اقدس پر آثارِ غضب نمایاں ہوئے تو میں نے کہا: یہ پناہ مانگنے کا مقام ہے، آپ نے مجھے ایک شخص کے

ساتھ بھیجا اور آپ نے مجھے اس کی فرمانبرداری کا حکم فرمایا، پس میں نے تو وہ کچھ پہنچایا جس کے ساتھ مجھے بھیجا گیا۔ اِس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لا تبغضن يا بريدة علياً، فإن علياً مني وأنا منه وهو وليكم بعدي.

"اے بریدہ! علی سے بغض مت رکھو! بیشک علی مجھ سے ہے اور میں اُس سے ہوں اور وہ میرے بعد تمہارا ولی ہے"۔

(السنن الكبرى للنسائي ج٧ص ٤٤١، حديث ٨٤٢١؛ مسند أحمد ج٥ ص ٣٥٦؛ وط: ج٧ص ٦٣٥، حديث ٢٣٤٠٠؛ فضائل الصحابة ج٢ ص ٨٥٦، حديث ١١٧٥؛ مسند البزار ج١٠ ص ٢٨٣، حديث ٤٣٩١؛ كشف الأستار ج٣ ص ٢٠٠، حديث ٢٥٦٣؛ البداية والنهاية ج٧ ص ٥٧٠)

ایک اور سند کے ساتھ یہ حدیث یوں منقول ہے:

"سیدنا ابن عباس ؓ بیان کرتے ہیں کہ حضرت بریدۃ ؓ نے فرمایا: میں سیدنا علی ؓ کے ساتھ یمن گیا تو میں نے ان سے زیادتی دیکھی، پھر میں نے نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں آکر سیدنا علی ؓ کا شکوہ کیا اور اُن کی تنقیص کی، جس پر نبی کریم ﷺ کے چہرۂ اقدس (کا رنگ) متغیر ہونا شروع ہوا، پھر آپ نے فرمایا:

يا بُرَيدةُ! ألستُ أولىٰ بالمؤمنين من أنفسِهم؟ قلتُ: بلىٰ يا رسولَ الله، قال: من كنت مولاه فعليٌّ مولاه.

"اے بریدہ! کیا میں مومنین کو اُن کی جانوں سے زیادہ محبوب نہیں ہوں؟ میں نے عرض کیا: کیوں نہیں یا رسول اللہ، فرمایا: میں جس کا محبوب ہوں تو علی ؓ بھی اس کے محبوب ہیں"۔

(السنن الكبرىٰ للنسائي ج٧ ص ٣٠٩، حديث ٨٠٨٩ وص ٤٣٨، حديث ٨٤١٣؛ وط: ج٥ ص ٤٥، حديث ٨١٤٥ وص ١٣١، حديث ٨٤٦٧؛ مسند أحمد ج٥ ص ٣٤٧، حديث ٢٣٣٣٣؛ فضائل الصحابة ج٢ ص ٧٢٣، حديث ٩٨٩؛ الأحاد والمثاني ج٤ ص ٣٢٥، حديث ٢٣٥٧؛ مختصر تاريخ دمشق ج ١٧ ص ٣٤٨؛ جمع الجوامع ج١٤ ص ١٣٢، حديث ٩٧٥٩)

ایک اور مفصل حدیث کے آخر میں حضرت بریدہ ؓ فرماتے ہیں:

وذهب الذي في نفسي عليه.

''میرے دل میں سیدنا علی ﷜ کے خلاف جو کدورت تھی وہ چلی گئی''۔

(المستدرك للحاكم ج٢ص١٢٩، ١٣٠، وط: ج٢ص١٤١حديث٢٥٨٨؛جمع الجوامع ج ١٤ ص١٤٠،حديث ٩٨٠٠)

ایک اور حدیث میں حضرت بریدہ ﷜ سے منقول ہے کہ انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ!

لا أسوء ك فيه أبداً.

''میں کبھی بھی آپ کو علی المرتضی ﷜ کے متعلق رنجیدہ نہیں کروں گا''۔

(البحر الزخار المعروف بمسند البزار ج١٠ ص٢٥٨،حديث٤٣٥٤)

ایک اور حدیث میں سوال وجواب کی صورت میں ایسی وضاحت آ گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شکایت کنندہ حضرات کی مکمل تشفی اور تسلی ہو گئی اور انہیں مزید سمجھانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی، ملاحظہ فرمایئے!

حضرت بریدہ ﷜ فرماتے ہیں:

فامسک بيدي رسول الله ﷺ فقال: يابريدة! أتبغض علياً؟ قلتُ: نعم، فقال: لا تُبغضه، وإن كنت تحبه فازدَد له حباً، فوالذي نفسي بيده لنصيبُ آل علي في الخمس أفضل من وصيفة، فما كان أحدٌ من الناس بعد رسول الله ﷺ أحب إليّ من علي ﷜.

قال عبد الله بن بريدة: والله ما في الحديث بيني وبين النبي ﷺ غير أبي.

''پھر رسول اللہ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: اے بریدہ! کیا تو علی کے ساتھ بغض رکھتا ہے؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں۔ فرمایا: اُس سے بغض نہ رکھ، اور اگر تو اُس سے محبت کرتا ہے تو محبت میں اضافہ کر۔ اُس ذات کی قسم! جس کے قبضہ میں میری جان ہے، خمس میں آل علی کا حصہ اُس وصیفہ (لونڈی) سے زیادہ ہے۔ پس رسول اللہ ﷺ کے بعد لوگوں میں سے مجھے حضرت علی ﷜ سے زیادہ محبوب کوئی نہیں تھا۔

حضرت ابن بریدہ ﷜ فرماتے ہیں: خدا کی قسم اس حدیث میں میرے اور نبی کریم

ﷺ کے مابین میرے والد کے سوا اور کوئی واسطہ نہیں ہے"۔

(السنن الكبرى للنسائي ج٧ص٤٤٣، حديث٨٤٢٨، وط: ج٥ص١٣٥، حديث٨٤٨٢؛ مسند أحمد ج٥ص٣٥١، حديث٢٣٣٥٥ وص٣٥٦، حديث٢٣٤٠٠ وص٣٥٩رقم٢٣٤٢٤؛ فضائل الصحابة ج٢ص٨٥٦، حديث١١٧٥، ١١٧٧، ١١٧٩، ١١٨٠؛ المستدرك ج٢ص١٢٩، حديث ٢٦٣٥وج٣ص١٠٩، حديث٤٦٣٥؛ شرح مشكل الآثار ج٨ص٥٨، ٥٩، حديث٣٠٥١؛ تحفة الأخيار ج٥ص٤٩٦، حديث٣٥٨٩؛ السنن الكبرى للبيهقي ج٦ص٣٤٢، حديث١٢٩٥٧؛ معرفة السنن والآثار ج٩ص٢٧٤، حديث١٣١٥٠؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٧ص٣٤٨، ٣٤٩؛ الرياض النضرة ج٤ص١١١، ١١٢؛ زاد المعاد ج٥ص٦٣٧؛ مجمع الزوائد ج٩ص١٢٧، وط: ج٩ص ١٧١، حديث١٤٧٣١، وط: ج٩ص١١٩، حديث١٤٧٣١)

بعض احادیث میں ہے کہ اُسی وقت سے مجھے رسول اللہ ﷺ کے بعد سیدنا علی رضی اللہ عنہ سب سے زیادہ محبوب ہو گئے۔ ذرا الفاظ میں غور فرمایئے:

فما كان من الناس أحدٌ بعدَ قولِ رسولِ اللّٰه ﷺ أحب إلي مِن علي.

"پس لوگوں میں سے کوئی ایک بھی رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے بعد مجھے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ محبوب نہیں تھا"۔

(مسند أحمد ج٥ص٣٥١، وط: ج٧ص٦٢٤، حديث٢٣٣٥٥؛ شرح مشكل الآثار ج٨ص٥٨، ٥٩، حديث٣٠٥١؛ مجمع الزوائد ج٩ص١٢٧، وط: ج٩ص١٧١، حديث ١٤٧٣١؛ البداية والنهاية ج١١ص٦٠؛ در السحابة للشوكاني ص٢٢٣)

ان پانچوں حدیثوں میں اور حدیث غدیرِ خم میں چند باتوں کا فرق ہے، جسے ملحوظ رکھنا ضروری ہے:

١۔ ان پانچوں حدیثوں میں شکایت کا تذکرہ ہے اور حدیث غدیرِ خم میں یہ تذکرہ نہیں ہے۔

٢۔ ان پانچوں حدیثوں میں حجۃ الوداع کا ذکر نہیں ہے جبکہ حدیث غدیرِ خم میں یہ ذکر موجود ہے۔

٣۔ ان پانچوں حدیثوں میں مولیٰ علی رضی اللہ عنہ کے مبارک ہاتھوں کو پکڑ کر اُنہیں بلند کرنے کا ذکر نہیں ہے اور حدیث غدیرِ خم میں یہ ذکر ہے۔

٤۔ ان پانچوں حدیثوں میں ایک مخصوص صحابی رضی اللہ عنہ کا نام لے کر انہیں مخاطب فرمایا گیا ہے جبکہ حدیث غدیرِ خم

میں فرد واحد کو نہیں بلکہ تمام لوگوں کو خطاب ہے۔

۵۔ ان پانچوں حدیثوں میں اہل بیت اور قرآن کریم (یعنی ثقلین) کا ذکر نہیں ہے جبکہ حدیث غدیر خم میں یہ ذکر موجود ہے، اور یہ انتہائی اہم اور عظیم فرق ہے۔

٦۔ ان پانچوں حدیثوں میں نبی کریم ﷺ کے وصال مبارک کا اشارہ نہیں ہے جبکہ حدیث غدیر خم میں یہ شارہ موجود ہے۔

۷۔ ان پانچوں احادیث میں سے بعض میں اولاً صحابی کا اعتراف بغض ہے اور بعد میں از دیاد محبت کا ذکر ہے جبکہ حدیث غدیر خم میں یہ ذکر نہیں ہے۔

ان تمام تفریقات کو مدنظر رکھتے ہوئے اب حدیث غدیر خم کا مطالعہ فرمایئے:

أخبرنا محمد بن المثنیٰ، قال: حدثنا يحيى بن حمّاد قال: أخبرنا أبو عوانة عن سليمان، قال: حدثنا حبيب بن أبي ثابت، عن أبي الطفيل، عن زيد بن أرقم قال: لما رجع رسول الله ﷺ من حجة الوداع ونزل غدير خم أمر بدَوحاتٍ فَقُمِمْنَ ثم قال: كأني دُعيتُ فأجَبْتُ وإني تارك فيكم الثقلين: أحدهما أكبر مِن الآخر، كتابَ الله وعِترَتي أهلَ بيتي، فانظروا كيف تخلفوني فيهما، فانهما لن يتفرقا حتىٰ يردا عليّ الحوض، ثم قال: إن الله مولاي، وأنا وليُّ كل مؤمن، ثم أخذ بيد علي، فقال: مَن كنتُ وليّه فهذا وليّه، اللّهم والِ من والاه، وعادِ من عاداه، فقلتُ لزيد: سمعتَه مِن رسولِ الله ﷺ؟ فقال: ما كان فِي الدَّوحاتِ أحدٌ إلا رآه بعينيه، وسَمِعَهُ بأُذُنَيه.

''حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ حجۃ الوداع سے پلٹے اور ''غدیر خم'' کے مقام پر اُترے اور خیمے کھڑے کرنے کا حکم دیا تو وہ کھڑے کر دیئے گئے، پھر فرمایا: گویا مجھے بلایا گیا ہے تو میں نے بلاوا قبول کر لیا ہے اور میں تمہارے درمیان دو بھاری چیزیں چھوڑنے والا ہوں، ان میں سے ہر ایک دوسری سے بڑی ہے:

۱۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب

۲۔ اور میری عترت، میرے اہل بیت

پس تم غور کرنا کہ ان دونوں چیزوں کے بارے میں تم میرا کتنا لحاظ رکھتے ہو؟ بلاشبہ یہ دونوں چیزیں ایک دوسری سے جدا نہیں ہوں گی حتیٰ کہ دونوں اکٹھے میرے پاس حوض پر آئیں گی۔ پھر فرمایا: بیشک اللہ تعالیٰ میرا مولیٰ ہے اور میں ہر مومن کا مولیٰ ہوں، پھر آپ نے سیدنا علی ﷺ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: جس شخص کا میں مولیٰ ہوں تو یہ بھی اس کے مولیٰ ہیں، اے اللہ! تو اس شخص سے محبت کر جو علی ﷺ کو محبوب رکھے اور اس شخص سے عداوت رکھ جو علی ﷺ سے عداوت رکھے۔

حضرت ابوالطفیل ﷺ فرماتے ہیں: میں نے حضرت زید بن ارقم ﷺ سے پوچھا: کیا یہ ارشاد آپ نے رسول اللہ ﷺ سے خود سنا ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں (میں بھی اور میرے سوا) جو کوئی شخص بھی خیموں میں موجود تھا اُس نے اپنی آنکھوں سے حضور ﷺ کو بیان کرتے ہوئے دیکھا اور اپنے کانوں سے سنا"۔

(خصائص أمیر المؤمنین علي بن أبي طالب ﷺ ص ۱۱۲، حدیث ۷۸، وط: ص ۹۶، حدیث ۷۹، وط: ص ۸٤، حدیث ۷٦؛ السنن الکبریٰ للنسائي ج۷ ص ۳۱۰، حدیث ۸۰۹۲ وص ٤۳٦، حدیث ۸٤۱۰؛ وط: ج۵ ص ٤۵، حدیث ۸۱٤۸ وص ۱۳۰، حدیث ۸٤٦٤؛ مسند الشامیین ج۳ ص ۲۲۲، ۲۲۳، حدیث ۲۱۲۸؛ المستدرك ج۳ ص ۱۰۸، ۱۰۹، حدیث ٤٦۳۳، ٤٦۳٤، ٤٦۳۵؛ مصابیح السنة ج٤ ص ۱۹۰، حدیث ٤۸۱٦؛ رسالة طرق حدیث من کنت مولاہ، للذهبي ص ٦٤؛ استجلاب ارتقاء الغرف للسخاوي ج۱ ص ۳٤۲؛ مشکاة ج۲ ص ۵۱٤، حدیث ٦۱۵۳)

امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو شیخین (امام بخاری اور امام مسلم) کی شرائط کے مطابق صحیح قرار دیا ہے اور علامہ ذہبی نے اس پر سکوت اختیار فرمایا ہے۔ امام ذہبی کا اس حدیث پر مستقل ایک رسالہ بھی ہے، اس میں وہ فرماتے ہیں:

هذا اسنادٌ قويّ، أخرجه س.

"یہ سند قوی ہے، اس کو امام نسائی نے روایت کیا ہے"۔

(رسالة: طرق حدیث من کنت مولاہ، للذهبي ص ٦٤)

علامہ ابواسحاق الحوینی الاثری نے بھی اس کی سند کو مشروط طور پر صحیح کہا ہے، اور شیخ شعیب الارنؤوط نے کہا: اس حدیث کی سند حسن ہے اور اس کے تمام راوی ثقہ (اعتماد کے لائق) ہیں اور بخاری و مسلم کے راوی ہیں، ماسوا فطر بن خلیفہ کے اور وہ بھی سچے راوی ہیں۔

(كتاب الحلي بتخريج خصائص علي ص ٨٤؛ صحيح ابن حبان بتحقيق شعيب الأرنوط ج ١٥ ص ٣٧٦، حديث ٦٩٣١)

مذکورہ بالا سطور میں جس قدر فرق شمار کیے گئے ہیں ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے خود سوچیے کہ اس قدر اہتمام کے ساتھ اہل بیت کرام اور خصوصاً سیدنا علی المرتضیٰ علیہم السلام کی شان میں زبانِ نبوت کا کھلنا اور پھر اس میں بالخصوص یہ فرمانا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے حضور جانے والے ہیں۔ کیا یہ سب کچھ فقط ازالۂ شکایات کے لیے تھا؟ نہیں، ہرگز نہیں!

افسوس ہے اُن نام نہاد شیعہ یا روافض پر جو اس حدیث سے مولیٰ علی ﷛ کی خلافتِ بلافصل کا قول کر کے اصحابِ ثلاثہ ﷡ کی خلافتِ راشدہ پر طعن و تشنیع کے دروازے کھولتے ہیں، اور تعجب ہے ان نام نہاد سنیوں پر جو روافض کی دشمنی میں اس حدیث کی ایسی بھونڈی تاویلیں کرتے ہیں جن سے نہ صرف یہ کہ مولیٰ علی ﷛ کی مخصوص عظمتوں کا انکار لازم آتا ہے بلکہ "وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى" کی شان والے أفصح الخلق نبی ﷺ کا کلام بھی (معاذ اللہ) عبث ٹھہرتا ہے! اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ.

مولیٰ بمعنی آقا یا سردار کی نفی میں ناکام کوشش

شیخ الحدیث والتفسیر پیر سائیں غلام رسول قاسمی لکھتے ہیں:

"حضرت خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ کوٹ مٹھن والے نے تین صفحات پر اس حدیث کی زبردست وضاحت فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں کہ یہاں مولا کے معنی سید، سردار، حاکم اور لائقِ امامت کے نہیں بلکہ اس کے معنی ناصر اور محبوب کے ہیں (مقابیس المجالس ص ۹۲۰)"۔

(ضربِ حیدری ص 173)

قاسمی صاحب اس سے اگلے صفحہ پر لکھتے ہیں:

"اور اگر مولا بمعنی آقا لیا جائے تو حضور اکرم ﷺ تو انبیاء علیہم السلام کے بھی آقا ہیں، تو کیا سیدنا علی کریم تمام انبیاء کے بھی آقا ہوں گے؟ بتائیے آپ کے عقائد سے قدم قدم پر غالی

رافضیت لازم آتی ہے کہ نہیں؟"۔

(ضربِ حیدری ص 174)

کیا"مقابیس المجالس"مکمل قبول ہے؟

پیر سائیں نے پہلے پیراگراف میں یہ تو لکھ دیا کہ "حضرت خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ کوٹ مٹھن والے نے تین صفحات پر اس حدیث کی زبردست وضاحت فرمائی ہے" مگر کیا خبر قاسمی صاحب کو یہ زبردست وضاحت مکمل طور پر قبول بھی ہوگی یا نہیں؟ میں کہتا ہوں: اس زبردست وضاحت کے بعض حصے پیر سائیں کو قبول نہیں ہوسکتے، جیسا کہ ہم آئندہ سطور میں بیان کریں گے۔ رہا ہمارا معاملہ، تو ہمیں یہ زبردست وضاحت قبول ہے، ماسوا اُن الفاظ کے جو حدیث نبوی ﷺ اور فہم صحابہ رضی اللہ عنہم کے خلاف ہیں۔ کیونکہ مولیٰ علی علیہ السلام کا لائق امامت (خلافت) ہونا دوسری کئی احادیث سے ثابت ہے، ان میں سے کچھ احادیث آئندہ سطور میں نمبر (۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲) پر آرہی ہیں۔

فائدہ

خیال رہے کہ لائق امامت وخلافت ہونا اور بات ہے اور عملاً وواقعۃً خلیفہ بلافصل ہونا اور بات ہے، لہٰذا مولیٰ علی علیہ السلام کے لائق امامت وخلافت ہونے کی نفی کرنا احادیث مبارکہ اور علماء وصوفیہ کی تصریحات کے خلاف ہے۔ تفصیل حدیث نمبر (۳۸ وما بعدھا) کے تحت آئے گی۔ ان شاء اللہ تبارک وتعالیٰ۔

"مقابیس المجالس" میں مولیٰ بمعنی سید وسردار کی نفی بھی درست نہیں ہے، کیونکہ حدیث میں مولیٰ علی علیہ السلام کو سید العرب فرمایا گیا ہے، جیسا کہ آئندہ صفحات میں متن کے اندر نمبر (۱۶، ۱۷) پر حدیث آرہی ہے، اور تمام ائمہ کے نزدیک ضعیف حدیث ذاتی قیاس پر مقدم ہوتی ہے، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی مولیٰ بمعنی سید وآقا لیا ہے، جیسا کہ ہم آگے چل کر آثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نقل کریں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ملفوظ اور تصنیف وتالیف میں فرق

واضح رہے کہ "مقابیس المجالس" ملفوظات کا مجموعہ ہے، اس کا سابقہ نام "اشارات فریدی" ہے، جب کیپٹن واحد بخش سیال جزاہ اللہ تعالیٰ نے اس مجموعہ کی نئی ترتیب وتدوین فرمائی تو اسے "مقابیس المجالس" سے موسوم فرمایا، اور اہل تحقیق علماء کرام کا اتفاق ہے کہ بزرگانِ دین کے ملفوظات پر بلا تحقیق اعتماد

کرنا درست نہیں، اس لیے کہ ملفوظ اور تصنیف وتالیف میں واضح فرق ہوتا ہے، جس کی توضیح ہم اپنی کتاب ''موضوع حدیث کا حکم'' میں کر چکے ہیں۔ دیکھئے امام احمد رضا حنفی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات مشہور ترین ہیں مگر ان میں بھی واضح اغلاط موجود ہیں، خود "مقابیس المجالس" سے واضح غلطی کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیں! اس میں لکھا ہوا ہے:

''آنحضرت ﷺ نے پیش گوئی فرمائی تھی کہ "الخلافة بعدي ثلاثون سنة" (میرے بعد خلافت تیس سال تک قائم رہے گی) لیکن ابھی اس مدت میں سے پانچ سال باقی تھے کہ امام حسن رضی اللہ عنہ خلافت سے دستبردار ہو گئے''۔

(مقابیس المجالس ص ۹۳۱)

خط کشیدہ الفاظ حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ کی مشہور حدیث کے سراسر خلاف ہیں اور پھر ''پانچ ماہ'' بھی نہیں بلکہ ''پانچ سال'' کا لفظ رقم ہو گیا۔ خود اندازہ کیجئے کہ بزرگان دین کے ملفوظات کے مرتبین سے کس قدر واضح غلطیاں ہو جاتی تھیں؟ یہاں یہ بھی ذہن میں رہے کہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام جس دن دستبردار ہوئے تھے وہ تیسویں سال کا آخری دن تھا اور اُس کے معاً بعد کاٹنے والی ملوکیت شروع ہو گئی تھی۔

کیا سیدنا علی رضی اللہ عنہ انبیاء کرام علیہم السلام کے بھی آقا ہیں؟

باقی رہا قاسمی صاحب کا یہ جملہ:

''اور اگر مولا بمعنی آقا لیا جائے تو حضور اکرم ﷺ تو انبیاء علیہم السلام کے بھی آقا ہیں، تو کیا سیدنا علی کریم تمام انبیاء کے بھی آقا ہوں گے''؟

(ضربِ حیدری ص 174)

تو اس کا جواب یہ ہے کہ کلامِ الٰہی، کلام نبوی اور کلام الناس میں بہت سے مقامات ایسے آتے ہیں جہاں کسی حکم کے الفاظ تو بظاہر عموم پر دلالت کرتے ہیں مگر ان کا معنوی اطلاق سب کو شامل نہیں ہوتا اور اکثر یا کچھ لوگ اس حکم عام سے بوجوہ مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ مثلاً بنی اسرائیل کی شان میں قرآن کریم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ "وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ" (میں نے تمہیں تمام جہانوں پر فضیلت دی) اگر اِس آیت کے ظاہری عموم کی طرح اس کے معنوی اطلاق کو بھی عام رکھا جائے تو بنی اسرائیل کی حضور اکرم ﷺ اور آپ کی امت پر

افضلیت لازم آتی ہے جو کہ متعدد آیاتِ قرآنی اور احادیث نبویہ کے خلاف ہے۔

اسی طرح قرآن کریم میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی ایک دعا یوں آئی ہے:

رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْبَغِيْ لِأَحَدٍ مِّنْ بَعْدِيْ إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ.

''اے میرے رب مجھے بخش دے اور مجھے ایسی سلطنت عطا کر کہ میرے بعد کسی کو لائق نہ ہو، بیشک تو ہی بڑی دین والا ہے''۔ (ص: ۳۵)

یہاں بھی اگر استثناء کے قاعدہ کو بالائے طاق رکھ دیا جائے تو حضرت سلیمان علیہ السلام کی ہمارے نبی کریم ﷺ پر افضلیت لازم آتی ہے، جو کہ متعدد آیات قرآنی اور احادیث نبویہ کے خلاف ہے۔

لہٰذا جب قانونِ استثناء کا لحاظ رکھا جائے گا تو بنی اسرائیل کی فضیلت فقط ان کے اپنے عالم کے مخصوص لوگوں پر ثابت ہوگی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا سے نبی کریم ﷺ متعدد وجوہ سے مستثنیٰ ہوں گے، مثلاً نبی کریم ﷺ فقط حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد ہی نہیں بلکہ آپ اُن سے پہلے بھی تھے جیسا کہ ''کنت نبیاً و آدم بین الروح والجسد'' سے ظاہر ہے، اسی طرح مولیٰ علی رضی اللہ عنہ کے مولی المومنین ہونے سے انبیاء کرام علیہم السلام مستثنیٰ ہوں گے کیونکہ مولیٰ علی نبی نہیں ہیں اور کوئی غیر نبی انسان انبیاء کرام علیہم السلام سے افضل نہیں ہوسکتا۔ افسوس کہ بعض لوگ اس قانون سے مکمل آشنا ہونے کے باوجود محض ردِ روافض کے جوش میں تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہیں۔

تردیدِ روافض میں فہمِ صحابہ رضی اللہ عنہم پر حملہ

اگر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شان میں واردشدہ لفظِ مولیٰ کا معنیٰ ''آقا'' کیا جائے تو یہ پیر شیخ الحدیث والتفسیر کے نزدیک رافضیت ہے، جبکہ اولوالعزم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ معنیٰ ثابت ہے۔ چند احادیث ملاحظہ فرمایئے!

فاروقِ اعظم کا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو اپنا مولیٰ کہنا

متعدد سندوں کے ساتھ ثابت ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو اپنا مولیٰ فرمایا، جیسا کہ ہم اس سے قبل متعدد حوالہ جات کے ساتھ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے ایک مفصل حدیث نقل کر چکے ہیں، اُس کے آخر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ بھی منقول ہیں:

''اے ابوطالب کے فرزند! مبارک ہو، آپ صبح وشام (ہمہ وقت) ہر مؤمن و مؤمنہ کے مولیٰ ہو گئے''۔

امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس حدیث کی سند حسن ہے۔

(رسالة طرق حديث: من كنت مولاه، للذهبي ص٨٦، ٨٧)

ظاہر ہے کہ "مولیٰ کل مؤمن و مؤمنة" (ہر مومن مرد اور مومنہ عورت کے مولیٰ) کے قول میں متکلم یعنی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ خود بھی شامل ہیں۔ ویسے بھی یہ بات محتاج وضاحت نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہر اُس شخص کے مولیٰ ہیں جس کے رسول اللہ ﷺ مولیٰ ہیں، اور ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بھی مولیٰ ہیں، اور یہ مفہوم خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے، انہوں نے فرمایا ہے:

۲۔ علي مولىٰ من كان رسول الله مولاه .

"علی رضی اللہ عنہ ہر اُس شخص کے مولیٰ ہیں جس کے رسول اللہ ﷺ مولیٰ ہیں"۔

(الرياض النضرة ج٣ ص١٢٨، وط: ج٣ ص١١٠؛ موسوعة العشرة المبشرون بالجنة ج١١ ص٤٨)

۳۔ علاوہ ازیں بعض روایات میں آپ نے صراحتاً اپنا ذکر پہلے اور دوسرے مؤمنین و مؤمنات کا ذکر بعد میں کیا، چنانچہ امام ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث کا آخری جملہ یوں نقل کیا ہے:

فقال له عمر: هنيئاً لك يا ابن أبي طالب، أصبحت وأمسيت مولاي و مولىٰ كل مؤمن و مؤمنة.

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُنہیں کہا: اے ابوطالب کے فرزند! آپ کو مبارک ہو آپ ہر صبح اور ہر شام (ہمہ وقت) میرے اور ہر مومن اور مومنہ کے مولیٰ ہو گئے"۔

(تاريخ دمشق لابن عساكر ج٤٢ ص٢٢١، ٢٢٢؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٧ ص٣٥٤؛ التفسير الكبير للرازي ج١٢ ص٥٣)

۴۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

بخ بخ لك يا ابن أبي طالب ! أصبحت مولاي ومولىٰ كل مسلم .

"واہ واہ، اے ابوطالب کے فرزند! آپ میرے اور ہر مسلمان کے آقا ہو گئے"۔

(تاريخ دمشق ج٤٢ ص٢٣٣، ٢٣٤؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٧ ص٣٥٨؛ البداية والنهاية ج٥ ص٤٦٤ وط: ج٧ ص٥٧٨)

۵۔ امام ابن عساکر اور دوسرے محدثین لکھتے ہیں:

''حضرت ابو فاختہ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا علی تشریف لائے درآنحالیکہ سیدنا عمر اپنی مجلس میں جلوہ افروز تھے، پس جب اُن کی نگاہ سیدنا علی پر پڑی تو اُنہوں نے ان کے لیے انکساری اور تواضع فرمائی اور مجلس میں ان کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی، پھر جب سیدنا علی اٹھ کر چلے گئے تو بعض اہلِ مجلس نے کہا: امیر المومنین آپ نے علی کے لیے ایسا معاملہ کیا ہے جو آپ حضور ﷺ کے صحابہ میں سے کسی کے ساتھ نہیں کرتے؟ حضرت عمر نے فرمایا: تم نے مجھے کیا کرتے دیکھا؟ اس نے عرض کیا: میں نے آپ کو دیکھا کہ جب آپ نے علی کو دیکھا تو ان کے لیے انکساری اور تواضع کی اور مجلس میں جگہ کشادہ کی حتی کہ وہ بیٹھ گئے، آپ نے فرمایا:

وما يمنعني؟ والله إنه لمولاي ومولیٰ كل مؤمن.

''مجھے ایسا کرنے سے کیا چیز مانع ہے؟ اللہ کی قسم! بیشک وہ میرے اور ہر مومن کے آقا ہیں''۔

(تاريخ دمشق ج٤٢ ص٢٣٥؛ مختصر ج١٧ ص٣٥٨؛ الرياض النضرة ج٤ ص١١٠)

٦۔ امام محب الدین طبری لکھتے ہیں:

''حضرت عمر سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے اُن کے ساتھ کسی مسئلہ میں جھگڑا کیا تو اُنہوں نے فرمایا کہ میرے اور تیرے درمیان یہ بیٹھا ہوا آدمی فیصلہ کرے گا اور حضرت علی کی طرف اشارہ کیا تو اس آدمی نے کہا: یہ بڑے پیٹ والا (ہمارا فیصلہ کرے گا؟) حضرت عمر اپنی جگہ سے اٹھے، اُسے گریبان سے پکڑا، یہاں تک کہ اسے زمین سے اوپر اٹھالیا، پھر فرمایا: کیا تو جانتا ہے کہ تو جسے حقیر سمجھ رہا ہے وہ میرے اور ہر مسلمان کے مولی ہیں''۔

(الرياض النضرة ج٤ ص١١٠؛ موسوعة العشرة المبشرون بالجنة ج١١ ص٤٨)

٧۔ نیز امام محب الدین طبری لکھتے ہیں:

''حضرت عمر سے روایت ہے کہ اُن کے پاس دو بدؤ جھگڑا کرتے ہوئے آئے، آپ نے سیدنا علی سے عرض کیا: اے ابو الحسن! ان دونوں کے درمیان فیصلہ فرما دیں۔ پس آپ نے ان کے درمیان فیصلہ کر دیا۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ (کیا) یہی ہمارے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے رہ گیا ہے؟ (اس پر) سیدنا عمر اس کی طرف بڑھے اور اس کا گریبان پکڑ کر فرمایا: تو ہلاک ہو جائے! کیا تو جانتا ہے کہ یہ کون ہیں؟ یہ میرے اور ہر مومن کے مولیٰ ہیں (اور) جو

شخص ان کو اپنا مولیٰ نہ مانے وہ مؤمن نہیں"۔

(الرياض النضرة ج٤ ص ١١٠؛ ذخائر العقبىٰ ص ٨٤؛ الصواعق المحرقة ص ١٧٩؛ موسوعة العشرة المبشرون بالجنة ج ١١ ص ٤٨)

سیدنا فاروقِ اعظم عمر رضی اللہ عنہ سے جس سیاق وسباق سے مولیٰ علی رضی اللہ عنہ کی شان میں "مَوْلَايَ" (میرے مولیٰ) کے الفاظ صادر ہوئے ہیں، ان کا معنیٰ "آقا" ہی ہوتا ہے، کیونکہ محبوب تو ہر مومن ہے، تاہم اگر کوئی شخص شک میں مبتلا ہو تو اس معنیٰ کی تائید میں بعض عظیم المرتبت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایسے الفاظ پیش کرتا ہوں، جو اس معنیٰ میں بالکل بے غبار اور واضح ترین ہیں۔

١۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ روایت کرتے ہیں:

عن رياح بن الحارث قال: جاء رهط إلى علي بالرحبة فقالوا: السلام عليك يا مولانا! قال: كيف أكون مولاكم وأنتم قوم عرب؟ قالوا: سمعنا رسولَ الله يوم غدير خم يقول: من كنت مولاه فإن هذا مولاه، قال رياح: فلما مضوا تبعتهم فسألت من هؤلاء؟ قالوا: نفر من الأنصار، فيهم أبو أيوب الأنصاري.

"حضرت ریاح بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک وفد سیدنا علی علیہ السلام کے پاس آیا اور عرض کیا: اے ہمارے آقا! آپ پر سلامتی ہو۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا: میں کیسے تمہارا آقا ہوں، حالانکہ تم تو عرب قوم ہو؟ انہوں نے کہا: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے غدیر خم کے دن سنا تھا: "جس کا میں آقا ہوں بیشک اس کا یہ (علی بھی) آقا ہے"۔ حضرت ریاح رضی اللہ عنہ نے کہا: جب وہ لوگ چلے گئے تو میں نے ان کے پیچھے جا کر اُن سے پوچھا کہ وہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے کہا: انصار کا ایک وفد ہے، ان میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی ہیں"۔

(مسند أحمد ج٥ ص ٤١٩، وط: ج٧ ص ٧٧٩، ٧٨٠، حديث ٢٣٩٥٩، وط: ج٣٨ ص ٥٤١، ٥٤٢، حديث ٢٣٥٦٣؛ فضائل الصحابة ج٢ ص ٧٠٧، حديث ٩٢٧؛ المصنَّف لابن أبي شيبة ج٦ ص ٣٢٩، حديث ٣٢٠٦٤، وط: ج١٧ ص ٩٨، ٩٩، حديث ٣٢٧٣٦؛ البداية والنهاية ج ٤ ص ١٧٢ وج ٥ ص ٤٦٢؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٧ ص ٣٥٣؛ المعجم الكبير ج٤ ص ١٧٣، ١٧٤، حديث ٤٠٥٢، ٤٠٥٣؛ مجمع الزوائد ج٩ ص ١٠٤؛ الرياض النضرة ج٤ ص ١٠٩؛ إتحاف للبوصيري ج٧

ص۲۱۲، حدیث ۶۶۸۷؛ مرقاۃ ج۱۰ ص۴۷۸؛ فضائل درود شریف ص۸۸)

امام ذہبی فرماتے ہیں:

"اس حدیث کو امام احمد اور ایک ثقہ (لائق اعتماد) جماعت نے روایت کیا ہے"۔

(رسالة طرق حديث من كنت مولاه، للذهبي ص۴۹، ۹۸)

شیخ احمد شاکر اور شیخ شعیب الأرنؤوط نے لکھا ہے: اس کی سند صحیح ہے۔

(مسند أحمد ج۱۷ ص۳۶، حديث ۲۳۴۵۳، وط: ج۳۸ ص۵۴۱، ۵۴۲، حديث ۲۳۵۶۳)

۲۔ امام ذہبی مزید لکھتے ہیں:

ثنا عبيد الله بن موسىٰ، أخبرنا يوسف بن صهيب عن حبيب بن يسار عن أبي رملة أن ركباً أتوا علياً، فقالوا: السلام عليك ورحمة الله وبركاته، قال: وعليكم أنّى أقبل الركب؟ قالوا: أقبل مواليك من أرض كذا وكذا، قال: أنّىٰ أنتم مواليّ؟ قالوا: سمعنا رسول الله ﷺ يقول يوم غدير خمّ: من كنت مولاه فعليّ مولاه، اللّهم وال من والاه، وعادِ من عاداه، فقال عليّ: أنشد الله رجلاً سمع رسول الله ﷺ يقول ما قال إلا قام، فقام اثناعشر رجلاً فشهدوا بذلك.

رواه ابن جرير عن الرمادي عنه، ويوسف وثّقه ابن معين.

"حضرت ابو رملہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ کچھ سوار لوگوں نے سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام عرض کیا تو آپ نے جواب دے کر فرمایا: سوار کدھر سے آرہے ہیں؟ انہوں نے عرض کیا: آپ کے غلام فلاں اور فلاں مقام سے آرہے ہیں۔ آپ نے فرمایا: تم میرے غلام کیونکر ہو گئے؟ انہوں نے عرض کیا: ہم نے رسول اللہ ﷺ سے غدیر خم کے دن سنا تھا: "جس کا میں آقا ہوں بیشک اس کا یہ (علی بھی) آقا ہے، اے اللہ! تو اُسے دوست رکھ جو اِسے دوست رکھے اور اُس سے عداوت رکھ جو اِس سے عداوت رکھے۔ اس پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں اس شخص کو قسم دے کر کہتا ہوں جس نے رسول اللہ ﷺ سے سنا تھا وہ کھڑا ہو جائے، تو بارہ افراد نے کھڑے ہو کر اس حدیث کی گواہی دی"۔

اس حدیث کو امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے الرمادی سے روایت کیا ہے اور اس

کے ایک راوی یوسف کی امام ابن معین نے توثیق فرمائی ہے"۔

(رسالة طرق الحديث من كنت مولاه، للذهبي ص ٤٤، ٤٥)

ثانی عمر رضی اللہ عنہ بھی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو اپنا آقا کہتے تھے۔ چنانچہ اُن کے پاس ایک مرتبہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ایک غلام حاضر ہوا تو اُنہوں نے پوچھا:

"تم کون ہو؟ غلام نے کہا: قریش سے ہوں۔ فرمایا: کونسے قریش؟ کہا: بنو ہاشم۔ فرمایا: کون سے بنو ہاشم؟ اس پر وہ خاموش ہوا تو آپ نے دوبارہ پوچھا: اُس نے کہا: "مولیٰ علي" فرمایا: کون علی؟ وہ خاموش ہوا تو سیدنا عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے اُس کے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے فرمایا: اللہ کی قسم! میں بھی علی بن ابی طالب کا مولیٰ (غلام) ہوں، پھر پوری حدیث سنائی اور اُس غلام کو دوگنا عطا کیا"۔

(مسند أمير المؤمنين عمر بن عبدالعزيز ص ٢٧٣)

ان حدیثوں میں غور فرمائیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایسی جماعت نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو اپنا آقا اور خود کو بارگاہِ مرتضوی کا غلام کہا جنہوں نے براہِ راست حدیث "من كنت مولاه فعليّ مولاه" خود زبانِ نبوت سے سماعت فرمائی تھی، اور یہ امر مسلّم ہے کہ متکلم کے کلام کے معنیٰ اور مطلب کو جتنا براہِ راست سننے والا شخص سمجھتا ہے اتنا کوئی دوسرا شخص نہیں سمجھ سکتا۔ لہٰذا اگرچہ صاحب ضربِ حیدری بزعم خویش شیخ الحدیث والتفسیر ہیں لیکن جان کی امان ہو اور بے ادبی معاف ہو تو ہم صاحب "ضربِ حیدری" کے افکار کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عقل وفہم کے مقابلہ میں مسترد کرنے پر مجبور ہیں۔

مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ...... کا کوئی معنیٰ صحیح بھی ہے؟

روافض کی تردید میں قاسمی صاحب اس قدر پرجوش ہیں کہ انہوں نے لفظِ مولیٰ کے تقریباً تمام مطالب ومفاہیم کی یا تو نفی کردی ہے یا اُنہیں دُھندلانے کی ناکام کوشش کی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۷۴ پر "وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ" (یعنی تمام مومن مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے مولا ہیں) آیت لگا کر مولیٰ علی رضی اللہ عنہ کی اِس خصوصیت کی نفی کردی۔ پھر اُسی صفحہ پر مولیٰ بمعنیٰ آقا کی صریح نفی کی ہے، اور مولیٰ بمعنیٰ محبوب اور دوست کو تسلیم کرکے ہیرا پھیری سے اس کی خصوصیت کو بھی دھندلا دیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''حدیث پاک میں تمام صحابہ کرام ﷡ کے بارے میں محبوب کریم ﷺ نے فرمایا: فمن احبھم فبحبی احبھم ومن ابغضھم فببغضی ابغضھم، یعنی جس نے اُن سے محبت رکھی پس اس نے میری محبت کی وجہ سے ان کو محبوب جانا اور جس نے ان سے بغض رکھا میرے بغض کی وجہ سے ان سے بغض رکھا۔

خود اسی حدیث میں ''اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ'' سے ولایت کا مفہوم متعین ہو رہا ہے، یعنی اے اللہ جو علی کو مولا بنائے تو اسے اپنا مولا بنا اور جو اس سے دشمنی رکھے تو اسے اپنا دشمن بنا۔ یہاں مولا کا لفظ دشمن کے مقابلے پر استعمال ہوا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں مولا بمعنی محبوب اور دوست ہے نہ کہ مولا بمعنی آقا۔

ذرا آگے چل کر لکھا ہے:

''حدیث پاک میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللّٰھم حبب عبیدک ھذا یعنی ابا ھریرۃ وامہٗ الیٰ عبادک المومنین وحبب الیھم المؤمنین یعنی اے اللہ اپنے اس بندے ابو ہریرہ اور اس کی ماں کو تمام مومنوں کا محبوب بنا دے اور مومنوں کو ان کا محبوب بنا دے۔

حضرت ابو ہریرہ ﷜ فرماتے ہیں: فما خلق مومن یسمع بی ولا یرانی الا احبنی یعنی کوئی ایسا مومن پیدا نہیں ہوگا جو میرے بارے میں سنے اور مجھ سے محبت نہ کرے خواہ اس نے مجھے نہ دیکھا ہو (مسلم رقم الحدیث ۶۳۹۶)

(ضربِ حیدری ص174,175)

ان دو پیراگراف میں صاحبِ ''ضربِ حیدری'' نے دو احادیث درج کی ہیں جن پر ہم نے خط کھینچ دیا ہے، ان دونوں حدیثوں سے اُس مخصوص محبت کی نفی تو کیا اُسے دھندلایا بھی نہیں جا سکتا جو ''مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ'' میں سیدنا علی کے لیے چاہی گئی ہے۔ اس لیے کہ پہلی حدیث میں تمام صحابہ کرام ﷡ سے حضور ﷺ کی وجہ سے محبت کا ذکر ہے اور صحابہ کرام ﷡ میں سیدنا علی ﷜ بھی شامل ہیں بلکہ شرفِ صحابیت میں وہ تمام صحابہ کرام ﷡ سے زائد ہیں کیونکہ صحابہ میں وہی اوّل المسلمین ہیں اور آخری سرگوشی کا شرف بھی اُنہیں کو حاصل ہوا تھا۔ پھر وہ اہل بیت کرام میں بھی شامل ہیں اور ''مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ'' کا ارشاد اہل بیت عظام علیہم السلام اور صحابہ کرام ﷡ دونوں کے مقابلہ میں اُن کا مخصوص اعزاز ہے۔

بلاشبہ حضرت ابو ہریرہ اور ان کی والدہ ماجدہ رضی اللہ عنہما کے لیے محبت کی دعا فرمائی گئی لیکن "مَنْ کُنْتُ مَوْلَاهُ" کے الفاظ سے شارع ﷺ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی محبت کو جو اپنی محبت کے مساوی قرار دیا ہے، اس سے آنکھیں بند کرنا کسی سچے شیخ الحدیث سے بعید ہے۔

قارئین کرام! پہلے تو پیر سائیں نے کسی بھی معنیٰ میں سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے لیے لفظ مولیٰ کو تسلیم کرنے میں تاویلاتِ فاسدہ کیں، پھر مولیٰ بہ معنیٰ آقا کی صاف نفی کی، پھر مولیٰ بہ معنیٰ محبوب و دوست کا اقرار کر کے معاً اس معنیٰ کو بھی دُھندلا دیا، ورنہ اس مقام پر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے متعلق جو احادیث قاسمی صاحب نے درج کی ہیں ان کے اندراج کا اس کے سوا اور کیا مقصد ہے؟

کیا سیدنا علی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فقط پیر بھائی تھے؟

پہلے لکھا جا چکا ہے کہ پیر سائیں نے حدیث "مَنْ کُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ" کے کسی مفہوم کو بھی برقرار نہیں رکھا۔ انہوں نے مولیٰ بمعنیٰ آقا کا صاف انکار کر دیا، پھر مولیٰ بمعنیٰ محبوب لکھا تو سہی مگر ساتھ ہی سورۃ التوبۃ کی آیات اور دو احادیث لگا کر اپنی کاری گری سے محبتِ صحابہ اور محبتِ مرتضوی کو برابر دکھلانے کی کوشش کی، حالانکہ عام سوجھ بوجھ والا مسلمان بھی سمجھتا ہے کہ حدیث "مَنْ کُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ" کا جو بھی درست معنیٰ کیا جائے گا وہی معنیٰ سیدنا علی علیہ السلام کی خصوصیت ہوگی، کیونکہ یہ حدیث جب اُن کے سوا کسی دوسرے صحابی رضی اللہ عنہ کی شان میں نہیں آئی تو اس کا کسی نہ کسی درست معنیٰ میں اُن کی خصوصیت ہونا ضروری ہے، ورنہ حضور ﷺ کا فرمان عبث قرار پائے گا۔ پیر نے بڑے طمطراق سے شیخ مشائخنا حضرت خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ سے یہ جملہ نقل کیا تھا:

"یہاں مولا کے معنیٰ سید، سردار، حاکم اور لائقِ امامت کے نہیں بلکہ اس کے معنیٰ ناصر اور محبوب کے ہیں" مگر کیا اُنہیں حضرت خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ کا بیان فرمودہ وہ مفہوم بھی ہضم ہوگا جو انہوں نے حدیث "مَنْ کُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ" کے تحت یوں ارشاد فرمایا ہے:

> "اس سے پہلے صحابہ کرام ایک دوسرے کو پیر بھائی سمجھتے تھے اور اپنے مابین صرف اسلامی اخوت کے قائل تھے، اس حدیث کے ورود کے بعد تمام صحابہ حضرت علیؓ کو محبوب رکھنے پر مامور ہو گئے تھے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے یہ حدیث سنتے ہی حضرت علیؓ سے ملاقات کی اور مبارکباد دی کہ اے ابن ابی طالب آپ ہمیشہ ہر مومن اور مومنہ کے دوست اور محبوب ہیں۔ اس سے بڑی فضیلت اور

شرافت (عظمت) کیا ہو سکتی ہے؟"۔

(مقابیس المجالس ص ۹۲۱)

معلوم ہوا کہ "مَن کنتُ مولاہ" کے ارشاد کے بعد سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے محض پیر بھائی نہیں رہے تھے بلکہ اُن کی شان اس سے بلند ہو گئی تھی۔

واہ! پیر کی پسند

"النبراس" کے صفحہ ۳۰۳ پر ایک سوال قائم کیا گیا ہے کہ: کیا اصحاب ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی بہ نسبت سیدنا و مولانا علی المرتضیٰ علیہ السلام سے محبت کا زیادہ ہونا جائز ہے؟ وہاں اس سوال کے دو جواب مذکور ہیں: [۱] ایک یہ کہ کوئی حرج نہیں [۲] دوسرا یہ کہ درست نہیں۔

پہلے ہم اپنے قارئین کرام کے سامنے سوال اور جواب کی عبارت پیش کرتے ہیں پھر بعض معاصرین کی پسند پیش کریں گے۔ علامہ عبدالعزیز پرہاروی لکھتے ہیں:

هل يجوز لأحد أن يحب علياً رضي الله عنه أكثر من الثلاثة مع الاعتقاد بالأفضلية على الترتيب؟ قال: في الكروري: لابأس به، وفي الناطقي عن أبي حنيفة قال: من قال عليٌّ رضي الله عنه أحب إليّ من الجميع فهو رجل وغل، أي فاسد.

"کیا کسی شخص کے لیے جائز ہے کہ وہ تین خلفاء کرام رضی اللہ عنہم کی بہ نسبت سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ محبت کرے؟ "کروری" میں ارشاد ہے: اس میں کوئی حرج نہیں، اور "ناطقی" میں امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا: جس شخص نے کہا: مجھے علی سب سے زیادہ محبوب ہیں تو وہ بگڑا ہوا آدمی ہے"۔

(النبراس شرح شرح العقائد ص ۳۰۳، وط: ص ۴۹۲)

لیکن افسوس کہ پیر سائیں کو دوسرا قول ہی پسند ہے۔ آیئے ایک معروضی جائزہ لیتے ہیں کہ مذکورہ دونوں اقوال میں سے کونسا قول درست ہے؟

کیا سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ محبت کمینگی ہے؟

عقلاً اور نقلاً جو بات درست ہے وہ یہ ہے کہ جتنی احادیث صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت کے متعلق آئی ہیں سیدنا

علی ؓ اُن میں بھی شامل ہیں اور " مَنْ کُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ "کا ارشاد اُن کی ایک اضافی اور مخصوص شان ہے۔ اس ارشاد سے سیدنا علی ؓ کے لیے مخصوص اور زیادہ محبت چاہی گئی ہے، صحابہ کرام ؓ نے بھی اس ارشاد سے یہی سمجھا تھا۔ چنانچہ آپ پڑھ چکے ہیں کہ جب ایک شخص کو سیدنا علی ؑ کے قاضی ہونے پر اعتراض ہوا تو فاروقِ اعظم ؓ نے اس کے گریبان سے پکڑ کر اسے فرمایا: '' کیا تو جانتا ہے کہ یہ کون ہیں؟ یہ میرے اور ہر مومن کے مولیٰ ہیں (اور) جو شخص ان کو اپنا مولیٰ نہ مانے وہ مومن نہیں'' حالانکہ فاروقِ اعظم ؓ بھی ہمارے معاصر شیخ الحدیث والتفسیر کی طرح آیت " وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ " (تمام مومن مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے مولا ہیں) پڑھ کر اس شخص کو فرما سکتے تھے کہ ہر چند کہ بڑا مولیٰ میں ہوں کیونکہ میں افضل ہوں اور جو افضل ہو وہی بڑا مومن ہوتا ہے اور جو جتنا بڑا مومن ہوتا ہے اتنا ہی وہ بڑا مولیٰ ہوتا ہے، البتہ مسئلہ تم اِن سے ہی پوچھو، لیکن چونکہ اُن کا فہم ہمارے معاصر سے نہیں ملتا تھا اس لیے اُنہوں نے سیدنا علی ؓ کو خود اپنا بھی مولیٰ فرمایا اور ساتھ فتویٰ بھی دے دیا کہ جو انہیں اپنا مولیٰ نہ مانے وہ مومن ہی نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ کرام ؓ کے نزدیک بھی تمام مومنین کا مولیٰ ہونا سیدنا علی ؓ کی ایک خصوصیت ہے اور اُن سب کے نزدیک " مَنْ کُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ " آپ کی شان میں مستقل اور منفرد حدیث ہے۔ پھر جب صاحب ''ضربِ حیدری'' کو بھی کرھاً تسلیم ہے کہ مولیٰ بمعنی دوست اور محبوب ہے، اور یہ بھی تسلیم ہے کہ یہ لفظ فقط سیدنا علی المرتضیٰ ؓ کی ہی شان میں آیا ہے تو اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ آپ کے ساتھ سب سے زیادہ محبت ہو، مگر افسوس کہ پیر سائیں کے نزدیک یہ زیادتی محبت کینگی ہے، اور انہیں "النبراس" کا دوسرا قول ہی پسند ہے۔ چنانچہ وہ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

> ''اولاً محبت کی وجہ سے افضل کہنا تو بڑی بات ہے، افضل مانے بغیر محض محبت کو غالب رکھنا ہی فساد کی جڑ ہے۔ امامِ اعظم ابوحنیفہ رحمت اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ من قال علي احب اليّ من الجميع فهو رجل وغل یعنی جس نے کہا کہ مجھے علی سب سے زیادہ پیارے ہیں تو وہ شخص نہایت کینہ ہے''۔

(ضربِ حیدری ص236)

بعض معاصرین کی پسند کا جائزہ

احقر کا یقین ہے کہ ایسا لغو قول افقہ الائمہ، سراج الامہ سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت ؓ کا نہیں ہو

سکتا، کیونکہ وہ مولیٰ علی ﷺ کو سیدنا عثمان غنی ﷺ پر ترجیح دیتے تھے اور یہی اہلِ سنت کے ایک جم غفیر کا مذھب ہے۔ یہ قول کسی دوسری بڑی شخصیت کا بھی نہیں ہو سکتا، خدا جانے ''ناطقی'' کو یہ قول کہاں سے ہاتھ آ گیا؟ خیر، جہاں سے بھی انہوں نے لیا ہو، احادیث کے خلاف ہونے کی وجہ سے مردود و باطل ہے، کیونکہ سیدنا ابن عباس ﷺ نے ضابطہ بیان فرمایا ہے:

لیس أحدٌ إلا یؤخذ من قوله ویُدَعُ غیر النبي صلی اللّٰه علیه وسلم.

''ہر شخص کا قول قبول بھی کیا جاتا ہے اور مسترد بھی، ماسوا نبی کریم ﷺ کے قول کے''۔

(المعجم الكبير ج٥ ص٤٠٤، حديث ١١٧٧٣؛ جامع بيان العلم وفضله ج٢ ص٩٢٥، ٩٢٦؛ إحياء علوم الدين ج١ ص٧٧؛ كتاب الفقيه والمتفقه ج١ ص٤٤١؛ الدرر المنتثرة ص٢٢٥؛ المقاصد الحسنة ص٣٨٠؛ الأسرار المرفوعة ص١٧٥؛ الشذرة ج٢ ص٤٢؛ كشف الخفاء ج ٢ ص ١٠٩؛ أسنى المطالب للحوت ٢٣٩؛ إتحاف السادة المتقين ج١ ص٧١٤؛ فتاویٰ رضویه ج١٠ ص١٩٤)

اس پسند کی تردید میں احادیث

معلوم ہوا کہ کتاب وسنت کے مقابلہ میں شخصی اقوال مسترد ہو سکتے ہیں اور فقہاءِ احناف ﷺ تو حدیث کے معاملہ میں اس قدر محتاط ہیں کہ وہ ضعیف حدیث کو بھی ذاتی رائے پر ترجیح دیتے ہیں اور اس مسئلہ (یعنی افضلیتِ مرتضوی) میں تو احادیثِ صحیحہ اور حسنہ موجود ہیں، چند احادیث آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ غزوۂ خیبر کی حدیث آگے آ رہی ہے، اگر اس میں غور کیا جائے تو سیدنا علی ﷺ تمام صحابہ کرام ﷺ سے زیادہ محبوب ومحبِ خدا و مصطفیٰ نظر آتے ہیں، اس لیے کہ دوسرے صحابہ کرام ﷺ بھی محبوب ومحبِ خدا و مصطفیٰ تھے مگر پرچمِ فتح سیدنا علی ﷺ کو عطا ہوا جو اُن کے زیادہ محبوب ومحب ہونے کی واضح دلیل ہے۔

۲۔ حدیث الطیر کی رو سے تو کھانے پینے والی اُس وقت کی ساری مخلوق سے سیدنا علی ﷺ زیادہ محبوبِ خدا ثابت ہوتے ہیں۔

۳۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

حدثنا أبو نعيم، حدثنا يونس، حدثنا العيزار بن حريث قال: قال النعمان بن بشير: استأذن أبو بكر على رسول الله ﷺ، فسمع صوت عائشة عالياً وهي

تقول: واللّٰہ لقد عرفتُ أن علياً أحب إليک من أبي ومني، مرتین أو ثلاثاً، فاستأذن أبو بکر، فدخل، فأھویٰ إلیھا فقال: یا بنت فلانۃ ألا أسمعک ترفعین صوتک علیٰ رسول اللّٰہ ﷺ.

''حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے اندر آنے کی اجازت طلب کی تو انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی آواز سنی، وہ کہہ رہی تھیں: ''اللہ کی قسم یقیناً میں جانتی ہوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کو میرے والد سے اور مجھ سے زیادہ محبوب ہیں'' یہ انہوں نے دو یا تین مرتبہ کہا۔ پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اجازت مانگ کر اندر داخل ہوئے تو وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف بڑھے اور فرمایا: او فلانی کی بیٹی! کیا میں نہیں سن رہا کہ تو رسول اللہ ﷺ کے سامنے آواز بلند کر رہی ہے؟''۔

(مسند أحمد ج٤ ص٢٧٥ وط: ج٦ ص٢٩٠، حدیث ١٨٦١١ وط: ج٣٠ ص ٣٧٢، ٣٧٣، حدیث ١٨٤٢١؛ فضائل الصحابة ج١ ص٨٩، حدیث ٣٩)

امام بزار نے بھی بعینہٖ اسی سند کے ساتھ یہ حدیث روایت فرمائی ہے، ماسوا اس کے کہ اُن کی سند کے شروع میں ایک شخص محمد بن معمر کے نام کا اضافہ ہے۔

(مسند البزار ج٨ ص٢٢٣، حدیث ٢٣٧٥؛ کشف الأستار ج٣ ص١٩٤، ١٩٥ حدیث ٢٥٤٩)

حافظ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اس حدیث کو امام ابوداود نے ذکرِ محبتِ علی رضی اللہ عنہ کے بغیر روایت کیا ہے، (ان الفاظ سے) اس کو امام بزار نے روایت کیا ہے اور ان کے راوی صحیح حدیث کے راوی ہیں، اور امام طبرانی نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے''۔

(مجمع الزوائد ج٩ ص١٢٧ وط: ج٩ ص١٧٠، حدیث ١٤٧٣٠ وط: ج٩ ص١١٩، حدیث ١٤٧٣١)

یہاں حافظ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مناقب میں لائے ہیں اور آگے اس کو دوبارہ سیدتنا فاطمۃ الزھراء علیہا السلام کے ذکر میں لائے ہیں اور وہاں فرمایا ہے:

''میں کہتا ہوں: اس کو امام ابوداود رحمۃ اللہ علیہ نے سیدنا علی و فاطمہ علیہما السلام کے ذکر

کے بغیر روایت کیا ہے (اور ان الفاظ سے) اس کو امام احمد نے روایت کیا ہے اور اُن کے راوی صحیح حدیث کے راوی ہیں"۔

(مجمع الزوائد ج۹ص۲۰۲-وط: ج۹ص۳۲۵، حدیث۱۵۱۹٤، وط: ج۹ص ۲۳۷، حدیث ۱۵۱۹٤، وط: ج۱۸ص۵۸۲، حدیث۱۵۱۸۸)

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی مسند احمد کے الفاظ میں یہ حدیث ذکر فرمائی ہے اور شیخ شعیب الأرنؤط نے اس پر مسند احمد اور شرح مشکل الآثار کی تحقیق میں لکھا ہے کہ یونس بن ابی اسحاق کی وجہ سے اس کی سند حسن ہے اور اس کے راوی صحیح حدیث کے راوی ہیں۔

(مسند أحمد ج۳۰ص۳۷۲، ۳۷۳، حدیث۱۸٤۲۱؛ شرح مشکل الآثار ج۱۳ص۳۳۳، حدیث ۵۳۰۹؛ تحفة الأخیار بترتیب شرح مشکل الآثار ج۹ص۸۹، حدیث٦۳۹٦)

یہ حدیث قاضی ابو الحسین ابن قانع بغدادی نے بھی ذکر کی ہے۔

(معجم الصحابة ج۲ص۲۸۱رقم۱۷۷۵)

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے دو مقامات پر اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے:

(مختصر زوائد البزار للعسقلاني ج۲ص۳۱٦، ۳۱۷، حدیث۱۹۲۷؛ فتح الباري ج۷ص۳۷۷)

امام عبد الرؤف المناوی اور قاضی شوکانی نے بھی امام احمد کی سند کے تمام راویوں کو صحیح حدیث کا راوی کہا ہے۔

(إتحاف السائل للمناوي ص۲۱؛ در السحابة للشوکاني ص۲۷۸)

فائدہ:

خیال رہے کہ ان تمام احادیث صحیحہ میں ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے اس قول "میں یقین سے جانتی ہوں کہ حضرت علی آپ کو میرے والد اور مجھ سے زیادہ محبوب ہیں" کی نبی کریم ﷺ نے تردید نہیں فرمائی بلکہ خاموشی اختیار فرما کر اُم المومنین کے اس خیال کو مقرر رکھا ہے، حالانکہ اللہ ﷻ کے کسی بھی نبی سے بعید ہے کہ وہ (بقول صاحب ضرب حیدری) کمینی بات پر خاموشی اختیار کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اس بات کو حقیقت سمجھا اور وہ بعد میں تا حیات اسی حقیقت کا اظہار فرماتی رہیں۔ ایک

حدیث ملاحظہ فرمایئے:

أخبرني محمد بن آدم بن سليمان المصيصي، قال: حدثنا ابن أبي غنية، عن أبيه عن أبي إسحاق، عن جُمَيْع بن عُمَير قال: دخلت مع أمي على عائشة وأنا غلام، فذكرت لها علياً ﷺ، فقالت: ما رأيتُ رجلاً أحبَّ إلى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ منه، ولا امرأةً أحبَّ إلىٰ رسولِ اللّٰه ﷺ من امرأته.

''حضرت جمیع بن عمیر ﷺ بیان کرتے ہیں کہ میں اپنی امی کے ساتھ ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گیا اور اس وقت میں بچہ تھا۔ میری والدہ نے ان کے سامنے حضرت علی ﷺ کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا: میں نے نہیں دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کو ان سے زیادہ کوئی شخص محبوب تھا اور نہ ہی ان کی اہلیہ (سیدۃ نساء اہل الجنۃ، فاطمہ رضی اللہ عنہا) سے زیادہ کوئی خاتون محبوبہ تھیں''۔

(السنن الكبرى للنسائي ج٧ص ٤٤٨، حديث ٨٤٤٢، وط: ج٥ ص ١٣٩، حديث ٨٤٩٦؛ سنن الترمذي ص ٨٧٤، حديث ٣٨٧٤؛ شرح مشكل الآثار ج١٣ ص ٣٣٢، ٣٣٣، حديث ٥٣٠٧، ٥٣٠٨؛ تحفة الأخيار بترتيب شرح مشكل الآثار ج٩ ص ٨٧، حديث ٦٣٩٤ وص ٨٨، حديث ٦٣٩٥؛ المستدرك للحاكم ج٣ ص ١٥٣، حديث ٤٧٤ وص ١٥٦، حديث ٧٤٩٨؛ فضائل فاطمة الزهراء للحاكم ص ٤٧، ٤٨؛ تاريخ دمشق ج٤٢ ص ٢٦٠، ٢٦١، ٢٦٢؛ مختصر تاريخ دمشق ج ١٧ ص ٣٦٥، ٣٦٦؛ مشكاة ج٢ ص ٥١٤، حديث ٦١٥٥؛ ذخائر العقبىٰ ص ٤٨؛ الرياض النضرة ج ٣ ص ١٠٠؛ در السحابة للشوكاني ص ٢٧٣، ٢٧٤)

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو ''حسنٌ غریبٌ'' قرار دیا ہے جبکہ محی السنۃ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اِس کو اپنی کتاب کی اُس فصل میں درج کیا ہے جس میں وہ احادیثِ حسنہ لاتے ہیں، جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ حدیث اُن کے نزدیک حسن ہے۔

(مصابيح السنة ج٤ ص ١٩٠ رقم ٤٨١٨)

ان احادیثِ صحیحہ اور حسنہ سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام ﷺ کے نزدیک سیدنا علی ﷺ سے بڑھ کر نبی کریم ﷺ کو کوئی دوسرا شخص محبوب نہیں تھا۔ دل پر ہاتھ رکھ کر انصاف سے بتلایئے! اس محبت کو کمینگی کہنا کہاں کی شرافت ہے؟

اس پسند کی تردید میں آثار

مجھ ایسے عوام الناس کے لیے عرض کر دوں کہ آثار "اثر" کی جمع ہے، اور محدثین کی زبان میں "اثر" صحابی کے قول کو کہا جاتا ہے۔ یہاں جو آثار ہم نقل کر رہے ہیں وہ حدیث نبوی ﷺ کی روشنی میں ہیں، ملاحظہ فرمایئے!

۱۔ محدث خلال لکھتے ہیں:

أخبرنا عبد اللّٰه بن أحمد قال: ثنا داود بن عمر الضبّي، وانتخبه أبي عليه، قال: ثنا علي بن هاشم، قال: ثنا أبو الحجاف، عن معاوية ابن ثعلبة، قال: جاء رجلٌ أباذرٍّ وهو في مسجدِ رسولِ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وآله وسلّم فقال: يا أباذر! ألا تخبرني بأحب الناس إليک؟ فإني أعرف أن أحبهم إليک أحبهم إلىٰ رسولِ اللّٰه. قال: إي ورب الكعبة، إن أحبهم إليّ أحبهم إلىٰ رسولِ اللّٰه ﷺ وهو ذاک الشيخُ، وأشار بيده إلىٰ عليٍّ وهو يصلّي أمامه.

''حضرت معاویہ بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت وہ مسجد نبوی میں تھے، اُس نے عرض کیا: "اے ابوذر! کیا آپ مجھے آگاہ نہیں فرماتے کہ آپ کو تمام لوگوں سے زیادہ محبوب کون ہے؟ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ آپ کو زیادہ محبوب وہی ہوگا جو رسول اللہ ﷺ کو سب سے زیادہ محبوب تھا۔ انہوں نے فرمایا: ہاں ربِّ کعبہ کی قسم یقیناً مجھے سب سے زیادہ محبوب وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ کو سب سے زیادہ محبوب تھا، اور وہ یہ شیخ ہے، اور اپنے ہاتھ سے سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ فرمایا درآنحالیکہ وہ اُن کے سامنے نماز پڑھ رہے تھے''۔

(كتاب السنة للخلال ج۱ ص۳٤٤، حديث۴۵۲؛ تاريخ دمشق ج ٤٢ ص٢٦٥؛ المناقب للخوارزمي ص٦٩، حديث٤٢؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٧ ص٣٦٦؛ الرياض النضرة ج٣ ص١٠٠؛ ذخائر العقبىٰ ص٧٧؛ غاية التبجيل وترك القطع فی التفضیل، للممدوح ص١٢٩، ١٣٠؛ موسوعة العشرة المبشرون بالجنة ج١١ ص٣٦)

۲۔ ایک طویل حدیث کے آخر میں ہے کہ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کو جب نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میں جس کا مولیٰ

ہوں تو علی بھی اس کے مولیٰ ہیں تو انہوں نے اِس محبت کو اپنا عقیدہ بنالیا، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

فما كان أحدٌ من الناس بعد قول رسول الله ﷺ احب إلي من علي ؓ.

''پس رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے بعد لوگوں میں سے کوئی بھی مجھے علی ؓ سے زیادہ محبوب نہیں تھا''۔

(السنن الكبرى للنسائي ج٧ص٤٤٣، حديث٨٤٢٨، وط: ج٥ص١٣٥، حديث٨٤٨٢؛ مسند أحمد ج٥ص٣٥١، حديث٢٣٣٥٥، وط: ج١٦ص٤٨٣، ٤٨٤، حديث ٢٢٨٦٣، وط: ج٣٨ ص٦٥، ٦٦، ٦٧، حديث٢٢٩٦٧؛ فضائل الصحابة ج٢ص٨٦٠، حديث١١٨٠؛ شرح مشكل الآثار ج٨ص٥٨، ٥٩، حديث٣٠٥١؛ تحفة الأخيار ج٥ ص ٤٩٦، حديث٣٥٨٩؛ خصائص علي ص١١٦، حديث٩٧، وط: ص٩٩، حديث ٩٤؛ البداية والنهاية ج١١ص٦٠؛ مجمع الزوائد ج٩ص١٢٧، وط: ج٩ ص١٧١، حديث١٤٧٣١، وط: ج٩ص١١٩، حديث١٤٧٣١؛ در السحابة للشوكاني ص٢٢٣)

خیال رہے کہ صحابیِ رسول سیدنا بریدۃ ؓ نے بلا استثنا فرمایا ہے کہ اُنہیں رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے فوراً بعد تمام لوگوں سے زیادہ سیدنا علی علیہ السلام محبوب ہوگئے، اُن کا یہ بیان فرمانِ نبوی ﷺ کے صدور کے وقت سے لے کر اُن کی حیات کی آخری سانس تک کو شامل ہے، اور اُن کا وصال یزیدی دور میں ٦٣ھ میں ہوا تھا۔

(الإصابة في تمييز الصحابة ج١ص٤١٨)

اس سے معلوم ہوا کہ خلفاء ثلاثہ ؓ کے ادوارِ خلافت میں بھی ہر خلیفۂ وقت سے زیادہ اُنہیں سیدنا علی علیہ السلام محبوب تھے۔ پیر سائیں فیصلہ فرمائیں کہ یہ شرعی طور پر پسندیدہ بات ہے یا کمینگی؟ فَاعْتَبِرُوْا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ!

٣۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہا حضرت عبداللہ بن ظالم سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

جاء رجل إلىٰ سعيد بن زيد فقال: إني أحببتُ علياً حباً لم أحبه شيئاً قط،
قال: نِعْمَ ما رأيت، أحببت رجلاً من أهل الجنة.

''حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہما (جو کہ از عشرہ مبشرہ ہیں) کی خدمت میں ایک شخص نے حاضر ہو کر عرض کیا: میں سیدنا علی المرتضیٰ ؓ سے خوب محبت کرتا ہوں، ایسی محبت میں

نے کبھی کسی چیز کے ساتھ نہیں کی، انہوں نے فرمایا: تمہارا نظریہ خوب ہے، تم ایک جنتی شخص کو محبوب رکھتے ہو“۔

(فضائل الصحابة ج٢ ص ٧٠٥، حديث ٩٦٣، وط: ص ٢١٦، حديث ٩٦٥؛ السنن الكبرى للنسائي ج٥ ص ٥٩، حديث ٨٢٠٦، وط: ج٧ ص ٣٣٢، حديث ٨١٤٩؛ أسد الغابة ج٤ ص ١١٨؛ موسوعة العشرة المبشرون بالجنة ج١١ ص ١٠٤)

خیال رہے کہ حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہما نے اُس شخص کو یہ تنبیہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی کہ علی کے ساتھ ہر شے سے زیادہ محبت ضرور کرو مگر یاد رکھنا اصحابِ ثلاثہ رضی اللہ عنہم سے بڑھ کر اُن سے محبت مت کرنا کیونکہ یہ کمینگی ہے۔ فَتَدَبَّرْ!

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور کمینگی پر خاموشی؟

مذکورہ بالا تمام احادیث کو مدنظر رکھتے ہوئے بتلایئے! کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہ اولین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کسی ایسی بات پر خاموش رہ سکتے تھے جو شریعت میں کمینگی ہو؟ خصوصاً مؤخر الذکر صحابی کا قول زیادہ لائق توجہ ہے، کیونکہ وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُنہیں سات باتوں کی وصیت فرمائی تھی جن میں ایک بات یہ بھی تھی:

أن أقول بالحق وإن كان مُرًّا.

”کہ میں حق بات کروں اگرچہ وہ کڑوی ہو“۔

(مسند أحمد ج٥ ص ١٥٩، ١٧٣، وط: ج٧ ص ١٨٠، حديث ٢١٧٤٥؛ صحيح ابن حبان ج٢ ص ١٩٤، حديث ٤٤٩؛ السنن الكبرى للبيهقي ١٠ ص ٩١، وط: ج١٠ ص ١٥٥، حديث ٢٠١٨٦؛ شعب الإيمان ج٣ ص ٢٤٠، حديث ٣٤٢٩، ٣٤٣٠؛ المعجم الصغير ج٢ ص ٤٨، حديث ٧٥٨)

یہ اس وصیتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس حد تک کاربند ہوئے کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے حق میں فرمایا:

ما أقلّت الغبراء ولا أظلّت الخضراء من رجل أصدق لهجة من أبي ذر.

”ابوذر رضی اللہ عنہ سے کسی زیادہ سچے شخص کو نہ زمین نے اٹھایا اور نہ آسمان نے سایہ کیا“۔

(مسند أحمد ج٢ ص ١٦٣، ١٧٥، ٢٢٣، وط: ج٢ ص ٥٩٨، حديث ٦٥١٩ وص ٦٢٢، حديث ٦٦٣٠ وص ٧٢١، حديث ٧٠٧٨؛ سنن الترمذي ص ٨٢٢، حديث ٣٨٠١؛ سنن ابن ماجه ج١ ص

۱۰۳، حدیث ۱۵٦)

بعض محدثین کرام کو اس حدیث میں تاویل کی ضرورت محسوس ہوئی، کیونکہ اُن کے نزدیک حضرت ابوذر ؓ تمام صحابہ کرام ؓ سے زیادہ سچے نہیں ہو سکتے، ان کے نزدیک بعض صحابہ کو اس سے مستثنیٰ سمجھنا ناگزیر ہے، اور یہ رجحان کلی فضیلت کی طرف جاتا ہے، جبکہ اس حدیث کا ایسا معنیٰ بھی ممکن ہے جس سے یہ ارشادِ نبوی ﷺ حضرت ابوذر ؓ پر مکمل صادق آتا ہے اور کسی استثناء کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ چنانچہ امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی معنوی تاویل کے آخر میں لکھتے ہیں:

أقول يمكن أن يراد أنه لايذهب إلى التورية والمعاريض في الكلام، فلا يرخىٰ عنان كلامه ولايواري مع الناس، ولايسامحهم، ويظهر الحق البحت، والصدق المحض.

"میں کہتا ہوں: ممکن ہے اس سے یہ مراد ہو کہ وہ کلام میں "تورية" اور "معاریض" (ذومعنی بات) کی طرف نہ جاتے ہوں، تو وہ اپنے کلام کی لگام کو ڈھیلا نہ چھوڑتے ہوں، لوگوں سے مخفی نہ رکھتے ہوں، اُن کے ساتھ موافقت نہ کرتے ہوں اور خالص حق اور محض سچ کو ظاہر کر دیتے ہوں"۔

(شرح الطيبي على المشكاة ج١٢ ص ٣٩٤٥؛ تحفة الأحوذي ج ١٠ ص ٢٨٣)

شاید سائل کو ان کی یہ طبیعت معلوم تھی اس لیے اُس نے انتہائی جستجو اور تحقیقی فکر سے دریافت کیا:

يا أباذر! ألا تخبرني بأحب الناس إليک؟ فإني أعرف أن أحبهم إليک أحبهم إلىٰ رسولِ الله.

"اے ابوذر! کیا آپ مجھے آگاہ نہیں فرماتے کہ آپ کو تمام لوگوں سے زیادہ محبوب کون ہے؟ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ آپ کو زیادہ محبوب وہی ہوگا جو رسول اللہ ﷺ کو سب سے زیادہ محبوب تھا"۔

جس طرح سائل کا انداز تحقیق و جستجو پر مبنی تھا، حضرت ابوذر ؓ کا جواب بھی اُسی شان سے تھا، سو اُنہوں نے مسجد نبوی میں بیٹھ کر رب کعبہ کی قسم کھا کر فرمایا:

إن أحبهم إليّ أحبهم إلىٰ رسولِ الله ﷺ.

"یقیناً مجھے سب سے زیادہ محبوب وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ کو سب سے زیادہ محبوب تھا"۔

واضح رہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا وصال خلیفۂ ثالث سیدنا عثمان غنی ذی النورین رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ۳۲ھ میں ہوا تھا، جبکہ خلیفۂ ثالث کی شہادت ۳۵ھ میں ہوئی تھی۔ خدا جانے سائل نے یہ سوال کس دور میں کیا ہوگا؟ بہر حال یہ تو ظاہر ہے کہ اُس نے یہ سوال اُن کی حیات میں ہی کیا تھا اور جب اُن کا وصال خلیفۂ ثالث رضی اللہ عنہ کے دور میں ہوا تو اس سے ثابت ہوا کہ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم سے محبت کی ترتیب اُن کی خلافت کی ترتیب کے مطابق لازم نہیں۔ اگر شرعی طور پر کوئی ایسی قباحت ہوتی (جو پیر سائیں کے نزدیک کمینگی ہے) تو "توریہ" تعریض اور رکھ رکھاؤ سے آزاد یہ عظیم صحابی اُس پر خاموش نہ رہتے اور واشگاف الفاظ میں حق اور سچ کو واضح کرتے ہوئے سائل کو متنبہ فرما دیتے کہ: یاد رکھو! محبت کی ترتیب خلافت کی ترتیب کے مطابق لازم ہے، لہٰذا اگر تم نے سب سے زیادہ علی سے محبت کی تو تم کمینے ہو جاؤ گے۔

میں سمجھتا ہوں: شاید وہ سائل کو تنبیہ کرنے کے ثواب سے اس لیے محروم رہ گئے کہ انہوں نے تقاریظ علماء سے مملو کتاب "ضربِ حیدری" کا یا ہمارے نصاب میں شامل "النبراس" کا مطالعہ نہیں کر رکھا تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ خلیفۂ ثالث رضی اللہ عنہ کی خلافت کے عین وقت میں اِس أصدق اللھجة صحابی کو خلیفۂ وقت سے زیادہ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ محبوب تھے، اور اس کی وجہ خود اُن کے مطابق یہ ہے کہ سیدنا علی علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سب سے زیادہ محبوب تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کے دور میں بھی ان کو زیادہ محبوب شیخین کریمین نہیں بلکہ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ تھے۔

اگرچہ پیر سائیں کے اس غیر محتاط فتوے کی زد میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بھی آتے ہیں لیکن یہ پندرھویں صدی کے پیر کا فتویٰ ہے جبکہ مرشد العالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اُن کے دائمی اعزاز کی حتمی ضمانت منقول ہے۔ چنانچہ جامع ترمذی میں مذکور الصدر حدیث مزید اضافہ کے ساتھ یوں آئی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ولا اوفیٰ من أبي ذر شبه عیسی ابن مریم ،فقال عمر بن الخطاب کالحاسد: یارسول اللّٰہ أفتعرف ذلک له؟ قال: نعم، فاعرفوه.

"اور نہ کوئی ابوذر سے زیادہ وفا والا ہے، وہ عیسیٰ بن مریم [علیہ السلام] کے مشابہ ہے۔ اس پر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے رشک کرنے والے شخص کی طرح عرض کیا: یارسول اللہ! کیا آپ اس کا یہ مرتبہ پہچانتے ہیں؟ فرمایا: ہاں، تم بھی پہچان لو"۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: بعض راویوں نے اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد فرمایا:

أبو ذر يمشي في الأرض بزهد عيسى ابن مريم ﷺ.

حضرت ابوذر ؓ زمین پر حضرت عیسی بن مریم ؑ کے زھد کے ساتھ چلتے ہیں"۔

(جامع الترمذي ص ٨٦٢، حديث ٣٨٠٢)

یہ زائد محبت کمینگی نہیں، کمالِ ایمان ہے

چند سطور قبل آپ پڑھ چکے ہیں کہ حضرت سیدنا بریدہ ؓ نبی کریم ﷺ کے ظاہری دور مبارک سے لے کر (یزید کے دور میں) اپنے وصال تک سب سے زیادہ سیدنا علی ؓ سے محبت کرتے رہے۔ لہٰذا ایمان سے بتلائیے! کیا رسول اللہ ﷺ کے بعد مولیٰ علی ؓ کے ساتھ سب سے زیادہ محبت کرنے والے یہ صحابہ کرام ؓ کمینگی میں مبتلا تھے؟ اور کیا شارع ؑ معاذ اللہ، اُنہیں کمینگی کا درس دیتے رہے؟ فیا للعجب!

یا اللہ! ہمیں عقلِ سلیم عطا فرما! کیونکہ اب ہم پر وہ وقت آپڑا ہے کہ ہم کمال کو زوال، شرافت کو ذلت اور عظمت کو کمینگی سمجھنے لگے ہیں، اور۔

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقت دعا ہے
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

عجیبہ

آپ حیران ہوں گے کہ جو بات محبت و ادب کے ایسے نام نہاد پیر سائیوں کے نزدیک کمینگی ہے وہی بات بعض اُن لوگوں کے نزدیک جن پر بے ادبی کے فتوے لگائے جاتے ہیں سیدنا بریدہ ؓ کی منقبت ہے۔ چنانچہ قاضی شوکانی اور شیخ عبداللہ بن صالح لکھتے ہیں:

وفي الحديث الآخر منقبة ظاهرة لعلي ؓ ومنقبة لبريدة لمصير علي أحب الناس إليه، وقد صح أنه لا يحبه إلا مؤمن ولا يبغضه إلا منافق.

"اس دوسری حدیث میں سیدنا علی ؓ کی کھلی منقبت ہے، اور اس میں سیدنا بریدہ ؓ کی بھی فضیلت ہے کہ اُنہیں سیدنا علی ؓ تمام لوگوں سے زیادہ محبوب ہو گئے، اور حدیث میں ہے کہ اُن سے محبت نہیں کرے گا مگر مومن اور اُن سے بغض نہیں رکھے گا مگر منافق"۔

(نيل الأوطار ج٦ ص ١٨٥، وط: ج١٢ ص ٦١٣؛ كتاب الأربعين ص ١٦١)

امام اعظم ﷺ پر پیر سائیں کی زیادتی

شیخ الحدیث والتفسیر پیر سائیں غلام رسول قاسمی نے لکھا ہے:

''امام اعظم ابوحنیفہ رحمت اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ من قال علي احب الیّ من الجمیع فھو رجل وغل یعنی جس نے کہا کہ مجھے علی سب سے زیادہ پیارے ہیں تو وہ شخص نہایت کمینہ ہے''۔

(ضربِ حیدری ص 236)

میں کہتا ہوں: یہ امام اعظم ابوحنیفہ ﷺ کی علمی، فقہی اور محدثانہ شخصیت پر انتہائی مکروہ الزام ہے، کیونکہ سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کے احب الصحابة (تمام صحابہ سے بڑھ کر محبوب) ہونے پر متعدد احادیث صحیحہ اور حسنہ موجود ہیں، لہٰذا یہ کیونکر تصور کیا جا سکتا ہے کہ امام اعظم ﷺ احادیث صحیحہ اور حسنہ پر اپنے قول و قیاس کو ترجیح دیتے تھے، جبکہ وہ تو ضعیف حدیث کو بھی ذاتی قیاس پر ترجیح دیتے تھے۔ چنانچہ مشہور نقاد حدیث امام ذھبی شافعی رحمۃ اللہ علیہ ابن حزم ظاہری سے نقل کرتے ہیں:

جميع اصحاب حنيفة مجمعون على أن مذهب أبي حنيفة أن ضعيف الحديث أولىٰ عنده من القياس والرأي.

''امام ابوحنیفہ ﷺ کے تمام پیروکار اس امر پر متفق ہیں کہ امام ابوحنیفہ ﷺ کا مذھب یہ ہے کہ اُن کے نزدیک ضعیف حدیث قیاس اور رائے سے بہتر ہے''۔

(مناقب الإمام أبي حنيفة للذهبي ص ٣٤)

علامہ ابن قیم، علامہ ابن حجر مکی شافعی اور علامہ ظفر احمد عثمانی حنفی تھانوی نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔

(إعلام الموقعين لابن القيم ج١ ص ٨٢، وط: ج٢ ص ١٤٥؛ الخيرات الحسان لابن حجر مكي ص ٦٣؛ قواعد في علوم الحديث ص ٩٥)

فرض کیجئے اگر امام صاحب ﷺ کے سامنے حدیث الرایہ اور حدیث سیدتنا عائشہ صدیقہ (جس میں ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ سے عرض کیا: میں جانتی ہوں کہ آپ کو علی مجھ سے اور میرے ابا سے زیادہ محبوب ہیں اور حضور ﷺ نے اِس قول کی تردید نہ فرمائی) نہ تھی مگر حدیث الطیر تو اُن کے سامنے تھی، کیونکہ امام صاحب ﷺ خود

اس حدیث کے راوی ہیں۔ چنانچہ مسند ابی حنیفہ میں ہے:

حدثنا محمد بن إسحاق القاضي، ثنا الحسن بن عیسی ابن الحسن بن السمیدع، ثنا موسی بن أیوب، عن سعید بن أبي إسحاق، عن أبي حنیفة، عن مسعر، عن حماد، عن إبراهیم، عن أنس بن مالک، قال: أهدی إلی النبي ﷺ هدیة، فقال: اللّٰهم ائتني بأحب خلقک إلیک، فجاء علي، فأکل معه.

''سیدنا امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ از مسعر، از حماد، از ابراہیم، از انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں ھدیہ پیش کیا گیا تو آپ نے دعا فرمائی: اے اللہ! تیری مخلوق میں تجھے جو زیادہ محبوب ہو اُسے میرے پاس بھیج دے، پس حضرت علی رضی اللہ عنہ آئے تو انہوں نے آپ کے ساتھ کھایا''۔

(مسند الإمام أبي حنیفة لأبي نعیم ص ۲۳٤)

ہم اس سے قبل امام ذہبی، حافظ ابن حجر عسقلانی اور دوسرے محدثین کے حوالہ سے ثابت کر چکے ہیں کہ یہ حدیث موضوع تو کیا ضعیف بھی نہیں بلکہ حسن ہے۔ لہٰذا جب امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک ضعیف حدیث کو قیاس اور رائے پر ترجیح ہے تو پھر حدیث حسن کا مرتبہ تو اس سے بھی زیادہ ہے۔ پھر جب سند کے ساتھ یہ حدیث امام اعظم رضی اللہ عنہ سے منقول ہے تو یہ قطعاً نہیں ہوسکتا کہ وہ سیدنا علی المرتضیٰ علیہ السلام کے ساتھ زیادہ محبت کو کمینگی قرار دیں۔ فَتَدَبَّرْ، وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغَافِلِيْنَ.

پیر سائیں کی تردید محدثین، فقہاء اور صوفیہ سے

یہاں یہ بات بھی مدنظر رہے کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مقابلہ میں سیدنا علی اور اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم سے محبت زیادہ کرنے والے شخص کو تو کجا علماءِ اہلِ سنت نے تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے افضل ماننے والے شخص کو بھی رافضی اور کمینہ نہیں کہا بلکہ اسے متقی اور سنی ہی تسلیم کیا۔ چنانچہ مشہور محدث علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ ابان بن تغلب الکوفی رحمۃ اللہ علیہ کو سچا اور دیانت دار قرار دینے کے بعد لکھتے ہیں:

''اَسلاف کرام کے زمانہ میں غالی شیعہ اُس شخص کو کہا جاتا تھا جو حضرات عثمان غنی، طلحہ، زبیر اور معاویہ اور جنہوں نے حضرت علی کے خلاف جنگ میں حصہ لیا ان میں کلام کرے اور ان حضرات

کو برا کہنے والوں سے آنکھیں بند رکھے۔

اور ہمارے زمانے میں اور ہمارے عرف میں غالی شیعہ وہ ہے جو ان حضرات کی تکفیر کرے اور شیخین ﷺ سے بیزاری ظاہر کرے، پس ایسا انسان گمراہ اور پھسلا ہوا ہے۔ لیکن ابان بن تغلب شیخین ﷺ سے قطعاً منحرف نہیں تھا بلکہ وہ سیدنا علی ﷺ کی ان دونوں پر افضلیت کا قائل تھا"۔

(میزان الاعتدال ج۱ ص ۱۱۸، ۱۱۹)

مشہور محدث حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وربما اعتقد بعضهم أن علياً أفضل الخلق بعد رسول الله ﷺ وإذا كان معتقد ذلك ورعاً دَيِّناً صادقاً مجتهداً فلا تُرد روايته بهذا.

"بسا اوقات بعض راوی حضرت علی المرتضیٰ ﷺ کو رسول اللہ ﷺ کے بعد پوری مخلوق سے افضل اعتقاد کرتے ہیں اور جب ایسا شخص پرہیزگار، دین دار، صادق (اور) مجتہد ہو تو اُس کی روایت کو اس اعتقاد کی وجہ سے مسترد نہیں کیا جائے گا"۔

(تهذيب التهذيب ج۱ ص۱۱۹)

مشہور صوفی، مفسر اور محدث شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وہ لوگ جن کا لقب شیعہ ہوا، گروہ مہاجرین و انصار اور ان کے تابعین میں سے ہیں کہ ہم چلن اور پیرو حضرت مرتضیٰؓ کے تھے۔ جس وقت کہ آپ اُن کے خلیفہ ہوئے ان لوگوں نے ہمیشہ صحبت آپ کی اختیار کی اور مخالفین سے لڑتے رہے اور مطیع ان کے امر و نہی کے ہوئے ان کو شیعہ مخلصین کہتے ہیں اور یہ لقب ان کا سینتیس (۳۷) ہجری میں ہوا۔

دو برس بعد شیعہ تفضیلیہ ظاہر ہوئے انہی میں سے ابوالاسود دئلی (ﷺ) ہے واضع نحو اور شاگردِ جناب امیرؓ (ﷺ) کہ آپ ہی کے حکم و تعلیم سے اس نے قواعد نحو جمع کیے، اور انہی لوگوں سے ابوسعید یحییٰ بن یعمر عدوانی (ﷺ) ہے کہ یہ ایک تابع سے ہے عبداللہ بن سوید عدوی سے ملاقات رکھتا تھا، علم قرأت کا عالم اور تفسیر و نحو ولغات کا خوب جاننے والا۔ نحو میں شاگرد ابوالاسود کا اور قرأت میں ایک قراءِ بصرہ سے ہے۔ قاضی شمس الدین احمد بن خلکان نے "وفیات الاعیان" میں لکھا ہے کہ "كَانَ يَحْيىٰ بنُ يَعْمُرَ شِيْعِيًّا مِنَ الشِّيْعَةِ الْأُوَلِ الْقَائِلِيْنَ

بِتَفْضِيْلِ اَهْلِ الْبَيْتِ مِنْ غَيْرِ تَنَقُّصٍ لِلَّذِيْ فَضْلٍ مِنْ غَيْرِهِمْ" یعنی تھا یحییٰ بن یعمر شیعی پہلے شیعوں کی جنس سے جو قائل ہوئے تفضیلِ اہلِ بیت کے، بغیر اس کے کہ گھٹائیں کسی فضل والے کو غیر اہل بیت سے، اور انہی میں سے ہے سالم بن ابی حفصہ کہ راوی حدیث ہے اور امام محمد باقر اور امام جعفر صادق۔ اور انہی سے عبدالرزاق ہے صاحب تصنیف کہ محدث مشہور ہے اور اہل سنت وجماعت سے ہے اور من جملہ ان کے ابو یوسف یعقوب بن اسحاق ہے معروف بابن سکیت صاحب کتاب "اصلاح المنطق"۔

(تحفہ اثنا عشریہ ص ۳۴، ۳۵؛ وفیات الأعیان ج۶ ص۱۷۳)

امام احمد رضا حنفی قادری رحمۃ اللہ علیہ ایک غیر مقلد مصنف کی تردید میں لکھتے ہیں:

"ثالثاً: یہ بکف چراغی قابل تماشا کہ ابن فضیل کے منسوب بہ رفض ہونے کا دعوی کیا اور ثبوت میں عبارت تقریب رُمِيَ بِالتَّشَيُّعِ، ملاجی کو بایں سالخوردی وادعائے محدثی آج تک اتنی خبر نہیں کہ محاورات سلف واصطلاح محدثین میں تشیع ورفض میں کتنا فرق ہے؟ سلف میں جو تمام خلفائے کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ساتھ حُسنِ عقیدت رکھتا اور حضرت امیر المومنین مولی علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کو اُن میں افضل جانتا شیعی کہا جاتا بلکہ جو صرف امیر المومنین عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر تفضیل دیتا اُسے بھی شیعی کہتے، حالانکہ یہ مسلک بعض علمائے اہل سنت کا تھا اسی بناء پر متعدد ائمہ کوفہ کو شیعہ کہا گیا بلکہ کبھی محض غلبۂ محبت اہلِ بیتِ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو شیعیت سے تعبیر کرتے، حالانکہ یہ محض سُنیت ہے"۔

(فتاوی رضویہ ج۵ ص۱۷۴)

تھوڑا سا تدبر کیا جائے تو از خود یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ فقط بعد کے مسلمان ہی نہیں بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اہل بیت سے ہی سب سے زیادہ محبت کرتے تھے اور یہ زیادہ محبت ان پر واجب تھی، اس لیے کہ اس کے بغیر کوئی شخص مومن ہی نہیں ہو سکتا۔ درج ذیل احادیث کے اسلوب میں ذرا غور کیجئے!

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

أحبوا اللّٰهَ لِمَا يغذوكم من نِعَمِهِ، وأحبوني بحب الله، وأحبوا أهل بيتي لحبي.

"اللہ تعالیٰ سے محبت کرو کیونکہ وہ اپنی نعمتوں سے تمہیں غذا فراہم کرتا ہے، اور اللہ کی خاطر مجھ

سے محبت کرو، اور مجھ سے محبت کے باعث میرے اہل بیت سے محبت کرو"۔

(سنن الترمذي ج٦ ص١٢٦، حديث٣٧٨٩؛ فضائل الصحابة لأحمد ج٢ ص١٢٥١، حديث ١٩٥٢؛ وط: ص٤٠٩، حديث١٩٥٤؛ المستدرك ج٣ ص١٤٩، وط: ج٤ ص١٣١، حديث ٤٧٧٠؛ المعجم الكبير ج٣ ص٣٨، ٣٩، حديث٢٦٣٩ وج١٠ ص٣٤٢، حديث١٠٦٦٤، وط: ج٥ ص١٩٥، ١٩٦، حديث١٠٥١٦؛ شرف المصطفىٰ ج٥ ص٣١٥؛ شعب الإيمان ج١ ص٣٦٦، حديث٤٠٨ وج٢ ص١٣٠، حديث١٣٧٨؛ الآداب للبيهقي ص٥٢١، حديث ١١٧٧؛ الاعتقاد للبيهقي ص٤٥٥، وط: ص٤٥٠؛ حلية الأولياء ج٣ ص٢٤٤؛ مشكاة ج٢ ص٥١٩، حديث ٦١٨٢؛ الجامع الصغير حديث٢٢٤؛ جمع الجوامع ج١ ص١٠١، حديث٥٧٠، وط: ج١ ص١٧٢ حديث ٦٣٣؛ إحياء الميت للسيوطي ص١٧، حديث٩؛ موسوعة آل بيت النبي ﷺ ج١ ص٦٠)

امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے اور امام ذہبی نے اُن کی موافقت فرمائی ہے، امام سخاوی اور امام سمہودی رحمۃ اللہ علیہما نے امام ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ پر تعجب کیا ہے کہ انہوں نے اس حدیث کو "العلل المتناهية في الأحاديث الواهية" میں درج کر دیا ہے۔

(استجلاب ارتقاء الغرف للسخاوي ج ١ ص ٣٩٢؛ جواهر العقدين للسمهودي ص٣٢٨)

سیدنا مولیٰ علی ﷺ سے منقول ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

أدِّبوا أولادكم على ثلاث خصال: حب نبيكم ، وحب أهل بيته، وعلىٰ قراءة القرآن.

"تین باتوں کی اپنی اولاد کو عادت ڈالو:

۱۔ اپنے نبی ﷺ کی محبت کی،

۲۔ ان کے اہل بیت کرام علیهم السلام کی محبت کی

۳۔ اور تلاوت قرآن کی"۔

(الجامع الصغير، حديث٣١١؛ جمع الجوامع ج١ ص١٢٦، حديث٧٨٢، وط: ج١ ص ٢١٥، حديث٨٦٦؛ إحياء المَيِّت ص٣٣؛ كنز العمال ج ١٦ ص٥٤، حديث٤٥٤٠٩؛ جواهر العقدين ص ٣٢٨؛ الصواعق المحرقة ص١٧٢؛ كشف الخفاء ج١ ص٦٥، حديث١٧٤؛ رشفة الصادي ص

۹۱؛موسوعة آل بيت النبي ﷺ ج ۱ ص ٦٨)

اِن دونوں حدیثوں میں صیغۂ امر استعمال ہوا ہے، یعنی نبی کریم ﷺ نے حکماً فرمایا ہے کہ اللہ ﷻ اور اس کے نبی ﷺ کی محبت کے بعد اہل بیت سے محبت کرو! اور دونوں حدیثوں میں "کُم" ضمیر سے جو خطاب ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اُس کے اوّلین مخاطب اور مکلَّف ہیں اور دوسرے اہل اسلام اُن کے بعد ہیں۔

بعض کج فہم لوگ ایسے ارشاداتِ عالیہ کی تاویلات کرنا شروع کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں:

"ان احادیث میں زیادتیِ محبت کا تقاضا نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اہلِ بیت سے محبت کرو، عداوت نہ کرو"۔

میں پوچھتا ہوں کہ اگر ان احادیث کا مطلب یہی ہے تو پھر اَفْصَحُ الْفُصَحَاء ﷺ کو ایسا اُسلوب اپنانے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کا معنی بھی یہی ہوگا کہ اس سے عداوت نہ کی جائے؟ ذرا اُسلوبِ حدیث میں غور تو فرمائیے! پہلی حدیث میں نبی کریم ﷺ کی محبت کے بعد اہل بیت کی محبت کا حکم ہے اور ایسا ہی دوسری حدیث میں ہے مگر اُس میں اہل بیت کی محبت کو قرآن کی تلاوت و محبت پر مقدم رکھا گیا ہے، اور سورۃ الفاتحہ میں بھی اسی اسلوب کو ملحوظ رکھا گیا ہے بلکہ سورتوں کی ترتیبِ صوری میں بھی یہی اُسلوب کارفرما ہے، کیونکہ "صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" پہلے ہے اور "ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ، هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" بعد میں ہے، لہٰذا جب تک کوئی شخص اللہ ﷻ اور اس کے حبیبِ مطلق ﷺ کی محبت کی اتباع میں سب سے زیادہ اہلِ بیت سے محبت نہیں کرے گا اُس وقت تک وہ متقی یا اَتقٰی تو کیا مسلمان ہی نہیں ہو سکتا۔

جن لوگوں کے نزدیک اہلِ بیت سے وفورِ محبت کمینگی ہے اور جو حبِّ اہل بیت پر مبنی احادیث کی بھونڈی تاویلات کرتے ہیں، میں ان سے پوچھتا ہوں کہ قرآن کریم میں جو جابجا عبادتِ الٰہی کے بعد والدین سے حسنِ سلوک کا حکم ہے اور ایک مقام پر تو یوں ارشاد ہے: "اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ" (میرا شکر کر اور اپنے والدین کا) اور اکثر مقامات پر قرآن حکیم میں ترتیب بھی آئی ہے کہ پہلے والدین پھر اقارب، کیا اس قسم کی آیات کی تاویل میں کہا جا سکتا ہے کہ ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ والدین کے ساتھ عداوت نہ کی جائے؟ نہیں! بلکہ ان آیات کا ظاہر مطلب یہ ہے کہ والدین کے ساتھ دوسرے اقارب کی بہ نسبت زیادہ محبت کی جائے۔ بعینہٖ اسی طرح مذکورہ بالا احادیث کا مطلب ہے کہ اللہ ﷻ اور رسول اللہ ﷺ کے بعد سب سے زیادہ محبت اہل بیت کرام علیہم السلام کے ساتھ کی جائے، اور یہ حکم بشمول صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قیامت تک تمام اہل اسلام کے لیے عام ہے، اور صحابہ

کرام سمیت تمام اسلاف کرام ﷺ کا عقیدہ بھی یہی رہا اور عمل بھی اسی پر رہا۔

کیا مولیٰ علی ﷺ سے زائد محبت چھپانا لازم ہے؟

پیر شیخ الحدیث والتفسیر لکھتے ہیں:

"ثانیاً علماء نے صاف لکھا ہے کہ اگر دین کی وجہ سے محبت ہے تو پھر اس محبت کا افضلیت کی ترتیب پر ہونا لازم ہے اور اگر کسی پر محبت کا ایسا غلبہ ہو کہ وہ بے بس ہو جائے تو اس پر لازم ہے کہ اپنی زبان بند رکھے اور شریعت کی بے ادبی نہ کرے۔ (نبراس صفحہ ۳۰۲)"۔

(ضربِ حیدری ص ۲۳۷)

امام ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے شیخین کریمین کی افضلیت کو قطعی اور ختنین کریمین (سیدنا علی اور ذی النورین) ﷺ کی افضلیت کو ظنی لکھنے کے بعد ایک سوال قائم کیا ہے:

وهل تجب محبتهم برعاية أفضليتهم؟ فيه تفصيل، وهو: أنها إن كانت من حيث الدين والعلم ومحبة رسول الله ﷺ وجب ترتيبها كترتيبهم المذكور، وإن كانت لنحو قرابة وإحسان لم تجب رعايتها.

"اور کیا اُن سے محبت اُن کی افضلیت کی رعایت کے مطابق واجب ہے؟ اس میں تفصیل ہے، اور وہ یہ کہ محبت اگر دین، علم اور محبت رسول ﷺ کی وجہ سے ہو تو اس کا مذکورہ ترتیب کے مطابق ہونا واجب ہے، اور اگر قرابت اور احسان کی وجہ سے ہو تو اس کی رعایت واجب نہیں"۔

(المنح المكية في شرح الهمزية ص ۵۷۷)

اس سے ترتیبِ محبت بترتیبِ خلافت کا وجوب باطل ہو گیا، باقی رہا ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کا "من حیث الدین والعلم" وغیرہ کہنا تو اگر علم، دین اور محبت رسول ﷺ کو مدنظر رکھا جائے تو پھر سیدنا علی ﷺ سب سے زیادہ محبت کے حقدار ہیں، کیونکہ وہی سب سے پہلے تلمیذ رسول ﷺ ہیں، وہی سب سے پہلے صحابی ہیں، وہی سب مردوں سے زیادہ محبوبِ خدا و نبی ہیں اور وہی سب سے زیادہ قرابت دار ہیں۔

دراصل بات یہ ہے کہ خلافت کی جو ترتیب وقوع پذیر ہوئی وہ ترتیب اللہ ﷻ اور رسول اللہ ﷺ کی

طرف سے صحابہ کرامؓ پر منصوصاً لازم نہیں تھی، جیسا کہ آگے حدیث نمبر ۳۸، ۳۹، ۴۰ وغیرہا کے متن سے واضح ہے۔ پھر بعد از بحث و تکرار اور مجالسِ شوریٰ کی صواب دید سے جس ترتیب پر اتفاق ہوتا گیا اُس کے مطابق ہر خلیفہ راشد کی خلافت کو برحق ماننا تو لازم ہے کیونکہ اس پر تقریباً اجماع ہے مگر اس ترتیب کے مطابق افضلیت کا عقیدہ رکھنا قطعاً لازم نہیں ہے، کیونکہ اس پر اجماعِ صحابہ و تابعین ہرگز نہیں ہوا اور نہ ہی بعد میں پوری امت اس پر متفق ہوئی۔ اب رہا خلافت کی ترتیب کے مطابق محبت کی ترتیب کا لازم ہونا تو یہ شارع ﷺ کی طرف سے قطعاً لازم نہیں ہے اور نہ ہی خلافت کی ترتیب کے برعکس کسی سے زیادہ محبت ہو تو اس کو چھپانا اور زبان بند رکھنا لازم ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ کسی چیز کو فرض، لازم، واجب، سنت، اور مستحب وغیرہ کا درجہ دینا اللہ کے رسول ﷺ کا منصب ہے کسی دوسرے کا نہیں۔

اگر مجھے خوفِ طوالت اور قارئین کرام کی اکتاہٹ کا خیال نہ ہوتا تو یہاں میں نقل کرتا کہ کوئی بات فرض، واجب، سنت اور مستحب وغیرہ کب اور کیوں ہوتی ہے، اور اس میں اختیار کس کو حاصل ہے؟

کیا خدا نے علیؓ سے زائد محبت کو چھپایا؟

پیر شیخ الحدیث والتفسیر تو اس زیادہ محبت کو چھپانا لازم قرار دیتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس زیادہ محبت کو چھپانا لازم نہیں سمجھا، ذرا حدیث الطیر میں دعاءِ نبوی ﷺ کے الفاظ میں غور فرمایئے:

اللّٰهم ائتني بأحب خلقک إليک يأكل معي هذا الطير.

"اے اللہ! تیری مخلوق میں جو تجھے زیادہ محبوب ہو اس کو میرے پاس بھیج دے، وہ میرے ساتھ یہ پرندہ کھائے"۔

نبی کریم ﷺ نے اپنی دعا میں اللہ ﷻ سے اُس شخص کو طلب کیا جو اُس کو مخلوق میں زیادہ محبوب ہو، اللہ ﷻ نے دعا قبول فرماتے ہوئے ظاہر کر دیا کہ اسے زیادہ محبوب کون ہے،

فجاء عليٌّ فأكل معه.

"پس حضرت علیؓ آئے تو انہوں نے آپ ﷺ کے ساتھ کھایا"۔

(سنن الترمذي ص۸٤٦، حديث ۳۷۲۱؛ مصابيح السنة للبغوي ج٤ ص۱۷۳، حديث ٤۷۷۰؛ مشكاة المصابيح حديث ٦۰۹٤)

اسی طرح غزوۂ خیبر میں بھی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے علی الاعلان ظاہر فرما دیا کہ انہیں زیادہ محبوب کون ہے۔

کیا حضور ﷺ نے علی علیہ السلام سے زائد محبت چھپائی؟

پیر شیخ الحدیث والتفسیر کے اِس لازمی قانون کی حضور ﷺ نے بھی پابندی نہیں فرمائی، اور آپ کو سیدنا علی علیہ السلام کے ساتھ جو سب سے زیادہ محبت تھی اُسے چھپا نہ سکے حتیٰ کہ وہ محبت آپ کی محبوب زوجہ ام المؤمنین سیدتنا عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر بھی عیاں ہوگئی۔ شاید ایسے ہی موقعہ کے لیے کسی نے کہا ہے۔

ہم نے لاکھ چھپائی محبت چھپ نہ سکی
آنکھوں نے رو کے یار کا اظہار کر دیا

الغرض کوئی تو سبب تھا کہ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا پر یہ محبت آشکار ہوگئی تھی۔ گذشتہ صفحات میں ہم اُن کے وہ الفاظ نقل کر چکے ہیں جو انہوں نے احتجاجاً نبی کریم ﷺ کے سامنے ادا کیے تھے، ایک مرتبہ پھر ملاحظہ فرمائیے:

واللہ لقد عرفتُ ان علیاً أحب إلیک من أبي ومني، مرتین أو ثلاثاً.

''اللہ کی قسم یقیناً میں جانتی ہوں کہ حضرت علی علیہ السلام آپ کو میرے والد سے اور مجھ سے زیادہ محبوب ہیں، یہ انہوں نے دو یا تین مرتبہ کہا''۔

دو یا تین مرتبہ سننے کے باوجود نبی کریم ﷺ نے اس خیال اور قول کی تردید نہ فرمائی بلکہ خاموشی اختیار فرما کر اس کو مقرر رکھا، حالانکہ اگر شرعی طور پر مولیٰ علی کی بہ نسبت کسی دوسری شخصیت کے ساتھ زیادہ محبت لازم ہوتی، یا سیدنا علی علیہ السلام کے ساتھ زیادہ محبت کو چھپانا لازم ہوتا تو بحیثیت شارع نبی کریم ﷺ ضرور چھپاتے، کم از کم اتنا ہی فرما دیتے: عائشہ! نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ لیکن جب ایسی کوئی نفی یا انکار منقول نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ حضور ﷺ بھی دوسروں کی بہ نسبت محبتِ مرتضوی میں اضافہ کو چھپا نہ سکے، بھلا وہ ذات اِس سچی محبت کو کیسے چھپاتی جو دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتی تھی:

اللّٰھم لا تمتني حتیٰ تریني علیاً.

''اے اللہ! میری روح قبض نہ کرنا، یہاں تک کہ علی کا دیدار کرا دے''۔

(سنن الترمذي ص ۸۵۰، حدیث ۳۷۳۷؛ فضائل الصحابة ج۲ ص ۷۵۴، حدیث ۱۰۳۹ وص

۸۱٤، حدیث۱٤١٦؛ المعجم الكبير ج٢٥ ص٦٨، حديث١٦٨؛ المعجم الأوسط ج٣ ص٤٨، حديث٢٤٣٢؛ مصابيح السنة ج٤ ص١٧٦، حديث٤٧٧٥؛ تهذيب الكمال ج٣٣ ص١٨٧؛ مشكاة ج٢ ص٥٠٥، حديث٦٠٩٩؛ أسد الغابة ج٤ ص١١٥؛ جامع الأصول لابن أثير الجزري ج٦ ص٣٢٠، حديث٦٥١٠؛ المناقب لموفق المكي ص٧١)

جو دِن کو شب کہا تو رات ہو کے رہی
تیرے منہ سے نکلی جو، وہ بات ہو کے رہی

اگرچہ یہ دعا کافی پہلے کسی جنگ کے موقعہ پر فرمائی گئی تھی مگر چونکہ زبانِ نبوت سے نکلے ہوئے الفاظ تھے اس لیے ایسے قبول ہوئے کہ وصالِ اقدس سے قبل بھی نبی کریم ﷺ کی آخری سرگوشی سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوئی تھی اور وصال سے قبل مرتضیٰ مصطفیٰ کے روبرو تھے، صلی اللّٰہ علیہما وعلیٰ آلهما وبارک وسلم۔

کیا صحابہ رضی اللہ عنہم نے علی رضی اللہ عنہ سے زائد محبت چھپائی؟

پیرِ شیخ الحدیث والتفسیر کے اِس لازمی ضابطہ کی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی دھجیاں اُڑادیں۔ چنانچہ اسی بحث میں آپ درجِ ذیل تین آثار پڑھ چکے ہیں کہ:

- سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ نے برملا فرمایا اور ہرگز نہ چھپایا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد تمام لوگوں سے زیادہ انہیں سیدنا علی علیہ السلام محبوب تھے۔
- ایک شخص نے سیدنا سعید بن زید رضی اللہ عنہ کے سامنے برملا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا:

"میں سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے شدید محبت کرتا ہوں، ایسی محبت میں نے کبھی کسی چیز سے نہیں کی"۔

اِس پر سیدنا سعید بن زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"تمہارا عقیدہ خوب ہے، تم ایک جنتی شخص کو محبوب رکھتے ہو"۔

- حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے تو کمال ہی کر دیا، اُن سے جب خود اُن کے سب سے زیادہ محبوب اور حضور ﷺ کے سب سے زیادہ محبوب کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے دوٹوک انداز میں فرمایا: حضور ﷺ کو اور مجھ کو سب سے زیادہ محبوب علی المرتضیٰ ہیں۔ اگر اِس زیادہ محبت کو چھپانا اور زبان بند رکھنا شرعی طور پر لازم ہوتا تو وہ ضرور

چھپاتے۔

پیر سائیں کے ضابطہ کا عقل کے خلاف ہونا

شیخ الحدیث والتفسیر پیر سائیں غلام رسول قاسمی زید مجدہ نے سیدنا علی ؓ کے ساتھ زیادہ محبت کرنے کی نفی میں جو یہ ضابطہ لکھا ہے کہ:

"اگر کسی پر محبت کا ایسا غلبہ ہو کہ وہ بے بس ہو جائے تو اس پر لازم ہے کہ اپنی زبان بند رکھے اور شریعت کی بے ادبی نہ کرے"۔

یہ ضابطہ جہاں اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب کریم ﷺ کے نزدیک عبث ہے اور صحابہ کرام ؓ کے نزدیک مردود ہے وہاں تمام اہل عقل کے نزدیک بھی باطل ہے۔ کیونکہ جب شرعی تقاضوں کے مطابق سیدنا علی ؓ کے ساتھ سب سے زیادہ محبت مطلوب و محبوب ہے تو جو چیز زیادہ محبوب ہو اس کا ذکر اکثر ہوتا ہے۔ چنانچہ امام قسطلانی مشہور صوفی بزرگ علامہ محاسبی رحمۃ اللہ علیہما سے نقل کرتے ہیں:

قال المحاسبي: علامة المحبين كثرة الذكر للمحبوب على طريق الدوام، لاينقطعون ولايملّون ولايفتُرون، وقد أجمع الحكماء علىٰ أن من أحب شيئاً أكثر من ذكره، فذكر المحبوب هو الغالب على قلوب المحبين.

"محاسبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: محبت کرنے والوں کی علامت مداومت کے ساتھ بہ کثرت محبوب کا ذکر ہے، وہ اس ذکر کو منقطع نہیں کرتے، اکتاتے نہیں اور وقفہ نہیں آنے دیتے، اور بیشک داناؤں کا اجماع ہے کہ جو شخص کسی چیز کو محبوب رکھتا ہے وہ اُس کا بہ کثرت ذکر کرتا ہے، پس محبوب کا ذکر محبین کے دلوں پر غالب ہوتا ہے"۔

(المواهب اللدنية للقسطلاني ج٢ ص٣٠١؛ فيض القدير للمناوي ج١١ ص٥٥٨١؛ زرقاني على المواهب ج٩ ص١٣٢)

داناؤں کا جس بات پر اجماع ہے وہ محض داناؤں کا قول ہی نہیں بلکہ وہ مخلوق میں سب سے بڑے دانا کا ارشاد ہے۔ چنانچہ ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

من أحب شيئا أكثر من ذكره.

"جو شخص کسی چیز کو محبوب رکھتا ہے وہ اس اُس کا بہ کثرت ذکر کرتا ہے"۔

(الجامع الصغير، حديث ٨٣١٢؛ جمع الجوامع ج٦ ص ٤٠٣، حديث ٢٠١٠٤؛ كشف الخفاء ج٢ ص١٩٨)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ شیخ الحدیث والتفسیر پیر سائیں غلام رسول قاسمی زید عمرہ کا بیان کیا ہوا ضابطہ اللہ تعالیٰ، اس کے رسول کریم ﷺ، صحابہ کرام ﷺ اور دنیا کے تمام داناؤں کی دانائی اور حکمت کے خلاف ہے، لہٰذا شرعاً نقلاً مردود و باطل ہونے کے ساتھ ساتھ عقلاً بھی حماقت پر مبنی ہے۔

جسے کمینگی کہا وہی اپنی کتاب میں لکھ دیا

خود صاحب "ضربِ حیدری" کے قلم سے بھی ایک ایسا واقعہ رقم ہو گیا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ بعد از خدا و رسول (ﷺ) اہلِ بیت کرام علیہم السلام کی محبت تمام محبتوں پر غالب ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"حضرت ابوبکر بن عیاش علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ اگر میرے گھر میں ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہم اکٹھے تشریف لے آئیں تو میں پہلے حضرت علی ﷺ سے پوچھوں گا کہ میرے لیے کیا حکم ہے اس لیے کہ آپ ﷺ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قرابت دار ہیں۔ لیکن مجھے آسمان سے گر کر مرجانا گوارا ہے مگر علی کو ابوبکر اور عمر سے افضل نہیں کہہ سکتا" ﷺ (الشفاء جلد ۲ صفحہ ۴۰)۔

(ضربِ حيدري 239)

اس سے معلوم ہوا کہ محبت میں مقدم اہل بیت کرام علیہم السلام ہیں۔

پیر سائیں نے اِس عبارت کے آخری جملہ میں معنوی طور پر تھوڑی سی ڈنڈی ماری ہے تاکہ اُن کی مطلب برآری ہو۔ ہم وہ جملہ شفا شریف اور دوسری کتابوں سے براہِ راست نقل کر رہے ہیں:

لأن أخِرَّ من السماء إلى الأرض أحب إلي من أن أُقَدِّمَه عليهما.

"اگر میں آسمان سے زمین پر گرا دیا جاؤں تو وہ مجھے اس سے زیادہ محبوب ہے کہ میں حضرت علی ﷺ کو اُن دونوں پر مقدم سمجھوں"۔

(الشفا ج٢ ص٤٣، وط: بحاشية الشمني ص٢٥٨، وط: ج٢ ص ٦١٠؛ استجلاب ارتقاء الغرف ج ٢

ص ۵۶۷؛ سبل الهدیٰ ج ۱۱ ص ۱۵؛ جواهر العقدین ص ۳۹۰؛ الصواعق المحرقة ص ۲۳۸؛ موسوعة آل بیت النبی ﷺ ج ۱ ص ۷۳)

امام ابوبکر بن عیاش رضی اللہ عنہ نے یہاں خلافت میں تقدیم کی بات کی ہے، افضلیت میں نہیں، کیونکہ افضلیت میں تقدیم اتنا بڑا مسئلہ نہیں کہ اس کے مقابلہ میں انسان آسمان سے زمین پر گرائے جانے کو ترجیح دے اور خودکشی کا مرتکب ہو۔ ہاں اگر کسی کی افضلیت پر نص قطعی یا اجماع قطعی ہوتا تو پھر اس سے انحراف یقیناً ایسا ہی خطرناک معاملہ ہوتا۔ سو جب حضرت ابن عیاش رضی اللہ عنہ نے "أن أُقَدِّمَه علیهما" فرمایا ہے اور "أن أُفَضِّلَه علیهما" نہیں فرمایا تو ترجمہ "أن أُقَدِّمَه علیهما" کی بجائے "أن أُفَضِّلَه علیهما" کا کیوں کیا گیا؟ اس معنوی ترمیم کی حکمت پیر سائیں سے اُن کا کوئی مرید سائیں ہی پوچھ سکتا ہے۔

سوال

حضرت ابوبکر بن عیاش کا شیخین کریمین رضی اللہ عنہما پر سیدنا علی علیہ السلام کو تعظیم میں مقدم رکھنا غصہ کے سبب سے تو نہیں محبت ہی اس تقدیم کا سبب ہے۔ پھر اس محبت کا جو بھی سبب ہو بہرحال شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کے روبرو امام ابوبکر بن عیاش رضی اللہ عنہ عملاً اِس زیادہ محبت کو اور تمام اہل اسلام سے قولاً اس زیادہ محبت کو چھپا نہ سکے، کیونکہ اب تک اُن کا محبتِ مرتضوی سے مملو یہ قول ہمارے درمیان گردش کر رہا ہے۔ ممکن ہے کہ اگر انہوں نے تقاریظ علماء سے مزین کتاب "ضربِ حیدری" کا مطالعہ کر رکھا ہوتا تو وہ شریعت کا کچھ لحاظ کرتے اور اپنی زبان بند رکھتے، لیکن چونکہ زبان وقلم سے نکلی ہوئی بات کو واپس نہیں لیا جا سکتا، اس لیے اب علماء کرام اور مفتیانِ عظام سے سوال یہ ہے کہ امام ابوبکر بن عیاش رحمۃ اللہ علیہ کا یہ عمل اور قول کس حکم میں آتا ہے؟ آیا یہ شرافت پرمبنی ہے یا کمینگی پر؟

خدمت وتعظیم میں تقدیم کا سبب؟

یہ بات بھی اگر مجھ ایسے گنوار کو سمجھا دی جائے تو کرم ہوگا کہ دوسروں کے مقابلہ میں اگر کسی کو خدمت وتعظیم میں مقدم رکھا جائے تو اس کا سبب کیا ہوتا ہے۔ خیال رہے کہ رعایت وشفقت کی بات نہیں ہو رہی بلکہ خدمت وتعظیم کی بات ہو رہی ہے، کیونکہ امام ابوبکر بن عیاش رضی اللہ عنہ نے مولیٰ علیہ السلام پر شفقت ورعایت میں تقدیم کی بات نہیں فرمائی بلکہ خدمت وتعظیم میں تقدیم کی بات فرمائی ہے۔ لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدمت وتعظیم میں اس تقدیم کا سبب کیا ہے؟

اگر کہا جائے کہ اس تقدیم کا سبب زیادہ محبت ہے، تو پھر سوال ہوگا کہ اِس زیادہ محبت کا سبب کیا ہے؟ اگر کہا جائے کہ اس کا سبب حضور ﷺ کی قرابت ہے، تو پھر سوال ہوگا کہ صحابہ کرام ﷡ کی عظمت کا سبب کیا ہے؟ اگر کہا جائے کہ حضور ﷺ سے قربت و نسبت، تو سوال ہوگا کہ بعینہٖ یہی قربت و نسبت تو سیدنا علی ؑ کو بھی حاصل تھی بلکہ زماناً اور مکاناً دوسروں سے بھی زیادہ حاصل تھی اور قرابت اس کے علاوہ تھی۔

الغرض یہ سوال ہر لحاظ سے حل طلب ہے کہ امام ابوبکر بن عیاش ؒ کا خدمت و تعظیم میں مولیٰ ؑ کو مقدم رکھنا جس سبب سے بھی ہو ہر وہ سبب سیدنا علی ؑ سے زیادہ محبت کا اظہار کر رہا ہے، اور یہ زیادہ محبت صاحب ''ضربِ حیدری'' کے نزدیک کمینگی اس لیے ہے کہ یہ افضلیت کو مستلزم ہے۔ لہٰذا اب کوئی مرید سائیں اپنے پیر سائیں سے پوچھے کہ اُنہیں اُن کی اپنی کتاب میں لکھی ہوئی یہ کمینگی کس حد تک گوارا ہے؟

امام ابوبکر بن عیاش ؒ کے قول کی تائید

سبب جو بھی ہو بہر حال امام ابوبکر بن عیاش ؒ کے اس قول سے یہ حقیقت ثابت ہو رہی ہے کہ ہمارے اسلاف کرام کو سیدنا علی ؑ تمام اہلِ اسلام سے زیادہ محبوب ہیں، اور دوسروں کے مقابلہ میں کسی کی کسی سے کثرتِ محبت کا اندازہ ہوتا بھی اُسی وقت ہے جب اُس کا اُس کے ساتھیوں سے تقابل ہو۔ حضرت ابوبکر بن عیاش رحمۃ اللہ علیہ کے اِس اظہارِ محبت میں مکمل طور پر خدا اور رسول ﷺ اور صحابہ کرام ﷡ کی اطاعت و پیروی موجود ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے بھی سب کی موجودگی میں جس سے زیادہ محبت کا اظہار فرمایا وہ سیدنا علی ؑ ہیں، جیسا کہ غزوۂ خیبر کی حدیث اور حدیث الطیر میں اس حقیقت کا واضح ثبوت موجود ہے، اور جیسا کہ اوپر درج کردہ حضرت بریدہ اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہما کی احادیث سے ظاہر ہے۔ نیز صحیحین کی ایک طویل حدیث میں سیدنا ابوبکر صدیق ؓ کے درجِ ذیل ارشاد سے بھی یہی حقیقت عیاں ہے:

والذي نفسي بيده لقرابة رسول الله ﷺ أحب إليّ أن أصل من قرابتي.

''اُس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے: رسول اللہ ﷺ کی قرابت مجھے میری قرابت سے زیادہ محبوب ہے''۔

(بخاري ص ٥٠٦، حديث ٣٧١٢؛ صحيح مسلم ص ٨٤١، ٨٤٢، حديث ١٧٥٩)

بلاشبہ خلیفۂ ثانی سیدنا عمر ؓ رسول اللہ ﷺ کے سسر ہیں اور خلیفۂ ثالث سیدنا عثمان غنی ؓ نبی کریم

ﷺ کے داماد ہیں اور دونوں قریشی بھی ہیں لیکن سیدنا علی المرتضیٰ ؓ فقط قریشی نہیں بلکہ ہاشمی بھی ہیں اور نبی کریم ﷺ کے حقیقی چچازاد ہیں، لہٰذا وہ جتنا زیادہ قرابت دار ہیں اتنا ہی وہ سیدنا ابوبکر صدیق ؓ کو فاروق وغنی ؓ سے زیادہ محبوب ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ سیدنا ابوبکر صدیق نہ تو ترتیب خلافت اور ترتیب افضلیت کے مطابق محبت کے پابند تھے اور نہ ہی انہیں یہ معلوم تھا کہ محبت کا اس ترتیب کے خلاف ہونا کمینہ پن ہے۔ سیدنا عمر ؓ بھی اس ترتیب کے پابند نہیں تھے ورنہ وہ سیدنا عثمان غنی ؓ کو چھوڑ کر سیدنا عباس بن عبدالمطلب ؓ کے وسیلہ سے بارش نہ مانگتے۔

محبت وتوقیر میں مقدم کون؟

پیر سائیں قاسمی کے نزدیک جو پہلے خلیفہ ہوا اُس کا احب (سب سے بڑھ کر محبوب) وغیرہ ہونا واجب ہے، لیکن آپ نے پڑھا کہ اللہ تعالیٰ، رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام ؓ کا عمل پیر سائیں کے اس ضابطہ کے خلاف ہے، اور الحمدللہ اب تک تمام اہل قبلہ (خوارج ونواصب کو چھوڑ کر) قولاً اور عملاً اس ضابطہ کے خلاف ہیں۔ اہل اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ اگر کوئی أعلم اور افضل ہو تو اپنی جگہ لیکن اُنہیں سب سے زیادہ محبوب وہ ہستیاں ہیں جو نبی کریم ﷺ کی زیادہ قرابت دار ہیں۔ چنانچہ امام احمد رضا حنفی کے شیخ سید زینی دحلان مکی کی تقریظ شدہ کتاب "رشفة الصادي من بحر فضائل بني النبي الهادي" میں شیخ ابوبکر شہاب الدین علوی حضرمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> "بعض علماء کرام نے فرمایا کہ سیادت کا شرف علم کے شرف پر فوقیت رکھتا ہے، اس لیے کہ سیادت جوھر (اصل) ہے اور علم عرض (زائل ہونے والی چیز) ہے، اور اس کی تائید میں بعض صوفیہ کا وہ جواب ہے جو انہوں نے ایک سوال پر دیا تھا۔ اُن سے ایک اَن پڑھ سید اور ایک عالم کے متعلق سوال کیا گیا کہ اُن دونوں میں سے افضل کون ہے؟ انہوں نے جواباً فرمایا کہ اَن پڑھ سید افضل ہے۔ پھر فرمایا: کیا تم غور نہیں کرتے کہ اگر سید پر جنون اور دیوانگی کا حملہ ہو جائے تو اس کا شرف اور فضیلت باقی رہتی ہے، اگر عالم مجنون ہو جائے تو اس سے علم کی فضیلت چلی جاتی ہے۔

اور خاتمة المحققین احمد بن حجر ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ میں ہے کہ ان سے پوچھا گیا: آیا اَن پڑھ سید افضل ہے یا باعمل عالمِ دین، اور ان دونوں میں توقیر کا زیادہ حقدار کون ہے،

یعنی جب وہ کسی مقام پر دونوں اکٹھے ہوں تو پہلے کس کی تعظیم اور تواضع کی جائے، مثلاً قہوہ (چائے وغیرہ) پہلے کس کو پیش کیا جائے؟ اُنہوں نے جواباً فرمایا: اُن دونوں کے اندر ایک عظیم فضیلت ہے، لیکن سید کے اندر چونکہ بَضعۃ کریمہ (جسم نبوی ﷺ کا مقدس حصہ) ہے اِس لیے اُس کے برابر کسی چیز کو نہیں کیا جاسکتا، یہی وجہ ہے کہ بعض علماء کرام نے فرمایا ہم جسمِ نبوی کے جزو پر کسی کو فضیلت نہیں دیتے، چونکہ علماءِ عاملین کے اندر وہ چیز ہے جس سے اہلِ اسلام کو نفع پہنچتا ہے اور گمراہوں کو ہدایت ملتی ہے، اور وہ رسول اللہ ﷺ کے نائب اور آپ کے علوم ومعارف کے وارثین ہیں، لہٰذا لازم ہے کہ سید اور عالم دونوں کی تعظیم اور توقیر کا حق ادا کیا جائے، اور جب دونوں ایک مقام پر جمع ہوں تو سید کو مقدم رکھا جائے، اس لیے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشادِ پاک ہے ''قریش کو مقدم رکھو'' اور اس لیے بھی کہ وہ جسم نبوی ﷺ کا جزو ہے، اور ہماری اِس گفتگو میں سید سے مراد حسنین کریمین كَرَّمَ اللّٰهُ وَجْهَهُمَا کی اولاد ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم''۔

(رشفة الصادي ص ۱۸۵، ۱۸۶)

اندازہ کیجئے کہ جب اَن پڑھ سید اور باعمل عالمِ دین ایک مقام پر جمع ہو جائیں تو بوجہ قرابتِ نبوی ﷺ محبت وتعظیم میں سید کو مقدم رکھا جائے گا، تو پھر بتلایئے کہ جب حضور ﷺ کا قرابت دار علم وعمل میں بھی اپنے ساتھیوں سے زیادہ ہو تو وہ کس قدر زیادہ محبت اور زیادہ تعظیم کا مستحق ہوگا؟

اہل بیت وصحابہ رضی اللہ عنہم کی محبت میں عمومی جائزہ

ہر چند کہ کتاب وسنت، صحابہ کرام اور دوسرے اسلاف کرام رحمہم اللہ کی سیرت سے واضح ہو چکا ہے کہ اہل بیت کرام علیهم السلام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مقابلہ میں محبت کے زیادہ حقدار ہیں مگر یہاں ہم اپنے قارئین کرام کی توجہ اس جانب بھی مبذول کراتے ہیں کہ اس سلسلہ میں ایک عام سروے کیا جائے اور اہل اسلام سے معلوم کیا جائے کہ انہیں زیادہ محبوب کون تو معاملہ نکھر کر سامنے آجائے گا۔

میں نے بطورِ نمونہ دو آدمیوں سے یہی سوال کیا ہے، چنانچہ جب میں یہ سطور قلم بند کر رہا تھا تو میرے ہاں (مطالعہ گاہ) میں دو حافظ صاحبان تشریف لائے، میں نے ازراہِ طبع آزمائی اُن سے سوال کیا: معزز حافظ صاحبان!

ایک سوال کا جواب تو دیں۔ وہ حیران ہو کر کہنے لگے: جی ہم؟ میں نے عرض کیا: وہ کوئی مشکل اور علمی سوال نہیں، سادہ سا سوال ہے، بتلائیے! مسلمان شخص کو زیادہ محبت اہل بیت سے ہوتی ہے یا صحابہ کرام ﷺ سے؟ انہوں نے بیساختہ جواب دیا: اہل بیت کرام سے۔ میں نے انہیں عرض کیا: آپ حضرات نے سادگی سے جو جواب دیا ہے، وہ کتاب وسنت، صحابہ کرام ﷺ کی سیرت اور اسلاف کرام کے معمولات کے عین مطابق ہے اور خود شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کی سنت بھی یہی ہے۔

قارئین کرام سے غور وفکر کی اپیل

غور کیجئے کہ جو بات قرآن وسنت اور صحابہ کرام ﷺ کی سیرت کے عین مطابق ہے اسے اگر کوئی شخص کمینگی قرار دے تو یہ کتنا بڑا ظلم ہے؟ تعجب ہے کہ صاحب "ضربِ حیدری" کے نزدیک سیدنا علی ﷺ سے محض زیادتی محبت کمینگی ہے جبکہ اکابر علماء اہلِ سنت کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کے بعد مولیٰ علی ﷺ کو افضل ماننا بھی کمینگی نہیں۔ ہم نقل کر چکے ہیں کہ امام ذہبی نے تفضیلی شخص کو سچا اور دیانتدار کہا ہے، حافظ رحمہ اللہ نے پرہیزگار، دین دار، صادق اور مجتہد فرمایا ہے، شاہ عبدالعزیز نے ایسے بہت سے مہاجرین وانصار کو شیعانِ علی بھی کہا ہے اور ساتھ ہی اہل سنت بھی فرمایا ہے اور اسی طرح امام احمد رضا حنفی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی غلبۂ حبِّ اہل بیت کے حامل ایسے علماءِ کرام کو علماءِ اہلِ سنت تسلیم کیا ہے اور اِس غلبۂ محبت کو محض سنیت قرار دیا ہے، مگر افسوس کہ شیخ الحدیث والتفسیر پیر سائیں غلام رسول قاسمی کے نزدیک یہ بات کمینگی ہی نہیں بلکہ نہایت کمینگی ہے۔ اِنَّمَا اَشْكُوا اِلَى اللّٰهِ، وَهُوَ الْمُسْتَعَانُ.

ضربِ حیدری کے مُقَرِّظِین سے التماس

ہر چند کہ احقر کی علمی، دینی اور دنیوی کوئی حیثیت نہیں ہے، لیکن "لاتنظر إلیٰ من قال وانظر إلیٰ ما قال" (یہ مت دیکھو کہ کون کہہ رہا ہے، یہ غور کرو کہ کیا کہہ رہا ہے) کو مدنظر رکھتے ہوئے "ضربِ حیدری" کے تمام اصحابِ تقریظ سے میری گذارش ہے کہ وہ غور فرمائیں کہ جو بات صحیح احادیث، آثار اور اقوالِ علماءِ اہلِ سنت کی روشنی میں ایمان اور سُنیت ہے اس کو کمینگی کہنا کتنی بڑی جسارت ہے؟ جبکہ تمام اہلِ بیت، ساداتِ کرام بلکہ خود اصحابِ ثلاثہ ﷺ کو رسول اللہ ﷺ کے بعد سب سے زیادہ محبوب مولیٰ علی اور اہل بیت علیہم السلام ہی تھے۔ معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ، کیا موصوف اِن سب حضرات پر بھی انتہائی کمینہ پن کے فتویٰ لگانے کی جسارت کریں گے؟

اگر تقریظ لکھتے وقت بعض مُـقـرِّظین حضرات کی توجہ ایسے حساس مقامات کی طرف نہیں گئی، اور ہجوم مصروفیت میں ایسا ہو ہی جاتا ہے تو انہیں چاہیئے کہ وہ اب غور فرمالیں، اور اگر انہیں ہماری نقل کردہ احادیث وآثار کی روشنی میں صاحب "ضـرب حیـدری" کا قول حق کے خلاف نظر آئے تو وہ اسے ترمیم کا مشورہ دیں اور اگر میری فکر خطا کر گئی ہو تو مجھے متنبہ فرمائیں۔ میرا یقین وایمان ہے کہ کوئی بھی مسلمان شخص کسی معاصر عالم یا روافض کی ضد میں آکر اتنی بڑی جسارت نہیں کرسکتا کہ جس محبت کو ایمان فرمایا گیا ہو وہ اس کے نزدیک کمینگی ہو۔ وَاللّٰـهُ يَهْدِيْ مَنْ يَشَآءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ.

محبتِ مرتضوی میں بغضِ صحابہ رضی اللہ عنہم

صاحب "ضربِ حیدری" سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ محبت رکھنے کے معاملہ میں احتیاطی پہلو پر اس لیے بھی زور دے رہے ہیں کہ انہیں یہ خدشہ ہے کہ یہ محبت دوسرے صحابہ کے ساتھ بغض کا سبب بن سکتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> "ثالثاً اس قسم کی بھینگی محبت کے دعوے دار اگر تفضیل کا قول نہ بھی کریں تو پھر توازن نہیں رکھ سکتے اور اکثر دیگر صحابہ کے گستاخ ہوجاتے ہیں اور کم از کم حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے تو ضرور بغض رکھتے ہیں۔ آزما کر دیکھ لیجیے، مولا علی کی محبت میں غالی شخص ہمیشہ امیر معاویہ کا دشمن ہوگا"۔

(ضربِ حیدری ص 238)

عقلاً اور نقلاً صحیح بات یہ ہے کہ کوئی مسلمان کسی مسلمان شخص کا کسی اور مسلمان سے محبت کے باعث دشمن نہیں ہوتا بلکہ مسلمان کی محبت وعداوت کا معیار "الحب فی اللّٰہ والبغض فی اللّٰہ" ہے۔ نہ معلوم یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ سیدنا علی علیہ السلام سے محبت کسی دوسرے صحابی سے عداوت کا سبب ہوسکتی ہے؟ یوں کیوں نہیں کہا جاتا کہ حضرات ابوبکر، عمر، عثمان، ابن مسعود، سلمان فارسی اور عمار بن یاسر وغیرھم رضی اللہ عنہم میں سے کسی کی محبت کسی دوسرے صحابی سے عداوت کا سبب ہوسکتی ہے؟ سلوف یا اسلاف کرام میں سے کسی سے کسی کو عداوت یا محبت فقط اُس کی ذاتی سیرت اور اُس کے اپنے اقوال، افعال اور کردار کے باعث ہوتی ہے، کسی اور شخص سے محبت کے سبب سے ہرگز نہیں ہوتی، الا یہ کہ وہ اُس کے محبوب کا دشمن ہو۔

پیر سائیں کا بھیانک قول

خدا جانے پیر سائیں نے سیدنا علی ؓ کی محبت کو اکثر صحابہ کرام ؓ اور خصوصاً حضرت معاویہ سے عداوت کا سبب کیوں سمجھ لیا ہے؟ پھر انہوں نے دوسرے اکثر صحابہ کرام ؓ کا بالعموم ذکر کیا اور حضرت معاویہ کا باقاعدہ نام ذکر کیا، آخر یہ تخصیص کیوں؟ بہر حال چونکہ پیر سائیں کی توجہ اکثر صحابہ کرام ؓ سے فوراً حضرت معاویہ کی طرف مبذول ہوگئی، اس لیے ہم یہ بتلانا ضروری سمجھتے ہیں کہ سیدنا علی علیہ السلام سے محبت کسی دوسرے شخص سے عداوت کا سبب ہرگز نہیں! لہٰذا اس محبت کی ناپ تول کے لیے کسی ذاتی پیمانے اور ترازو کی ضرورت نہیں ہے، اور اس کے ساتھ ہم یہ پوچھنے کا حق بھی رکھتے ہیں کہ اُن کے نزدیک حضرت معاویہ ؓ کے دشمن کو جاننے کی علامت کیا ہے؟ کیا یہی کہ ہر محبِ علی دشمنِ معاویہ ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہو تو یہ ایک خطرناک خیال ہوگا، کیونکہ سیدنا علی ؓ کا قول ہے:

الأعداء ثلاثة: عدوک وعدو صدیقک وصدیق عدوک.

"دشمن تین ہیں: ایک تیرا دشمن، ایک تیرے دوست کا دشمن اور ایک تیرے دشمن کا دوست"۔

(ملفوظاتِ اعلیٰ حضرت ص ۲۰۵)

اس اصول کی روشنی میں پیر سائیں قاسمی کا مذکورہ بالا بیان انتہائی بھیانک ہے، اس لیے کہ اس سے حضرت معاویہ سیدنا علی علیہ السلام کے دشمن قرار پاتے ہیں، حالانکہ اہل سنت کے نزدیک وہ سیدنا علی علیہ السلام کے دشمن نہیں تھے بلکہ اقتدار کے دلدادہ تھے، اور حصولِ اقتدار ہی کی وجہ سے اُن سے وہ ہوا جو ہوا۔

پیر سائیں کے نزدیک کہیں حضرت معاویہ کے دشمن وہ محققینِ اہل سنت تو نہیں جنہوں نے حضرت معاویہ سے صادر ہونے والے کچھ اقوال وافعال کی کوئی تاویل قبول نہیں کی بلکہ اُن اقوال وافعال کو اُن کے ظاہر پر ہی رکھا لیکن دامنِ اعتدال بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ مثلاً قاطع رافضیت حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مقام پر ایک سطری سوال کے جواب میں لکھا ہے:

سوال: حضرت معاویہ ؓ اور مروان کو بُرا کہنے کے بارے میں اہل سنت کے نزدیک کیا ثابت ہے؟

جواب: اہلِ بیت کی محبت فرائضِ ایمان سے ہے نہ کہ لوازمِ سنت، اور محبتِ اہلِ بیت سے ہے کہ مروان علیہ اللعنۃ کو برا کہنا چاہیے اور اُس سے دل سے بیزار رہنا چاہیے۔ علی الخصوص

اُس نے بدسلوکی کی حضرت امام حسین اور اہل بیت کے ساتھ، اور کامل عداوت ان حضرات سے رکھتا تھا۔ اِس خیال سے اُس شیطان سے نہایت بے زار رہنا چاہیے، لیکن حضرت معاویہ بن ابی سفیان صحابی ہیں اور آنجناب کی شان میں بعض احادیث بھی وارد ہیں۔ آنجناب کے بارے میں علماءِ اہل سنت میں اختلاف ہے۔

علماءِ ماوراء النہر اور مفسرین اور فقہاء کہتے ہیں کہ حضرت معاویہ کے حرکات جنگ و جدال جو حضرت علیؓ کے ساتھ ہوئیں، وہ صرف خطاءِ اجتہادی پر تھیں۔

محققینِ اہلِ حدیث (یعنی محدثین) نے بعد تتبعِ روایات دریافت کیا ہے کہ یہ حرکات شائبہ نفسانی سے خالی نہ تھے، اس تہمت سے خالی نہیں کہ جناب ذی النورین حضرت عثمانؓ کے بارے میں جو تعصب اُمویہ اور قرشیہ میں تھا اُسی کی وجہ سے یہ حرکات حضرت معاویہ سے وقوع میں آئیں، جس کا غایت نتیجہ یہی ہے کہ وہ مرتکب کبیرہ اور باغی قرار دیئے جائیں۔ "وَالْفَاسِقُ لَيْسَ بِاَهْلِ اللَّعْنِ" (فاسق قابل لعن نہیں) تو اگر مراد بُرا کہنے سے اسی قدر ہے کہ اُن کے اِس فعل کو برا کہنا اور برا سمجھنا چاہیے تو بلاشبہ اس امر کا ثبوت محققین پر واضح ہے، اور اگر برا کہنے سے مراد لعن و شتم ہے تو معاذ اللہ کہ اہلِ سنت سے کوئی شخص اس کے گرد (قریب) جائے"۔

(فتاوی عزیزی ص ۴۱۳، ایچ ایم سعید کمپنی کراچی)

ایک اور مقام پر شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث "ما منعک أن تسبّ أبا تراب" پر تفصیلی گفتگو میں حضرت معاویہ کی طرف سے سیدنا علی ﷺ پر سب و شتم کرنے کرانے کی تحقیق کرتے ہوئے آخر میں بہ طور لب لباب لکھا ہے:

بلکه بهتر همین ست که این لفظ را برظاهرش جاری باید داشت، نهایت کار آنکه این فعل شنیع یعنی سبّ یاامرسبّ از معاویه بن ابی سفیان لازم خواهد آمد، ولیس هذا باول قارورة کسرت فی الاسلام، چه مرتبهٔ سبّ کمتراز قتل وقتال است، لما روي فی الحدیث الصحیح: "سباب المومن فسوق وقتاله کفر" وهر گاه قتل وامرقتال یقینی است ازان گریز نیست، بالجمله اصلح همین ست که وے رامرتکب کبیره بایددانست

وزبان ازطعن ولعن بندبايدنمود، وإلا مايقال في من زنى ومن شرب من الصحابة رضي الله تعالیٰ عنهم أجمعين ؟ وبرجائے خطائے اجتہادی رادخل دادن خالی ازسماحت نیست.

"بلکہ بہتر یہی ہے کہ اس لفظ سے اس کا ظاہر معنی سمجھا جائے، غایۃ الامر اس کا یہی ہوگا کہ ارتکاب اس فعل قبیح یعنی سب یا حکم سب حضرت معاویہ سے صادر ہونا لازم آئے گا تو یہ کوئی پہلی شیشی نہیں جو اسلام میں توڑی گئی، اس واسطے کہ درجہ سبّ کا قتل وقتال سے بہت کم ہے۔ چنانچہ حدیث صحیح میں وارد ہے کہ "برا کہنا مومن کو فسق ہے اور اس کے ساتھ قتال کفر ہے"۔ اور جب قتال اور حکم قتال کا صادر ہونا یقینی ہے اور اس سے انکار کا چارہ نہیں تو بہتر یہی ہے کہ اُن کو مرتکب کبیرہ کا جاننا چاہیے، لیکن زبان طعن ولعن بند رکھنا چاہیے۔ ورنہ اُن صحابہ کرام ﷺ کے بارے میں کیا کہا جائے گا جن سے زنا ہوا اور شراب خوری ہوئی؟ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین، اور ہر جگہ خطائے اجتہادی کو دخل دینا بے باکی سے خالی نہیں"۔

(فتاوی عزیزی فارسي ج١ ص١٢٤ ومترجم ص٢٢٩)

علامہ کرمانی رحمہ اللہ سے یہ دخل اندازی ہوگئی تھی تو امام عینی حنفی رحمۃ اللہ علیہ نے اُن کا یوں تعاقب کیا تھا:

قلتُ: كيف يقال كان معاوية مخطئًا في اجتهاده، فما الدليل في اجتهاده؟ وقد بلغه الحديث الذي قال ﷺ: ويح ابن سمية تقتله الفئة الباغية، وابن سمية هو عمار بن ياسر، وقد قتله فئة معاوية، أفلا يرضى معاوية سواء بسواء، حتى يكون له أجر واحد؟

"میں کہتا ہوں: کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ معاویہ نے اپنے اجتہاد میں خطا کی، اُن کے اجتہاد پر کون سی دلیل ہے؟ حالانکہ انہیں حدیث پہنچی تھی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ابن سمیہ پر رحمت ہو اسے باغی گروہ قتل کرے گا، ابن سمیہ عمار بن یاسر ﷺ ہیں اور انہیں معاویہ کے گروہ نے قتل کیا تھا، کیا معاویہ اس پر راضی نہیں کہ ان کا معاملہ برابر برابر ہو جائے، چہ جائیکہ اُن کے لیے ایک اجر ہو؟"۔

(عمدة القاري ج٢٤ ص١٩٢، وط: ج٢٤ ص٢٨٦، حديث ٧٠٨٣)

سید شریف علی بن محمد جرجانی متوفی ۸۱۶ھ نے لکھا ہے کہ جمہور اہل اسلام حضرت عثمان غنی اور سیدنا علی بن ابی طالب ﷺ کے ساتھ لڑنے والوں کو خطاوار سمجھتے ہیں، پھر ان میں سے بعض اس خطا کو فسق نہیں مانتے جبکہ تمام شیعہ اور کثیر اہل سنت اس کو فسق کی حد تک خطا قرار دیتے ہیں۔ آخری اصل الفاظ یہ ہیں:

أن بعضهم كالقاضي أبي بكر إلى أن هذه المخطئة لا تبلغ إلى حد التفسيق، ومنهم من ذهب إلى التفسيق كالشيعة و كثير من أصحابنا.

''بعض علماء جیسا کہ قاضی ابوبکر کا کہنا ہے کہ ہر خطا فسق کو نہیں پہنچتی، اور اُن میں سے بعض فسق کی طرف گئے ہیں، جیسا کہ شیعہ اور ہمارے اکثر علماء''۔

(شرح المواقف للجرجاني ج۸ ص۴۰۷)

یہ قاضی ابوبکر کون ہیں؟ یہ '' العواصم من القواصم '' کے مصنف ابن العربی مالکی ہیں، اور یہی ہیں وہ جنہوں نے امام عالی مقام ﷺ کی شہادت میں یزید کے اقدام کو درست کہا، اور یہی ہیں وہ جنہیں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور علامہ عبدالرشید نعمانی وغیرھما نے ناصبی قرار دیا ہے۔

بہر حال غلو سے پاک علماء اہل سنت سے جناب معاویہ کے بارے میں فسق وخطا وغیرہ کی تصریحات بکثرت منقول ہیں، اور ہمیشہ سے ایسے علماء اہل کساء (سیدنا علی المرتضیٰ، سیدۂ کائنات، امام حسن مجتبیٰ اور امام حسین سید الشہداء علیہم السلام) کے ساتھ بلا تقابل تمام صحابہ کرام ﷺ سے زیادہ محبت کرتے رہے ہیں اور کرتے ہیں مگر اس کمال محبت کے باوجود وہ کسی بھی صحابی کے دشمن نہیں رہے۔ یہ دشمنی فقط غالی لوگوں اور روافض میں پائی جاتی ہے۔

ہاں اگر کوئی شخص کہے کہ اہل بیت کرام علیہم السلام یا فقط سیدنا علی ﷺ کے ساتھ دوسرے صحابہ کرام ﷺ کے مقابلہ میں زیادہ محبت ہی غلو ہے تو اس کا یہ قول قرآن وسنت، خلفاء ثلاثہ ﷺ کی سیرت، تمام جلیل القدر صحابہ اور جملہ اسلاف کرام ﷺ کی سنت وعادت کی روشنی میں باطل ومردود ہے۔ یہاں اہل انصاف کی خدمت میں صرف ایک حوالہ پیش کرتا ہوں جو عقل ونقل دونوں خوبیوں پر مشتمل ہے۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

إن من اعترف بالخلافة والفضيلة للخلفاء، وقال: أحب عليًّا أكثر لا يؤاخذ به إن شاء الله تعالىٰ، لقوله عليه السلام: اللّٰهم هذه قسمتي فيما أملك، فلا تؤاخذني فيما لا أملك.

''جو شخص خلفاء کرام کی خلافت وفضیلت کو تسلیم کرے اور کہے: میں علی سے زیادہ محبت کرتا ہوں

توان شاء اللہ اس پر اُس کا مواخذہ نہیں کیا جائے گا، اس لیے کہ حدیث نبوی ﷺ ہے: اے اللہ! یہ وہ تقسیم ہے جس پر مجھے اختیار تھا، لہٰذا جس پر مجھے اختیار نہیں اُس پر میرا مواخذہ نہ کرنا"۔

(شم العوارض للقاري ص١٠٨، وط: ص٦٢؛ حاشية على النبراس، برخوردار ملتاني ص٤٩٢)

ملا علی قاری کی نقل فرمودہ حدیث "اللّٰهم هذه قسمتي فيما أملك" صحاح اربعہ میں موجود ہے۔

(سنن الترمذي ج٢ ص٤٣٣، حديث ١١٤٠)

نبی کریم ﷺ اپنی ازواج مقدسہ کے مابین عدل کے ساتھ ظاہری امور کی تقسیم فرماتے تھے لیکن دل کا میلان جو سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف زیادہ ہوتا تھا مندرجہ بالا الفاظ میں اُس کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔




مقامِ مرتضیٰ بہ بارگاہِ مصطفیٰ علیہما السلام

﴿۵﴾ أخبرنا ابن أبي عمر، أخبرنا ابن البخاري، أخبرنا حنبل، أخبرنا ابن حصين، أخبرنا ابن المذهب، أخبرنا ابن مالک، حدثنا عبد الله بن أحمد، حدثني أبي، حدثنا أبو أحمد الزبيري، حدثنا عبد الله بن حبيب بن أبي ثابت، عن حمزة بن عبد الله عن أبيه، عن عبد الله بن عمر، عن سعد، قال: لما خرج رسول الله ﷺ إلى تبوک خلّف علياً، فقال: أتخلّفني؟ فقال:

أما ترضیٰ أن تكون مني بمنزلة هارون من موسیٰ، غير أنه لا نبي بعدي.

﴿۵﴾ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غزوہ تبوک کے لیے نکلے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پیچھے چھوڑا تو انہوں نے عرض کیا: آپ مجھے پیچھے چھوڑ رہے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ تمہاری نسبت میرے ساتھ ایسی ہے جیسی ہارون علیہ السلام کی موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ، مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔

(مسند أحمد ج۱ ص۱۸٤، وط: ج۱ ص٤۹٦، حديث ۱٦۰۰؛ السنن الكبریٰ للنسائي ج ۷ ص ٤۲۹، حديث ۸۳۹۰؛ السنة لابن أبي عاصم ص۵۸٦، حديث ۱۳۳٤؛ كتاب الأغراب للنسائي ص ۱۸۰، حديث ۱۰۸؛ الروض البسام بترتيب وتخريج فوائد تمام ج٤ ص۲۹۸، حديث ۱٤۷۹)

﴿٦﴾ وبه إلى أحمد، حدثنا أبو سعيد، مولیٰ بني هاشم، حدثنا سليمان بن بلال، حدثنا إسماعيل عن عبد الرحمان، عن عائشة بنت سعد، عن أبيها، أن علياً خرج مع النبي ﷺ حتى جاء ثنية الوداع وعلي رضي الله عنه يبكي ويقول: تخلفني مع الخوالف؟ فقال:

أما ترضی أن تكون مني بمنزلة هارون من موسیٰ إلا النبوة.

﴿٦﴾ حضرت عائشہ بنت سعد اپنے والد سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ غزوہ تبوک کے لیے روانہ ہوئے، حتیٰ کہ ثنیۃ الوداع کے مقام پر پہنچے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ روتے ہوئے آئے اور عرض کیا: آپ مجھے پیچھے رہنے والیوں کے ساتھ چھوڑ رہے ہیں؟ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ تمہاری نسبت میرے ساتھ ایسی ہے جیسی ھارون علیہ السلام کی موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ، ماسوا نبوت کے۔

(مسند أحمد ج۱ ص ۱۷۰، وط: ج۲ ص٤٦٤، حديث ۱٤٦۳؛ فضائل الصحابة ج۲ ص ۷۳۲،

حدیث۱۰۰٦؛حدیث السراج لأبي العباس الثقفي ج۳ص ٢٦٥، حدیث۲۷۳۲؛السنن الكبرىٰ للنسائي ج۷ص٤٢٩، حدیث۸۳۸۹،وط: ج٥ص١٢٣، ١٢٤، حدیث٨٤٤٣؛مسند البزار ج٤ ص۳۸،حدیث۱۲۰۰؛تاريخ دمشق لابن عساكر ج٤٢ص١٦٢)

حديث المنزلة کا حکم

مصنف رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

متفق على صحته بمعناه من حديث سعد بن أبي وقاص،قال الحافظ أبو القاسم ابن عساكر:وقد روي هذا الحديث عن رسول الله ﷺ جماعة من الصحابة، منهم: عمر، وعلي، وابن عباس، وعبد الله بن جعفر،ومعاذ، ومعاوية،وجابر بن عبد الله،وجابر بن سمرة، وأبو سعيد،والبراء بن عازب، و زيد بن أرقم، وزيد ابن أبي أوفى،ونبيط بن شريط، وحبشي بن جنادة،وماهر بن الحويرث ، وأنس بن مالك،وأبي الطفيل، وأم سلمة، وأسماء بنت عميس، وفاطمة بنت حمزة،ثم ذكر طرقها كلها بأسانيده في تاريخ دمشق رحمه الله.

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کی صحت پر اتفاق ہے۔حافظ ابو القاسم بن عساکر نے کہا ہے: رسول اللہ ﷺ سے یہ حدیث صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے روایت کی ہے،اُن میں سے حضرات عمر،علی،ابن عباس،عبد اللہ بن جعفر،معاذ،معاویہ،جابر بن عبد اللہ،جابر بن سمرہ،ابو سعید،براء بن عازب،زید بن ارقم،زید بن ابی اوفی،نبیط بن شریط،حبشی بن جنادہ،ماہر بن حویرث،انس بن مالک،ابو الطفیل،ام سلمہ،اسماء بنت عمیس اور فاطمہ بنت حمزہ رضی اللہ عنہم،پھر امام ابن عساکر نے "تاریخ دمشق" میں ان تمام احادیث کو ان کی سندوں کے ساتھ ذکر کیا،اللہ تعالیٰ ان پر رحمت فرمائے۔

فائدہ

"تاريخ مدينة دمشق" دار الفكر،بیروت کے ایڈیشن کی بیالیسویں اور دار إحياء التراث العربي بیروت کے ایڈیشن کی پینتالیسویں جلد مکمل سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے حالات پر مشتمل ہے،اس میں اس حدیث اور فضائل مرتضوی میں باقی تمام احادیث کو دیکھا جا سکتا ہے۔

حدیث المنزلۃ سے مرتضوی افضلیت

اس حدیث میں سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کی ہر شان آ گئی ہے، مثلاً اخوتِ نبوی، وزارتِ نبوی حتیٰ کہ نبوت کے علاوہ کوئی ایسی عظمت نہیں جو اس حدیث میں نہ آئی ہو، اور چونکہ شیعہ وروافض جو کہ سیدنا علی ﷺ کی خلافتِ ظاہری بلافصل کے قائل ہیں اور وہ دوسری احادیث کی طرح اس حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں اس لیے ہمارے اکثر شارحین حضرات نے اس حدیث کی تشریح کا آغاز روافض کی تردید سے کیا ہے لیکن آخر میں بعض حضرات نے ایک آدھ جملہ سیدنا علی ﷺ کی فضیلت میں بھی رقم کیا ہے، چنانچہ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ اسی اسلوب میں لکھتے ہیں:

بل فيه من فضائل علي ومنزلته مالايحط من منزلة غيره.

''بلکہ اس میں سیدنا علی ﷺ کی ایسی فضیلت اور مرتبہ کا ذکر ہے جس سے باقی حضرات کے مرتبہ میں کمی نہیں آتی''۔

(إكمال المعلم بفوائد مسلم ج٧ص٤١٢)

میں کہتا ہوں: ویسے بھی کسی کی شان کسی دوسرے کی شان میں کمی کے لیے نہیں ہوتی، نہ جانے سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کی شان میں آیات واحادیث کی تفسیر وتشریح کے وقت ہی ہمارے علماء کرام کو ایسے توضیحی جملے لکھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی ہے؟ غالباً کسی مخصوص فرقہ کے غلط استدلالات کے انسداد کی خاطر حفظ ماتقدم کے طور ایسے جملوں کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ کاش وہ فرقہ پیدا نہ ہوتا اور کوئی محدث خالی الذہن ہو کر اس حدیث کی تشریح کرتا تو پھر اس حدیث کی تشریح کی صورت کچھ اور ہوتی، تاہم بعض علماء نے اس حدیث کے تحت بہت اچھا لکھا ہے۔ چنانچہ علامہ وشتانی اُبی اور علامہ سنوسی حسنی رحمۃ اللہ علیہما نے قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کا مذکورہ جملہ نقل کرنے کے بعد مزید یہ بھی لکھا ہے:

قال الآمدي: لايخفىٰ أن علياً كان مستجمعاً لخلال شريفة ومناقب منيفة بعضها كاف في استحقاق الإمامة، وقد اجتمع فيه من حميد الصفات وكمال أنواع الكمالات ما تفرق في غيره من الصحابة حتىٰ إذا قيل: من أشجع الصحابة وأعلمهم وأزهدهم وأفصحهم وأسبقهم إيماناً وأكثرهم جهاداً بين يدي رسول الله ﷺ وأقربهم نسباً وصهراً كان معدوداً في أول الجريدة

وسابقاً إلى كل فضيلة، وقد قال فيه ربانيّ هذه الأمة ابن عباس وقد سأله معاوية عنه، فقال: كان و كان، فلم تبق محمدة من محامد الدين و الدنيا حتى وصفه بها.

''امام سیف الدین آمدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مخفی نہیں کہ سیدنا علی ؓ حسین خوبیوں اور ایسے بلند مراتب کے جامع تھے جن میں بعض خوبیاں ان کے استحقاقِ خلافت کے لیے کافی ہیں، اور بلاشبہ ان میں صفاتِ حمیدہ اور کئی اقسام کے ایسے کمالات جمع ہو گئے تھے جو دوسرے صحابہ کرام ؓ میں متفرق طور پر موجود تھے، حتیٰ کہ اگر پوچھا جائے سب سے بڑھ کر بہادر، سب سے بڑا عالم، سب سے بڑا زاہد، سب سے بڑھ کر فصیح، ایمان میں سب سے سابق، حضور ﷺ کی موجودگی میں جہاد میں سب سے زائد اور رشتہ داری میں سب سے زیادہ قریب کون ہے؟ تو گنتی میں پہلا نمبر اُن ہی کا آتا ہے اور ہر فضیلت میں وہی سابق نظر آتے ہیں۔ امت کے ربانی عالم سیدنا ابن عباس ؓ نے اُن کی شان میں حضرت معاویہ ؓ کے سوال کے جواب میں فرمایا تھا: وہ یہ شان رکھتے تھے اور یہ شان رکھتے تھے، حتیٰ کہ دین و دنیا کی کوئی خوبی نہیں جس سے انہوں نے اُنہیں متصف نہ فرمایا ہو''۔

(إكمال إكمال المُعْلِم للوشتاني الأبي ج٨ص٢٢٦؛ مكمل إكمال الإكمال للسنوسي الحسني ج ٨ص٢٢٦)

امام ابوالحسن سیف الدین الآمدی کا کلام کافی طویل ہے، امام وشتانی اُبی اور امام سنوسی حسنی نے اُس کی تلخیص کا حق ادا کر دیا ہے، راقم الحروف بھی اسے مکمل نقل کرنے سے قاصر ہے تاہم اس مقام کی مناسبت سے چند مزید جملے پیش خدمت ہیں۔ سیدنا ابن عباس ؓ فرماتے ہیں:

كان والله علم الهدى، و كهف التقىٰ، ومحل الحجى، وبحر الندى، وطود النهى، و كنف العلم للورىٰ، ونور السفر في ظلام الدجىٰ، كان داعياً إلى المحجة العظمىٰ، ومستمسكاً بالعروة الوثقىٰ، عالماً بما في الصحف الأولىٰ، وعاملاً بطاعة الملك الأعلىٰ، عارفاً بالتأويل و الذكرىٰ، متعلقاً بأسباب الهدىٰ، حائزاً عن طرقات الردىٰ، سامياً إلى المجد والعلىٰ، وقائماً بالدين

والتقوىٰ، وتاركاً للجورِ والعُدوىٰ، وخير من آمن واتقى، وسيد من تقمّص وارتدى، وأبر من انتقى وسعىٰ، وأصدق من تسربل واكتسىٰ، وأكرم من تنفس وقرأ، وأفضل من صام و صلى، وأفخر من ضحك وبكىٰ، وأخطب من مشى علىٰ الثرىٰ، و أفصح من نطق في الورىٰ بعد النبي المصطفىٰ، فهل من يساويه أحد؟ وهوزوج خير النسوان فهل يساويه بعل، وأبو السبطين فهل يدانيه خلق ؟

''خدا کی قسم وہ ھدایت کا پرچم، تقوی کا منبع، عقل کا مرکز، عطاؤں کا سمندر، زیرکی کا پہاڑ، لوگوں کے لیے علم کی آماجگاہ، تاریکیوں میں مشعلِ نور، انتہائی سیدھی راہ کے داعی، مضبوط حلقہ کو تھامنے والے، پہلی کتابوں کے عالم، رب العلیٰ کی طاعت پر کاربند، تأویل وتفسیر کے عارف، اسبابِ ہدایت کو تھامنے والے، نامناسب راہوں سے اجتناب کرنے والے، شرف وعظمت کو اپنانے والے، دین وتقوی پر قائم رہنے والے، ظلم وزیادتی کو ترک کرنے والے، ہر مومن ومتقی سے بہتر، ہر قمیص وچادر پہننے والے کے سردار، ہر چلنے اور سعی کرنے والے سے زیادہ نیک، ہر کرتہ ولباس پہننے والے سے زیادہ سچے، ہر سانس لینے اور کھانے والے سے زیادہ معزز، ہر نمازی اور روزے دار سے افضل، ہر ہنسنے اور رونے والے سے بہتر، ہر زمین پر چلنے والے سے اخطب (بڑے خطیب) اور مصطفیٰ ﷺ کے بعد لوگوں کی مجالس میں ہر کلام کرنے والے سے زیادہ فصیح۔ تو کیا ہے کوئی اُن کے برابر؟ وہ تمام خواتین سے بہتر خاتون کے شوہر تھے، تو کیا ہے کوئی شوہر اُن کا ہمسر؟ وہ سبطین کریمین کے بابا تھے، تو کیا ہے کوئی مخلوق میں اُن جیسا قد آور؟''۔

(أبكار الأفكار في أصول الدين ج٣ص٥٧٢، ٥٧٣)

اگر بلا تکلف اس حدیث کا مفہوم بیان کیا جائے تو یہ ہے کہ سیدنا علیؑ کو نبوت کے علاوہ تمام فضائل حاصل ہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فقط نبوت کو ہی مستثنیٰ فرمایا ہے۔

جدید طرز سے اس حدیث کی مکمل تخریج، تشریح اور اس کے ضمن میں ناصبیت کی تردید کے لے احقر کی تصنیف ''شرح خصائص عليؑ'' صفحہ٢٩٣تا٣٥٥۔ الطبعة الخامسة ملاحظہ فرمائیں۔





علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھنے والا منافق ہے

﴿۷﴾ وأخبرنا شيخنا صلاح بن أحمد الإمام قراءةً عليه، أخبرنا علي بن أحمد سماعًا، أخبرنا علي البغدادي، أخبرنا هبة الله بن الحصين، أخبرنا الحسين بن محمد، أخبرنا أبوبكر القطيعي، حدثنا عبد الله بن أحمد بن محمد، حدثني أبي، حدثنا ابن نمير عن الأعمش عن عدي بن ثابت عن زر بن حبيش قال: قال علي رضي الله عنه:

والله إنه لمما عهد إليّ رسول الله صلى الله عليه وسلم، أنه لا يبغضني إلا منافق، ولا يحبني إلا مؤمن.

﴿۷﴾ حضرت زر بن حبیش سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مجھے بتایا اُس میں یہ بھی ہے کہ مجھ سے بغض نہیں رکھے گا مگر منافق اور میرے ساتھ محبت نہیں کرے گا مگر مؤمن۔

(السنن الكبرى للنسائي ج۷ ص ۴۴۵، حديث ۸۴۳۲، وط: ج ۵ ص ۱۳۷، حديث ۸۴۸۶؛ الفوائد المنتقاة للصوري ص۳۸؛ خصائص علي ص ۱۰۱، حديث ۹۸، وط: ص ۱۴۴، حديث ۱۰۱، وط: ص ۱۱۸، حديث ۱۰۱)

مصنف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

هذا حديث صحيح، أخرجه مسلم في كتاب الإيمان من صحيحه، عن أبي بكر بن أبي شيبة، عن وكيع، وأبي معاوية، وعن يحيى بن يحيى، عن أبي معاوية كلاهما عن الأعمش به ولفظه:

یہ صحیح حدیث ہے اس کو امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح مسلم کی کتاب الایمان میں امام ابوبکر بن ابی شیبہ سے از وکیع اور ابومعاویہ سے روایت کیا ہے اور از یحییٰ بن یحییٰ اور ابومعاویہ سے روایت کیا ہے اور ان دونوں نے امام اعمش سے روایت کیا ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں:

﴿۸﴾ والذي فلق الحبة، وبرأ النسمة إنه لعهد النبي الأمي إليّ أنه لا يحبني إلا مؤمن، ولا يبغضني إلا منافق.

﴿۸﴾ سیدنا علی رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں: اُس اللہ جل جلالہ کی قسم جس نے دانے کو چیرا اور جاندار کو پیدا فرمایا، بیشک نبی اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم نے قطعیت کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ مجھ (علی) سے محبت نہیں کرے گا مگر مومن اور میرے ساتھ بغض

نہیں رکھے گا مگر منافق۔

(صحیح مسلم رقم المسلسل ٢٤٠[٧٨]؛السنن الكبرى للنسائي ج٧ص٣١٢،حديث٨٠٩٧ و ص٤٤٥،حديث٨٤٣١،وط: ج٥ص٤٧،حديث٨١٥٣ وص٧٣١،حديث٨٤٨٥؛ مسند أحمد ج١ص٨٤،حديث٦٤٢وص٩٥،حديث٧٣١ وص١٢٨،حديث١٠٦٢ وج ٦ص٢٩٢،حديث ٢٧٠٤٠عن سلمة؛فضائل الصحابة ج٢ص٦٩٦،حديث٩٤٨وص٧٠٤،حديث٩٦١؛ المصنَّف لابن أبي شيبة ج٦ص ٣٦٨،حديث٥٠٣٣، ٥٠٣٧؛ مسند الحميدي ج١ ص ٣١ ، حديث ٥٨؛مسند البزار ج ٢ص١٨٢،حديث٥٦٠؛مسند أبي يعلىٰ ج١ص ١٥٤ ، حديث ٢٨٦ وص٢١٧،حديث ٤٤١؛كتاب الإيمان لابن مندة ج١ص٤١٥،حديث٢٦١؛ صحيح ابن حبان ج٩ص٤٠،حديث٦٨٨٥؛معرفة علوم الحديث للحاكم ص١٨٠؛ البداية والنهاية ج٥ص ٤٦٩، ٤٧٠؛مشكاة ج٢ص٥٠٣،حديث ٦٠٨٨)

ورواه أيضاً الترمذي والنسائي وابن ماجة في سننهم،وقال الترمذي : حديث حسن صحيح، ورواه ابن ماجه أيضاً،عن علي بن محمد وعبد الله بن نمير به، فوقع لنا موافقة عالية،وبدلا عالياً لشيوخ مسلم وأصحاب السنن ولله الحمد.

نیز اس حدیث کو امام ترمذی، امام نسائی اور امام ابن ماجہ نے اپنی اپنی سنن میں روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے فرمایا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے، اور اس کو امام ابن ماجہ نے از علی بن محمد اور عبداللہ بن نمیر سے بھی روایت کیا ہے، لہٰذا ہمیں ایک عالی موافقت اور بلند سند امام مسلم اور ارباب سنن سے حاصل ہوئی، وللہ الحمد۔

(سنن الترمذي ص٨٤٩،حديث٣٧٣٦؛ سنن النسائي ج٨ص١١٦،حديث٥٠٣٣؛سنن ابن ماجه،حديث١١٤؛السنن الكبرى للنسائي ج٧ص٣١٢،حديث٨٠٩٧ وص٤٤٥، حديث ٨٤٣١،وط: ج٥ص ٤٧،حديث ٨١٥٣وص٧٣١،حديث٨٤٨٥)

﴿٩﴾ وأخبرناشيخنا رحلة الآفاق أبو حفص عمربن الحسن الحلبي بقراءتي عليه غير مرة، أخبرنا أبوالحسن علي بن أحمد السعدي،أخبرنا أبو حفص عمربن محمد البغدادي، أخبرنا أبوالفتح عبد الملك ابن أبي القاسم الهروي، أخبرنا أبوعامر الأزدي، أخبرنا أبومحمد الجراحي، أخبرنا أبوالعباس محمد بن أحمد المحبوبي، أخبرنا أبوعيسى محمدبن عيسى

الحافظ، حدثنا واصل بن عبد الأعلیٰ، حدثنا محمد بن فضيل، عن عبد الله بن عبد الرحمان أبي نصر، عن المساور الحميري عن أمه قالت: دخلت على أم سلمة، فسمعتها تقول:

كان رسول الله ﷺ يقول: لا يحب علياً منافق، ولا يبغضه مؤمن.

رواه الترمذي في جامعه، وقال: حسن غريب من هذا الوجه.

﴿۹﴾ مساور الحميري اپنی والدہ سے روایت کرتے ہیں، وہ کہتی ہیں: میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے ہاں حاضر ہوئی تو میں نے انہیں فرماتے ہوئے سنا: رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے: منافق علی کے ساتھ محبت نہیں کرے گا اور مومن علی کے ساتھ بغض نہیں رکھے گا۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو اپنی "جامع" میں روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ اس سند سے یہ حدیث حسن غریب ہے۔

فائدہ

چونکہ اس حدیث کی سند میں "مساور حمیری" اور اس کی والدہ غیر معلوم ہیں اس لیے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: اس سند سے یہ حدیث "حسن غریب" ہے، ورنہ دوسری سندوں کے ساتھ تو یہ حدیث صحیح ہے اور صحیح مسلم میں بھی موجود ہے۔

علی سے بغض نفاق کی مخصوص علامت ہے؟

متعدد سندوں اور مختلف الفاظ سے یہ صحیح حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ کسی شخص کے ایمان و نفاق کو پہچاننا ہو تو غور کرو کہ وہ سیدنا علی ؑ سے، اُن کے فضائل اور اُن کے ذکرِ خیر سے شاداں و فرحاں ہوتا ہے تو وہ مومن ہے اور اگر کبیدہ خاطر ہوتا ہے تو منافق ہے۔

بہ حیثیتِ فردِ واحد یہ سیدنا علی ؑ کی خصوصیت ہے مگر بعض لوگوں کے نزدیک یہ خصوصیتِ مرتضوی نہیں ہے۔ چنانچہ بعض معاصرین نے لکھا ہے:

"اس طرح یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مولا علی کا بغض منافقت کی نشانی ہے اور آپ کی محبت ایمان کی نشانی ہے۔ یہ بات بالکل حق ہے مگر یہ آپ ؓ کا خاصہ نہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ آيَةُ الْإِيْمَانِ حُبُّ الْأَنْصَارِ وَآيَةُ النِّفَاقِ بُغْضُ الْأَنْصَارِ انصار کی محبت ایمان کی نشانی

ہے اور انصار کا بغض منافقت کی نشانی ہے (بخاری: ۱۷، ۳۷۸۴، مسلم: ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، نسائی: ۵۰۱۹) اسی طرح تمام کے تمام صحابہ علیہم الرضوان کے بارے میں فرمایا کہ مَنْ اَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّیْ اَحَبَّهُمْ وَمَنْ اَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِیْ اَبْغَضَهُمْ یعنی جس نے ان سے محبت رکھی پس اس نے میری محبت کی وجہ سے ان کو محبوب جانا اور جس نے ان سے بغض رکھا میرے بغض کی وجہ سے ان سے بغض رکھا (ترمذی: ۳۸۶۲، مسند احمد: ۱۶۸۰۸، مشکوٰۃ: ۶۰۱۴)"۔

(ضربِ حیدري بارِ پنجم ص ۱۸۱، ۱۸۲)

مشکل یہ ہے کہ ہمارے بعض معاصر "شیخ الحدیث" سے زیادہ "پیر سائیں" ہیں۔ اس لیے ان کے سامنے لب کشائی کرنا مشکل ہے۔ آیئے جو "پیر" یا "سائیں" نہ ہو اُسے ہم یہ خصوصیت سمجھاتے ہیں۔ قاضی صاحب نے دو حدیثیں پیش کیں، ایک انصار کے بارے میں اور دوسری تمام صحابہ کرام ﷢ کے بارے میں، اور ظاہر ہے کہ انصار ﷢ ایک جماعت کا نام ہے فرد کا نہیں، اور دوسری حدیث میں تمام صحابہ کرام ﷢ کا ذکر ہے اور تمام صحابہ کرام ﷢ میں سیدنا علی المرتضی ﷛ بھی شامل ہیں۔ پھر اس کے باوجود سیدنا علی ﷛ کا نام لے کر تنہا اُن کی محبت کو ایمان اور اُن کے ساتھ بغض رکھنے کو منافقت قرار دینا اُن کی خصوصیت کیوں نہیں؟ مثلاً غور فرمایئے کہ ہر وہ شخص جو اعلانِ نبوت کے بعد ایمان کے ساتھ حضور ﷺ سے ملاقات کرے اور پھر ایمان پر اُس کا خاتمہ ہو تو وہ صحابی ہے۔ اب سائیں پیر سے کوئی پوچھے کہ صحابہ تو بہت ہیں مگر "اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ" کے الفاظ میں جو سیدنا ابوبکر صدیق ﷛ کی صحابیت کا ذکر ہے وہ اُن کی خصوصیت ہے کہ نہیں؟ نیز حسبِ مراتب تمام صحابہ کرام ﷢ انعام یافتہ ہیں مگر جس کے لیے "وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَیْهِ" آیت نازل ہوئی یہ اُس کی خصوصیت ہے کہ نہیں؟

بہرکیف کسی سائیں کو یہ خصوصیت سمجھ آئے یا نہ آئے مگر جس جماعتِ انصار ﷢ کی شان میں اس مضمون کی حدیث آئی ہے خود اُن کے نزدیک بھی یہ سیدنا علی ﷛ کی خصوصیت ہے، جیسا کہ نیچے متن کی حدیث میں صراحت آرہی ہے۔

انصار ﷢ کے نزدیک منافقت کی کسوٹی

﴿۱۰﴾ وأخبرنا ابن يزيد قراءة مني عليه، أخبرنا علي بن أحمد بن محمد، حدثنا ابن طبرزد، أخبرنا أبو الفتح الكروخي، أخبرنا أبوبكر الغورجي، أخبرنا عبد الجبار المروزي،

أخبرنا محمد بن أحمد ابن محبوب، أخبرنا ابن سورة الحافظ، حدثنا قتيبة، حدثنا جعفر بن سليمان عن أبي هارون، عن أبي سعيد الخدري ﷺ، قال:

إنا كنا لنعرف المنافقين، نحن معشر الأنصار، ببغضهم علي بن أبي طالب ﷺ.

رواه الترمذي، وقال: حديث غريب، قال: وقد روي هذا الحديث عن الأعمش، عن أبي صالح عن أبي سعيد.

﴿١٠﴾ حضرت ابوسعید خدری ﷺ بیان فرماتے ہیں: ہم انصار لوگ منافقین کو حضرت علی بن ابی طالب ﷺ کے ساتھ بغض رکھنے سے پہچانتے تھے۔

اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ غریب ہے، اور کہا ہے کہ یہ حدیث از اعمش از ابوصالح از ابوسعید بھی روایت کی گئی ہے۔

(سنن الترمذي ص٨٤٦، حديث٣٧١٧؛ فضائل الصحابة ج٢ ص٧١٥، حديث٩٧٩؛ تاريخ دمشق ج٤٢ ص٢٨٦؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٧ ص٣٧٠؛ الصحيح المسند من فضائل أهل بيت النبوة لأم شعيب الوادعية ص٦٤، حديث٧٦)

یہ حدیث حضرت جابر بن عبداللہ انصاری ﷺ سے بھی منقول ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں:

ما كنا نعرف منافقينا معشر الأنصار إلا ببغضهم علياً.

"ہماری جماعت انصار ﷺ اپنے اندر منافقین کو سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کے ساتھ بغض کے باعث ہی پہچانتی تھی"۔

(فضائل الصحابة ج٢ ص٧٩٣، حديث١٠٨٦، وط: ص٢٤٤، حديث١٠٨٨؛ المعجم الأوسط ج٤ ص٢٦٤، حديث٤١٥١؛ مجمع البحرين في زوائد المعجمين ج٣ ص٣٨٣، حديث ٣٧٠٩؛ مجمع الزوائد ج٩ ص١٣٣، حديث١٤٧٥٩، وط: ج٩ ص١٢٦، حديث١٤٧٥٩؛ كشف الأستار ج٣ ص١٩٩، حديث٢٥٦٠؛ الرياض النضرة ج٤ ص١٦٣؛ ذخائر العقبىٰ ص١١٠؛ تاريخ دمشق ج٤٢ ص٢٨٦؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٧ ص٣٧١؛ مختصر زوائد البزار للعسقلاني ج ٢ ص ٣١٨، حديث١٩٣١)

مہاجرین ﷺ کے نزدیک منافقت کی کسوٹی

حضرت جندب بن جنادہ یعنی ابوذر غفاری ﷺ مہاجر صحابی ہیں اُن کے نزدیک بھی اللہ ﷻ اور رسول اللہ ﷺ کی تکذیب اور نماز میں غفلت کے ساتھ ساتھ بغض مرتضوی بھی منافقت کی علامت ہے۔ درج ذیل متن کی حدیث میں غور فرمائیے:

﴿۱۱﴾ ورواه الحاكم في صحيحه عن أبي ذر، ولفظه:

ما كنا نعرف المنافقين إلا بتكذيبهم الله ورسوله، والتخلّف عن الصلاة، والبغض لعلي بن أبي طالب.

وقال: صحيح على شرط البخاري، ومسلم، ولم يخرجاه.

﴿۱۱﴾ اور امام حاکم نے اس حدیث کو اپنی صحیح میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں:

ہم منافقین کو فقط اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکذیب سے، نماز سے پیچھے رہ جانے سے اور سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما کے ساتھ بغض رکھنے سے پہچانتے تھے۔

امام حاکم نے کہا: یہ حدیث امام بخاری اور امام مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے اور انہوں نے اس کو روایت نہیں کیا۔

(المستدرك ج۳ص۱۲۸، وط: ج٤ص۹۹، حديث۳٦۹۸، وط: ج۳ص۱۳۹، حديث ٤٦٤۳؛ جمع الجوامع ج۱۵ص٥۲٥، حديث۱٥۰۲۲، وط: ج۲۲ص۱۳٥، حديث٦۲۲؛ كنز العمال ج ۱۳ص۱۰٦، حديث۳٦۳٤٦)

تنبیہ

خیال رہے کہ "المستدرک" میں اس حدیث کی سند میں ایک شخص اسحاق بن بشر الکاہلی ہے جس پر بعض محدثین نے کذب اور وضع کی تہمت لگائی ہے، تاہم وہ ایسی بات نہیں لایا جو احادیث صحیحہ سے ثابت نہ ہو۔ چنانچہ اگر غور کیا جائے تو اس حدیث کے ہر جملہ کی تائید دوسری صحیح السند احادیث سے ہو جاتی ہے۔ کس کو معلوم نہیں کہ تکذیب الٰہی اور تکذیب نبوی منافقت ہے، نماز سے پیچھے رہنا منافقت کی علامات سے واضح علامت ہے اور

سیدنا علی ﷺ سے بغض منافقت ہے، جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ کتب میں تصریح آئی ہے، فی الجملہ یہ کہ اس حدیث کا ہر ہر جملہ شواہد کے ساتھ مؤید و صحیح ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

بہر کیف اِن احادیث سے معلوم ہوا کہ اگرچہ انصار ﷺ کے ساتھ بُغض رکھنے کو منافقت فرمایا گیا ہے اور تمام صحابہ کرام ﷺ کے ساتھ بغض کو حضور ﷺ کے ساتھ بغض کے مترادف قرار دیا گیا ہے تاہم انفرادی طور پر تمام مہاجرین وانصار ﷺ کے نزدیک یہ بات طے شدہ تھی کہ اگر تنہا کوئی ذات منافقت کی پہچان کی کسوٹی ہے تو وہ فقط سیدنا و مولانا علی المرتضیٰ ﷺ کی ذات پاک ہے۔ اسی حقیقت کو متن کی آئندہ حدیث میں ایک اور انداز میں بیان فرمایا گیا ہے۔





مُبغضِ علی ؓ ولد الزنا ہے

﴿۱۲﴾ أخبرنا الإمام العلامة شيخ الإسلام أبو العباس أحمد بن الحسن الحنبلي القاضي في جماعة آخرين مشافهة، عن الإمام القاضي سليمان ابن حمزة الدمشقي، أخبرنا محمد بن فتيان البغدادي في كتابه، أخبرنا الإمام أبو موسىٰ محمد بن أبي بكر الحافظ، أخبرنا أبو سعد محمد بن الهيثم، أخبرنا أبو علي الطهراني، حدثنا أحمد بن موسىٰ، حدثنا علي بن الحسين بن محمد الكاتب، حدثنا أحمد بن الحسين الخزار، حدثنا حصين بن مخارق، عن زيد ابن عطاء بن السائب عن أبيه، عن الوليد بن عبادة بن الصامت عن أبيه عبادة بن الصامت ؓ قال:

كنا نبور أولادنا بحب علي بن أبي طالب رضي الله عنه، فإذا رأينا أحدهم لايحب علي بن أبي طالب، علمنا أنه ليس منا، وأنه لغير رِشدة.

قوله: لغير رِشْدة، هو بكسر الراء، واسكان الشين المعجمة، ولد زنا. وهذا مشهور من قديم وإلى اليوم أنه ما يبغض علياً ؓ إلا ولد زنا.

﴿۱۲﴾ حضرت ولید بن عبادہ اپنے والد حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: ہم اپنی اولاد کو سیدنا علی بن ابی طالب ؓ کی محبت سے جانچتے تھے، پس جب ہم ان میں سے کسی کو دیکھتے کہ وہ سیدنا علی بن ابی طالب ؓ سے محبت نہیں کرتا تو ہم جان لیتے کہ وہ ہم میں سے نہیں ہے اور وہ صحیح النسب نہیں۔

حضرت عبادہ ؓ کے قول "لغیر رشدۃ" حرف "ر" کی زیر اور حرف "ش" کے سکون (جزم) کے ساتھ کا معنیٰ ہے ولد الزنا، اور یہ بات تب سے اب تک معروف ہے کہ سیدنا علی ؓ کے ساتھ حرامی شخص ہی بغض رکھتا ہے۔

خیال رہے کہ حضرت عبادہ بن الصامت ؓ بھی انصاری صحابی ہیں لیکن وہ اور اُن کے دوسرے ساتھی کسی بے اصل شخص کی شناخت کے لیے کسی انصاری بزرگ کی محبت کو نہیں بلکہ سیدنا علی المرتضیٰ ؓ کی محبت کو کسوٹی کے طور اپناتے تھے۔ اس لیے کہ اس چیز کی پہچان کے لیے سب صحابہ کرام ؓ میں سے انصار خاص ہیں اور تمام انصار

ومہاجرین ﷺ میں سے سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ خاص ہیں۔ اسی حقیقت کو امام اعظم ابوحنیفہ ﷺ کے شیخ امام جعفر صادق ﷺ نے بھی بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ امام ابن اثیر الجزری، علامہ محمد طاہر پٹنی اور علامہ وحید الزماں لکھتے ہیں:

وفي حديث جعفر الصادق ﷺ: لا يحب أهل البيت المذعذع، قالوا: وما المذعذع ؟ قال: ولد الزنا.

"امام جعفر صادق [ﷺ] نے فرمایا: ہم اہل بیت سے وہی محبت نہ کرے گا جو مذعذع ہوگا، لوگوں نے عرض کیا: مذعذع کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے فرمایا: ولد الزنا"۔

(ترجمہ: از علامہ وحید الزمان)

(النهاية ج٢ ص١٤٩؛ مجمع بحار الأنوار ج٢ ص ٢٣٩؛ لغات الحديث ج٢ ص١٨)

حضرت محبوب بن ابی الزناد ﷺ بیان کرتے ہیں:

قالت الأنصار: إن كنا لنعرف الرجل إلى غير أبيه ببغضه علي بن أبي طالب.

"انصار ﷺ نے کہا: بیشک ہم کسی شخص کے حرامی ہونے کی شناخت سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کے ساتھ بغض سے کرتے تھے"۔

(تاريخ دمشق لابن عساكر ج٤٢ ص٢٨٧، ٢٨٨؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٧ ص٣٧١)

﴿١٣﴾ وروينا ذلك أيضاً من أبي سعيد الخدري ﷺ، ولفظه:

كنا معشر الأنصار نبور أولادنا بحبهم علياً رضي الله عنه، فإذا ولد فينا مولود فلم يحبهٔ عرفنا أنه ليس منا.

قوله: نبور، بالنون والباء الموحدة وبالراء أي نختبر ونمتحن.

﴿١٣﴾ اسی طرح حضرت ابوسعید خدری ﷺ سے بھی روایت ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں:

ہم انصار برادری کے لوگ اپنی اولاد کو سیدنا علی ﷺ کے ساتھ محبت سے جانچتے تھے، پس جب ہمارے ہاں کوئی بچہ پیدا ہوتا اور وہ سیدنا علی ﷺ سے محبت نہ کرتا تو ہم پہچان لیتے کہ وہ ہمارا نہیں ہے۔

"نبور" "ن، ب اور "ر" سے کا معنیٰ ہے: ہم پرکھتے اور آزماتے تھے۔

جب صحابہ کرام ﷺ کے نزدیک اُن کی اولاد کی اصلیت کو پہچاننے کی کسوٹی ذاتِ مرتضوی تھی تو دورِ حاضر میں بھی یہی کسوٹی چلے گی اور اب ذاتِ مرتضوی کو تو کسی کے سامنے پیش کرنا مشکل ہے لیکن محبتِ مرتضوی کو کسوٹی

بنایا جا سکتا ہے، لہٰذا اب کسی بڑے سے بڑے عالم، شیخ الحدیث، شیخ التفسیر، پیر، سجادہ مشین وغیرہ کے لاکھوں مریدوں اور پیروں وغیرہ کی پیشانیوں پر سجدوں کے نشانات کو نہیں دیکھا جائے گا بلکہ اُس کے سامنے فضائل مرتضوی بیان کیے جائیں گے، اگر اُس کا مزاج بگڑنے لگے اور چہرے پر بارہ بجنے لگیں تو سمجھ لیجیے کہ بظاہر وہ کتنا ہی بڑا دین دار کیوں نہ ہو لیکن اُس کی اصل مشکوک ہے اور وہ حلالی نہیں ہے۔

قارئین کرام سے گزارش ہے کہ وہ اِس بات کو راقم الحروف کا غصہ یا طنز سمجھ کر اس سے صرف نظر نہ فرمائیں بلکہ یقین فرمائیں کہ یہ ایک حقیقت ہے جو قیامت تک کسوٹی کا کام دیتی رہے گی۔ چنانچہ مصنف رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۸۳۳ھ نے بھی اپنے دور میں اس حقیقت کو مجرب لکھا ہے۔ حدیث نمبر ۱۲ کے آخر میں مصنف کے ان الفاظ کو دوبارہ پڑھ لیجیے:

وهذا مشهور من قديم وإلى اليوم أنه ما يبغض علياً ﷺ إلا ولد زنا.

''اور یہ بات قدیم سے آج تک مشہور ہے کہ سیدنا علی ﷺ کے ساتھ ولد الزنا ہی بغض رکھتا ہے''۔

کسی پنجابی شاعر نے شاید ایسی ہی احادیث وآثار کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا ہے۔

نبی پاک نے علم دا شہر یارو! تے علی ولی اُوس شہر دا باب ہے جی

جیہڑا منے نہ حیدری رُتبے نوں، سمجھو اُو دا خمیر خراب ہے جی

مُبغضِ سیدنا علی ﷺ مفعول ہے

امام ابو السعادات ابن اثیر الجزری لکھتے ہیں:

وفي حديث جعفر الصادق: لا يحبنا ذو رحم منكوسة، قيل: هو المأبون لانقلاب شهوته إلى دبره.

ہم اِن الفاظ کا ترجمہ علامہ وحید الزماں کے الفاظ میں نقل کر رہے ہیں لیکن انہوں نے قوسین میں جو لفظ مفعول کی توضیح کی ہے اُسے نقل کرنے سے قاصر ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''امام جعفر صادق ﷺ نے فرمایا: ہم سے محبت نہیں رکھے گا جو اوندھا پڑا کرتا ہے، (یعنی مفعول)''۔

(النهاية في غريب الحديث لابن أثير الجزري ج٥ ص١٠١ مادة: نكس؛ مجمع بحار الأنوار ج٤ ص٨٠٦؛ لغات الحديث لوحيد الزمان ج٤ ص٤١٢)



سیدنا علی ؓ سے بغض یہودیت ہے

﴿۱۴﴾ وأخبرنا الحافظ أبوبكر بن المحب شيخنا مشافهة غير مرة، أخبرتنا أم محمد ابنة الكمال أحمد بمنزلها (بسفح قاسيون)أخبرنا أبو المظفر بن المنى في كتابه، أخبرنا محمد بن أبي بكر الحافظ، أخبرنا أبوسعيد محمد بن الهيثم بن محمد، أخبرنا أبو علي الطهراني، حدثنا أحمد بن موسیٰ، حدثنا محمد بن أحمد بن علي، حدثنا إسحاق بن محمد ابن الحسن الآبنوسي،سمعت مسروق بن المرزبان يقول:سمعت شريک بن عبدالله يقول:

إذا رأيت الرجل لايحب علي بن أبي طالب رضي الله عنه فَاعْلَمْ أن أصله يهودي.

﴿۱۴﴾ حضرت مسروق بن مرزبان فرماتے ہیں میں نے شریک بن عبداللہ ؓ کوفرماتے ہوئے سنا:

جب تم کسی شخص کودیکھو کہ وہ سیدنا علی بن ابی طالب ؓ سے محبت نہیں کرتا تو جان لوکہ اس کی بنیاد یہودی ہے۔

چونکہ سیدنا علی ؓ ہی خیبر شکن ہیں اورقلعۂ خیبر یہود کا بہت بڑا مرکز تھا، اس لیے یہود اور یہودنواز لوگ کبھی بھی سیدنا علی ؓ کے محب نہیں ہوسکتے۔

امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''حضرت جابر بن عبداللہ ؓ سے منقول ہے، وہ فرماتے ہیں: ہمیں رسول اللہ ﷺ نے خطبہ دیا تو میں نے آپ کوفرماتے ہوئے سنا: اے لوگو! جو شخص ہم اہل بیت سے بغض رکھے اللہ تعالیٰ اُسے قیامت کے دن یہودی اٹھائے گا، میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! اگرچہ وہ نماز پڑھے اورروزے رکھے؟ فرمایا: اگرچہ وہ نماز پڑھے اور روزے رکھے اور خود کو مسلمان گمان کرے''۔

(المعجم الأوسط ج۵ ص ۱۴،حدیث ۴۰۱۴)

حافظ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اس حدیث میں بعض راویوں کو میں نہیں جانتا''۔

(مجمع الزوائد ج۹ ص ۱۷۲،وط: ج۹ ص ۲۷۳،حدیث ۱۵۰۰۹)

احقر اس حدیث کی تحقیق کے درپے ہوا تو یہ موضوع ہی نکلی، چنانچہ ابن جوزی، محدث عقیلی، امام سیوطی اور

امام سخاوی وغیرہم سب نے اس کو موضوع قرار دیا ہے، اور کہا ہے کہ اس میں ایک شخص سدیف بن میمون کی غالی رافضی ہے۔

(كتاب الضعفاء للعقيلي ج٢ ص٥٥٥؛ اللآلي المصنوعة للسيوطي ج١ ص٣٧١؛ استجلاب ارتقاء الغرف للسخاوي ج٢ ص٦٠٥، ٦٠٦)

شیعہ لوگوں کے نزدیک یہ حدیث مقبول ہے لیکن چونکہ ہم اہلِ سنت میں اس حدیث کے موضوع ہونے پر معتدل اور غیر معتدل تمام محدثینِ اہلِ سنت متفق نظر آتے ہیں، لہٰذا یہ موضوع ہی ہے، اور اسے موضوع تسلیم کرنا چاہیے، اس لیے کہ "لِكُلِّ فَنٍّ رِجَالٌ" (ہر فن کے لیے مخصوص لوگ ہوتے ہیں) تاہم دوسری احادیث سے اس معنی کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ امام حاکم نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ سیدنا عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب ﷺ سے روایت کرتے ہیں:

أن رسول الله ﷺ قال: يا بني عبد المطلب إني سألت الله لكم ثلاثاً أن يثبت قائمكم وأن يهدي ضالكم وأن يعلّم جاهلكم وسألت الله أن يجعلكم جوداء نجداء رحماء، فلو أن رجلاً صفن بين الركن والمقام فصلّى وصام ثم لقي الله وهو مبغض لأهل بيت محمد دخل النار.

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے اولادِ عبدالمطلب! میں نے تمہارے لیے اللہ تعالیٰ سے تین دعائیں کی ہیں:

۱۔ تمہارے مومن کو ایمان پر ثابت قدم رکھے

۲۔ تمہارے گمراہ کو ھدایت دے

۳۔ اور تمہارے جاہل کو تعلیم دے

اور میں نے دعا مانگی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں سخی، بہادر اور رحم کرنے والا بنائے، پس اگر کوئی شخص رکن یمانی اور مقام ابراہیم کے مابین اہتمام کے ساتھ نماز پڑھے اور روزے رکھے پھر اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے کہ اہلِ بیتِ محمد (ﷺ) سے بغض رکھتا ہو تو وہ جہنم میں داخل ہوگا"۔

(المستدرك للحاكم ج٣ ص١٤٨، وط: ج٤ ص١٢٩، حديث٤٧٦٦، وط: ج٣ ص١٦١، حديث

٤٧١٢؛ كتاب السنة لابن أبي عاصم ص٦٢٨، حديث١٥٤٦؛ المعجم الكبير ج٥ ص٣١٩، حديث٤٩ ١١٢؛ المعجم الأوسط [عن عبدالله بن جعفر] ج٨ ص٣٧٣، حديث٧٧٥٧؛ شرف المصطفیٰ لأبي سعيد الخركوشي ج٥ ص٣١٦؛ ذخائر العقبیٰ ص٢٤؛ إحياء الميت بفضائل أهل البيت ص١٨، حديث١١، وص٢٢، حديث٢٠؛ الصواعق المحرقة ص١٧٤؛ جواهر العقدين ص ٣٣١؛ استجلاب ارتقاء الغرف للسخاوي ج٢ ص٦١٠، حديث٣٤٣؛ موسوعة آل بيت النبي المختار ﷺ ص٢٨)

حافظ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اس حدیث کو امام طبرانی نے اپنے شیخ محمد بن زکریا الغلابی سے روایت کیا ہے اور وہ ضعیف ہے، اور امام ابن حبان نے اس کو ''کتاب الثقات'' میں ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ جب یہ ثقہ راویوں سے روایت کرے تو اس کی حدیث معتبر مانی جاتی ہے، پس بلاشبہ اس کی روایت میں بعض مجہول راویوں سے مناکیر منقول ہیں۔ میں کہتا ہوں: اس نے سفیان ثوری ؓ سے روایت کیا ہے اور اس حدیث کے باقی راوی صحیح حدیث کے راوی ہیں''۔

(مجمع الزوائد ج٩ ص١٧١، وط: ج٩ ص٢٧٢، حديث١٥٠٠٦، وط: ج٩ ص١٩٤، حديث ١٥٠٠٦، وط: ج١٨ ص٤٧٥، حديث١٥٠٠٢)

امام زین الدین قاسم بن قاسم بن قطلو بغا حنفی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی لکھا ہے کہ جب یہ ثقہ راوی سے روایت کریں تو ان کی حدیث کو معتبر مانا جاتا ہے۔

(الثقات لابن قطلوبغا ج٨ ص٢٩٤)

امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو امام مسلم کی شرط کے مطابق حسن صحیح فرمایا ہے اور امام ذہبی نے ان کی موافقت فرمائی ہے، اور حافظ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ نے جو اس حدیث پر کلام کیا ہے یہ ان کی سبقتِ نظر ہے، چنانچہ المستدرک کے محقق شیخ ابو عبداللہ عبدالسلام بن محمد بن عمر علوش لکھتے ہیں:

''حافظ ہیثمی نے اس حدیث پر کلام کیا ہے حالانکہ اس میں کلام کی گنجائش نہیں ہے، شاید یہ اُن کی سبقتِ نظر کا نتیجہ ہے۔ میں کہتا ہوں: اسماعیل اور اس کے والد دونوں ثقہ ہیں، ان کے حافظہ میں کچھ کمی ہے لیکن اس کے باوجود اس حدیث کی تحسین ممکن ہے جیسا کہ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے

فرمایا ہے، اور "المستدرک" میں یہ اول مقام ہے جہاں حاکم نے کسی حدیث کی (تصحیح کے بجائے) تحسین کی ہے، واللہ اعلم"۔

(تعليقات: على المستدرك ج٤ ص١٢٩)

امام سخاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کے متعلق امام حاکم کی تصحیح کے قول کو مقرر رکھا ہے۔

(استجلاب ارتقاء الغرف ج٢ ص٦١٠)

سو جب صحیح حدیث سے ثابت ہو گیا کہ مبغضِ اہلِ بیت اگرچہ کعبہ معظمہ کا دائمی نمازی ہو تب بھی وہ جہنمی ہے تو اسے کافر، منافق، نصرانی اور یہودی جو بھی سمجھا اور کہا جائے سب درست ہے۔




علی رضی اللہ عنہ کو برا کہنا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو برا کہنا ہے

﴿١٥﴾ وأخبرنا الصلاح بن أحمد الإمام، أنا الفجر بن أحمد،أنا حنبل ،أنا هبة الله، أنا أبو علي، أنا ابن جعفر، ثنا عبد الله،حدثني أبي:أحمد بن محمد، ثنا يحيى بن أبي بكير، ثنا إسرائيل، عن أبي إسحاق عن أبي عبد الله الجدلي قال: دخلتُ على أم سلمة فقالت لي: أيسب رسول الله ﷺ فيكم؟ قلت:معاذ الله،أو سبحان الله،أو كلمة نحوها، قالت: سمعتُ رسولَ اللهِ ﷺ يقول:من سب علياً فقد سبني.

كذا رواه الإمام أحمد.

﴿١٥﴾ حضرت ابوعبداللہ الجدلی بیان کرتے ہیں: میں ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوا تو انہوں نے مجھے فرمایا: کیا تمہارے ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو برا کہا جاتا ہے؟ میں نے کہا: معاذ اللہ، سبحان اللہ یا ایسا ہی کوئی لفظ بولا تو انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے: جس نے علی کو برا کہا تو اُس نے مجھے برا کہا۔ ایسا ہی امام احمد نے روایت کیا ہے۔

(مسند أحمد ج٦ ص ٣٢٣،وط: ج٨ص٦٤٩،حديث ٢٧٢٨٤، وط: ج٤٤ ص٣٢٨،حديث ٢٦٧٤٨؛فضائل الصحابة ج٢ ص٧٣٦،حديث١٠١١؛السنن الكبرىٰ للنسائي ج٧ص٤٤١، حديث٨٤٢٢،وط: ج٥ ص ١٣٣ ،حديث ٨٤٧٦؛خصائص علي ص ١١١ ،حديث٩١؛المستدرك ج٣ص ١٢٠ ،حديث٤٦٧٣، ٤٦٧٤، ٤٦٧٦، ٤٦٧٧؛شرف المصطفىٰ ج٥ص ٥٠٢؛إتحاف الخيرة المهرة ج٧ص٢٠٢ ،حديث ٦٦٧٠،وط: ج٩ص ٢٦٧،حديث ٥٥٨٩؛ مجمع الزوائد ج ٩ ص ١٣٠،حديث ١٤٧٤٠؛تاريخ دمشق ج٤٢ ص٢٦٦؛مختصر تاريخ دمشق ج١٧ ص ٣٦٦؛ الرياض النضرة ج٤ ص ١٠٦؛سير أعلام النبلاء (سيرت) ص ٦٢٤؛البداية والنهاية ج٥ ص ٤٦٩، وط: ج٧ص٥٨٤؛مشكاة ج٢ ص ٥٠٥،حديث ٦١٠١؛الجامع الصغير حديث ٨٧٣٦؛ إزالة الخفاء ج٤ ص ٤٥٠؛مناقب علي والحسنين ص ٣٢؛السلسلة الصحيحة ج٣ ص٢٨٨)

امام حاکم نے اِس حدیث کو صحیح السند قرار دیا ہے اور امام ذہبی نے ان کی تائید فرمائی ہے۔

(المستدرك للحاكم ج٣ص ١٢٠)

حافظ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اس کے راوی صحیح حدیث کے راوی ہیں۔

(مجمع الزوائد ج٩ص ١٣٠، حديث ١٤٧٤٠، وط: ج٩ص ١٢٣، حديث ١٤٧٤٠)

علامہ ابو اسحاق الحوینی نے کہا: اس کی سند حسن ہے۔

(كتاب الحلي بتخريج خصائص علي ص٩٣)

علامہ ناصر الدین البانی کے نزدیک بھی یہ حدیث صحیح ہے۔

(السلسلة الصحيحة للألباني ج ٣ص٢٨٨)

کیا ابو عبداللہ الجدلی غالی شیعہ تھا؟

علامہ احمد میرین البلوشی نے کہا:

"اس سند کے تمام راوی ثقہ ہیں مگر ابو عبداللہ الجدلی غالی شیعہ ہے، امام ابوداود نے فرمایا: یہ مختار ثقفی کا پرچم بردار تھا"۔

(خصائص علي بتحقيق البلوشي ص١١١)

بخدا اُس وقت انتہائی دکھ ہوتا ہے جب کوئی شخص عمداً یا بلا سوچے سمجھے کسی راوی کے بارے میں یک طرفہ قول نقل کر دیتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں: کیا اگر کسی شخص نے یزیدیوں کا قلع قمع کرنے کی خاطر مختار ثقفی کا ساتھ دیا تھا تو فقط اسی سبب سے اُس کا شمار غالی شیعوں میں ہوگا؟ جبکہ یہ حقیقت بھی تاریخ کے طالب علم پر مخفی نہیں ہے کہ مختار ثقفی نے آخر میں جا کر دعوائے نبوت کیا تھا، لیکن اس کو بھی پراپیگنڈا کہا گیا ہے، بہرحال شروع شروع میں اُس کا نعرہ فقط شہداء کربلاء کے دشمنوں سے انتقام کا تھا، جس میں بڑے بڑے مخلص اور سچے مسلمان اُس کے ہمنوا ہو گئے تھے، حتیٰ کہ بعض صحابہ کرام ﷺ بھی اُس کے لشکر میں شریک ہو گئے تھے اور انہوں نے چن چن کر تمام قاتلین شہداءِ کربلاء کو فی النار کیا تھا، مثلاً شمر ذی الجوشن، خولی بن یزید، عمرو بن سعد اور عبیداللہ بن زیاد وغیرہم۔ نیز یہ حقیقت بھی کتاب وسنت کے کسی طالب پر مخفی نہیں کہ کبھی اللہ تعالیٰ اپنے دین کی تقویت کا کام ظالم وفاجر قسم کے لوگوں سے بھی لے لیتا ہے۔ چنانچہ کبھی لشکر میں بے دین لوگ شامل ہو جاتے ہیں اور بہادری سے لڑ کر اسلام کی سربلندی کا سبب بن جاتے ہیں، حتیٰ کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ امیر لشکر بے ایمان ہوتا ہے مگر اُس کے لشکر میں مخلص لوگ شامل ہوتے ہیں اور ہدف ونیت دونوں کی یکساں نہیں ہوتی، امیر لشکر کا ہدف حصولِ اقتدار یا دوامِ اقتدار ہوتا ہے اور فوجی کا ہدف مذہب

وملک کا دفاع ہوتا ہے، اور شروع سے ہر فوجی کے اندر جذبہ ہی یہی پیدا کیا جاتا ہے، کبھی بھی کوئی خودغرض سربراہ اپنی فوج پر اپنی ذاتی منفعت ظاہر نہیں کیا کرتا۔ مختار ثقفی کا باطن کسی پر عیاں نہیں ہوا تھا سارے لوگ اُس کے ظاہری نعرے کو مدنظر رکھتے ہوئے اُس کے دست وباز دبن گئے تھے۔ حضرت ابوعبداللہ الجدلی ہوں یا اُن سے بھی بڑے لوگ سب کے سب شہداء کربلاء کے مقدس انتقام کے جذبہ سے سرشار تھے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ اس کے متعلق شدید تشیع اور مختار کے فوجی ہونے کے اعتراض پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں کہتا ہوں: ابن زبیر ﷺ نے سیدنا محمد بن الحنفیہ ﷺ کو اپنی بیعت کی دعوت دی تو انہوں نے انکار کر دیا، اس پر ابن زبیر نے انہیں محصور کر دیا اور اُن کو اور اُن کے ساتھیوں کو خوف زدہ کیا، یہ خبر مختار کو پہنچی جو اس وقت کوفہ کا سربراہ تھا تو اُس نے مکۃ المکرمہ کی طرف حضرت ابوعبداللہ الجدلی کی سرپرستی میں ایک لشکر بھیجا، اُس لشکر نے حضرت محمد بن الحنفیہ ﷺ کو قید سے نکالا۔ سیدنا محمد بن الحنفیہ ﷺ نے لشکر کو حرم شریف میں قتال سے منع فرمایا۔ [۱] پس اس وجہ سے علماء اسماء الرجال نے ابوعبداللہ الجدلی کو اور سیدنا ابوالطفیل (عامر بن واثلہ صحابی ﷺ) کو بھی آڑے ہاتھوں لے لیا کہ یہ اُس لشکر میں شامل تھے، حالانکہ یہ شمولیت اُن دونوں پر اعتراض کا سبب نہیں ہوسکتی۔ إن شاء اللہ تعالی''.

(تھذیب التھذیب ج ۱۰ ص ۱۷۱)

یہ انتہائی فہم وتدبر پر مبنی تجزیہ ہے، اس کے برعکس جتنے بھی بلاتدبر مختصر اقوال نقل کیے گئے ہیں سب حقیقت کے خلاف ہیں۔ ''میزان الاعتدال'' کے درج ذیل الفاظ بھی اسی عدم تدبر کے زمرہ میں آتے ہیں۔ امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

أبو عبد اللہ الجدلي شیعي بغیض، قال الجوزجاني: کان صاحب رایة

---

[۱] اللہ اکبر! ہاشمی اور مرتضوی خون کی تاثیر دیکھئے! ہاشمی فرزند نے قید میں ہونے کے باوجود اپنی حمایت میں آنے والے لشکر کو حرم میں قتال سے منع فرمادیا، جبکہ بعض غیر ہاشمی حکمران تختِ سلطنت پر بیٹھے ہوئے حرم مکہ تو کیا خود بیت اللہ پر بھی حملہ سے باز نہ آئے، اور مسجدِ نبوی پر بھی چڑھائی کردی حتی کہ اُس میں مسلسل تین روز تک اذان ونماز معطل رہی۔ سچ ہے کہ جس کی چیز ہوتی ہے اُسی کو احساس ہوتا ہے، اور یہ بھی حق ہے کہ ''کُلُّ إِنَاءٍ یَنْضَحُ بِمَا فِیْهِ'' (ہر برتن سے وہی نکلتا ہے جو اُس میں ہو)۔

المختار، وقد وثقه أحمد.

"ابوعبداللہ الجدلی بغض رکھنے والا شیعہ تھا، جوزجانی نے کہا: یہ مختار کا پرچم بردار تھا اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ثقہ (معتبر راوی) قرار دیا ہے"۔

(میزان الاعتدال ج۷ص ۳۹۰)

جوزجانی کی محبانِ اہل بیت پر جرح

امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کا حضرت ابوعبداللہ الجدلی کو "شیعي بغیض" کہنا مبہم جرح ہے۔اگر یہ بات انہوں نے جوزجانی کے قول کو مدنظر رکھتے ہوئے کہی ہے تو علماء اسماء الرجال کے نزدیک جوزجانی کی جرح کا قول کسی بھی کوفی اور محبِ اہل بیت شخص کے خلاف قبول نہیں ہے۔کیونکہ جوزجانی ناصبی (دشمنِ اہل بیت) ہے۔اس کی عادت ہے کہ یہ جس روایت میں کسی محبِ اہل بیت یا کوئی شخص کو دیکھتا ہے تو فوراً کہہ دیتا ہے کہ "یہ حق سے منحرف تھا، شیعہ تھا یا رافضی تھا" جوزجانی کا نام ابراہیم بن یعقوب ہے اور اس کی کنیت ابواسحاق ہے۔یہ بہت بڑا محدث اور حفاظ مصنفین میں سے تھا مگر سیدنا علی ﷺ اور اُن کے محبینِ کرام کا سخت ترین دشمن تھا۔علماء اسماء الرجال نے متعدد مقامات پر اس کی شدت کا ذکر فرمایا ہے۔چنانچہ اسماعیل بن ابان الوراق الکوفی کی امام نسائی، محدث مطین، یحییٰ بن معین، ابواحمد الحاکم، جعفر الصائغ، دارقطنی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم نے تعدیل فرمائی ہے مگر جوزجانی کو وہ راوی پسند نہیں۔چنانچہ حافظ رحمۃ اللہ علیہ ابن ابان کے حالات میں لکھتے ہیں:

قال الجوزجاني: كان مائلاً عن الحق ولم يكن يكذب في الحديث. قال ابن عدي: يعني ما عليه الكوفيون من التشيع. قلتُ: الجوزجاني كان ناصبياً منحرفاً عن علي، فهو ضد الشيعي المنحرف عن عثمان، والصواب موالاتهما جميعاً، ولا ينبغي أن يسمع قول مبتدع في مبتدع.

"جوزجانی نے کہا: وہ حق سے منحرف تھا لیکن حدیث کے معاملہ میں جھوٹا نہیں تھا۔امام ابن عدی فرماتے ہیں: یعنی کوفیوں کے مذہب تشیع (حب اہل بیت) پر تھا۔میں کہتا ہوں: جوزجانی ناصبی تھا، سیدنا علی ﷺ سے منحرف تھا، ناصبیت شیعیت کی ضد ہے، شیعی حضرت عثمان غنی ﷺ سے منحرف ہوتا ہے، اور بھلائی سب کی محبت میں ہے، اور کسی بدعتی کی بات دوسرے بدعتی کے متعلق

نہیں سننا چاہیے‘‘۔

(هدي الساري ص٥٥٢، وط: ص١٠٢١، وط: ص٥٢١؛ قواعد في علوم الحديث ص٣٩٩، ٤٤٠)

حافظ رحمہ اللہ مقدمہ ”لسان المیزان“ میں بعض اہم امور کی نشاندہی میں جوزجانی کی محبانِ اہل بیت کے بارے میں شدت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فإن الحاذق إذا تأمل ثلب أبي إسحاق الجوزجاني لأهل الكوفة رأي العجب، وذلک لشدة انحرافه في النصب وشهرة أهلها في التشيع، فتراه لايتوقف في جرح من ذكره منهم بلسان ذلق وعبارة طلقة.

’’ماہر شخص جب اہل کوفہ کے بارے میں ابواسحاق جوزجانی کی زبان درازی میں غور کرے گا تو عجیب پائے گا، یہ اس لیے کہ وہ اہل بیت کی شدید دشمنی میں حق سے منحرف تھا جبکہ اہل کوفہ کی تشیع (حب اہل بیت) میں شہرت تھی، لہٰذا تم دیکھو گے کہ وہ کوئی شخص کے ذکر میں بلاتوقف بے لگام زبان اور آزاد عبارت استعمال کرے گا‘‘۔

(لسان الميزان ج١ ص٢٣، وط: ج١ ص٢١٢)

امام ابن عدی، امام ذہبی اور امام مغلطائی حنفی رحمۃ اللہ علیہم لکھتے ہیں:

الجوزجاني كان مقيماً بدمشق، وكان شديد الميل إلى مذهب أهل دمشق في التحامل على علي ﷺ، فقوله في إسماعيل: مائل عن الحق يريد به ماعليه الكوفيون من التشيع.

’’جوزجانی دمشق کا باشندہ تھا اور سیدنا علی ﷺ کے ساتھ بغض رکھنے میں اہل دمشق کے رویہ کی طرف شدید میلان رکھتا تھا، اسماعیل کے بارے میں اُس کے قول ”مائل عن الحق“ (وہ حق سے اترا ہوا تھا) سے اس کی مراد یہ ہے کہ وہ کوفیوں کے مذہب تشیع (حب علی) پر تھا‘‘۔

(الكامل ج١ ص٥٠٦؛ ميزان الاعتدال ج١ ص٢٠٥؛ كتاب السلسبيل للذهبي ص٩٧؛ إكمال تهذيب الكمال، لابن قطلوبغا ج١ ص٢٩٢)

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ عاصم بن ضمرہ کے حالات میں لکھتے ہیں:

تعصب الجوزجاني على أصحاب علي معروف.

''سیدنا علیؓ کے محبین کے خلاف جوز جانی کا تعصب معروف ہے''۔

(تهذيب التهذيب ج٤ ص١٣٨)

جوز جانی نے حضرت ابان بن تغلب کوفیؒ کے بارے میں یوں بھڑاس نکالی:

زائغ مذموم المذهب مجاهر.

''وہ بھٹکا ہوا، علی الاعلان بدمذہب تھا''۔

تو اس پر حافظ رحمہ اللہ نے فرمایا:

وأما الجوزجاني فلا عبرة بحطه على الكوفيين.

''کوفیوں پر جوز جانی کی جرح کا کوئی اعتبار نہیں''۔

(تهذيب التهذيب ج١ ص١١٨؛ الرفع والتكميل ص٣٠٨)

منھال بن عمرو الکوفی کے بارے میں جوز جانی نے کہا: ''كان سيىء المذهب'' (وہ بدمذہب تھا) اس پر حافظ رحمہ اللہ نے فرمایا:

قد قلنا غير مرة: إن جرحه لا يقبل في أهل الكوفة لشدة انحرافه ونصبه.

''ہم کئی بار کہہ چکے ہیں کہ اس کی شدید ناصبیت اور اہل بیت سے انحراف کی وجہ سے اہل کوفہ کے خلاف اس کی جرح قابلِ قبول نہیں''۔

(هدي الساري مقدمة فتح الباري ص٦٢٣، وط: ص١١٩٨)

حضرت عبداللہ بن عمر کے غلام حضرت ابو یحییٰ مصدع الاعرج المعرقبؒ کے بارے میں جوز جانی نے یوں بھڑاس نکالی:

كان زائغاً حائداً عن الطريق.

''بھٹکا ہوا، راہِ راست سے ہٹا ہوا تھا''۔

(أحوال الرجال للجوزجاني ص١٤٤ رقم الترجمة ٢٤٩؛ الكامل لابن عدي ج٨ ص٢٣٠)

اس پر حافظ رحمہ اللہ نے فرمایا:

الجوزجاني مشهور بالنصب والانحراف فلا يقدح فيه قوله.

''جوز جانی ناصبیت اور (اہل بیت سے) انحراف میں مشہور ہے، لہٰذا اُس کا قول اِس راوی کا

کچھ نہیں بگاڑ سکتا"۔

(تهذيب التهذيب ج٨ص١٨٦)

ابو یحییٰ مصدع کو "مُعَرْقَب" کہنے کی وجہ

یہاں آپ یہ بھی جانتے چلئے کہ اِس ناصبی کے نزدیک حضرت مصدع کے مذھب میں خامی کیا تھی جو کہ اُن کے "مُعَرْقَب" ہونے کا سبب بنی۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

إنما قيل له المعرقب لأن الحجاج أوبشر بن مروان عرض عليه سبّ علي فأبى فقطع عرقوبه. قال ابن المديني: قلتُ لسفيان: في أي شيء عُرقِب؟ قال: في التشيع.

"انہیں "مُعَرْقَب" اس لیے کہا گیا کہ اُن سے حجاج یا بشر بن مروان نے سیدنا علی المرتضیٰ کی تنقیص کرانا چاہی تو اُنہوں نے انکار کردیا، اس پر اُن کے عرقوب (پاؤں کے ٹخنوں کے اوپر کے پٹھے) کاٹ دیے گئے۔ امام ابن المدینی فرماتے ہیں: میں نے سفیان سے پوچھا: اُن کے پٹھے کیوں کاٹے گئے؟ فرمایا: حبِ اہل بیت میں"۔

(تهذيب التهذيب ج٨ص١٨٦؛ كتاب الضعفاء للعقيلي ج٤ص١٤٠٤؛ إكمال تهذيب الكمال للمغلطائي ج٦ص٢٥٦)

اس عبارت میں "تَشَيُّع" سے مراد آج کل کی نام نہاد شیعیت (یعنی رافضیت) نہیں بلکہ محض حُبِّ اہل بیت ہے، کیونکہ حضرت مصدع تابعی ہیں اور ان کا شمار شیعۂ اولیٰ میں ہوتا ہے جو خالص اہل سنت تھے، جیسا کہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے تصریح فرمائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے علماء اسماء الرجال نے اس "تَشَيُّع" کو حب مرتضوی سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ مشہور محدث عجلی اور حافظ علاؤ الدین مغلطائی حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

عرقبه بشر بن مروان لحبه علي بن أبي طالب.

"بشر بن مروان نے سیدنا علی بن ابی طالب کی محبت کی پاداش میں اُن کے پٹھے کاٹے تھے"۔

(معرفة الثقات ج٢ص٢٨٠؛ إكمال تهذيب الكمال للمغلطائي ج٦ص٢٥٦)

علمِ حدیث میں جوزجانی کا مقام

خیال رہے کہ جوزجانی بہت بڑا محدث تھا حتیٰ کہ امام احمد بن حنبل، امام نسائی اور امام ابوداود رحمۃ اللہ علیہم کے مشائخ میں اس کا شمار ہوتا ہے مگر اس کے باوجود بہت بڑا بدبخت تھا۔ چنانچہ امام ابن عساکر دمشقی اور امام ابن منظور افریقی لکھتے ہیں:

''یہ منبر پر بیٹھ کر حدیث بیان کرتا تھا اور امام احمد بن حنبل اس کی حدیث لکھتے تھے، یہ جلی حروف میں لکھواتا اور منبر پر بیٹھ کر پڑھتا، اور یہ سیدنا علی ﷛ پر طعن میں اہل شام کے مذہب کی طرف شدید طور پر مائل تھا۔ امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ ایک عرصہ مکہ میں رہا، ایک مدت رملہ میں قیام کیا اور کچھ وقت بصرہ میں رہا، اور یہ حفاظ مصنفین اور ثقہ محدثین میں سے تھا لیکن اس کے مزاج میں سیدنا علی بن ابی طالب ﷛ سے انحراف تھا۔ ایک مرتبہ اس کے دروازے پر محدثین کی ایک جماعت آئی تو یہ باہر آیا، پھر اس کی لونڈی ایک چوزہ لے کر باہر نکلی تاکہ اسے ذبح کرائے لیکن اُسے ذبح کرنے والا کوئی نہ ملا تو وہ کہنے لگا: سبحان اللہ! مرغی کو ذبح کرنے والا نہیں پایا گیا جبکہ علی نے دن دہاڑے بیس ہزار سے زائد افراد ذبح کر دیے تھے''۔

(تاریخ دمشق ج۷ص۲۸۱؛ مختصر تاریخ دمشق ج٤ص۱۸۲؛ إكمال تهذيب الكمال لمغلطائي ج۱ص۲۹۲؛ تهذيب التهذيب ج۱ص۱۹۹)

جوزجانی کا حریزی المذھب ہونا

اس کی اس تعریض سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جس جنگ کی طرف اشارہ کر رہا ہے اس میں وہ مکمل قصوروار سیدنا علی ﷛ کو سمجھتا ہے، کیونکہ اس نے تمام تر کشت وخون کا ذمہ دار سیدنا علی ﷛ کو ٹھہرایا ہے، معاذ اللہ! اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک سیدنا علی ﷛ کا مدمقابل حق پر تھا اور سیدنا علی ﷛ اُس مدمقابل کے باغی تھے۔ افسوس! آج بھی اُس بدبخت محدث کی طرح بڑے بڑے علم کے دعویدار اس کے خبیث نظریہ کے حامل پائے جاتے ہیں۔ نعوذ باللہ من شرهم.

امام مغلطائی اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہما نے لکھا ہے کہ ''یہ حریزيُ المذهب تھا''۔

(إكمال تهذيب الكمال ج۱ص۲۹۲؛ تهذيب التهذيب ج۱ص۱۹۹)

حریزيُ المذھب کا مطلب ہے کہ جوزجانی حریز بن عثمان کے مذھب پر تھا۔حریز بن عثمان کا علم حدیث میں بڑا مقام ہے لیکن وہ بدبخت بھی سیدنا علی علیہ السلام پر (معاذاللہ) لعنت کرتا تھا اور کہتا تھا کہ انہوں نے میرے آباءواجداد کو قتل کیا تھا۔حریز بن عثمان کا کچھ تعارف آئندہ صفحات میں حدیث "أنا مدينة العلم وعليّ بابها" کی تحقیق کے ضمن میں آئے گا۔إن شاء الله تعالىٰ.

امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ سے شامیوں کے بغض کا سبب

یہ دشمنی چند کوفیوں سے نہیں بلکہ اکثر کوفیوں کے ساتھ تھی حتیٰ کہ امام الائمہ، سراج الامۃ امام اہل سنت، شہید اہل بیت سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی تھی۔چنانچہ امام موفق بن احمد بن محمد المکی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے اپنے لوگوں سے دریافت فرمایا:

أوَ تدرون لِمَ يبغضنا أهل الشام ؟ قلنا: لا، قال: لأنّا لو شهدنا عسكر علي بن أبي طالب ومعاوية لكنا مع علي رضي الله عنه على معاوية.

"کیاتم جانتے ہو کہ اہل شام ہمارے ساتھ بغض کیوں رکھتے ہیں؟ ہم نے عرض کیا: نہیں، فرمایا: اس لیے کہ اگر ہم حضرت علی بن ابی طالب اور معاویہ کے لشکر کے وقت موجود ہوتے تو معاویہ کے خلاف سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیتے"۔

(مناقب أبي حنيفة للموفق المكي ص ٢٥٩، وط: ج٢ ص٨؛ مناقب الإمام الأعظم لابن البزاز الكردري بهامش مناقب المكي ج١ ص٢٦٤؛ كتاب الاعتقاد للقاضي صاعد بن محمد النيسابوري ص١٩١)

نہ صرف یہ کہ امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کو عام شامی مبغضینِ اہل بیت سے عداوت کا سامنا تھا بلکہ انہیں اپنے ماقبل یا مابعد مگر جوزجانی ایسے شقی قسم کے محدثین کی عداوت کا بھی خدشہ تھا۔چنانچہ امام موفق المکی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ امام صاحب نے اپنے تلامذہ سے دریافت فرمایا:

أوَ تدرون لِمَ يبغضنا أهل الحديث؟ قلنا: لا، قال: لأنّا نحب أهل بيتِ رسول الله ﷺ ونقرُّ بفضائلهم.

"کیاتم جانتے ہو کہ ارباب حدیث ہمارے ساتھ بغض کیوں رکھتے ہیں؟ ہم نے عرض کیا: نہیں۔

فرمایا: اس لیے کہ ہم اہل بیت رسول ﷺ سے محبت کرتے ہیں اور اُن کے فضائل کا اعتراف کرتے ہیں"۔

(مناقب أبي حنيفة للموفق المكي ص ٢٥٩، وط: ج٢ ص٨؛ مناقب الإمام الأعظم لابن البزاز الكردري بهامش مناقب المكي ج١ ص ٢٦٤)

افسوس کہ فضائل اہل بیت کرام علیہم السلام کو مقرر رکھنا اور بیان کرنا، امام اعظم ایسے متقی حضرات سے نفرت کا سبب تھا۔ خیال رہے کہ حبِّ اہل بیت کا یہ "جرم" سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ ﷺ تادم آخر کرتے رہے، حتیٰ کہ یہی گناہ اُن کے وصالِ اقدس کا سبب ثابت ہوا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں کتاب "امام اعظم ابوحنیفہ شہید اھلِ بیت" یہ بعض علماء دیوبند کی تصنیف ہے، پڑھنے کی چیز ہے، اور لاہور سے شائع ہوئی ہے۔

افسوس کہ ہمارے بعض محدثین کرام نے مروان ملعون اور دوسرے نواصب سے تو احادیث لی ہیں مگر ائمہ اہل بیت ﷺ اور اُن کے تلامذہ جیسا کہ امام اعظم ابوحنیفہ ﷺ اور دوسرے محدثین سے حدیث لینا مناسب نہیں سمجھا۔




منبروں پر رسول اللہ ﷺ کی برائی

مصنف رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

﴿۱۶﴾ ورواه أبو يعلىٰ الموصلي: عن عبد الله بن موسىٰ، عن عيسىٰ بن عبد الرحمن البجلي من بجلية من سليم، عن السدي، عن أبي عبد الله الجدلي قال: قالت لي أم سلمة: أيسب رسول الله ﷺ فيكم على المنابر؟ قال: قلت: وأنى ذلك؟ قالت: أليس يسب علي ومن أحبه، وأشهد أن رسول الله ﷺ كان يحبه.

﴿۱۶﴾ حضرت ابوعبداللہ الجدلی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے مجھے فرمایا: کیا تمہارے ہاں منبروں پر رسول اللہ ﷺ کو برا کہا جاتا ہے؟ وہ کہتے ہیں: میں نے عرض کیا: یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ فرمایا: کیا علی اور اُن سے محبت کرنے والوں کو برا نہیں کہا جاتا؟ میں گواہی دیتی ہوں کہ رسول اللہ ﷺ اُن سے محبت فرماتے تھے۔

(المعجم الكبير ج١٠ ص٨١، حديث١٩٢٠٢، وط: ج٢٣ ص٣٢٢، حديث٧٣٧؛ المعجم الأوسط ج٦ ص٣٨٩، حديث٥٨٢٨؛ الروض الداني إلى المعجم الصغير للطبراني ج٢ ص٨٣، حديث ٨٢٢؛ مسند أبي يعلىٰ ج٦ ص١١٩، حديث٦٩٧٧، وط: ج١٢ ص٤٤٤، حديث٧٠١٣؛ إتحاف الخيرة المهرة ج٩ ص٢٦٧، حديث٨٩٥٥؛ البداية والنهاية ج٧ ص٥٨٤؛ مجمع البحرين للهيثمي ج٣ ص٣٨٢، حديث٣٧٠٥؛ فضائل علي بن أبي طالب لسامي أنور جاهين ص١٤٧)

حافظ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"اس حدیث کو امام طبرانی نے معاجم ثلاثہ میں روایت کیا ہے اور امام ابویعلیٰ نے مسند میں روایت کیا ہے اور امام طبرانی کے تمام راوی صحیح حدیث کے راوی ہیں، ماسوا ابوعبداللہ کے اور وہ بھی ثقہ ہے"۔

(مجمع الزوائد ج٩ ص١٢٩، حديث١٤٧٤١، وط: ج٩ ص١٢٣، حديث ١٤٧٤١، وط: ج ١٨ ص ٣٠٠، حديث١٤٧٤٢)

مجمع البحرين في زوائد المعجمين للهيثمي کے محقق شیخ محمد حسن اسماعیل الشافعی نے لکھا ہے

کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔

(مجمع البحرين للهيثمي ج٣ ص٣٨٢)

یہ برائی کس دور میں کی جاتی تھی؟

اس حدیث میں ہے کہ حضرت ابوعبداللہ الجدلی ﷺ سے سیدتنا ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے دریافت فرمایا کہ تمہارے ہاں رسول اللہ ﷺ کو منبروں پر برا کہا جاتا ہے؟ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کس دور کی بات ہے؟ جواباً عرض ہے کہ سیدتنا ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا وصال اکسٹھ [۶۱ھ] کے آخر میں سیدنا امام عالی مقام علیہ السلام کی شہادت کی خبر آنے کے بعد ہوا، اور دوسرے قول کے مطابق باسٹھ [۶۲ھ] میں ہوا۔ ساٹھ [۶۰ھ] کے آخر میں یزید بن معاویہ بن ابوسفیان کی ملوکیت شروع ہوئی تھی اور اسی سال میں اس کے والد کی وفات ہوئی تھی، لہٰذا اگر اس سبّ و شتم کے متعلق ام المومنین کا سوال ملوکیتِ معاویہ کے بعد کا ہو تو پھر یہ دورِ یزید میں ہوگا اور اگر اس کو دورِ یزید سے ماقبل کے دور میں مانا جائے تو یہ بھی عقلاً ونقلاً درست ہے۔ اس لیے کہ یزید کے دور سے پہلے بھی یہ سبّ و شتم کیا جاتا تھا اور یزید کو یہ سبّ و شتم سابقہ حکومت سے بطور ورثہ ملا تھا۔ سابقہ حکومت میں یہ مکروہ عمل انتہائی عروج پر تھا اور مسجد نبوی کے منبر سمیت تمام منبروں پر سیدنا علی علیہ السلام پر سبّ و شتم کیا جاتا تھا، جس میں سربراہِ مملکت سمیت تقریباً تمام گورنرز وغیرہ پورا پورا حصہ لیتے تھے، کوئی پیچھے نہیں رہتا تھا، اور اگر اس عمل میں کوئی شخص سستی کا مظاہرہ کرتا تو اس سے باز پرس ہوتی کہ تم کیوں نہیں ایسا کرتے؟ جیسا کہ صحیح مسلم شریف وغیرہ کتب حدیث میں اس بات کی تصریح موجود ہے۔ مکمل اور باحوالہ تفصیل وتحقیق کے لیے احقر کی کتاب ''شرح خصائص علي ﷺ'' میں حدیث نمبر ۱۰۹، ۹۸، ۹۹ کی تشریح ملاحظہ فرمائیں۔



یہ جھوٹ ہے کہ مجھ سے محبت اور تجھ سے عداوت

﴿۱۷﴾ وقد روي من غير وجه،عن أم سلمة، وورد أيضاً من حديثها وحديث أبي سعيد وجابر،أنه ﷺ قال لعلي:

كذب من زعم أنه يحبني ويبغضك.

﴿۱۷﴾ اور یہ حدیث سیدہ ام سلمہ سے ایک اور طریقہ سے بھی روایت کی گئی ہے، نیز اُن سے اور حضرت ابوسعید خدری اور جابر بن عبداللہؓ سے بھی منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سیدنا علیؑ سے فرمایا: وہ شخص جھوٹا ہے جو مجھ سے محبت کا دعویدار ہے اور تجھ سے بغض رکھتا ہے۔

حدیثِ ابوعبداللہ الجدلی کے شواہد

مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "یہ حدیث سیدہ ام سلمہ سے ایک اور طریقہ سے بھی روایت کی گئی ہے"۔ اس سے مصنف کا مقصود اس حدیث کے متابع کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ لہٰذا یہاں ہم اس حدیث کے بعض متابع پیش کر رہے ہیں۔

مولیٰ علیؑ کو برا کہنا خدا کو برا کہنا

۱۔ امام ابوعبداللہ الحاکم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

حدثنا أبو جعفر أحمد بن عبيد الحافظ بهمدان،ثنا أحمد بن موسىٰ بن إسحاق التميمي،ثنا جندل بن والق،ثنا بكير بن عثمان البجلي قال: سمعتُ أبا إسحاق التميمي يقول:سمعت أبا عبدالله الجدلي يقول: حججتُ وأنا غلام فمررت بالمدينة وإذا الناس عنق واحد فاتبعتهم فدخلوا علىٰ أم سلمة زوج النبي صلى الله عليه وآله وسلم، فسمعتها تقول:ياشبيب [شبث]بن ربعي! فأجابها رجل خلف جاف:لبيك ياأمتاه! قالت:يُسَبُّ رسولُ الله صلى الله عليه وآله وسلم في ناديكم، قال:وأنّىٰ ذلك؟ قالت:فعلي بن أبي طالب، قال: إنا لنقول أشياء نريد عرض الدنيا، قالت:فإني سمعتُ رسولَ الله صلى الله

عليه وآله وسلم يقول: من سب علياً فقد سبني، ومن سبّني فقد سب الله تعالیٰ.

''ابواسحاق تمیمی بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابوعبداللہ الجدلی کو بیان کرتے ہوئے سنا: میں نے حج کیا اور اس وقت میں لڑکا تھا، پس ہم مدینہ مقدسہ سے گذرے تو سب لوگ یکجان تھے تو میں بھی اُن کے پیچھے چلتا رہا، پھر لوگ نبی کریم ﷺ کی زوجہ محترمہ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئے تو میں نے سنا وہ فرما رہی تھیں: اے شبیب [شبث] بن ربعی! تو ایک شخص نے پردہ کے پیچھے سے جواب دیا: لبیک یا أمي! فرمایا: تمہارے درمیان بآواز بلند رسول اللہ ﷺ پر سب وشتم کیا جاتا ہے؟ اُس نے عرض کیا: یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ فرمایا: تو کیا علی بن ابوطالب کو برا نہیں کہا جاتا؟ اُس نے عرض کیا: ہاں یہ ہم کچھ دنیوی مفادات کی خاطر کہا کرتے ہیں۔ فرمایا: بلاشبہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا تھا: جس شخص نے علی ؑ کو برا کہا تو یقیناً اُس نے مجھے برا کہا اور جس نے مجھے برا کہا تو اُس نے اللہ تعالیٰ کو برا کہا''۔

(المستدرك ج٣ص١٢٠ وط: ج٤ ص٨٨، حديث ٤٦٧٤؛ تاريخ دمشق ج٤٢ ص٥٣٣؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٨ ص٨٣)

۲۔ امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

حدثنا أحمد بن رشدين، قال: حدثنا يوسف بن عدي الكوفي، قال: حدثنا عمرو بن أبي المقدام، عن يزيد بن أبي زياد، عن عبد الرحمان ابن أخي زيد بن أرقم، قال: دخلت علىٰ أم سلمة أم المؤمنين، فقالت: من أين أنتم؟ فقلت: من أهل الكوفة، فقالت: أنتم الذين تشتمون النبي ﷺ؟ قلتُ: ماعلمنا أحداً يشتم النبي ﷺ. قالت: بلىٰ، أليس تلعنون علياً؟ وتلعنون من يحبه، وكان رسول الله يحبه.

''حضرت زید بن ارقم کے بھتیجے حضرت عبدالرحمان ؓ بیان کرتے ہیں کہ میں ام المومنین ام سلمہ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوا تو انہوں نے فرمایا: تم کہاں کے باشندے ہو؟ میں نے عرض کیا: کوفہ کا۔ فرمایا: وہ تم ہو جو نبی کریم ﷺ کو سبّ وشتم کرتے ہو؟ میں نے عرض

کیا: ہم کسی ایسے شخص کو نہیں جانتے جو رسول اللہ ﷺ کو سب و شتم کرتا ہو۔ فرمایا: کیوں نہیں، کیا تم علی رضی اللہ عنہ پر لعنت نہیں کرتے اور اُن کے محبین پر لعنت نہیں کرتے؟ حالانکہ رسول اللہ ﷺ انہیں محبوب رکھتے تھے"۔

(المعجم الأوسط ج١ص٢٢٨،حديث٣٤٦؛مجمع البحرين في زوائد المعجمين ج٣ص٣٨٢، حديث٣٧٠٦؛تاريخ دمشق لابن عساكرج٤٢ص٢٦٦)

۳۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے یہ حدیث حضرت قیس بن حازم نے بھی روایت کی ہے۔

(تاريخ دمشق لابن عساكرج٤٢ص٢٦٧)

حدیثِ ابوعبداللہ الجدلی کے شواہد میں پیش کردہ اِن احادیث سے معلوم ہوا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو برا کہنا حضور ﷺ کو برا کہنا ہے اور حضور ﷺ کو برا کہنا خود اللہ ﷻ کو برا کہنا ہے، اور بغضِ مرتضوی میں اس حد تک جانے والا انسان مسلمان نہیں ہو سکتا۔

حدیثِ جابر و ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما

حدیث نمبر[۱۷] کے تحت مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ حدیث "حضرت ابوسعید خدری اور جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے" حدیث ابوسعید تو خود مصنف نے نقل فرما دی ہے اور حدیث ام سلمہ اور جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کو امام ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہم نے اپنی سند سے نقل کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں ہمارے ہاں تشریف لائے درآنحالیکہ آپ نے سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کو پکڑ رکھا تھا، پس نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کیا تم گمان کرتے ہو کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا: کیوں نہیں یا رسول اللہ! فرمایا:

كذب من زعم أنه يحبني ويبغض هذا.

"وہ شخص جھوٹا ہے جو مجھ سے محبت کرے اور اس سے بغض رکھے"۔

یہ حدیث امام ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے چار سندوں سے روایت کی ہے، دو سندیں حضرت جابر سے، ایک سند حضرت ام سلمہ سے اور ایک سند حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے ہے، اور یہ وہی ہے جو اوپر متن میں آ چکی

ہے۔

(تاریخ دمشق ج٤٢ ص٢٢٦٨، الإيماء إلىٰ زوائد الأمالي والأجزاء ج٢ ص٢٢٦، حدیث١٣٥٨)

حدیثِ ھٰذا پر ابن کثیر کا اعتراض

مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث نمبر[١٧] کی سند و متن کا مکمل پیراگراف حافظ ابن کثیر کے الفاظ میں نقل کیا ہے، البتہ انہوں نے ابن کثیر کے آخری الفاظ کو لائق توجہ نہیں گردانا، جو یہ ہیں:

ولکن أسانيدها كلها ضعيفة لا يحتج بها.

''لیکن ان سب کی سندیں ضعیف ہیں، لائق حجت نہیں''۔

(البداية والنهاية ج٧ ص٥٨٤)

حافظ ابن کثیر کا یہ حکم جہاں بلا دلیل ہے وہیں علم اصول حدیث کے بھی منافی ہے۔اس لیے کہ اُن کے نزدیک یہ تمام سندیں ضعیف ہیں، لہٰذا اگر واقعۃً ضعیف ہوں بھی تو متابع اور شواھد سے باہم مل کر قوی ہو جاتی ہیں، چنانچہ اسی اصول کے پیش نظر خود حافظ ابن کثیر مشہور حدیث "قلبت الأرض مشارقها ومغاربها" کو قوی اور لائق حجت قرار دے چکے ہیں، اور اگر متعدد ضعیف احادیث باہم مل کر قوی نہ بھی ہوں تو بھی ضعیف حدیث فضائل اور ترغیب و ترہیب میں لائق حجت ہوتی ہے اور یہ ترہیب کا معاملہ ہے۔ پھر زیر بحث مسئلہ میں بطور شواہد احادیث صحیحہ بھی موجود ہیں۔ مثلاً: ابھی ابھی سبّ و شتم کے متعلق جو احادیث گذری ہیں اور ان کے علاوہ ایسی احادیث جن میں سیدنا علی علیہ السلام کے ساتھ بغض کو منافقت فرمایا گیا ہے، سب اس مسئلہ میں شواہد ہیں اور ابن کثیر وغیرہ حضرات پر یہ اصول مخفی بھی نہیں ہے کہ متابع سے سند کو اور شواھد سے متنِ حدیث کو تقویت ملتی ہے، مگر افسوس کہ شیعہ سے ضد کی وجہ سے فضائلِ مرتضوی علیہ السلام میں بڑے بڑے حضرات کو ایسے تمام اصول بھول جاتے ہیں۔وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ.

حدیثِ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے شواہد

اس بحث کے آخر میں بطور شاہد سیدتنا ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ بعض دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی ایک آدھ حدیث نقل کر رہا ہوں، جس سے چند باتیں واضح ہوں گی:

١۔ اولاً یہ کہ واقعی سیدنا علی علیہ السلام پر سبّ و شتم کیا جاتا تھا،

٢۔ ثانیاً یہ کہ اس کی روک ٹوک اور روایت میں ام المومنین تنہا نہیں تھیں،

۳۔ ثالثاً یہ کہ سب وشتم جس دور میں شروع ہوا اُس کا تعین بھی ہو جائے گا۔

امام ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

حدثنا جعفر بن عون قال: حدثنا شقيق بن أبي عبد الله، قال: حدثنا أبوبكر بن خالد بن عُرفُطة، قال: أتيت سعد بن مالک بالمدينة، فقال: ذُكِرَ لي أنكم تسبون علياً؟ قال: قد فعلنا، قال: فلعلک سببْتَهُ؟ قال: قلتُ: معاذ الله، قال: فلا تسُبَّه، فلو وضع المنشار على مَفرقي على أن أسبَّ علياً ما سببتُه أبداً بعد ما سمعتُ من رسولِ الله ﷺ ما سمعتُ؟

”حضرت ابو بکر بن خالد بن عرفطہ ﷺ بیان کرتے ہیں: میں نے حضرت سعد بن مالک بن ابی وقاص ﷺ کو مدینہ مقدسہ میں دیکھا تو انہوں نے مجھے فرمایا: ہمیں بتایا گیا ہے کہ تم حضرت علی ﷺ کو برا کہتے ہو؟ میں نے کہا: ہم نے ایسا کیا ہے، فرمایا: شاید تو نے بھی اُنہیں برا کہا ہے؟ وہ کہتے ہیں: میں نے کہا: معاذ اللہ، فرمایا: اُنہیں کبھی برا مت کہنا! پس اگر میری چوٹی پر آری رکھ دی جائے تا کہ میں اُنہیں برا کہوں تو میں اُنہیں برا نہیں کہوں گا، بعد اس کے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے وہ سنا جو سنا“۔

(المصنف لابن أبي شيبة ج٦ ص٣٧٥، حديث٣٢١١٣، وط: ج١٧ ص١٣١، حديث ٣٢٧٨٥؛ مسند سعد بن أبي وقاص للدورقي ص١٨٩، حديث١١٢؛ السنن الكبرىٰ للنسائي ج٧ ص٤٤١، حديث٨٤٢٣، وط: ج٥ ص١٣٣، حديث٨٤٧٧؛ خصائص علي بتحقيق البلوشي ص١١٢، حديث٩٢؛ مسند أبي يعلىٰ ج١ ص٣٢٨، حديث٧٧٣، وط: ج٢ ص١١٤، حديث٧٧٧؛ إتحاف الخيرة المهرة ج٧ ص٢٠١، حديث٦٦٦٩، وط: ج٩ ص٢٦٦، حديث٨٩٥٣؛ كتاب السنة لابن أبي عاصم ص٥٩٠، حديث١٣٥٣؛ تاريخ دمشق ج٤٢ ص٤١٢؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٨ ص١٢٨؛ جمع الجوامع ج١٣ ص٤٦٧، حديث٩٣٤٩؛ المقصد العلي، حديث ١٣٣٧؛ المطالب العالية ج٤ ص٦٤، حديث٣٩٦٧، وط: ج١٦ ص١٣٢، حديث٣٩٣٩؛ فتح الباري ج٧ ص٤٣٨، وط: ج٨ ص٤٢٤؛ مجمع الزوائد ج٩ ص١٣٠، وط: ج٩ ص١٧٥، وط: ج٩ ص١٢٢، حديث ١٤٧٣٩، وط: ج١٨ ص٢٩٩، حديث١٤٧٤٠)

سبّ وشتم کرنے کے لیے دباؤ

خیال رہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص کا وصال مشہور قول کے مطابق دورِ ملوکیت میں پچپن [۵۵ھ] یعنی معاویہ بن ابوسفیان کے دور میں ہوا تھا اور اُس وقت اُن کی عمر مبارک ۸۰ برس سے زائد تھی۔

(البداية والنهاية لابن كثير ج١١ ص٢٨٢؛ محض الخلاص في مناقب سعد بن أبي وقاص لابن المبرد ص٢٨٢؛ مرقاة شرح المشكاة ج١٠ ص٤٨٦)

اس حدیث کے آخر میں حضرت سعد بن ابی وقاص نے ایک جملہ یہ فرمایا ہے:

''اگر میری چوٹی پر آری رکھ دی جائے تاکہ میں اُنہیں برا کہوں تو میں اُنہیں برا نہیں کہوں گا، بعد اس کے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے وہ سنا جو سنا''۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن پر سیدنا علی کو برا کہنے کے بارے میں حکومتِ وقت کی جانب سے کوئی دباؤ ہوگا۔ صحیح مسلم کی حدیث کے الفاظ "ما منعک أن تسب أبا تراب؟" (تمہیں ابوتراب کو برا کہنے سے کیا چیز مانع ہے؟) بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ اگر اُن پر کوئی دباؤ نہ ہوتا تو اُنہیں مذکورہ بالا الفاظ ادا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ سے ایسا کیا سن رکھا تھا جس کی وجہ سے وہ ایسے گھناؤنے عمل سے باز رہے؟ یہ جاننے کے لیے احقر کی کتاب ''شرح خصائص علي الطبعة الخامسة ص ۵۱۰ ملاحظہ فرمائیں۔





مواخات میں سیدنا علی ﷺ کی خصوصیت

﴿١٨﴾ أخبرنا عمر بن أميلة شيخنا، أخبرنا الفخر بن أحمد، أخبرنا عمر بن محمد الدارقزي، أخبرنا أبو الفتح الهروي، أخبرنا محمود ابن القاسم، أخبرنا ابن جراح، أخبرنا ابن محبوب، أخبرنا أبو عيسى الحافظ، حدثنا يوسف بن موسى القطان، حدثنا علي بن قادم، حدثنا علي بن صالح بن حيي، عن حكيم بن جبير، عن جميع بن عمير التيمي، عن ابن عمر رضي الله عنهما، قال:

آخى رسول الله ﷺ بين أصحابه فجاء علي تدمع عيناه، فقال: يارسول الله آخيت بين أصحابك ولم تؤاخ بيني وبين أحد؟ فقال رسول الله ﷺ: أنت أخي في الدنيا والآخرة.

رواه الترمذي في الجامع وقال: حسن غريب.

﴿١٨﴾ ''سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام ﷺ کے درمیان بھائی چارہ قائم فرمایا تو حضرت علی ﷺ آئے، اس حال میں کہ اُن کی چشم مقدس سے آنسو رواں تھے، عرض کیا: یارسول اللہ! آپ نے اپنے صحابہ کرام ﷺ کے درمیان اخوت قائم فرمائی اور مجھے کسی کا بھائی نہ بنایا؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم دنیا و آخرت میں میرے بھائی ہو''۔

یہ حدیث امام ترمذی نے اپنی جامع میں روایت فرمائی ہے اور کہا ہے کہ یہ حسن غریب ہے۔

(سنن الترمذي ص٨٤٧، حديث ٣٧٢٠، وط: ص٨٤٣، حديث ٨٤٧؛ جامع الأصول لابن أثير الجزري ج٦ ص٣١٢، حديث ٦٣٨٧؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٧ ص٣١٢؛ مشكاة ج٢ ص٥٠٤ رقم ٦٠٩٣؛ مناقب علي والحسنين، لمحمد فؤاد عبد الباقي ص٤٧)

خصوصیتِ مواخات میں بعض کی ہیرا پھیری

ہمارے معاصر پیر شیخ الحدیث والتفسیر خصائصِ مرتضوی پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اسی طرح کہا جاتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے آپ ﷺ کو اپنا بھائی قرار دیا تھا۔ یہ آپ کا خاصہ ہے۔ حالانکہ آپ ﷺ نے صدیق اکبر کو بھی اپنا بھائی قرار دیا ہے ولکن اخی و صاحبی (بخاری حدیث رقم: ٣٦٥٦، مسلم حدیث رقم: ٦١٧٢) سیدنا فاروقِ اعظم ﷺ کو فرمایا: اشرکنا

یااخی فی دعائک یعنی اے میرے بھائی ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا (ابوداود حدیث رقم: ۱۴۹۸، ترمذی حدیث رقم: ۹۱۸۰، مشکوۃ حدیث رقم: ۲۲۴۸) حضرت جبریل علیہ السلام نے حضرت عمر فاروق کو نبی کریم ﷺ کا بھائی قرار دیا (الریاض النضرۃ جلد ۱ صفحہ ۳۱۸) لہٰذا یہ بھی مولیٰ علی ؑ کا مطلق خاصہ نہیں۔

ہاں مواخاتِ مدینہ کی خصوصی جہت میں مولا علی ؑ ہی کو اخو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کا شرف واعزاز حاصل ہے۔ مواخات کا یہ مخصوص گوشہ چچازاد بھائی ہونے کے سبب اور آپ ﷺ کے کاشانہ اقدس میں پرورش پانے کے سبب اور دیگر فضائل کی وجہ سے ہے نہ کہ افضلیت کی وجہ سے۔ ان سب فضیلتوں کے پیش نظر مولا علی ہی اس موقع پر حضور ﷺ کے بھائی بنتے تو بات جچتی تھی۔ لہٰذا اس میں بھی مولا علی کی بڑی پیاری فضیلت موجود ہے مگر یہ آپ کی افضلیت کا ثبوت نہیں"۔

(ضربِ حیدری ص 181)

اس اقتباس کے پہلے پیراگراف میں مواخاتِ مرتضوی کی خصوصیت کا انکار ہے اور دوسرے پیراگراف میں مقید طور پر اس خصوصیت کا اقرار ہے، چار مقامات کو جو ہم نے خط کشیدہ کر دیا ہے ان میں غور فرمایئے کہ سہمے ہوئے انداز میں پہلے خصوصیت کا اقرار ہے اور پھر پینترا بدلتے ہوئے معاً انکار بھی ہے۔ درج ذیل الفاظ میں غور فرمائیں:

"مواخات کا یہ مخصوص گوشہ چچازاد بھائی ہونے کے سبب اور آپ ﷺ کے کاشانہ اقدس میں پرورش پانے کے سبب اور دیگر فضائل کی وجہ سے ہے نہ کہ افضلیت کی وجہ سے۔ ان سب فضیلتوں کے پیش نظر مولا علی ہی اس موقع پر حضور ﷺ کے بھائی بنتے تو بات جچتی تھی"۔

(ضربِ حیدری ص 181)

پیر شیخ الحدیث والتفسیر صاحب نے پہلے یہ فضیلت شیخین کریمین کے لیے ثابت کی، پھر مخصوص گوشوں اور اسباب کا چکر چلانے کے باوجود اسی فضیلت کو مولیٰ علی ؑ کے لیے مقید خصوصیت بھی تسلیم کر لیا لیکن ساتھ ہی کہہ دیا کہ یہ افضلیت نہیں۔ ارے شیخ الحدیث والتفسیر صاحب! جب شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کو برادرِ رسول ہونے کی فضیلت حاصل ہے، اور بقول تمہارے اُنہیں ایک خاص جہت حاصل نہیں تو پھر جس خوش نصیب کو وہ

خاص جہت حاصل ہے وہ اس کی خصوصیت اور افضلیت کیوں نہیں؟ ایک بات کو تسلیم بھی کرنا اور اسی کا انکار بھی کرنا اور علامۃ الناس کو مخصوص گوشوں اور سبھوں کے چکر میں ڈالنا ہیرا پھیری نہیں تو اور کیا ہے؟

یہ خصوصیت سیدنا علی ﷛ کی اپنی زبانی

عقل اپنی اپنی، پسند اپنی اپنی، پیر شیخ الحدیث والتفسیر کی فہم و پسند آپ نے ملاحظہ فرمائی، اب اس سلسلے میں احادیث اور خود سیدنا علی ﷛ کی فہم بھی ملاحظہ فرمائیے: محدثین کرام لکھتے ہیں:

عن عبّاد بن عبد الله، قال: قال علي ﷛: أنا عبد الله، وأخو رسول الله، وأنا الصّدّيق الأكبر، لايقولها بعدي إلا كاذب.

"حضرت عباد بن عبداللہ ﷛ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا علی ﷛ نے فرمایا: میں عبداللہ ہوں، رسول اللہ ﷺ کا بھائی ہوں اور میں صدیق اکبر ہوں۔ میرے بعد یہ دعویٰ نہیں کرے گا مگر جھوٹا شخص"۔

(السنن الكبرى للنسائي ج٧ص ٤٠٩، حديث ٨٣٣٨، وط: ج٥ ص١٠٧، حديث ٨٣٩٦؛ سنن ابن ماجه، حديث ١٢٠؛ المستدرك للحاكم ج٣ص ١١١، حديث ٤٦٤١؛ المصنف لابن أبي شيبة ج ٦ ص ٣٧٠، حديث ٣٢٠٧٥، وط: ج١٧ ص١٠٦، حديث ٣٢٧٤٧؛ كتاب السنة لابن أبي عاصم ص ٥٤٨، حديث ١٣٢٤؛ خصائص علي ص ٢٩، حديث ٦، وط: ص ٢٤، حديث ٧)

امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"هذا إسناد صحيح" (یہ سند صحیح ہے)۔

(زوائد ابن ماجه للبوصيري ص٤٦)

امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

"یہ حدیث امام بخاری اور امام مسلم کی شرط پر صحیح ہے"۔

(المستدرك للحاكم ج٣ص ١١١، وط: ج٤ ص ٧٥)

اس حدیث کی مزید تحقیق کتاب ہذا کے آخر میں بھی آئے گی۔

ایک اور مقام پر یہ مضمون یوں آیا ہے:

عن أبي سليمان الجُهَنِي، قال: سمعتُ علياً على المنبر يقول: أنا عبد

اللّٰه وأخو رسول اللّٰه، لايقوم بها إلا كذاب مفتر، فقال رجل: أنا عبد اللّٰه وأخو رسوله ﷺ، فخُنِقَ فحُمِل.

''حضرت ابوسلیمان اَلْجُهَنِیّ بیان کرتے ہیں: میں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو منبر پر فرماتے ہوئے سنا: میں اللہ کا بندہ اور رسول اللہ ﷺ کا بھائی ہوں، (میرے سوا) یہ دعویٰ نہیں کرے گا مگر جھوٹا اور بہتان تراش۔ پس ایک شخص کہنے لگا: میں بھی اللہ کا بندہ اور اُس کے رسول کا بھائی ہوں تو وہ خناق (گلے کی مرض) میں مبتلا ہو گیا حتیٰ کہ اُس کا جنازہ اُٹھایا گیا''۔

(خصائص علي للنسائي ص ٨٥، حديث ٦٧؛ السنن الكبرى للنسائي ج٧ ص ٤٣٢، حديث ٨٣٩٨، وط: ج٥ ص ١٢٦، حديث ٨٤٥٢)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث میں ہے:

أن علياً كان يقول في حياة رسول اللّٰه ﷺ: إن اللّٰه تعالىٰ يقول: ﴿أَفَائِنْ مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ﴾ واللّٰه لا ننقلب علىٰ أعقابنا بعد إذ هدانا اللّٰه، واللّٰه لئن مات أو قتل لأقاتلن علىٰ ماقاتل عليه حتى أموت، واللّٰه إني لأخوه ووليه ووارثه وابن عمه، فمن أحق به مني.

''سیدنا علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی حیات میں فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿تو کیا اگر وہ اِنتقال فرما جائیں یا شہید کر دیے جائیں تو پھر جاؤ گے تم اُلٹے پاؤں﴾ (آل عمران: ١٤٤) خدا کی قسم! اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہدایت سے بہرہ ور کیا ہم اُلٹے پاؤں نہیں پلٹیں گے۔ اللہ کی قسم! اگر حضور ﷺ کا وصال ہو گیا یا آپ کو شہید کر دیا گیا تو میں ضرور اس بات پر جہاد جاری رکھوں گا جس بات پر آپ ﷺ نے جہاد کیا تھا یہاں تک کہ میں شہید ہو جاؤں۔ خدا کی قسم! میں رسول اللہ ﷺ کا بھائی، آپ کا ولی اور وارث ہوں اور آپ کا چچا زاد ہوں تو پھر آپ کا حق دار مجھ سے زیادہ کون ہے؟''۔

(خصائص علي للنسائي ص ٧٥، حديث ٦٢؛ السنن الكبرىٰ للنسائي ج٧ ص ٤٣١، حديث ٨٣٩٦، وط: ج٥ ص ١٣٥، حديث ٨٤٥٠؛ المعجم الكبير ج١ ص ٦٦، حديث ١٧٤؛ المستدرك ج٣ ص ١٢٦، وط: ج٤ ص ٩٥، حديث ٤٦٩١؛ تفسير ابن أبي حاتم ج٣ ص ٧٧٧؛ تاريخ دمشق ج٤٢ ص

٥٦؛الدر المنثور ج٢ ص٣٣٨،وط:ج٤ص ٥١)

امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی صحت کا قول کیا ہے،اور حافظ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث کو امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور ان کے تمام راوی صحیح حدیث کے راوی ہیں۔

(مجمع الزوائد ج٩ص ١٢٤،وط:ج٩ص ١٨٣،حدیث ١٤٧٦٥،وط:ج٩ص ١٢٨،حدیث ١٤٧٦٥)

ان تینوں حدیثوں میں سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے بطورِ تحدیث نعمت جہاں اپنی دوسری خصوصیات بیان فرمائیں وہیں مواخات کو بھی خصوصیت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ کے بعد ایسا دعویٰ کوئی جھوٹا شخص ہی کرسکتا ہے۔میں کہتا ہوں: آپ سے قبل بھی ایسا دعویٰ کسی نے نہیں کیا،لہٰذا یہ آپ کی انفرادی خصوصیت ہے۔

مواخاتِ مصطفوی و مرتضوی میں حکمت

مواخات کے موقعہ پر نبی کریم ﷺ نے اپنے لیے بالخصوص سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو کیوں منتخب فرمایا، حالانکہ یہ دینی مواخات تھی نہ کہ نسبی، لہٰذا کسی دوسرے صحابی کو منتخب کیا جاسکتا تھا؟ اس حکمت پر اسلاف کرام نے بھی اظہارِ خیال فرمایا ہے اور دورِ حاضر کے لوگوں نے بھی۔ پہلے ہم آپ کی خدمت میں عصرِ حاضر کے بعض لوگوں کی گوہر افشانی کا نمونہ پیش کرتے ہیں، بعد میں اسلاف کرام کا کلام پیش کریں گے۔

ہمارے دور کے شیخ الحدیث والتفسیر پیر سائیں غلام رسول قاسمی اپنی تمام تر عقل وفہم کو بروئے کار لاتے ہوئے انتہائی دریا دلی کے ساتھ لکھتے ہیں:

''ان سب فضیلتوں کے پیش نظر مولا علی ہی اس موقع پر حضور ﷺ کے بھائی بنتے تو بات بجتی تھی''۔

(ضربِ حیدری ص 181)

شکر ہے کہ پیر سائیں نے ''بات بجتی تھی'' کی حد تک تو تسلیم کرلیا۔اب آپ درج ذیل حدیث کی تشریح میں چھٹی صدی اور پھر گیارھویں صدی کی عقل وفہم کو ملاحظہ فرمایئے۔امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین اخوت قائم فرمائی تو حضرت ابو بکر،حضرت عمر اور مولیٰ علی رضی اللہ عنہ باقی رہ گئے۔پھر آپ نے حضرت ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کو باہم بھائی بھائی بنادیا اور سیدنا مولیٰ علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

أَنْتَ أَخِي وَأَنَا أَخُوْكَ.

''آپ میرے بھائی اور میں آپ کا بھائی''۔

(فضائل الصحابة ج۲ ص ۷٤۰، حدیث۱۰۱۹، ۱۰۵۵؛ مختصر تاریخ دمشق ج۱۷ ص ۳۱۲)

محی السنۃ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ رشید اور امام سمعانی رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ گرامی امام ابوالفتوح مجد الدین محمد بن محمد بن علی الطائی الھمدانی متوفی ۵۵۵ھ اور امام زین الدین محمد عبدالرؤف المناوی متوفی ۱۰۲۱ھ رحمۃ اللہ علیہما لکھتے ہیں:

وإذا أردت أن تعلم قرب منزلته من رسول ﷺ فتأمل صنيعه في المواخاة بين الصحابة، جعل يضم الشكل إلى الشكل، والمثل منهم إلى المثل فيؤلف بينهما، إلى أن آخى بين ابي بكر وعمر رضي الله عنهما، وادخر علياً لنفسه، واختصه بأخوته، وناهيك به من فضيلة وشرف.

''اگر تم رسول اللہ ﷺ کے نزدیک سیدنا علی کے مرتبہ کو جاننا چاہو تو مواخاتِ صحابہ میں نبی کریم ﷺ کی حکمت عملی میں غور کرو کہ آپ نے ایک کی دوسرے کے ساتھ اُخوت میں مماثلت ومشاکلت کو ملحوظ رکھا، حتی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مؤاخات فرمائی اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو اپنے لیے بچائے رکھا اور اُنہیں اپنی اُخوت سے مختص فرمایا، لہٰذا اُنھیں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی یہ فضیلت اور مرتبہ کافی ہے''۔

(كتاب الأربعين لأبي الفتوح الطائي ص ٥٥؛ الكواكب الدرية ج١، القسم الأول ص ١٠٠)

اسی حکمت کو مشہور صوفی شیخ مشایخنا حضرت خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ نے یوں بیان فرمایا ہے:

''آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اے علی! تو میرا بھائی ہے دنیا وآخرت میں۔ یہ کیا مناسبت ہے کہ تجھے کسی اور کی برادری میں دے دوں؟ تو میری برادری کے قابل ہے''۔

(مقابیس المجالس [اشاراتِ فریدی] ص ۹۰۷)

مواخات میں ایک روحانی حکمت

امام ابوالفتوح الطائی، امام مناوی اور حضرت خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہم نے بہت خوب فرمایا کہ جس صحابی

کی کسی صحابی کے ساتھ مماثلت تھی اُس کی اسی کے ساتھ مواخات فرمائی گئی اور چونکہ بعض باتوں میں سیدنا علی ﷛ کی مماثلت نبی کریم ﷺ کے ساتھ زیادہ تھی اس لیے آپ ﷺ نے اُنہیں اپنے لیے بچائے رکھا۔ میں نے ''زیادہ'' کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ شیخین کریمین اور دوسرے حضرات کو بھی بعض باتوں میں مماثلت حاصل ہے لیکن یہاں میرے نزدیک مماثلت ومشاکلت سے خلقۃً اور روحاً قربت مراد ہے اور اس قربت کو حدیث پاک میں یوں بیان فرمایا گیا ہے:

الأرواح جنود مجندة فما تعارف منها ائتلف وما تناكر منها اختلف.

''روحیں باہم مجتمع تھیں، ان میں سے جو (وہاں) متعارف تھیں وہ (دنیا میں) باہم الفت کرتی ہیں اور اُن میں سے جو (وہاں) غیر مانوس تھیں وہ (دنیا) میں ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہتی ہیں''۔

(صحيح مسلم ص١١٤٩، حديث٦٧٠٩، وط: ص١٢١٨، حديث٢٦٣٨؛ مسند خليفة بن خياط ص٥٦، حديث٥٧؛ كتاب الروح لابن القيم ص٥١١)

اسی روحانی تعارف کی بنیاد پر دنیا میں دو مومنوں کی روحیں کسی سابقہ باہمی تعارف کے بغیر ایک دوسرے سے ملاقات کرتی ہیں۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے:

إن أرواح المؤمنين لتلتقيان على مسيرة يوم وليلة وما رآى واحد منهما صاحبه.

''اہل ایمان کی روحیں ایک دن اور رات کی مسافت کے باوجود باہم ملاقات کرتی ہیں، حالانکہ اُن میں سے ایک نے دوسرے کو نہیں دیکھا ہوتا''۔

(مسند أحمد ج٢ ص١٧٥، حديث٦٦٣٦ وص٢٢٠، حديث٧٠٤٨؛ الأدب المفرد، حديث٢٦١؛ كتاب الروح ص١٣٦؛ شرح الصدور للسيوطي٩٧)

امام یافعی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''حضرت ذوالنون المصری ﷫ بیان کرتے ہیں کہ میں بنی اسرائیل والے صحرائے تیہ میں جا رہا تھا کہ ایک سیاہ فام لونڈی پر نظر پڑی، محبتِ الٰہی میں وہ دیوانی ہو چکی تھی، اس نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا رکھی تھیں۔ میں نے اسے کہا: اَلسَّلَامُ عَلَيْكِ يَا أُخْتَاهُ (اے بہن آپ پر سلام)

اس نے جواباً کہا: وَعَلَيْكَ السَّلَامُ يَاذَا النُّوْنِ، میں نے کہا: اللہ کی بندی آپ مجھے کیسے پہچانتی ہو؟ کہنے لگی: اے بطّال! اللہ ﷻ نے روحوں کو جسموں سے دو ہزار برس پہلے پیدا فرمایا، پھر انہیں عرش کے اردگرد گھمایا، پس جو روحیں وہاں باہم متعارف ہو گئیں وہ یہاں باہم الفت کرتی ہیں اور جو وہاں جدا رہیں وہ یہاں جدا رہتی ہیں "فَعَرَفَتْ رُوْحِيْ رُوْحَكَ فِيْ ذٰلِكَ الْجَوْلَانِ" سو میری روح نے آپ کی روح کو اس ماحول میں پہچان لیا تھا"۔

(روض الرياحين في حكايات الصالحين ص ۸۲)

اسی طرح حضرت ہرم بن حیان کا واقعہ مشہور ہے، چنانچہ امام ابونعیم لکھتے ہیں:

"جب وہ حضرت اویس القرنی ﷺ کی خدمت بابرکت میں پہنچے تو سیدنا اویس القرنی ﷺ نے ان کا اور ان کے والد کا نام لے کر انہیں مرحبا کہا۔ ہرم بن حیان نے کہا: آپ میرا اور میرے والد کا نام کیسے جانتے ہیں حالانکہ آج سے پہلے نہ آپ نے مجھے دیکھا اور نہ میں نے آپ کو دیکھا ہے؟ فرمایا: "عَرَفَتْ رُوْحِيْ رُوْحَكَ" (میری روح نے آپ کی روح کو پہچان لیا ہے)"۔

(حلية الأولياء ج۲ ص ۱۰۰، روض الرياحين ص ۱۶۷)

امام مناوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"حضرت عبدالواحد بن زید فرماتے ہیں: میں نے مسلسل تین راتیں دعا کی یا اللہ! مجھے وہ شخص دکھا جو جنت میں میرا ساتھی ہو، پس میں نے دیکھا کہ ایک کہنے والا کہہ رہا تھا: تمہاری جنت کی ساتھی میمونۃ السوداء ہے۔ میں نے کہا: وہ کہاں ہے؟ فرمایا: کوفہ میں۔ میں چلا اور ان کے متعلق معلومات حاصل کیں تو بتایا گیا: وہ فلاں مقام پر ہماری بکریاں چرا رہی ہے۔ میں وہاں پہنچا تو وہ نماز پڑھ رہی تھیں اور ان کے جسم پر اون کا ایک جبہ تھا جس پر لکھا ہوا تھا "لَاتُبَاعُ وَلَاتُشْتَرىٰ" (وہاں کوئی خرید و فروخت نہیں ہوگی) اور بکریاں بھیڑیوں کے پاس چر رہی تھیں، نہ بھیڑیئے بکریوں کو کھا رہے تھے اور نہ بکریاں ان سے خوف زدہ تھیں۔ جب میمونہ کی مجھ پر نظر پڑی تو وہ فرمانے لگیں: اے ابن زید لوٹ جاؤ، ہمارے وعدے کی جگہ یہاں نہیں وہاں ہے۔ میں نے کہا: آپ نے کیسے جان لیا کہ میں ابن زید ہوں؟ فرمایا: "أما علمت أن الأرواح جنود

مجندة فما تعارف منها ائتلف؟" (کیا آپ نہیں جانتے کہ روحیں ایک لشکر کی طرح رہتی تھیں سو جن کا وہاں تعارف ہو گیا تھا وہ یہاں باہم الفت کرتی ہیں؟)"۔

(الکواکب الدریۃ في طبقات الصوفیۃ ج۱، القسم الثاني ص ۴۶۷، ۴۶۸)

عالمِ ارواح کے اسی تعارف کی وجہ تھی کہ جونہی سیدنا علی علیہ السلام کی ولادت باسعادت ہوئی تو ابوالارواح سید العالمین محمد رسول اللہ ﷺ کی توجہ ان کی طرف مبذول ہوگئی، انہیں آپ نے اُٹھالیا اور پہلی غذا اپنی ریقِ مبارک (لعابِ دہن) سے دی۔

(السیرۃ الحلبیۃ ج۱ ص ۴۳۲؛ السیرۃ النبویۃ لابن زیني دحلان ج۱ ص ۱۵۰)

پھر اپنی اور اپنی زوجہ طاہرہ کی آغوش میں اُن کی تربیت فرمائی، مواخات میں اپنے ساتھ ملایا اور اپنی اُس بیٹی کو ان کے عقد میں دیا جس سے ذریتِ طاہرہ کا چلنا مقدر تھا۔ یہ ہے اُس نکتہ کی توضیح جو امام ابوالفتوح الطائی رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث مواخات کی روشنی میں بیان فرمایا۔ خود سوچئے! یہ کتنی بڑی خصوصیت ہے جسے صاحب "ضربِ حیدری" نے دُھندلانے کی ناکام کوشش کی؟




علی سید العرب

﴿۱۹﴾ أخبرنا أحمد بن محمد بن الحسين البناء، مشافهة غير مرة، عن علي بن أحمد المقدسي، أخبرنا أبو الفتوح الأصبهاني في كتابه، منها أخبرنا إسماعيل بن محمد الطلحي الحافظ، أخبرنا أبوبكر بن خلف، أخبرنا أبو عبدالله الحافظ، أخبرنا أبو العباس المحبوبي، حدثنا أبو حفص عمرو بن الحسن الراسبي، حدثنا أبو عوانة، عن أبي بشر، عن سعيد بن جبير، عن عائشة رضي الله عنها:

أن النبي ﷺ قال: أنا سيد ولد آدم وعلي سيد العرب.

أخرجه الحاكم في صحيحه المستدرك، وقال: صحيح الإسناد ولم يخرجاه، وله شاهد من حديث عروة عن عائشة، حدثناه أبوبكر محمد بن جعفر القاري.

﴿۱۹﴾ ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں اولادِ آدم کا سید ہوں اور علی عرب کا سید ہے۔

اس حدیث کو امام حاکمؒ نے "المستدرک" میں ذکر کیا اور فرمایا کہ یہ صحیح السند ہے اور شیخین رحمۃ اللہ علیہما نے اسے روایت نہیں کیا، اور اس کی تائید حدیثِ عروہ بروایتِ عائشہ سے ہوتی ہے، جسے ابوبکر بن محمد جعفر القاری نے بیان کیا ہے۔

﴿۲۰﴾ حدثنا أحمد بن عبيد بن ناصح، حدثنا الحسين بن علوان عن هشام بن عروة عن أبيه عن عائشة رضي الله عنها، قالت: قال رسول الله ﷺ:

أدعوا لي سيد العرب، فقلت: يا رسول الله، ألست سيد العرب؟ فقال: أنا سيد ولد آدم وعلي سيد العرب.

قال: وله شاهد ثالث من حديث جابر.

﴿۲۰﴾ حضرت عروہؓ ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں، آپ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہمارے لیے سید العرب کو بلاؤ، میں نے عرض کیا: کیا آپ سید العرب نہیں ہیں؟ فرمایا: میں اولادِ آدم کا سید ہوں اور علی سید العرب ہیں۔

امام حاکم فرماتے ہیں: اور اس حدیث کا تیسرا شاہد حدیث جابر ہے۔

﴿۲۱﴾ حدثناه أبو عبد الله محمد ابن أحمد بن موسىٰ القاضي الخازن، من أصل كتابه، حدثنا إبراهيم بن مالك الزعفراني، حدثنا سهل بن عثمان العسكري، حدثنا المسيب ابن شريك، حدثنا عمر بن موسىٰ الوجيهي، عن أبي الزبير عن جابر، قال: قال رسول الله ﷺ: أدعوا لِي سيد العرب، فقالت عائشة: ألست سيد العرب؟ قال: أنا سيد ولد آدم وعلي سيد العرب.

﴿۲۱﴾ حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہمارے لیے سید العرب کو بلاؤ، اس پر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی: کیا آپ سید العرب نہیں ہیں؟ فرمایا: میں اولادِ آدم کا سید ہوں اور علی سید العرب ہیں۔

حدیث "عَلِيٌّ سَيِّدُ الْعَرَبِ" کی تحقیق

امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ کے قول کا کچھ حصہ مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کر دیا اور آپ نے اسے پڑھ لیا، علاوہ ازیں امام حاکم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اس حدیث کی سند میں عمر بن حسن ہے اور میں اُسے سچا سمجھتا ہوں اور اگر وہ نہ ہوتے تو میں اس حدیث پر شیخین کی شرائط کے مطابق صحت کا حکم لگاتا۔ اس پر امام ذہبی فرماتے ہیں:

"میں خیال کرتا ہوں کہ اِسی (عمر بن حسن) نے یہ حدیث گھڑی ہے، اور دوسری سند کے بارے میں کہا ہے کہ اس کو ابن علوان نے وضع کیا (گھڑا) ہے، اور اس حدیث کو عمر بن موسیٰ الوجیہی نے از ابو الزبیر از جابر روایت کیا ہے اور عمر وضاع (حدیث گھڑنے والا) ہے"۔

(تلخيص المستدرك للذهبي ج۳ ص ۱۲۳)

امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کا میلان تو اس حدیث کے موضوع ہونے کی طرف ہے لیکن درست بات یہ ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے موضوع نہیں۔ ملا علی القاری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وله شواهد كلها ضعيفة، بل جنح الذهبي إلى الحكم عليها بالوضع. قلتُ: ولعله نظر إلى المعنى، مع قطع النظر إلى صحة المبنى.

"اس حدیث کے کئی شواہد ہیں، سب ضعیف ہیں، بلکہ ذہبی اس پر وضع کے حکم کی طرف مائل

ہوئے۔میں کہتا ہوں: شاید اُنہوں نے اسنادِ صحت سے قطع نظر کرتے ہوئے محض معنی کی طرف توجہ کی ہے"۔

(الأسرار المرفوعة في الأخبار الموضوعة ص ۱۳۷، حديث ۵۱۷)

امام ذہبیؒ پر بعض علماء کی شدید جرح

اِس عبارت میں ملاعلی القاریؒ دھیمے انداز میں لفظ "لَعَلَّ" سے انتہائی اہم اشارہ فرما گئے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ امام ذہبی کی نگاہ سند سے زیادہ معنیٰ حدیث کی طرف چلی گئی اور انہیں سیدنا علی ﷺ کے حق میں یہ معنیٰ مستبعد نظر آیا تو انہوں نے یہ حکم لگادیا۔ بعض علماء کرام نے امام ذہبی کے خلاف اس بات کو واضح ترین انداز میں بیان کر دیا ہے۔ چنانچہ شیخ احمد بن محمد بن الصدیق الغماری رحمۃ اللہ علیہ ایک حدیث پر امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کی جرح نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

قلت: لو وثقه الناس كلهم لقال الذهبي في حديثه أنه كذب، كما فعل في عدة أحاديث أخرجها الحاكم بسند الشيخين وادعى هو دفعاً بالصدر وبدون دليل أنها موضوعة وما علتها في نظره إلا كونها في فضل علي بن أبي طالب، فالله المستعان.

"میں کہتا ہوں: اگر اس راوی کی تمام لوگ توثیق کرتے تب بھی ذہبی اس کی حدیث کے بارے میں کہتے کہ یہ کذب ہے، جیسا کہ انہوں نے اُن متعدد احادیث میں کیا جو امام حاکم نے شیخین کی سند سے تخریج فرمائیں، بلا دلیل ان احادیث کے متعلق اپنی طرف سے کہہ دیا کہ وہ موضوع ہیں، ذہبی کی نگاہ میں اُن احادیث کی کوئی علت نہیں تھی ماسوا اس کے کہ وہ سیدنا علی بن ابی طالب ﷺ کی فضیلت میں ہیں"۔

(فتح الملك العلي بصحة حديث باب مدينة العلم علي ص ۴۰)

ایک مقام پر امام ذہبی نے ایک اثر کے متعلق لکھ دیا "إسناده لين" (اس کی سند کچھ کمزور ہے) اس پر یہی محدث لکھتے ہیں:

مع أنه أثر صحيح له طرق متعددة عن كميل، ولكن نفس الذهبي لا تسمح

بالسكوت على فضيلة لعلي عليه السلام، ولله در من قال: لو كان قوله تعالى: ﴿وَمَآ أَرْسَلْنَاکَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ﴾ نازلاً في حق علي لقال الذهبي إنها آية ضعيفة.

"باوجود اس کے کہ یہ اثر (قولِ صحابی) صحیح ہے اور حضرت کمیل سے اس کی متعدد سندیں ہیں، لیکن ذہبی کے نفس کے لیے فضیلتِ علی علیہ السلام پر سکوت کی گنجائش نہیں رہی، اُس شخص کے قول کی خوبی اللہ کے لیے ہے جس نے کہا: اگر ارشادِ الٰہی ﴿وَمَآ أَرْسَلْنَاکَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ﴾ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوا ہوتا تو ذہبی کہتے: یہ آیت ضعیف ہے"۔

(البرهان الجلي للغماري ص ۹۸)

اس شدید جرح پر راقم کا تبصرہ

احقر کے نزدیک یہ جرح جھوٹ یا غلط نہیں لیکن مبالغہ پر مبنی ہے۔ اس سے جو یہ تأثر اُبھرتا ہے کہ امام ذہبی کے دل میں گویا بغضِ علی تھا تو یہ قطعاً درست نہیں۔ اس لیے کہ امام ذہبی نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شان میں واردشدہ ایسی احادیث کو بھی صحیح یا حسن قرار دیا ہے جنہیں ان کے بعض اساتذہ نے موضوع قرار دیا تھا، مثلاً حدیث الموالاۃ اور حدیث الطیر وغیرھا بلکہ اول الذکر حدیث پر امام ذہبی کا مستقل رسالہ ہے اور انہوں نے اس حدیث کو متواتر تسلیم کیا ہے۔ لہٰذا ان کے بارے میں یہ تصور کرنا کہ انہوں نے شانِ مرتضوی میں وارد کسی حدیث کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ بغض کی وجہ سے موضوع کہا ہے تو یہ تصور درست نہیں، البتہ اگر یہ کہا جائے کہ روافض کی تردید کے جوش میں اُن سے ایسا ہو گیا تو یہ قرینِ قیاس ہے، اور ایسی تفریط بڑے بڑے نامور مصنفین سے ہوتی رہی ہے اور اب تک ہو رہی ہے۔ اس کی بعض مثالیں آئندہ سطور میں حدیث نمبر[۳۰] کے تحت آئیں گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

خلاصہ یہ ہے کہ محدث غماری رحمۃ اللہ علیہ نے امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں جو اظہارِ خیال فرمایا ہے اسے سراسر مسترد نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ جب کوئی چلاّتا یا احتجاج کرتا ہے تو اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوتی ہے۔ وجہ کوئی بھی ہو بہرکیف امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کا قلم متعدد مقامات پر شانِ مرتضوی میں واردشدہ احادیث پر حکم لگانے میں لغزش سے محفوظ نہیں رہا۔ خود زیرِ بحث حدیث میں بھی یہی صورتِ حال ہے۔ امام ذہبی نے اس حدیث کو موضوع قرار دیا ہے حالانکہ یہ حدیث موضوع نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ضعیف ہے۔ چنانچہ امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

حدثنا أحمد، قال حدثنا عبد الله بن يوسف الجبيري، قال حدثنا عمر بن عبد العزيز الدارع، قال حدثنا خاقان بن عبد الله بن أهتم، قال حدثنا حُميد الطويل، عن أنس بن مالک أن رسول الله ﷺ قال: من سيد العرب؟ قالوا: أنت يارسول الله. قال: أنا سيد ولد آدم، وعليٌّ سيد العرب.

''حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا: سید العرب کون ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: یارسول اللہ آپ۔ فرمایا: میں اولادِ آدم کا سید ہوں اور علی سید العرب ہے''۔

(المعجم الأوسط ج۲ص۲۷۹، حدیث۱۴۹۱)

امام ذہبی کے نزدیک مذکورہ حدیث عمر بن حسن راسبی، ابن علوان اور عمر بن موسیٰ الوجیہی کی وجہ سے موضوع ہے، اور اِس سند میں یہ تینوں راوی نہیں ہیں، لہٰذا یہ حدیث موضوع نہیں ہے، چنانچہ حافظ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اس حدیث کو امام طبرانی نے ''الأوسط'' میں روایت کیا ہے اور اس کی سند میں ایک شخص خاقان بن عبد اللہ بن اہتم ہے، امام ابوداود نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے''۔

(مجمع الزوائد ج۹ص۱۱٦، وط: ج۹ص۱۵۲، حدیث۱٤٦۸۲، وط: ج۱۸ص۲۰٤، ۲۰۵، حدیث۱٤٦۸٤)

امام ابن عساکرؒ نے اس حدیث کو متعدد سندوں سے روایت کیا ہے جن میں سے فقط ایک کی سند میں عمر بن حسن راسبی ہے اور باقی سندوں میں نہ یہ ہے اور نہ ہی عمر بن موسیٰ الوجیہی اور ابن علوان ہے۔

(تاریخ دمشق لابن عساکر ج٤۲ص۳۰۵، ۳۰٦)

حدیث ''علي سيد العرب'' کے معنوی شواہد

معلوم ہوا کہ سنداً اس حدیث کے موضوع ہونے پر محدثین کرام متفق نہیں ہوسکے، اور لگتا یہ ہے کہ مصنف (امام شمس الدین الجزری المقری) رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس حدیث کے متعلق امام ذہبی کے قول کو لائقِ التفات نہیں سمجھا۔ لہٰذا زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ سنداً یہ حدیث ضعیف ہے، اور محدثین میں یہ اُصول مسلّم ہے کہ

ضعیف حدیث فضائل واعمال میں مقبول ہے بشرطیکہ وہ کسی صحیح حدیث سے ٹکراتی نہ ہو، اور یہ حدیث کسی صحیح حدیث سے ٹکراتی نہیں بلکہ متعدد صحیح احادیث وآثار سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس طرح اور کیسے؟ جواباً عرض ہے کہ اس کے لیے پہلے لفظِ سید کی معنوی تحقیق ضروری ہے، مثلاً "مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ" صحیح اور متواتر حدیث ہے اور لفظِ مولی کے معانی میں سردار وآقا کا معنی بھی آتا ہے۔

لفظِ سید کی معنوی تحقیق

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ لفظ سید کی تشریح میں لکھتے ہیں:

السيد الذي يفوق قومه وهي السيادة والسؤدد وهي الرياسة والزعامة ورفعة القدر.

"سید وہ ہے جو اپنی قوم پر فائق ہو، اور یہ سیادت، ریاست، قیادت اور بلندیٔ رتبہ سے عبارت ہے"۔

(مشارق الأنوار للقاضي عياض ج٢ ص٢٨٦)

نیز وہ فرماتے ہیں:

قال الهروي: السيد الذي يفوق قومه في الخير، وقال غيره: السيد هو الذي يفزع إليه القوم في النوائب والشدائد فيقوم بأمورهم ويحتمل عنهم مكارههم ويدفعها عنهم.

"امام ہروی نے فرمایا: سید وہ ہے جو خیر میں اپنی قوم پر فائق ہو، اور دوسرے علماء کرام نے فرمایا: سید وہ ہے جس سے قوم مصائب اور مشکلات میں رجوع کرے تو وہ ان کے معاملات کو درست کرے، اُن کے بوجھ کو برداشت کرے اور اُن سے مشکلات کو دفع کردے"۔

(إكمال المعلم بفوائد مسلم ج٧ ص٥٨٢)

امام نووی، امام طیبی، امام خضیری، امام سیوطی، امام صالحی، ملا علی قاری، امام زرقانی، عبد الرحمٰن مبارکپوری، شمس الحق عظیم آبادی، شیخ محمد امین الأرمی اور علامہ تقی عثمانی نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔

(نووي شرح صحيح مسلم ج١٥ ص٣٩؛ شرح الطيبي على المشكاة ج١١ ص٣٦٣٢؛ اللفظ

المكرم بخصائص النبي المعظم (ﷺ) ص۳۲٤، وط: ج۲ ص۸٤؛ الرياض الأنيقة ص۱۷۷؛ سبل الهدیٰ ج۱ ص٤۱۷؛ مرقاة شرح المشكاة ج۱۰ ص۷؛ زرقاني على المواهب ج٤ ص۱۹۵؛ تحفة الأحوذي ج۷ ص۱۰۳؛ عون المعبود ج۱۲ ص۲۷۸؛ تكملة فتح الملهم ج ٤ ص٤۱٤؛ الكوكب الوهاج ج۲۳ ص۱٤)

لفظِ سید کے معنیٰ میں ایک باریکی

لفظ سید کی معنویت میں ایک لطیف فرق یہ بھی ملحوظ رہے کہ سید اُسے کہا جاتا ہے جو ذی عقل قوم پر سردار ہو، اُن کے دکھ درد بانٹتا ہو، مسائل حل کرتا ہو اور اُن کی تہذیب نفس کرتا ہو۔ محض غیر ذی عقول مخلوق کے محافظ یا مال و اشیاء کے مالک کو سید نہیں کہا جاتا۔ امام ابو العباس قرطبی لکھتے ہیں:

''سید وہ ہے جو اپنی قوم پر سرداری کرے، یعنی خصائل حمیدہ کے جامع ہونے کے سبب اُن سب پر فائق ہو، اِس حیثیت سے کہ لوگ اُس کی طرف رجوع کریں اور اپنے اہم معاملات میں اُس پر اعتماد کریں۔ شاعر نے اسی معنیٰ کی توضیح میں کہا:

فإن كنت سيدنا سدتنا

وإن كنت للخال فاذهب فخل!

اگر تو ہمارا سید ہے تو مشکلیں حل کرا اور اگر چرواہا ہے تو پھر جا مویشی چرا''۔

(المفهم لما أشكل من تلخيص كتاب مسلم ج۱ ص٤۲٦)

امام جمل رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''سید وہ ہے جو اپنی قوم کا سردار ہو، یعنی خصائلِ کمال اور شرفِ تام میں اُن سب پر مقدم ہو''۔

(شرح دلائل الخيرات للإمام الجمل بحواله جواهر البحار ج۲ ص۳٦۳)

سیدنا علی ؓ پر لفظِ سید کی معنوی مطابقت

لفظ سید کی جو تشریح کی گئی اگر اس کا خلاصہ کیا جائے تو یہ دو معانی سامنے آتے ہیں:

۱۔ ''السيد الذي يفوق قومه في الخير'' (سید وہ ہے جو خیر میں اپنی قوم پر فائق ہو)

۲۔ ''السيد هو الذي يفزع إليه القوم في النوائب والشدائد'' (سید وہ ہے قوم جس کی طرف

مصائب اور مشکلات میں رجوع کرے)۔

اب ہم اِن دونوں معانی پر بالترتیب احادیث و آثار سے شواہد پیش کرتے ہیں تا کہ زیرِ بحث حدیث کی معنوی صحت پر کوئی شبہ باقی نہ رہے۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

الناس معادن كمعادن الفضة والذهب، خيارهم في الجاهلية خيارهم في الإسلام إذا فقهوا.

"لوگ سونے چاندی کی کانوں کی طرح کانیں ہیں، جو زمانۂ جاہلیت میں اچھے تھے وہ زمانۂ اسلام میں بھی اچھے ہیں بشرطیکہ فقیہ ہوں"۔

(صحيح مسلم ص١٤٤٩، حديث ٦٧٠٩؛ بخاري ص٥٨٨ حديث ٣٤٩٦)

اس حدیث میں دو باتوں کا ذکر ہے:

۱۔ زمانۂ جاہلیت میں خیر (بہتر) ہونا

۲۔ زمانۂ اسلام میں فقیہ ہونا

اور ان دونوں باتوں میں سیدنا علی علیہ السلام پوری امت پر فوقیت رکھتے ہیں، اس لیے کہ آپ اباً اور اُمّاً ہاشمی ہیں اور بنو ہاشم اولادِ آدم میں افضل ترین خاندان ہے، جیسا کہ مشہور حدیث "قلبت الأرض مشارقها الخ" وغیرہا میں اس بات کی تصریح موجود ہے۔

خیر (بہتر) ہونے کی دوسری بات اسلام میں فقیہ ہونا ہے اور کوئی شخص اسلام کا زیادہ فقیہ تب ہی ہو سکتا ہے جب اُسے کامل اُستاذ مل جائے اور سیدنا علی علیہ السلام نے جونہی روئے زمین کے افضل ترین خاندان میں جنم لیا انہیں اُسی وقت کائنات کے افضل ترین استاذ ﷺ نے اپنا لیا اور پھر اس کامل استاذ نے اُنہیں اتنا پڑھایا اتنا پڑھایا کہ کامل اور مکمل بنا دیا اور پھر خود ہی اس کی قابلیت کا اعلان فرمایا: "انا مدينة العلم وعلي بابها" (میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے) اور ایسی شہادت معلم کائنات ﷺ کی زبان اقدس سے کسی دوسرے شاگرد کے حق میں منقول نہیں ہے۔ اس لیے یہ کہنا مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ نسبی اور فقہی برتری کے لحاظ سے ساری امت میں سیدنا علی علیہ السلام کا ہمسر کوئی نہیں۔

یہ لفظِ سید کے معنیٰ کا پہلا اور لازم (غیر متعدی) حصہ تھا، یعنی پوری قوم سے خیر میں فائق ہونا اور دوسرا حصہ متعدی ہے، اور وہ ہے قوم کی مشکلات کا حل کرنا۔ اس کو ابتدائی طور پر دو صورتوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ جسمانی طور پر مشکل کشا ہونا

۲۔ معنوی طور پر مشکل کشا ہونا

جسمانی طور پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے یوں مشکل کشائی فرمائی کہ ہر غزوہ میں پرچم نبوی وہی تھامتے تھے اور فتح اُنہیں کی بدولت حاصل ہوتی تھی، حتیٰ کہ ایک غزوہ میں شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کو بھی فتح حاصل نہ ہو سکی تو نبی کریم ﷺ نے آخری دن اسد اللہ الغالب مولیٰ علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کو بھیجا اور فرمایا یہ فتح حاصل کیے بغیر نہیں پلٹے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور عظیم یہودی کالونی کو فتح کر کے مولیٰ علی رضی اللہ عنہ نے سید العرب ہونے کا جسمانی ثبوت فراہم کر دیا۔

تنبیہ:

خیال رہے کہ بعض غزوات کا شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کے ہاتھوں فتح نہ ہونا اور مولیٰ علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں فتح ہو جانا اگر احادیثِ صحیحہ اور حسنہ سے ثابت نہ ہوتا تو یہ احقر یہ بات محض نکتہ سنجی کے طور پر ہرگز بیان نہ کرتا، لہٰذا اس بات کو محض نکتہ اور اظہارِ خیال نہ سمجھا جائے بلکہ اظہارِ حدیث وقال بھی سمجھا جائے!

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا معنوی طور پر مشکل کشا ہونا اس قدر مشہور ہے کہ محتاجِ بیان نہیں، کون نہیں جانتا کہ افرادِ قوم تو کیا خود خلفاء راشدین المہدیین رضی اللہ عنہم بھی اُن کی طرف رجوع کرتے تھے، حتیٰ کہ سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ تو ہر اُس مشکل سے پناہ مانگتے تھے جس کو حل کرنے کے لیے ابوالحسن نہ ہوں، اور کبھی تو یہاں تک فرماتے کہ "علی رضی اللہ عنہ کے بعد اللہ تعالیٰ مجھے باقی نہ رکھے" اور اُن کا یہ ارشاد تو زبان زدِ عام ہے کہ "اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا" عرب اور حلب، شام کے مشہور ترین محقق شیخ عبد الفتاح ابو غدہؒ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شخصیت کے اس معنوی پہلو کی وجہ سے اُنہیں حلّال المشکلات کہا ہے اور لکھا ہے کہ ضرب المثل ہو گئی تھی کہ "قضية ولا أبا حسن لها" (مشکل آپڑی پر ابوالحسن نہیں ہے)۔ معلوم ہوا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ جسماً اور معنیً ظاہراً اور باطناً قوم کی مشکلیں حل فرماتے تھے۔ اس لیے اگرچہ حدیث "علي سيد العرب" سنداً ضعیف ہے مگر معنوی طور پر قوی ہے اور سیدنا علی علیہ السلام واقعۃً اور یقیناً سید العرب ہیں۔

سیادتِ مرتضوی کا تمام امت کو شامل ہونا

جب مولیٰ علی سید العرب ہیں تو پھر وہ اُمتِ مسلمہ کے ہر عربی کے بھی سید ہیں اور اس سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں۔ بلاشبہ حسنین کریمین علیہما السلام نوجوانانِ اہلِ جنت کے سید ہیں لیکن سیدنا علی علیہ السلام اُن کے بھی سید ہیں کیونکہ وہ عرب سے باہر نہیں، میرے اس خیال کی تائید ایک حدیث پاک سے بھی ہوتی ہے۔ امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

سیدنا ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

الحسن والحسين سيدا شبابِ أهل الجنة وأبوهما خير منهما.

''حسن اور حسین نوجوانانِ اہلِ جنت کے سردار ہیں اور ان کے والد اُن دونوں سے بہتر ہیں''۔

(سنن ابن ماجه ج١ ص٤٨، حديث١١٨؛ المستدرك للحاكم ج٣ ص١٦٧، حديث ٤٨٣٢، ٤٨٣٣؛ المعجم الكبير ج٣ ص٣٩ حديث٢٦١٧ وج١٩ ص٦٥٠؛ مجمع الزوائد ج٩ ص ١٨٤، حديث١٥٠٨٨، ١٥٠٨٩؛ الجامع الصغير حديث٣٨٢١)

اس حدیث میں ''خیر منهما'' کے الفاظ ہیں جبکہ ایک اور حدیث میں ''أفضل منهما'' کے الفاظ آئے ہیں۔ چنانچہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''ایک روز ہم نے رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ اقدس میں مسرت کے آثار دیکھے تو عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم آپ کے چہرہ مبارک میں مسرت کے آثار دیکھ رہے ہیں۔ فرمایا: میں کیوں نہ مسرور ہوں جبکہ میرے پاس جبرائیل علیہ السلام نے حاضر ہو کر بشارت دی کہ: إن الحسن والحسين سيدا شباب أهل الجنة وأبوهما أفضل منهما ''بیشک حسن اور حسین جنت کے نوجوانوں کے سردار ہیں اور ان کے بابا اُن دونوں سے افضل ہیں''۔

(المعجم الكبير ج٣ ص٢٧، حديث٢٦٠٨، وط: ج٢ ص١٧٣، حديث٢٥٤٢؛ مجمع الزوائد ج٩ ص١٨٤، حديث١٥٠٨٧، وط: ج٩ ص٢١٢، حديث١٥٠٨٧)

اسی طرح سیدتنا فاطمۃ الزہراء علیہا السلام بھی بلاشبہ خواتینِ جنت کی سیدہ ہیں اور بضعۂ مصطفوی ہونے کے حوالے سے اُنہیں سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر ایک گونہ فضیلت بھی حاصل ہے لیکن سیدنا علی اُن کے بھی سید ہیں کیونکہ وہ

عرب سے باہر نہیں۔ نیز ایک حدیث شریف سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ سیدہ علیہا السلام کی بہ نسبت سیدنا علی علیہ السلام حضور ﷺ کے نزدیک زیادہ معزز تھے۔ چنانچہ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ سیدنا علی بن ابی طالب ﷺ بیان کرتے ہیں:

خطبتُ إلى رسول الله فاطمة عليها السلام فزوَّجني، فقلتُ يا رسول الله! أنا أحبُّ إليك أم هي؟ فقال: هي أحبُّ إليَّ منك، وأنتَ أعز عليَّ منها.

''میں نے نبی کریم ﷺ کی طرف فاطمہ علیہا السلام کے نکاح کا پیغام بھیجا تو آپ نے میرے ساتھ نکاح کر دیا پھر (ایک مرتبہ) میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں آپ کو زیادہ محبوب ہوں یا وہ؟ فرمایا: وہ مجھے تم سے زیادہ محبوب ہے اور تم میرے نزدیک اُس سے زیادہ معزز ہو''۔

(السنن الكبرىٰ للنسائي ج٧ص ٤٦١، حديث٨٤٧٨، وط: ج٥ص ١٥٠، حديث٨٥٣١؛ سنن سعيد بن منصور ج١ ص١٦٧، ١٦٨، حديث ٦٠٠؛ مسند الحميدي ج١ ص٢٢، ٢٣، حديث٣٨؛ فضائل الصحابة ج٢ ص٧٨٣، حديث١٠٧٦؛ خصائص علي بتحقيق الحويني ص١٢٦، حديث ١٤٢؛ الآحاد والمثاني ج٥ص ٣٦٠، حديث١٩٥١؛ بحر الفوائد للكلاباذي ج١ ص٤٥٤، ٤٥٥؛ الجامع الصغير ص٤٣٤، حديث٥٨٣٦؛ جمع الجوامع ج١٣ص٢٥ وط: ج١٧ ص١٦٦؛ مسند فاطمة الزهراء للسيوطي ص٥٦، حديث١٠٦)

اس حدیث میں فقط یہ بات نہیں کہ تم اُس سے زیادہ معزز ہو بلکہ ارشاد ہے کہ ''میرے نزدیک'' لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آپ فقط شوہر ہونے کی وجہ سے سیدہ سے زیادہ معزز ہیں۔

معلوم ہوا کہ جو بھی عرب ہے بلا استثناء سیدنا علی علیہ السلام اُس کے سید ہیں اور جب عرب کے سید ہیں تو از خود عجم کے بھی سید ہیں، البتہ انبیاء کرام علیہم السلام اس سے مستثنیٰ ہیں، انبیاء کرام علیہم السلام کے سید نبی کریم ﷺ ہیں، کیونکہ آپ مطلقاً سید ولد آدم ہیں۔

سیدنا علی علیہ السلام کا ذوالقرنین ہونا

سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کی سیادت ایک اور دلچسپ حدیث سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

حدثنا عفان، حدثنا حماد بن سلمة، حدثنا محمد بن إسحاق، عن محمد بن إبراهيم التيمي، عن سلمة بن أبي الطفيل، عن علي بن أبي طالب أن النبي ﷺ، قال له: يا علي إن لک کنزاً في الجنة، وإنک ذو قرنيها، فلا تتبع النظرة النظرة، فإنما لک الأولیٰ وليست لک الآخرة.

''حضرت سلمہ بن ابی الطفیل سیدنا علی بن ابی طالب ؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اے علی! تمہارے لیے جنت میں ایک خزانہ ہے اور تم اس کے دو قرن والے ہو، لہٰذا تم (غیر محرم پر) ایک نگاہ کے بعد دوسری نگاہ نہ کیا کرو، پہلی تمہیں معاف ہے اور دوسری تمہیں معاف نہیں''۔

(فضائل الصحابة ج٢ ص٧٤٤، ٧٤٨، حديث١٠٢٨؛ مسند أحمد ج١ ص١٥٩، وط: ج١ ص٤٣٨، حديث١٣٧٣؛ المصنف لابن أبي شيبة ج٩ ص٣٦٣، حديث١٧٥١٢ و ج١٧ ص١٠٥، ١٠٦، حديث٣٢٧٤٦، وط: ج٦ ص٢٥٥، حديث١٧٣٩٥ و ج١١ ص١٤١، حديث٣٢٦١٩؛ صحيح ابن حبان ج١٢ ص٣٨١، حديث٥٥٧٠؛ مسند البزار ج٣ ص١٢١، حديث٩٠٧؛ شرح معاني الآثار ج٣ ص١٤، ١٥، حديث٤٢٨٤؛ المعجم الأوسط ج١ ص٣٨٨، حديث٦٧٨؛ المستدرك للحاكم ج٣ ص١٢٢، وط: ج٤ ص٩١، حديث٤٦٨١؛ معرفة الصحابة لأبي نعيم ج١ ص١٠٤، حديث٣٤٢، وط: ص٨٧، حديث٣٤٢؛ الأحاديث المختارة للضياء المقدسي ج٢ ص١٠٨، ١٠٩، حديث٤٨٢، ٤٨٣؛ إتحاف الخيرة المهرة ج٧ ص١٨٨، حديث٦٦٤١؛ كشف الأستار ج٢ ص١٥٩، حديث١٤١٩؛ مجمع الزوائد ج٤ ص٢٧٧، وط: ج٤ ص٥٠٨، حديث٧٤٥٨؛ مجمع البحرين للهيثمي ج٢ ص٣١٣، حديث٢٢٤٣؛ مختصر زوائد البزار للعسقلاني ج١ ص٥٧٥، حديث١٠١٨)

محدثین کرام نے اس حدیث شریف کے لفظ ''ذُوْ قَرْنَیْھَا'' کی متعدد توجیہات کی ہیں، یہاں ہم ان کے مختار معانی نقل کر رہے ہیں۔ امام زکی الدین عبد العظیم المنذری (متوفی ٦٥٦ھ) سیدنا علی ؓ کے ذو قرن ہونے کی توجیہ میں لکھتے ہیں:

''ذُوْ قَرْنَي الْجَنَّةِ'' (جنت کے دو قرن والے) کا معنیٰ ہے اُس کی دو طرفوں والا ہونا، اُس کا

بااختیار مالک ہونااور اُس کے تمام مقامات میں یوں دورہ فرمانا جیسا کہ سکندر ذوالقرنین نے شرقاً غرباً زمین کے تمام اطراف کا دورہ کیا تو بعض اقوال کے مطابق وہ ذوالقرنین مشہور ہو گیا، یہ معنی قریب الفہم ہے اور اس کے علاوہ بھی معانی ہیں"۔

(الترغيب والترهيب ج٣ص ٢٤ ،وطبعة في مجلد واحد ص ٧٦٣)

حافظ ابوبکر محمد بن ابراہیم الکلاباذی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۳۸۰ھ) لکھتے ہیں:

"اِنَّکَ ذُوْ قَرْنَيْهَا" کا معنی ہے کہ اے علی تم جنت کے مخصوص اور بڑے ملک کے بادشاہ ہو، اور بیشک تمہارے لیے جنت میں ایک پورا ملک ہے جیسا کہ ذوالقرنین کے لیے پوری زمین مخصوص تھی وہ اس کے مشرق و مغرب تک کا دورہ کرتا تھا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿یہاں تک کہ جب وہ غروبِ آفتاب کی جگہ پہنچا تو اس نے اسے یوں پایا گویا وہ ڈوب رہا ہے ایک سیاہ کیچڑ کے چشمہ میں﴾ [الکہف: ٨٦] اور ارشاد فرمایا: ﴿یہاں تک کہ جب وہ پہنچا طلوعِ آفتاب کے مقام پر تو اس نے پایا سورج کو کہ وہ طلوع ہو رہا ہے ایک قوم پر﴾ [الکہف: ٩٠] سو اللہ تعالیٰ نے اُس کے مشرق و مغرب تک پہنچنے کا ذکر کیا اور فرمایا: ﴿یقیناً ہم نے اقتدار بخشا تھا اسے زمین میں اور دیا تھا ہم نے اسے ہر چیز کے حصول کا سبب﴾ [الکہف: ٨٤] پس واضح ہو گیا کہ وہ پوری زمین کا بادشاہ تھا اُس کے آغاز سے انتہا تک پہنچتا تھا، سو اسی طرح حضرت علی علیہ السلام کے لیے تمام بادشاہوں کے مابین جنت میں ایک مخصوص ملک ہوگا، کیونکہ جنت میں اسی طرح بادشاہ ہوں گے جس طرح دنیا میں بادشاہ ہوتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"کیا میں تمہیں جنت کے بادشاہوں کے متعلق نہ بتلاؤں؟ صحابہ کرام نے عرض کیا: کیوں نہیں، فرمایا: ہر وہ الجھے ہوئے بالوں والا، غبار آلود، دو پھٹے کپڑے پہننے والا، محفل سے دھتکارا جانے والا شخص ہے، اگر وہ اللہ تعالیٰ پر قسم ڈالے تو وہ ضرور اس کی قسم کو پورا فرمائے"۔

پس حضور ﷺ نے آگاہ فرمایا کہ جنت میں بادشاہ ہوں گے اور سیدنا علی المرتضیٰ علیہ السلام اُن سب سے بڑے بادشاہ ہوں گے اور وہ ان لوگوں میں سے ہوں گے جن کی بادشاہت پوری جنت پر ہوگی، جیسا کہ ذوالقرنین پوری زمین کا بادشاہ تھا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿اور (اہلِ جنت) کہیں گے ساری تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے پورا فرمایا ہمارے ساتھ

اپنا وعدہ اور وارث بنا دیا ہمیں اس پاک زمین کا، اب ہم ٹھہریں گے جنت میں جہاں چاہیں گے﴾[الزمر:٧٤]معلوم ہوا کہ اہل جنت جہاں چاہیں گے ٹھہریں گے، اور تمام اہل جنت کے مخصوص درجات اور مقرر ٹھکانے ہوں گے۔ چنانچہ ارشاد نبوی ﷺ ہے: ''بعض اہل جنت کے لیے یوں مقام ہوگا اور بعض کے لیے یوں''۔ اس سے معلوم ہوا کہ سیدنا علی ﷺ کی جو جنت میں بادشاہی ہوگی وہ محدود و منتہی نہیں ہوگی بلکہ اُن کی بادشاہی پوری جنت میں ہوگی وہ جہاں چاہیں گے ٹھہریں گے''۔

(بحر الفوائد، المشهور بمعاني الأخبار ملخصاً ج١ ص ٤٥١، ٤٥٢، ٤٥٣)

بعض علماء کرام نے ''إِنَّکَ ذُوْ قَرْنَیْهَا'' کی تشریح میں یہ بھی کہا ہے کہ سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ پوری امت اور تمام روئے زمین کے بادشاہ ہیں۔ چنانچہ امام کلاباذی سے قبل امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ٣٢١ھ) نے لکھا تھا:

''اس سے مراد یہ ہے کہ تم اس امت کے ذوالقرنین ہو، پس ''الأمة'' کا لفظ محذوف کر دیا، جیسا کہ اللہ ﷻ کا ارشاد ہے: ﴿وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ﴾ (اور اگر اللہ تعالیٰ پکڑ لیا کرتا لوگوں کو اُن کے کرتوتوں کے باعث تو نہ چھوڑتا اُس کی پشت پر کسی جان دار کو)[فاطر:٤٥] اور دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿مَا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ﴾ (نہ چھوڑتا اس پر کسی جان دار کو)[النحل:٦١] یہاں ''اس کی پشت پر'' اور ''اُس پر'' سے مراد زمین ہے، حالانکہ اس سے قبل اس کا ذکر نہیں ہے، اور اسی طرح اللہ ﷻ کا یہ ارشاد ہے: ﴿حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ﴾ (یہاں تک کہ وہ چھپ گیا پردے کے پیچھے)[صٓ ٣٢] اس سے آفتاب مراد لیا ہے اور اس کو لفظاً محذوف رکھا ہے''۔

(شرح مشكل الآثار ج٥ ص ١٢٠، حديث ١٨٦٥؛ تحفة الأخيار ج٩ ص ١٨٨)

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے آگے بھی بہت عمدہ لکھا ہے، بہرکیف امام منذری، امام کلاباذی اور امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہم کی تشریح سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کو جنت اور تمام روئے زمین کا مختار بادشاہ بنایا ہے، لہٰذا اس کو ظاہر یا باطن جس معنیٰ پر بھی محمول کیا جائے اس میں ایک بھرپور عملی سیادت کا معنیٰ موجود ہے۔ شاید اسی حقیقت کے اظہار کے لیے جس قلم سے یہ لکھا گیا تھا:

''جس کا نام محمد یا علی ہے وہ کسی چیز کا مختار نہیں''۔

(تقویۃ الایمان مع تذکیر الاخوان ص ۴۳)

اُسی قلم سے کسی کے تصرف نے یہ بھی لکھوادیا:

''اور حضرت علی مرتضیٰ ﷺ کے لیے شیخین رضی اللہ عنہما پر بھی ایک گونہ فضیلت ثابت ہے، اور وہ فضیلت آپ کے فرمانبرداروں کا زیادہ ہونا اور مقامات ولایت بلکہ قطبیت اور غوثیت اور ابدالیت اور انہی جیسے باقی خدمات آپ کے زمانہ سے لے کر دنیا کے ختم ہونے تک آپ ہی کی وساطت سے ہونا ہے، اور بادشاہوں کی بادشاہت اور امیروں کی امارت میں آپ کو وہ دخل ہے جو عالم ملکوت کی سیر کرنے والوں پر مخفی نہیں''۔

(صراط مستقیم مترجم ص ۶۷ کتب خانہ رحیمیہ دیوبند، یوپی)

پنجتن پاک اور سیادت

یہاں یہ پہلو بھی مدنظر رہے کہ اہلِ کساء (چادر والی) تمام کی تمام ہستیاں سیادت سے متصف ہیں۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ تمام اولادِ آدم علیہ السلام کے سید ہیں، سیدتنا فاطمۃ الزہراء علیہا السلام خواتینِ اہلِ جنت کی سیدہ ہیں، حسنین کریمین علیہما السلام نوجوانانِ اہل جنت کے سید ہیں اور سیدنا علی علیہ السلام سید العرب ہیں اور باقی جتنے اہلِ عرب ہیں وہ آپ کی سیادت میں آتے ہیں۔

غیر حسنی یا حسینی شخص کا خود کو سید کہلوانا کیسا؟

خیال رہے کہ احادیث مبارکہ میں ان پانچوں حضرات کی شان میں لفظِ ''سید'' صراحتاً آیا ہے، لہٰذا جب مطلقاً سیادت کا ذکر ہوگا تو فقط یہی ہستیاں مراد ہوں گی۔ نیز یہاں یہ پہلو بھی ملحوظ خاطر رہے کہ ان کے بعد بھی کوئی قوم یا شخص سیادتِ مطلقہ کا حامل نہیں ہوسکتا، ماسوا اس کے کہ وہ ان پانچوں کی اولاد میں سے ہو، مگر حسنی یا حسینی ہو۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ وہ سیدتنا فاطمۃ الزہراء علیہا السلام کی نرینہ اولاد کی اولاد ہو، جو شخص فقط سیدتنا فاطمۃ الزہراء علیہا السلام کی بیٹیوں کی اولاد سے ہو وہ سیادتِ مطلقہ کا مستحق نہیں۔

اسی طرح ہاشمی حضرات کو چاہیے کہ وہ خود کو مطلقاً سید کہلوانے سے اجتناب فرمائیں، خصوصاً برصغیر پاک و ہند میں تو زیادہ پرہیز کرنا چاہیے، کیونکہ اس خطے میں ہاشمی اور قریشی تو کیا دوسرے لوگ بھی سید کہلوانے لگے ہیں۔

راقم الحروف نے اپنی کتاب "مناقب الزهراء" میں لکھا تھا کہ علوی، عقیلی، جعفری اور عباسی حضرات اپنی ان نسبتوں کے ساتھ ساتھ اگر خود کو سید لکھیں یا کہیں تو جائز ہے۔ میرا یہ لکھنا اگرچہ میزانِ علم کی رو سے جائز تھا مگر خدشہ ظاہر کیا گیا کہ اس سے بعض لوگ ناجائز فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔اس پر میری گزارش ہے کہ مفاد پرست تو قرآن کریم سے بھی ناجائز فائدہ اٹھانے کے چکر میں رہتے ہیں، بہرحال "علوی، عقیلی، جعفری اور عباسی" حضرات سے دوبارہ گزارش ہے کہ وہ خود کو مطلقاً سید نہ لکھوائیں اس لیے کہ یہ اصطلاح کے منافی ہونے کی وجہ سے شرعاً بھی ناجائز ہے اور احادیث میں اس سلسلے میں سخت وعید آئی ہے۔

راقم الحروف کو مغفرت کی اُمید

جب میں لفظِ سید کے لغوی اور اصطلاحی معنی میں غور کرتا ہوں اور پھر میری نگاہ ان پانچ نفوسِ مقدسہ پر جاتی ہے جنہیں دنیا اور خصوصاً آخرت کی سیادت حاصل ہے تو دل میں اطمینان پیدا ہو جاتا ہے کہ جس کے ایسے پانچ سید (تکالیف و مصائب کو دور کرنے والے) ہوں اُسے خطرہ کس بات کا؟ اور پھر بے ساختہ زبان پر یہ الفاظ جاری ہو جاتے ہیں:

لي خمسة أطفي بها حر الوباء الحاطمة

المصطفىٰ والمرتضىٰ وابنا هما والفاطمة

فائدہ

ہمارے بعض احباب کو بادی النظر میں ہمارا یہ خیال ضعیف الاعتقادی محسوس ہوا، لہٰذا ہم ان کی اور دوسرے قارئین کرام کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ قرآن کریم میں ہے "قیامت کے دن تمام گہرے دوست ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے ماسوا متقین کے۔(الزخرف:٦٧) اس آیت کا محض یہ مطلب نہیں کہ ایک متقی دوسرے متقی کا ہی دوست ہوگا بلکہ اگر ایک متقی ہوگا اور دوسرا غیر متقی ہوگا تو متقی شخص پھر بھی اپنی دوستی نبھائے گا، یہ حقیقت متعدد احادیثِ صحیحہ میں صراحتاً بیان فرمائی گئی ہے۔ چنانچہ بخاری شریف میں ایک حدیث کئی مقامات پر باختلاف الفاظ آئی ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ! قیامت کب آئے گی؟ فرمایا: تم نے اس کے لیے کیا تیاری کی ہے؟ اُس نے عرض کیا:

لَا شَيْءَ، إلا أني أحب اللّٰه ورسوله ﷺ، فقال: أنت مع من أحببت.

"کچھ بھی نہیں تیار کیا، مگر میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرتا ہوں، ارشاد فرمایا: تم اسی کے ساتھ ہوگے جس سے محبت کرتے ہو"۔

حضرت انس ؓ نے فرماتے ہیں: اس ارشادِ نبوی ﷺ پر ہم جتنا خوش ہوئے اتنا کسی چیز پر بھی خوش نہیں ہوئے۔ وہ فرماتے ہیں: میں نبی کریم ﷺ حضرت ابوبکر اور عمر ؓ سے محبت کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ میں انہیں کے ساتھ ہوں گا "وإن لم أعمل بمثل أعمالهم" (اگر چہ میں نے ان کے اعمال کی طرح عمل نہیں کیا)"۔

(بخاري ص ٦١٩، حديث ٣٦٨٨)

غالباً حضرت انس ؓ نے اپنے اُن محبوبوں کا ذکر کیا ہے جو اُس وقت وصال فرما گئے تھے، ورنہ انہیں درجہ بدرجہ تمام اہل بیت وصحابہ کرام ؓ سے محبت تھی، اسی طرح احقر نے بھی اُن ہستیوں پر فخر کیا ہے جن کے تذکرہ میں مشغول ہے، ورنہ مجھے بھی درجہ بدرجہ تمام آل واصحاب ؓ سے محبت ہے، اور ایسی محبت کی وجہ سے بلا شک وشبہ ہر محبّ اپنے محبوب کے ساتھ ہوگا اور یہ احقر بھی ضرور بالضرور پنجتن پاک، شیخین کریمین اور دوسرے تمام اسلاف کرام ؓ کے ساتھ ہوگا، اگر چہ اعمالِ حسنہ کے لحاظ سے اس کا دامن یکسر خالی اور اعمالِ سیہ کے لحاظ سے اس کا دامن مکمل سیاہ ہے۔ خصوصاً ہماری حالت جتنی دگرگوں ہے قیامت کے دن اُن سادات کرام علیہم السلام کی توجہ ہماری طرف اتنی ہی زیادہ ہوگی، اور اس خصوصی توجہ کو دیکھ کر نیکوکار ہستیاں رشک کرتی ہوں گی۔ شاید ایسے ہی موقعہ کے لیے کسی محبّ نے کہا تھا:

کیا ہی ذوق افزا شفاعت ہے تمہاری واہ واہ
قرض لیتی ہے گنہ پرہیزگاری واہ واہ

(حدائق بخشش ص ۸۹)





بابِ مرتضوی کے علاوہ تمام ابواب بند

﴿۲۲﴾ أخبرنا ابن قدامة، أنا ابن عبد الواحد، أنا ابن الحصين، أنا أبو علي، أنا أبو بكر، ثنا أحمد بن عبد الله بن محمد، حدثني أبي، حدثنا محمد بن جعفر، ثنا عوف عن ميمون عن زيد بن أرقم قال: كان لنفر من أصحابِ رسول الله ﷺ أبوابٌ شارعة في المسجد. قال: فقال يوماً:

سدوا هذه الأبواب إلا باب عليّ، قال: فتكلم في ذلک أناس، فقام رسول الله ﷺ فحمد اللّٰه وأثنیٰ عليه، ثم قال: أما بعد: فإني أمرت بسدِّ هذه الأبواب غير باب علي، فقال قائلكم، وإني والله ماسددتُ باباً ولا فتحته، ولكني أمرتُ بشيء فاتَّبَعْتُهُ.

﴿۲۲﴾ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کچھ حضرات کے دروازے مسجد کی طرف کھلتے تھے تو آپ نے فرمایا: علی (رضی اللہ عنہ) کے دروازہ کے علاوہ یہ تمام دروازے بند کردیے جائیں۔ اس پر کچھ لوگوں نے تبصرہ کیا تو رسول اللہ ﷺ نے ایک خطبہ دیا اور حمد وثنا کے بعد ارشاد فرمایا: علی کے دروازے کے علاوہ ان تمام دروازوں کے بند کرنے کا مجھے حکم ہوا ہے، اور تم میں سے بعض لوگوں نے اس پر کلام کیا ہے، بخدا! میں نے کسی دروازے کو از خود بند نہیں کیا اور نہ ہی کسی دروازے کو از خود کھولا، لیکن مجھے جس چیز کا حکم ہوتا ہے میں اسی کی پیروی کرتا ہوں۔

(مسند أحمد ج٤ ص٣٦٩، حديث١٩٥٠٢، وط: ج٣٢ ص٤١، حديث١٩٢٨٧؛ فضائل الصحابة ج٢ ص٧١٨، ٧٢٠، حديث٩٨٥؛ السنن الكبرى للنسائي ج٧ ص٤٢٢، حديث٨٣٦٩، وط: ج٥ ص١١٨، حديث٨٤٢٣؛ المستدرك ج٣ ص١٢٥، حديث٤٦٨٨؛ مجمع الزوائد ج٩ ص١١٤، حديث١٤٦٧١؛ البداية والنهاية ج٥ ص٤٥٦؛ الحاوي للفتاوي ص٤٢٢؛ الرياض النضرة ج٤ ص١٣٦)

مصنف رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

حديث حسن، وقد رواه أبو الأشهب عن عوف عن ميمون، عن البراء بن عازب، وروي عن ابن عباس في حديث طويل، وورد أيضاً من حديث سعد، ولاينافي ما في صحيح

البخاري من أمره ﷺ في مرض موته بسد الأبواب إلا باب أبي بكر الصديق، لأن هذا كان في حال حياته ﷺ لاحتياج فاطمة رضي الله عنها إلى المرور من بيتها إلىٰ بيت أبيها فجعل هذا رفقاً بها وستراً وغيرةً عليها، وأما بعد وفاته فلما زالت هذه العلة احتيج إلىٰ فتح باب الصديق لأجل خروجه إلى المسجد ليصليٰ بالمسلمين إذا كان هو الخليفة بعده، ورفقاً به أيضاً، وإشارة إلىٰ أنه القائم بعده ولذلک قال ﷺ في الحديث الذي سيأتي:

یہ حدیث حسن ہے، اس کو ابوالاشہب نے از عوف، از میمون، از براء بن عازب رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے، اور یہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی ایک طویل حدیث میں آئی ہے، نیز یہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے، اور یہ اُس حدیث کے منافی نہیں جو صحیح بخاری میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے مرضِ وصال میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دروازے کے سوا تمام دروازوں کو بند کرنے کا حکم فرمایا تھا۔ اس لیے کہ یہ (بابِ علی والا) حکم حضور ﷺ کی حالتِ حیات میں سیدتنا فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی ضرورت کے پیشِ نظر تھا، تا کہ وہ اپنے گھر سے اپنے بابا کے گھر آ ئیں، پس یہ اُن پر شفقت، اُن کے پردے اور اُن کی عظمت کے پیشِ نظر تھا، البتہ بعد از وصال جب یہ ضرورت ختم ہوگئی تو بابِ صدیق کو کھولنے کی ضرورت محسوس کی گئی تا کہ وہ مسجد کی طرف نکل کر مسلمانوں کی امامت کریں، اس میں اُن پر شفقت بھی ہے اور اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے بعد وہی آپ کے خلیفہ ہوں گے، اسی لیے آپ ﷺ نے آئندہ حدیث میں فرمایا:

کیا قبل از وصالِ نبوی ﷺ بابِ علی بند ہوا؟

دراصل مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے یہ الفاظ حافظ ابن کثیر کی معروف تصنیف "البداية والنهاية" سے نقل کیے ہیں، اس پر ہماری گزارش ہے کہ یہ حافظ ابن کثیر کے الفاظ ہوں یا مصنف کے اپنے الفاظ ہوں ہمیں اس استدلال سے اتفاق نہیں ہے، کیونکہ اس کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے آخری ایام میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دروازہ کے علاوہ تمام دروازے بند کرا دیے تھے حتیٰ کہ دروازۂ علی بھی بند کرا دیا تھا کیونکہ پہلے وہ دروازہ بقولِ مصنف فقط سیدتنا فاطمۃ الزہراء علیہا السلام کی سہولت کے لیے کھلا ہوا تھا۔ لیکن مصنف رحمۃ اللہ علیہ کا یہ استدلال درست نہیں، کیونکہ مصنف کی درج فرمودہ کے حدیث کے الفاظ "أبوابٌ شارعةٌ في المسجد" ہیں، "أبوابٌ شارعة في الحجرة" نہیں، اور سیدتنا فاطمۃ الزہراء علیہا السلام اپنے گھر سے

اپنے بابا کے گھر آتی تھیں نہ کہ مسجد میں۔ پھر حدیث میں "أمرت بسدّ هذه الأبواب غير باب علي" ہے "غير باب فاطمة" نہیں۔ تعجب ہے کہ مصنف رحمۃ اللہ علیہ کو اتنا بڑا ذہول لاحق ہو گیا کہ بات مسجد کی طرف کھلنے والے دروازوں کی ہو رہی ہے مگر اُن کا ذہن حجرۂ نبوی اور حجرۂ فاطمہ [علیہا السلام] کی طرف چلا گیا۔ اہل علم اگر مصنف رحمۃ اللہ علیہ کے ان الفاظ "المرور من بيتها إلىٰ بيت أبيها" میں غور فرمائیں گے تو وہ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے۔

البتہ مصنف رحمۃ اللہ علیہ کا یہ استدلال مجموعی طور پر درست ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے مرض وصال میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دروازے کے سوا تمام دروازوں کو بند کرنے کا حکم فرمایا تھا اور اس استدلال کا باقی حصہ بھی تقریباً درست ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مکمل درست کیوں نہیں؟ جواباً عرض ہے: اس لیے کہ مسجد کی طرف کھلنے والا سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا دروازہ اس سے قبل ہی بند ہو چکا تھا۔ چنانچہ امام بزار رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> ''سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف حکم بھیجا کہ وہ اپنا دروازہ بند کر لیں۔ انہوں نے عرض کیا: میں نے فرمان سنا اور تعمیل کرتا ہوں، پھر انہوں نے اپنا دروازہ بند کر لیا، پھر آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف حکم بھیجا، پھر اسی طرح حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی طرف حکم بھیجا۔ پھر فرمایا: میں نے از خود تمہارے دروازے بند نہیں کیے اور از خود علی رضی اللہ عنہ کا دروازہ کھلا نہیں رکھا بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہی علی (رضی اللہ عنہ) کا دروازہ کھلا رکھا ہے اور تمہارے دروازے بند کیے ہیں''۔

(مسند البزار ج٢ ص١٤٤، حديث٥٠٦؛ كشف الأستار ج٣ ص١٩٥، حديث٢٥٥٢؛ مجمع الزوائد ج٩ ص١١٥، حديث١٤٦٧٣؛ مختصر زوائد البزار للعسقلاني ج٢ ص ٣٠٩، حديث ١٩١٦؛ الحاوي للفتاوي ص٤٢٢)

پھر اس استدلال کے تقریباً درست ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ آخری ایام نبوی ﷺ میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دروازے کو مستثنیٰ نہیں فرمایا گیا تھا بلکہ "خَوْخَة" (کھڑکی / روشن دان) کو مستثنیٰ فرمایا گیا تھا، کیونکہ مذکور الصدر حدیث کے مطابق دروازہ تو پہلے ہی بند ہو چکا تھا۔ ہمارے اس خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ بخاری شریف میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث تین مقامات پر منقول ہے اور اُن میں سے ایک مقام پر "بَابٌ" کی بجائے "خَوْخَة" کا لفظ ہے۔ بخاری کے علاوہ دوسری کتب حدیث میں بھی یہ لفظ آیا ہے۔

فرمایئے:(بخاري ص ٦٥٦، حديث ٣٩٠٤؛صحيح مسلم رقم المسلسل ٦١٧٠؛صحيح ابن حبان ج٩ ص ٥، حديث ٦٨٢١، ٦٨٢٢)

سیدنا ابن عباس ﷺ سے بھی یہی الفاظ منقول ہیں۔

(بخاري ص ٨١، حديث ٤٦٧)

جب بعض احادیث سے ثابت ہو چکا ہے کہ بشمول سیدنا ابوبکر ﷺ تمام صحابہ کرام ﷺ نے فرمانِ نبوی ﷺ کی تعمیل میں اپنے اپنے دروازے بند کر دیئے تھے اور کسی حدیث میں اُن کے دوبارہ کھولے جانے کا ذکر بھی نہیں ملتا تو لامحالہ "باب" کے الفاظ پر "خَوْخَة" کے الفاظ کو ترجیح ہوگی، یعنی سیدِ عالم ﷺ نے وصال اقدس سے قبل سیدنا ابوبکر صدیق ﷺ کے گھر کی کھڑکی کو مستثنیٰ رکھا تا کہ انہیں اذان کی آواز بہ آسانی پہنچے اور دوسری سہولتیں بھی مہیا ہوں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع کی تقریباً تمام احادیث کا احاطہ کیا ہے اور اُن کے مابین عمدہ مطابقت بیان فرمائی ہے۔ اہل علم کو چاہیئے کہ "فتح الباري" یا "القول المسدد" کا مطالعہ فرمائیں، اور مجھ ایسے اردو داں شخص کو چاہیئے کہ راقم الحروف کی کتاب "شرح خصائص علي ﷺ" صفحہ حدیث ۳۷ تا ۴۲ کا مطالعہ کرے، تاہم حافظ رحمۃ علیہ اللہ کے کلام کا خلاصہ یہاں بھی پیش خدمت ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"حاصل کلام یہ ہے کہ دروازوں کو بند کرنے کا حکم دو مرتبہ ہوا ہے۔ پہلی بار سیدنا علی ﷺ کو مستثنیٰ رکھا گیا اور دوسری مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق ﷺ کو، لیکن یہ بیان مکمل سمجھا نہیں جا سکتا جب تک کہ سیدنا علی ﷺ کے باب کو حقیقی دروازے پر اور حضرت ابوبکر ﷺ کے باب کو مجازی دروازے پر محمول نہ کیا جائے، اور اس مجازی دروازہ سے مراد "خَوْخَة" (کھڑکی) ہے جیسا کہ بعض طرق حدیث میں اس کی تصریح موجود ہے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ جب دروازوں کو بند کرنے کا حکم ہوا تو سب نے دروازے بند کر دیئے اور کھڑکیاں کھول لیں جن سے مسجد میں دخول ہو سکتا تھا، پھر بعد میں ان کھڑکیوں کو بھی بند کرنے کا حکم ہوا۔ پس اس طریقہ سے دونوں حدیثوں کے مابین مطابقت دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ امام ابوجعفر طحاوی ﷺ نے "مشكل الآثار" میں اور ابوبکر کلاباذی نے "معاني الأخبار" میں اسی طرح مطابقت بیان کی ہے، اور انہوں نے تصریح کی ہے کہ حضرت ابوبکر ﷺ کا دروازہ مسجد سے باہر اور کھڑکی مسجد کے اندر کھلتی تھی اور

سیدنا علی ﷜ کے گھر کا دروازہ داخلِ مسجد کے علاوہ تھا ہی نہیں۔ واللہ أعلم"۔

(فتح الباري ج۷ص۳٦۳؛القول المسدد فی الذب عن مسند الإمام أحمدص۳۲)

تفصیل یا تلخیص کے ساتھ امام بدرالدین عینی، امام سیوطی، امام قسطلانی، امام سمہودی اور علامہ محمد ادریس کاندھلوی نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔

(عمدة القاري ج۱٦ص۱۷٦؛اللآلی المصنوعة ج۱ص۳۱۸؛إرشادالساري ج۷ص۱٤۷؛وفاء الوفاج۲ص٤۷٤،تا٤۷۷؛التعلیق الصبیح علیٰ مشکاة المصابیح ج۷ص۳۳۰،۳۳۱)

ظاہر یہ ہے کہ سیدنا علی المرتضیٰ ﷜ کے دروازے کے استثنا کو نبی کریم ﷺ نے تا حیاتِ ظاہری کالعدم نہیں فرمایا تھا۔ اس لیے کہ وسیع المطالعہ محدثین کرام نے قبل از وصالِ نبوی ﷺ کی احادیث کے الفاظ "لا یبقین فی المسجد بابٌ إلا سُدّ إلا باب أبي بکر" اور "سدوا عني کل خوخة في هذا المسجد غیر خوخة أبي بکر" سے "خَوْخَة" کے لفظ کو ترجیح دی ہے، اور مسجد شریف کی طرف سیدنا علی المرتضیٰ ﷜ کا "خَوْخَة" نہیں بلکہ "باب" مفتوح تھا۔

اس حدیث کی دوسری سندیں

مصنف رحمہ اللہ نے جو اس حدیث کی دوسری سندوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے، اُن تمام احادیث کو ہماری کتاب "شرح خصائص علي ﷜" میں دیکھا جائے۔ نیز مصنف علاّم نے سیدنا ابن عباس ﷜ کی جس طویل حدیث میں اس حدیث کی شمولیت کا اشارہ فرمایا ہے اُس میں بعینہٖ یہی الفاظ تو نہیں تاہم یہ مفہوم موجود ہے۔ وہ صحیح حدیث ہے، اور اس میں ہے کہ بعض نواصب کی بکواسات سے کبیدہ خاطر ہو کر سیدنا ابن عباس ﷜ نے سیدنا علی المرتضیٰ ﷤ کے دس خصائص بیان فرمائے تھے۔ مکمل حدیث پڑھنے کی چیز ہے، امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ کی "خصائص علي ﷜" کے متن کی تحسیں [۲۳] نمبر حدیث ہے۔ احقر کے قلم سے اللہ ﷻ نے اس حدیث کی بہترین تحقیق وتشریح کرادی ہے، والحمد للہ علیٰ ذلک۔





خصوصی طہارتِ مرتضوی

﴿۲۳﴾ أخبرنا عمر بن الحسين قراءةً مني عليه،أنا علي بن أحمد، أنا عمر بن محمد، أنا أبو الفتوح،أنا ابن القاسم، أنا الجراحي، أنا المحبوبي، أنا أبوعيسىٰ الحافظ، ثنا علي بن المنذر، ثنا ابن فضيل، عن سالم بن أبي حفصة،عن عطية، عن أبي سعيد قال:قال رسول الله ﷺ لعلي:

ياعلي لا يحل لأحدٍ أن يجنب في هذا المسجد غيري وغيرك.

قال علي بن المنذر:قلتُ لضرار بن صرد:ما معنىٰ هذا الحديث؟ قال: لا يحل لأحد يستطرقه جنباً غيري وغيرك.

قال الترمذي:حديث حسن غريب لانعرفه إلا من هذا الوجه، وقد سمع محمد بن إسماعيل.يعنى البخاري.مني هذا الحديث.

﴿۲۳﴾ حضرت ابوسعید خدری ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اے علی! میرے اور تیرے سوا کسی کے لیے حلال نہیں کہ وہ اِس مسجد میں جنبی حالت میں رہے۔

علی بن منذر کہتے ہیں: میں نے ضرار بن صرد سے پوچھا: اس حدیث کا کیا معنیٰ ہے؟ انہوں نے کہا: کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ حالتِ جنابت میں مسجد کو گذرگاہ بنائے، میرے اور تیرے سوا۔

امام ترمذی فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن غریب ہے، میں اس کو اس سند کے علاوہ نہیں جانتا، اور مجھ سے محمد بن اسماعیل یعنی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ حدیث سنی تھی۔

(سنن الترمذي ص٨٤٨،حديث٣٧٢٧)

مصنف رحمہ اللہ نے مذکورہ بالا حدیث [۲۲] کے آخر میں اپنے استدلال کی تائید میں اِس حدیث [نمبر ۲۳] کی طرف اشارہ کیا تھا، اس سے غالباً اُن کا مقصد یہ تھا کہ سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کے دروازہ کو مستثنیٰ رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ اُن کے لیے اُس دروازہ کے سوا دوسری کوئی گذرگاہ اور راہ نہیں تھی۔ اسی لیے انہوں نے ضرار بن صرد کا بیان کردہ مطلب بھی ساتھ لگانا ضروری سمجھا ہے۔ لیکن مصنف رحمۃ اللہ علیہ کا گمان اور ضرار بن صرد کا بیان کردہ معنیٰ درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث میں سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کی عطائی طہارت اور خصوصیت کا ذکر ہے۔

وہ یہ کہ سیدنا علی المرتضیٰ ﷛ پیدا ہوتے ہی حنفیت پر قائم تھے، پھر انہیں آغوشِ نبوی میسر آ گئی، پھر آیتِ تطہیر کے نزول پر سید العالمین ﷺ نے انہیں اپنی خاص چادر کے نیچے لے لیا اور مزید طہارت کی دعا فرمائی تو وہ طہارت کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہو گئے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس قدر اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے؟ آیئے یہ سوال ہم اُس شخصیت سے پوچھتے ہیں جن کے بارے میں ہمارے بعض معاصرین کا کہنا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ سے پوچھ پوچھ کر کتابیں لکھنے کے عادی تھے۔ وہ آیتِ تطہیر پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فما ظنک بأهل البيت في نفوسهم؟ فهم المطهرون بل هم عين الطهارة، فهذه الآية تدل علىٰ أن الله قد شرک أهل البيت مع رسول الله ﷺ في قوله تعالىٰ: لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ.

"اہل بیت کے نفوسِ مقدسہ کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے؟ کیا وہ طاہر ہیں؟ نہیں، بلکہ وہ عین طہارت ہیں۔ پس یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل بیت کرام علیہم السلام کو اپنے ارشاد: "لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ" میں شریک فرمایا ہے"۔

(الفتوحات المكية ج١ ص ٤٧٠، وط: ج١ ص ٢٩٨؛ فضل أهل البيت للمقريزي ص ٤٤)

بتلایئے، کیا عین طہارت ہستیوں پر دوسروں کو قیاس کیا جا سکتا ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں! لہٰذا یہ سمجھنا کہ دوسرا راستہ نہ ہونے کی مجبوری کے باعث سیدنا علی ﷛ کو مسجد سے گذرنے کی اجازت تھی، سراسر غلط ہے۔ اس مفہوم کے غلط ہونے کی ایک واضح دلیل حدیث نمبر ۲۸ کے متن میں آ رہی ہے، لیکن اگر بعض حضرات کو اس سے زیادہ تفصیل درکار ہو تو ہماری کتاب "شرح خصائص علي ﷛" میں حدیث ۴۲ کی تشریح ملاحظہ فرمائیں۔





امہات المومنین رضي الله عنهن کی خصوصیت

مصنف رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

﴿۲٤﴾ قلتُ: وقد رواه الحافظ ابن عساكر من طريق كثير النواء عن عطية عن أبي سعيد، ثم روي من طريق أبي نعيم، ثنا عبد الملك بن أبي عيينة، عن أبي الخطاب عمر الهجري، عن مخدوج عن جسرة بنت دجاجة قالت: أخبرتني أم سلمة قالت: خرج النبي ﷺ في مرضه حتىٰ انتهىٰ إلىٰ صرحة المسجد فنادى بأعلىٰ صوته:

لايحل المسجد للجنب، ولاللحائض إلا لمحمد وأزواجه، وعلي وفاطمة بنت محمد.

ثم رواه من حديث أبي رافع نحوه وفي إسناده غرابة.

﴿۲٤﴾ میں کہتا ہوں: حافظ ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ کثیر النواء کی سند سے از عطیہ، از ابوسعید روایت کیا ہے، پھر ابونعیم کی سند سے روایت کیا ہے کہ ہمیں عبدالملک بن ابوعیینہ نے از ابوالخطاب عمر الہجری، از مخدوج، از جسرہ بنت دجاجہ روایت کیا ہے، وہ فرماتی ہیں: مجھے حضرت ام سلمہ نے بیان فرمایا کہ نبی کریم ﷺ اپنی بیماری میں باہر تشریف لائے حتیٰ کہ صحن مسجد تک پہنچے تو بہ آواز بلند فرمایا: کسی جنبی، کسی حائضہ کے لیے مسجد حلال نہیں، ماسوا (سیدنا) محمد ﷺ اور اُن کی ازواج مقدسہ، علی اور فاطمہ بنت محمد علیہم السلام کے۔ پھر انہوں نے اس حدیث کو ابورافع سے اسی طرح روایت کیا ہے اور اس کی سند میں غرابت ہے۔

امہات اور اہل کساء علیہم السلام کی طہارت میں فرق

ہر چند کہ اس حدیث کی سند میں غرابت ہے اور بعض دوسری احادیث میں بھی امہات المومنین رضوان اللہ علیہن کا ذکر نہیں ہے، چنانچہ امام بیہقی اور دوسرے علماء کرام رحمۃ اللہ علیہم نے ایک حدیث نقل فرمائی ہے جس میں امہات المومنین کا ذکر نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ألا إن مسجدي حرام علىٰ كلِّ حائض مِن النساءِ وكل جنب من الرجال

إلا على محمد وأهل بيته، علي وفاطمة والحسن والحسين رضي الله عنهم۔

''آگاہ رہو! بیشک میری مسجد عورتوں میں سے ہر حائض عورت اور مردوں میں سے ہر جنبی مرد پر حرام ہے، ماسوا محمد (ﷺ) اور اُن کے اہل بیت علی، فاطمہ، حسن اور حسین کے''۔

بعض احادیث کے آخر میں یہ ارشاد بھی ہے:

ألا قد بينتُ لكم الأسماء أن لا تضلوا.

''خبردار! ہم نے تمہارے سامنے نام بیان کردیے ہیں تاکہ تم بھول نہ جاؤ''۔

(السنن الكبرى للبيهقي ج٧ص٦٥،٦٦،وط: ج٧ص١٠٤، حديث ١٣٤٠٠،١٣٤٠٢؛ تاريخ المدينة المنورة ج١ص٣٨؛ تاريخ دمشق ج٤٢ص١٤١؛ مختصر تاريخ دمشق ج٧ص١٢٣ وج ١٧ص٣٤٣؛ تلخيص الحبير ج٣ص٢٨٨؛ الخصائص الكبرىٰ ج٢ص٤٢٤؛ اللآلي المصنوعة ج ١ ص٣٢٣؛ سبل الهدىٰ ج١٠ص٤٢٣؛ كشف الغمة ج١ص٧٥؛ زرقاني على المواهب ج٧ص١٥٣)

تاہم امہات المومنین آیت تطہیر میں شامل ہیں اور قرآن مجید کی نص ''يَانِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ''[الأحزاب:٣٢] (اے نبی کی ازواج! تم عورتوں میں سے کسی کی مثل نہیں ہو) کے مطابق جب وہ دوسری خواتین کی مانند نہیں تو اُن کی طہارت کا مقام بھی دوسرے لوگوں سے بلند ہے، اور چونکہ قرآن کے مطابق ''الطيبات للطيبين'' (پاکیزہ خواتین پاکیزہ حضرات کے لیے) ہوتی ہیں لہٰذا طیب وطاہر نبی ﷺ کے حرم میں شامل ہونے والی خواتین کا اسی نسبت سے پاک وطاہر ہونا ضروری ہے۔

ہاں مگر یہ حقیقتِ مسلّمہ ہے کہ طہارت کے جس مقام پر پنج تن پاک فائز ہیں وہ اُنہیں کا خاصہ ہے، اُس میں اُن کا کوئی شریک نہیں ہے۔ نبی کریم ﷺ کی طہارت میں تو کسی کو کلام ہو ہی نہیں سکتا اور اگر احادیث مبارکہ کو مدنظر رکھا جائے تو باقی چار نفوسِ مقدسہ (علی وفاطمہ حسن وحسین) بھی حضور ﷺ کے طفیل طہارت کے اُسی مقام پر فائز ہیں۔ اس لیے کہ سید عالم ﷺ نے ان کے حق میں فرمایا تھا ''هؤلاء حامّتي وخاصّتي'' (یہ میرے منتخب اور مخصوص ہیں) نیز فرمایا: ''إنهم مني وأنا منهم'' (وہ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں) اسی لیے علماء حق نے فرمایا ہے کہ:

''اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے اہل بیت کرام علیہم السلام کے وجود کو حضور ﷺ کے وجود

مسعود کا قائم مقام قرار دیا ہے اور انہیں امت کے لیے امان بنایا ہے"۔

(جواهر العقدين ص ۲٦٣؛ الصواعق المحرقة ص ۱۵۲، ۱۵۳؛ رشفة الصادي ص ۱۳۲، ۱۳۳)

تسلسل کے ساتھ یہ مقامِ طہارت فقط اہل کساء کو حاصل ہے، کیونکہ اُنہیں کا طاہر و مطہر خون تسلسل کے ساتھ جاری وساری ہے۔ اس لیے کہ امہات المومنین میں سے ہر ام المومنین اپنے مبارک وجود تک محدود تھی اور ہر صحابی اپنے مبارک وجود تک صحابی تھا اُس کی بدولت کوئی دوسرا شخص صحابی نہیں بن سکا لیکن ذریتِ مصطفوی ﷺ کا طاہر خون مسلسل جاری ہے اور تا قیامت جاری رہے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو خصوصی طہارت اہل کساء اور اُن کی مقدس نسل کو حاصل ہے وہ کسی دوسری شخصیت کو حاصل نہیں۔



محبوبِ خدا و مصطفیٰ ﷺ

﴿۲۵﴾ أخبرنا أبو عبد الله محمد بن عبد الله الصفوي قراءة عليه بجامع دمشق، أخبرنا الإمام أبو الحسين علي بن الشيخ الإمام محمد اليونيني وأبو عبد الله محمد بن أبي العز بن مشرف الأنصاري سماعاً، قال: أخبرنا أبو عبد الله الحسين بن مبارك الزبيدي، أخبرنا أبو الوقت عبد الأول بن شعيب السجزي، أخبرنا أبو الحسن عبد الرحمان بن محمد الداودي، أخبرنا أبو محمد عبد الله بن أحمد بن حمويه، أخبرنا أبو عبد الله محمد بن يوسف بن مطر الفربري، حدثنا الإمام أبو عبد الله محمد بن إسماعيل الجعفي، حدثنا قتيبة بن سعيد، حدثنا عبد العزيز ابن أبي حازم، عن سهل بن سعد أن رسول الله ﷺ قال:

لأعطين الراية غداً يفتح الله علىٰ يديه، يحب اللهَ ورسولَه، ويحبه اللهُ ورسولُه. قال: فبات الناس يدوكون ليلتهم أيهم يعطاها، فلما أصبح الناس غدوا على رسول الله ﷺ كلهم يرجون أن يعطاها: فقال: أين علي بن أبي طالب؟ فقالوا: هو يشتكي عينيه يا رسول الله، قال: فأرسلوا إليه فأتوني به، فلما جاء بصق في عينيه، ودعا له، فبرأ حتى كأنه لم يكن به وجع، فأعطاه الراية.

الحديث متفق علىٰ صحته، وهذا الحديث هو الصحيح في إعطاء الراية لعلي ﷺ وما ورد مخالفاً فهو موضوع كما نص عليه علماء الحديث رحمهم الله.

﴿۲۵﴾ حضرت ابو حازم ﷺ بیان کرتے ہیں کہ مجھے حضرت سہل بن سعد ﷺ نے بتایا کہ غزوۂ خیبر کے دن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کل میں ایک ایسے شخص کو جھنڈا دوں گا اللہ تعالیٰ جس کے ہاتھوں فتح عطا فرمائے گا، وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو محبوب رکھتا ہے اور اس کو اللہ اور اس کا رسول ﷺ محبوب رکھتے ہیں۔ پس جب صبح ہوئی تو تمام لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس جمع ہو گئے، ان میں سے ہر ایک کو امید تھی کہ پرچم اسے عطا کیا جائے گا، لیکن آپ نے دریافت فرمایا: علی بن ابی طالب کہاں ہیں؟ لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اُن کی آنکھوں میں تکلیف ہے، تو آپ نے فرمایا: اُنہیں لے آؤ! پس اُنہیں لایا گیا تو رسول اللہ ﷺ نے ان کی آنکھوں میں لعاب دہن لگایا اور دعا فرمائی تو وہ ایسی ٹھیک ہوئیں گویا اُنہیں کوئی تکلیف ہوئی ہی نہیں تھی۔ پھر آپ نے اُنہیں جھنڈا

عطا فرمایا۔

اس حدیث کی صحت پر اتفاق ہے، اور یہی وہ صحیح حدیث ہے جس میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو پرچم تھمانے کا ذکر ہے، اور جو کچھ اس کے مخالف وارد ہوا ہے وہ من گھڑت ہے، جیسا کہ علماء حدیث رحمہم اللہ نے تصریح فرمائی ہے۔

محب ومحبوب ہونے میں عظمتِ مرتضوی

''وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو محبوب رکھتا ہے اور اس کو اللہ اور اس کا رسول ﷺ محبوب رکھتے ہیں'' کے الفاظ انتہائی اہمیت کے حامل ہیں، کیونکہ یہ عام شہادت نہیں بلکہ خدائی شہادت ہے، جس زبانِ اقدس سے یہ الفاظ صادر ہوئے اس کی شان میں ﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوىٰ﴾ (وہ اپنی خواہش سے کلام نہیں فرماتے) کی خدائی شہادت آئی ہے۔ اس لیے ہمیں اس خصوصی اعلان کی اہمیت کو سمجھنا ہوگا، ہر چند کہ ہر سچا مومن اللہ ﷻ اور اس کے رسول ﷺ کا محب ومحبوب ہے مگر تقریباً سولہ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی امیدوار جماعت میں سے کسی ایک شخص کا نام لے کر اس کے محب ومحبوبِ خدا ورسول ﷺ ہونے کا اعلان کرنا معمولی بات نہیں، اگر معمولی ہوتی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ساری رات انتظار کیوں کرتے؟ لہٰذا ہم اس غیر معمولی عظمت کو سمجھنے کے لیے پہلے لفظ "محبة" کی معنوی تحقیق کرتے ہیں پھر اُس تحقیق کی روشنی میں حتی المقدور مقامِ مرتضوی کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

لفظِ محبت کا معنی

لفظ محبت کے معانی اور اس کے اطلاقات میں اس قدر تفصیل ہے کہ اربابِ عقل کی عقل دنگ رہ گئی اور وہ اس لفظ کی گہرائی اور گیرائی کو نہ پا سکے اور بالآخر انہیں کہنا پڑا:

ولا توصف المحبة بوصف أظهر من المحبة.

''یعنی لفظ محبت کی توصیف خود لفظ محبت سے زیادہ نہیں کی جا سکتی''۔

(مدارج السالکین لابن القیم ج۳ ص۱۱)

حروفِ محبت کے انتخاب میں حکمت

اس لفظ کے حروفِ اصلیہ کے لحاظ سے بھی بہترین حکمتیں بیان فرمائی گئیں، اس لفظ کا مادۂ اصلی ''ح'' اور ''ب'' مشدد ہے، علماء کرام لکھتے ہیں:

"تم غور کرو کہ لفظ محبت کے لیے کیسے دو لفظ منتخب کیے گئے، ان میں سے ایک "ح" ہے
جو اقصیٰ حلق (حلق کا وہ حصہ جو سینے کے قریب ہے) سے ادا ہوتا ہے اور اس کا مخرج ہمزہ (ء)
کے مخرج کے قریب ہے، یہیں سے آواز کی ابتدا ہوتی ہے، یہ اصلِ مصدر ہے اور محبت کا مرکز
ومنبع بھی یہی مقام ہے، پھر اس کے ساتھ حرف "ب" کو ملایا جو شفویہ (ہونٹوں سے ادا ہونے والا)
حرف ہے، اور یہ مخارج صوت کی آخری اور انتہائی حد ہے۔ پس دو حرفوں نے آواز کی ابتدا اور انتہا
کو جمع کر لیا، یہی حال تحریکِ محبت کی ابتدا اور انتہا کا ہے۔ پس حُبِّ محبّ کی تحریک کی ابتدا محبوب
سے ہوتی ہے اور اس کی انتہا اس کے وصال پر ہوتی ہے۔ اگر تم اس عجیب نکتے میں غور کرو تو اسے
بادِ نسیم سے بھی زیادہ لطیف پاؤ گے"۔

(بدائع الفوائد ج۱ ص۳۲۰، وط: ج۱ ص۵۲۷؛ مدارج السالکین ج۳ ص۱۲؛ بصائر ذوی التمییز ج
۲ ص۴۱۷)

مزید لکھتے ہیں:

"پھر محبت کے لیے لفظ "الـحُـب" (ح) کے پیش سے ہے جو قوی اور ثقیل ترین حرکت ہے اور
اپنے مسمیٰ (محبّ) سے مطابقت رکھتی ہے، اور محبوب کے لیے "الحِبّ" (ح) کی کسرہ (زیر)
سے ہے جو ضمہ (پیش) سے خفیف ہے اور اس حرکت کی محبوب سے مطابقت ہے کیونکہ محبوب کا
ذکر دلوں اور زبانوں پر خفیف ہوتا ہے"۔

(مدارج السالکین لابن القیم ملتقطاً ج۳ ص۱۲؛ بصائر ذوی التمییز ج۲ ص۴۱۷)

راقم الحروف کہتا ہے کہ ان دو حرفوں کے ساتھ جو تیسرا حرف "م" شامل کیا گیا ہے وہ بھی خوب ہے، حرف
"ب" دونوں ہونٹوں کے تر مقام سے ادا ہوتا ہے جبکہ حرف "م" دونوں ہونٹوں کے خشک مقام سے ادا ہوتا ہے اور
محبوب چیز کو ہونٹوں کا پہلے خشک حصہ چھوتا ہے بعد میں تر، اور اس چومنے کی ٹھنڈک سینے میں محسوس ہوتی ہے۔ پھر
یہ چومنا فقط مجازی محبت میں ہی منحصر نہیں بلکہ حقیقی محبت کی تسکین کا سامان بھی اسی میں موجود ہے، اسی لیے قرآن
کریم، کعبہ معظمہ اور حجر اسود وغیرہ کو بھی چوما جاتا ہے۔

اللہ ﷻ کی بندے سے محبت کا معنی

اب ہم لفظ "حُب" اور "محبۃ" کے اُس معنی کو لے رہے ہیں جو صوفیہ کرام نے بیان فرمایا ہے۔ امام قشیری رحمۃ اللہ علیہ اس لفظ کی مختصر لغوی تحقیق کے بعد اس کے معنوی اطلاقات کی توضیح میں لکھتے ہیں:

''پس حق ﷻ کی بندے سے محبت اُس پر مخصوص انعام کا ارادہ ہے جیسا کہ اس کی رحمت کا معنی بھی انعام ہے، لیکن رحمت ارادہ سے زیادہ خاص ہے اور محبت رحمت سے زیادہ خاص ہے، پس اللہ تعالیٰ کا یہ ارادہ کہ وہ بندے کو ثواب و انعام سے نوازے اس کا نام رحمت ہے، اور اس کا یہ ارادہ کہ وہ بندے کو مقاماتِ عالیہ اور قربِ خاص سے نوازے اس کا نام محبت ہے۔

حق سبحانہ وتعالیٰ کا ارادہ اس کی واحد صفت ہے لیکن اُس ارادہ کے متعلقات کے لحاظ سے اس کے نام مختلف ہو جاتے ہیں۔ سو جب ارادہ سزا دینے کے متعلق ہو جائے تو اس کو غضب کہتے ہیں اور جب عمومی نعمتوں کے متعلق ہو جائے تو اسے رحمت کہتے ہیں اور جب وہ ارادہ مخصوص ہو جائے تو اسے محبت کہتے ہیں۔

ایک قوم نے کہا: اللہ ﷻ کی بندے سے محبت کا معنی ہے اس کی مدح کرنا اور اس کی ثناء جمیل کرنا اس قول کی صورت میں محبت کا معنی اس کے کلام کی طرف لوٹتا ہے اور اس کا کلام قدیم ہے، اور دوسری قوم نے کہا: اس کی بندے سے محبت اس کی صفاتِ فعلیہ سے ہے اور وہ ایسا مخصوص احسان ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بندے سے ملاقات کرتا ہے، اور ایسی مخصوص حالت ہے جس کی طرف وہ بندے کو ترقی دیتا ہے، جیسا کہ بعض نے کہا: اس کی بندے پر رحمت اُس کی نعمت کی معیت ہے، اور اسلاف سے ایک قوم نے کہا: اللہ تعالیٰ کی محبت صفاتِ خبریہ سے ہے، پس انہوں نے لفظ کو مطلق رکھا اور اس کی وضاحت سے توقف کیا۔

رہا اس لفظ کا وہ مفہوم جو مخلوق کی باہمی محبت کی حالتوں سے متعلق ہے کہ ایک چیز کا دوسری چیز کی طرف میلان اور کسی کا کسی چیز سے مانوس ہونا یا وہ کیفیت جو مخلوق میں ایک محبّ اپنے محبوب کے ساتھ پاتا ہے، ذاتِ قدیم ﷻ ان تمام معانی سے بلند ہے، اور رہی بندے کی اللہ تعالیٰ سے محبت تو وہ ایک حالت ہے جو بندہ اپنے قلب میں پاتا ہے، جسے الفاظ میں ادا کرنا

مشکل ہے"۔

(الرسالۃ القشیریۃ ص ۳۹۷)

امام قشیری رحمۃ اللہ علیہ کی اس عبارت کے آخر میں ہے کہ بندے کی اللہ تعالیٰ سے محبت کو لفظوں سے تعبیر کرنا مشکل ہے، بالکل بجا ہے، تاہم آپ کے بعض پیشرو حضرات نے اس کیفیتِ محبت کو لفظوں میں ادا کرنے کی کوشش فرمائی ہے جسے ہم آگے چل کر نقل کریں گے، یہاں ہم امام قشیری کی ایک اور تصنیف سے اللہ ﷻ کی بندے سے محبت کا مفہوم نقل کر رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

ومحبة الحق للعبد إرادته إحسانه إليه ولطفه به، وهي إرادة فضل مخصوص، وتكون بمعنى ثنائه سبحانه عليه ومدحه له، وتكون بمعنى فضله المخصوص معه.

"حق تعالیٰ کی بندے سے محبت اُس پر احسان اور لطف کا ارادہ ہے، اور یہ ارادہ مخصوص فضل کا ہے، جو کبھی حق سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے بندے کی مدح وثنا کے معنیٰ میں ہوتا ہے اور کبھی بندے کے ساتھ مخصوص فضل کے معنیٰ میں ہوتا ہے"۔

(لطائف الإشارات، المعروف بتفسير القشيري ج۱ ص ۱۴۳)

محبتِ الٰہی اور مقامِ مرتضوی

یہاں میں مندرجہ بالا کلام کے مخصوص جملوں کی عربی نقل کر رہا ہوں پہلے آپ ان جملوں میں غور فرمالیں تاکہ آپ پر صوفیہ کرام کے نکات مکمل طور پر آشکارا ہو جائیں اور پھر اُن کی روشنی میں مقامِ مرتضوی کی کچھ سمجھ آسکے:

- إرادته لأن يخص بالقربة والأحوال العلية تسمى محبة.

"اللہ تعالیٰ کا یہ ارادہ کہ وہ بندے کو مقاماتِ عالیہ اور قربِ خاص سے نوازے اس کا نام محبت ہے"۔

- وإذا تعلقت بخصوصها تسمىٰ محبة.

"اور جب وہ ارادہ مخصوص ہو جائے تو اسے محبت کہتے ہیں"۔

- وحالة مخصوصة يُرَقِّيه إليها

"یعنی محبت ایک مخصوص حالت ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ بندے کو ترقی دیتا ہے"۔

تفسیر قشیری کی عبارت میں تو بالکل واضح ہے کہ محبت ایک مخصوص فضل ہے، اگر آپ نے درج بالا جملوں کو بغور ملاحظہ فرمالیا ہے تو اب اس اعلان میں غور فرمائیں "یحبہ اللّٰہ ورسولہ" (اللہ ﷻ اور اس کا رسول ﷺ اسے محبوب رکھتے ہیں) اور اس کے ساتھ یہ بات بھی مدنظر رہے کہ یہ انتخاب تقریباً ایسے سولہ سو (1600) افراد میں سے ہوا جو سب کے سب اس فضلِ مخصوص اور محبتِ خاصہ کے منتظر تھے۔ اب خود سوچئے کہ سولہ سو (1600) افراد میں سے جس ایک کو منتخب کیا گیا وہ اپنے تمام ساتھیوں سے کتنا ممتاز ہوگا؟

خیبر میں عطا شدہ مرتبہ کیا بعد میں بھی باقی رہا؟

یہ تو ثابت ہوگیا کہ غزوۂ خیبر میں سیدنا علی علیہ السلام کے اُس اعلیٰ مقام و مرتبہ اور مخصوص فضل کا اظہار ہوا جو اُن کے سوا کسی بھی دوسرے صحابی کو نہیں ملا تھا مگر بعض ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ آیا اُن کا وہ مقام و مرتبہ بعد میں قائم بھی رہا یا نہیں، کہیں ظاہری خلافت میں چوتھے نمبر پر آنے کی وجہ سے وہ اُس مقام و مرتبہ سے معزولی یا تنزلی کا شکار تو نہیں ہوگئے تھے؟

جواب: ہرگز نہیں، بلاشبہ اُن کا وہ مخصوص مقام و مرتبہ برابر قائم رہا، کیونکہ وہ اُن کے حال یا اُن کی کیفیت کا اظہار نہیں تھا بلکہ اُن کے مقام کا اظہار تھا۔ صوفیہ کرام کے مطابق کسی سالک کے حال اور کیفیت میں تو معاذ اللہ تنزل یا تعطل آسکتا ہے مگر جب وہ صاحبِ مقام ہوجائے تو تنزل اور تعطل کا دور ختم اور ترقی کا دور شروع ہوجاتا ہے، اور وہ مخصوص مرتبہ ہمیشہ کے لیے سالک کا مقام ہوجاتا ہے، اسی لیے صوفیاء اسے لفظ "مَعَ" کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ امام قشیری رحمۃ اللہ علیہ کی "اللطائف القشیریۃ" سے اُن کی مذکور الصدر عبارت میں لفظ محبت کے اطلاقات میں ایک جملہ یہ بھی آیا ہے:

وتكون بمعنى فضله المخصوص معه.

"اور کبھی بندے کے ساتھ (وہ محبت) اُس کے مخصوص فضل کے معنی میں ہوتی ہے"۔

اسی طرح اُن کے رسالہ کی عبارت میں بھی یہ الفاظ آئے ہیں:

وحالة مخصوصة يُرَقِّيه إليها، كما قال بعضهم: إن رحمته بالعبد نعمة معه.

"یعنی محبت ایک مخصوص حالت ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ بندے کو ترقی دیتا ہے، جیسا کہ بعض نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی بندے پر رحمت اس کی نعمت کی معیت ہے"۔

اس کی تشریح میں شیخ الاسلام زکریا انصاری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

نعمة معه، لا تفارقه.

"یعنی وہ مرتبہ اس کے ساتھ ہمیشہ قائم رہتا ہے، جدا نہیں ہوتا"۔

(شرح الرسالة القشيرية ج٤ ص١٤٦)

قرآن کریم میں اسی دائمی معیت کو "مَعَ الصَّابِرِينَ، مَعَ الْمُتَّقِينَ" اور "لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ" وغیرھا الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

خیال رہے کہ خیبر کے روز سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو وہ مخصوص مقام و مرتبہ عطا نہیں ہوا تھا بلکہ قبل ازیں وہ اُس مرتبہ پر فائز تھے لیکن اُس کا اعلان و اظہار اُس دن کیا گیا تھا۔ پھر اُس کے بعد بھی وہ مسلسل ترقی فرماتے رہے، اس لیے کہ اُن کی شان میں ارشادات نبوی "عَلِيٌّ كَنَفْسِي، عَلِيٌّ مِنِّي وَأَنَا مِنْهُ" (علی میری ذات کی مانند ہے، علی مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں) سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حقیقۃً فانی الرسول ہیں، لہٰذا اُن کی مسلسل ترقی حضور ﷺ کی ترقی کے تابع ہے، یعنی حضور ﷺ کے طفیل اُن پر بھی "وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ" کی ضیاء باری ہوتی رہتی ہے۔

بندے کی اللہ جل جلالہ سے محبت کا معنیٰ

امام ابو بکر محمد بن اسحاق الکلاباذی متوفی ۳۸۰ھ لکھتے ہیں کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہا فرماتے ہیں:

المحبة ميل القلوب. معناه أن يميل قلبه إلى الله وإلى ما لله من غير تكلف، وقال غيره: المحبة هي الموافقة. معناه: الطاعة له فيما أمر، والانتهاء عما زجر، والرضا بما حكم وقدّر.

"محبت دلوں کے میلان کو کہتے ہیں۔ معنیٰ یہ ہے کہ اُس کا دل اللہ تعالیٰ کی طرف اور اللہ کے حقوق کی طرف مائل ہو، اور دوسرے صوفیہ کرام نے فرمایا: موافقت ہی محبت ہے، معنیٰ یہ ہے کہ جو حکم دیا گیا اس کی اطاعت کرنا، جس سے منع کیا گیا اس سے رکنا اور جو فیصلہ اور مقدر کیا گیا اس پر راضی رہنا محبت ہے"۔

(التعرف لمذهب أهل التصوف للكلاباذي ص١٢٨)

شیخ ابوالعباس محمد بن احمد المعروف ابن عطاء اللہ سکندری رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۷۰۹ھ فرماتے ہیں:

ليس المحب الذي يرجو من محبوبه عوضاً،أويطلب منه غرضاً، فإن المحب من يبذل لک، ليس المحب من تبذل له.

''وہ محب نہیں جو اپنے محبوب سے معاوضہ کا امیدوار ہو، یا اس سے کسی غرض کا طلبگار ہو، لیکن محب وہ ہے جو تمہاری خاطر لٹائے نہ کہ وہ جس کی خاطر تم لٹاؤ''۔

شیخ عبدالمجید الشرنوبی اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:

''یعنی محبِ حقیقی وہ ہے جو اپنے محبوب سے اپنے اعمال کی جزا کا امیدوار نہ ہو، جیسا کہ داخلۂ جنت یا دوزخ سے نجات یا اور کوئی دنیوی اور اخروی اغراض کی خواہش''۔

(شرح حكم الإمام ابن عطاء الله السكندري ص ۲۲۹)

یہی حقیقت خود سیدنا علی علیہ السلام سے ملاحظہ فرمائیے، مشہور ترین عارف سید احمد بن علی الرفاعی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۵۷۸ھ، جن کی خاطر روضۂ نبوی ﷺ سے دستِ اقدس ظاہر ہوا تھا اور انہوں نے اُسے چوما تھا، لکھتے ہیں:

قال علي ﷺ: العارف إذا خرج من الدنيا لم يجد السابق، ولا الشهيد في القيامة، ولا رضوان في الجنة، ولا مالك النار في النار. قيل: وأين يوجد؟ قال ﴿فِي مَقْعَدِ صِدْقٍ عِندَ مَلِيكٍ مُّقْتَدِرٍ﴾[القمر: ۵۵] إذا قام من قبره لا يقول: أين أهلي وولدي، ولا أين جبريل وميكائيل والجنة والثواب؟ ولكن يقول: أين حبيبي وأنيسي؟

''سیدنا علی ﷺ نے فرمایا: عارف جب دنیا سے کوچ کرتا ہے تو اسے پہلے جانے والا شخص نہیں پاتا اور نہ ہی اسے روزِ قیامت شہید پائے گا اور اُسے رضوانِ جنت بہشت میں اور داروغۂ جہنم آگ میں نہیں پائے گا۔ عرض کیا گیا: وہ کہاں پایا جائے گا؟ فرمایا: ﴿بڑے پسندیدہ مقام میں عظیم قدرت والے بادشاہ کے پاس﴾[القمر: ۵۵] جب قبر سے اٹھے گا تو یوں نہیں کہے گا: میرے اہل و اولاد کہاں ہیں، اور نہ ہی یہ کہے گا کہ جبریل و میکائیل اور جنت و ثواب کہاں ہیں؟ بلکہ کہے گا: میرا حبیب اور میرا مونسِ جاں کہاں ہے؟''

(حالة أهل الحقيقة مع الله، للسيد أحمد الرفاعي ص ۱۲۵)

علامہ ابن قیم الجوزیہ نے محبت کی تعریف میں تفصیلی اور عمدہ گفتگو کی ہے، انہوں نے کل تیس[30] اقوال ذکر کیے ہیں اور اُن کے نزدیک جامع قول یہ ہے:

"حضرت ابوبکر الکتانی فرماتے ہیں: ایامِ حج میں مکۃ المکرمۃ میں (اللہ کریم اس کی عظمت میں اضافہ فرمائے) محبت کے موضوع پر بحث چل پڑی، جس میں مشائخ کرام رحمۃ اللہ علیہم نے گفتگو فرمائی اور حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ اُن سب سے کم عمر تھے، مشائخ کرام نے انہیں فرمایا: اے عراقی تمہاری معلومات میں جو کچھ ہو بیان کیجئے! انہوں نے سر جھکالیا اور اُن کی چشمانِ مبارک سے آنسو رواں ہو گئے، پھر فرمایا:

عبد ذاهب عن نفسه، متصل بذكر ربه، قائم بأداء حقوقه، ناظر إليه بقلبه، أحرقت قلبه أنوار هيبته، وصفا شربه من كأس وُدِّهِ، وانكشف له الجبار من أستار غيبه، فإن تكلم فبالله، وإن نطق فعن الله، وإن تحرك فبأمر الله، وإن سكن فمع الله، فهو بالله ولله ومع الله. فبكى الشيوخ وقالوا: ما علىٰ هذا مزيد، جزاك الله يا تاج العارفين.

"محب وہ عبد ہے جو تصرفِ ذاتی سے دستبردار ہو، اپنے رب کی یاد میں شاغل ہو، حقوقِ الٰہیہ کی ادائیگی میں کمربستہ ہو، نگاہِ قلب سے اس کا مشاہدہ کرنے والا ہو، اس کے قلب (کی خواہشات) کو ہیبتِ انوارِ الٰہی نے جلا دیا ہو، اس کا مشروب مودّتِ جامِ الٰہی سے مصفّٰی ہو چکا ہو، اور جبار ﷻ نے اپنے غیب کے حجابات اس سے ہٹا دیئے ہوں۔ پس اگر وہ کلام کرے تو اللہ سے، اور اگر گویا ہو تو اللہ کے متعلق، اور اگر حرکت کرے تو امرِ الٰہی سے، اور سکون میں آئے تو اللہ کے ساتھ۔ فی الجملہ یہ کہ وہ اللہ سے ہو، اللہ ہی کے لیے ہو اور اللہ ہی کے ساتھ ہو۔ اس پر تمام مشائخ کرام پر گریہ طاری ہو گیا اور انہوں نے کہا: اس بیان پر اضافہ کی گنجائش نہیں ہے، اے تاج العرفاء! اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے"۔

(مدارج السالکین لابن القیم ج۳ ص۱۸)

صوفیہ کرام خصوصاً تاج العارفین سید الطائفہ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہم نے محبِ خدا کی جو صفات بیان فرمائیں یقیناً یہ صفات بہت سی شخصیات میں پائی جاتی ہوں گی، مگر کس میں پائی جاتی ہیں اور کس میں نہیں، یہ معلوم

کرنا آسان نہیں، لیکن جب ہم زیر بحث حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں تو کسی قسم کے تتبع اور جستجو کے بغیر نصِ صریح سے ہی عیاں ہو جاتا ہے کہ خیبر کے دن سولہ سو افراد میں جو شخصیت اِن صفات یا اِن سے بھی زیادہ صفات کی حامل تھی وہ وہ شخصیت تھی جو اُس دن فاتحِ خیبر کے طور پر نمایاں ہوئی۔ لہٰذا اب آپ محدثین اور صوفیہ کرام کے بیان فرمودہ معانی کی روشنی میں "یُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ" (وہ اللہ اور اس کے رسول کا محبّ ہے) اور "یحبه اللّٰهُ ورسولهٗ" (اللہ اور اُس کا رسول اُس کے محبّ ہیں) کے الفاظ میں جس قدر غور فرماتے جائیں گے اسی قدر آپ پر مقامِ مرتضوی کی عظمتیں آشکار ہوتی چلی جائیں گی۔

سیدنا علی علیہ السلام اور اتباعِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ آل عمران کی آیت ۳۱ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حبیبِ خدا ہیں، لہٰذا محبتِ الٰہی کے ہر مدعی پر آپ کی اتباع لازم ہے، اس لیے کہ محبوب کا محبوب، محبوب ہوتا ہے، لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت واجب ہوئی، اور آپ کی محبت قولاً اور عملاً، اخلاقاً اور احوالاً، سیرۃً اور عقیدۃً آپ کی اتباع اور سنت پر چلے بغیر نہیں ہو سکتی، اور اس کے بغیر دعوائے محبت نہیں چل سکتا، کیونکہ اتباع محبت کا قطب (چکی کے نچلے پاٹ کے درمیان لوہے کی میخ کی مانند) ہے، سو جس شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع نصیب نہیں اسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت بھی نصیب نہیں"۔

(تفسیر القرآن العظیم لابن عربي ج ۱ ص ۱۷۸)

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو مسلمان جتنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا متبع ہے اتنا ہی وہ اللہ عزوجل اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا محبّ ہے۔ اس لحاظ سے کوئی مسلمان بھی محبتِ الٰہی اور محبتِ نبوی سے خالی نہیں ہے، کیونکہ اگر کوئی شخص محض کلمہ پڑھ کر اقرارِ توحید کرتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع میں کرتا ہے۔ امام ابو العباس القرطبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"جس شخص نے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق کی اور بجا طور پر آپ پر ایمان لایا تو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر راجح محبت کے وجود سے خالی نہیں ہوتا "غیر أنهم في ذلک متفاوتون" (ماسوا اس کے کہ سب اس میں برابر نہیں ہوتے)"۔

(المفهم لما أشکل من تلخیص کتاب مسلم ج ۱ ص ۲۲۶)

اس سے ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں:

ولا شک في أن حظ أصحابه ﷺ من هذا المعنى أعظم، لأن معرفتهم لقدره أعظم، لأن المحبة ثمرة المعرفة فتقوى وتضعف بحسبها.

''اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حضور ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا حصہ اس محبت میں اعظم ہے، کیونکہ انہیں حضور ﷺ کی قدر و منزلت کا جو حصہ ملا ہے وہ بھی اعظم ہے، کیونکہ محبت معرفت کا ثمرہ ہے، لہٰذا وہ حسبِ معرفت قوی اور ضعیف ہوتی ہے''۔

(المفهم ج١ ص٢٢٦؛ المواهب اللدنية ج٣ ص٢٧٦)

اس کلام سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کا دعوائے محبت اتنا ہی تسلیم کیا جائے گا جتنا وہ متبعِ سنت ہوگا۔ تمام اہل اسلام اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم محبانِ مصطفیٰ ﷺ ہیں، مگر محبت میں کون کتنا بلند ہے یا دعوائے محبت میں کتنا سچا ہے؟ ہمیں اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے، واللہ ورسولہ أعلم۔ البتہ ہم جس حدیث کی تشریح میں مشغول ہیں اس کے تقاضا کے مطابق مولیٰ علی علیہ السلام کا دعوائے محبت اور اس کی حقانیت کا جاننا ضروری ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے اس سلسلہ میں بہت بڑا دعویٰ منقول ہے، پہلے اس میں غور فرمایئے پھر اس کی دلیل ملاحظہ فرمایئے گا۔ آپ سے سوال کیا گیا:

كيف كان حبكم لرسول الله ﷺ؟ قال: كان واللهِ أحبَّ إلينا مِن أموالِنا وأولادِنا وآبائِنا وأمهاتِنا، ومن الماء البارد على الظمأ.

''رسول اللہ ﷺ کے ساتھ آپ کی محبت کیسی تھی؟ فرمایا: اللہ عزوجل کی قسم ہمیں آپ ہمارے اموال، ہماری اولاد، ہمارے آباء اور ہماری ماؤں سے زیادہ پیارے تھے، اور سخت پیاس کے وقت ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ محبوب تھے''۔

(الشفاء ج٢ ص٥٦٨، وط: ج٢ ص٢٠، وط: بتشريح الشُّمُني ج٢ ص٢٤٠؛ المواهب اللدنية ج٣ ص٢٧٧؛ أسمى المطالب في سيرة أمير المؤمنين علي بن أبي طالبؓ ص٧٨)

ملا علی القاری رحمۃ اللہ علیہ ''و من الماء البارد على الظماء'' کی تشریح میں لکھتے ہیں:

وفي إعادة الجار إشعار بأنه أشد نفعاً لأنه روح الروح وإيماء إلى أنه أحب إليهم من أرواحهم.

"اور حرف جار [مِنْ] کے اعادہ میں پانی کے شدید نفع بخش ہونے کی طرف باریک اشارہ ہے، کیونکہ پانی جان کی بھی جان ہے اور اس میں اشارہ ہے کہ حضور ﷺ انہیں ان کی جانوں سے بھی زیادہ محبوب تھے"۔

(شرح الشفاء للقاري ج۲ ص ۴۰ وعلیٰ هامش النسيم ج۳ ص ۳۵۳، ۳۵۴)

یہ دعوائے مرتضوی ہے اور اس کی حقانیت کی دلیل زیر بحث حدیث میں یہ ارشادِ مصطفوی ہے "یُحِبُّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ" (وہ اللہ اور اس کے رسول کا محبّ ہے) اور چونکہ یہ ارشاد تقریباً سولہ سو [1600] صحابہ کرام ﷺ کی موجودگی میں زبانِ نبوت سے صادر ہوا، اس لیے اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ سیدنا علی ﷺ اُن سب حضرات سے محبتِ نبوی اور اتباعِ نبوی ﷺ میں زیادہ ہیں۔

سیدنا علی ﷺ کا کمالِ علم و معرفت

ابھی ابھی لکھا جا چکا ہے کہ "المحبة ثمرة المعرفة فتقوي وتضعف بحسبها" (محبت معرفت کا ثمرہ ہے، پس وہ معرفت کے لحاظ سے قوی اور ضعیف ہوتی رہتی ہے) یعنی کسی کو اپنے محبوب کے ساتھ محبت اتنا ہوتی ہے جتنا اُسے اپنے محبوب کے اوصاف، حلیہ، فضائل اور خصائل کی معرفت ہوتی ہے، اور سیدنا علی ﷺ اس علم میں سب پر مقدم تھے، حتیٰ کہ حضرت سیدنا ابو بکر صدیق ﷺ سے حلیۂ نبوی ﷺ کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے بھی سائل کو سیدنا علی ﷺ کی طرف بھیجا۔ ملاحظہ فرمائیں:

(تاريخ دمشق ج۱۸ ص ۷۵؛ موسوعة العشرة المبشرون بالجنة ج۱۱ ص ۸۰، ۸۱)

اور بنت صدیق ام المومنین سیدتنا عائشہ صدیقہ رضي الله عنهما نے بھی دوٹوک انداز میں فرمایا تھا کہ حضرت علی ﷺ اعلم السنہ ہیں۔ حضرت جسرہ ﷺ فرماتے ہیں کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے ہمیں فرمایا:

من أفتاكم بصوم يوم عاشوراء؟ قلنا علي بن أبي طالب، قالت: هو أعلم الناس بالسنة.

"تمہیں عاشورہ کے روزے کا فتویٰ کس نے دیا ہے؟ ہم نے عرض کیا: علی بن ابی طالب نے۔ فرمایا: وہ تمام لوگوں سے بڑھ کر سنت کے عالم ہیں"۔

(تاريخ مدينة دمشق ج۴۲ ص ۴۰۸؛ مختصر تاريخ دمشق ج۱۸ ص ۲۶؛ الاستيعاب ج۳ ص ۲۰۶؛

المناقب للخوارزمي ص ۹۱؛ الرياض النضرة ج٤ ص ۱۳۷؛ فتح الملك العلي بصحة حديث باب مدينة العلم علي ص٤٤؛ موسوعة العشرة المبشرون بالجنة ج۱۱ ص۷۷)

سو جب محبت معرفت کا ثمرہ ہے تو خیبر کے روز [1600] سولہ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں "یُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ" (وہ اللہ اور اس کے رسول کا محب ہے) کے اعلان نے یہ ثابت کر دیا کہ مولیٰ علی علیہ السلام علم و معرفت میں تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے زائد تھے۔

نوٹ:

اس حدیث کے اس جملہ "یُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ" (وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا محب ہے) کی مزید تشریح آئندہ حدیث کے بعد والی حدیث کے تحت ملاحظہ فرمائیں۔

پرچم بردارِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقط سیدنا علی رضی اللہ عنہ تھے

اس حدیث کے آخر میں مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے:

"اس حدیث کی صحت پر اتفاق ہے، اور یہی وہ صحیح حدیث ہے جس میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو پرچم تھمانے کا ذکر ہے، اور جو کچھ اس کے مخالف وارد ہوا ہے وہ من گھڑت ہے، جیسا کہ علماء حدیث رحمہم اللہ نے تصریح فرمائی ہے"۔

اس سے مصنف رحمہ اللہ نے اُن نواصب کی طرف اشارہ کیا ہے جو غزوۂ خیبر کا فاتح اور مرحب کا قاتل سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی اور کو قرار دیتے ہیں، اور اس میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی اس خصوصیت کا بھی واضح بیان ہے کہ غزوۂ خیبر میں اُن سے قبل ہر چند کہ دوسرے حضرات بھی تشریف لے گئے تھے مگر پرچم فقط سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو ہی عطا کیا گیا تھا، یہی وجہ ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی جن خصوصیات پر رشک فرمایا کرتے تھے، اُن میں ایک خصوصیت یہ بھی تھی، جیسا کہ آگے ایک حدیث میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی تصریح آ رہی ہے۔ غزوۂ خیبر کے علاوہ دوسرے تمام غزوات میں بھی پرچم نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سیدنا علی مرتضیٰ علیہ السلام ہی تھامتے تھے۔ چنانچہ امام ابن اثیر الجزری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وأعطاه رسول الله ﷺ اللواء في مواطن كثيرة بيده.

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اکثر مقامات میں پرچم اُن ہی کے ہاتھ میں دیا"۔

(أسد الغابة ج٤ ص ۱۰۰)

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وكان اللواء بيده في أكثر المشاهد.

''اکثر غزوات میں پرچم اُن ہی کے ہاتھ میں ہوتا تھا''۔

(الإصابة ج٤ ص٤٦٤)

اس سے مراد پرچم نبوی ﷺ ہے، چنانچہ امام ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وهو الذي كان معه لواءه معه في كل زحف.

''اور وہی ہیں جن کے پاس ہر بڑے لشکر میں پرچم نبوی ﷺ ہوتا تھا''۔

(الاستیعاب ج٣ ص١٩٧)

امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وقال قتادة: إن عليًا كان صاحب لواء رسول الله ﷺ يوم بدر، وفي كل مشهد.

''حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ بدر اور تمام غزوات میں رسول اللہ ﷺ کے پرچم بردار علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ تھے''۔

(سير أعلام النبلاء للذهبي ج٢ ص٦١٧؛ تاريخ الإسلام للذهبي ج٢ ص٢٢١)

امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی بات سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت فرمائی ہے:

(المعجم الكبير للطبراني ج٥ ص٤٣٣، حديث١١٩٣٣؛ ذخائر العقبىٰ ص٩١، ٩٢)

نہ صرف یہ کہ ہر گھمسان کی جنگ میں پرچم بردار تھے بلکہ ہر میدان کے فاتح بھی سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ ہی تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ بعض لوگوں نے حیدر کرار غیر فرار کی اس مشہور ترین خصوصیت کا بھی انکار کر دیا ہے، حتیٰ کہ آپ کے فاتح خیبر ہونے کی نفی کی بھی ناکام کوشش کر ڈالی ہے اور کہا ہے کہ مرحب کے قاتل بھی وہ نہیں ہیں کوئی اور ہے۔ اگر آپ کو اس میں مکمل تفصیل مطلوب ہو تو راقم کی تصنیف ''شرح خصائص علي رضی اللہ عنہ'' میں حدیث نمبر ١۵ کی تشریح ملاحظہ فرمائیں۔

پہلے میں حیران ہوتا تھا کہ بعض لوگ سارا زور فقط سیدنا علی علیہ السلام کی خصوصیات کی نفی پر ہی کیوں لگاتے ہیں، لیکن جب معلوم ہوا کہ مخبر صادق ﷺ پہلے ہی آگاہ فرما دیا تھا کہ ایک گروہ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ساتھ یہود کی طرح بغض رکھے گا تو پھر میں سمجھا کہ ایسے بدبخت لوگ ہر زمانے میں رہیں گے۔

اہل بیت کے لیے وہ جو دوسروں کے لیے نہیں

اس حدیث میں ہے کہ "لأعطین الرایة غداً یفتح اللہ علیٰ یدیه" (کل میں ایک شخص کو پرچم دوں گا جس کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ فتح عطا فرمائے گا) اور دوسرے روز وہ پرچم سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو عطا ہوا، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے پاس اہل بیت کے لیے مخصوص حصہ رکھتا ہے۔ چنانچہ اسی جملہ کے تحت شیخ عبداللہ بن صالح لکھتے ہیں:

الثالثة: فیه أن اللّٰه تعالیٰ قد یذخر لبعض آل البیت من النصر والفتح والهدایة مالا یذخر لغیرهم.

"اس حدیث میں تیسرا فائدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض اہل بیت کے لیے نصرت، فتح اور ہدایت کا وہ ذخیرہ رکھتا ہے جو دوسروں کے لیے نہیں رکھتا"۔

(کتاب الأربعین في فضائل آل البیت الطاهرین ص ٤٤)

یہ بالکل بجا ہے، چنانچہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے پہلے بعض اکابر میدان میں اُترے تھے مگر پرچم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، مخصوص محبت خدا، مخصوص محبت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، مخصوص پرچم اور فتح خیبر مرتضیٰ علیہ السلام کے مقدر میں تھی۔




علی علیہ السلام میدان چھوڑنے والا نہیں

﴿۲۶﴾ وأخبرنا محمد بن أحمد قراءةً عليه، أخبرنا علي بن أحمد، أخبرنا حنبل بن عبد الله، أخبرنا أبو القاسم الشيباني، أخبرنا ابن المذهب، أخبرنا ابن مالک، أخبرنا عبد الله بن أحمد، حدثني أبي، حدثنا وكيع، عن ابن أبي ليلىٰ، عن المنهال، عن عبد الرحمان بن أبي ليلىٰ، قال:

كان أبي يسمر مع علي، وكان يلبس ثياب الصيف في الشتاء، وثياب الشتاء في الصيف، فقيل له: لو سألته، قال: فسألته، فقال: إن رسول الله ﷺ بعث إلي وأنا أرمد العين يوم خيبر، فقلت: يارسول الله: إني أرمد العين، فتفل في عيني، وقال: اللّٰهم أذهب عنه الحر والبرد، فما وجدتُ حراً ولابرداً منذ يومئذ، وقال: لأعطين الراية رجلاً يحب الله ورسوله، ويحبه الله ورسوله، ليس بفرّارٍ فتشرف لها أصحاب رسول الله ﷺ فأعطنيها.

رواه ابن ماجه في سننه عن عثمان بن أبي شيبة عن وكيع فوقع لنا بدلاً عالياً ولله الحمد.

قال: فتشرف لها، اي تطلع وتعرض.

﴿۲۶﴾ حضرت عبدالرحمان بن ابی لیلیٰ بیان کرتے ہیں کہ میرے والد رات کی گفتگو میں سیدنا علی علیہ السلام کے ساتھ ہوتے تھے، اور سیدنا علی علیہ السلام گرمیوں کا لباس سردیوں میں اور سردیوں کا لباس گرمیوں میں زیب تن فرما لیتے تھے۔ انہیں (میرے ابا سے) کہا گیا: آپ اُن سے اس کی وجہ کیوں نہیں معلوم کرتے؟ فرمایا: میں نے اُن سے وجہ معلوم کی تھی تو انہوں نے فرمایا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے دن میرے پاس آدمی بھیجا تھا اور میں آشوبِ چشم میں مبتلا تھا، میں نے عرض کیا تھا: یارسول اللہ! مجھے آشوبِ چشم ہے، تو آپ نے میری آنکھوں میں لعاب کی آمیزش کے ساتھ پھونک ماری تھی اور کہا تھا: اے اللہ! اس سے سردی اور گرمی کو ہٹا دے، پس اس دن سے میں سردی اور گرمی کو نہیں پاتا، اور فرمایا تھا: میں اس شخص کو پرچم عطا کروں گا جو اللہ جل جلالہ اور اس کے رسول ﷺ کو محبوب رکھتا ہے اور اللہ جل جلالہ اور اس کا رسول ﷺ اس کو محبوب رکھتے ہیں، وہ فرار ہونے والا نہیں ہے، پس رسول اللہ ﷺ کے صحابہ نے اُس پرچم کی آرزو کی مگر آپ ﷺ نے وہ پرچم مجھے عطا فرمایا۔

اس حدیث کو امام ابن ماجہ نے اپنی سنن میں از عثمان بن ابی شیبہ از وکیع روایت کیا ہے لیکن ہمیں اس سے بھی اعلیٰ سند سے یہ حدیث موصول ہوئی ہے، والحمدللہ۔

"فتشرف لها" کا معنی ہے "پرچم کی اُمید میں خود کو حضور ﷺ کے سامنے پیش کیا"۔

(مسندأحمد ج١ ص٩٩، حديث٧٧٨ وص١٣٣، حديث١١١٧، وط: ج٢ ص١٦٨، حديث ٧٧٨ وص٣٤٢، حديث١١١٧؛فضائل الصحابة ج٢ ص٦٩٧، حديث ٩٥٠ وص٧٩١، حديث١٠٨٤؛ سنن ابن ماجه ج١ ص٨٣، حديث١١٧؛السنن الكبرى للنسائي ج٧ص٤١١، حديث ٨٣٤٥، وط: ج٥ ص١٠٨، ١٠٩، حديث٨٤٠١؛المصنف لابن أبي شيبة ج٦ ص٣٧٠، حديث٣٢٠٧١ و ج٧ص٣٩٤، حديث٣٦٨٧٢، وط: ج١٧ ص١٠٣، حديث٣٢٧٤٣، وج٢٠ ص٤٤١، حديث ٣٨٠٣٨؛مسند عابس الغفاري لأبي عمر ص٣٩، حديث١٤ وص٥٤، حديث ٢٥ وص٦٥، حديث٣٧؛ مسند البزار ج٢ ص١٣٦، حديث٤٩٦؛ المعجم الأوسط ج٣ ص ١٥١، حديث ٢٣٠٧ وج٦ ص ٣٦٩، حديث٥٧٨٥؛شرف المصطفىٰ لأبي سعيد ج٣ ص ٤٧٢ وج٥ ص٥٠١؛ دلائل النبوة للبيهقي ج٤ ص٢١٣؛دلائل النبوة لأبي نعيم ص٤٦٣، حديث٣٩١؛جامع المسانيد لابن الجوزي ج٧ص١٩٣، حديث٥٥٩٣؛الوفا لابن الجوزي ص٣٥٠؛ذخائر العقبى ص٩٠؛ سير أعلام النبلاء ص ٦١٨؛البداية والنهاية ج٥ ص٤٥٢، وط: ج٧ص٥٦٣؛مجمع الزوائد ج٩ص ١٢٣، حديث١٤٧٠٧؛كشف الأستار ج٣ص١٩٢، ١٩٣، حديث٢٥٤٦؛مجمع البحرين للهيثمي ج٣ ص٣٧٧، ٣٧٨ حديث٣٦٩٢؛ إتحاف الخيرة المهرة ج٧ص١٨٥ حديث٦٦٣٣؛ الأنوار في آيات النبي المختار للثعالبي ج٣ص٨٤٠؛مختصر زوائد البزار للعسقلاني ج٢ ص٣١٤، حديث ١٩٦٤؛فتح الباري ج٨ص٢٥٥؛جمع الجوامع للسيوطي ج١٣ ص١٥، حديث ٥٤٢٥؛ الخصائص الكبرىٰ للسيوطي ج١ ص٤١٨، ٤١٩؛سبل الهدى ج١٠ ص٢٠١)

حافظ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"اس حدیث کو امام بزار نے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں محمد بن عبدالرحمان بن ابی لیلیٰ ہے اور اُس کا حافظہ درست نہیں تھا اور اس کے باقی تمام راوی صحیح حدیث کے راوی ہیں"۔

(مجمع الزوائد ج٩ص١٢٣، حديث١٤٧٠٧، وط: ج٩ص١١٣، حديث١٤٧٠٧)

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے:

هذا إسناد حسن.

"یہ سند حسن ہے"۔

(مختصر زوائد البزار ج۲ ص۳۱۴، ۳۱۵، حديث ۱۹۲۴؛ موسوعة ابن حجر العسقلاني ج۳ ص ۴۹۲)

شیخ محمد عوامہ نے مذکورہ راوی کی وجہ سے اس حدیث کی سند کو ضعیف کہا ہے لیکن ساتھ ہی وضاحت فرمادی ہے کہ اس کی متابعت موجود ہے، اور ابو اسحاق ہمدانی نے اس کی متابعت کی ہے۔

(تعليقات على المصنف لابن أبي شيبة ج۱۷ ص۱۰۲)

میں عرض کرتا ہوں کہ درج ذیل عنوان کے تحت جو حدیث آرہی ہے اُس میں حافظہ کی خرابی والا یہ راوی موجود نہیں ہے۔

تشریح تو کیا تصریح پر بھی پابندی؟

اس حدیث میں "ليس بفرّار" کے الفاظ سے بعض ایسے صحابہ کرامؓ پر تعریض ہے جو سیدنا علی المرتضیٰؓ سے قبل بطور سپہ سالار خیبر کے میدان میں گئے تھے مگر فتح کے بغیر واپس آگئے تھے۔ وہ کون حضرات تھے؟ درج ذیل حدیث میں اس بات کی تصریح موجود ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

حدثنا عبد الله، قال: حدثني أبي، قال: نا زيد بن الحباب، قال: حدثني الحسين بن واقد، قال: حدثني عبد الله بن بريدة، قال: سمعتُ أبي يقول: حاصرنا خيبر، فأخذ اللواء أبوبكر فانصرف ولم يفتح له، ثم أخذه من الغد عمر، فخرج فرجع ولم يفتح له، وأصاب الناس يومئذ شدة وجهد، فقال رسول اللهﷺ: إني دافع اللواء غداً إلى رجل يحبه اللهُ ورسولُه، ويحب اللهَ ورسولَه، لا يرجع حتى يُفتح له، وبتنا طيبة أنفسنا أنّ الفتح غداً، فلما أصبح رسول اللهﷺ صلى الغداة، ثم قام قائماً فدعا باللواء، والناس على مصافِّهم، فدعا علياً وهو أرمد، فتفل في عينيه، فدفع إليه اللّواء، وفتح له، قال بريدة: وأنا فيمن

تطاول لها.

”حضرت عبد اللہ بن بریدہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنے والد کو بیان کرتے ہوئے سنا کہ ہم نے خیبر کا محاصرہ کیا تو حضرت ابوبکر نے پرچم تھاما اور اُن پر خیبر فتح نہ ہوا، پھر دوسرے روز حضرت عمر نکلے پھر لوٹ آئے اور ان پر خیبر فتح نہ ہوا، اور اس دن لوگوں کو بہت شدت اور مشکل پیش آئی، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کل میں اپنا پرچم ایک ایسے شخص کو دوں گا جس کو اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ﷺ محبوب رکھتے ہیں یا فرمایا وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو محبوب رکھتا ہے، وہ نہیں لوٹے گا جب تک کہ اُسے فتح حاصل نہیں ہوگی۔ ہم نے اطمینان سے رات بسر کی کہ کل ضرور فتح ہو جائے گی۔ پس جب رسول اللہ ﷺ نے صبح فرمائی تو نماز فجر پڑھائی، پھر آ کر قیام فرمایا پھر پرچم طلب فرمایا اور لوگ اپنی صفوں میں تھے، پھر حضرت علی کو بلایا حالانکہ وہ آشوب چشم میں مبتلا تھے، پھر آپ نے اُن کی آنکھوں میں لعاب مبارک کی آمیزش سے تھتکارا اور پرچم انہیں تھما دیا اور انہیں فتح نصیب ہوئی۔ حضرت بریدہ فرماتے ہیں: اور میں بھی اُن لوگوں میں سے تھا جو پرچم کے امیدوار تھے“۔

(فضائل الصحابة ج٢ ص ٧٣٥، حديث ١٠٠٩؛ مسند أحمد ج٥ ص ٣٥٤، وط: ج٧ ص ٦٣٠، حديث ٢٣٣٨١، وط: ج٣٨ ص ٩٧، حديث ٢٢٩٩٣)

فضائل الصحابۃ کے محقق شیخ وصی اللہ بن محمد عباس نے کہا ہے کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔

امام احمد کے علاوہ یہ حدیث امام نسائی، امام ابن اسحاق بن یسار، امام ابن ہشام، امام بیہقی، امام ابن عساکر، امام عراقی اور حافظ ابن کثیر وغیرہم نے بھی ذکر کی ہے۔

(السنن الكبرى للنسائي ج٧ ص ٤١٢، حديث ٨٣٤٦ وج٨ ص ١٦، حديث ٨٥٤٧، وط: ج٥ ص ١٠٩، حديث ٨٤٠٢ وص ١٧٩، حديث ٨٦٠١؛ خصائص علي ص ٤٠، حديث ١٥؛ السيرة النبوية لابن إسحاق ص ٤٧٦؛ السيرة النبوية لابن هشام ج٣ ص ٢٩٣؛ دلائل النبوة للبيهقي ج٤ ص ٢٠٩، ٢١٠؛ تاريخ دمشق ج٤٢ ص ٩٣؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٧ ص ٣٢٧؛ تقريب الأسانيد للعراقي ص ٦٣٢، حديث ٣٠٩؛ السيرة النبوية لابن كثير ج٣ ص ٣٣٩؛ البداية والنهاية ج٣ ص ٣٥٩، وط: ج٧ ص ٥٦٠؛ سيرة المصطفى للكاندهلوي ج٢ ص ٧٢١)

شیخ احمد میرین البلوشی انتہائی متشدد شخص ہیں لیکن انہوں نے بھی اس حدیث کی سند کو صحیح کہا ہے، اسی طرح ابواسحاق الحوینی کے نزدیک بھی اس حدیث کی سند صحیح ہے۔

(خصائص علي ص ٤٠، حدیث ١٥؛ خصائص علي ص ٣٧ حدیث ١٤)

حافظ ابن کثیر نے غزوہ خیبر کے ذکر میں اس مضمون کی احادیث کو غیر صحیح باور کرانے کے لیے کافی ہاتھ پیر مارے ہیں مگر اس حدیث کی سند پر اُن کی دال بھی نہیں گلی۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کے مطابق بھی سیدنا علی سے قبل شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کا جانا اور فتح کے بغیر لوٹ آنا ثابت ہے۔

(فتح الباري ج٨ ص ٢٥٤، وط: ج٧ ص ٥٤٦، وط: ٩ ص ٣١٣، حديث ٤٢٠٩، ٤٢١٠؛ سيرة المصطفىٰ للكاندهلوي ج٢ ص ٧٢١)

جب صحیح حدیث سے یہ حقیقت ثابت ہوگئی کہ سیدنا علی سے قبل شیخین کریمین رضی اللہ عنہما غزوۂ خیبر کی فتح کے لیے تشریف لے گئے تھے اور فتح حاصل نہیں کر سکے تھے تو یہاں ایک افسوس ناک رجحان عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ یہ کہ بعض مجالس میں بعض علماء نے سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے فضائل میں دوسری احادیث کے ساتھ یہ حدیث بھی بیان کی تو بعض لوگوں نے کہا کہ یہ حدیث بیان کرنے سے گریز کیا جائے۔ میں پوچھتا ہوں: اگر اس قسم کے مشوروں پر عمل کیا جائے اور کسی کے صریح فضائل کے بیان سے بھی گریز کرنے کا آرڈر یا مشورہ قبول کیا جائے تو کیا یہ بات کتمانِ حق کے زمرہ میں نہیں آئے گی؟

خودساختہ عقائد کے فسادات

کبھی آپ غور کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں تو یقیناً اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ اس قسم کی پابندیوں کی وجہ اکثر وہ خودساختہ عقائد ہیں جو صدیوں بعد عقائد کی کتب میں ترتیب دیے گئے، اُن ہی میں سے ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ ترتیبِ خلافت ترتیبِ افضلیت کے مطابق ہے۔ پھر کچھ لوگ اس معاملہ میں اس حد تک آگے نکل گئے کہ وہ کسی بھی قسم کی افضلیت کو اُس شخص کے لیے ماننے کو تیار نہیں ہوتے جو ترتیبِ مذکور میں اوّل نہ ہو۔ دراصل یہ عقیدہ نہیں بلکہ محض نظریہ ہے اور ایسے نظریات مآل کار بہت سے فسادات کا باعث بنتے ہیں۔ مثلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو روئے زمین پر بسنے والے تمام لوگوں سے زیادہ سچا قرار دیا تو امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ اس فرمان میں کچھ استثنائی صورتوں کی تلاش میں کھو گئے، جیسا کہ ہم اس سے قبل لکھ چکے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ

میں ایسا کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

جواباً عرض ہے کہ جب عقائد کی کتابوں کو قرآن مجید کی طرح غیر مسترد اتھارٹی مان لیا جائے تو ایسی ابیوں کا جنم لینا یقینی ہو جاتا ہے۔ زیر تشریح حدیث میں سیدنا علی علیہ السلام کی احبیت، اُن کے کرّار غیر فرّار ہونے کی ضلیت کے انکار اور اُسے بیان نہ کرنے کے مشوروں کے پیچھے بھی یہی خرابی کارفرما ہے۔

جو لوگ عقائد کی کتب کو اس حد تک اہمیت دیتے ہیں اُنہیں چاہیے کہ وہ احادیث کے کلمات میں ایسی ترمیم لیں کہ ہر حدیث کے الفاظ کتب عقائد کے مطابق ہو جائیں۔

"کلموا الناس علیٰ قدرِ عقولهم" کا مطلب

علاوہ ازیں بعض کو دِن قسم کے لوگ کہتے ہیں: "کلموا الناس علیٰ قدرِ عقولهم" (لوگوں کی عقلوں ، مطابق کلام کیا کرو) اُنہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اِس کا مطلب فقط یہ نہیں کہ سطحی الذہن لوگوں کی عقلوں کے ابق کلام کیا کرو بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ اعلیٰ ذہانت والے لوگوں کے سامنے اُن کے معیار کے مطابق م کیا کرو۔ مولانا سید ابوالحسن علی الندوی لکھتے ہیں:

> "کلموا الناس علیٰ قدرِ عقولهم، الخ. اس میں جس طرح عوام کی عقلی سطح کی رعایت ضروری ہے اسی طرح اہل علم وعقلاء کی عقلی سطح کی رعایت بھی ضروری ہے"۔

(تاریخ دعوت وعزیمت حصہ اول ص ۱۱۱)

اگر اس میں فقط عوام کی سطح کے مطابق کلام کرنے کا حکم ہے تو پھر یہ مشورہ حضور ﷺ کو دیا ہوتا کہ آپ "یفِرو" نہ فرماتے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مشورہ دیا ہوتا کہ وہ پورا پورا واقعہ ہی بیان نہ کرتے، تابعین عظام کو ایسا مشورہ ہوتا کہ وہ ایسی روایات کو آگے ہی نہ پہنچاتے، محدثین وسیرت نگار حضرات کو تلقین کی ہوتی کہ وہ اس روایت کو اپنی کتب میں درج ہی نہ فرماتے اور ہر قومی زبان کے مترجم کو مشورہ دیا ہوتا کہ وہ اِن احادیث کا ترجمہ عربی ے اپنی زبان میں منتقل نہ کرتا۔

آخر کیا وجہ ہے کہ سیدنا ومرشدنا علی علیہ السلام کے فضائل ومناقب کے وقت لوگوں کی عقل سکڑنے لگتی ہے؟ اور فضائل مرتضوی ہی اُن کی عقلی سطح سے ماوراء سمجھے جاتے ہیں؟ روافض کو خدا ہدایت دے کہ اُن کی ضد میں معاملہ ں تک آپہنچا ہے کہ کسی مجلس میں شیخین کریمین، سیدنا عثمان ذی النورین، دوسرے صحابہ کرام، سیدنا غوث اعظم،

سیدنا خواجہ غریب نواز، سیدنا شیخ شہاب الدین سہروردی، سیدنا خواجہ بہاؤ الدین نقشبند اور دوسرے بزرگانِ دین ﷺ کا گھنٹوں ذکر کیا جائے اور اِن میں سے فقط کسی ایک ہی ہستی کا ذکر کیا جائے تو وہ سب کی عقلوں کے مطابق ہوتا ہے، کوئی ایک شخص بھی اسے عقل سے ماوراء نہیں سمجھتا، لیکن اگر فقط سیدنا علی ﷺ کا ذکر کیا جائے تو نگاہیں اوپر اٹھنے لگتی ہیں، تیور بدلنے لگتے ہیں، مقرر کی طرف گھور گھور کر دیکھا جاتا ہے، حتیٰ کہ بیچارے مقرر کو اپنی ساکھ اور سنیت بچانے کے لیے سیدنا علی ﷺ کے ذکر کے ساتھ ساتھ کسی اور شخصیت کا ذکر بھی شامل کرنا پڑتا ہے۔

مجھے بعض جید علماء کرام نے لاہور کا ایک واقعہ سنایا کہ ایک سال رمضان المبارک کا جمعہ اکیسویں روزے کو آیا اور اُس دن خطیب صاحب نے سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کا ذکرِ خیر کرنا تھا کہ اچانک عین وقت پر مسجد کے متولی صاحب نے مولانا صاحب کو آکر کہا: آج آپ سیدنا ابوبکر صدیق ﷺ کا ذکر فرمائیں۔ مولانا نے حسب حکم بیان کردیا اور آخر میں کہا: آج یوم شہادت علی المرتضیٰ ﷺ ہے مگر ہم نے اُن کے ذکر کی بجائے سیدنا ابوبکر صدیق ﷺ کا ذکر کیا ہے، یقیناً یہ ذکر بھی ہمارے ایمان کا حصہ ہے لیکن دن کی نسبت بھی تو ایک حقیقت ہے۔ اگر تم پوچھو کہ ہم نے اس نسبت کا خیال کیوں نہیں کیا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اِس منافق نے ہمیں کہا کہ آج ہم سیدنا ابوبکر صدیق ﷺ کا ذکر کریں۔ یہ کہتے ہوئے مولانا نے سامنے بیٹھے ہوئے مسجد کے متولی کی طرف اشارہ کیا۔ علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایسے ہی احمقوں کے بارے میں فرمایا تھا۔

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محرابِ مسجد پر
یہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقتِ قیام آیا

(بالِ جبریل ص ۵۷)

قیام بھی بہتر ہے اور سجدہ بھی، ذکرِ صدیقی بھی عبادت ہے اور ذکرِ مرتضوی بھی مگر ہر ایک کا اپنا اپنا وقت ہے اور وقت سے مؤخر کرنے والوں کو ناداں کہا گیا ہے۔ لیکن اب تو روافض کی ضد میں آکر اس سے بھی زیادہ نادانی کا ثبوت دیا جارہا ہے اور اہل بیت کے خاص دنوں میں اُن لوگوں کے فضائل بیان کیے جانے لگے ہیں جن کے فضائل میں کوئی صحیح حدیث آئی ہی نہیں۔ ہماری گذارش ہے کہ اس انداز پر نظرِ ثانی کرنا چاہیے، اور سیدنا علی ﷺ کا ذکرِ خیر بھی گوشِ دل سے سننا چاہیے، اور اسے عقل سے ماوراء نہیں سمجھنا چاہیے۔ یاد رکھئے! سیدنا علی کا ذکر خوارج کو سمجھ نہیں آتا اور صحیح احادیث میں انہیں کو "سفهاء الأحلام" (بے وقوف و احمق) فرمایا گیا ہے۔ لہٰذا عقل مندی اسی میں ہے کہ دن کی مناسبت یا جلسہ کے عنوان کے مطابق جس ہستی کا ذکر موضوعِ سخن ہو اُس موضوع کی

پابندی کرتے ہوئے فقط اسی ہستی کا ذکر کر دیا جائے اور سود و زیاں کی یا کسی ملامت گر کی ملامت و طعن کی پروانہ کی جائے۔ یہ ملامت گر احمق لوگ فقط اِس زمانے میں ہی نہیں بلکہ شروع سے آ رہے ہیں۔ اگر کوئی ایسا منافق آپ کے پیچھے پڑتا ہے تو مت پروا کیجئے! کیونکہ ایسے منافق ہمارے ائمہ کرام ؓ کے پیچھے بھی پڑے رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے بدبختوں کے بارے میں امام شافعی ایسے مدبّر و ربانی عالم کو بھی یوں تند و تیز اظہار خیال کرنا پڑا تھا:

إِذَا نَحْنُ فَضَّلْنَا عَلِيّاً فَإِنَّنَا رَوَافِضُ بِالتَّفْضِيلِ عِنْدَ ذَوِي الْجَهْلِ
وَفَضْلُ أَبِي بَكْرٍ إِذَا مَا ذَكَرْتُهُ رُمِيتُ بِنَصْبٍ عِنْدَ ذِكْرِيَ لِلْفَضْلِ
فَلَازِلْتُ ذَا رَفْضٍ وَنَصْبٍ كِلَاهُمَا بِحُبَّيْهِمَا حَتّٰى أُوَسَّدَ فِي الرَّمْلِ

"جب ہم سیدنا علی ؓ کے مناقب بیان کرتے ہیں تو جاہلوں کے نزدیک ہمارا شمار روافض میں ہوتا ہے،
اور جب میں ابوبکر ؓ کے مناقب بیان کرتا ہوں تو مجھے ناصبی ہونے کا طعنہ دیا جاتا ہے،
پس میں رافضی اور ناصبی دونوں رہوں گا، ان کی محبت کی وجہ سے یہاں تک کہ قبر میں دفن کیا جاؤں"۔

(دیوان الشافعي ؓ ص ۳۲۵، ۳۲۶، ومترجم اردو ۲۰۳؛ توالي التأسیس لابن حجر ص ۱۴۱)

آپ نے ایک اور موقعہ پر فرمایا:

إِذَا فِي مَجْلِسٍ ذَكَرُوا عَلِيّاً وَسِبْطَيْهِ وَفَاطِمَةَ الزَّكِيَّةْ
فَأَجْرَى بَعْضُهُمْ ذِكْرَى سِوَاهُمْ فَأَيْقِنْ أَنَّهُ ابْنُ سَلَقْلَقِيَّةْ
إِذَا ذَكَرُوا عَلِيّاً أَوْ بَنِيهِ تَشَاغَلَ بِالرِّوَايَاتِ الدَّنِيَّةْ
وَقَالَ تَجَاوَزُوا يَا قَوْمُ عَنْهُ فَهٰذَا مِنْ حَدِيثِ الرَّافِضِيَّةْ
بَرِئْتُ إِلَى الْمُهَيْمِنِ مِنْ أُنَاسٍ يَرَوْنَ الرَّفْضَ حُبَّ الْفَاطِمِيَّةْ
عَلٰى آلِ الرَّسُولِ صَلَاةُ رَبِّي وَلَعْنَتُهُ لِتِلْكَ الْجَاهِلِيَّةْ

"یعنی علماء حق جب کسی محفل میں سیدنا علی المرتضیٰ، حسنین کریمین اور فاطمہ پاک ؓ کا ذکر خیر کرتے ہیں،
تو بعض لوگ دوسروں کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں، پس میں یقین کر لیتا ہوں کہ بیشک یہ رنڈی کی اولاد ہیں۔
جب بھی لوگ سیدنا علی اور ان کے فرزندانِ کرام ؓ کا ذکر کرتے ہیں تو کچھ لوگ خسیس روایات میں مشغول ہو جاتے ہیں، اور کہتے ہیں: اے قوم اِس عالم کو چھوڑ دو! یہ رافضیوں کی سی باتیں کرتا ہے۔
میں ایسے لوگوں سے اللہ ﷻ کی پناہ میں آتا ہوں جو فاطمیہ ؓ کی محبت کو رفض گمان کرتے ہیں۔

آلِ رسول علیہم السلام پر میرے رب کی صلاۃ ہو، اور ان جاہلوں پر اُس کی لعنت ہو"۔

(ديوان الإمام الشافعي مصححاً ص ٤١٢، ٤١٣)

حلاوتِ ایمان اور سیدنا علی علیہ السلام

اس حدیث شریف میں بھی گذشتہ حدیث کی طرح "يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ، وَيُحِبُّهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ" (وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا محبّ ہے اور اللہ تعالیٰ اور اُس کا رسول ﷺ اُس کے محبّ ہیں) کا جملہ موجود ہے، یعنی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے محبّ اور محبوب ہونے کا بھرپور بیان ہے۔ اس جملہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے اِس ارشادِ الٰہی میں غور فرمایئے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ.

"اور ایمان والے اللہ تعالیٰ سے شدید محبت کرتے ہیں"۔

(البقرة: ١٦٥)

سیدنا علی علیہ السلام ایمان کی ایسی اعلیٰ منزل پر تھے جس سے زائد کا کوئی امتی تصور بھی نہیں کر سکتا، حتی کہ ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا:

لو كشف الغطاء ما ازددت يقيناً.

"اگر پردہ ہٹا دیا جائے تب بھی میرے یقین میں اضافہ نہیں ہوگا"۔

(المناقب للخوارزمي ص ٣٧٥؛ الذريعة إلىٰ مكارم الشريعة لراغب الأصفهاني ص ١٤٩؛ مطالب السؤول ص ٤٣، وط: ص ٥٤؛ متن الهمزية للبوصيري [صاحب البردة] مع شرحه ص ٦٠، وص ٥٨٢؛ المنح المكية لابن حجر مكي ص ٥٨٢؛ اليواقت والجواهر للشعراني ج٢ ص ٥٤٦؛ نزل الأبرار بما صح من مناقب أهل البيت الأطهار للبدخشاني ص ١٢٢؛ امداد المشتاق للتهانوي ص ٩٨ مكتبة إسلامية، لاهور)

اس سے بلا تصنع اور بلا تکلف واضح ہوا کہ خیبر کے دن سولہ سو [1600] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں "يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ، وَيُحِبُّهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ" (وہ اللہ اور اس کے رسول کا محبّ ہے اور اللہ اور اس کا رسول اُس کے محبّ ہیں) کے اعلان کے بعد جس ہستی کو پرچم سونپا گیا تھا وہ ہستی کمالِ محبت و ایمان میں منفرد و یگانہ تھی۔

یہاں اگر درج ذیل حدیث اور اس کے ساتھ بعض آیات کو مدنظر رکھا جائے تو یہ حقیقت مزید واضح ہو جائے گی۔ حضرت انس ؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

ثلاث من كن فيه وجد حلاوة الإيمان: أن يكون الله ورسوله أحب إليه مما سواهما، وأن يحب المرء لايحبه إلا لله، وأن يكره أن يعود في الكفر كما يكره أن يقذف في النار.

''تین خصلتیں جس شخص میں پائی جائیں اس نے ایمان کی مٹھاس پالی:

۱۔ یہ کہ اللہ اور اس کا رسول ﷺ اُس کو اُن کے ماسوا سے زیادہ محبوب ہوں

۲۔ وہ جس شخص سے محبت کرے تو فقط اللہ کی خاطر محبت کرے

۳۔ اور وہ کفر میں پلٹنے کو یوں ہی ناپسند کرے جیسا کہ آگ میں ڈالے جانے کو ناپسند کرتا ہے''۔

(بخاري، حديث ١٦، ٢١، ٦٠٤١، ٦٩٤١)

حلاوتِ ایمان کا معنیٰ

اس حدیث کی تشریح میں ایک لطیف بات ارشاد فرمائی گئی ہے، وہ یہ کہ حلاوت (مٹھاس) کا تعلق ماکولات و مشروبات سے ہوتا ہے، ایمان جو ایک معنوی چیز ہے اس کے ساتھ حلاوت کا کیا تعلق؟ اس پر شارحین فرماتے ہیں:

''اس میں مریض اور تندرست شخص کے حال کی طرف اشارہ ہے، اس لیے کہ صفراوی مریض کو خالص شہد کڑوا محسوس ہوتا ہے اور تندرست شخص اس کی حلاوت کے اصلی ذائقہ سے شاد کام ہوتا ہے، اور پھر جس قدر صحت میں کمی ہوتی ہے اسی قدر قوتِ ذائقہ میں کمی ہوتی ہے، اسی طرح جو دل غفلتوں اور خواہشاتِ نفسانیہ کے امراض سے محفوظ ہوتا ہے وہ ایمان (محبت الٰہی اور محبت نبوی ﷺ) کی چاشنی سے یوں لطف اندوز ہوتا ہے، جس طرح منہ شہد اور لذیذ نعمتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے''۔

(مرقاة شرح المشكاة ج١ ص١٤٧؛ فتح الباري ج١ ص٨٧؛ شرح السيوطي على النسائي ج٨ص ٤٧٠؛ شرح السندهي على النسائي ج٨ص ٤٧١)

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص جتنا جسمانی صحت والا ہوگا وہ اتنا ہی ماکولات و مشروبات لذیذہ سے لطف اندوز ہوگا، بالکل اسی طرح جو شخص جتنا ایمان میں قوی ہوگا وہ اتنا ہی احکامِ الٰہیہ کی بجاآوری میں چاشنی اور مٹھاس زیادہ پائے گا۔ یہاں امام سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے بہت عمدہ بات لکھی ہے کہ کبھی ایمان کی یہ معنوی مٹھاس حسی (شکر، گڑ، شہد و ثمرات وغیرہ) مٹھاس پر بھی غالب آجاتی ہے، وہ فرماتے ہیں:

حتیٰ یدفع بها أشد المرارات.

''حتی کہ اُس (معنوی مٹھاس) کے ذریعے سخت ترین کڑواہٹیں دفع کی جاتی ہیں''۔

(شرح سنن النسائي ج٨ ص ٤٧١؛ وشرحه لعلي بن آدم ج٣٧ ص ١٧٢)

انبیاء کرام علیہم السلام کا تو مقام ہی ارفع ہے، محبت و ذکرِ الٰہی سے تو امت کے اہل اللہ بھی معنوی طور پر اس قدر میٹھے ہو جاتے ہیں کہ اُن کا جسمِ حسی بھی سراپا میٹھا ہو جاتا ہے، اور اتنا میٹھا ہو جاتا ہے کہ اُن پر زہر ہلاہل بھی اثر انداز نہیں ہوتا اور اُن کے لعاب سے کھاری پانی شیریں ہو جاتا ہے۔ خود اندازہ فرمایئے! جو محبتِ الٰہی میں اس قدر مستغرق ہو کہ اُس محبت کی معنوی ہی نہیں بلکہ حسی مٹھاس تک کا ذوقی مشاہدہ کر چکا ہو اُس کے ایمان و یقین کا مقام کیا ہوگا؟

ایمانِ مرتضوی کی حلاوت کا مقام

عرفاء کرام فرماتے ہیں کہ ایسا شخص یقین کے اُس بلند ترین مقام پر فائز ہو جاتا ہے کہ جو چیزیں حواسِ خمسہ ظاہری کے دائرہ کار میں نہیں آتیں اُس کا اُن پر بھی ایسا کامل یقین ہوتا ہے کہ اگر اُخروی امور یا خود ذاتِ الٰہی ﷻ اُس کے سامنے آجائیں تو اُس کے ایمان و ایقان میں اضافہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ اسی حدیث کی شرح میں امام سندھی رحمۃ اللہ علیہ آگے چل کر لکھتے ہیں:

ومرجع هذا أن يصير الغيب عنده من قوة الاعتقاد كالعيان، كما روي عن علي ﷺ لو كشف الغطاء ما ازددت يقيناً، ولايخفى أن من تكون عقيدته من القوة بهذا الوجه ومحبة الله تعالىٰ بذلك الوجه، فهو حقيق بأن يجد من لذة الأيمان مايجد.

''اور نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ ایسے شخص پر اُس کے ایمان کی قوت کی بدولت غیب عیاں

(ظاہر) کی طرح ہو جاتا ہے، جیسا کہ سیدنا علی ؓ سے روایت کیا گیا ہے کہ اگر پردے اُٹھا دیئے جائیں تو میرے یقین میں اضافہ نہیں ہوگا، اور مخفی نہیں کہ اس وجہ سے جس کا عقیدہ قوی ہو اور اسی وجہ سے وہ محبتِ الٰہی میں مستغرق ہو تو وہ حق رکھتا ہے کہ ایمان کی لذت میں سے وہ پائے جو پائے"۔

(شرح سنن النسائي ج۸ ص۴۷۱؛ شرح سنن النسائي لعلي بن آدم ج۳۷ ص۱۷۲)

جہاد سے اس قدر محبت کیوں؟

اب مجھے معلوم ہوا کہ سیدنا علی المرتضیٰ ؓ کو جہاد اتنا کیوں محبوب تھا؟ اس لیے کہ اُنہیں اس میں دوسروں کی بہ نسبت زیادہ حلاوت محسوس ہوتی تھی۔ چنانچہ قرآن کریم میں ایسی چاشنی والے مومنین کا ذکر یوں کیا گیا ہے:

يَـآاَيُّهَـا الَّـذِيْـنَ اٰمَـنُوْا مَـنْ يَّـرْتَـدَّ مِـنْـكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُـحِـبُّـوْنَـهٗٓ اَذِلَّةٍ عَـلَـى الْـمُـؤْمِـنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَايَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ.

"اے ایمان والو! جو تم میں سے اپنے دین سے پھرے گا تو عنقریب اللہ ایسی قوم لائے گا کہ وہ ان سے محبت فرمائے گا اور وہ اس سے محبت کریں گے، مومنوں کے لیے نرم کافروں پر سخت، اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے"۔ (المائدۃ: ۵۴)

علامہ ابن قیم لکھتے ہیں:

"اس آیت میں مومن کی چار علامات بیان فرمائی گئیں:

۱۔ مومنین پر نرم

۲۔ کافروں پر سخت

۳۔ جان، ہاتھ، زبان اور مال سے راہِ الٰہی میں جہاد، اور یہ دعوائے محبت کی حقانیت ہے

۴۔ راہِ الٰہی میں لوگوں کی طعنہ زنی کی پرواہ نہ کرنا اور یہ صحتِ محبت کی علامت ہے"۔

(مدارج السالکین ج۳ ص۲۲، ۲۳، وط: ج۳ ص۲۳)

سورۃ التوبہ کی آیت (۲۴) میں آٹھ ایسی چیزوں کا ذکر کیا گیا جو انسان کو فطری طور پر محبوب ہیں، پھر فرمایا گیا کہ اگر یہ چیزیں تمہیں اللہ تعالیٰ، اس کے رسول ﷺ اور جہاد سے زیادہ محبوب ہوں تو اللہ کی گرفت کے لیے تیار ہو جاؤ۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ جس شخص کا ایمان جتنا زیادہ قوی ہوگا اسے اتنا ہی اللہ تعالیٰ اور اُس کے حبیب ﷺ سے زیادہ محبت اور جہاد سے دلچسپی ہوگی، اس لیے کہ سورۃ المائدۃ کی مذکور الصدر آیت میں مومن کی تیسری علامت جہاد ہے، اور سورۃ التوبہ میں محبتِ الٰہی اور محبتِ نبوی ﷺ کے بعد مومن کی دوسری محبوب چیز جہاد بتلائی گئی ہے۔ سو جب آیات وحدیث کی روشنی میں کامل اور قوی مومن کی علامات واضح ہو گئیں تو کیا پھر یہ بتلانے کی ضرورت ہے کہ سیدنا علیؑ کو جہاد کتنا مرغوب ومحبوب تھا؟ اللہ اکبر جہاد میں انہیں کچھ ایسی حلاوت اور مٹھاس حاصل ہوتی تھی کہ تمام غزوات میں وہ پیش پیش رہتے تھے اور پرچم نبوی ﷺ بھی وہی تھامتے تھے، غزوۂ تبوک میں انہیں نہ لیجایا گیا تو رو پڑے تھے اور خصوصاً غزوۂ خیبر میں تو اُن کی محبت کے کمال کو بہت واضح بیان فرمایا گیا۔ چنانچہ جب دوسرے نامور صحابہ کرامؓ فتح حاصل کیے بغیر لوٹ آئے تو زبانِ نبوت ﷺ پر یہ جملہ جاری ہوا "لَأُعْطِيَنَّ الرَّايَةَ رَجُلاً يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ، وَيُحِبُّهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ لَيْسَ بِفَرَّارٍ" (میں ایک ایسے شخص کو پرچم عطا کروں گا جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا محب ہے اور اللہ اور اس کا رسول ﷺ اُس کے محب ہیں، وہ فرار ہونے والا نہیں)۔

فائدہ

اس سے اُن بعض مفسرین کی سنگین لغزش واضح ہوتی ہے جنہوں نے سورۃ الحدید کی آیت نمبر [۱۰] کے تحت خلیفۂ اول اور خلیفۂ رابع کے مالی اور بدنی جہاد میں مفاضلہ کرتے ہوئے سیدنا علیؓ کی جہادی عظمت کو مدہم اور دھندلا کرنے کی کوشش کی ہے۔

قوی مومن ضعیف مومن سے افضل

"لَيْسَ بِفَرَّارٍ" یہ لفظ اُس زبان مبارک سے صادر ہوا جو خواہش کے تابع نہیں تھی، اور پھر چونکہ یہ لفظ کائنات کے اعظم ترین حکیم ودانا کی زبانِ اقدس سے صادر ہوا، اس لیے عقل مند مسلمان پر ضروری ہے کہ وہ اس لفظ میں غور وفکر کرے، اور اگر کوئی شخص غور وفکر کی زحمت گوارا نہ کرے تو وہ نقل ہی پر اعتماد کرے، اور نقلی دلائل میں

متعدد احادیثِ صحیحہ اور حسنہ آئی ہیں کہ غزوۂ خیبر میں سیدنا علی المرتضیٰ سے قبل شیخین کریمین رضی اللہ عنہما گئے تھے۔ چنانچہ امام محب الدین الطبری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وقد وقع القتال قبل إعطائه الراية لعلي يومين لأبي بكر، ويوم لعمر.

''اور یقیناً سیدنا علی کو پرچم عطا کرنے سے دو روز قبل جنگ ہوئی تھی، ایک دن حضرت ابوبکر اور دوسرے دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ گئے تھے''۔

(الرياض النضرة ج٣ ص٢٠٤؛ موسوعة العشرة المبشرون بالجنة ج١١ ص١٢٨)

غزوۂ خیبر میں سیدنا علی سے قبل شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کے جانے کی مفصل و مدلل تحقیق راقم الحروف کی کتاب ''شرح خصائص علي رضی اللہ عنہ'' کی حدیث نمبر ۱۳ تا ۲۰ کا متن اور تشریح ملاحظہ فرمائیں۔ وہاں ایسی احادیث درج ہیں جن میں ہے کہ جب کوشش کے باوجود شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کو فتح حاصل نہیں ہوئی تھی تب اسد اللہ الغالب حیدر کرار کرم اللہ وجہہ کو بھیجا گیا تھا۔ لیکن ایک مخصوص اقتباس یہاں بھی ملاحظہ فرمائیں۔ حال ہی میں وفات پانے والے ہمارے معاصر جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شجاعت پر مرتضوی شجاعت کی ترجیح میں دلائل دیتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

''غزوۂ خیبر کے موقعہ پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے ہم رکاب تھے۔ خیبر میں یہودیوں کے چھ قلعے تھے۔ چھ تو فتح ہو گئے لیکن آخری قلعہ قموص زیادہ سخت ثابت ہوا۔ پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کی تسخیر کے لئے مامور ہوئے لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں کل ایک ایسے بہادر کو علم دوں گا جو خدا اور رسول ﷺ کا محبوب ہے اور اس قلعہ کی فتح اسی کے لیے مقدر ہے۔ صبح ہوئی تو ہر جان نثار متمنی تھا کہ کاش اس فخر و شرف کا تاج اس کے سر کی زینت بنے۔ حضور ﷺ نے دفعتاً حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پکارا اور وہ آشوبِ چشم میں مبتلا تھے۔ حضور ﷺ نے اُن کی آنکھوں پر لعاب دہن لگایا جس سے اُن کی تکلیف جاتی رہی، پھر علم مرحمت فرمایا''۔

(مثيل عيسىٰ علي مرتضىٰ، تحرير شده خطاب: ڈاكٹر أسرار أحمد ص ٣٣)

ایسی تمام نقولِ صحیحہ کے ساتھ ساتھ عقولِ سلیمہ بھی اسی بات کی تائید کرتی ہیں کہ جب کوئی مشکل معرکہ پہلے سپہ سالار سے سر نہ ہو سکے تو بعد میں اُس سے زیادہ قوی، شجیع اور بہادر شخص کو بھیجا جاتا ہے۔ اگر کسی شخص کو ان نقول

صحیحہ اور عقول سلیمہ پر اعتراض نہ ہو تو پھر ہم اس کی خدمت میں درج ذیل حدیث پیش کرنا چاہتے ہیں:

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

المؤمن القوي خير وأحب إلى الله من المؤمن الضعيف.

"قوی مومن بہتر ہے اور اللہ تعالیٰ کو کمزور مومن سے زیادہ محبوب ہے"۔

(صحيح مسلم ص ١١٦١، حديث ٦٧٧٤)

بعض مقامات پر اس حدیث میں "أحب" کے ساتھ "افضل" کا لفظ بھی آیا ہے:

المؤمن القوي خير وأفضل وأحب إلى الله ﷻ من المؤمن الضعيف.

"قوی مومن بہتر اور افضل ہے اور اللہ ﷻ کو ضعیف مومن سے زیادہ محبوب ہے"۔

(مسند أحمد ج ٢ ص ٣٦٦، وط: ج ٣ ص ٣٦٢، حديث ٨٧٧٧، وص ٣٧٠، حديث ٨٨١٥، وط: ج ١٤ ص ٣٩٥، حديث ٨٧٩١، وص ٤٢٤، حديث ٨٨٢٩؛ عمل اليوم والليلة لابن السني ص ١٢٦، حديث ٣٤٨)

اس صحیح حدیث کو سامنے رکھتے ہوئے حدیثِ خیبر کے اِس جملہ میں ایک مرتبہ پھر غور فرمایئے "لَأُعْطِيَنَّ الرَّايَةَ غَدًا رَجُلاً يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ، وَيُحِبُّهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ" (کل میں ایک شخص کو پرچم عطا کروں گا جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا محب ہے اور اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے محب ہیں) اس جملہ میں "رَجُلاً" کا لفظ نکرہ ہے، یعنی بلاتعین کوئی شخص، یہی وجہ ہے کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس پرچم کی امید میں رات گذاری تھی۔ لہٰذا مکمل عدل وانصاف کو بروئے کار لاتے ہوئے ایمان سے بتلایئے کہ جب ایک روز قبل بلاتعین فرمایا تھا کہ کسی شخص کو پرچم دوں گا اور دوسرے دن تمام مُتَنَظِرِیْن اور امیدواروں کی موجودگی میں کسی کم بہتر، کم فضیلت والے اور کم محبوب شخص کو پرچم تھما دیتے تو کیا یہ خیانت نہ ہوتی؟ یقیناً ہوتی، اور چونکہ اللہ کا نبی ہر قسم کی خیانت سے منزہ اور مقدس ہوتا ہے اس لیے ثابت ہوا کہ جس شخص کو وہ پرچم عطا ہوا وہ اپنے تمام ساتھیوں سے قوی، بہتر، افضل اور سب سے بڑھ کر محبّ ومحبوبِ خدا ومصطفیٰ ہے۔

ضرب المثل کی حد تک قوت وشجاعت کی شہرت

جب حدیث کی رو سے زیادہ محبوب، افضل اور بہتر مومن وہ ہے جو سب سے زیادہ قوی ہو تو پھر اگر ناصبی

ذہنیت اس حقیقت پر چیں بہ جبیں ہوتو ہوتی رہے مگر میں ضرور عرض کروں گا کہ اہل اسلام کے نزدیک یہ حقیقت ایمان وعقیدہ کی حیثیت رکھتی ہے کہ امت میں قوی ترین اور بہادر ترین مومن سیدنا علی علیہ السلام کی ذات بابرکات ہے۔ چنانچہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے منظوم فارسی اور اردو کلام میں جابجا اسی حقیقت کو بیان کیا ہے، وہ فرماتے ہیں۔

تری خاک میں ہے اگر شرر، تو خیالِ فقر وغنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے، مدارِ قوتِ حیدری

(بانگِ دراص ۱۹۳؛ کلیات اقبال ص ۱۹۷)

ایک اور مقام پر اسی قوت کی یوں التجا کی ہے۔

جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے
اسے بازوئے حیدر بھی عطا کر

(بال جبریل ص ۸؛ کلیات اقبال ص ۲۴۲)

ایک اور مقام پر اس طاقت کو یوں ادا فرمایا ہے۔

مٹایا قیصر وکسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؟ زورِ حیدر، فقرِ بوذر، صدقِ سلمانی

(بال جبریل ص ۲۰۹؛ کلیات اقبال ص ۲۱۳)

یہود وہنود وغیرہ کی کارستانیوں پر علامہ کو فکر لاحق ہوئی تو اُن کی زبان پر آیا تو فقط یہی نام آیا۔

بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین ووطن
اس زمانے میں کوئی حیدرِ کرار بھی ہے؟

(بال جبریل ص ۵۲؛ کلیات اقبال ص ۲۸۶)

چونکہ غزوۂ خیبر میں کامل محبت اور کامل قوت کامیاب ہوئی، اس لیے علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مقام پر دونوں کو یوں جمع کیا۔

کبھی تنہائی کوہ ودمن عشق
کبھی سوز وسرور وانجمن عشق

کبھی سرمایۂ محراب ومنبر

کبھی مولا علی خیبر شکن عشق

(بال جبریل ۷۰؛ کلیات اقبال ص ۳۰۴)

ایک اور مقام پر امارت وشاہانہ دبدبہ کے تقابل میں فرماتے ہیں۔

امارت کیا، شکوہِ خسروی بھی ہو، تو کیا حاصل

نہ زورِ حیدرؓ تجھ میں نہ استغنائے سلمانی

(بال جبریل ص ۱۰۰؛ کلیات اقبال ص ۳۳۴)

مولیٰ علی علیہ السلام کا ایک لقب اسد اللہ بھی ہے، علامہ ایک مقام پر اسے مرد کی بہتری کی علامت قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اے طائر لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی

جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ

ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

(بالِ جبریل ص ۴۶)

علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے فارسی کلام میں بھی سیدنا علی المرتضیٰ علیہ السلام کو تمام بہادروں کا سردار بلکہ سراپا بہادری قرار دیا ہے۔ چنانچہ درج ذیل شعر میں آپ کو تمام بہادر مردوں کا بادشاہ قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے۔

مسلمِ اوّل شہِ مرداں علی

عشق را سرمایۂ ایماں علی

''اولین مسلم اور بہادروں کے سردار علی ہیں، عشق کے لیے سرمایۂ ایمان علی ہیں''۔

(اسرار و رموز ص ۴۷)

فرماتے ہیں: ممالک اور دلوں کی فتح بھی اسی قوت وکراری میں مضمر ہے۔

مــــرد کشــــور گیــــر از کــــرّاری اســــت

گــــوہــــرش را آبــــرو خــــود داری اســــت

''کوئی مردِ فاتح فقط کرّاری سے بنتا ہے، اُس کے باطنی جوہر کو عظمت خودداری سے ملتی ہے''۔

(اسرار و رموز ص۴۸)

پھر فرماتے ہیں:

می شناسی معنیٔ کرار چیست

ایں مقامے از مقاماتِ علی است

''تم جانتے ہو کرّار کا کیا معنی ہے؟ یہ علی کے مقامات میں سے ایک مقام ہے''۔

(پس چہ باید کرد ص۸۷۸)

امتــــاں را در جہــــانِ بــــے ثبــــات

نیســــت ممــــکن جــــز بــــکراری حیــــات

''اس ناپائیدار جہاں میں امتوں کے لیے کرّاری کے بغیر عزت کی زندگی ناممکن ہے''۔

(پس چہ باید کرد ص۸۷۸)

علامہ اقبال کا کلام ابھی باقی ہے، اور اس کا احاطہ کرنا آسان نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ زورِ حیدر اور قوتِ علی کے ذکر کے بغیر اعلیٰ ہمتی اور عظیم بہادری کو سمجھا ہی نہیں جاسکتا، یہی وجہ ہے کہ آج تک سب سے بڑے مسلمان طاقتور اور بہادر کو جو تمغۂ جرأت و بہادری دیا جاتا ہے وہ ''نشانِ حیدر'' ہے۔ والحمد للہ علیٰ افضالہ۔

سیدنا علی علیہ السلام کا کمالِ ایمان واتباع

گذشتہ سطور میں لفظ محبت کے معانی میں ایک معنی یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ محبّ وہ ہوتا ہے جس میں ذاتی خواہش اور تصرف باقی نہ رہے۔ حدیث پاک سے بھی اس معنی کی تائید ہوتی ہے، حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لا یؤمن أحدکم حتی یکونَ هواه تبعًا لِمَا جئتُ به.

''تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اُس کی خواہش اُس کے تابع

نہ ہو جائے جسے میں لایا ہوں"۔

(شرح السنة ج١ ص١٤٥، حديث ١٠٤؛ كتاب السنة لابن أبي عاصم ص١٢، حديث١٥؛ تاريخ بغداد ج٥ ص١٣٣؛ جامع العلوم والحكم لابن رجب ج٢ ص٣٩٣؛ موطا: ص٨٢٤؛ مشكاة، حديث١٦٧؛ الجواهر البهية في شرح الأربعين النووية ص٢٥٤)

بلاشبہ سیدنا علی ﷛ ایمان کے اِسی اعلیٰ ترین مقام پر فائز تھے، کیا آپ نے نہیں سنا کہ ایک مرتبہ وہ محبوبِ حقیقی کی خاطر اُس کے دشمن کے ساتھ مصروفِ جہاد تھے اور اُس پر قابو پایا ہی تھا کہ اُس نے اُن پر تھوک دیا تو اُنہوں نے فوراً اُسے چھوڑ دیا، جس پر وہ حیرت زدہ ہوا تو اُنہوں نے فرمایا:

گفت من تیغ از پے حق می زنم — بندۂ حق ام نہ مامورِ تنم

شیرِ حق ام نیستم شیرِ ہوا — فعلِ من بر دینِ من باشد گوا

"فرمایا: میں اللہ تعالیٰ کے لیے تلوار چلاتا ہوں، میں خدا کا بندہ ہوں اپنے جسم کا غلام نہیں ہوں میں اسد اللہ [خدا کا شیر] ہوں، خواہشِ نفسانی کا شیر نہیں ہوں، میرا فعل میرے دین پر گواہی دے گا"۔

(مثنوي مولانا روم ج١ دفتر اول مترجم قاضي سجاد حسين ص٣٨٥)

یہ کمالِ اتباعِ نبوی ہے۔ اندازہ کیجئے کہ ایک طرف تو اتنے بڑے بدبخت دشمن کو فقط اس لیے چھوڑ دیا کہ اُس وقت اس کے قتل میں خواہش کی آمیزش ممکن تھی، جبکہ دوسری طرف اِتباعِ نبوی ﷺ کا یہ عالم تھا کہ نبی کریم ﷺ کی ہر قابلِ عمل سنت (جو خصوصیتِ نبوی نہ ہو) پر عمل کیا اور اس سلسلے میں اولیٰ اور خلافِ اولیٰ کی پرواہ نہ فرمائی بلکہ فقط ایک ہی جذبہ غالب رہا کہ یہ محبوب کی سنت ہے۔ پھر اس میں کسی قسم کے طعن و ملامت کی پرواہ بھی نہ فرمائی۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ حضرت میسرہ اور حضرت زاذان ﷛ سے روایت کرتے ہیں [واللفظ لزاذان] کہ انہوں نے فرمایا:

"سیدنا علی بن ابی طالب ﷛ نے کھڑے ہو کر پانی نوش فرمایا تو لوگ اُنہیں غور سے دیکھنے لگے گویا ناپسندیدگی کا اظہار کر رہے تھے، تو اُنہوں نے فرمایا: کیا دیکھتے ہو؟ اگر میں کھڑے ہو کر پیتا ہوں تو میں نے رسول اللہ ﷺ کو کھڑے ہو کر پیتے ہوئے دیکھا ہے اور اگر میں بیٹھ کر پیتا ہوں تو میں نے رسول اللہ ﷺ کو بیٹھ کر پیتے ہوئے دیکھا ہے"۔

(مسند أحمد ج١ ص١٠١، ١١٤، ١٣٤، وط: ج١ ص٣٠٣، ٣٣١، ٣٧٩، حديث ٧٩٥، ٩١٦،

١١٢٥، وط: ج٢ ص١٩٧، حديث ٧٩٥، ٧٩٧؛ المصنف لابن أبي شيبة ج١٢ ص ٢٧٧، حديث ٢٤٥٨٥)

اِسی جذبۂ اتباعِ نبوی ﷺ میں بسا اوقات وہ خلیفۂ وقت سے بھی اختلاف کر دیتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ اُن کا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے اختلاف ہو گیا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک ہی احرام کے ساتھ حج اور عمرہ ادا کرنا تمتع یا قِران ہے اور الگ الگ ادا کرنا اِفراد کہلاتا ہے۔ لہٰذا شریعت میں یہ دونوں صورتیں سنت ہیں مگر جب کسی عمل کے دو طریقوں میں سے کسی ایک کو عمل میں لایا جائے اور دوسرے کو ترک کر دیا جائے تو غالب خدشہ ہوتا ہے کہ عوام فقط اُسی ایک طریقہ تک محدود رہ جائیں گے، اسی لیے مولیٰ علی علیہ السلام نے ایک خلیفۂ راشد کے ساتھ اس مسئلہ میں اختلاف فرمایا تھا۔ چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ اُنہوں نے فرمایا:

"حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مابین عسفان کے مقام پر حج تمتع کے مسئلہ میں اختلاف پیدا ہو گیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آپ کا اس کے سوا اور کوئی ارادہ نہیں کہ آپ لوگوں کو اُس عمل سے روکیں جسے نبی کریم ﷺ نے کیا تھا، بہر حال جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ صورتِ حال دیکھی تو اُنہوں نے حج و عمرہ دونوں کے لیے تلبیہ کی آواز بلند فرمائی"۔

(بخاري ص ٢٥٥، حديث ١٥٦٩)

صحیح مسلم میں ہے کہ اس موقعہ پر حضرت عثمان غنی نے سیدنا علی رضی اللہ عنہما سے کہا:

دَعْنَا مِنْکَ، فَقَالَ: إِنِّي لَا أَسْتَطِيعُ أَنْ أَدَعَکَ.

"آپ ہمیں ہمارے حال پر رہنے دیں، تو اُنہوں نے فرمایا: یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا"۔

(صحيح مسلم ص ٥٦١، حديث ١٢٢٣ وط: ص ٥١٩، حديث ٢٩٦٤)

بخاری شریف میں ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو اس موقعہ پر یہ بھی فرمایا:

ما كنت لأدع سنة النبي ﷺ لقول أحد.

"میں کسی شخص کے قول کی وجہ سے سنتِ نبوی ﷺ کو نہیں چھوڑ سکتا"۔

(بخاري ص ٢٥٤، حديث ١٥٦٣؛ مسند أبي داود للطيالسي ص ١٦، حديث ٩٦، وط: ج١ ص ٦٤، حديث ٩٦؛ سنن الدارمي ج٢ ص ٥٩، حديث ١٩٢٣؛ موافقة خُبر الخبر للعسقلاني ج١ ص ٢٨٨)

ایمانِ مرتضوی کے کمال پر شہادتِ فاروقی رضی اللہ عنہ

یہ ایسا انتہائی حساس مقام ہے جہاں بعض عقول کے پھسلنے کا امکان ہے، اس لیے ازراہِ خیر خواہی واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مولائے کائنات علیہ السلام کا یہ یا اور کوئی طرزِ عمل خواہشِ نفسانی یا کسی بھی سطحی سوچ کے تابع نہیں ہوتا تھا بلکہ اُن کا ہر عمل محض رضائے الٰہی کی خاطر ہوتا تھا، جیسا کہ راقم اس سے قبل مثنوی سے نقل کر چکا ہے بلکہ خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی حلفاً اس بات کی ضمانت دی ہے کہ علی کا غصہ ہو یا خوشی سب میں رضاءِ الٰہی مدنظر ہوتی ہے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

أيها الناس لا تشكوا علياً، فو الله إنه لأخشن في ذات الله أو في سبيل الله.

''لوگو! علی کی شکایت نہ کیا کرو، اللہ کی قسم! وہ سب سے بڑھ کر ذاتِ الٰہی اور راہِ الٰہی میں سخت ہیں''۔

(مسند أحمد ج۳ ص۸٦، وط: ج٤ ص۲۱۷، حديث ۱۱۸۳۹، وط: ج۱۸ ص ۳۳۷، حديث ۱۱۸۱۷؛ فضائل الصحابة ج۲ ص۸٤٥، حديث ۱۱٦۱؛ المستدرك ج۳ ص ۱۳٤، وط: ج٤ ص ۱۰۷، حديث ٤۷۱۰؛ حلية الأولياء ج۱ ص۱۰۹؛ تاريخ دمشق ج٤۲ ص۱۹۹، ۲۰۰؛ در السحابة للشوكاني ص ۲۲۳؛ موسوعة العشرة المبشرون بالجنة ج۱۱ ص۱۲۹)

حافظ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے اور اس کے تمام راوی ثقہ ہیں''۔

(مجمع الزوائد ج۹ ص۱۲۹، وط: ج۹ ص۱۷٤، حديث ۱٤۷۳٥، وط: ج۹ ص ۱۲۱، حديث ۱٤۷۳٥، وط: ج۱۸ ص۲۹٦ حديث ۱٤۷۳٦)

اس تمام تر تفصیل سے معلوم ہوا کہ سیدنا علی علیہ السلام اتباعِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سب سے بڑھ کر تھے، اسی لیے وہ مُحِبّیت و محبوبیت میں بھی سب پر فائق تھے، اور کاملِ اتباع اور کاملِ مُحِبّیت و محبوبیت کا دوسرا نام ہے کاملِ ایمان۔

چنانچہ ترجمانِ حق خلیفۂ ثانی سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ اگر ساتوں زمینیں

ایک پلڑے میں رکھی جائیں اور حضرت علیؓ کا ایمان دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو اُن کا ایمان بھاری رہے گا"۔

(تاریخ دمشق ج٤٢ص٣٤١؛مختصر تاریخ دمشق ج١٧ص٣٨٩؛مختصر کتاب الموافقة ص ١٤١؛الرياض النضرة ج٣ص١٧٧؛موسوعة العشرة المبشرون بالجنة ج١١ص١٣٠)

شہادتِ فاروقی میں تائیدِ نبوی ﷺ

لسانِ حق سیدنا عمرؓ کے بیان سے معلوم ہوا کہ ایمان کے جس کمال پر سیدنا علیؑ فائز تھے اس کمال پر کوئی دوسرا نہیں پہنچا تھا۔ قارئین کرام بخدا میں میلانِ طبع کے تحت نہیں لکھتا بلکہ دلائل مجھے جس طرف لے جائیں میں ادھر چلا جاتا ہوں، لہٰذا آپ بھی سیدنا فاروقِ اعظمؓ کے ارشاد میں غور فرمایئے، یہ انتہائی اہم ارشاد ہے، کیونکہ فضائل ومدارج کا تعلق ایمان کے کمال سے ہے۔ اگر غور کیا جائے تو خلیفۂ ثانی سیدنا عمر بن خطابؓ کے اس ارشاد میں بہت کچھ ہے۔ ممکن ہے اس اثر (قول عمرؓ) میں کسی کو کلام ہو تو راقم الحروف یہاں صحیح حدیثِ نبوی ﷺ پیش کر دیتا ہے جس میں آپ جتنا غور فرماتے جائیں گے اتنا ہی آپ پر نہ صرف یہ کہ سیدنا فاروقِ اعظمؓ کے ارشادِ مبارک کی گہرائی واضح ہوتی چلی جائے گی بلکہ اُن کے اس ارشاد کا سبب بھی واضح ہو جائے گا۔

حضرت ربعی بن حراش سیدنا علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

> يا معشر قريش، والله ليبعثن الله عليكم رجلاً منكم امتحن الله قلبه للإيمان، فيضربكم على الدين أو يضرب بعضكم، قال أبوبكر: أنا هو يارسول الله؟ قال: لا، قال عمر: أنا هو يارسول الله؟ قال: لا، ولكن ذلك الذي يخصف النعل، وقد كان أعطى علياً نعله يخصفها.

"اے جماعتِ قریش! اللہ کی قسم عنقریب میں تم پر ایک ایسے شخص کو بھیجوں گا جس کے دل کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کے لیے آزما لیا ہے۔ پس وہ دین کے بارے میں تمہارے ساتھ جہاد کرے گا یا تمہارے بعضوں کو مارے گا۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا وہ میں ہوں؟ آپ نے فرمایا: نہیں! حضرت عمرؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا وہ میں ہوں؟ فرمایا: نہیں! لیکن وہ، وہ شخص ہے جو جوتی کی مرمت کر رہا ہے اور آپ نے سیدنا علیؓ کو اپنی نعل

مبارک دی تھی جس کی وہ مسرت کر رہے تھے"۔

(السنن الكبرىٰ للنسائي ج٧ص ٤٢٠، حديث٨٣٦٢، وط: ج٥ص ١١٥، حديث٨٤١٦؛ فضائل الصحابة ج٢ص٨٠٦، حديث١١٠٥؛ سنن الترمذي، حديث٣٧٢٤؛ خصائص علي ص٥٥، حديث٣١؛ شرح معاني الآثار ج٤ص٣٥٩، حديث٧٣١٨؛ نخب الأفكار للعيني ج١٦ ص ٤٩٦، ٤٩٧؛ المصنف لابن أبي شيبة ج ٦ص ٣٧٠، حديث ٣٢٠٧٢، وط: ج١٧ ص ١٠٤، حديث٣٢٧٤٤؛ المستدرك للحاكم ج٢ص ١٣٧، وط: ج٢ص ٤٧٧، حديث٢٦٦١؛ تاريخ دمشق ج٤٢ص ٣٤٢، ٣٤٣؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٧ص ٣٨٩؛ إتحاف الخيرة المهرة ج٧ص ١٨٥، حديث٦٦٣٤؛ المناقب للخوارزمي ص١٢٨؛ الرياض النضرة ج٤ص ١٣٥؛ جمع الجوامع ج١٣ص ٥١، حديث٥٦٢١ وص ٧٣، حديث٥٧٦١، ٥٧٦٣ وص ٤١٩، حديث٧٩٩٦؛ نزل الأبرار للبدخشاني ص ٤١)

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے، امام حاکم اور علامہ ابو اسحاق الحوینی الاثری نے کہا: "إسناده جيد" اس کی سند عمدہ ہے۔

(كتاب الحلي بتخريج خصائص علي ص٤٩)

ایمانِ مرتضوی کے کمال کا سبب کیا؟

زیر بحث (غزوۂ خیبر کی) حدیث سے سیدنا علی کا تمام صحابہ کرام سے زیادہ قوی ہونا، زیادہ محب محبوب ہونا، سب سے بہتر و افضل ہونا اور ایمان میں باکمال ہونا جو ثابت ہو رہا ہے، آخر اس کا سبب کیا ہے؟ میری دانست کے مطابق ان تمام فضائل کا سبب سیدنا علی کی ایمان میں تقدیم ہے۔ کیونکہ کسی شخص کا ایمان اتنا قوی ہوتا ہے جتنا یقین قوی ہو، اور یقین اتنا قوی ہوتا ہے جتنا انسان احکامِ شرعیہ پر عمل پیرا ہو۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے ﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ﴾ (اپنے رب کی عبادت کر یہاں تک کہ تجھے یقین آجائے) [الحجر: ٩٩] پس اگر کوئی شخص دوسرے شخص کی بہ نسبت احکامِ شرعیہ پر زیادہ عمل پیرا ہو تو اس کی یقینی قوت بھی دوسرے کی بہ نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ پھر اگر دو شخص عملاً، استقامۃً اور اخلاصاً برابر ہوں مگر اُن میں سے ایک کا عملی دورانیہ دوسرے سے زائد ہو تو اس کے یقین کی قوت دوسرے کی بہ نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ یقین کی اِس قوت کو

قرآن کریم میں کہیں روح سے اور کہیں حیات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ایک مقام پرارشاد فرمایا گیا:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ.

"اے ایمان والو حاضر ہو جاؤ اللہ اور رسول کے بلانے پر جب رسول تمہیں اس چیز کے لیے بلائیں جو تمہیں زندگی بخشے گی"۔

(الأنفال:٢٤)

علامہ ابن قیم اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:

"یہ آیت کئی فوائد پر مشتمل ہے۔اوّل یہ کہ حیاتِ نافعہ فقط اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی دعوت کو قبول کرنے میں ہے۔جس شخص نے یہ دعوت قبول نہیں کی اس کو حیاتِ نافعہ حاصل نہیں ہے، اگرچہ اُسے وہ حیات حاصل ہے جس میں ناکارہ ترین جانور بھی اُس کے برابر ہیں۔پس حقیقی اور پاکیزہ زندگی اس شخص کی زندگی ہے جس نے دل وجان سے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی دعوت کو قبول کیا۔سو وہی لوگ ہی زندہ ہیں اگرچہ وفات پا گئے ہوں اور ان کے ماسوا لوگ مردہ ہیں اگرچہ ان کے بدن زندہ ہوں۔لہٰذا سب سے بڑھ کر کامل حیات اُس شخص کی ہے جس نے حضور ﷺ کی دعوت کو کامل طور پر قبول کیا، اور ہر وہ بات جس کی حضور اکرم ﷺ نے دعوت دی، اُس میں حیات ہے۔پس جس شخص نے اُس کا کچھ حصہ ضائع کر دیا اس کی حیات میں اتنی کمی رہ گئی۔الغرض ہر شخص کو اتنی زندگی ملتی ہے جتنی وہ حضور ﷺ کی دعوت کو قبول کرتا ہے"۔

(الفوائد لابن القیم ص ١٢١، وط: ص ١٢٦، ١٢٧)

کمالاتِ مرتضوی کا سبب اسلامی سبقت

قرآن کریم کی تصریح اور علامہ ابن قیم کی تشریح سے جب یہ اصول معلوم ہو گیا تو اس امر پر احادیث بھی ہیں اور محققین کا بھی اسی پر اتفاق ہے کہ پہلا مُذَکّر انسان جو حضور ﷺ پر ایمان لایا اور آپ کے ساتھ نماز پڑھی وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ ہی ہیں۔افسوس کہ بعض لوگ اس تقدمِ ایمان واسلام کے تذکرہ سے ہی چڑتے ہیں، چنانچہ پیر شیخ الحدیث والتفسیر لکھتے ہیں:

''یہ لوگ صدیق اکبراور مولیٰ علی رضی اللہ عنہما میں قِدَمِ اسلام کا موازنہ لیکر بیٹھ گئے مگر علماء کا یہ لکھنا کہ صدیق اکبر تو سرکار کے اعلان نبوت سے پہلے شام کے تجارتی سفر کے دوران ہی ایمان لے آئے تھے''۔

(ضربِ حیدری ص176)

خط کشیدہ الفاظ میں غور فرمائیں! ہمارے معاصر کس قدر خفا نظر آتے ہیں؟ اُنہیں یہ نہیں معلوم کہ کئی مرتبہ خود نبی کریم ﷺ سیدنا علی کرم اللہ وجھہ کے قِدَمِ اسلام کو لے کر بیٹھ گئے اور سیدتنا فاطمۃ الزھراء علیہا السلام کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا:

أما ترضين أني زوجتک أقدم أمتي سلماً وأكثرهم علماً وأعظمهم حلماً!

''کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ میں نے تمہارا نکاح ایسے شخص سے کیا ہے جو اسلام کے لحاظ سے میری اُمت میں مقدم، علم کے لحاظ سے سب سے زیادہ اور بُردباری کے لحاظ سے سب سے اعظم ہے؟''۔

(مسند أحمد ج٥ ص٢٦ وج٦ ص٧٩٤، حديث ٢٠٥٧٣، وط: ج٣٣ ص٤٢٢، حديث ٢٠٣٠٧؛ المعجم الكبير ج٢٠ ص٢٢٩؛ المصنف لابن أبي شيبة ج٦ ص٣٧٦، حديث ٣٢١٢٢، وط: ج١٧ ص١٣٦، حديث ٣٢٧٩٤، وط: ج١١ ص١٥٤، حديث ٣٢٦٦٧؛ الأحاد والمثاني ج١ ص١٤٢، حديث ١٦٩؛ المعجم الكبير للطبراني ج١ ص٥١، حديث ١٥٦، وط: ج١ ص٥٧، حديث ١٥٤، عن أبي إسحاق، سير أعلام النبلاء للذهبي ج٢ ص٦٢؛ تاريخ دمشق ج٤٢ ص١٢٦؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٧ ص٣٣٧، ٣٤١؛ مسند فاطمة الزهراء ص٥٠، ٥١؛ نساء أهل البيت ص٥٤٥؛ نزل الأبرار للبدخشاني ص٤١؛ موسوعة العشرة ج١١ ص٧٨؛ در السحابة للشوكاني ص٢٠٥)

حافظ ہیثمی فرماتے ہیں:

''اس حدیث کو امام احمد اور امام طبرانی نے روایت کیا ہے، اور اس کی سند میں ایک شخص خالد بن طہمان ہے، امام ابوحاتم اور دوسرے علماء نے اس کی توثیق فرمائی ہے اور باقی تمام راوی ثقہ ہیں''۔

(مجمع الزوائد ج٩ ص١٠١ وط: ج٩ ص١٢٣، حديث ١٤٥٩٥، وط: ج٩ ص٨٥، حديث

۱۴۵۹۵، وط: ج۱۸ ص ۲۰۰، حدیث ۱۴۵۹۷)

معلوم ہوا کہ سیدنا علی علیہ السلام کو تمام مذکر انسانوں سے قبل ایمان و نماز کی سعادت نصیب ہوئی، کاشانہ نبوی ﷺ میں اظہار نبوت کو ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہیں گذرے تھے کہ سیدنا علی علیہ السلام کو اظہار اسلام کی سعادت حاصل ہو چکی تھی۔ لہٰذا اُنہیں دوسروں کی بہ نسبت جتنا عرصہ قبل نماز و دیگر عبادات بجالانے کا موقعہ میسر آیا سورۃ الانفال کی مذکورہ بالا آیت کے مطابق اتنا ہی ان کی ایمانی اور روحانی قوت وحیات زیادہ تھی۔

چونکہ کچھ لوگوں کو سیدنا علی علیہ السلام کے تقدمِ اسلامی کا تذکرہ مرغوب نہیں ہے اس لیے وہ ایچ پیچ سے کام لیتے ہوئے اس تقدم کی اہمیت کو گھٹانے کی ناکام کوشش میں رہتے ہیں۔ ہمارے معاصر بھی اسی چکر بازی میں مبتلا ہیں۔ چنانچہ وہ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

''علی اسلام کے ابتدائی دنوں میں ننھے سے بچے تھے''۔

(ضربِ حیدری ص 111)

امام رازی نے جس سیاق میں یہ بات ذکر کی ہے ہمارے معاصر نے ایک آدھ لفظ اُس سے حذف کر کے اس بات کو معنوی وسعت دینے کی ناکام کوشش کی ہے، امام رازی کی مکمل عبارت ''بچپن کے اسلام کا حکم'' کی بحث پر مذاہب اربعہ کی نقول کے آخر میں آرہی ہے۔

معاصر موصوف نے مولائے کائنات علیہ السلام کو ننھا سا بچہ ثابت کرنے کی کوشش تو کر ڈالی لیکن انہوں نے اتنا سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں فرمائی کہ کائنات کے سب سے بڑے مدبّر، سب سے بڑے معلّم اور سب سے بڑے مرشد ﷺ نے اُنہیں اُن کی کم سنی میں دعوت ہی کیوں دی تھی؟ جب جوہرِ قابل ہی نہ ہو تو کیا کوئی عام دانشمند کسی کو اپنے مشن کی دعوت دیتا ہے؟ معلوم ہوا کہ دانائے سبل، معلّم کائنات ﷺ کے نزدیک مولائے کائنات علیہ السلام کی ذہنی زمین دین وایمان کی تخم ریزی کے قابل تھی تو آپ نے انہیں دعوت دی تھی۔ پھر اس زرخیز زمین میں دین وایمان کے شجر مبارک کی جڑیں مضبوط ہوئیں اور اس کی شاخیں پھلوں سے لد گئیں، تب ہی تو امام الانبیاء ﷺ نے اپنی لختِ جگر کو فرمایا تھا ''زَوَّجْتُکِ أَقْدَمَ أُمَّتِيْ سِلْماً وأکثرهم علماً وأعظمهم حلماً'' (بیٹی! میں نے تمہارا نکاح اسلام کے لحاظ سے اپنی امت کے مقدم ترین، علم کے لحاظ سے اُن سب سے وافر ترین اور بُردباری کے لحاظ سے عظیم ترین شخص کے ساتھ کیا ہے)۔

﴿ عقل والو! غور کرو! روافض اور سفہاء شیعہ کی ضد میں انسان کتنا آگے نکل جاتا ہے کہ اس ضد میں وہ

دانائے سبل اور معلّمِ کُل کی عقل مبارک پر بھی حملہ کر بیٹھتا ہے اور اسے شعور تک نہیں ہوتا۔ حالانکہ مفسرین کرام کے مطابق ایسا اقدام آوازِ نبوی ﷺ پر آواز بلند کرنے کے مترادف ہے۔ فَاعْتَبِرُوا یَا أُولِی الْأَبْصَارِ !

بچپن کے اسلام کے حکم پر مذاہب اربعہ

ہمارے معاصر نے سیدنا علی ؓ کے بارے میں "ننھے سے بچے تھے" کے الفاظ سے جو تأثر قائم کرنے کی کوشش کی ہے، روافض یا نام نہاد شیعہ کی ضد میں ایسے تأثرات دوسرے لوگوں کی زبان و قلم سے بھی صادر ہوتے رہتے ہیں، اور چونکہ اِس مبہم سازش سے سیدنا علی ؓ کی اسلامی سبقت کو دھندلانے کی ناکام کوشش کی جاتی ہے، اس لیے ہم اس مسئلہ پر کچھ علماء کرام کی عبارات نقل کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

فقہاءِ اسلام نے کتبِ فقہ میں بچے کے اسلام کے متعلق کافی بحث فرمائی ہے۔ اکثر فقہاء کرام نے یہ بحث "کتاب المرتدین" (مرتدین کے باب) میں چلائی ہے۔ اکثر فقہاء کا موقف ہے کہ اگر معاذ اللہ بچہ مرتد ہو جائے تو اُس کے ارتداد کو قبول نہیں کیا جائے گا تا آنکہ وہ بالغ ہو جائے۔ فقہائے احناف کا موقف ہے کہ اُس کے ارتداد کو تو تسلیم کیا جائے گا مگر سزا کو اُس کے بالغ ہونے تک مؤخر رکھا جائے گا، لیکن بچے کے اسلام کے بارے میں جمہور فقہاء کرام کا اتفاق ہے۔ یہاں ہم چاروں مذاہب کی کتب سے چند عبارات پیش کر رہے ہیں، ان عبارات سے جہاں فقہاء کا اپنا اپنا موقف واضح ہوگا، سیدنا علی ؓ کی سبقت اسلامی کی عظمت ظاہر ہوگی، وہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ ہمارے معاصر صاحب حنفی ہو کر سیدنا علی المرتضیٰ ؓ کی سبقتِ اسلامی کو دھندلانے کی کوشش میں کہاں کھڑے ہیں۔

اس سے قبل کہ فقہاء کرام کی عبارات پیش کی جائیں یہ جان لینا ضروری ہے کہ بچے کے (معاذ اللہ) مرتد ہونے کا قول تب صحیح مانا جا سکتا ہے جب اُس سے قبل اُس کا اسلام صحیح ہو۔

بچے کے اسلام کا حکم اور فقہاءِ شافعیہ

فقہاء شافعیہ ؒ بچے کے ارتداد اور اسلام دونوں کو قبول نہیں کرتے مگر ارتداد کا واضح انکار کرتے ہیں اور اسلام کا واضح انکار نہیں فرماتے، جبکہ بعض شافعی علماء اپنے فقہاء سے اختلاف کرتے ہوئے بچے کے اسلام کی صحت کو صراحتاً تسلیم کرتے ہیں۔ اس اختلاف کے پیشِ نظر سب سے پہلے ہم شافعیہ کا موقف پیش کر رہے ہیں۔

امام ابو اسحاق ابراہیم بن علی شیرازی شافعی متوفّٰی ۴۷۶ھ، امام ابو الحسین یحییٰ عمرانی یمنی شافعی متوفّٰی

۵۵۸ھ اور امام نووی متوفّی ۶۷۶ھ ارتداد کی اقسام پر گفتگو کے بعد لکھتے ہیں:

إذا ثبت هذا: فإن الردة إنما تصح من كل بالغ، عاقل، مختار، فالصبي والمجنون فلا تصح ردتهما. وقال أبو حنيفة: تصح ردة الصبي، ولكن لا تقبل حتى يبلغ.

"جب یہ بات ثابت ہوگئی تو ارتداد فقط ہر بالغ، عاقل اور خود مختار شخص کا صحیح ہوگا، بچے اور مجنون کا ارتداد صحیح نہیں ہوگا، اور امام ابوحنیفہ ؓ نے کہا ہے: بچے کا مرتد ہونا تو صحیح ہے لیکن اُس کے بالغ ہونے تک اُسے قبول نہیں (قتل نہیں) کیا جائے گا"۔

(المجموع شرح المهذب ج۲۰ ص۱۱۲، ۱۱۳؛ البيان في مذهب الإمام الشافعي ج۱۲ ص۳۹)

امام اعظم ابوحنیفہ ؓ کے قول کے بغیر امام ماوردی، امام غزالی، امام نووی اور امام ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہم نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔

(الحاوي الكبير للماوردي ج۱۳ ص۱۵۷؛ الوسيط للغزالي ج۶ ص۴۲۵؛ روضة الطالبين للنووي ج۱۰ ص۷۱؛ فتح الجواد بشرح الإرشاد لابن حجر مكي ج۳ ص۳۵۲)

نوٹ

یوں محسوس ہوتا ہے کہ اِس عبارت میں مذہب احناف کو نقل کرنے میں ان شافعی حضرات ؒ سے بوجہ سبقتِ قلم "لَا یُقْتَلُ" (نہیں قتل کیا جائے گا) کی بجائے "لَا تُقْبَلُ" (نہیں قبول کیا جائے گا) لکھا گیا ہے، کیونکہ احناف کے نزدیک بچے کا ارتداد تو قبول ہے مگر قبل از بلوغ اُسے قتل کرنا ممنوع ہے۔

یہ مسئلہ شوافع کی دوسری کتب سے

شافعیہ ؒ کی فقہ کی وہ مخصوص کتب جنہیں باقاعدہ فقہی ابواب پر مرتب کیا گیا ہے، اُن میں تو یہ مسئلہ اسی طرح مذکور ہے جیسا کہ اوپر نقل کیا گیا لیکن شافعی علماء کتب حدیث کی شروح اور فتاوی کی کتب میں اس مسئلہ میں جمہور کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں۔ اس کی تفصیل وتشریح بخاری شریف کے اس باب میں موجود ہے:

باب إذا أسلم الصبيّ فمات هل يُصلّي عليه؟ وهل يعرض على الصبيّ الإسلام؟

اس باب کے تحت ابن صیاد کا ذکر کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ "قد قارب ابن صياد الحلم"

(ابن صیاد بلوغ کے قریب تھا) نبی کریم ﷺ نے ابن صیاد پر ہاتھ مارتے ہوئے فرمایا: "تشهد أني رسول الله" تو گواہی دیتا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں"؟ علماءِ حدیث نے اس طویل حدیث کے اسی جملہ سے استدلال کیا ہے کہ بچے کو اسلام کی دعوت دینا درست ہے۔

بخاری کے اسی باب میں جس دوسری حدیث سے دلیل لی گئی، وہ یہ ہے:

عن أنسٍ ؓ قال: كان غلامٌ يهوديٌّ يخدمُ النبيَّ ﷺ فمرض فأتاه النبيُّ ﷺ يعودهُ، فقعد عند رأسِهِ فَقَالَ لَهُ: أَسْلِمْ، فنظر إلى أبيه وهُوَ عِنْدَهُ فقالَ لَهُ: أطع أبا القاسم ﷺ، فأسلم فخرجَ النبيُّ ﷺ وهُو يقولُ: الحمدُ لله الذي أنقذهُ مِن النار.

"حضرت انس ؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک یہودی لڑکا نبی کریم ﷺ کی خدمت کرتا تھا، وہ بیمار ہوگیا تو نبی کریم ﷺ اُس کی عیادت کو تشریف لے گئے، آپ اُس کے سر کے قریب تشریف فرما ہوئے اور اُسے ارشاد فرمایا: اسلام قبول کرلو، اُس کا باپ قریب موجود تھا تو اُس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا، اُس کے باپ نے اُسے کہا: ابوالقاسم ﷺ کی اطاعت کرو۔ اس پر وہ بچہ مسلمان ہوگیا تو نبی کریم ﷺ یہ فرماتے ہوئے باہر تشریف لائے: اُس اللہ کے لیے تمام تر حمد ہے جس نے اس کو جہنم سے بچالیا"۔

(صحیح البخاري ص ۲۱۷، حدیث ۱۳۵۶)

ان میں سے اول الذکر حدیث کے تحت ابن الملقن شافعی متوفی ۸۰۴ھ لکھتے ہیں:

فيه عرض الإسلام على الصغير، واستدل به قوم على صحة إسلام الصبي.

"اس حدیث میں چھوٹے بچے پر اسلام پیش کرنے کی دلیل ہے، اور ایک قوم نے اس سے بچے کے اسلام کی صحت پر استدلال کیا ہے"۔

(التوضیح لشرح الجامع الصحیح ج ۱۰ ص ۸۷)

اس سے قبل علامہ ابن الملقن شافعی یہ بھی لکھ چکے ہیں:

قال ابن القاسم :إذا أسلم الصغير وقد عقل الإسلام فله حكم المسلمين فی الصلاة عليه.

''ابن القاسم نے کہا ہے: جب بچہ اسلام لائے اور وہ اسلام کو سمجھتا ہو تو اُس کے لیے نماز جنازہ کا حکم دوسرے مسلمانوں کی طرح ہے''۔

(التوضيح لشرح الجامع الصحيح ج ١٠ ص ٨٢)

حافظ ابن حجر عسقلانی شافعی متوفی ۸۵۲ھ اول الذکر حدیث کے تحت لکھتے ہیں:

ومقصود البخاري منه الاستدلال هنا بقوله ﷺ لابن صياد "أتشهد أني رسول الله؟" وكان إذا ذاک دون البلوغ.

''اور امام بخاری کا اس حدیث میں اس ارشادِ نبوی ﷺ ''کیا تو گواہی دیتا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں'' سے یہ استدلال مقصود ہے کہ بچے کو اسلام کی دعوت دینا صحیح ہے، کیونکہ ابن صیاد اس وقت نابالغ تھا''۔

(فتح الباري ج٣ ص ٥٨٤ وط: ج٤ ص ١٣٧)

حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث نمبر ۳۰۵۵ کے تحت بھی اسی طرح لکھا ہے۔

(فتح الباري ج٧ ص ٣٠٦)

امام قسطلانی شافعی متوفی ۹۲۳ھ نے بھی اس مفہوم کو برقرار رکھا ہے۔

(إرشاد الساري ج٣ ص ٤٤٥)

حافظ عسقلانی رحمہ اللہ دوسری حدیث سے مستنبط فوائد کے بیان میں لکھتے ہیں:

وعرض الإسلام على الصبي ولولا صحته منه ما عرضه. وفي قوله "أنقذه بي من النار" دلالة علىٰ أنه صح إسلامه.

''اور اس حدیث سے یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ بچے کو اسلام کی دعوت دینا صحیح ہے، اگر صحیح نہ ہوتی تو نبی کریم ﷺ اُس (یہودی بچے) کو دعوت نہ دیتے، اور ارشادِ نبوی ﷺ ''اللہ نے اُسے میری وجہ سے آگ سے بچا لیا'' میں دلیل ہے کہ اُس کا اسلام صحیح تھا''۔

(فتح الباري ج٣ ص ٥٨٦، وط: ج٤ ص ١٣٩)

امام قسطلانی شافعی متوفی ۹۲۳ھ اور شیخ زکریا انصاری شافعی متوفی ۹۲۶ھ رحمۃ اللہ علیہما نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔

(إرشاد الساري ج٣ص٤٤٩؛منحة الباري ج٣ص٤٣٢)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ شافعی فقہاء کرام ﷭ نے اپنی کتب فقہ میں تو سابقین کی طرح لکھتے چلے گئے مگر حادیث کی تشریح میں وہ جمہور اہل اسلام کے ساتھ نظر آ رہے ہیں، اور یہی حق پرستی ہے۔ متاخرین فقہاء شافعیہ میں سے تو بعض نے اس مسئلہ میں بہت واضح لکھ دیا ہے۔ چنانچہ امام ابن حجر مکی شافعی رحمۃ اللہ علیہ سیدنا علی ﷛ کے اسم اقدس کے ساتھ "كَرَّمَ اللّٰهُ وَجْهَهٗ" کی حکمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس کی حکمت یہ ہے کہ سیدنا علی ﷛ کبھی بھی بتوں کے سامنے سجدہ ریز نہیں ہوئے، لہٰذا اُن کی شان کے مناسب ہوا کہ اُن کے چہرۂ انور کی تعظیم میں یہ الفاظ کہے جائیں اور ان الفاظ سے حقیقۃً یا کنایۃً اُن کی ذات اقدس مراد ہے کہ انہوں نے کبھی غیر اللہ کی طرف توجہ نہیں فرمائی، اور اس فضیلت میں اُن کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق ﷛ بھی شریک ہیں۔

لیکن سیدنا علی ﷛ کی شان میں ان الفاظ کا اکثر استعمال اس لیے ہوتا ہے کہ بتوں کے سامنے اُن کے سجدہ ریز نہ ہونے پر اجماع ہے، اس لیے کہ وہ اس وقت اسلام لائے جب وہ سمجھ دار بچے تھے، اور اُن کا اُس وقت کا اسلام "ہمارے مذہب شافعی کے برعکس" صحیح تھا، کیونکہ اُن کے اسلام کے وقت احکام کا دارومدار عقل وتمیز پر تھا پھر بعد میں یہ حکم منسوخ ہوگیا اور بلوغت پر موقوف ہوگیا، جیسا کہ امام بیہقی اور دوسرے علماء کرام نے بیان کیا ہے"۔

دوسرے پیراگراف کی عربی ملاحظہ فرمائیں:

وإنما كان استعمال ذلک في حق علي أكثر لأن عدم سجوده أمر مجمع عليه، لأنه أسلم وهو صبي مميز، وصح إسلامه حينئذ على خلاف مذهبنا، لأن الأحكام وقت إسلامه كانت منوطة بالتمييز، ثم بعد ذلک نسخ ذلک الأمر وأنيطت بالبلوغ كمابينه البيهقي وغيره.

(الفتاوى الحديثية لابن حجر مكي ص٨٠)

فی الجملہ فقہاء شافعیہ ﷭ بچے کے اسلام اور ارتداد کے بارے میں تو اختلاف رکھتے ہیں لیکن اُن میں سے

کسی بھی معتمد شافعی کو سیدنا علی ﷺ کے اسلام کی صحت پر کلام نہیں ہے، جیسا کہ امام عراقی، حافظ ابن حجر عسقلانی شافعی، ابن کثیر شافعی، امام سیوطی شافعی اور امام قسطلانی شافعی نے سیدنا علی ﷺ کے اول مسلمان ہونے کی تصریح کی ہے، اور ہم ان سب کی تصریحات "شرح خصائص علي ﷺ" اور کتاب ھذا میں بھی نقل کر چکے ہیں۔

بچے کے اسلام کا حکم اور فقہاء مالکیہ

راقم السطور کے پاس فقہاء مالکیہ کی زیادہ کتابیں نہیں ہیں تاہم جو دستیاب ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بچے کے اسلام اور معاذ اللہ اُس کے ارتداد کی صحت کے قائل ہیں مگر مرتد ہو جانے کی صورت میں اُس کو قتل کرنے کے قائل نہیں تا آنکہ وہ بالغ ہو جائے۔ چنانچہ شیخ محمد امیر المالکی متوفی ۱۲۳۲ھ شرح مختصر الخلیل میں لکھتے ہیں:

الردة كفر المسلم، وإن صبياً ولا يقتل قبل بلوغه.

"معاذ اللہ مسلمان کا کافر ہو جانا ارتداد ہے، اگر چہ بچہ ہو، اور وہ قبل از بلوغ قتل نہیں کیا جائے گا"۔

(الاكليل شرح مختصر الخليل ص۴۳۸)

ابن بطال مالکی متوفی ۴۴۹ھ لکھتے ہیں:

لأن مالكاً يقول: لو أسلم وقد عقل الإسلام، ثم بلغ فرجع عنه أجبر عليه.

"امام مالک ﷺ فرماتے تھے: اگر وہ اسلام لائے پھر بالغ ہونے کے بعد اس سے پھر جائے تو اُسے اسلام پر مجبور کیا جائے گا"۔

(شرح البخاري لابن بطال ج۳ ص۳۴۱)

مجبور کیوں کیا جائے گا؟ اس لیے کہ پہلے اُس کا اسلام صحیح تھا اور وہ اُسے سمجھتا تھا۔

نیز ابن بطال مالکی لکھتے ہیں:

قال ابن القاسم: إذا أسلم الصغير وقد عقل الإسلام فله حكم المسلمين في الصلاة عليه.

"ابن القاسم نے کہا ہے: جب بچہ اسلام لائے اور وہ اسلام کو سمجھتا ہو تو اُس کے لیے نماز جنازہ کا حکم دوسرے مسلمانوں کی طرح ہے"۔

(شرح صحيح البخاري لابن بطال ج۳ ص۳۴۰)

امام ابوسلیمان حمد بن محمد الخطابی المالکی متوفی ۳۸۸ھ نے ابن صیاد کی حدیث کے تحت لکھا ہے:

وقد استدل بعض أهل العلم بهذا الحديث على أن إسلام غير البالغ قد يصح، ولولا ذلک لم يكشفه رسول الله ﷺ عن الإيمان، وهو إذ ذاک غير بالغ.

بعض اہل علم نے اس حدیث سے نابالغ بچے کے اسلام کی صحت پر استدلال کیا ہے، اور اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر رسول اللہ ﷺ اُس کے ایمان کے معاملہ کو نہ کھولتے، حالانکہ وہ اُس وقت نابالغ تھا"۔

(أعلام الحديث شرح صحيح البخاري للخطابي ص ۷۰۹)

بچے کے اسلام کا حکم اور فقہاءِ حنابلہ

حنبلی فقہاء اس مسئلہ میں فقہاء احناف کے موافق ہیں اور انہوں نے اس پر تفصیلی کلام کیا ہے۔ چنانچہ امام موفق الدین ابومحمد عبداللہ بن احمد بن محمد بن قدامہ مقدسی دمشقی صالحی حنبلی متوفی ۶۲۰ھ لکھتے ہیں:

وأما الصبي المميز، فيصح إسلامه وردته، لأن علياً ﷛ أسلم وهو ابن سبع، فصح إسلامه، وثبت إيمانه، وعُدّ بذلک سابقاً.

"اور "الصبي المميز" (سمجھدار بچے) کا اسلام اور اُس کا ارتداد صحیح ہے، اس لیے کہ سیدنا علی ﷛ اسلام لائے تو وہ سات سال کے بچے تھے، پس اُن کا اسلام صحیح اور ایمان ثابت ہے، اور اسی وجہ سے وہ سابق شمار ہوئے"۔

(الکافی ج ۵ ص ۳۱۷)

امام شرف الدین موسیٰ بن احمد بن موسیٰ بن سالم ابوالنجا مقدسی حنبلی متوفی ۹۶۸ھ نے بھی "الصبي المميز" (سمجھدار بچے) کے بارے میں اسی طرح لکھا ہے۔

(الإقناع لطالب الانتفاع ج ٤ ص ۲۹۲)

امام شمس الدین محمد بن مفلح مقدسی حنبلی متوفی ۷۶۳ھ نے اسی کو واضح مذہب قرار دیا ہے۔

(کتاب الفروع ج ۱۰ ص ۱۹۲)

اول الذکر یعنی امام موفق الدین مقدسی متوفّی ۶۲۰ ھ نے اپنی دوسری تصانیف میں اس مسئلہ پر مفصل کلام کیا ہے، چنانچہ وہ اور امام شمس الدین عبدالرحمان بن محمد بن احمد بن قدامہ متوفّی ۶۸۲ ھ لکھتے ہیں:

''بچہ جب دس برس کا ہو جائے اور اسلام کو سمجھنے لگے پھر اسلام لے آئے تو وہ مسلمان ہے۔ فی الجملہ بچے کا اسلام صحیح ہے، یہی امام ابوحنیفہ، صاحبین (امام محمد اور امام ابو یوسف) امام اسحاق، امام ابن ابی شیبہ اور امام ابوایوب کا مذھب ہے۔ امام شافعی اور امام زفر فرماتے ہیں کہ اُس کا اسلام صحیح نہیں، یہاں تک کہ بالغ ہو جائے، اس لیے کہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے: تین افراد مرفوع القلم ہیں: اُن میں ایک بچہ ہے جو بالغ ہونے تک مرفوع القلم ہے۔ یہ حسن حدیث ہے۔ اور اس لیے بھی اس کا اسلام صحیح نہیں کہ اس پر احکام مترتب ہوتے ہیں اور بچے پر کوئی حکم صحیح نہیں جیسا کہ ہبہ وغیرہ۔

اور ہماری دلیل ارشاداتِ نبویہ ﷺ کا عموم ہے، فرمایا: جس نے بھی کہا ''لَا إِلٰـــهَ إِلَّا اللّٰهُ'' وہ جنت میں داخل ہوا، اور فرمایا: مجھے حکم ہوا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ گواہی دیں ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ'' پس جب وہ یہ کلمہ کہہ دیں تو انہوں نے مجھ سے اپنی جان و مال کو محفوظ کر لیا، ماسوا ضروری حقوق کے، اور اُن کا حساب اللہ کے سپرد ہے، اور فرمایا: ہر پیدا شدہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اُس کے ماں باپ اُسے یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں، حتیٰ کہ جب اُس کی گفتگو سمجھ آنے لگتی ہے تو وہ شکر گزار یا ناشکرا واضح ہو جاتا ہے۔ اِن تمام احادیث کے عموم میں بچہ بھی داخل ہے، اور چونکہ اسلام محض عبادت ہے اس لیے عقل مند بچے کی عبادت نماز و حج وغیرہ صحیح ہے، اور اس لیے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دارالسلام (سلامتی کے گھر) کی دعوت دی ہے اور اُس کی راہ اسلام کو بنایا ہے، اور جو اس راہ پر نہ چلے اس کے لیے جہنم اور دردناک عذاب تیار کیا ہے، لہٰذا یہ جائز نہیں کہ بچے کو اُس کی دعوت کو قبول کرنے اور اُس کی راہ پر چلنے سے محروم سمجھا جائے اور اُسے عذابِ الٰہی اور جہنم کا مستحق سمجھ کر اُس پر نجات کا راستہ بند سمجھا جائے، جبکہ وہ عذاب سے بھاگتا ہے۔ یہ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے اس پر اجماع ہے،

بیشک سیدنا علی رضی اللہ عنہ بچپن میں اسلام لائے اور فرمایا:

سبقتکم إلی الإسلام طُرًّا ... صبیًّا ما بلغتُ أوان حلمي

میں نے اسلام میں تم سب پر سبقت کی تھی، اُس وقت میں بچہ تھا بلوغت کو نہیں پہنچا تھا۔

اسی لیے کہا گیا ہے: مردوں میں اول مسلمان حضرت ابوبکر، بچوں میں سیدنا علی، خواتین میں سیدتنا خدیجۃ الکبریٰ اور غلاموں میں حضرت بلال ﷺ ہیں، اور حضرت عروہ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا علی اور حضرت زبیر ﷺ آٹھ سال کی عمر میں اسلام لائے، اور نبی کریم ﷺ نے حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما کو سات یا آٹھ سال کی عمر میں بیعت فرمایا تھا، اور نبی کریم ﷺ نے اسلام کی بیعت لیتے ہوئے کسی کم عمر یا زیادہ عمر والے کو مسترد نہیں فرمایا، اور ارشادِ نبوی ﷺ "رفع القلم عن ثلاثة" (تین شخص مرفوع القلم ہیں) میں اختلاف کرنے والوں کے لیے کوئی دلیل نہیں، کیونکہ ان الفاظ کا معنیٰ یہ ہے کہ ان تین شخصوں کے بارے میں کوئی ضرر آمیز بات نہیں لکھی جاتی، اور اسلام سے اُنہیں ضرر نہیں بلکہ اس میں دنیا اور آخرت کا فائدہ ہے اس لیے یہ اُن کے حق میں لکھا جاتا ہے، جیسا کہ بچے کی نماز درست ہوتی ہے اور وہ اُس کے نامۂ عمل میں لکھی جاتی ہے۔

اسی تسلسل میں چند سطور آگے چل کر لکھتے ہیں:

اکثر محققین نے بچے کے اسلام لانے کی سالوں کے لحاظ سے کوئی حد مقرر نہیں فرمائی، امام ابن المنذر نے امام احمد بن حنبل ﷺ سے نقل کیا ہے کہ اس مسئلہ میں جب بھی مقصد حاصل ہو جائے تو اُس پر عمر کے اضافہ کی کوئی حاجت نہیں، اور امام احمد ﷺ سے یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ بچہ جب سات برس کا ہو جائے تو اس کا اسلام لانا اسلام ہی ہے، اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بچے جب ساتویں سال میں پہنچ جائیں تو انہیں نماز کا حکم کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ عمر اُنہیں حکم کرنے کی ہے اور یہی اُن کی عبادت کی صحت کی عمر ہے، لہٰذا اُن کے اسلام کی صحت کی عمر بھی یہی ہے۔

اور امام ابن ابی شیبہ نے فرمایا ہے کہ جب سیدنا علی ﷺ اسلام لائے تو وہ پانچ سال کے تھے، امام ابن ابی شیبہ نے اُن کے اسلام کو اسلام مانا ہے، شاید انہوں نے حضرت علی علیہ السلام کے اسلام لانے کی عمر پانچ برس اس لیے لکھی ہے کہ کہا جاتا ہے کہ جب سیدنا علی ﷺ کا وصال ہوا تو وہ اٹھاون برس کے تھے، اس بنا پر اسلام لاتے وقت اُن کی عمر پانچ برس بنتی ہے، کیونکہ بعد از

اعلانِ نبوت نبی کریم ﷺ نے ۲۳ برس گزارے ہیں اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ وصالِ نبوی ﷺ کے بعد تیس برس تک حیات رہے اور یہ ۵۳ سال بنتے ہیں، پھر جب اِن میں اُن کی عمر کے ابتدائی پانچ سال جمع کیے جائیں تو ۵۸ سال بنتے ہیں۔

اور ابوایوب (ابوبکر بن ابی تمیمہ السختیانی تابعی متوفی ۱۳۱ھ) نے تو تین سال کی عمر میں بھی اسلام کی صحت تسلیم کی ہے اور کہا ہے کہ چھوٹا یا بڑا جس نے بھی حق کو پالیا جائز ہے، حالانکہ عموماً اس عمر میں بچہ اسلام کو سمجھتا ہے اور نہ ہی کہا ہوا سمجھتا ہے، اور نہ اس کی بات سے کوئی حکم ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر اس عمر میں بھی کسی بچے کے اقوال واحوال سے معرفتِ اسلام کی جھلک محسوس ہو اور وہ اسلام کے مفاد کو سمجھتا ہو تو اُس کا اسلام دوسرے حضرات کی طرح صحیح ہوگا۔ واللہ اعلم"۔

(المغني لموفق الدين ابن قدامة ج١٢ ص ١٠٠، ١٠١، ١٠٢، ١٠٣، وط: ج١٢ ص ٢٧٨، ٢٨٠؛ المقنع [له] ج٢٧ ص١٢٣، ١٢٧؛ الشرح الكبير على المغني لشمس الدين ابن قدامة ج١٢ ص ١٠٠، ١٠١، ١٠٢، ١٠٣؛ الشرح على المقنع [له] ج٢٧ ص١٢٣، ١٢٧)

امام شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ الزرکشی حنبلی متوفی ۷۷۲ھ نے اس مسئلہ پر اس سے بھی زیادہ تفصیل سے لکھا ہے۔

(شرح الزركشي على متن الخرقي ج٤ ص١٦ ومابعدها)

امام مرداوی حنبلی نے فقہ حنبلی پر ایک کتاب لکھی ہے، جس میں وہ کسی بھی مسئلہ میں مختلف اقوال میں سے راجح قول کو نمایاں کرتے ہیں، اور وہ اس مسئلہ میں لکھتے ہیں "الصبي المميز" یعنی بچہ جب سمجھدار ہو تو اس کے اسلام اور ارتداد کی صحت کا قول ہی حنبلی مذہب ہے۔

(الإنصاف للمرداوي ج١٠ ص٣٢٩ وعلى هامش المقنع ج٢٧ ص١٢٣، ١٢٧)

بچے کے اسلام کی صحت کے متعلق جس قدر فقہاءِ حنابلہ کی کتب سے عبارات نقل کی گئیں تقریباً وہ تمام عبارات علامہ ابن قیم الجوزیہ حنبلی نے اپنی اُس مفید کتاب میں نقل کی ہیں جو بچوں کے احکام کے متعلق مخصوص ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

(تحفة المودود بأحكام المولود ص٤١٢ ومابعدها)

بچے کے اسلام کا حکم اور فقہاء احناف

اس مسئلہ میں فقہاء احناف کی تصریحات احاطۂ تحریر میں لانا مشکل ہے، اس لیے ہم مختصر عبارات نقل کریں گے اور مفصل عبارات کی طرف فقط نشان دہی کریں گے۔

امام محمد بن حسن شیبانی متوفی ۱۸۹ھ لکھتے ہیں:

وارتداد الصبي الذي يعقل ارتداد عند أبي حنيفة ومحمد، ويجبر على الإسلام ولا يقتل، وإسلامه إسلام.

''اور عقل مند بچے کا ارتدا دامام ابوحنیفہ اور امام محمد رضی اللہ عنہما کے نزدیک ارتداد ہی ہے، اُسے اسلام پر مجبور کیا جائے گا اور قتل نہیں کیا جائے گا اور اس کا اسلام، اسلام ہی ہے''۔

(الجامع الصغير للإمام محمد ص ١٥٨)

امام ابوالمعالی برھان الدین محمود بن احمد ابن مازہ بخاری حنفی متوفی ۶۱۶ھ، امام عبداللہ بن محمود بن مودود الموصلی الحنفی متوفی ۶۸۳ھ، امام ابوالبرکات عبداللہ بن احمد المعروف امام نسفی متوفی ۷۱۰ھ، برھان الشریعہ امام محمود بن احمد محبوبی متوفی ھ، صدرالشریعہ امام عبداللہ بن مسعود محبوبی متوفی ۷۴۷ھ، امام عالم بن العلاء انصاری دھلوی متوفی ۷۸۶ھ، امام ابراھیم بن محمد بن ابراھیم حنفی متوفی ۹۵۶ھ امام نظام الدین اور علماء ہند کی ایک جماعت نے بھی اسی طرح لکھا ہے اور بعض نے یہی مفہوم ادا کیا ہے:

(المحيط البرهاني ج٥ ص ٢٦٢؛ المختار بشرح الاختيار ج٤ ص ١٨١؛ كنز الدقائق بشرح البحر الرائق ج٥ ص ٢٣١؛ الوقاية بشرح عمدة الرعاية ج٤ ص ٤٩٧، ٤٩٨؛ شرح الوقاية ج٤ ص ٤٩٧، ٤٩٨؛ الفتاوى التاتارخانية ج٥ ص ٣٨٣؛ ملتقى الأبحر ج٢ ص ٥٠٠؛ الفتاوى الهندية [عالمگيري] ج٢ ص ٢٧٦، ٢٧٧)

شیخ الاسلام قاضی ابوالحسن علی بن حسین السغدی متوفی ۴۶۱ھ لکھتے ہیں:

وقال أبو حنيفة: ارتداده ارتداد، كما أن إسلامه إسلام، وقال أبو يوسف ومحمد وزفر وأبو عبد الله: إسلامه إسلام وارتداده ليس بارتداد.

''اور امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں: اُس کا ارتداد، ارتداد ہی ہے جیسا کہ اُس کا اسلام،

اسلام ہے، اور امام ابو یوسف، امام محمد، امام زفر اور امام ابو عبد اللہ (امام احمد) رحمہم اللہ فرماتے ہیں:
اُس کا اسلام، اسلام ہے اور اُس کا ارتداد، ارتداد نہیں ہے"۔

(النتف فی الفتاوی ص٤٢٥)

صاحب "الھدایۃ" شیخ الاسلام برھان الدین ابو الحسن علی بن ابی بکر المرغینانی متوفّٰی ۵۹۳ھ نے بھی اسی طرح لکھا ہے، اور انہوں نے احناف کے موقف کی ترجیح میں یہ بھی لکھا ہے:

ولنا فيه أن عليًا رضي الله عنه أسلم في صباه وصحح النبي عليه الصلاة والسلام إسلامه وافتخاره بذلك مشهور.

"اور اس مسئلہ میں ہماری دلیل یہ ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اپنے بچپن میں اسلام لائے تھے اور نبی کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم نے اُن کے اسلام کو صحیح مانا تھا اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا اس پر فخر کرنا مشہور ہے"۔

(الھدایة ج١، ٢ ص٤١١؛ البناية في شرح الهداية للعيني ج٧ ص٢٩٤)

امام عبد اللہ بن محمود الموصلی متوفّٰی ۶۸۳ھ اور امام زین الدین بن ابراہیم بن محمد المعروف بابن نجیم المصری الحنفی متوفّٰی ۹۷۰ھ نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔

(الاختيار لتعليل المختار ج٤ ص٩٤؛ البحر الرائق شرح كنز الدقائق ج٥ ص٢٣٢)

صاحب "الھدایۃ" رحمہ اللہ نے "وافتخاره بذلك مشهور" سے کس طرف اشارہ کیا ہے؟ امام کمال الدین محمد بن عبد الواحد المعروف بابن الھمام، امام محمد بن محمود بن احمد حنفی اور امام عبد الرحمان الحنفی شارحینِ ھدایہ نے لکھا ہے کہ یہ اس شعر کی طرف اشارہ ہے:

سبقتكم إلى الإسلام طرًّا غلامًا ما بلغتُ أوان حلمي

"میں نے اسلام میں تم سب پر سبقت کی تھی، اُس وقت میں بچہ تھا بلوغت کو نہیں پہنچا تھا"۔

(فتح القدير على الهداية ومعه شروح الهداية ج٦ ص٨٧)

امام عبد اللہ بن محمود بن مودود الموصلی الحنفی متوفّٰی ۶۸۳ھ، صدر الشریعہ امام عبد اللہ بن مسعود محبوبی متوفّٰی ھ اور امام علاء الدین حصکفی متوفّٰی ۱۲۵۲ھ نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔

(كتاب الاختيار لتعليل المختار ج٤ ص١٨٢؛ شرح الوقاية ج٤ ص٤٩٩، ٥٠٠؛ الدر المختار مع

ردالمحتار ج٦ص ٣١١)

امام ابوالحسن المرغینانی سے قبل اس مسئلہ پر شمس الائمہ امام ابوبکر بن محمد بن ابی سہل السرخسی متوفّٰی ۴۹۰ھ نے تفصیلاً لکھا ہے اور انہوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اسلامی افتخار پر مبنی یہ شعر بھی نقل فرمایا ہے۔

(المبسوط للسرخسي ج١٠ ص ١٢١)

"المبسوط للسرخسي" سے مطلوبہ عبارت امام ابوالحسن المرغینانی کے شاگرد امام محمد بن محمود استروشنی حنفی متوفّٰی ۶۳۲ھ نے اپنی کتاب "جامع احکام الصغار" میں ذکر فرمائی ہے۔ لاہور سے اس کتاب کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں

(بچوں کے اسلامی احکام ص 269)

امام علاؤالدین ابوبکر بن مسعود الکاسانی حنفی متوفّٰی ۵۸۷ھ نے بچے کے اسلام کے بارے میں امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے قول کو نقل فرما کر وجوہِ ترجیح بھی بیان فرمائی ہیں۔

(بدائع الصنائع ج٩ص ٥٢٦، ٥٢٧)

امام مظفر الدین احمد بن علی بن ثعلب المعروف بابن الساعاتی حنفی متوفّٰی ۶۹۴ھ لکھتے ہیں:

ونحكم بصحة إسلام الصبي العاقل وردّته.

''ہم عقل مند بچے کے اسلام اور اُس کے ارتداد کا حکم کرتے ہیں''۔

(مجمع البحرين وملتقى النيرين ص٨١٨)

امام عبیداللہ بن مسعود محبوبی حنفی متوفّٰی ۷۴۷ھ نے بھی اس حکم کو مقرر رکھا ہے۔

(النقاية بشرح فتح باب العناية للقاري ج٣ص ٣٠٧)

علامہ عبدالعلی محمد بن نظام الدین انصاری لکھنوی متوفّٰی ۱۲۲۵ھ نے بھی اس مسئلہ کو تفصیل سے لکھا ہے۔

(فواتح الرحموت بشرح مسلّم الثبوت ج١ ص ١٢٢، ١٢٣)

علامہ عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس مسئلہ کو کافی تفصیل سے لکھا ہے، انہوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مذکورہ بالا شعر کے ساتھ باقی اشعار بھی نقل کیے ہیں اور لکھا ہے کہ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مفاخرِ اسلامی پر مبنی یہ اشعار حفظ کرلے۔

(عمدة الرعاية علىٰ شرح الوقاية ج٤ ص ٤٩٩، ٥٠٠، ٥٠١، ٥٠٢)

ملا علی قاری نے اس مسئلہ کو بہت عمدگی سے بیان کیا ہے، انہوں نے صحاح کی بعض احادیث سے بھی اس کو ثابت کیا ہے، ہم اُن احادیث کو فقہاء شافعیہ کے عنوان کے آخر میں لکھ چکے ہیں۔ اُنہوں نے قرآن کریم سے بھی دلیل لی ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ بعض فقہاء کرام نے بچے کے اسلام کو تو اسلام مانا ہے لیکن اُس کے ارتداد کو ارتداد نہیں مانا، اور بطور دلیل حدیث "رفع القلم عن ثلاث......" پیش فرمائی ہے، اس پر ملا علی قاری لکھتے ہیں:

ومن كان مرفوع القلم لايبنى الحكم فى الدنيا علىٰ قوله، أما الإسلام فيصح منه لأن الصبي أهل للرسالة، قال الله تعالىٰ: ﴿وَآتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا﴾ فعُلم ضرورة انه أهل للإسلام، ولأنه سبب الفوز بالسعادة الأبدية، فيكون محض منفعة في الأمور الدنيوية والأخروية، بخلاف الارتداد فإنه محض مضرة.

"جو مرفوع القلم ہے اُس پر بقول اُن کے دنیوی حکم لاگو نہیں ہوتا، ہاں اُس کا اسلام صحیح ہے، اس لیے کہ بچہ رسالت (ونبوت) کا اہل ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿اور ہم نے اُس (یحییٰ علیہ السلام) کو بچپن میں نبوت دی﴾ [مریم: ١٢] پس لازماً ثابت ہوا کہ بچہ اسلام کا بھی اہل ہے، اور اس لیے کہ اسلام ابدی سعادت کا سبب ہے، اور وہ دنیوی اور اخروی امور میں نفع ہی نفع ہے، بخلاف ارتداد کہ وہ محض ضرر ہے [اس لیے بچہ ضرر سے مستثنیٰ ہے]"۔

(فتح باب العناية ج٣ ص ٣٠٧)

اب ہم اس بحث کے آخر میں ڈاکٹر وھبۃ الزحیلی کا ملخص ومختار قول نقل کر رہے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"اور شافعیہ کے بغیر جمہور نے عقل مند بچے کے اسلام کو صحیح کہا ہے، اس لیے کہ حدیث شریف میں ہے: ہر پیدا شدہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، اور ارشاد نبوی ﷺ ہے: جس نے "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" کہا وہ جنت میں داخل ہوا۔ خلاصہ یہ ہے کہ جمہور کے نزدیک عقل مند بچے کا اسلام اور ارتداد صحیح ہے، اور شافعیہ کے نزدیک اُس کا اسلام اور مرتد ہونا دونوں صحیح نہیں ہیں، اور اس میں راجح ترین رائے جمہور کی ہے، اس پر دلیل یہ ہے کہ سیدنا علی علیہ السلام بچپن میں اسلام لائے تھے، البتہ عقل مند بچے کے ارتداد میں امام شافعی اور امام ابو یوسف کے قول کو لینا زیادہ بہتر ہے، اس لیے کہ قبل از بلوغ کوئی ضرر درست نہیں"۔

(الفقه الإسلامي وأدلته ج٦ ص ١٨٥، ١٨٦)

راقم السطور عرض کرتا ہے: بلکہ زیادہ بہتر اور جمہور کے قول کے مطابق یہ بات ہے کہ عقل مند بچے کا اسلام اور (معاذ اللہ) اُس کا ارتداد دونوں صحیح ہیں لیکن مرتد ہو جانے کی صورت میں قبل از بلوغ وہ قتل نہیں کیا جائے گا، اور یہی قول امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ اور جمہور اہل اسلام کے مطابق ہے۔

''ننھے سے بچے'' یہ تصغیر کیوں؟

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ کتب فقہ کی حد تک شافعیہ کے علاوہ جمہور اہل اسلام بچے کے اسلام کی صحت کے قائل ہیں اور احادیث کی تشریح میں شافعیہ بھی جمہور کا ساتھ دینے پر مجبور ہیں، جبکہ احناف نے تو مکمل وضاحت سے لکھ دیا ہے کہ ''إسلامه إسلام'' (بچے کا اسلام، اسلام ہی ہے) جب یہ عام بچوں کی بات ہے تو پھر اُس خوش نصیب بچے کا کیا مقام ہوگا جو ہاشمی حکمت ودانائی سے مالا مال تھا اور جس کی تربیت آغوشِ نبوی ﷺ میں ہوئی تھی۔

اب آپ خود غور فرمایئے کہ جو لوگ حنفی ہونے کے باوجود کسی عام بچے کے اسلام کو ہی نہیں بلکہ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے اسلام کی اہمیت کو الفاظ تصغیر سے گھٹانے کے درپے ہیں، کیا وہ اسلام کی خدمت کر رہے ہیں؟ محض روافض سے بغض کی وجہ سے شافعیہ کے مرجوح قول کی طرف لپکنا اور یہ نہ سوچنا کہ نبی کریم ﷺ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اسلام کو معتبر رکھا، سیدتنا فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے سامنے ''أقدم أمتي سلماً'' فرما کر اس سبقت کو اُن کی تسلی کا سامان بنایا، سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنی اس سبقت پر فخر فرمایا اور اسی سبقت کی وجہ سے انہوں نے خود کو ''الصدیق الأکبر'' فرمایا۔ خود انصاف فرمایئے! آخر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی اسلامی سبقت اور اِسی سبقت کی بدولت اُن کی ہر عظمت کی اہمیت کو گھٹانے کے پیچھے کونسا جذبہ کارفرما ہے؟

میں پوچھتا ہوں: جب فقہاء کرام کی تصریحات کے مطابق بچے کا اسلام، اسلام ہی ہے تو پھر ''ننھے سے بچے'' وغیرہ الفاظ سے تحقیر کیوں؟ ہمارے معاصر صاحب نے یہاں جو تصغیر کے الفاظ لکھ مارے ہیں امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت میں یہ تصغیر نہیں ہے، پھر معاصر موصوف نے دوسری ڈنڈی یہ ماری ہے کہ اگلے الفاظ نقل نہیں کیے۔ کیوں؟ تاکہ اُن کی اس کارروائی کے الفاظ کا اثر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے عدم قتال کے ساتھ ساتھ اُن کے اسلام کی کم اہمیت پر بھی دلالت کریں۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کے اصل الفاظ یہ ہیں:

وذكر الواحدي في البسيط [الوسيط.فيضي] أن أبا بكر كان أول من قاتل على الإسلام، لأن علياً في أول ظهور الإسلام كان صبياً صغيراً ولم يكن

صاحب القتال.

''اور واحدی نے "البسیط" (الوسیط،فیضی) میں ذکر کیا ہے کہ حضرت ابوبکر ﷺ اول شخص ہیں جنہوں نے اسلام کی خاطر قتال کیا، اس لیے کہ سیدنا علی ﷺ ظہور اسلام کے آغاز میں چھوٹے بچے تھے اور قتال کے اہل نہیں تھے''۔

(الوسيط للواحدي ج٤ص ٢٤٥؛ التفسير الكبير ج٢٩ص ١٩١)

خط کشیدہ الفاظ واحدی کے نہیں بلکہ امام رازی کے ہیں۔

اگر ہمارے معاصر "ولم يكن صاحب القتال" کے الفاظ نقل کر دیتے تو بات فقط یہاں تک محدود رہتی کہ سیدنا علی ﷺ اُس وقت قتال کی عمر نہیں رکھتے تھے، لیکن چونکہ ہمارے معاصر ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے یہ الفاظ نقل کرنا اپنے حق میں مناسب نہیں سمجھا۔

اہلیتِ قتال کے وقت مقام علی ﷺ کا عالم

یہ بات صحیح ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق ﷺ نے آغاز اسلام میں بہت صعوبتیں برداشت فرمائیں، کعبہ معظمہ میں کھلے بندوں تبلیغ فرمائی تو مشرکین کے شدید ظلم کا شکار ہوئے، نیز اُنہوں نے فرداً فرداً جو تبلیغ فرمائی اُس سے متعدد سابقین حضرات کو سعادتِ اسلام نصیب ہوئی، حتیٰ کہ عشرہ مبشرہ کا نصف حصہ بھی اُن ہی کی مساعی جمیلہ کی بدولت شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہوا، رضي الله عنه وأرضاه عنا، وجزاه الله تعالىٰ ورسوله عنا وعن الإسلام والمسلمين.

لیکن یہ سب وقت وقت کی بات ہے آغاز اسلام میں سیدنا ابوبکر صدیق ﷺ کی عمر تقریباً ۳۸ برس تھی اور سیدنا علی ﷺ کی عمر آٹھ یا دس برس تھی، اور ظاہر ہے کہ جسمانی قوت کا جو کام ۳۸ برس کا شخص کر سکتا ہے وہ آٹھ دس سال کا بچہ نہیں کر سکتا، لیکن جب سیدنا علی ﷺ کی عمر مبارک بیس برس کی ہوئی تو انہوں نے غزوۂ بدر میں جو بہادری کے جوہر دکھائے وہ فقط ان ہی کا حصہ ہے، اور غزوہ خیبر میں تو حیدر کرار غیر فرار نے ایسی مشکلیں حل فرمائی تھیں جو احادیث کی تصریحات کے مطابق اُن سے قبل دوسرے حضرات سے حل نہیں ہو سکی تھیں۔

حدیث الرایۃ کی تشریح کے ضمن میں ''بچپن کے اسلام کا حکم'' پر اس ضمنی بحث کے بعد آخر میں بطور نتیجہ اور خلاصہ عرض ہے کہ غزوۂ خیبر کے موقعہ پر سیدنا علی ﷺ کے اللہ ﷻ اور اُس کے حبیب ﷺ کے نزدیک تمام

صحابہ کرام ﷺ سے زیادہ محب ومحبوب، اسمل، بہتر اور قوی مومن ہونے کا سبب اُن کا اسلامی تقدم ہے۔ وَالحَمدُ لِلّٰہِ عَلیٰ نعمتہ.

مسئلۂ کثرتِ ثواب اور غزوۂ خیبر میں برتری

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ سیدنا علی ﷺ تقدمِ اسلام ونماز کے سبب غزوۂ خیبر میں سب پر مقدم رہے تو اس سے دو باتیں ثابت ہوئیں:

۱۔ ایک تو یہ کہ وہ اُس وقت ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ أَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ﴾ (ایمان والے اللہ تعالیٰ سے شدید محبت کرتے ہیں) کا کامل مصداق تھے،

۲۔ اور دوسری یہ کہ ثواب کی کثرت میں بھی وہ سب پر مقدم تھے۔

اس لیے کہ جو جتنا محب ومحبوب ہوتا ہے اتنا ہی وہ متبع ہوتا ہے اور جو جتنا متبع ہوتا ہے اتنا ہی وہ کثرتِ ثواب سے بہرہ ور ہوتا ہے، اور چونکہ تقدمِ اسلامی کے باعث سیدنا علی ﷺ کو سب سے پہلے صحبتِ نبوی ﷺ میسر آئی تھی اس لیے انہوں نے اتباعِ نبوی ﷺ کی بدولت ثواب کی بھی کثرت حاصل کرلی تھی۔ لہٰذا خیبر میں جو اُنہیں پرچم محبوبیت عطا ہوا تھا وہ فضلِ الٰہی کے ساتھ ساتھ ﴿إِنَّا لَانُضِيْعُ أَجْرَ مَنْ أَحْسَنَ عَمَلًا﴾ کی رو سے اُن کا استحقاق بھی تھا۔

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا بعد میں بھی سیدنا علی ﷺ اس کثرتِ ثواب کے حامل رہے یا تنزلی کا شکار ہوگئے تھے؟ تو جواباً عرض ہے کہ اگر وہ عملاً سست ہوئے ہوں گے تو تنزلی کا شکار ہونا یقینی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ سیدنا علی ﷺ بعد میں بھی کبھی عملاً سست روی کا شکار نہیں ہوئے، یہاں تک کہ جہادِ صفین اُن کی زندگی کا مشکل ترین جہاد تھا مگر اس میں بھی اُن کے معمولات میں فرق نہیں آیا تھا۔ فرائض وواجبات تو کجا انہوں نے تو اپنے اوراد ووظائف میں بھی تعطل نہیں آنے دیا تھا۔ چنانچہ امام بخاری سیدنا علی ﷺ ہی سے روایت کرتے ہیں کہ اُنہوں نے فرمایا:

> ''جب سے نبی کریم ﷺ نے ہمیں تسبیحِ فاطمہ (سُبْحَانَ اللّٰهِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ) کی تلقین فرمائی ہم نے کبھی بھی ترک نہیں کی۔ عرض کیا گیا: صفین کی شب میں بھی؟ فرمایا: صفین کی شب میں بھی''۔

(بخاري ص۹۵۸، حديث ۵۳۶۲؛ عمل اليوم والليلة لابن السني ص۲۵۸، حديث ۷۴۰؛ منتخب

مسند عبد بن حُمید ج ۱ ص ۱۱، حدیث ۶۳)

معلوم ہوا کہ آغازِ اسلام (اعلانِ نبوی کے دوسرے دن) سے سیدنا علی ؑ نے اتباعِ نبوی ﷺ کی بدولت جو ثواب کمانا شروع کیا تھا وہ غزوۂ خیبر تک جوں کا توں محفوظ تھا، اسی لیے پرچم اُن ہی کو تھمایا گیا تھا اور بعد میں بھی وہ ثواب مزید اضافہ جات کے ساتھ قائم ودائم رہا، اس لیے کہ اُن کے معمولات میں کبھی تعطل کو راہ نہیں مل سکی۔

مسئلۂ کثرتِ ثواب غزوۂ خیبر کے بعد

کثرتِ ثواب کا تذکرہ مسئلۂ افضلیت میں چھیڑا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ جس کا ثواب زیادہ وہی افضل، لیکن جس نے بھی یہ بحث چھیڑی اُسے یہ ضرور لکھنا پڑا کہ اس کثرت کی حقیقت کو نبی کریم ﷺ کے سوا کوئی نہیں جانتا، یہاں تک کہ صاحبِ "ضربِ حیدری" جناب قاسمی صاحب کو بھی یہاں ہتھیار ڈالنا پڑے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"علامہ پرہاروی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: محققین نے وضاحت کی ہے کہ جس فضیلت پر یہاں بحث ہو رہی ہے اس سے مراد کثرتِ ثواب ہے یعنی اچھے اعمال کی جزا۔ یہاں نسبی شرف کی بات نہیں ہو رہی ورنہ نبی کریم ﷺ کے شہزادے بھی دوسرے انبیاء سے بڑھ جائیں گے۔ یہاں ظاہری عبادت کی کثرت کی بات بھی نہیں ہو رہی اس لیے کہ ثواب عبادتوں کی مقدار کے مطابق نہیں ملا کرتا۔ آج ہم اگر اُحد پہاڑ کے برابر سونا بھی اللہ کی راہ میں خرچ کر دیں تو صحابہ کے ایک سیر جو کے برابر بھی نہیں ہو سکتا جیسا کہ حدیث شریف میں اس کی تصریح موجود ہے۔ اس میں راز یہ ہے کہ بھلائی کا دارومدار اخلاص، اللہ کی محبت اور دائمی حضوری پر ہے۔ ان چیزوں کا تعلق اعمال کی ظاہری مقدار سے نہیں بلکہ باطنی اور روحانی مقام سے ہے۔ اسی وجہ سے حضرت ابوبکر صدیق کے بارے میں یہ فرمان موجود ہے کہ ابوبکر تم لوگوں سے نماز روزے کی کثرت کی وجہ سے نہیں نکلا بلکہ اس چیز کی وجہ سے آگے نکلا ہے جو اس کے دل میں سجادی گئی ہے۔ بڑی واضح سی بات ہے کہ کثرتِ ثواب کے بارے میں نبی کریم ﷺ کے سوا کوئی نہیں بتا سکتا۔ اور اس میں عقل اور ظاہری مناقب کا کوئی دخل نہیں۔ یہ باتیں اچھی طرح سمجھ لو، ان سے شیعہ کے بے شمار شبہات

حل ہو جائیں گے"۔(نبراس صفحہ ۲۹۹)

(ضربِ حیدری ص 171)

اس اقتباس کے خط کشیدہ الفاظ پر ایک مرتبہ پھر نظر ڈال لیجئے! ان الفاظ سے پہلے اور بعد میں اپنی طرف سے جو اصول وقواعد بیان کیے گئے ہیں وہ محض پانی میں مدھانی چلانے والی بات ہے، کیونکہ وہ ساری گفتگو اسی جملہ کی بنیاد پر کی گئی۔ انہوں نے اس جملہ کو حدیثِ نبوی ﷺ گمان کر لیا، اور افضلیت کے باقی تمام راستوں (کثرتِ عبادت، قرابتِ نبوی وغیرہ) کو مسدود کر کے خوش ہو گئے کہ اس حدیث سے افضل شخصیت کا تعین ہو گیا۔ اسی لیے آگے یہ جملہ لکھا:

"بڑی واضح سی بات ہے کہ کثرتِ ثواب کے بارے میں نبی کریم ﷺ کے سوا کوئی نہیں بتا سکتا"۔

(ضربِ حیدری ص 171)

لیکن افسوس کہ یہ حدیث نبوی نہیں بلکہ یہ ایک شخص بکر بن عبداللہ المزنی کا قول ہے، جیسا کہ ہم آغازِ کتاب میں وضاحت کر چکے ہیں۔ لہٰذا بات وہی درست ہے جسے آخر میں یوں بیان کیا گیا:

"بڑی واضح سی بات ہے کہ کثرتِ ثواب کے بارے میں نبی کریم ﷺ کے سوا کوئی نہیں بتا سکتا"۔

(ضربِ حیدری ص 171)

کثرتِ ثواب اور سیدنا علی ؓ کی افضلیت

بلاشبہ یہ بات حق ہے کہ "کثرتِ ثواب کے بارے میں نبی کریم ﷺ کے سوا کوئی نہیں بتا سکتا"، لیکن راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ یہ بات اتنی مبہم نہیں جتنی اسے مبہم بنا دیا گیا ہے، کیونکہ ہمارے سامنے نبی کریم ﷺ کی ایسی احادیث موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کثرتِ ثواب کے لحاظ سے سیدنا علی ؑ اپنے سے پہلے تمام وصال یافتہ صحابہ کرام ؓ سے افضل ہیں۔ اس سلسلہ میں چند احادیث پیش کرتا ہوں جن میں غور وفکر کرنا آپ کا کام ہے۔

۱۔ "حضرت ابو ہریرہ ؓ فرماتے ہیں کہ ایک قبیلہ کے دو صحابی ایک ساتھ مسلمان ہوئے ان میں سے ایک صاحب جہاد میں شہید ہو گئے اور دوسرے صاحب کا ایک سال بعد انتقال ہوا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ وہ صاحب جن کا ایک سال بعد انتقال ہوا تھا اُس شہید سے بھی

پہلے جنت میں داخل ہو گئے تو مجھے بڑا تعجب ہوا کہ شہید کا درجہ تو بہت اونچا ہے وہ پہلے جنت میں داخل ہوتے۔ میں نے حضور ﷺ سے خود عرض کیا یا کسی اور نے عرض کیا تو حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: جن صاحب کا بعد میں انتقال ہوا اُن کی نیکیاں نہیں دیکھتے کتنی زیادہ ہو گئیں؟ ایک رمضان المبارک کے پورے روزے بھی اُن کے زیادہ ہوئے اور چھ ہزار اور اتنی اتنی رکعتیں نماز کی ایک سال کی اُن میں بڑھ گئیں"۔

(مسند أحمد ج۲ ص ۳۳۳ وط: ج۳ ص ۲۷۵، حدیث ۸۳۸۰، وط: ج۱۴ ص ۱۲۶، حدیث ۸۳۹۹؛ مسند البزار ج۳ ص ۱۴۳، حدیث ۹۲۹؛ الترغیب والترهیب ج۱ ص ۱۴۹؛ إتحاف الخيرة المهرة ج۶ ص ۳۶۸، حدیث ۶۰۳۴ وط: ج۸ ص ۲۹۴، حدیث ۸۰۹۳)

۲۔ حضرت طلحہ ﷺ بیان کرتے ہیں کہ ایک قبیلہ کے دو آدمی حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں ایک ساتھ آئے اور اکٹھے ہی مسلمان ہوئے۔ ایک صاحب بہت زیادہ مستعد اور ہمت والے تھے وہ ایک لڑائی میں شہید ہو گئے اور دوسرے صاحب کا ایک سال بعد انتقال ہوا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں جنت کے دروازے پر کھڑا ہوں اور وہ دونوں صاحب بھی وہاں ہیں۔ اندر سے ایک شخص آئے اور ان صاحب کو جن کا ایک سال بعد انتقال ہوا تھا اندر جانے کی اجازت ہو گئی اور جو صاحب شہید ہوئے تھے وہ کھڑے رہ گئے۔ تھوڑی دیر بعد پھر اندر سے ایک شخص آئے اور اس شہید کو بھی اجازت ہو گئی، اور مجھ سے کہا کہ تمہارا ابھی وقت نہیں آیا تم واپس چلے جاؤ۔ میں نے صبح کو لوگوں سے اپنے خواب کا تذکرہ کیا۔ سب کو اس پر تعجب ہوا کہ اُس شہید کو بعد میں کیوں اجازت مل گئی اُن کو تو پہلے ہونی چاہیے تھی۔ آخر حضور ﷺ سے لوگوں نے اِس کا تذکرہ کیا تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ وہ شہید بھی ہوئے اور وہ بہت زیادہ مستعد اور ہمت والے بھی تھے مگر جنت میں یہ دوسرے صاحب پہلے داخل ہو گئے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا اُنہوں نے ایک سال کی عبادت زیادہ نہیں کی؟ عرض کیا بیشک کی۔ ارشاد فرمایا: کیا اُنہوں نے پورے ایک رمضان کے روزے اُن سے زیادہ نہیں رکھے؟ عرض کیا گیا: بیشک رکھے۔ ارشاد فرمایا: کیا اُنہوں نے اتنے اتنے سجدے ایک سال کی نمازوں کے زیادہ نہیں کیے؟ عرض کیا گیا: بیشک کیے۔ حضور ﷺ نے

فرمایا:"لِمَا بینهما أبعد مما بین السماء والأرض" (بایں وجہ اُن دونوں میں زمین وآسمان سے بھی زیادہ فرق ہوگیا"۔

(مسند أحمد ج۱ ص ۱۶۳، وط: ج۱ ص ۴۴۷، حدیث ۱۴۰۳، وط: ج۳ ص ۲۲، حدیث ۱۴۰۳؛ سنن ابن ماجہ ج۴ ص ۳۱۳، حدیث ۳۹۲۵؛ صحیح ابن حبان ج۷ ص ۲۴۸، ۲۴۹، حدیث ۲۹۸۲؛ مسند البزار ج۳ ص ۱۶۵، حدیث ۹۵۱)

ایک اور حدیث میں تین اشخاص کا ذکر آیا ہے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

۳۔ حضرت عبداللہ بن شداد بیان کرتے ہیں قبیلہ بنو عذرہ کے تین شخص نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں اکٹھے حاضر ہوئے اور اسلام قبول کیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ان کی کفالت میں میری معاونت کون کرے گا؟ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میں، پس وہ تینوں حضرات حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے ہاں رہنے لگے، یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ نے ایک لشکر روانہ فرمایا تو اُن میں سے ایک اُس لشکر میں شامل ہوگیا تو شہادت سے سرفراز ہوا۔ حضور ﷺ نے پھر ایک لشکر جہاد کے لیے بھیجا تو دوسرا شخص اس میں شریک ہوا اور شہید ہوا۔ راوی کہتے ہیں: پھر تیسرے شخص نے اپنے بستر پر طبعی وفات پائی۔ سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے ان تینوں کو حالتِ خواب میں جنت میں دیکھا تو میں نے طبعی وفات پانے والے کو سب سے آگے دیکھا اور جو دوسرے نمبر پر شہید ہوا تھا اسے اُس کے ساتھ دیکھا اور جو سب سے پہلے شہید ہوا تھا اسے اُن دونوں سے پیچھے دیکھا۔ فرماتے ہیں: اس پر میرے دل میں تعجب پیدا ہوا تو میں نے نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمہیں کونسی چیز اسے تسلیم کرنے سے مانع ہے؟

لیس أحدٌ أفضل عند اللہ من مؤمن یُعَمَّرُ فی الإسلام لتسبیحه وتکبیره وتهلیله.

"اللہ تعالیٰ کے نزدیک اُس مومن سے کوئی افضل نہیں جس کو اسلام میں اللہ کی تسبیح، تکبیر اور تہلیل (کلمہ طیبہ کے ورد) کے لیے لمبی عمر عطا کی جائے"۔

(مسند أحمد ج۱ ص ۱۶۳، وط: ج۱ ص ۴۴۶، حدیث ۱۴۰۱، وط: ج۳ ص ۱۹، حدیث ۱۴۰۱ وص ۲۱، حدیث ۱۳۸۹؛ عمل الیوم واللیلة للنسائي ص ۴۸۴، حدیث ۸۳۸، ۸۳۹؛ مسند

أبي يعلیٰ ج١ص ٢٧٥، ٢٧٦، حدیث ٦٣٠؛مسند البزار ج٣ص١٦٧، حدیث ٩٥٤؛منتخب مسند عبد بن حمید ج١ص١٣٩، حدیث ١٠٤؛إتحاف الخيرة المهرة ج٦ص٣٦٦، ٣٦٧، حدیث ٦٠٣٢، وط: ج٨ص ٢٩٢، حدیث ٨٠٨٧، ٨٠٨٨، ٨٠٨٩، ٨٠٩٠)

ایک اور حدیث میں فقط چالیس روز کا فرق بیان کیا گیا ہے، چنانچہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

۴۔ ''حضرت عامر بن سعد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنے والد حضرت سعد بن ابی وقاص اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو فرماتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں دو بھائی تھے ''وكان أحدهما أفضل من الآخر فتوفي الذي هو أفضلهما'' (ایک اُن میں سے دوسرے سے افضل تھا، پس وہ جو افضل تھا اس کا انتقال ہوگیا) دوسرا اُس کے بعد چالیس روز زندہ رہا پھر انتقال کر گیا، لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پہلے کی دوسرے پر افضلیت بیان کرنا شروع کر دی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''الم یکن یصلي؟'' (کیا وہ نماز نہیں پڑھتا تھا؟) [موطا میں ہے: ألم يكن الآخرُ مسلماً، کیا وہ دوسرا مسلمان نہیں تھا؟] لوگوں نے عرض کیا: کیوں نہیں، لیکن وہ حرج کش نہیں تھا۔ فرمایا: ''ما يدريكم ما ذا بلغت صلاته؟'' (تم کیا جانو کہ اس کو نماز نے کہاں پہنچا دیا ہے؟)''۔

(مسند أحمد ج١ص١٧٧، وط: ج١ص ٤٨٠، حدیث ١٥٣٤، وط: ج٣ص ١١٥، حدیث ١٥٣٤؛ الموطا للإمام مالك ج١ص ١٧٠، حدیث ٤٣٠، وط: ج٢ص ٧٧، ٧٨، حدیث ٤٦١؛ التمهيد ج٢٤ ص ٢٢٠ تا ٢٣٠؛الاستذكار ج٦ص ٣٥٠، حدیث ٩٣٢٨، وط: ج٢ص ٣٦٥، ٣٦٦، حدیث ٣٩٢؛مسند سعد بن أبي وقاص ص ٨٤، حدیث ٤٠؛صحيح ابن خزيمة ج١ص١٩٢، حدیث ٣١٠؛ المستدرك ج١ص٤٤٧، حدیث ٧٤٥، وط: ج١ص ٢٠٠، وط: ج١ص٣١٦، حدیث ٧١٩؛شعب الإيمان ج٣ص ٤٢، حدیث ٢٨١٤؛الجامع لشعب الإيمان ج٤ص ٣٠٥، حدیث ٢٥٥٧؛ الأحاديث المختارة لضياء المقدسي ج٣ص١٩٣، ١٩٤، ١٩٥، حدیث ٩٨٨، ٩٨٩، ٩٩٠؛الترغيب والترهيب ج١ص١٤٨، ١٤٩، وط: ص١٩٤، حدیث ٥٢٢، ٥٢٣؛مجمع الزوائد ج١ص٢٩٧، وط: ج٢ص ٣٠، حدیث ١٦٥٠)

اِن تمام احادیث میں غور کرتے ہوئے اندازہ کیجئے کہ سیدنا علی علیہ السلام سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد تقریباً

چھبیس[26] برس تک بلا تعطل جو نمازیں، روزے، حج، زکوٰۃ، جہاد، تلاوت اور دوسرے ورد وظائف ادا کرتے رہے، ان تمام عبادات نے انہیں کہاں پہنچا دیا ہوگا؟ علیٰ ھذا القیاس باقی دو خلفاءِ راشدین کے ساتھ موازنہ کیجئے۔ اگر غور کیا جائے تو اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سیدنا ابوبکر صدیق سے حضرت عمر افضل ہوں، چونکہ وہ ان کے بعد تقریباً مزید بارہ برس تک حیات رہے اور بھرپور عملی اور زھد بھری زندگی گزاری۔ اسی طرح سیدنا عثمان غنی ذی النورین کا معاملہ ہے، وہ اگرچہ اپنی خلافت کے آخری چھ سالوں میں عزیمت سے رخصت کی طرف چلے گئے تھے، جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ اور دوسرے حضرات نے تصریح فرمائی ہے۔ (الریاض النضرۃ ج۳ ص۵۶؛ ازالۃ الخفاء ج۱ ص۵۸۶؛ موسوعۃ العشرۃ المبشرون بالجنۃ ج۱۰ ص۱۰۶) تاہم تقریباً بائیس[22] برس کی ان کی عبادت کا ثواب زیادہ بنتا ہے۔

فی الجملہ یہ کہ سیدنا علی کو ہر خلیفۂ راشد کی بہ نسبت کئی کئی سال زیادہ میسر آئے اور وہ ان سالوں میں بھرپور استقامت و مداومت کے ساتھ ہر طرح کی عبادت ادا کرتے رہے، لاینحل مسائل میں خلفاء راشدین کے ساتھ تعاون فرماتے رہے، حتیٰ کہ فاروقِ اعظم نے تو ایسے پیچیدہ مسائل کے حل کی خاطر انہیں درخواست کی تھی کہ وہ جہاد پر جانے کی بجائے ان مسائل کو ترجیح دیں۔ خود سوچئے اس پر کتنا ثواب مرتب ہوا ہوگا؟ پھر سیدنا علی نے اپنے دور کے آخری سالوں میں جو جہاد کیے اُن پر تو اُنہیں فرائض کا ثواب عطا ہوا جیسا کہ ہم "شرح خصائص علي" کے آخر میں بالدلائل ذکر کر چکے ہیں۔ لہٰذا حقیقت یہ ہے کہ خلفاء ثلاثہ کے وصال کے بعد اُنہیں جو ثواب کی کثرت حاصل ہوئی اس کا اندازہ کرنا ممکن نہیں۔ بھلا جب دو شخصوں میں فقط ایک سال کے فرق پر شارع نے فرمایا: "لما بینھما أبعد مما بین السماء والأرض" (بایں وجہ اُن دونوں میں زمین وآسمان سے بھی زیادہ فرق ہوگیا) اور دوسری حدیث کے مطابق فقط چالیس روز کے فرق سے لوگ جسے افضل سمجھتے تھے وہ مفضول ہوگیا اور جسے مفضول سمجھتے تھے وہ افضل نکلا اور وہ اُس شخص سے بھی پہلے جنت میں چلا گیا جسے صحابہ کرام افضل سمجھتے تھے۔ سو جب فقط ایک سال یا فقط چالیس دن زائد ہونے کی وجہ سے اس قدر فرق ہو گیا تو پھر کئی سالوں کی عبادت کے ثواب کا اندازہ لگانا کہاں ممکن ہے؟

نیز یہاں یہ بھی ذہن نشین رہے کہ دو شخص ایک ہی طرح کی عبادت کریں اور خشوع وخضوع میں بھی دونوں برابر ہوں مگر اُن میں سے ایک اہل بیت سے ہو اور دوسرا غیر اہل بیت سے ہو تو اہل بیت کے فرد کو زیادہ ثواب دیا جاتا ہے، جیسا کہ ہم پیچھے ابن سعد کی طبقات اور علامہ ابن تیمیہ کے فتاویٰ سے نقل کر چکے ہیں۔ اس کی مزید تفصیل

کے لیے قطب الاقطاب حضرت سیدنا پیر مہر علی شاہ گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ کے "ملفوظات" اور اُن کی سوانح "مہر منیر" کے ابتدائی صفحات ملاحظہ فرمائیں۔

یہاں یہ اہم پہلو بھی ذہن نشین رہے کہ اگرچہ خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم عمر میں سیدنا علی المرتضیٰ علیہ السلام سے بڑے تھے مگر سیدنا علی رضی اللہ عنہ اُن سب سے پہلے صحبتِ نبوی ﷺ میں آئے تھے، لہٰذا عمر میں چھوٹے ہونے کے باوجود حضور ﷺ کی صحبت مبارکہ میں گذارے ہوئے ماہ وسال اور لمحات کے لحاظ سے وہ اُن سب سے بڑے صحابی ہیں، اور پھر وصال نبوی ﷺ کے بعد بھی اُنہوں نے خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم سے زیادہ سال پائے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ صحابی صحبت سے ہوتا ہے اور صحبت زیادہ پانے کے لحاظ سے سیدنا علی علیہ السلام سب پر مقدم ہیں، دوسری طرف اسلامی دورانیہ زیادہ پانے کے لحاظ سے بھی اُن کا کوئی مدمقابل نہیں ہے۔ جب حقیقت یہ ہے تو پھر اس پر لوگوں کا نہیں بلکہ شارع علیہ السلام کا فیصلہ قبول کرنا چاہیے، اور شارع علیہ السلام کا فرمان اوپر آچکا ہے کہ:

"ليس أحدٌ أفضل عند الله من مؤمن يُعَمَّرُ في الإسلام لتسبيحه وتكبيره وتهليله.

"اللہ تعالیٰ کے نزدیک اُس مومن سے کوئی افضل نہیں جس کو اسلام میں اللہ کی تسبیح، تکبیر اور تہلیل (کلمہ طیبہ کے ورد) کے لیے لمبی عمر دی جائے"۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اندازے نادرست

اس تصریح نبوی ﷺ سے اُن لوگوں کی بھی تردید ہو جاتی ہے جن کا قول ہے کہ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور ﷺ کی حیات میں انتقال فرما گئے اور آپ نے اُن کی نماز جنازہ پڑھائی وہ بعد والوں سے افضل ہیں۔

قارئین کرام! غور فرمایئے، ایک طرف یہ احادیث نبویہ ہیں اور دوسری طرف موضوع حدیث اور شخصی اقوال ہیں، لہٰذا فیصلہ آپ خود کیجیے اور سوچیے کہ کثرتِ ثواب کا چکر چلانے والے کس چکر میں مبتلا ہیں؟ بھلا جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے افضلیت ومفضولیت کے دعووں کو بارگاہِ نبوی ﷺ میں مسترد فرما دیا گیا تو بعد والوں کی کیا حیثیت ہے کہ وہ اپنی ترازو میں خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے ثواب کی کثرت وکیفیت کو تولتے، ناپتے اور کسی کو گھٹاتے اور کسی کو بڑھاتے پھریں؟

اس مسئلہ میں حرفِ آخر

مذکورہ دو صورتوں یعنی زیادہ صحبتِ نبوی ﷺ اور زیادہ اسلامی عملی زندگی گذارنے کی وجہ سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ بشمول خلفاء ثلاثہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثواب میں زیادہ ہیں۔ اگر ہمارا یہ خیال غلط ہو اور حقیقت اس کے برعکس ہو تو خلفاءِ ثلاثہ رضی اللہ عنہم کا مقام تو بہت بلند ہے کوئی دوسرا صحابی بھی ثواب کے لحاظ سے سیدنا علی علیہ السلام سے افضل اور بڑھا ہوا پیش کر دیا جائے تو ہمیں تسلیم ہوگا، کیونکہ ہم دلائلِ شرعیہ کے پابند ہیں، خواہشِ نفس کے نہیں۔

اتباعِ نبوی ﷺ کے ثمرات

یوں تو غزوۂ خیبر میں سیدنا علی علیہ السلام کے سرِ اقدس پر جو محبوبیتِ عظمیٰ کا تاج سجایا گیا تھا وہ بھی ثمرۂ اتباعِ نبوی ﷺ ہی تھا، کیونکہ اتباعِ نبوی محبوبِ الٰہی ہونے کے لیے شرط ہے، تاہم راقم الحروف یہاں ثمرۂ اتباعِ نبوی ﷺ کا وہ پہلو بھی اُجاگر کرنا چاہتا ہے جسے محدثین عظام اور صوفیہ کرام رحمہم اللہ نے تجرباتی طور پر بیان فرمایا ہے۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وإذا تابعه حق المتابعة ناسب باطنه وسرّه، وقلبه ونفسه، باطن النبي ﷺ وسرّه، وقلبه ونفسه، وهو مظهر المحبة، فلزم بهذه المناسبة أن يكون لهذا المتابع قسط من محبة الله تعالىٰ، بقدر نصيبه من المتابعة، فيلقي الله تعالىٰ محبته عليه، ويسري من باطن روح النبي ﷺ نور تلك المحبة إليه، فيكون محبوباً لله مُحِبًّا له، ولو لم يتابعه لخالف باطنه باطن النبي ﷺ، فبعد عن وصف المحبوبية.

''اور بندہ جب حضور ﷺ کی کماحقہ پیروی کرتا ہے تو اس کا باطن، اس کا سرّ، اس کا قلب اور اس کی روح نبی کریم ﷺ کے باطن، آپ کے سرّ، آپ کے قلب اور آپ کی روح سے مناسبت حاصل کر لیتا ہے، اور آپ ہی مظہرِ محبت ہیں، لہٰذا اس مناسبت کی بدولت لازم ہے کہ اس پیروکار کے لیے اس کی پیروی کے مطابق محبتِ الٰہی کا حصہ ہو۔ پس اللہ تعالیٰ اُس پر اپنی محبت نازل فرماتا ہے اور نبی کریم ﷺ کی روح مبارک کے باطن سے اس کی طرف اپنی محبت کے نور کو بھیجتا ہے تو وہ محبوبِ الٰہی اور محبِ الٰہی ہو جاتا ہے، اور اگر وہ پیروی نہ کرے تو اس کا باطن

نبی کریم ﷺ کے باطن کے خلاف ہوجاتا ہے پھر وہ محبوبیت کے وصف سے دور ہو جاتا ہے"۔

(تفسير القرآن العظيم لابن عربي ج۱ ص۱۷۸)

چونکہ محبوبیتِ الٰہی کے لیے اتباعِ نبوی ﷺ شرط ہے، لہٰذا اس توضیح کے پیش نظر محبوبیتِ مرتضوی اور اتباعِ مرتضوی میں مطابقت ہونا لازم ہے، اور چونکہ غزوۂ خیبر میں محبوبیتِ مرتضوی سب پر فائق تھی، اس لیے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی اتباعِ نبوی کا بھی سب پر فائق ہونا لازم ہے۔ اگر فی الواقع ایسا نہ ہوتا اور وہاں کوئی دوسرا شخص اتباعِ نبوی ﷺ میں فائق ہوتا تو سیدنا علی علیہ السلام کے حق میں اعلانِ محبت اقربانوازی یا خیانت قرار پاتا۔

معلوم ہوا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اتباعِ نبوی ﷺ میں کامل ہی نہیں بلکہ اکمل تھے، اور جب کوئی بندہ اتباع میں کامل ہو جائے تو اس کے ایمان کی شان کا عالم یوں ہوتا ہے، قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

لمن قوی بالإیمان یقینه، واطمأنت به نفسه، وانشرح له صدره، وخالط دمه ولحمه، وهو الذي وجد حلاوته.

"جس شخص کا ایمان یقین کی بدولت قوی ہو جائے اور اس کا نفس اس کے ساتھ مطمئن ہو جائے اور اس کا سینہ کھل جائے اور ایمان اس کے گوشت اور خون میں سرایت کر جائے تو وہ شخص ایمان کی مٹھاس کو پا لیتا ہے"۔

(إكمال المعلم ج۱ ص۲۷۸؛ المنهاج للنووي ج۱ ص۲۰۳؛ عمدة القاري ج۱ ص۲۴۲)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ ایمان جب گوشت و خون میں سرایت کر جائے تب بندہ حلاوتِ ایمان پا لیتا ہے، سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایمان کس چیز کا نام ہے؟ جواب ظاہر ہے کہ اللہ عزوجل اور حضور ﷺ کی محبت کا نام ایمان ہے: علامہ بدر الدین عینی حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

محبة الله ورسوله التي هي أصل الإيمان بل عينه.

"اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت ایمان کی اصل بلکہ عین ایمان ہے"۔

(عمدة القاري ج۱ ص۲۴۲)

یہ ایمان جب گوشت و خون میں سرایت کر جائے تو پھر بندہ کی شان کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں اس کے ہاتھ، پاؤں، سمع اور بصر بن جاتا ہوں، لیکن کیا حضور ﷺ بھی کسی شخص میں اس طرح سرایت کر جاتے ہیں؟ غالباً ایسا ممکن ہے اور صوفیہ کرام کے نزدیک شاید اسی کو فنا فی الرسول کہا جاتا ہے۔ پھر سوال پیدا ہوتا

ہے کہ فنافی اللہ یا فنافی الرسول ہونے میں کس کا کیا مقام ہے؟ اس سلسلے میں ہم عرض کرتے ہیں کہ ہر شان والے کی اپنی شان ہے لیکن ہم جن کا ذکر خیر کر رہے ہیں اُن کی شان میں اُن کے کسی مرید نے نہیں بلکہ اُن کے مرشد کریم ﷺ نے یوں ارشاد فرمایا:

لأبعثن عليهم رجلاً كنفسي.

"میں تم پر ایک شخص کو بھیجوں گا جو میری جان کی مانند ہے"۔

(السنن الكبرى للنسائي ج٧ص٤٣٤، حديث٨٤٠٣؛ فضائل الصحابة ج٢ ص٧٠٦، حديث ٩٦٦ وص٧٣٣، حديث١٠٠٨؛ المصنف لعبدالرزاق ج١٠ ص٢٢٠، حديث٢٠٥٥٧؛ المصنف لابن أبي شيبة ج٦ ص٣٧١، حديث٣٢٠٧٧، ٣٢٠٨٤، وط: ج١٠ ص٤٨٥، حديث ٣٢٦٨٤ وص٤٨٧، حديث٣٢٦٩١، وط: ج١٧ ص١٠٧، حديث ٣٢٧٤٩ وص١١٢، حديث ٣٢٧٥٦ وج٢٠ ص٤٩٩، ٥٠٠، حديث٣٨١٠٨؛ مسند البزار ج ٣ ص٢٥٩، حديث١٠٥٠؛ مسند أبي يعلى ج١ ص٣٥٤، حديث٨٥٦، وط: ج٢ ص١٦٥، ١٦٦، حديث٨٥٩؛ مجمع الزوائد ج ٩ ص ١٣٤، حديث١٤٧٦٦ وص١٦٣، حديث١٤٩٦٠؛ كشف الأستار ج٣ ص٢٢٣، ٢٢٤، حديث ٢٦١٨؛ الرياض النضرة ج٤ ص١٠٣؛ إزالة الخفاء ج٤ ص ٤٢٥)

دوسرے مقام پر فرمایا:

هذا علي بن أبي طالب لحمه لحمي ودمه دمي.

"یہ علی بن ابی طالب ہے، اس کا گوشت میرا گوشت اور اس کا خون میرا خون ہے"۔

(المعجم الكبير ج١٢ ص١٨، حديث١٢٣٤١، وط: ج٦ ص٢٤، حديث١٢١٧٢؛ مجمع الزوائد ج٩ ص ١١١، حديث١٤٦٥٤؛ تاريخ دمشق ج٤٢ ص١٦٩؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٧ ص ٣٠٧، ٣٤٦؛ موسوعة العشرة المبشرون بالجنة ج١١ ص٣٩)

یہ بیانِ قربت کی انتہا ہے، اس سے زیادہ بیانِ قربت ممکن نہیں، حضرت قطب گولڑہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو یوں ادا فرمایا ہے۔

مہرِ علی ہے حُبِّ نبی، حُبِّ نبی ہے مہرِ علی
لحمك لحمي جسمك جسمي فرق نہیں مابین پیا

ہر مومن باخبر ہے کہ حضور ﷺ کی محبت عین ایمان بلکہ ایمان کی بھی جان ہے، جیسا کہ فرمایا گیا۔

اللہ کی سرتا بقدم شان ہیں یہ — اِن سا نہیں انساں وہ انسان ہیں یہ
قرآن تو ایمان بتاتا ہے انہیں اور — ایمان یہ کہتا ہے مری جان ہیں یہ

(حدائق بخشش ص۱۲۳)

جب حضور ﷺ کی محبت ایمان کی جان ہے تو پھر اُس ہستی کی محبت کا مقام از خود سمجھ آ جانا چاہیے جس کو "لحمك لحمي جسمك جسمي" کی قربت نصیب ہوئی۔ جی ہاں ان کی محبت بھی جانِ ایمان ہے، اسی لیے آقائے کائنات ﷺ نے فرمایا تھا یا علی!

لایحبک إلا مؤمن ولا یبغضک إلا منافق.

"تجھے مومن ہی چاہے گا اور تجھ سے منافق ہی بغض رکھے گا"۔

میرے مطالعہ کے مطابق سیدنا علی علیہ السلام کے علاوہ ایسا معیّن ومشخص اعلان کسی دوسرے فردِ واحد کے حق میں نہیں ہوا، لہٰذا مصطفیٰ و مرتضیٰ صلوات اللہ وسلامہ علیہما میں یہ مخصوص قربت ہے، اور ثمرۂ اتباع کا اس سے زیادہ تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ والحمد للہ علیٰ نِعْمَتِهٖ.

ہمارے معاصر کی ایک تحریف

چونکہ ایمانِ مرتضوی کی عظمت کے ضمن میں حدیث "لَحْمُهٗ لَحْمِيْ الخ" کا ذکر آ گیا ہے، لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث پر وارد شدہ اعتراضات کا جائزہ بھی لے لیا جائے۔ معاصر موصوف امام احمد رضا حنفی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہیں:

"بلکہ اگر کوئی عارف بصیر تمہارے سامنے حدیث لَحْمَهٗ مِنْ لَحْمِي وَدَمُهٗ مِنْ دَمِي کی اسناد مظلم وشنیع کی خرابیاں ظاہر کرے گا تم اس کے دشمن ہو جاؤ گے۔ حالانکہ وہ روایت واقعی موضوع ہے جسے کوئی ماہرِ فن قبول نہیں کرسکتا"۔ (مطلع القمرین قلمی صفحہ ۷۵)۔

(ضرب حيدري ص ۲۴۷)

آخری خط کشیدہ جملہ میں معاصر مذکور (شیخ الحدیث والتفسیر پیر سائیں غلام رسول قاسمی) نے تحریف (ہیرا پھیری) فرمائی ہے۔ میرے سامنے "مطلع القمرین" قلمی بھی موجود ہے اور اس کے علاوہ دو مطبوعہ نسخے بھی

موجود ہیں، ان تینوں نسخوں میں یہ جملہ یوں مرقوم ہے:

"اگرچہ در حقیقت وہ روایت ایسی ہی ہے، جسے کوئی ماہرِ فن صالحِ قبول واعتبار نہیں کہہ سکتا"۔

(مطلع القمرين في إبانة سبقة العمرين قلمي ص۷۵، ومطبوعة: جامعه إسلاميه كهاريان ص ۷۲، ومطبوعة: مكتبة بهارِ شريعت ص۱۷۷)

معاصر مذکور نے اس حدیث کو جعلی ثابت کرنے کے لیے لفظ "موضوع" اپنی طرف سے سخاوتاً شامل فرمایا ہے، اور یہ اُن کے قلم سے قبیح ترین زیادتی ہے۔ یاد رکھئے! اگر اپنی بات بنانا مقصود ہو تو اس قسم کی ترمیم "تسہیل" یا "تساہل" کے زمرہ میں نہیں آتی بلکہ تحریف کہلاتی ہے۔ جب ایک نقطہ کے فرق سے مَحْرَمْ "مجرم" اور خدا "جدا" بن جاتا ہے تو کیا مکمل لفظ کی تبدیلی سے کچھ فرق نہیں پڑے گا؟ ہائے افسوس! جب پیر سائیں لوگ بھی ایسی کارروائیوں میں مشغول ہو گئے تو مرید سائیں لوگ کیا کیا گل کھلائیں گے؟ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے کسی بھی گروگھنٹال کی ایسی بے اعتدالیوں کے بارے میں فرمایا تھا۔

اگر زباغ رعیت ملک خورد سیبے
بر آورند غلاماں اودرخت از بیخ
بپنج بیضہ کہ سلطان ستم روادارد
زنند لشکریانش ہزار مرغ بسیخ

"اگر رعایہ کے باغ سے بادشاہ ایک سیب کھائے تو اس کے کارندے خود درخت کو جڑ سے اکھاڑ لیتے ہیں۔ سلطان اگر پانچ انڈے ظلماً لے لے تو اس کے لشکری ہزاروں مرغ سیخوں پر چڑھا لیتے ہیں۔"

(گلستان سعدي، كليات ص۹٦)

حدیث "لَحْمُهُ لَحْمِيْ" کی سند پر اعتراض

باقی رہا امام احمد رضا حنفی رحمۃ اللہ علیہ کا اس حدیث کی اسناد کو "مظلم وشنیع" (تاریک وقبیح) کہنا تو نہ معلوم اُن کے سامنے اس حدیث کی کون سی سند تھی، کاش! وہ سند ذکر فرما دیتے۔ نیز انہوں نے جو متن لکھا ہے خدا جانے وہ کہاں سے نقل فرمایا ہے؟ اُن کے ذکر فرمودہ متن میں حرف "مِـنْ" کا اضافہ ہے، اس صورت میں اس حدیث کا

معنی یہ بنتا ہے:

''علی کا گوشت میرے گوشت سے ہے اور اس کا خون میرے خون سے ہے''۔

اور اِن الفاظ سے بہ ظاہر یہ حدیث درست نظر نہیں آتی، کیونکہ سیدنا علی المرتضیٰ علیہ السلام کا گوشت وخون اُن کے والدین ماجدین رضی اللہ عنہما سے ہے۔ لہٰذا یہی کہا جاسکتا ہے کہ امام احمد رضا حنفی رحمۃ اللہ علیہ نے جس سند اور متن سے یہ حدیث نقل فرمائی ہے فقط وہی سند ومتن ''مظلم وشنیع'' ہے اور وہی ماہرِ فنِ صالح کے نزدیک قبول واعتبار کے لائق نہیں ہے۔ ہمارے سامنے جو سند ومتن ہے وہ ماہرینِ فن کے نزدیک قبول واعتبار کے لائق ہے۔ ملاحظہ فرمایئے!

اس حدیث کی سند ومتن

امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

حدثنا علي بن العباس البجلي الكوفي، ثنا محمد بن تسنيم، ثنا حسن بن حسين العربي، ثنا يحيى بن عيسىٰ الرملي، عن الأعمش، عن حبيب بن أبي ثابت، عن سعيد بن جبير، عن ابن عباس، قال: قال رسول الله ﷺ لأم سلمة: هذا علي بن أبي طالب لحمه لحمي ودمه دمي، هو مني بمنزلة هارون من موسىٰ إلا أنه لا نبي بعدي.

''سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ام المومنین سیدتنا ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا: یہ علی بن ابی طالب ہے، اس کا گوشت میرا گوشت اور اس کا خون میرا خون، اِس کی منزلت میرے ساتھ ایسی ہے جیسی ھارون علیہ السلام کی موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ، بجز اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا''۔

(المعجم الكبير ج١٢ ص١٨، حديث١٢٣٤١، وط: ج٦ ص٢٤، حديث١٢١٧٢؛ تاريخ دمشق ج٤٢ ص١٦٩؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٧ ص٣٠٧، ٣٤٦؛ كنوز الحقائق للمناوي ج٢ ص ٢٦٦، حديث٨٥٧٨)

حافظ نور الدین ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

رواه الطبراني، وفيه: الحسن بن الحسين العرني [في المعجم: العربي] وهو

ضعيف.

''اس حدیث کوامام طبرانی نے روایت کیا ہے، اوراس میں ایک راوی حسن بن حسین العرنی[المعجم الکبیر میں عربی] ہے اوروہ ضعیف ہے''۔

(مجمع الزوائد ج۹ص۱۱۱، وط: ج۹ص۱۴۲، حدیث ۱۴۶۵۴)

حدیثِ ضعیف کا حکم

حافظ ہیثمی کی تصریح سے عیاں ہوگیا کہ امام احمد رضا حنفی رحمۃ اللہ علیہا کے سامنے ''المعجم الکبیر'' کی یہ حدیث نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ امام احمد رضا رحمۃ اللہ علیہ فضائل میں ضعیف حدیث کو قبول کرنے میں جمہور محدثین کے ساتھ ہیں۔ تفصیل کے لیے اُن کی تصنیف ''منیر العینین في حکم تقبیل الإبهامین'' کا مطالعہ فرمایئے۔ لہٰذا ہمارا یہ سمجھنا زمرۂ گمان سے نکل کر دائرۂ یقین میں آگیا کہ امام احمد رضا حنفی رحمۃ اللہ علیہ نے جس حدیث کی اسناد کو مظلم وشنیع فرمایا ہے وہ یہ نہیں بلکہ کوئی اور حدیث ہے۔

جب یہ طے ہوگیا کہ حدیث ''لحمه لحمي ودمه دمي'' کی سند میں ایک ضعیف راوی ہے تو اب ضروری نہیں رہا کہ میں اُس مکتبِ فکر کے سامنے حدیثِ ضعیف کا حکم بیان کروں، جس کا گذارہ ہی ''نزهة المجالس'' اور ''درة الناصحین'' وغیرھا کتب پر ہو۔ البتہ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ یہ مسئلہ مجھ ایسے سادہ قارئین کے سامنے سہل انداز میں پیش کردوں تاکہ واضح ہوجائے کہ فقط ایک مکتبِ فکر کے نزدیک ہی نہیں بلکہ جمہور اہل علم کے نزدیک فضائل میں ضعیف حدیث قبول واعتبار کے لائق ہے۔

علامہ سید شریف الجرجانی فرماتے ہیں:

يجوز عند العلماء التساهل في إسناد الضعيف دون الموضوع.

''علماء کرام کے نزدیک ضعیف حدیث کی سند میں تساہل جائز ہے، موضوع میں نہیں''۔

(مختصر في مصطلح الحديث، للسيد الشريف الجرجاني ص۱۸۱)

امام برھان الدین حلبی لکھتے ہیں:

لايخفى أن السير تجمع الصحيحَ والضعيفَ والمرسلَ والمنقطِعَ والمعضلَ والمنكرَ دون الموضوع.

''مخفی نہیں کہ کتب سیرت وتاریخ حدیث صحیح، ضعیف، مرسل، منقطع، معضل اور منکر پر مشتمل ہوتی ہیں ماسوا موضوع کے''۔

(إنسان العيون في سيرة الأمين المأمون ﷺ ج١ ص٣)

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ ابوین کریمین رضی اللہ عنہما کے ایمان کی بحث میں اُن کے دوبارہ زندہ ہونے کی حدیث لائے اور فرمایا: امام سہیلی، امام محب الطبری، امام قرطبی، ابن المنیر، صلاح الصفدی اور ابن ناصر الدین الدمشقی نے اس حدیث کو اس کے مخالف احادیث کی ناسخ قرار دیا ہے:

ولم يبالوا بضعفه، لأن الحديث الضعيف يعمل به في الفضائل والمناقب، وهذه منقبة.

''اور انہوں نے اس حدیث کے ضعف کی پرواہ نہیں کی، اس لیے کہ فضائل ومناقب میں ضعیف حدیث پر عمل کیا جاتا ہے، اور یہ منقبت ہے''۔

(الدرج المنيفة في الأباء الشريفة ضمن مجموعة الرسائل العشر للسيوطي ص٣٢)

ایک اور رسالہ میں امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

ويرون أن ضعف إسناده في هذا المقام مغتفر، وأن إيراد ما ضعف في الفضائل والمناقب معتبر، و قد خرّجت الأئمة في أبواب المناقب ما هو أشد ضعفاً من هذا.

''ان کی رائے میں یہاں اس روایت کی سند کا ضعیف ہونا قابلِ برداشت ہے اور فضائل ومناقب میں ضعیف حدیث کا لانا معتبر مانا گیا ہے، اور بلاشبہ ائمہ نے مناقب کے ابواب میں اس سے بھی شدید تر ضعیف احادیث ذکر کی ہیں''۔

(المقامة السندسية في النسبة المصطفوية ضمن مجموعة الرسائل العشر للسيوطي ص١٠)

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے جو فرمایا کہ شدید ضعیف حدیث بھی ذکر کی گئی، اس کی تائید میں امام سخاوی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تصریح ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

وفي الجملة هو حديث ضعيف جداً يكتب في فضائل الأعمال، وأما كونه موضوعاً فلا.

''خلاصہ یہ ہے کہ یہ حدیث شدید ضعیف ہے، فضائل اعمال میں اسے قبول کیا جائے گا، اور اگر وہ موضوع ہو تو پھر نہیں''۔

(القول البديع للسخاوي ص۴۳۲)

ایک اور رسالہ میں امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نبی کریم ﷺ کی والدہ ماجدہ سیدتنا آمنہ رضی اللہ عنہا کے ایمان کی بحث میں لکھتے ہیں:

وبأن الحديث الوارد في أن الله أحياها له ليس بموضوع كما ادعاه جماعة من الحفاظ، بل هو من قسم الضعيف الذي يتسامح بروايته في الفضائل.

''اور وہ جو حدیث وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی خاطر آپ کی والدہ کو زندہ فرمایا، وہ موضوع نہیں جیسا کہ حفاظِ حدیث کی ایک جماعت نے دعویٰ کیا بلکہ وہ ضعیف ہے، فضائل میں ایسی روایت میں نرمی کی جاتی ہے''۔

(التعظيم والمنة من مجموعة: الرسائل العشر للسيوطي ص۱۱۹)

ایک اور مقام پر امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے کبار محدثین سے حدیث ضعیف پر عمل کرنا مستحب ثابت فرمایا ہے، چنانچہ وہ تلقینِ میت اور بعد از انتقال کئی دن تک طعام کھلانے کی بحث میں مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

التلقين لم يثبت فيه حديث صحيح ولا حسن، بل حديثه ضعيف باتفاق المحدثين، ولهذا ذهب جمهور الأمة إلىٰ أن التلقين بدعة، وآخر من أفتى بذلك الشيخ عزالدين بن عبد السلام، وإنما استحبه ابن الصلاح وتبعه النووي نظراً إلىٰ أن الحديث الضعيف يتسامح به في فضائل الأعمال.

''تلقینِ میت کے بارے میں کوئی صحیح اور حسن حدیث ثابت نہیں ہے بلکہ اس میں ایک ضعیف حدیث ہے، اسی لیے جمہور امت نے تلقین کو بدعت کہا ہے، اور آخری شخص جس نے یہ فتویٰ دیا شیخ عزالدین بن عبدالسلام ہیں، اور اس تلقین کو امام ابن الصلاح اور اُن کی پیروی میں امام نووی نے مستحب قرار دیا ہے، اس بنا پر کہ فضائل اعمال میں ضعیف حدیث میں نرمی کی جاتی

ہے"۔

(طلوع الثريا بإظهار ما كان خفيا،من:الحاوي للفتاوي ج٢ص١٩١وط:ص٥٩٨)

ملا علی قاری علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں:

والضعيف يعمل به في فضائل الأعمال اتفاقاً.

"فضائلِ اعمال میں ضعیف حدیث پرعمل کرنے میں اتفاق ہے"۔

(الأسرار المرفوعة في الأخبار الموضوعة ص٢٠٩،حديث٨٢٨)

علمِ اصولِ حدیث کے نامور محدث امام نووی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

قال العلماء من المحدثين والفقهاء وغيرهم: يجوز ويستحب العمل في الفضائل والترغيب والترهيب بالحديث الضعيف مالم يكن موضوعاً.

"محدثین،فقہاء اوردوسرے علماء کرام نے فرمایا ہے:فضائل اورترغیب وترہیب میں حدیث ضعیف پرعمل کرنا جائز اورمستحب ہے جبکہ وہ موضوع نہ ہو"۔

(الأذكار للنووي ص٣٥؛القول البديع للسخاوي ص٤٧٢)

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اورمقام میں لکھا ہے:

ويجوزُ عند أهلِ الحديثِ وغيرهم التساهلُ في الأسانيدِ وروايةِ ماسوى الموضوع مِنَ الضعيف والعملُ به مِنْ غيرِ بيانِ ضعفه في غير صفات اللّٰهِ تعالىٰ والأحكام، كالحلالِ والحرامِ ،ومما لا تعلقَ له بالعقائدِ والأحكام.

"محدثین اوردوسرے علماء کے نزدیک سند میں نرمی اورموضوع حدیث کے علاوہ ضعیف حدیث کی روایت اوراس کے ضعف کی توضیح کے بغیر اس پرعمل جائز ہے،بشرطیکہ وہ صفاتِ الٰہیہ، احکام یعنی حلال وحرام کے بارے میں نہ ہو،اورنہ ہی اس کا عقائد واحکام سے تعلق ہو"۔

(التقريب والتيسير لأحاديث البشير النذير للنووي ص٢٠٣)

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ محدثین،فقہاء اوردوسرے علماء کرام کے نزدیک ضعیف حدیث پرعمل جائز ومستحب ہے۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون علماء کرام ہیں؟ یہ معلوم کرنے کے لیے سطورِ ذیل میں غور فرمائیے!

امام سیوطی امام نووی رحمۃ اللہ علیہما کے کلام کی تشریح میں لکھتے ہیں:

ومما نقل عنه ذلک: ابن حنبل، وابن مهدي وابن المبارک، قالوا:
إذا روينا في الحلال والحرام شددنا،وإذا روينا في الفضائل ونحوها تساهلنا.

”یہ مذہب جن محدثین سے نقل کیا گیا ہے وہ امام احمد بن حنبل، ابن مھدی اور امام ابن المبارک ہیں، انہوں نے فرمایا ہے: جب ہم حلال وحرام میں روایت کرتے ہیں تو سختی کرتے ہیں اور جب ہم فضائل اور ان جیسے دوسرے امور میں روایت کرتے ہیں تو نرمی کرتے ہیں“۔

(تدريب الراوي في شرح تقريب النواوي للسيوطي ج١ ص ٣٥٠، ٣٥١)

احادیث احکام کی اسناد میں تشدد اور احادیث فضائل وغیرہ میں تساہل پر کلام کرتے ہوئے امام سخاوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”یہ تساہل اور تشدد امام عبدالرحمان بن مھدی اور دوسرے ائمہ سے منقول ہے، مثلاً امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، ابن المبارک، سفیان ثوری، اور سفیان بن عیینہ، جیسا کہ امام ابواحمد بن عدی نے اپنی ”الكامل في ضعفاء الرجال“ میں اور خطیب بغدادی نے ”الکفایة“ میں اس پر باب قائم فرمایا ہے“۔

(فتح المغيث شرح ألفية الحديث للسخاوي ج١ ص ٣١٢، وط: ج٢ ص ١٥١، ١٥٢؛ شرح علل الترمذي لابن رجب ص ٧٦؛ الكامل في ضعفاء الرجال ج١ ص ٢٥٧)

امام حاکم، اُن کے شاگرد امام بیہقی اور امام سخاوی رحمۃ اللہ علیہم لکھتے ہیں:

”میں نے ابوزکریا عنبری کو سنا، انہوں نے بیان کیا کہ مجھے امام محمد بن اسحاق بن ابراہیم حنظلی (امام بخاری کے شیخ) نے بیان کیا کہ مجھے میرے ابا نے محدث عبدالرحمان بن مھدی سے روایت کیا کہ وہ فرمایا کرتے تھے: جب ہم ثواب وعذاب اور فضائل اعمال میں روایت کرتے ہیں تو سندوں میں نرمی کرتے ہیں اور راویوں میں نرمی کرتے ہیں، اور جب ہم حلال وحرام اور احکام کی احادیث روایت کرتے ہیں تو سند میں سختی کرتے ہیں اور راویوں پر جرح کرتے ہیں“۔

(المدخل إلىٰ كتاب الإكليل للحاكم ص ٢٥؛ المدخل في أصول الحديث للحاكم ١٧؛ المدخل إلى دلائل النبوة للبيهقي ج١ ص ٣٤؛ فتح المغيث ج٢ ص ١٥٢)

خطیب بغدادی نے ”الكفاية في علم الرواية“ میں اس پر ایک مستقل باب قائم کیا ہے اور اُس میں

یہ مذکورہ بالا قول بھی لائے ہیں:

(الكفاية في علم الرواية ص ١٢٤)

امام مجد الدین ابو السعادات مبارک بن محمد بن اثیر الجزری رحمۃ اللہ علیہ نے یہی بات امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے نقل فرمائی ہے:

(مقدمة جامع الأصول ج١ ص ٥٩)

امام ابو عمر یوسف بن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

أهل العلم بجماعتهم يتساهلون في الفضائل فيروونها عن كل، وإنما يتشددون في أحاديث الأحكام.

"محدثین حضرات فضائل میں نرمی کرتے ہیں تو ہر ایک سے روایت کرتے ہیں، البتہ وہ احکام کی احادیث میں سختی کرتے ہیں"۔

(جامع بيان العلم وفضله ج١ ص ١٠٣)

"فيروونها عن كل" کا مطلب یہ ہے کہ ضعیف اور متروک وغیرہ سے روایت کر لیتے ہیں اور مکمل چھان پھٹک ضروری نہیں سمجھتے، یہ مطلب نہیں کہ ہر کذاب شخص سے بھی روایت لے لیتے ہیں۔ چنانچہ امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

قلت: لهذا أكثر الأئمة على التشديد في أحاديث الأحكام، والترخيص في القليل، لا كل الترخص في الفضائل والرقائق فيقبلون في ماضعف إسناده، لا ما اتهم رواته.

"میں کہتا ہوں: اسی لیے اکثر ائمہ احکام کی احادیث میں سختی پر قائم ہیں، اور فضائل کی احادیث میں مکمل نہیں بلکہ تھوڑی سی نرمی کرتے ہیں، سو وہ ان احادیث کو قبول کر لیتے ہیں جن کی سند میں ضعف ہو، اُسے قبول نہیں کرتے جس کی سند میں تہمت زدہ راوی ہوں"۔

(سير أعلام النبلاء ج٨ ص ٥٢٠)

اس سے زیادہ واضح یہ عبارت ہے، حافظ ابن رجب حنبلی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وإنما يروىٰ في الترغيب والترهيب والزهد والآداب أحاديث أهل

الغفلة الذين لایتهمون بالكذب، فاما أهل التهمة فيطرح حديثهم.

"ترغیب وترہیب، زھد اور آداب میں فقط اُن اہل غفلت کی احادیث روایت کی جاتی ہیں جو کذب کی تہمت سے بری ہوں اور جو تہمت زدہ ہوں اُن کی احادیث کو مسترد کر دیا جاتا ہے"۔

(شرح علل الترمذي لابن رجب حنبلي ج ١ ص ٧٤، وط: ص ٧٧)

سند ضعیف اور حدیث ضعیف میں فرق

یہاں ایک بات یہ بھی مدنظر رہے کہ کبھی کہا جاتا ہے: "هذا حديث ضعيف" (یہ حدیث ضعیف ہے) اور کبھی کہا جاتا ہے: "إسناده ضعيف" (اس کی سند ضعیف ہے) یہ دونوں حکم برابر نہیں بلکہ ان میں سے پہلے حکم کی بہ نسبت دوسرے حکم میں نرمی ہوتی ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی اور امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں:

قولهم ضعيف الإسناد أسهل من قولهم ضعيف.

"محدثین کا ضعیف السند کہنا ان کے فقط ضعیف کہنے کی بہ نسبت نرم ہوتا ہے"۔

(النكت للعسقلاني ص ١٧١؛ البحر الذي زخر للسيوطي ج ٣ ص ١٣١٤)

اور زیر بحث حدیث "لحمه لحمي" ضعیف نہیں بلکہ اس کی سند ضعیف ہے، چونکہ کہا گیا ہے کہ اس کی سند میں حسین بن حسن ایک ضعیف شخص ہے۔ لہٰذا محض سند کے ضعف کی وجہ سے سخت حکم لگانا تعنّت [بلاوجہ تشدد] ہے، اور یہ معتدل حضرات سے بعید ہے۔

حدیث "لحمه لحمي" کی معنویت

جب ثابت ہو گیا کہ زیر بحث حدیث کی سند کا فقط ایک راوی ضعیف ہے تو جان لیجئے کہ جب کوئی حدیث معنیً درست ہو تو سند کا ضعف اس کے معنیٰ میں مانع نہیں ہوتا۔ چنانچہ مشہور ترین محدث امام ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ ایک حدیث کی سند کے ضعف پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

و رُبَّ حديث ضعيف الإسناد صحيح المعنىٰ.

"بسا اوقات ضعیف السند حدیث صحیح المعنیٰ ہوتی ہے"۔

(التمهيد ج ١ ص ٤٨، وط: ج ١ ص ٥٨؛ مقدمة فتح البر عبد البر ص ٦٤)

اسی قاعدہ کی رو سے دیکھا جائے تو حدیث "لحمه لحمي و دمه دمي" معنی سیدنا علی المرتضیٰ ؑ کی شان میں مکمل طور پر صادق آتی ہے۔ مثلاً:

- حسی اور مادی لحاظ سے نبی کریم ﷺ اور سیدنا علی ؑ دونوں ہاشمی اور مطلبی خون ہیں اور سگے چچا زاد ہیں، لہذا خود سوچئے کہ دو سگے کزن کا خون ایک ہوتا ہے یا نہیں؟ پھر ساتھ ہی ساتھ اسی حدیث کے اگلے الفاظ "هو مني بمنزلة هارون من موسىٰ إلا أنه لا نبي بعدي. (اس کا مرتبہ میرے ساتھ ایسا ہے جیسا ہارون ؑ کا موسیٰ ؑ کے ساتھ، بجز اِس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا) میں بھی اگر آپ غور فرمائیں گے تو یہ معنویت مزید نکھر کر سامنے آجائے گی۔
- ایمانی، روحانی اور معنوی لحاظ سے بھی سیدنا علی المرتضیٰ ؑ پر یہ حدیث صادق آتی ہے کیونکہ وہ محبتِ نبوی ﷺ میں فنا تھے، حتیٰ کہ فرماتے تھے کہ سخت پیاس کے وقت پانی سے جو قدرتی محبت ہوتی ہے ہمیں حضور ﷺ سے اس سے بھی زیادہ محبت تھی، اور ایسی ہی محبت نبی کریم ﷺ کو سیدنا علی ؑ سے تھی، حتیٰ کہ آپ ﷺ دعا فرماتے تھے:

اللهم لا تمتني حتى تريني علياً.

"یا اللہ! مجھے علی کا دیدار کرائے بغیر مت اُٹھانا"۔

(جامع الترمذي ج٦ ص٩٥، حديث٣٧٣٧؛ تحفة الأحوذي ج١٠ ص٢٢٥ حديث٣٧٤٦؛ تاريخ دمشق ج٤٢ ص٣٣٧؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٧ ص٣٨٥؛ مصابيح السنة ج٤ ص١٧٦ حديث ٤٧٧٥؛ جامع الأصول ج٦ ص٣٢٠ حديث ٦٥١٠؛ البداية والنهاية ج٧ ص٥٨٨؛ مشكوة ج٢ ص٥٠٥ حديث٦٠٩٩)

ان دونوں معنوں کی تائید کے لیے بار بار اُس حدیثِ نبوی ﷺ میں غور فرمایئے جو "[علىٌّ] كَنَفْسِيْ" ([علی] میری جان کی مانند ہے) کے الفاظ کے ساتھ چند صفحات پہلے گذر چکی ہے۔





پہلے شِفاء پھر لِوَاء

﴿۲۷﴾ واخبرنا غير واحد من الثقات مشافهة عن أحمد بن هبة الله الدمشقي وغيره قال: ابانا أبو روح عبد المعز بن محمد الهروي قال:أنا زاهر بن طاهر قال:أنا أبوسعيد بن عبد الرحمان قال:أنا أبوعمرو محمد بن أحمد الحيري، قال:ثنا أبوبكر يعلىٰ الموصلي، ثنا جرير، عن مغيرة، عن أم موسىٰ قالت:سمعتُ عليّاً ﷺ يقول:ما رمدت ولا صدعت منذ مسح رسول الله ﷺ وجهي وتفل في عيني يوم خيبر وأعطاني الراية.

﴿۲۷﴾ حضرت ام موسیٰ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے سیدنا علی ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: جب سے رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے دن میرے چہرہ پر دستِ اقدس پھیرا، میری آنکھوں میں لعاب لگایا اور مجھے پرچم عطا فرمایا تب سے میں دردِ سر اور آشوبِ چشم میں مبتلا نہیں ہوا۔

(مسند أبي يعلىٰ ج١ ص ٢٦٥، حديث ٥٨٩، وط:ج١ ص ٤٤٥، حديث ٥٩٣؛ مسند الطيالسي ص ٢٦، حديث ١٨٩، وط:ج١ ص ١٠٥، حديث ١٨٥، وط:ج١ ص ١٥٦، حديث ١٨٥؛ مسند أحمد ج ١ ص ٧٨، حديث ٥٧٩، وط:ج٢ ص ١٩، حديث ٥٧٩؛ فضائل الصحابة ج٢ ص ٧١٥، حديث ٩٨٠؛ أمالي للمحاملي ص ١٧٠، حديث ١٣٩؛ تهذيب الآثار ج١ ص ٤٢٢، حديث ١٧١٢، وط: ج ٤ ص ١٦٨، حديث ١٢؛ مجمع الزوائد ج٩ ص ١٢٢، حديث ١٤٧٠٦؛ إتحاف للبوصيري ج ٩ ص ٢٤٥، حديث ٨٩١٠؛ البداية والنهاية ج١١ ص ٤٧)

عجیب فضلِ الٰہی

ذرا ذاتِ مرتضوی پر انعام و فضلِ باری تو ملاحظہ فرمایئے! تندرست حضرات رات بھر سے منتظر ہیں اور گردنیں بلند فرما کر اپنا چہرہ حضور ﷺ کے سامنے کرنے میں کوشاں ہیں تا کہ یہ پرچم محبت و فتح انہیں ملے لیکن عطا اُسے ہوا جو سامنے نہیں تھا، تندرست نہیں تھا اور منتظر بھی نہیں تھا، پہلے اُس کا ہاتھ تھام کر لایا گیا، پھر اُسے لعاب و لمس سے شفایاب فرمایا گیا پھر اُسے پرچمِ محبوبیت تھمایا گیا۔ یہاں قارئین کرام بتلائیں کہ کسی بھی شخصیت کے بارے میں پہلے نظریہ بنالینا پھر دلائل ڈھونڈنے کے درپے ہونے کا انداز درست ہے یا جس طرف دلائل لے جائیں اُسی طرف چلے جانا درست ہے؟ سو خالی الذہن ہو کر ذرا غور تو فرمایئے کہ ایک دن قبل کسی شخص کو جس عظیم الشان پرچم

کے عطا کرنے کا اعلان کیا گیا تھا کیا وہ اپنی جسمانی صحت کے لحاظ سے تندرست تھا؟ نہیں، پھر کیا وجہ تھی کہ پہلے اُسے تندرست کیا گیا پھر اُسے پرچم دیا گیا، اور کیوں نہ وہ پرچم پہلے سے نارمل اور تندرست لوگوں کو دیا گیا؟ اس کا جواب اس کے سوا کیا ہے کہ یوں کہا جائے: ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ.

اسی طرح اس میں بھی غور فرماتے چلئے کہ کونین میں سب خواتین سے افضل واعلیٰ خاتون کے رشتے کا معاملہ بارگاہِ الٰہی میں طے ہونے لگا تو جلیل القدر اور متمول حضرات باوجود التماس و درخواست کے رہ گئے اور جو رجوع کرنے میں ہچکچا رہا تھا، جس کے پاس شادی، ولیمہ حتیٰ کہ حق مہر کی استطاعت بھی نہیں تھی، اُس کا انتظار ہو رہا تھا۔ یہ سب کیا ہے؟ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ.

اسی طرح غور فرمایئے کہ ایک بھنا ہوا پرندہ دسترخوانِ نبوی ﷺ پر رکھا ہوا ہے اور ہاتھ بلند ہیں کہ پروردگار اُس کو میرے پاس بھیج دے جو تجھے اور مجھے پوری مخلوق سے زیادہ محبوب ہو، اِدھر دعا ہو رہی تھی اور اُدھر حضرت انس رضی اللہ عنہ آنے والوں کو واپس بھیج رہے تھے، بالآخر نہ اُن کی آرزو پوری ہوئی اور نہ کسی اور کی، آئے تو علی مرتضیٰ آئے، آئے تو "یُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيُحِبُّهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ" کا مصداق محبوبِ خدا و مصطفیٰ آئے۔ ایمان سے بتلایئے! یہ سب کیا ہے؟ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ. اگر یہ سب کچھ فضلِ الٰہی ہے تو مان لیجئے، ماننے میں ہی ایمان کی سلامتی ہے۔





فاروق اعظم ﷺ کا علی المرتضیٰ ﷺ پر رشک

﴿۲۸﴾ أخبرتنا الشيخة أم محمد ست العرب، ابنة محمد بن علي بن أحمد المقدسية فيما شافهتني به، قالت: أخبرنا جدي المذكور عن أبي سعد الصفار، أخبرنا أبو القاسم الشحامي، أخبرنا أبوبكر الحافظ، أخبرنا أبوعبد الله بن البيع الحافظ، أخبرنا الحسن بن محمد بن إسحاق الإسفرائيني، حدثني أبوالحسن محمد بن أحمد بن البراء، حدثنا علي بن عبد الله بن جعفر المديني، حدثني أبي أخبرني سهيل ابن أبي صالح عن أبيه، عن أبي هريرة ﷺ، قال:

قال عمر بن الخطاب ﷺ: لقد أعطي علي بن أبي طالب ثلاث خصال لأن يكون فيّ خصلة منهن أحب إليّ من أن أعطى حمر النعم، قيل: وماهن؟ قال: تزوجه فاطمة بنت رسول الله ﷺ، وسكناه بالمسجد مع رسول الله ﷺ يحل له فيه مايحل له، والراية يوم خيبر.

أخرجه الحاكم في صحيحه وقال: صحيح الإسناد ولم يخرجاه.

﴿۲۸﴾ حضرت ابوہریرہ ﷺ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا عمر بن الخطاب ﷺ نے فرمایا: سیدنا علی بن ابی طالب ﷺ کو تین خوبیاں عطا کی گئیں، اگر ان میں سے کوئی ایک خوبی مجھ میں ہوتی تو وہ مجھے سرخ اونٹوں کے عطا کیے جانے سے زیادہ محبوب ہوتی۔ عرض کیا گیا: وہ کون سی تین خوبیاں ہیں؟ فرمایا:

۱۔ سیدہ فاطمہ بنت رسول صلوات اللہ وسلامہ علیہا کے ساتھ ان کا نکاح،

۲۔ مسجد میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کا ٹھہرنا، جس میں ان کے لیے وہ حلال ہے جو اللہ کے رسول ﷺ کے لیے حلال ہے،

۳۔ اور خیبر کے دن اُنہیں پرچم کا عطا ہونا۔

امام حاکم نے اس حدیث کو روایت کر کے فرمایا: یہ صحیح السند ہے اور امام بخاری اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے اسے روایت نہیں کیا۔

(المستدرك للحاكم ج۳ص ۱۲۴، وط: ج٤ ص ۹٤، حديث ٤٦٨٩، وط: ج۳ ص ۱۳۵، حديث ٤٦٣٢؛ تاريخ دمشق ج٤٢ ص ۱۲۰؛ مختصر تاريخ دمشق ج۱۷ ص ۳۳۵؛ البداية والنهاية ج٥

ص٤٥٤؛ مجمع الزوائد ج٩ ص١٢٠، حديث ١٤٦٩٩، وط: ج٩ ص١١١، حديث ١٤٦٩٩؛ موسوعة العشرة المبشرون بالجنة ج١١ ص٧٦)

عقدِ مرتضٰی مع سیدہ زہراء پر صحابہ کا رشک

زیرِ تشریح حدیث میں سیدنا فاروقِ اعظم نے سیدنا علی المرتضیٰ کی جن تین خصوصیات پر رشک فرمایا ہے اُن میں پہلی خصوصیت سیدۂ کائنات علیہا السلام کا عقدِ مرتضوی میں آنا ہے، اور اس خصوصیت پر فقط فاروقِ اعظم نے ہی نہیں بلکہ دوسرے صحابہ کرام نے بھی رشک کیا ہے۔ خود فاروقِ اعظم کے فرزند حضرت عبد اللہ بن عمر کے نزدیک بھی یہ بات قابلِ رشک تھی۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

كنا نقولُ في زمنِ النبي : رسولُ اللهِ خيرُ الناس، ثم أبو بكر، ثم عمر، ولقد أُوتي ابنُ أبي طالب ثلاث خِصَال، لأن تكونَ لي واحِدَةٌ منهنّ أحبُّ إليَّ من حُمُرِ النَّعَم: زَوَّجَهُ رَسُوْلُ اللهِ ابنتَهُ وَوَلَدَتْ له، وسدَّ الأبوابَ إلا بابَهُ في المسجد، وأعطاهُ الرايةَ يومَ خَيْبَر.

"ہم رسول اللہ کے زمانہ میں کہتے تھے کہ لوگوں میں سب سے بہتر رسول اللہ ہیں، پھر حضرت ابوبکر پھر حضرت عمر اور حضرت علی بن ابی طالب کو تین خوبیاں عطا ہوئیں، مجھے اگر ان میں سے کوئی ایک خوبی حاصل ہوتی تو وہ مجھے سرخ اونٹوں کے عطا ہونے سے زیادہ محبوب ہوتی:

١۔ رسول اللہ نے اپنی لختِ جگر اُن کے نکاح میں دی اور انہوں نے اُن کے لیے اولاد جنم دی،

٢۔ آپ نے مسجد کی طرف کھلنے والے تمام دروازے بند کرا دیئے ماسوا اُن کے دروازہ کے،

٣۔ اور خیبر کے دن اُنہیں پرچم عطا فرمایا۔

(مسند أحمد ج٢ ص٢٦، وط: ج٢ ص٢٨١، حديث ٤٧٩٧، وط: ج٨ ص٤١٧، حديث ٤٧٩٧؛ فضائل الصحابة ج٢ ص٧٧٠، حديث ٩٥٥؛ المصنَّف لابن أبي شيبة ج١٢ ص٧٠، وط: ج١٧ ص

١١٤، حديث ٣٢٧٦٢، وط: ج١٠ ص٤٨٨، حديث ٣٢٦٩٧؛ كتاب السنة لابن أبي عاصم ص ٨٠٥، ٨٠٦، حديث ١٢٣٣؛ شرح مشكل الآثار ج٩ ص١٨٩، حديث ٣٥٦٠؛ مسند أبي يعلىٰ ج٥ ص١٠٢، حديث ٥٥٧٥، وط: ج٩ ص٤٥٢، حديث ٥٦٠١؛ تاريخ دمشق ج٤٢ ص ١٢١، ١٢٢؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٧ ص٣٣٥؛ إتحاف الخيرة المهرة ج٧ ص١٥٥، حديث ٦٥٥٦؛ مجمع الزوائد ج ٩ ص١٢٠، حديث ١٤٦٩٨، وط: ج٩ ص ١١١، حديث ١٤٦٩٨؛ در السحابة للشوكاني ص ٢١٨)

حافظ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"اس حدیث کو امام احمد اور امام ابو یعلیٰ نے روایت کیا ہے اور ان دونوں کے راوی صحیح حدیث کے راوی ہیں"۔

(مجمع الزوائد ج٩ ص١٢٠، وط: ج٩ ص١٦٠، حدیث ١٤٦٩٨، وط: ج٩ ص ١١١، حدیث ١٤٦٩٨، وط: ج١٨ ص٢٦٨، حدیث ١٤٧٠٠)

عشرہ مبشرہ میں مشہور صحابی حضرت سیدنا سعد بن ابی وقاص ﷺ بھی اس خصوصیت پر رشک فرماتے تھے۔ چنانچہ ایک حدیث میں انہوں نے سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کی دوسری خصوصیات کے ساتھ ایک خصوصیت یہ بھی بیان فرمائی:

ولأن أكون صهره على ابنته ولي منها من الولد ماله أحب إلي من أن يكون لي ما طلعت عليه الشمس.

"اور اگر مجھے حضور اکرم ﷺ کے داماد ہونے کی سعادت حاصل ہوتی اور آپ کی لختِ جگر سے میری اولاد ہوتی تو یہ سعادت مجھے روئے زمین کی تمام اشیاء سے زیادہ محبوب ہوتی"۔

(تاريخ دمشق ج٤٢ ص١١٩؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٧ ص ٣٣٥؛ البداية والنهاية ج٥ ص٥٣، وط: ج٧ ص٥٦٥، وط: ج١١ ص٥١)

عقدِ مرتضیٰ مع سیدہ زہراء پر رشک کی وجہ؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اِن جلیل القدر صحابہ کرام ﷺ نے اس قدر رشک کیوں کیا؟ سیدنا عثمان بن عفان

ﷺ کے نکاح میں خاتم النبیین ﷺ کی ایک نہیں بلکہ یکے بعد دیگرے دو بیٹیاں آئی تھیں، ایسا رشک اُن پر کیوں نہیں کیا گیا؟ اس کی تمام حکمتیں تو اللہ ﷻ جانتا ہے لیکن ہمیں جو احادیث مبارکہ کی روشنی میں بات سمجھ آئی ہے وہ یہ ہے کہ سیدتنا فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کو اپنی بہنوں پر کئی وجوہ سے افضلیت حاصل تھی، اُن میں سے تین واضح وجوہ یہ ہیں:

ا۔ سیدۂ کائنات علیہا السلام صورتاً اور سیرتاً ہر لحاظ سے اپنے بابا کریم ﷺ کے اس قدر مشابہ تھیں کہ اتنا کوئی دوسرا انسان مشابہ نہیں تھا۔ چنانچہ امام ترمذیؒ اُمّ المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ اُنہوں نے فرمایا:

ما رأيت أحداً أشبه سمتاً ودلاًّ وهدياً برسول اللهﷺ في قيامها وقعودها من فاطمة بنتِ رسول الله ﷺ قالت: وكانت إذا دخلت على النبي ﷺ قام إليها فقبّلها وأجلسها في مجلسه، وكان النبي ﷺ إذا دخل عليها قامت من مجلسها فقبّلته وأجلسَتْه في مجلسها.

"میں نے کسی کو راہِ راست پر قائم ہونے، ہیئت، حالت اور سیرت کے لحاظ سے اُٹھتے بیٹھتے سیدہ فاطمہ بنتِ رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر حضور اکرم ﷺ کے مشابہ نہیں دیکھا۔ فرمایا: جب بھی وہ بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوتیں تو نبی کریم ﷺ ان کے لیے کھڑے ہو جاتے، پھر اُنہیں بوسہ دیتے اور اُنہیں اپنی جگہ پر بٹھاتے اور جب حضور ﷺ اُن کے ہاں تشریف لاتے تو وہ آپ کے لیے کھڑی ہو جاتیں پھر آپ کو چومتیں اور اپنی جگہ پر بٹھاتیں"۔

(سنن الترمذي ص ٨٧٤، حديث ٣٨٧٢؛ سنن أبي داود ج٤ ص ٤٥٨، حديث ٥٢١٧؛ السنن الكبرىٰ للنسائي ج٧ ص ٣٩٣، حديث ٨٣١١؛ صحيح ابن حبان ج١٥ ص ٤٠٣، حديث ٦٩٥٣؛ الأدب المفرد ج٢ ص ٥١٩، حديث ٩٧١؛ المستدرك للحاكم ج٣ ص ١٥٢، حديث ٤٧٨٥ وص ١٥٩، حديث ٤٨٠٧؛ فضائل فاطمة الزهراء للحاكم ص ١٢٣؛ السنن الكبرىٰ للبيهقي ج ٧ ص ١٠١، حديث ١٣٥٧٨؛ شعب الإيمان للبيهقي ج٦ ص ٤٦٧، حديث ٨٩٢٧؛ الجامع لشعب الإيمان ج ١١ ص ٢٧٠، حديث ٨٥٢٩؛ الآداب للبيهقي ص ١٩١، حديث ٣١٨؛ المهذب في اختصار السنن الكبير [للبيهقي] للذهبي ج٥ ص ٤٩١، حديث ١٠٨٧٩؛ سبل الهدىٰ ج ١١ ص ٤٤ و٤٦)

اسی لیے سیدہ حضور ﷺ کو سب سے زیادہ محبوب تھیں۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سیدہ کو پوری مخلوق کی خواتین پر سیادت بخشی گئی اور یہ اعزاز کسی دوسری صاحبزادی کو نہیں ملا۔

۳۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ خالق کائنات ﷻ نے ذریتِ نبوی ﷺ کا سلسلہ سیدۂ کائنات سے ہی چلایا، دوسری کسی صاحبزادی سے اولاد کا سلسلہ نہیں چلا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں اس حکمت کو صراحتاً بیان کیا گیا ہے، چنانچہ پہلے تو فرمایا: ''زَوَّجَهُ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ ابنتهٗ'' (رسول اللہ ﷺ نے اپنی لختِ جگر اُن کے نکاح میں دی) پھر فرمایا: '' وَوَلَدَتْ لَهٗ'' (اور انہوں نے اُن کے لیے اولاد جنم دی) حضرت سعد بن ابی وقاص ﷺ کی حدیث میں بھی یہ الفاظ موجود ہیں، اور یہ اتنی بڑی فضیلت ہے کہ کائنات میں اتنی بڑی فضیلت کی حامل دوسری کوئی چیز نہیں، ماسوا قرآن کے۔ اب ساری مخلوق کی حتمی ضمانت اِن ہی دو چیزوں یعنی قرآن اور اہل بیت کے تمسک (تھامنے) میں ہے، اسی لیے قرآن کریم کے ساتھ اہل بیت کو باقی رکھا گیا ہے۔

نکتہ

بعض احباب نے مجھے بعض نامور مقررین کی تقریر کی [DVD] سننے کی ترغیب دی، اُس میں وہ مقرر بیان فرما رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے قرآن کریم کے ساتھ اہل بیت کو چھوڑا، صحابہ کرام ﷺ کو کیوں نہیں چھوڑا؟ پھر خود ہی جواب دیا: اس لیے کہ صحابی کسی دوسرے کو صحابی نہیں بنا سکتا اور جو خود صحابی ہے وہ اپنی حیات تک صحابی ہے اُس کی وجہ سے کوئی دوسرا شخص صحابی نہیں بن سکتا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ قرآن کریم کے ساتھ ایسی چیز کو باقی رکھا جائے جو قیامت تک قرآن کریم کے ساتھ رہے، لہٰذا اُس نے خونِ مصطفیٰ یعنی اہل بیت کرام علیہم السلام کو باقی رکھا۔

راقم عرض کرتا ہے کہ یہ اچھا نکتہ ہے لیکن اس سے عام ذہن میں یہ تأثر ابھرتا ہے کہ شاید اہل بیت کرام فقط بعد کے لوگوں کی ہدایت کے لیے لازم ہیں، حالانکہ ایسی بات نہیں بلکہ جس طرح قرآن کریم بعد والوں اور صحابہ کرام ﷺ کی ہدایت کے لیے برابر لازم ہے، اسی طرح اہل بیت کرام علیہم السلام بھی بعد والوں اور صحابہ کرام ﷺ سب کی ہدایت کے لیے برابر لازم ہیں، دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ:

❁ ''إني تارك فيكم الثقلين'' (میں تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑ رہا ہوں) کا خطاب فقط بعد والوں

سے نہیں بلکہ صحابہ کرام ﷡ سے بھی ہے۔

❁ "احبوا أهل بيتي بحبي" (میری خاطر میرے اہل بیت سے محبت کرو) کے فقط بعد والے ہی مخاطب نہیں بلکہ صحابہ کرام ﷡ اس کے اولین مخاطب ہیں۔

❁ أَدِّبُوا أولادَكُم ، الخ یعنی تین باتوں میں اپنی اولاد کی تربیت کرو: اپنے نبی کی محبت، اس کے اہل بیت کی محبت اور تلاوتِ قرآن۔ ان جیسے تمام احکامات کے فقط بعد والے ہی پابند نہیں بلکہ صحابہ کرام ﷡ بھی پابند تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے ساتھ جس دوسرے "الثقل الأكبر" کی محبت میں ہدایت کی حتمی ضمانت ہے وہ ثقلِ اکبر مصطفیٰ ﷺ کی ذریت ہے، جو فقط سیدۂ کائنات کے مقدس وجود سے ظہور پذیر ہوئی، اور جن کے سرتاج بننے کا شرف سیدنا علی المرتضیٰ ﷜ کو حاصل ہوا۔ اس لیے سیدنا فاروقِ اعظم سمیت تمام صحابہ کرام ﷡ نے اس افضلیتِ عظمیٰ اور خصوصیتِ علیا پر جتنا رشک کیا وہ حق ہے۔

مصطفیٰ و مرتضیٰ علیہما السلام کی ایک خصوصیت

حدیث نمبر [۲۸] میں سیدنا فاروقِ اعظم عمر بن خطاب ﷜ کا رشک آمیز دوسرا جملہ یہ ہے:

وسكناه بالمسجد مع رسولِ الله ﷺ يحل له فيه ما يحل له.

"مسجد میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کا ٹھہرنا، جس میں ان کے لیے وہ جائز ہے جو اللہ کے رسول ﷺ کے لیے جائز ہے"۔

اس میں سیدنا فاروقِ اعظم ﷜ نے سیدنا علی المرتضیٰ ﷜ کی اُس مخصوص اور عطائی طہارت کی طرف اشارہ فرمایا ہے جسے کسب اور ریاضت ومحنت سے حاصل کرنا ممکن نہیں۔ اس کی پوری تفصیل کے لیے راقم الحروف کی کتاب "شرح خصائص علي ﷜" حدیث نمبر ۴۲ کی تشریح ملاحظہ فرمائیں۔

سیدنا علی ﷜ کے أَزْكىٰ ہونے کی وجہ

آپ جان چکے ہیں کہ سیدنا عمر ﷜ نے سیدنا علی ﷜ کی اِس دوسری خصوصیت پر رشک فرمایا ہے اور کہا ہے کہ اگر انہیں یہ فضیلت حاصل ہوتی تو وہ اُن کو سرخ اونٹوں کے ملنے سے زیادہ محبوب ہوتی۔ اس سے یہ پہلو تو ظاہر ہے کہ یہ فضیلت اُن کے اپنے اعلیٰ تصور اور قول کے مطابق انہیں حاصل نہیں تھی، لیکن یہ پہلو مخفی ہے کہ انہیں یہ مقام حاصل کیوں نہیں تھا؟ اگر تاویلات کا سہارا لیا جائے تو یہ سمجھنا سمجھانا بہت مشکل ہے اور اگر خالی الذہن ہو کر قرآن

وسنت میں غور کیا جائے تو اس بات تک رسائی انتہائی آسان ہے۔ یہاں ہمیں اس حکمت کی کئی وجوہ سمجھ آتی ہیں۔

- یہ عطا ہے کیونکہ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ ہاشمی ہیں اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ قریشی ہیں اور ہاشمی خاندان ہر لحاظ سے افضل ہے، جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث اور حضرت جبریل علیہ السلام کا قول اس پر شاہد ہے، اور ظاہر ہے کہ اس افضلیت کا تعلق کسب و محنت اور مال و زر اور ظاہر سے نہیں۔

- سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو پیدا ہوتے ہی آغوشِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حاصل ہو گئی اور اس بات کو تمام کے تمام سیرت نگار حضرات نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر دوسرے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مقابلے میں انعامِ الٰہی قرار دیا ہے، جبکہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو سعادتِ اسلام بہت تاخیر سے حاصل ہوئی حتیٰ کہ وہ کبھر و جوان تھے اور اعلانِ نبوت کے بعد چھٹے سال میں ایمان لائے۔

- سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو اعلانِ نبوت کے دوسرے دن سے نماز کی سعادت حاصل ہو گئی تھی، اور اس سعادت کے متعلق قرآن کریم میں ہے:

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى.

"بیشک اُس نے فلاح پائی جس نے اپنے آپ کو پاک کیا، اور اپنے رب کا نام ذکر کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا"۔

(الأعلیٰ: ۱۴، ۱۵)

جبکہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اعلانِ نبوت کے بعد چھٹے سال میں ایمان لائے۔

- سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو قبل از اعلانِ نبوت کم از کم دس سال اور بعد از اعلانِ نبوت چھ سال، کل سولہ سال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں زیادہ صحبتِ نبوی میسر آئی، اور یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ کسی خالص اللہ والے کی صحبت پتھر یا مٹی کے پیالے کو بھی نصیب ہو جائے تو وہ بھی ذاکر بن جاتا ہے، شیر خوار بچہ ذاکر بن جاتا ہے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ ابھی شیر خوار بچے تھے، پیشاب کے لیے بھی خود نہیں بیٹھ سکتے تھے لیکن اُن کے ماموں حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت کی برکت سے اُن کا قلب ذاکر ہو چکا تھا۔ اُن کی والدہ وقت پر جب انہیں جائے ضرورت پر لیجاتیں اور کپڑا ہٹا کر پیشاب کے لیے بٹھانے لگتیں تو اُن کی زبان پر ذکر جاری ہوتا، اس پر وہ پریشان ہو جاتیں، بالآخر انہوں نے اپنے بھائی حضرت سری سقطی سے گزارش کی تو اُن کی توجہ سے یہ حال

موقوف یا تبدیل ہوا۔ حضرت سیدنا خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ نے تو اپنی والدہ رحمۃ اللہ علیہا کے شکم اطہر میں پندرہ پارے یاد کر لیے تھے۔

(ملفوظات اعلیٰ حضرت ص۳۷۸؛ تاریخ مشائخ چشت لزکریا سہارنپوری ص۱۷۲؛ دلی کے بائیس خواجہ ص۲۲؛ قطب الدین بختیار کاکی ص۱۵،۱۶)

حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے جو عالم شیر خوارگی میں رمضان المبارک کے ایام میں دودھ پینا ترک کر دیا تھا یہ محض صحبت کی برکت تھی۔ آگے آپ خود ہی غور وفکر فرمائیے کہ سیدنا علی مرتضی ؓ پر صحبتِ نبوی ﷺ کی تاثیر کس قدر رہوئی ہوگی!

قرآن کریم میں جتنی بار "یُزَکِّیْکُمْ" اور "یُزَکِّیْهِمْ" آیا ہے اس کے فاعل یعنی تزکیہ کرنے والے رسول اللہ ﷺ ہیں۔ حکم الٰہی کے مطابق آیات الٰہیہ کی تلاوت کے ذریعے لوگوں کا تزکیہ (من پاک) کرنا آپ کا فرضِ منصبی ہے، اور آپ نے روزِ اول سے اس فرض کو نبھانا شروع کر دیا تھا اور سیدتنا خدیجۃ الکبریٰ اور سیدنا علی ؓ کو ساتھ لے کر نماز شروع کر دی تھی، لہٰذا خود سوچئے کہ حضرت عمر ؓ کے اسلام لانے سے قبل سیدنا علی ؓ کو جو چھ سال زیادہ نصیب ہوئے تھے اور وہ شب و روز مُزَکِّیْ ﷺ کی مسلسل صحبت میں رہے تھے، کیا اُن کے اُن اضافی لمحات کی برکات کا کوئی اندازہ کیا جا سکتا ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں! یہ اُن ہی برکات کی تاثیر تھی کہ جب سرورِ عالم ﷺ نے اپنے اقرباء کو دعوتِ توحید دی تو سب نے انکار کر دیا مگر سیدنا علی ؓ نے کم سنی (دس سال کی عمر) میں اس دعوت کو قبول کر لیا تھا۔ یہ کوئی اتفاق یا حادثہ نہیں تھا بلکہ سابقہ صحبتِ نبوی ﷺ کی برکات کی تاثیر تھی۔

"ما ولد فی الإسلام مولود أزکیٰ" کا جائزہ

یہ ہے سیدنا عمر ؓ کے قول کے مطابق اُس خصوصیتِ مرتضوی کا راز جو زیرِ بحث حدیث میں زبانِ فاروقی پر جاری ہوئی، لیکن افسوس کہ اس کے مقابلہ میں بھی ایک حدیث گھڑ لی گئی اور اُسے اب تک چلایا جا رہا ہے۔ چنانچہ شیخ الحدیث والتفسیر سائیں قاسمی لکھتے ہیں:

"مَا وُلِدَ فِی الْاِسْلَامِ مَوْلُوْدٌ اَزْکیٰ وَلَا اَطْهَرَ وَلَا اَفْضَلَ مِنْ اَبِیْ بَکْرٍ وَعُمَرَ یعنی اسلام میں کوئی شخص ابوبکر اور عمر سے پاکیزہ، طاہر اور افضل پیدا نہیں ہوا (دیلمی، ابن عساکر، کنز العمال جلد ۱۱ صفحہ ۲۵۹ اَلْحَدِیْثُ ضَعِیْفٌ) اب بتلائیے خلافت تو بہت بعد کی چیز

ہے، یہ تو مادر زاد افضل ہیں"۔

(ضربِ حیدری ص140)

یہ حدیث کنز العمال کی گیارھویں جلد میں صفحہ ۲۵۹ پر نہیں بلکہ صفحہ ۵۶۷ پر ہے اور اس کا نمبر ۳۲۶۸۵ ہے۔اس حدیث پر پہلا حوالہ دیلمی کا دیا گیا ہے۔ہمارے سامنے دیلمی کے دو نسخے موجود ہیں اور اُن میں اِس کا راوی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ظاہر کیا گیا ہے اور اِن دونوں نسخوں کی تعلیق میں اس حدیث کی جو سند ذکر کی گئی ہے وہ مضطرب ہے، مثلاً ایک نسخہ میں پہلا راوی البصری ہے اور دوسرے نسخے میں ابن البصری ہے، دوسرا راوی عبد الرحمان بن علی الارجی ہے جبکہ دوسرے نسخے میں اس کا نام عبد العزیز بن علی الازجی لکھا ہے، باقی سند دونوں نسخوں میں یوں ہے:

"حدثنا أبو بكر بن عمر بن محمد بن السري بن سهل، حدثنا الحسن بن سوادة، حدثنا محمد بن مسلم العبدي، حدثنا أبو معاوية عن سعد بن طريف عن الأصبغ بن نباتة عن علي بن أبي طالب".

(مسند الفردوس وهو الفردوس بمأثور الخطاب ج٤ ص١١٨، حديث٦٣٦٦، وط: فردوس الأخبار بمأثور الخطاب المخرّج علىٰ كتاب الشهاب ج٤ ص٤٠٤، حديث٦٦٩٧)

اِن راویوں میں سے ابتدائی تین کے حالات تو کیا اُن کے نام بھی "تهذيب التهذيب، ميزان الاعتدال اور "لسان الميزان" میں نہیں مل سکے، شاید کسی دوسری کتاب میں موجود ہوں، البتہ آخری دو راوی سعد بن طریف اور اصبغ بن نباتہ کے حالات "تهذيب التهذيب" میں ہی مل گئے۔ان دونوں کے بارے میں ملا جلا رجحان پایا جاتا ہے اور ایک بات میں دونوں مشترک ہیں کہ دونوں کوفی ہیں اور دونوں پر شیعیت اور رافضیت کا الزام ہے۔پھر سعد بن طریف کو تشیع میں غالی اور مفرط بھی کہا گیا ہے، علاوہ ازیں اس کو متروک الحدیث، منکر الحدیث، ضَعِيفٌ جِدًّا بھی کہا گیا ہے اور ابن حبان نے اس کو حدیث گھڑنے والا بھی کہا ہے۔

(تهذيب التهذيب ج٣ ص٢٨٤)

دوسرے مقام پر حافظ رحمہ اللہ نے سعد بن طریف کے بارے میں خلاصۃً یوں لکھا ہے:

الكوفي، متروك ورماه ابن حبان بالوضع وكان رافضياً من السادسة.

"کوفی ہے، متروک ہے، ابن حبان نے اس پر حدیث گھڑنے کا الزام لگایا ہے اور یہ رافضی

(شیخین کو برا کہنے والا) تھا، چھٹے طبقے سے تھا"۔

(تقریب التهذیب ج۱ ص ۲۰۰ رقم الترجمة ۲۳۱۵)

اصبغ بن نباتہ کے بارے میں سعد بن طریف کے مقابلہ میں اگرچہ کچھ نرم موقف پایا جاتا ہے، تاہم ان کو شیعی، منکر الحدیث اور متروک الحدیث بھی کہا گیا ہے، جوزجانی نے زائغ بھی کہا ہے لیکن کوفیوں کے بارے میں جوزجانی کی جرح کو علماء اصول حدیث نے مسترد کر دیا ہے، ابن عیاش نے اصبغ اور ہیثم کو کذابین سے بھی کہا ہے، لیکن ابن عدی نے اس کے متعلق ایک گُر کی بات لکھی ہے۔ وہ یہ کہ اکثر وہ احادیث جو اس سے حضرت علی ﷺ کے متعلق ہیں اُن میں اس کی متابعت نہیں کی گئی اور اُن میں کھلا ضعف ہوتا ہے، اور جب اس سے کوئی ثقہ شخص روایت کرے تو میرے نزدیک اس روایت میں کوئی حرج نہیں، اعتراض فقط روایت کرنے والے کی جہت سے ہوتا ہے۔ محدث عجلی نے ان کو تابعی اور ثقہ کہا ہے۔

(تهذیب التهذیب ج۱ ص ۳۷۳، ۳۷۴ رقم الترجمة ۵۷۸)

دیانت داری کے تقاضا کے مطابق عام قارئین کرام کے سامنے ہم یہاں یہ اصول بھی بیان کیے دیتے ہیں کہ جب کوئی راوی ایسی حدیث بیان کرے جس سے اس کے مذہب کو تقویت حاصل ہو اور دوسرے کسی معتبر شخص سے وہ حدیث منقول نہ ہو تو اُس کو مسترد کر دیا جائے گا۔ لیکن یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے کہ راوی شیعہ بلکہ رافضی ہیں اور حدیث سیدنا علی کے فضائل میں نہیں بلکہ شیخین کریمین ﷺ کی شان میں ہے، لہٰذا اصولاً یہ حدیث قابلِ قبول ہونی چاہیے، لیکن میں کہتا ہوں: یہ حدیث پھر بھی قابلِ قبول نہیں ہے، کیوں؟ اس کی کئی وجوہ ہیں:

۱۔ اول یہ کہ اس کو کسی چالاک اور کذاب شخص نے گھڑ کر شیعہ اور رافضی راویوں کی سند پر چڑھا دیا ہے تاکہ یہ قابل قبول ہو سکے اور دوسری چالاکی یہ کی ہے کہ اس کا مرکزی راوی سیدنا علی ﷺ کو بنا دیا ہے، اور وہ چالاک شخص مذکورہ مجہول (نامعلوم) راویوں میں سے کوئی بھی ہو سکتا ہے۔

۲۔ دوم یہ کہ شیخین کریمین ﷺ کی ولادت موحدین کے ہاں نہیں ہوئی اور مشرکین نجس ہوتے ہیں لہٰذا اُن کی بہ نسبت ولادۃً اَزکی شخص وہ ہوگا جس کی ولادت موحدین کے ہاں ہوئی۔

۳۔ سوم یہ کہ اس حدیث میں شیخین کریمین ﷺ کو پیدائشی افضل کہا گیا ہے جبکہ ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے منقول حدیث میں جبریل علیہ السلام نے آگاہ کیا تھا کہ بنو ہاشم کے خاندان سے افضل کوئی خاندان نہیں، اور اُس حدیث کے بارے میں امام بیہقی، حافظ ابن حجر عسقلانی، حافظ ابن کثیر، امام سیوطی اور امام قسطلانی

وغیرھم نے کہا ہے کہ اُس پر صحت کے آثار واضح ہیں، جیسا کہ ہم باحوالہ لکھ چکے ہیں، اور اُس کی تائید بخاری، مسلم اور جامع ترمذی کی احادیث سے بھی ہوتی ہے، لہٰذا ان تمام احادیث سے ٹکرانے کی وجہ سے پیر سائیں کی پیش کردہ یہ حدیث فقط موضوع ہی نہیں بلکہ مردود و باطل بھی ہے۔

پرچمِ خیبر کے عطا ہونے پر رشک

اس حدیث میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے رشک آمیز تیسرا جملہ یہ منقول ہے "والراية يوم خيبر" (خیبر کے دن پرچم کا عطا ہونا) ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ ہر جنگ میں پرچمِ نبوی ﷺ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ ہی تھامتے تھے، لہٰذا یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی بلکہ سابقہ معمول کے مطابق تھی، پھر قابلِ رشک کیوں بن گئی؟ اس لیے کہ پرچم خیبر عطا کرنے سے ایک روز قبل ایک انوکھا اعلان ہوا تھا، اُسی اعلان نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سراپا انتظار بنا دیا تھا اور جس خوش نصیب کو بلا انتظار وہ پرچم عطا ہو گیا تھا وہ سب کے نزدیک قابلِ رشک بن گیا تھا۔

مصنف رحمہ اللہ کی دانائی

مصنف امام جزری المقری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ حدیث اس سے قبل کئی سندوں سے خود نبی کریم ﷺ سے نقل فرمائی ہے، اور یہاں آخر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے الفاظ میں لائے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ مجھے اس کی حکمت یہ سمجھ آئی ہے کہ حدیث تو ہر شخص پڑھتا ہے لیکن اُس میں غور کوئی کوئی کرتا ہے۔ سو اگر کوئی شخص ان احادیثِ نبویہ میں پنہاں عظمتِ مرتضوی کو کما حقہ نہیں سمجھ سکا تو اسے چاہیے کہ وہ اس حدیث کو فاروقی دانش کی روشنی میں دیکھے، سعد بن ابی وقاص کی فکر سے پرکھے، ابن عمر کے زاویۂ نگاہ سے دیکھے بلکہ غزوۂ خیبر کے تقریباً سولہ سو [۱۶۰۰] شرکاء کی انتظار کے تناظر میں دیکھے۔





سیدنا علی المرتضیٰ ؓ کی خصوصی مغفرت

﴿۲۹﴾ أخبرنا أبو العباس أحمد بن الطحان المقرئ، شيخنا مشافهة عن محمد بن محمد بن محمد الشيرازي، أخبرنا محمود بن إبراهيم بن مندة الحافظ، في كتابه من أصبهان، أخبرنا محمد بن أبي بكر الحافظ، أخبرنا الشيخ أبو سعد محمد بن الهيثم بن محمد، أخبرنا أبو الحسن ابن أبي القاسم، حدثنا أحمد بن موسىٰ، حدثنا أحمد بن محمد بن السري الكوفي، حدثنا الحسين بن جعفر القرشي، حدثنا جندل بن والق، حدثنا محمد بن عمر الكناسي، عن جعفر بن محمد، عن أبيه، عن علي بن الحسين عن فاطمة الصغرىٰ عن الحسين بن علي رضي الله عنهما، عن فاطمة بنت محمد ﷺ، ورضي عنها، قالت:

خرج علينا رسول الله ﷺ، فقال: إن الله عزّوجلّ باهي بكم فغفر لكم عامة، وغفر لعلي خاصة وإني رسول الله إليكم غير هائب لقومي، ولا محاب لقرابتي، هذا جبريل عليه السلام يخبرني، أن السعيد كل السعيد حق السعيد من أحب علياً في حياتي وبعد وفاتي.

حديث غريب، رواه الحافظ أبو موسىٰ المديني في كتابه (حجة ذوى الصلابة) بهذا الإسناد وهذا اللفظ.

﴿۲۹﴾ سیدتنا فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت محمد صلى الله عليهما وآلهما وسلم بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے ہاں تشریف لائے پھر فرمایا: اللہ ﷻ نے تم پر (اپنی شان کے مطابق) فخر فرمایا، پھر تمہاری عمومی مغفرت فرمائی اور علی کی خصوصی مغفرت فرمائی، اور میں تمہاری طرف اپنی قوم سے خوف کے بغیر اور تم سے اپنی قرابت کی محبت کے بغیر اللہ ﷻ کا پیغام پہنچانے آیا ہوں۔ یہ جبریل علیہ السلام ہیں، انہوں نے مجھے خبر دی ہے کہ سعادت مند، کامل سعادت مند، کما حقہ سعادت مند وہ شخص ہے جس نے میری حیات میں اور میرے وصال کے بعد علی (علیہ السلام) کو محبوب رکھا۔

یہ حدیث غریب ہے، اسے اسی سند اور انہی الفاظ میں حافظ ابو موسیٰ المدینی نے اپنی کتاب "حجة ذوى الصلابة" میں ذکر کیا ہے۔

الفاظِ حدیث کے متعلق ایک وضاحت

اکثر دوسری کتب میں اس حدیث کا آخری جملہ ضمیر متکلم کی بجائے ضمیر غائب سے منقول ہے اور ایک آدھ جملے کا اضافہ بھی ہے، مکمل صورت یوں ہے:

أن السعيد كل السعيد حق السعيد من أحب علياً في حياته وبعد موته، وأن الشقي كل الشقي من أبغض علياً في حياته وبعد وفاته.

"یعنی سعادت مند، کامل سعادت مند، کماحقہ سعادت مند شخص وہ ہے جس نے علی [علیہ السلام] کو اُس کی حیات میں اور اُس کے وصال کے بعد محبوب رکھا، اور بدبخت مکمل بدبخت وہ ہے جس نے علی [علیہ السلام] کو اُس کی حیات میں اور اُس کے وصال کے بعد مبغوض رکھا"۔

(فضائل الصحابة ج۲ ص ۸۱۷، ۸۱۸، حدیث ۱۱۲۱؛ المعجم الكبير ج ۲۲ ص ۴۱۵، حدیث ۱۰۲۶؛ المناقب للخوارزمي ص ۷۹؛ الرياض النضرة ج۳ ص ۱۶۴؛ موسوعة العشرة المبشرون بالجنة ج ۱۱ ص ۱۱۶؛ الإيماء إلى زوائد الأمالي والأجزاء ج۷ ص ۲۱۵، حديث ۶۶۲۰)

حافظ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "اس حدیث کی سند میں ایسے راوی ہیں جنہیں میں نہیں جانتا"۔

(مجمع الزوائد ج۹ ص ۱۳۲؛ ط: ج۹ ص ۱۸۰، حدیث ۱۴۷۵۸؛ ط: ج۹ ص ۱۲۶، حدیث ۱۴۷۵۸)

متنِ حدیث کے شواہد

مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے محدثانہ شان سے اصولِ حدیث کے ضوابط کے پیشِ نظر اس حدیث پر غرابت کا حکم لگایا ہے، جو کہ درست ہے، لیکن اس کے باوجود اُنہوں نے اپنی مسلسل سند کے ساتھ اس حدیث کو اپنی کتاب میں درج بھی کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ حدیث قابلِ حجت ہے، اور بلاشبہ مصنف رحمۃ اللہ علیہ کا یہ خیال درست ہے۔ ہم اس سے پہلے نقل کر چکے ہیں کہ بسا اوقات کوئی حدیث سند کے لحاظ سے ضعیف مگر معنیٰ کے لحاظ سے درست ہوتی ہے، اور اس حدیث کا ایک ایک جملہ دوسری صحیح السند احادیث سے ثابت ہے۔

غور فرمائیے! اس حدیث میں تین باتیں بیان فرمائی گئیں:

۱۔ اہل بیت کرام علیہم السلام پر اللہ تعالیٰ کا فخر فرمانا،

۲۔ سیدہ اور حسنین کریمین کی عمومی اور سیدنا علی علیھم السلام کی خصوصی مغفرت،

۳۔ سیدنا علی ﷺ کے محب کا کامل سعادت مند ہونا اور ان کے مبغض کا کامل بدبخت ہونا۔

اب ہم بفضلہٖ تعالیٰ بالترتیب ان تینوں امور پر گفتگو کر رہے ہیں۔

اہلِ کساء پر فخرِ الٰہی

اس حدیث میں سیدہ کائنات کے الفاظ "خَرَجَ عَلَیْنَا" (ہمارے ہاں تشریف لائے) سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کی یہ تشریف آوری خالصۃً خانوادۂ مرتضوی پر ہوئی تھی، لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ خانوادہ اس بات کا مستحق ہے کہ خود اللہ سبحانہ وتعالیٰ بھی اس پر فخر فرمائے؟

جواباً عرض ہے کہ بلاشبہ اس خانوادہ کو یہ شرف حاصل ہے، کیونکہ پوری مخلوق میں سے شرف وعظمت کے لیے بنو آدم کو منتخب فرمایا گیا، پھر بنو آدم ﷺ سے خاندان منتخب ہوتے رہے حتیٰ کہ پوری مخلوق میں سے بنو ہاشم کو منتخب فرمایا گیا، پھر اُس خاندان سے ایک فرد منتخب ہوا، چنانچہ حضور ﷺ فرماتے ہیں: "واصطفاني من بني هاشم" (اللہ نے مجھے بنو ہاشم سے چنا) اور پھر حضور اکرم ﷺ نے بنو ہاشم سے ایک ایسے فرد کو منتخب فرمایا جو اباً اور اُمّاً ہاشمی تھا، چنانچہ فرمایا: یہ میرا "صفي" (چنا ہوا) ہے، پھر خود ہی اس کی تربیت فرما کر اپنی آخری اور پوری کائنات کی خواتین سے افضل وبرگزیدہ بیٹی اُس کے عقد میں دی اور زوجین کو مخصوص دعاؤں کے ساتھ نوازا۔ ایسا داعی (دعا مانگنے والا) اور ایسی دعائیں خدا کی پوری مخلوق میں کسی دوسرے جوڑے کو نصیب نہیں ہوئیں۔ خود غور کیجیے! کہ ایسی نسبی فضیلت والا جوڑا کائنات کے اعلیٰ مربی اور مرشد کے زیرِ سایہ تربیت پائے پھر اسے ایسی دعائیں بھی ملیں تو وہ جوڑا خود اور اس کی اولاد قابلِ فخر ہوگی یا نہیں؟

ابوصالح جنگی ﷺ کے تربیت یافتہ کا مرتبہ

دیکھیے اکثر صوفیہ کو تسلیم ہے کہ سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی ﷺ تمام اولیاء کرام کے سردار ہیں۔ اس کا سبب کیا ہے؟ یقیناً اس میں حضور غوث اعظم ﷺ کے علم وعمل اور ریاضت کو بھی دخل ہے لیکن اکثر علماء کرام کے نزدیک اس برتری کا سبب اُن کے والدین ماجدین کا تقویٰ اور پرہیزگاری ہے۔ حضور غوث اعظم کے والد حضرت ابوصالح موسیٰ جنگی دوست ﷺ کے تقویٰ کا واقعہ مشہور ہے اور اسی واقعہ کے ضمن میں اُن کی والدہ ماجدہ کے تقویٰ کا مقام بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ اُن کے والد گرامی کی پرہیزگاری کا واقعہ زبانِ زدِ عام ہے کہ کئی روز کی سخت بھوک کے بعد جب

وہ پانی میں بہتا ہوا ایک سیب کھا بیٹھے تو اسے بخشوانے کی فکر میں پڑ گئے۔ چنانچہ پہلے تو اس کے مالک کی تلاش میں کئی روز صرف ہو گئے، جب مالک مل گیا تو ایک سیب کی خاطر سالہا سال اُس کے باغ کی باغبانی کی۔ پھر جب طے شدہ میعاد پوری ہوئی تو اس سے بھی زیادہ سخت شرط کا سامنا کرنا پڑا۔ باغ کے مالک نے کہا کہ میری ایک لڑکی ہے جو ہاتھوں سے لنجی، پیروں سے لنگڑی، آنکھوں سے اندھی، کانوں سے بہری اور زبان سے گونگی ہے، اُس کے ساتھ نکاح کر لو تو سیب معاف ہو جائے گا۔

یہ دوسری شرط پہلی سے زیادہ سخت تھی۔ اس لیے کہ ایسی اپاہج لڑکی کے ساتھ پوری زندگی گزارنا دس بیس برس کی باغبانی سے زیادہ مشکل ہے، لیکن حضرت ابو صالح ﷺ نے یہ انتہائی دشوار شرط بھی قبول فرمالی۔ ﷺ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ جس لڑکی کو سراپا اپاہج کہا گیا تھا در حقیقت وہ سالم الاعضاء، بے عیب اور انتہائی خوبصورت تھی، اُس کے یہ تمام اعضاء باطل سے تو اپاہج تھے مگر حق کے لیے توانا و درست تھے۔ یہاں یہ حکمت بھی سمجھ آتی ہے کہ حضرت عبداللہ صومعی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو صالح رحمۃ اللہ علیہ سے کم و بیش بارہ برس باغبانی کیوں کرائی؟ اس لیے کہ جب ابو صالح ایسا متقی نوجوان دور دراز کا سفر کر کے ایک سیب معاف کرانے کی خاطر وہاں آ پہنچا تھا تو اُس وقت اُن کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ ایسے اعلیٰ خاندان کے متقی نوجوان کو اپنا داماد بنایا جائے، مگر چونکہ اُن کی لڑکی ابھی چھوٹی تھی اس لیے اتنے سال باغبانی کے بہانے اُنہوں نے نوجوان کو اپنے پاس رکھ لیا۔ ایک طرف باغ کی باغبانی ہو رہی تھی تو دوسری طرف دو کلیوں کی نگہداشت ہو رہی تھی، سو جب کلیاں کھلنے لگیں تو شیخ صومعی نے ابو صالح (نیکی والے) کو ام الخیر (بھلائی والی) کے ساتھ ملا دیا۔ قانونِ فطرت ہے کہ دو چیزوں کے ملاپ سے تیسری چیز کو وجود ملتا ہے۔ چنانچہ جب ابو صالح اور اُم الخیر [یعنی نیکی اور خیر والے جوڑے] کا ملاپ ہوا تو عبد القادر جیلانی کی صورت میں مبارک ثمر حاصل ہوا ﷺ۔

ابو صالح اور اُم الخیر کے اِس فرزندِ ارجمند کو موروثی طور پر ایسا مقام حاصل ہوا کہ وہ عالمِ شیر خوارگی میں ہی عالمِ باعمل اور متقی ثابت ہوا۔ چنانچہ اُن کے فضائل و مناقب کی کتب میں آیا ہے کہ اُن کی والدہ ماجدہ سیدتنا ام الخیر فاطمہ رحمۃ اللہ علیہا فرماتی ہیں:

> ''جب میں نے اپنے بیٹے عبدالقادر کو جنم دیا تو وہ رمضان المبارک کے ایام میں میرا دودھ نہیں پیتا تھا، لوگوں پر بوجہ بادل رمضان کا چاند مخفی رہا تو وہ میرے پاس آ کر پوچھنے لگے، میں نے کہا: آج میرے بچے نے میرا دودھ نہیں پیا، پھر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ رمضان کا دن تھا

اور اُس وقت سے ہمارے شہر میں یہ بات مشہور ہوگئی کہ سادات کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا ہے جو رمضان المبارک کے دنوں میں دودھ نہیں پیتا"۔

(بهجة الأسرار للشطنوفي ص ۱۷۲؛ قلائد الجواهر للتاذفي ص ۳؛ الكواكب الدرية للمناوي ج ۲ ص ۲۵۶؛ جامع كرامات الأولياء للنبهاني ج ۲ ص ۱۶۸)

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ حضور غوث اعظم ﷺ نہ صرف یہ کہ عالمِ شیر خوارگی میں کتاب وسنت اور فقہ کے عالم تھے بلکہ شریعت پر کاربند بھی تھے، اور چونکہ رمضان المبارک کی یہ تعظیم غیر مکلّف ہونے کے باوجود تھی اس لیے یہ عظیم تقویٰ ہے۔ خود سوچیے اس موروثی تقویٰ کی بدولت بعد میں اُن کے مقام کا کیا عالم ہوگا؟ بعض معتقدین نے اُس مقام کی نشاندہی یوں کی ہے۔

غوثِ اعظم درمیانِ اولیاء

چوں محمد درمیانِ انبیاء

یعنی غوث اعظم کا مرتبہ اولیاء کرام ﷺ کے درمیان یوں ہے جیسے نبی کریم ﷺ کا مرتبہ انبیاء کرام علیہم السلام کے درمیان ہے۔ یہاں خود حضور سیدنا غوث اعظم ﷺ کا اپنا ارشاد "قدمي هذه علىٰ رقبة كل ولي الله" (میرا یہ قدم ہر ولی اللہ کی گردن پر ہے) بھی مدنظر رکھا جائے تو مذکور الصدر شعر شاعر کا مبالغہ معلوم نہیں ہوتا۔

یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوا، سب انبیاء کرام علیہم السلام آپ سے پہلے ہوئے اور آپ سب کے بعد آئے مگر رتبہ سب سے بلند آپ کا ہے، لیکن حضور غوث اعظم سے قبل بھی اولیاء کرام گذرے اور اُن کے بعد بھی سلسلہ جاری ہے۔ لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضور غوث اعظم ﷺ کی یہ افضلیت فقط اُن کے معاصرین اور بعد والوں پر تھی یا اولیاءِ سابقین پر بھی؟ اس سلسلے میں علماء اور صوفیہ عظام رحمۃ اللہ علیہم کے مابین اختلاف ہے مگر بعض قادری حضرات کا ذوق یہ ہے:۔

جو ولی قبل تھے، یا بعد ہوئے، یا ہوں گے
سب ادب رکھتے ہیں دل میں میرے آقا تیرا
سارے اقطاب جہاں کرتے ہیں کعبے کا طواف
کعبہ کرتا ہے طواف درِ والا تیرا

(حدائق بخشش ص ۸)

واضح رہے کہ محبوب سبحانی سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے فضائل میں یہ جو کچھ لکھا گیا ہے، اس میں کوئی استبعاد نہیں سب بجا ہے، کیونکہ وہ حسنی اور حسینی سید تھے اور اُن کے والدین ماجدین ﷺ انتہائی عظیم المرتبت تھے۔

سید الانبیاء ﷺ کے تربیت یافتہ کا رتبہ

بلاشبہ پیرانِ پیر رحمۃ اللہ علیہ کے یہ فضائل حق ہیں لیکن یہ سب کو معلوم ہے کہ یہ قرآن وحدیث نہیں۔اس لیے کچھ لوگ اختلاف بھی کرتے ہیں، تاہم مجھ عاجز کی طرح جو حضرات اِن سب باتوں کو تسلیم کرتے ہیں، یہاں ہم اُن تمام حضرات کو عرض کرتے ہیں کہ وہ غور وخوض کرکے بتلائیں کہ:

- اگر حضرت ابوصالح اور سیدتنا ام الخیر کے تربیت یافتہ بچے کو تمام سابقین ولاحقین اولیاء کرام کا سردار تسلیم کیا جاتا ہے تو اُس بچے کے بارے میں عقل سلیم کا کیا فیصلہ ہوگا جو اگرچہ نبی کریم ﷺ کی صلبی اولاد نہ تھا مگر گھٹی کے وقت سے آغوشِ نبوی اور آغوشِ سیدتنا خدیجۃ الکبریٰ علیہما السلام میں تربیت پاتا رہا حتیٰ کہ سیدنا ابوبکر صدیق ﷺ نے اُسے عترتِ رسول قرار دیا؟ یقیناً اُن کی اپنے سابقین، معاصرین اور لاحقین اولیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم پر برتری مسلّم ہے، اسی لیے تو وہ نہ صرف یہ کہ اِس امت کے لیے امام الاولیاء، قدوۃ العارفین، قسیم ولایت ہیں بلکہ امم سابقہ میں بھی جس کو ولایت کا فیض نصیب ہوا وہ اِن ہی کی روح کے توسط سے نصیب ہوا، اور بلاشبہ وہی حضور ﷺ کے باطنی خلیفۂ بلافصل ہیں۔
- حضرت ابوصالح اور سیدتنا ام الخیر رحمۃ اللہ علیہما کے تربیت یافتہ بچے کو اُس کے مرشدینِ طریقت، اساتذہ کرام اور معاصرین عظام پر ایسی برتری حاصل ہوئی کہ اُن کا قدم ہر ولی کی گردن پر تسلیم کیا جاتا ہے تو اُس بچے کے بارے میں عقل سلیم کا کیا فیصلہ ہے جس کے بارے میں مرشد ومعلّم ومربی مطلق ﷺ نے واشگاف اور غیر مبہم الفاظ میں فرمایا: "هو ولي كل مؤمن من بعدي" (وہ میرے بعد ہر مومن کا ولی ہے) هو وليكم من بعدي" (وہ میرے بعد تم سب کا ولی ہے) "من كنتُ مولاه فعليٌّ مولاه" (میں جس کا مولیٰ ہوں تو علی اُس کا مولیٰ ہے)۔

غور فرمایئے "قدمي هذه على رقبة كل ولي الله" (میرا یہ قدم ہر ولی کی گردن پر ہے) قرآن وحدیث نہیں مگر ہم اسے بلاچون وچرا تسلیم کرتے ہیں اور معنوی تاویلات کا سہارا نہیں لیتے حتیٰ کہ اِس میں لفظِ

ولی کا معنیٰ محض محبوب نہیں کیا جاتا بلکہ کامل طور پر آقائیت اور سرداریت کے معنیٰ میں لیا جاتا ہے۔ چنانچہ امام احمد رضا قادری رحمۃ اللہ علیہ لفظ ''واہ'' کے ساتھ تحسین و تعجب کے انداز میں فرماتے ہیں:

واہ کیا مرتبہ اے غوث ہے بالا تیرا
اونچے اونچوں کے سروں سے قدم اعلیٰ تیرا
سر بھلا کوئی کیا جانے کہ ہے کیسا تیرا
اولیاء ملتے ہیں آنکھیں وہ ہے تلوا تیرا

(حدائق بخشش ص ٦)

ذرا سوچئے کہ جب ہم شانِ غوثِ اعظم رضی اللہ عنہ کو بلا استثناء اور بلا چون و چرا تسلیم کرتے ہیں تو ولایتِ مرتضوی میں فرامینِ رسولِ اعظم ﷺ پر ہمارے ذہنوں میں استثنائی تاویلات کیوں انگڑائیاں لینے لگتی ہیں؟

حضرت ابو صالح اور سیدتنا ام الخیر فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لختِ جگر اور تربیت یافتہ بچے کو ہم عالم شیر خوارگی میں کتاب و سنت اور فقہ کا عالم اور عامل تسلیم کرتے ہیں اور کسی قسم کی تاویل نہیں کرتے مگر امام الانبیاء والمرسلین اور سیدتنا خدیجۃ الکبریٰ صلوات اللہ وسلامہ علیہما کے تربیت یافتہ بچے کی آٹھ یا دس برس کی عمر میں تمام ذکور سے قبل اظہارِ اسلام کی فضیلت پر چیں بہ جبیں ہوتے ہیں اور تاویلات کا سہارا لیتے ہیں کہ جی وہ ابھی ننھے سے بچے تھے وغیرہ وغیرہ، آخر یہ تاویلات کیوں؟

نبی، علی اور سیدہ علیہم السلام کے تربیت یافتوں کی شان

جبحضرت ابو صالح اور سیدتنا ام الخیر فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لختِ جگر اور تربیت یافتہ بچے کی اُس کے تمام معاصرین پر ہی نہیں بلکہ سابقین، لاحقین اور اساتذہ و مشائخ کرام رضی اللہ عنہم پر بھی برتری تسلیم ہے تو پھر اُن بچوں کے بارے میں عقل سلیم کا کیا فیصلہ ہے جو غوث اعظم کے جدین کریمین ہیں اور سیدنا علی المرتضیٰ اور فاطمۃ الزہراء کے لختِ جگر اور سید العالمین صلوات اللہ وسلامہ علیہم کے تربیت یافتہ ہیں؟

رافضیت اور نام نہاد شیعیت سے قطع نظر خدارا خالی الذہن ہو کر مکمل امانت و دیانت کو بروئے کار لاتے ہوئے عقل سے پوچھئے کیا یہ چاروں ہستیاں [علی و فاطمہ شبیر و شبر رضی اللہ عنہم] انبیاء کرام علیہم السلام کو چھوڑ کر تمام سابقین، معاصرین اور لاحقین کرام رضی اللہ عنہم سے افضل نظر آتی ہیں یا نہیں؟ اور ہے کوئی منصف مزاج جو حضور غوثِ اعظم کے امام

سیدنا امام احمد بن حنبل ﷫ کے اس فرمانِ عالیشان میں غور کرے کہ انہوں نے فرمایا:

''اہل بیت پر کسی کو قیاس نہیں کیا جاسکتا''۔

(مناقب الإمام أحمد بن حنبل لابن الجوزي ص ۲۱۲)

میرا تو ایمان ہے کہ اہل بیت کرام علیہم السلام کی شان بعد از انبیاء کرام علیہم السلام ہر تقابل سے ماوراء ہے، اس لیے زیر بحث حدیث میں یہ فرمان حق اور بجا ہے کہ خالق کائنات ﷻ آل عبا علیہم السلام پر فخر فرماتا ہے۔

اہلِ کساء علیہم السلام پر فخر الٰہی کی ایک اہم دلیل

اس حقیقت کو ایک اور زاویہ سے سمجھئے! وہ یہ کہ کونین کی سب سے بڑی حقیقت توحید الٰہی ہے۔ اللہ ﷻ نے اس حقیقت پر متعدد آیات یعنی دلائل بیان فرمائے مگر جس دلیل کو سب سے اہم اور اعظم قرار دیا وہ نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

يَآ اَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَ كُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ.

''اے لوگو! آ پہنچی تمہارے پاس تمہارے رب کی اٹل دلیل''۔

(النساء: ۱۷۴)

اہل لغت کے نزدیک ''برھان'' سے بڑھ کر اور کوئی قطعی، حتمی اور اٹل دلیل نہیں ہے۔ چنانچہ شیخ احمد بن یوسف المعروف بالسمین الحلبی لکھتے ہیں:

البرهان: هو الدليل القاطع، فهو أخص من الدليل الواضح، قال الراغب: والبرهان أوكد الأدلة.

''برھان: قطعی دلیل کو کہتے ہیں، سو یہ واضح دلیل سے زیادہ خاص ہوتی ہے، امام راغب فرماتے ہیں: برھان: تمام دلائل میں مضبوط ترین دلیل ہے''۔

(عمدة الحفاظ ج۱ ص ۲۱۱)

چونکہ واحد معبود ہونے کی ایسی محکم دلیل اللہ ﷻ کے سوا کسی کے پاس نہیں ہے اسی لیے وہ فخر اور چیلنج کے انداز میں فرماتا ہے:

أَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ. (الأنبياء: ۲۴)

"کیا انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر معبود بنا لیے ہیں؟ فرمایئے! تم برھان پیش کرو"۔

اور خود ہی فرمایا:

وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهاً اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ.

"جو اللہ کے ساتھ دوسرے معبود کی عبادت کرتا ہے اس کے پاس کوئی برھان نہیں"۔

(المؤمنون:۱۱۷)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کون سی "برھان" ہے؟ جواب ظاہر ہے کہ نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس۔ چنانچہ مفسرین کرام نے سورۃ النساء کی مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

البرهان: محمد ﷺ.

"البرھان: یعنی نبی کریم ﷺ کی ذات پاک"۔

(تفسير سفيان الثوري ص۹۸؛ الوجيز للواحدي ج۱ ص۲۰٤؛ تفسير العز بن عبدالسلام ص۱۲۱؛ نظم الدرر للبقاعي ج۲ ص۳۷۹؛ تفسير الجلالين ص۱۰٥؛ الدر المنثور ج٥ ص۱٤۲؛ الكشف والبيان ج۳ ص٤۲۱؛ تفسير البغوي ج۲ ص۳۱٥؛ حاشية القونوي ج۷ ص۳۷۲؛ جامع البيان للإيجي ج۱ ص٤۳٥؛ حدائق الروح والريحان ج۷ ص٦۸؛ رموز الكنوز ج۱ ص٦۷٥)

قرآن مجید میں یہ آیت جس مقام پر آئی ہے وہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اُلوہیت کی نفی اور خالق کائنات ﷻ کی توحید کا اثبات ہے، اور وہاں اثباتِ توحید کی برھان حضور ﷺ ہیں، مگر دوسرے مقام پر جب دلائلِ توحید میں اٹل دلیل کی ضرورت پیش آئی تو قادرِ مطلق ﷻ نے بطور برھان نبی کریم ﷺ کے ساتھ اِن چار نفوسِ مقدسہ کو بھی شامل کرنے کا حکم فرمایا۔ چنانچہ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

"رسول اللہ کے پاس نجران کے دو راہب آئے اور دریافت کیا: مَنْ اَبُوْ عِيْسٰى؟ (عیسیٰ علیہ السلام کا باپ کون ہے؟) رسول اللہ ﷺ اپنے رب کے حکم سے قبل جواب دینے میں جلدی نہیں فرماتے تھے تو آپ پر یہ آیات نازل ہوئیں:

ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ. اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ. اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ.

''یہ ہم پڑھ کر آپ کو سناتے ہیں آیات اور حکمت والی نصیحت، بیشک عیسیٰ علیہ السلام کی مثال اللہ کے نزدیک آدم علیہ السلام کی مانند ہے، اُسے مٹی سے بنایا پھر فرمایا ہو جا تو وہ ہو گیا۔ (اے سننے والے) یہ تیرے رب کی طرف سے حقیقت ہے، لہٰذا شک میں مبتلا نہ ہونا''۔ (آل عمران: ۵۸، ۶۰)

(تفسير القرآن العظيم لابن أبي حاتم ج ٢ص٦٦٤؛العجاب في بيان الأسباب للعسقلاني؛لباب النقول للسيوطي ص١١٩)

مگر نجران کے عیسائی ہٹ دھرمی سے باز نہ آئے تو پروردگار عزوجل نے فرمایا:

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَةَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ.

''پھر جو شخص کٹ حجتی کرے اس میں آپ کے ساتھ، بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آ گیا تو آپ فرمایئے! آؤ ہم بلا لیں اپنے بیٹوں کو اور تمہارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں کو اور تمہاری عورتوں کو اور اپنے آپ کو اور تم کو، پھر ہم مباہلہ (ایک دوسرے کے خلاف گڑگڑا کر دعا) کریں تو جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں''۔

(آل عمران: ٦١)

منکرینِ توحید کے خلاف یہ آخری اور فیصلہ کن (قائل) مرحلہ تھا۔ اس حکم الٰہی کی تعمیل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ساتھ جن نفوسِ مطہرہ کو لے گئے وہ کون تھے؟ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

لما نزلت هذه الآية "نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ "دعا رسولُ الله علياً وفاطمةَ وحسناً وحسيناً فقال:اللّٰهم هؤلاءِ أهلي.

''جب یہ آیت نازل ہوئی ''ہم بلا لیں اپنے بیٹوں کو اور تمہارے بیٹوں کو'' تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیدنا علی، فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کو بلایا، پھر عرض کیا: اے اللہ! یہ میرے اہل (بیت) ہیں''۔

(صحيح مسلم،رقم المسلسل ٦٢٢٠؛الجمع بين الصحيحين ج١ص١٩٧،حديث٢٠٨؛مسند أحمد ج١ص١٨٥،حديث١٦٠٨،وط:ج٣ص١٦٠،حديث١٦٠٨؛مسندسعد بن أبي وقاص للدورقي،حديث١٩؛سنن الترمذي ص٦٧٤،حديث٢٩٩٩،وص٨٤٧،حديث٣٧٢٤؛

المستدرك ج۳ص ۱٤٩، حديث ٤٧٧٣؛ جامع المسانيد لابن الجوزي ج۳ص ٥٩، حديث ۱۹۲۹؛ جلاء الأفهام ص ۲۹۹؛ تفسير ابن المنذر ص ۲۲۹، حديث ٥٤٨)

نبی کریم ﷺ نے اِن نفوسِ مقدسہ کو حکم فرمایا کہ جب میں دعا کروں تو تم آمین کہنا۔ چنانچہ بشمول نبی کریم ﷺ جب یہ پانچ نفوسِ مقدسہ سامنے آئے تو عیسائیوں کا لارڈ پادری پکار اٹھا:

یامعشر النصاریٰ إني لأریٰ وُجوهاً لو شاء الله أن یزیل جبلاً من مکانه لأزاله بها، فلا تباهلوا فتهلکوا ولایبقیٰ علی وجه الأرض نصراني إلی یوم القیامة.

"اے گروہِ نصاریٰ! میں ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ان کے طفیل پہاڑ کو اس کے مقام سے ہٹا دے، پس تم مباہلہ نہ کرو، ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے اور قیامت تک روئے زمین پر کوئی عیسائی باقی نہیں رہے گا"۔

(الکشاف ج۱ ص ۳۹٦؛ الوسیط للواحدي ج۱ ص ٤٤٤؛ التفسیر الکبیر ج۷ ص ۷۱؛ اللباب لابن عادل ج٥ ص ۲۸۹؛ غرائب القرآن ج۲ ص ۱۷۸؛ السراج المنیر ج۱ ص ۳٤۷؛ تفسیر أبي السعود ج۱ ص ۳۷۹؛ تفسیر الخازن ج۱ ص ۲٥٤؛ الفتوحات الإلهیة ج۱ ص ٤۳۲؛ روح المعاني ج۳ ص ۳۰۱؛ التفسیر المظهري ج۲ ص ٦٥؛ الکامل لابن أثیر ج۲ ص ۲۹۲، وفي مجلد واحد ص ۲٦۹؛ تاریخ الخمیس ج۲ ص ۹٦؛ تذکرة الخواص، ص ۱۸)

مباہلہ کا یہ حکم جس وقت ہوا تھا اُس وقت آغوشِ اسلام میں فقط تربیت پذیری نہیں بلکہ بکثرت تربیت یافتہ حضرات بھی موجود تھے مگر میدانِ مباہلہ میں اُنہیں نہ لایا گیا اور نہ ہی اُنہیں لانے کا حکم ہوا تھا۔ یقیناً وہ شرفِ صحابیت سے بہرہ ور تھے مگر اُس میدان کے لیے فقط اُن قدسی صفات ہستیوں کو منتخب فرمایا گیا جو شرفِ صحابیت کے ساتھ ساتھ دوسری مخصوص عظمتوں سے بھی متصف تھیں۔ جہاں وہ نفوس کائنات کے اعلیٰ خاندان (بنو ہاشم) میں سے تھے وہاں وہ اہلِ بیتِ نبوت اور مخصوص طہارت و نفاست کے حامل بھی تھے، اور یہ ایسا اعزاز ہے جس میں اُن کا کوئی شریک ہے اور نہ ہی اُن پر کسی کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا فرمانِ نبوی "إن الله ﷻ یباهیٰ بکم" (اللہ تعالیٰ تم پر فخر فرماتا ہے) فقط اُن ہی کی شایانِ شان ہے، اور بجا طور پر توحیدِ الٰہی کو ان پر فخر ہے۔

نبی کریم ﷺ کو بھی اِن مقدس ہستیوں پر فخر تھا۔ چنانچہ ایک حدیث میں آپ نے ان حضرات کو اپنے

مخصوصین فرمایا۔امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حضرات امام حسن، امام حسین، سیدنا علی اور سیدتنا فاطمۃ الزہراء علیہا السلام پر چادر ڈالی پھر بارگاہِ الٰہی میں عرض کی:

اللّٰهم هؤلاء أهل بيتي وحامتي أذهِبْ عنهم الرجسَ وطَهِّرْهم تطهيراً.

''اے اللہ! یہ میرے اہل بیت اور میرے خاص ہیں،ان سے پلیدی کو دور رکھ اور انہیں خوب پاک فرما''۔

(سنن الترمذي ص ٨٧٤، حديث ٣٨٧١؛ مسند أحمد ج ٤٤ ص ٢١٧، حديث ٢٦٥٩٧؛ المعجم الكبير ج ٢٣ ص ٣٣٤، حديث ٧٧٣؛ مجموع مصنفات ابن البختري ص ١٣٣، حديث ٥٠؛ سير أعلام النبلاء ج ٤ ص ٤٠٤؛ ذخائر العقبىٰ ص ٣٢؛ جواهر العقدين ص ١٩٤؛ الإيماء ج ٧ ص ٢٤١، حديث ٦٦٦٢)

اس حدیث میں اہلِ کساء (چادر والوں) کی شان میں زبانِ نبوت سے ''حامتي'' کا لفظ صادر ہوا،اس کا معنی کیا ہے؟ اہلِ لغت لکھتے ہیں:

حامّة الإنسان: خاصّته ومن يقرب منه. وهو الحميم أيضاً

''انسان کے ''حامّة'' کا معنٰی ہے: اُس کا خاص اور وہ شخص جو اس کا مقرب ہو، اور اسی معنٰی میں لفظِ ''حميم'' ہے''۔

(النهاية في غريب الحديث ج ١ ص ٤٢٩؛ الغريبين في القرآن والحديث ج ٢ ص ٤٩٧؛ مجمع بحار الأنوار ج ١ ص ٥٦٦؛ لغات الحديث لوحيد الزمان ج ١ ص ٥١٦)

بعض احادیث میں خود ''وخاصّتي'' (اور میرے خاص ہیں) کے الفاظ بھی آئے ہیں۔

(مسند أحمد ج ٤٤ ص ١١٨، حديث ٢٦٥٠٨؛ سير أعلام النبلاء للذهبي ج ٤ ص ٣٨٤)

ظاہر ہے کہ جو افراد کسی کے مخصوصین، مخلصین اور منتخب ہوں انہیں پر اُسے فخر ہوتا ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جن پر حضور ﷺ کو فخر ہے اللہ تعالیٰ بھی انہیں پر فخر فرماتا ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ آپ کا اپنے اہل بیت پر فخر فرمانا معاذ اللہ کنبہ پروری کی وجہ سے نہیں تھا، کیونکہ آپ خواہش نفسانی سے معصوم و منزہ ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد جن ہستیوں پر اللہ تعالیٰ کو فخر ہے وہ اہل کساء علیہم السلام ہیں، اور وہی

بعد از انبیاء کرام علیہم السلام تمام انسانوں سے افضل اور فضائل سے ماوراء ہیں۔

مولیٰ علی علیہ السلام کی مخصوص مغفرت کی وجہ

زیر بحث حدیث کے دوسرے جملہ میں ارشاد ہے:

"فغفر لكم عامة وغفر لعلي خاصة" (اللہ تعالیٰ نے تمہاری عام اور علی کی خصوصی مغفرت فرمائی ہے) سوال پیدا ہوتا ہے کہ سیدنا علی علیہ السلام کی مخصوص مغفرت کا کیا معنی ہے؟ واللہ اعلم، میری دانست کے مطابق اس کا معنی یہ ہے کہ سیدنا علی علیہ السلام کی اس سے قبل کئی بار مغفرت ہو چکی تھی، مثلاً:

- وہ سب سے پہلے نمازی اور پہلے مذکر مومن ہیں، لہٰذا خدا جانے مختلف اوقات میں ادعیۂ نبویہ ﷺ میں اُن کے لیے کتنی بار مغفرت طلب کی گئی ہوگی؟
- احادیث میں تصریح ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہر وہ خیر جو اپنے لیے مانگی وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے لیے بھی مانگی اور اس حد تک مانگی کہ اللہ تعالیٰ کو فرمانا پڑا کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہو سکتا، خود سوچئے کہ کتنا مانگا ہوگا؟
- یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ سیدنا علی المرتضیٰ علیہ السلام سے بڑا مجاہد کوئی نہیں، اور جب یہ حقیقت ہے تو پھر عام مجاہدین کے حق میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِيْنَ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ أَجْرًا عَظِيْمًا، دَرَجَاتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً.

"فضیلت دی ہے اللہ تعالیٰ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر اجر عظیم سے، (ان کے لیے) اُس کی طرف سے کئی درجے اور مغفرت و رحمت ہے"۔

(النسآء: ۹۵، ۹۶)

جب عام مجاہد کے لیے ایسی فضیلت، درجات، مغفرت اور رحمت ہے تو پھر اس مجاہد کی فضیلت اور اس کی خصوصی مغفرت کا اندازہ لگانا کہاں ممکن ہے جس سے بڑا مجاہد اس امت میں ہوا ہی نہیں؟ اُن کی شان میں جس نے بھی کہا سچ کہا:

لا فتىٰ إلا علي، لا سيف إلا ذو الفقار

- اِس مغفرت کے خصوصی ہونے کی تائید میں ایک صحیح حدیث میں یوں ارشادِ نبوی مذکور ہے، امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ اپنی سند کے ساتھ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اُنہیں فرمایا:

ألا أعلمک کلمات إذا قلتهن غفر لک مع أنه مغفورٌ لکَ!

''کیا میں تمہیں ایسے کلمات نہ سکھلاؤں کہ جب تم ان کو پڑھو تو اللہ تعالیٰ تمہیں بخش دے، اس کے باوجود کہ تم بخشے ہوئے ہو؟!''۔

(خصائص علي ص٤٧، حديث ٢٤ ووط: ص٥٠، حديث ٢٥؛ السنن الكبرى للنسائي ج٧ص ١٣١، حديث ٧٦٣٠، ٧٦٣١؛ مسند أحمد ج١ ص٩١، حديث ٧٠١ وص٩٢، حديث ٧١٢ وص ٩٤، حديث ٧٢٦ ووط: ج٢ ص١٠٩، حديث ٧٠١؛ فضائل الصحابة ج ٢ ص ٧٦٣، حديث ١٠٥٣ وص ٨٨٥، حديث ١٢١٦؛ صحيح ابن حبان ج١٥ ص٣٧٢ ، حديث ٦٩٢٨؛ المستدرك للحاكم ج٣ ص١٣٧، حديث ٤٧٢٥؛ كتاب السنة لابن أبي عاصم، حديث ١٣١٤، ١٣١٥، ١٣١٦؛ مسند البزار ج٢ ص٢٣١ ، حديث ٦٢٧ وص ٢٨٣، حديث ٧٠٥)

باقی رہا یہ سوال کہ مغفور (بخشے ہوئے) کی مغفرت کا کیا معنیٰ؟ تو اس کی تفصیل کے لیے احقر کی تصنیف "شرح خصائص علي ﷺ" حدیث نمبر ۲۹ کی تشریح ملاحظہ فرمائیں۔

کامل سعادت مندی کی علامت

زیر تشریح حدیث [نمبر۲۹] کا ایک جملہ یہ بھی ہے:

أن السعيد كل السعيد حق السعيد من أحب علياً.

''سعادت مند، کامل سعادت مند، برحق سعادت مند شخص وہ ہے جو علی کو محبوب رکھتا ہے''۔

یہ جملہ محتاج تشریح نہیں، اس لیے کہ کامل سعادت مندی تو کیا ناقص سعادت مندی کا بھی ایمان کے بغیر کوئی تصور نہیں، اور صحیح حدیث کی رو سے سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کی محبت ایمان اور اُن کے ساتھ بغض منافقت ہے۔ سعادت وشقاوت کو دوسرے لفظوں میں خیر وشر کہا جاتا ہے اور سید الانبیاء والمرسلین ﷺ نے واضح الفاظ میں فرمایا ہے کہ محبت اہل بیت کے بغیر خیر کا حصول ممکن نہیں۔ ارشاد فرمایا:

لن يبلغوا خيرا حتىٰ يحبوكم لله عز وجل ولقرابتي.

''وہ لوگ ہرگز خیر کو نہیں پاسکیں گے حتیٰ کہ تمہیں اللہ ﷻ اور میری قرابت کے سبب محبوب رکھیں''۔

(مجموع مصنفات ابن البختري ص١٣٤، حديث ٥١)

چونکہ ہر خیر ایمان پر موقوف ہے اس لیے دوسرے مقام پر یوں ارشاد ہے:

والذي نفسي بيده لا يدخل قلبَ رجل الإيمانُ حتى يحبكم لله ولرسوله.

"اُس ذات کی قسم جس کے دستِ اقدس میں میری جان ہے کسی شخص کے دل میں ایمان داخل نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ وہ تمہیں اللہ اور اُس کے رسول کی خاطر محبوب رکھے"۔

(مسند أحمد ج۱ ص۲۰۷، ۲۰۸؛ موط: ج۲ ص۳۷۸، ۳۸۳، حديث۱۷۷۲، ۱۷۷۷؛ فضائل الصحابة للنسائي ص۲۲، حديث۷۳؛ مسند البزار ج٤ ص۱٤۰، حديث۱۳۱٥؛ المستدرك ج ۳ ص ۳۳۳؛ موط: ج۳ ص۳۷٦، حديث٥٤۳۳ وج٤ ص۷٥، حديث٦۹٦۰، ٦۹٦۱؛ رأس الحسين لابن تيمية مع استشهاد الحسين للإمام ابن جرير الطبري ص۲۰۰، ۲۰۱؛ مجموعة الفتاوىٰ لابن تيمية ج۲۷ ص۲٤۸، ۲٤۹)

یہ ارشادِ نبوی ﷺ سیدنا عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کی شکایت کے موقعہ پر صادر ہوا، لیکن چونکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا رتبہ سب سے بلند ہے اس لیے اُن کی شان میں الگ حدیث آئی، جیسا کہ حدیث نمبر[۸] گزر چکی ہے۔ اُس کی روشنی میں تو یہ حقیقت روزِ روشن سے بھی زیادہ عیاں ہو جاتی ہے کہ ولاءِ علی علیہ السلام کے بغیر عبادات کا تو کیا ایمان کا بھی کوئی تصور نہیں۔ کسی نے کیا ہی خوب کہا ہے۔

اگر علی کی ولایت کا تجھے اعتراف نہیں
تو خطائیں تیری حضورِ خدا معاف نہیں
تن پہ جامۂ احرام، دل میں بغضِ علی
یہ تیرے نصیب کے چکر ہیں، طواف نہیں




سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں افراط وتفریط

﴿۳۰﴾ أخبرتنا الشيخة أم محمد زينب بنت القاسم العجمية فيما شافهتنا به، عن أبي الحسن بن أحمد السعدي، أخبرنا الإمام أبو الفتوح العجلي في كتابه، أخبرنا الإمام أبو القاسم التيمي، أخبرنا أبوبكر بن خلف، أخبرنا محمد بن عبد الله الحافظ، حدثني أبو قتيبة مسلم بن الفضل الآدمي بمكة، حدثنا محمد بن عثمان بن أبي شيبة، حدثنا عمي أبو بكر، حدثنا علي بن عثمان الدهان، حدثنا الحكم بن عبدالملک، عن الحارث ابن الحسين، عن أبي صادق، عن ربيعة بن ناجذ، عن علي رضي الله عنه، قال:

دعاني رسولُ الله ﷺ، فقال: يا علي إن فيک من عيسىٰ مثلاً أبغضته اليهود حتى بهتوا أمه، وأحبته النصارىٰ حتى أنزلته بالمنزلة التي ليس بها.

قال: فقال علي رضي الله عنه: إنه يهلک في محب مطر لي يقرظني بما ليس في، ومبغض مفتر يحمله شنآني على أن يبهتني.

ألا وإني لست بنبي، ولا يوحىٰ إلي ولكني أعمل بكتاب الله، وبسنة نبيه ﷺ، ما استطعت له، فما أمرتكم من طاعة الله فحق عليكم طاعتي فيما أحببتم، أو كرهتم، وما أمرتكم بمعصية الله أنا أو غيري فلا طاعة لأحد في معصية الله، إنما الطاعة في المعروف.

حديث حسن رواه الحاكم في صحيحه وقال: صحيح الإسناد ولم يخرجاه.

﴿۳۰﴾ حضرت ربیعہ بن ناجذ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: مجھے رسول اللہ ﷺ نے بلا کر فرمایا: علی! تمہارے اندر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ایک مثال ہے: اُن کے ساتھ یہود نے اس قدر بغض رکھا کہ اُن کی والدہ ماجدہ پر بہتان لگا دیا، اور نصاریٰ نے اُن کے ساتھ اس قدر محبت کی کہ انہیں اُس مقام پر پہنچا دیا جس کے وہ مستحق نہیں تھے۔

ربیعہ کہتے ہیں: پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بیشک مجھ سے محبت کرنے والا وہ شخص ہلاک ہوا جس نے میری فضیلت کے بیان میں مبالغۃً وہ بات بیان کردی جو مجھ میں پائی نہیں جاتی، اور میرے ساتھ بغض رکھنے والا وہ تنقیصی شخص بھی ہلاک ہوا جسے مجھ سے عداوت نے مجھ پر بہتان باندھنے پر ابھارا۔

خبردار! نہ میں نبی ہوں اور نہ ہی میری طرف وحی کی جاتی ہے، لیکن میں حسبِ استطاعت کتابِ الٰہی اور سنت نبوی پر عمل کرتا ہوں، لہٰذا میں تمہیں طاعتِ الٰہی میں جو حکم کروں تو تم پر میری پیروی واجب ہے، تمہارے پسندیدہ امور میں اور ناپسندیدہ امور میں، اور جو میں یا میرے علاوہ کوئی اور شخص معصیتِ الٰہی میں تمہیں حکم کرے تو خدا کی نافرمانی میں کسی شخص کی طاعت جائز نہیں، اطاعت فقط نیکی میں ہوتی ہے۔

یہ حدیث حسن ہے، اسے امام حاکم نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے، اور شیخین نے اس کو روایت نہیں کیا۔

(المستدرك ج٣ص١٣٢، ١٣٣، حديث٤٦٢٢، وط:٣ص١٤٢، حديث٤٦٨٦)

فائدہ:

اس حدیث کی سند، اس کی صحت، اس کا حکم اور دوسری تفصیلات ہم اپنی کتاب "شرح خصائص علي ﷺ" حدیث نمبر (١٠٠) کی تحقیق میں پیش کر چکے ہیں، وہاں بھی ملاحظہ فرمائیں۔

مرتضیٰ مثیلِ عیسیٰ علیہما السلام

چونکہ اس حدیث میں سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، لہٰذا سب سے پہلے تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ لوگوں نے کس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں افراط و تفریط کی، پھر اسی تناظر میں دیکھا جائے گا کہ آیا واقعی سیدنا علی علیہ السلام کی شان میں بھی لوگوں نے بعینہ وہی افراط و تفریط کی تھی یا نہیں؟ تا کہ پہلے فرمانِ نبوی ﷺ کی حقانیت تو سب پر عیاں ہو جائے۔ سو جب ہم اس زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں تو ہم پر نبی کریم ﷺ کے ارشادِ مقدس کی حقانیت روزِ روشن سے بھی زیادہ عیاں ہو جاتی ہے کہ واقعی لوگوں نے سیدنا علی علیہ السلام کی شان میں بعینہ وہی غلو کیا جیسا کہ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کیا تھا کہ انہیں معبود بنا دیا تھا۔ سیدنا علی ﷺ کے حق میں بھی لوگوں نے مبالغہ کیا اور بعضوں نے اُنہیں معبود اور بعضوں نے اُنہیں نبی تصور کر لیا۔ متن حدیث میں سیدنا علی علیہ السلام جو اپنی ذات سے نبوت کی نفی فرما رہے ہیں اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اُن کو نبی سمجھنے لگے تھے۔ دوسرے کچھ لوگ اس سے بھی بڑھ گئے تھے اور انہوں نے اُن کو معبود تصور کر لیا تھا تو اُنہوں نے اُنہیں سخت سزا دی تھی۔ ملاحظہ فرمائیں:

(ذخائر العقبى ص١١٢؛ الرياض النضرة ج٤ص١٦٨؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٨ص٥٧؛ أسمى

المطالب في سيرة أمير المؤمنين علی ابن أبی طالب ص ۳۰۳)

مثیلِ عیسیٰ علیہ السلام کی تشریح میں تجاوز

بعض لوگ اس تمثیل اور سیدنا علی المرتضیٰ علیہ السلام کی ذاتی فہم اوراُن کی اپنی توضیح سے تجاوز کر جاتے ہیں اور تقریر وتحریر سے یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اگر کسی نے سیدنا علی المرتضیٰ علیہ السلام کی ایسی شان بیان کی جس سے ان کی اصحابِ ثلاثہ پر افضلیت ظاہر ہوتو وہ شخص بھی اس حدیث کے حکم میں آتا ہے۔ چنانچہ مولوی محمد اشرف آصف جلالی صاحب نے عالمی شہرت یافتہ عالم دین کی تردید میں پہلے یہ عنوان قائم کیا:

''اہلسنت وجماعت کو رافضیت میں دھکیلنے کی مذموم کوشش''۔

پھر نیچے تمہید میں لکھا:

''شیرِ خدا خلیفۂ چہارم حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی ذات والاصفات کے لحاظ سے اہل سنت راہِ مستقیم پر ہیں جبکہ دو فرقے افراط وتفریط سے کام لیتے ہیں۔ ایک طرف ایسا بغض کہ جو شان اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کی اس کا انکار اور دوسری طرف ایسا غلو کہ جو شان اللہ تعالیٰ نے اُنہیں نہیں دی اس کے اثبات کی بھی ضد''۔

(ماہنامہ العاقب محرم ۱۴۳۱ھ، جنوری 2010 ص ۲۱، تقریظ: ضربِ حیدری بار پنجم ص 64)

پھر اس کے بعد انہوں نے یہی زیر بحث حدیث درج کی اور آگے چل کر پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری صاحب کی کتاب ''السیف الجلي علی منکر ولایة علي رضی اللہ عنہ'' کی تردید شروع کی۔ تو میں اِس اسلوب سے چونک اٹھا کہ اگر واقعی ایسا لکھا گیا ہے تو پھر ڈاکٹر طاہر القادری صاحب نے تمام حدیں پھلانگ ڈالیں۔ چنانچہ میں نے اُن کی کتاب ''السیف الجلي'' کا رخ کیا تا کہ دیکھوں کہ کہیں پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری صاحب نے سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے لیے الوہیت اور نبوت ثابت کرنے کی ناکام کوشش تو نہیں کی، کیونکہ یہ دو شانیں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو حاصل نہیں ہیں، مگر مجھے ''السیف الجلي'' میں سیدنا علی علیہ السلام کے حق میں الوہیت ونبوت کو ثابت کرنے کی کوئی بات نہیں ملی۔ پس اگر طاہر القادری صاحب سے یہ جرم نہیں ہوا تو پھر سیدنا علی علیہ السلام کی خلافتِ باطنی یا افضلیت علی الشیخین رضی اللہ عنہم کا قول کرنا تو اتنا بڑا جرم نہیں ہے کہ اُس کے قائل پر یہ حدیث فٹ کی جائے اور اسے مشرک عیسائیوں کی صف میں کھڑا کر دیا جائے۔

خیال رہے کہ اہل بیت کرام علیہم السلام، صحابہ کرام، تابعین عظام اور بعد میں محدثین وغیرہم رحمہم اللہ افضلیت مرتضوی کے قائل رہے ہیں، لہٰذا یہ حدیث ایسے سب حضرات پر فٹ کرنا انہیں فقط عیسائی نہیں بلکہ مشرک عیسائی سمجھنے کے مترادف ہے۔

آیئے ذرا خالی الذہن ہو کر اس حدیث کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یوں تو اس حدیث کے متن میں کوئی ابہام ہے ہی نہیں، تاہم یہاں اس کے ہر ہر پیراگراف پر علیحدہ نظر ڈالنا مناسب ہے۔ یہ حدیث تین پیراگراف پر مشتمل ہے:

پہلا پیراگراف الفاظ نبوی ﷺ پر مشتمل ہے،

دوسرے پیراگراف میں مُفْرِط (بڑھانے والا) اور مُفَرِّط (گھٹانے والا) کے بارے میں سیدنا علی علیہ السلام کی تمہیدی گفتگو ہے،

تیسرے پیراگراف میں سیدنا علی المرتضی علیہ السلام نے درج ذیل الفاظ سے مُفْرِط (بڑھانے والا) کی تعیین بھی فرمادی ہے اور تردید بھی۔ ارشاد فرمایا:

ألا وإني لست بنبي، ولا يوحى إليّ.

''خبردار! نہ میں نبی ہوں اور نہ ہی میری طرف وحی کی جاتی ہے''۔

سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے اِس جملہ سے جب اُن کی نبوت کے قائلین کی تردید ہوگئی تو اُن کی اُلوہیت کے قائلین کی بھی از خود نفی ہوگئی۔ سو فقط یہی دو باتیں ہلاکت کا موجب ہیں اِن کے علاوہ دوسری کسی بھی فضیلت کا اثبات کرنا قطعاً موجبِ ہلاکت نہیں، کیونکہ باقی ہر شان، ہر خوبی، ہر مقام اور ہر مرتبہ سیدنا علی علیہ السلام کو حاصل ہے۔

ماسوا نبوت کے تمام فضائل کی جامع ذات

ایک حدیث شریف میں ہے:

أخبرنا القاسم بن زكريا بن دينار حدثنا علي بن قادم عن جعفر الأحمر عن يزيد بن أبي زياد عن عبد الله بن الحارث عن علي قال: وجعتُ وجعاً شديداً فأتيتُ النبيّ ﷺ، فأقامني في مكانه وقام يصلي، و ألقى عَلَيَّ طرف ثوبه، ثم قال: قُم يا علي! قد برئتَ، لا بأس عليک، وما دعوتُ لنفسي بشيء إلا قد

دعوتُ لک بمثله، وما دعوتُ بشيء إلا استجيبَ لي، أو قال: أعطِيتُ، إلا أنه قيل لي: لانبي بعدک.

"حضرت عبد اللہ بن حارث رضی اللہ عنہ سیدنا علی المرتضیٰ علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ اُنہوں نے فرمایا: میں ایک مرتبہ شدید درد میں مبتلا ہوا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ آپ نے مجھے اپنی جگہ پر بٹھایا اور اپنے کپڑے کا ایک کونہ مجھ پر ڈال دیا اور نماز پڑھنے لگے۔ پھر فرمایا: اے علی! اٹھو یقیناً تم بیماری سے بری ہو گئے، اور تمہیں کوئی تکلیف نہیں رہی، اور میں نے اپنے لیے جو مانگا اسی کی مثل تمہارے لیے بھی مانگا، اور میں نے جو دعا مانگی وہ قبول کی گئی، یا فرمایا: میں نے جو بھی مانگا وہ مجھے عطا کیا گیا، مگر یہ کہ مجھے کہا گیا کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا"۔

(خصائص علي ص١٥٧، حديث١٤٨؛ السنن الكبرىٰ للنسائي ج٧ص٤٦٢، حديث٨٤٨، وط: ج٥ص١٥١، حديث٨٥٣٣؛ كتاب السنة لابن أبي عاصم ص٥٨٢، حديث١٣١٣؛ المعجم الأوسط ج٨ص٤٤٥، حديث٧٩١٣؛ تاريخ دمشق ج٤٢ص٣١٠، ٣١١؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٧ص٣٧٧؛ مجمع البحرين ج٣ص٣٧٦، حديث٣٦٨٩؛ مجمع الزوائد ج٩ص١١٠، وط: ج٩ص١٤٠، ١٤١، حديث١٤٦٤٩؛ جمع الجوامع ج١٣ص١١٢، حديث١٢ ٦٠)

امام سیوطی لکھتے ہیں: امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہا نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

(جمع الجوامع ج١٣ص١١٢)

اندازہ کیجئے! نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بارگاہِ الٰہی سے اس قدر تو مانگا کہ خود اللہ تعالیٰ کو واضح کرنا پڑا کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ظاہر حدیث کے مطابق اگر کوئی شخص الوہیت و نبوت کو چھوڑ کر جو شان بھی سیدنا علی المرتضیٰ علیہ السلام کے لیے بیان کرے تو سب درست ہے، ہلاکت اور غلو کے مرتکب فقط وہ لوگ ہیں جو نصاریٰ کی طرح غلو و افراط کا شکار ہوں۔ چنانچہ حضرت علقمہ بن قیس النخعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

أفرط ناس في حب علي كما أفرطت النصارى في حب المسيح.

"لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت میں اسی طرح افراط کیا ہے جس طرح عیسائیوں نے مسیح علیہ السلام کی محبت میں کیا تھا"۔

(سير أعلام النبلاء للذهبي ج٤ص٣١٠؛ النصب والنواصب لبدر بن ناصر ص٨٨٩)

لہٰذا فقط ایسے لوگ ہی غالی ہیں اور محبت مرتضوی میں افراط کی وجہ سے ہلاکت کے مستحق ہیں، اور جو لوگ اس قسم کی افراط سے منزہ ہوں اور الوہیت ونبوت کے علاوہ سیدنا علی علیہ السلام کے لیے کسی بھی فضیلت کے قائل ہوں، بشرطیکہ کسی صحابی کے بدخواہ نہ ہوں اور خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی خلافت کو حق مانتے ہوں تو وہ اس حدیث کے حکم میں شامل نہیں ہیں۔ اگر کوئی قدیم وجدید ملاں اور مصنف ان پر یہ حدیث فٹ کرنا چاہے تو یہ اُس کی ذاتی سوچ ہو سکتی ہے، لیکن اُس کی کارروائی سے کسی پر جنت کا دروازہ بند ہو سکتا ہے اور نہ ہی وہ جہنم رسید ہو سکتا ہے۔

سیدنا علی علیہ السلام کی شان میں تفریط

سیدنا علی المرتضیٰ علیہ السلام کی شان میں تفریط کے مرتکب لوگوں کی کئی اقسام ہیں۔ بعضوں نے کھلم کھلا توہین کی اور اُنہیں کافر تک قرار دے دیا جیسا کہ خوارج، بعضوں نے اُن کی توہین کی اور ازراہِ بہتان اُنہیں قاتل قرار دیا حالانکہ یہ کبیرہ گناہ ہے، بعضوں نے اُن کی تنقیص کی اور اُن پر (معاذ اللہ) لعن طعن اور سب وشتم کیا، اور بعضوں نے اُن کی تنقیص کی خاطر اُن کے مخالفین کی شان میں احادیث گھڑیں اور یہ ساری صورتیں تفریط میں آتی ہیں، حتیٰ کہ بعض لوگوں نے اُن کے ہم عصر، ہم استاد اور ہم مرشد دوستوں کے ساتھ موازنہ کرتے ہوئے بھی اُن کی تنقیص کی ہے، جیسا کہ صاحبِ ضربِ حیدری کا یہ لکھنا:

"مولا علی کے فضائل جو کتب میں مذکور ہیں ان کی کیفیت اور قوت شیخین کے فضائل سے بڑھ کر نہیں ہے"۔

(ضربِ حیدری، بار پنجم ص ۲۴۱)

لہٰذا حدیثِ ھٰذا میں جس ہلاکت کا ذکر ہے وہ ہلاکت فقط سیدنا علی علیہ السلام کی شان کو حد سے بڑھانے والوں کے لیے ہی نہیں بلکہ اُن کی توہین وتنقیص کرنے والوں کے لیے بھی ہے۔ جو لوگ سیدنا علی علیہ السلام کو معاذ اللہ کافر اور قاتل کہہ کر اُن کی توہین کے مرتکب ہوئے ہلاکت فقط اُن کے لیے ہی نہیں بلکہ اُن لوگوں کے لیے بھی ہلاکت لازم ہے جو اُن کی تنقیص کے مرتکب ہوئے اور ہوتے ہیں۔

مخالف کو بڑھا کر دوسرے کی تنقیص

ماضی بعید میں کچھ لوگ ایسے تھے جو سیدنا علی علیہ السلام کی عظمتوں اور مخصوص رفعتوں کو گھٹانے کی خاطر اُن کی شان میں وارد شدہ احادیث کی تاویلاتِ فاسدہ کرتے تھے، جب اس سے بھی اُن کا جی نہ بھرا تو اُن کم بختوں نے اُن

کے مقابل آنے والے طلقاء قسم کے لوگوں کی شان میں حدیثیں گھڑنا شروع کر دیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ عند الناس کسی کی عظمت کو گھٹانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اُس کے مخالف کی شان بھی اسی طرح بیان کرنا شروع کر دی جائے، اگر مخالف میں ویسی خوبیاں نہ ہوں تو اپنی طرف سے بنالی جائیں۔ سیدنا علی ؑ کی عظمتوں کو گھٹانے کی خاطر یہ دونوں حربے استعمال کیے گئے، اُن کے خلاف پراپیگنڈا بھی کیا گیا اور اُن کے مخالفین کو مصنوعی طور پر بڑا دکھلانے کی خاطر اُن کی شان میں حدیثیں بھی گھڑی گئیں۔ چنانچہ علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''حدیثوں کی تدوین بنوامیہ کے زمانہ میں ہوئی جنہوں نے پورے ۹۰ برس تک سندھ سے ایشیائے کوچک اور اندلس تک مساجدِ جامع میں آل فاطمہ کی توہین کی اور جمعہ میں بر سر منبر حضرت علی ؑ پر لعن کہلوایا، سینکڑوں ہزاروں حدیثیں امیر معاویہ وغیرہ کے فضائل میں بنوائیں''۔

(سيرة النبي ﷺ ج ١ ص ٦٩)

علامہ شبلی نعمانی کی اس عبارت میں غور فرمائیں کہ ایک طرف تو دورِ بنوامیہ میں آلِ فاطمہ کی توہین کی جا رہی تھی اور سیدنا علی ؑ پر معاذ اللہ لعن کیا جا رہا تھا جبکہ دوسری طرف وہ اپنے امام کی شان میں حدیثیں گھڑ رہے تھے، اور دنیا میں کسی کی تنقیص کے لیے ان دو طریقوں سے بڑا طریقہ اور کوئی نہیں۔

علامہ اعزاز علی دیوبندی اور علامہ حسین احمد مدنی دیوبندی کے شاگرد فاضل دار العلوم دیوبند علامہ سید لعل شاہ بخاری دیوبندی نے اس امر پر بہت مفصل اور مدلل لکھا ہے، یہاں ہم اُنہیں کے حوالہ جات کے ساتھ اُن کی کتاب سے ایک اقتباس پیش کر رہے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''ایک طائفہ نے حضرت معاویہ کے لیے فضائل وضع کیے اور پھر اس سلسلہ میں حضور ﷺ سے من گھڑت احادیث روایت کیں جو سب کی سب جھوٹ ہیں۔ ان من گھڑت روایات میں سے نمونہ از خروارے صرف تین روایتیں یہاں درج کی جاتی ہیں:۔

۱۔ يبعث معاوية يوم القيامة وعليه رداء من نور الإيمان.

''حضرت معاویہ قیامت کے دن مبعوث ہونگے اور ان پر نور ایمان سے ایک چادر ہوگی''۔

اس روایت کو ابن حبان نے حذیفہ سے مرفوع روایت کیا اور کہا یہ روایت موضوع ہے، اس کی سند میں جعفر ابن محمد انطا کی ہے جو موضوعات روایات کا راوی ہے۔

(الفوائد المجموعہ ص ۴۰۶، تذکرۃ الموضوعات ص ۱۴۵، اللآلی المصنوعہ ص ۴۲۳، شرح سفر السعادۃ ص ۵۴۲)

۲. الأمناء عند الله ثلاثة أنا و جبريل و معاوية.

''اللہ کے ہاں امین صرف تین ہیں: میں، جبریل و معاویہ''۔

نسائی، خطیب۔ ابن حبان نے تصریح کی کہ یہ روایت باطل ہے، موضوع ہے اسے علی ابن عبداللہ الفرج البردانی نے وضع کیا ہے۔ (الفوائد المجموعہ ص ۴۰۴، میزان الاعتدال ص ۱۲۹ ج ۱، اللآلی المصنوعہ ص ۴۱۷، ۴۱۸ ج ۱)

۳. ان رسول الله صلى الله عليه وسلم استشار جبريل في استكتابه معاوية فقال استكتبه فانه امين.

''تحقیق رسول اللہ ﷺ نے جبریل سے مشورہ لیا، معاویہ کے کاتب بنانے میں جبریل نے کہا اسے کاتب بنالیں کیونکہ یہ امین ہیں''۔

یہ روایت موضوع ہے۔ (الفوائد المجموعہ ص ۴۰۴)

اس کی سند میں غرابت ہے۔ (البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۲۰)

فانه غريب بل منكر وفي سنده السرى بن العاصم كذبه في الحديث ابن خراش.

''بیشک یہ روایت غریب بلکہ مردود ہے اور اس کی سند میں سری بن عاصم ہے جس کو ابن الخراش نے حدیث میں جھوٹا کہا ہے''۔ (البدایہ والنہایہ ج ۵ ص ۳۵۴)

اس روایت میں ایک راوی اصرم ابن حوشب ہے جو وضاع ہے۔

قال يحيى كذاب خبيث، قال ابن حبان كان يضع الحديث على الثقات، قال البخارى ومسلم والنسائى متروك، قال الدارقطنى منكر الحديث.

''یحییٰ نے کہا کذاب خبیث ہے، ابن حبان نے کہا: حدیث گھڑ کر معتبر راویوں کی طرف منسوب کرتا تھا، امام بخاری، امام مسلم اور امام نسائی نے فرمایا: یہ متروک ہے، دارقطنی نے کہا منکر

الحدیث ہے"۔(میزان الاعتدال ج ا ص ۲۷۲)

اس روایت کا دوسرا راوی بھی منکر الحدیث ہے۔(میزان الاعتدال ج ۳ ص ۶۳۰)

وبالجملة هذا الحديث من هذا الوجه ليس بثابت ولا يغتر به والعجب من ابن عساكر كيف يورد في تاريخه هذا.

"مختصر یہ کہ اس طریقہ سے یہ حدیث ثابت نہیں اور اس سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے، تعجب ہے کہ ابن عساکر نے اس کو اپنی تاریخ میں کیونکر ذکر کیا ہے"۔(البدایہ والنہایہ ج ۴ ص ۳۵۴)

(حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ واستخلاف یزید، از لعل شاہ بخاري دیوبندی ص ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸)

فاضل دیوبند سید لعل شاہ بخاری نے لکھا ہے کہ بنوامیہ کے دور میں حدیثیں گھڑنے والے لوگوں نے اپنے امام کی شان میں ہر اُس حدیث کے مقابلہ میں حدیث گھڑی جو کسی بھی جلیل القدر صحابی کی شان میں نبی کریم ﷺ سے مرفوع و متصل اور صحت کے ساتھ منقول تھی، حتیٰ کہ خلفاء اربعہ، باقی عشرہ مبشرہ، بیعتِ رضوان کے خوش نصیب اور دوسرے مشہورین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شانوں میں جو احادیث آئی ہیں، ایسی ہر سچی حدیث کے مقابلہ میں اُس دور کے لالچی اور احمق لوگوں نے حدیث گھڑ کر شائع کی۔ پھر وہ حدیثیں اس انداز سے چلائی گئیں کہ جھوٹ سچ محسوس ہونے لگا اور عامۃ الناس کے اذہان میں وہ جھوٹی حدیثیں رچ بس گئیں۔ عوام تو عوام اُس دور کے بعض خواص بھی اس فریب میں مبتلا ہو گئے تھے، اور اب تک اہل علم کہلانے والے لوگ فریب کاری کے اُس جال میں پھنستے چلے جارہے ہیں۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے: اب بھی بعض لوگ اس دھندے میں مشغول ہیں اور ایسی جعلی اور موضوع احادیث کو فرمانِ نبوی ﷺ گمان کرتے ہوئے بیان کررہے ہیں یا معاذ اللہ عمداً پھیلا رہے ہیں۔ چنانچہ اوپر جن احادیث کو سید لعل شاہ بخاری دیوبندی نے موضوع ثابت کیا ہے اُن میں سے مؤخر الذکر موضوع روایت کو بعض مقررین و مؤلفین حدیثِ نبوی سمجھ بیٹھے، فقط یہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ واضح موضوع و جعلی روایت کو حدیث سمجھ بیٹھے۔ چنانچہ مولوی عرفان شاہ مشہدی لکھتا ہے:

"یہ بھی مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ارشاد فرمایا: اے معاویہ! تو مجھ سے ہے اور میں تجھ سے ہوں۔ پھر دستِ اقدس کی دو انگلیوں کو درمیانی اور ساتھ

والی انگلی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: جنت میں داخل ہوتے وقت جنت کے دروازے پر میں تجھ سے اور تو مجھ سے اس طرح ملے ہوں گے جس طرح یہ دونوں انگلیاں آپس میں ملی ہوئیں"۔

(سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اہل حق کی نظر میں، لعرفان شاہ ص ۸۷)

پھر اس مصنف و مقرر کی پیروی میں ان ہی کے فیض یافتہ ایک نوجوان لکھاری بھی اس جھوٹی روایت کو حدیث نبوی ﷺ سمجھ بیٹھا اور بصد مسرّت اِس جھوٹی روایت کے وسیلہ سے اپنی کتاب کا انتساب حضور کریم ﷺ کے نام کیا۔ اُن کے انتساب کے آخری جملے ملاحظہ ہوں، وہ لکھتے ہیں:

"بے سہاروں کے سہارا، بے چاروں کے چارہ، ہادی السبل خیر الرسل احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کرتا ہوں جن کا فرمان عالی شان ہے

"یامعاویۃ انت منی وانا منک" (السیرۃ الحلبیہ)

"اے معاویہؓ تو مجھ سے ہے اور میں تجھ سے"۔

(حق چاریار، انتساب والاصفحہ)

مگر افسوس کہ اکتساب فیض کی یہ کاوش بے سود رہ گئی، اس لیے کہ اکابر محدثین کرام کی تحقیق کے مطابق یہ روایت ہی باطل ہے۔ چنانچہ امام ذہبی، حافظ ابن حجر عسقلانی اور دوسرے محدثین کرام رحمۃ اللہ علیہم اس حدیث کے ایک راوی عبدالعزیز بن بحر کے ترجمہ [حالات] میں لکھتے ہیں:

عبد العزيز بن بحر المروزي، عن إسماعيل بن عياش بخبر باطل، وقد طعن فيه عباس الدوري، واللفظ له، وعبد الله بن أحمد، وغيرهما، فقالوا: حدثنا عبد العزيز بن بحر، حدثنا إسماعيل بن عياش، عن عبد الرحمان بن عبد الله بن دينار، عن أبيه، عن ابن عمر، أن رسول الله ﷺ قال: الآن يطلع عليكم رجل من أهل الجنة، فطلع معاوية، فقال: أنت يامعاوية مني وأنا منک، لتزاحمني على باب الجنة كهاتين، وأشار بإصبعيه.

"عبدالعزیز بن بحر المروزی اسماعیل بن عیاش سے باطل روایت لایا ہے، عباس الدوری نے اس پر اعتراض کیا ہے اور یہ الفاظ اسی کے ہیں، اور عبداللہ بن احمد اور دوسرے محدثین نے بھی اعتراض کیا ہے، ان سب نے فرمایا: ہمیں عبدالعزیز بن بحر نے بیان کیا، اس نے کہا ہمیں اسماعیل بن عیاش

نے از عبدالرحمان بن عبداللہ بن دینار، از والدِ خود، از ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کیا، انہوں نے کہا: بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ابھی تمہارے ہاں ایک جنتی شخص آئے گا تو معاویہ ظاہر ہوئے۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: تم اے معاویہ! مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں، یقیناً تم دروازۂ جنت پر میرے ساتھ یوں مل جاؤ گے اور آپ نے اپنی دو انگلیوں سے اشارہ فرمایا"۔

(میزان الاعتدال ج٤ ص٣٥٨، ٣٥٩؛ سیر اعلام النبلاء ج٣ ص١٣١؛ لسان المیزان ج٤ ص ٣٧٩، وط: ج٥ ص١٩٤؛ تنزیہ الشریعة للکناني ج٢ ص٢٠)

اس قسم کی تمام باطل روایات فقط سیدنا علی ؑ کی تنقیص کے لیے وضع کی گئیں اور آج تک یہ جھوٹی روایات اسی مقصد کے پیشِ نظر بیان کی جاتی ہیں۔ اگر کسی کو شک ہو تو وہ ایک مرتبہ علامہ شبلی نعمانی کی عبارت پھر پڑھ لے، اور پھر بھی تسلی نہ ہو تو درج ذیل کلام میں امام احمد بن حنبل، علامہ ابن جوزی اور حافظ ابن حجر عسقلانی کی یہ تصریح بار بار پڑھے۔ حافظ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وأخرج ابن الجوزي أيضاً من طريق عبد الله بن أحمد بن حنبل: سألت أبي ما تقول في علي ومعاوية؟ فأطرق ثم قال: اعلم أن علياً كان كثير الأعداء ففتش أعداؤه له عيباً فلم يجدوا، فعمدوا إلى رجل قد حاربه فأطروه كياداً منهم لعلي، فأشار بهذا إلى ما اختلقوه لمعاوية من الفضائل مما لا أصل له. وقد ورد في فضائل معاوية أحاديث كثيرة لكن ليس فيها ما يصح من طريق الإسناد، وبذلك جزم إسحق بن راهويه والنسائي وغيرهما، والله أعلم.

"علامہ ابن الجوزی نے بھی امام عبداللہ بن احمد بن حنبل کی سند سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے اپنے والد سے عرض کیا کہ آپ سیدنا علی المرتضیٰ ؓ اور معاویہ کے متعلق کیا فرماتے ہیں؟ اس پر انہوں نے اپنا سر جھکا لیا اور پھر سر اُٹھا کر فرمایا: جان لو کہ سیدنا علی ؓ کے دشمن بہت تھے، انہوں نے اُن کے عیب تلاش کیے تو اُنہیں ناکامی ہوئی۔ پھر انہوں نے اُن کی عداوت میں اُس شخص کو بڑھانا شروع کر دیا جو اُن کے ساتھ لڑتا رہا۔ اس سے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اُن بے اصل روایات کی طرف اشارہ کیا جو لوگوں نے معاویہ کے فضائل میں گھڑی تھیں۔ (حافظ فرماتے ہیں) فضائلِ معاویہ میں بکثرت روایات وارد ہیں لیکن ان میں

کوئی روایت ایسی نہیں ہے جس کی سند صحیح ہو، یہی امام اسحاق بن راھویہ، امام نسائی اور دوسرے علماءِ حدیث ﷺ کا قطعی قول ہے، واللہ اعلم"۔

(فتح الباري ج۷ص۴۷٦،وط: ج۷ص۱۲۱،وط: ج۸ص۴۷۳؛ الطيوريات لأبي الحسين مبارك عبدالجبار الطيوري ص۱۳۸٦؛تاريخ الخلفاء للسيوطي ص۱۵۳،وط: ص۳۳۰،وط: دارابن حزم ص۱۵۹؛الصواعق المحرقة ص۱۲۷؛ لوامع الأنوار البهية ج۲ص۲۵٤؛حضرت علي ﷺ اور قصاص عثمان ﷺ للعلامة عبد الرشيد نعماني ص۱٤،۱۵)

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ محمد فضیل مغربی مالکی نے بھی امام ابن راھویہ رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے محدثین کرام کی تائید فرمائی ہے کہ حضرت معاویہ کی فضیلت میں کوئی حدیث نہیں ہے، اور مولانا محمد انور شاہ کشمیری نے کہا ہے کہ ابن عباس ﷺ نے بھی اغماض برتا ہے اور وتروں کی ایک رکعت کے قول میں حضرت معاویہ کی تصویب نہیں فرمائی۔ اس مقام پر علامہ کشمیری صاحب نے ابن عباس سے حضرت معاویہ کے بارے میں "شرح معاني الآثار" سے ایک سخت جملہ بھی نقل کیا ہے۔

(التوشيح شرح الجامع الصحيح للسيوطي ص۲۳۷۹؛الفجر الساطع على الصحيح الجامع للمغربي مالكي ج۹ص۹۳؛فيض الباري ج۵ص۴۷٦)

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ هَادِيًا کا مصداق؟

خیال رہے کہ جامع ترمذی میں حضرت معاویہ کے بارے میں "اللهم اجعله هاديا مهديا واهد به" (یعنی اے اللہ! اُس کو ہدایت دینے والا، ہدایت یافتہ بنا اور اُس کے ذریعے ہدایت پھیلا) کے الفاظ میں ایک دعائے نبوی ﷺ روایت کی گئی ہے، لیکن ان محدثین کرام نے اُس روایت کو لائق التفات نہیں سمجھا۔ شاید ان کے مدنظر عظمت نبوی ﷺ تھی، کیونکہ یہ کیسے ممکن ہے کہ جس انسان کے حق میں خاتم الانبیاء ﷺ کی زبان سے ایسی جامع دعا ہو وہ خلفاء راشدین کے طریقہ سے ہٹ جائے اور سرتوڑ کوشش کر کے حتیٰ کہ پیسے دے دلا کر اپنی زندگی میں اپنے بیٹے مگر سفیہ و نامراد شخص کو اپنا ولی عہد مقرر کر جائے؟ اسی اقتدار ہی کے نشہ میں بدمست ہو کر یزید پلید نے کعبہ معظمہ اور مسجد نبوی ﷺ کی حرمت کو پامال کیا اور اہل بیت و صحابہ کرام ﷺ پر مظالم ڈھائے، کیا "واهْدِ به" کی یہی تاثیر ہے؟

بعض لوگ کہتے ہیں: جی اُس وقت اُن پر یزید کا فسق وفجور عیاں نہیں ہوا تھا۔ اُن سے پوچھا جائے کہ اگر یزید صالح ومتقی بھی ہوتا تو پھر یہ کس کی سنت ہے کہ اگر کسی کا بیٹا مکمل صالح اور لائق ہو تو وہ بلا مشورہ اپنے ہی بیٹے کو اقتدار سونپ دے؟ کیا خلفاء راشدین المہدیین ﷺ نے ایسا کیا؟ قرآن کریم نے مہاجرین وانصار ﷺ کی اتباع کرنے والوں کو "وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ" [التوبة : ۱۰۰] کے الفاظ میں جو مژدۂ رضا سنایا ہے، کیا مذکورہ دعائے نبوی ﷺ کا مصداق شخص اُن ہدایت یافتہ ہستیوں کی پیروی سے محروم رہ سکتا ہے؟ اور کیا ایسی جامع دعائے نبوی ﷺ کے مصداق سے دانستہ تو کیا نادانستہ بھی ایسا قدم اٹھ سکتا ہے کہ وہ ایسے شخص کو اقتدار سونپ جائے جو آلِ رسول، مسجد نبوی، کعبہ معظمہ اور ہزاروں اہل اسلام کی عزت کو پامال کرے؟ ایسی جامع دعائے نبوی ﷺ کے مصداق شخص سے یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ وہ کسی خلیفۂ راشد کی پیروی کی بجائے اُلٹا اُس پر سب وشتم کرے؟

علاوہ ازیں اگر اس حدیث کی سند میں غور کیا جائے تو متعدد مقامات پر سقم نظر آتا ہے۔ مثلاً:

۱۔ پہلا سقم یہ ہے کہ عبد الرحمان بن ابی عمیرۃ یا ابن عمیرۃ جو اس حدیث کا اولین راوی ہے، اس کی صحابیت میں اختلاف ہے۔ اس کے بارے میں امام ابن ابی حاتم لکھتے ہیں:

وإنما هو ابن أبي عميرة ولم يسمعه من النبي ﷺ هذا الحديث.

"وہ ابن ابی عمیرہ ہی ہے اور اس نے نبی کریم ﷺ سے یہ حدیث نہیں سنی"۔

(كتاب العلل لابن أبي حاتم ج٦ ص٦٨٢)

حافظ ذہبی اور دوسرے علماء اسماء الرجال نے فرمایا ہے کہ اس حدیث کا وہ راوی جس نے نبی کریم ﷺ سے براہِ راست روایت کیا ہے، اس کی صحابیت میں اختلاف ہے، اور وہ عبد الرحمان بن ابی عمیرہ المزنی ہے۔

(تاريخ الإسلام للذهبي ج٢ ص٣٤٢؛ تقريب التهذيب ج١ ص٣٤٦)

امام ابن عبد البر، امام ابن اثیر الجزری، حافظ ابن حجر عسقلانی اور عبد الرحمان مبارک پوری نے لکھا ہے: نہ اس کا صحابی ہونا صحیح ہے اور نہ ہی یہ حدیث ثابت ہے۔

(الاستيعاب ج٢ ص٣٨٦؛ أسد الغابة ج٣ ص٤٩٤؛ تهذيب التهذيب ج٥ ص١٥٢؛ تحفة الأحوذي ج١٠ ص٣١٥)

حافظ مغلطائی حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

حديثه مضطرب فيه، لا يثبت صحبته.

''اس کی حدیث میں گڑبڑ ہے، اس کی صحابیت ثابت نہیں''۔

(الإنابة إلى معرفة المختلف فيهم من الصحابة ج۲ ص۲۳)

جب اتنے علماء و محدثین نے عبدالرحمان ابن ابی عمیرہ کی صحابیت کا انکار کیا ہے اور امام ابن ابی حاتم نے دو ٹوک انداز میں کہا ہے کہ اس نے یہ حدیث سنی ہی نہیں تو پھر سنداً اس حدیث کے موضوع و باطل ہونے میں کیا شک باقی رہ جاتا ہے؟ کیا سنن الترمذی میں آ جانے کی وجہ سے اس حدیث کو ماننا لازم ہو گیا ہے؟

۲۔ دوسرا سقم یہ ہے کہ یہ شامی ہے۔

۳۔ تیسرا سقم یہ ہے کہ ترمذی کی سند میں اس حدیث کا ایک راوی سعید بن عبدالعزیز ہے اور ہر چند کہ وہ ثقہ راوی تھا لیکن آخر عمر میں اختلاط (حافظہ کی خرابی) کا شکار ہو گیا تھا۔ مجھے علماء اسماء الرجال سے کوئی ایسی وضاحت نہیں ملی کہ کس نے اس سے قبل از اختلاط روایت کیا اور کس نے بعد از اختلاط؟ ترمذی کی سند میں اس سے روایت کرنے والا راوی عبدالاعلیٰ بن مسہر ہے اور مسند احمد کی سند میں ولید بن مسلم ہے، اور اُن دونوں کی تاریخ وفات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے سعید بن عبدالعزیز کی عمر کے آخری حصہ میں سماعت کی ہے، کیونکہ عبدالاعلیٰ بن مسہر سعید بن عبدالعزیز سے ۵۱ سال بعد ۲۱۸ھ میں فوت ہوا، اور ولید بن مسلم ۲۸ سال بعد ۱۹۵ھ میں فوت ہوا، اور خود سعید بن عبدالعزیز کی وفات ۱۶۷ھ میں ہوئی۔

فی الجملہ یہ کہ ہمارا ایمان ہے کہ جس انسان کے بارے میں بھی ایسی جامع دعاءِ نبوی ﷺ منقول ہو اُس سے عمداً تو کیا بھول کر بھی نہیں بلکہ خواب میں بھی اس قدر سنگین غلطیاں نہیں ہو سکتیں۔

اس حدیث [نمبر ۳۰] کی مزید تشریح و تحقیق کے لیے ہماری کتاب ''شرح خصائص علي ؓ'' کی حدیث نمبر ۱۰۰ کی تشریح و تحقیق ملاحظہ فرمائیں۔

سیدنا علی علیہ السلام باب الحکمۃ

﴿۳۱﴾ أخبرنا الحسن بن أحمد بن هلال قراءة عليه، عن علي بن أحمد بن عبد الواحد، أخبرنا أحمد بن محمد بن محمد في كتابه من أصبهان، أخبرنا الحسن بن أحمد بن الحسن المقري، أخبرنا أحمد بن عبد الله بن أحمد الحافظ، أخبرنا أبو أحمد الجرجاني،

أخبرنا الحسن بن سفيان، أخبرنا عبد الحميد بن بحر، أخبرنا شريک، عن سلمة بن کهيل، عن الصنابحي عن علي ﷺ قال: قال رسول اللہ صلى اللہ عليه وآله وسلم:

أنا دار الحكمة وعليٌّ بابها.

رواه الترمذي في جامعه، عن إسماعيل بن موسىٰ، حدثنا محمد ابن رومي، حدثنا شريک، عن سلمة بن کهيل، عن سويد بن غفلة، عن الصنابحي، عن علي، وقال: حديث غريب. ورواه بعضهم عن شريک، ولم يذكروا فيه عن الصنابحي، قال: ولا نعرف هذا الحديث عن واحد من الثقات غير شريک، وفي الباب عن ابن عباس انتهى.

﴿۳۱﴾ سیدنا علی المرتضیٰ ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں حکمت کا گھر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو اپنی جامع میں از اسماعیل بن موسیٰ روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا: ہمیں محمد بن رومی نے بیان کیا، انہوں نے کہا: ہمیں شریک نے از سلمہ بن کُہَیل، از سوید بن غفلہ، از صنابحی از سیدنا علی ؓ روایت کیا ہے، اور امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث غریب ہے، اور اس کو بعض محدثین نے شریک سے روایت کیا ہے اور انہوں نے اس کی سند میں صنابحی کا ذکر نہیں کیا۔ امام ترمذی فرماتے ہیں: ہم اس حدیث کو شریک کے سوا کسی اور ثقہ راوی سے نہیں جانتے، اور اور ایک باب میں یہ ابن عباس ؓ سے منقول ہے۔ امام ترمذی کا کلام پورا ہوا۔

(جامع الترمذي ص۸٤۷ حديث۳۷۲۳؛ فضائل الصحابة ج۲ ص۷۸۹ حديث ۱۰۸۱؛ مصابيح السنة ج٤ ص۱۷٤ حديث ٤۷۷۲؛ حلية الأولياء ج۱ ص۱۰۳؛ مشكاة المصابيح ج۲ ص٥۰٤ حديث۶۰۹۶؛ ذخائر العقبیٰ ص۹٤؛ الرياض النضرة ج٤ ص۱۳۷؛ كنوز الحقائق ج۱ ص ۱۷۵ حديث ۲۱۸۱)

"أنا دار الحكمة" حدیث کا حکم

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کو سیدنا علی المرتضیٰ ؓ سے روایت کر کے آخر میں اس کے ایک شاهد کی طرف اشارہ فرما کر اس کو لائقِ اعتبار قرار دے گئے، اور وہ ہے اس حدیث کا سیدنا ابن عباس ؓ سے بھی

روایت ہونا، اور وہ کتاب ھٰذا کی آئندہ حدیث ہے، اس پر مفصل گفتگو وہیں ہوگی۔ مصنف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی یہ حدیث قابلِ اعتماد ہے، اسی لیے وہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول "ولا نعرف هذا الحديث عن واحد من الثقات غير شريك" (ہم اس حدیث کو شریک کے سوا کسی اور ثقہ راوی سے نہیں جانتے) پر لکھتے ہیں:

قلت: ورواه بعضهم عن شريك، عن سلمة ولم يذكر فيه عن سويد. ورواه الأصبغ بن نباته، والحارث عن علي نحوه.

میں کہتا ہوں: اور بعض نے اس حدیث کو از شریک از سلمہ روایت کیا ہے اور اس میں سوید کا ذکر نہیں کیا، اور اس حدیث کو اصبغ بن نباتہ اور حارث نے بھی اسی طرح سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

جامع ترمذی کی یہ حدیث مشکوۃ شریف میں بھی ہے اور یہ اُن سولہ احادیث میں سے ہے جن پر علامہ قزوینی رحمۃ اللہ علیہ نے وضع کا حکم لگایا تھا اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اُن کی تردید فرمائی تھی۔ حافظ رحمہ اللہ اس حدیث کو سترھویں [۱۷] نمبر پر لائے ہیں اور اس کے کچھ شواھد بیان فرما کر آخر میں اپنے جواب کے خلاصہ میں فرمایا ہے:

السابع عشر: الترمذي، وهو ضعيف ويجوز أن يحسن.

"سترھویں حدیث امام ترمذی نے روایت کی ہے اور یہ ضعیف ہے اور جائز ہے کہ اس کو حدیث حسن قرار دیا جائے"۔

(أجوبة ابن حجر العسقلاني على رسالة القزويني ملحق بمشكاة المصابيح ج۲ ص۵۵۳، ۵۵۵)

حافظ رحمہ اللہ نے اس حدیث کی تحسین کا قول کر کے فکرِ صائب کا ثبوت دیا ہے۔ چنانچہ اُن سے قبل محی السنۃ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ بھی اس حدیث کو اپنی کتاب کی اُس فصل میں درج کر چکے ہیں جس میں وہ احادیثِ حسنہ لاتے ہیں اور اُن پر "مِن الحسان" کا عنوان قائم کرتے ہیں، مشکوۃ شریف میں بھی یہ حدیث "الفصل الثاني" میں ہے اور اہلِ علم جانتے ہیں کہ عموماً مشکاۃ کی پہلی فصل میں احادیثِ صحیحہ اور دوسری فصل میں احادیثِ حسنہ ہوتی ہیں۔

(مصابيح السنة ج٤ ص١٧٤ حديث٤٧٧٢؛ مشكاة المصابيح ج٢ ص٥٠٤ حديث٦٠٩٦)

امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس حدیث کی سند صحیح ہے، وہ لکھتے ہیں:

وهذا خبر صحيح سنده.

"اور اس حدیث کی سند صحیح ہے"۔

(تهذيب الآثار للطبري ج ١ ص ٣٩٥ حديث ١٦٠٧ ، وط: ج ٤ ص ١٠٤ حديث ٨)

اس کی مزید تحقیق آئندہ حدیث کے تحت بھی آئے گی، إن شاء الله تعالىٰ.

حکمۃ کے معانی کی تفصیل

چونکہ اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو حکمت کا باب قرار دیا ہے، لہٰذا ہم سب سے پہلے لفظ حکمۃ کے معانی پر غور کرتے ہیں:

قاضی شوکانی (البقرۃ: آیت ۱۲۹) کے تحت لکھتے ہیں:

"حکمت سے مراد، دین کی معرفت، تأویل اور شریعت کی فہم ہے"۔

(فتح القدير ج ١ ص ١٦٦)

نواب صدیق حسن خاں اسی آیت کے تحت لکھتے ہیں:

"قول اور عمل میں مطابقت حکمت ہے اور ہر چیز کو اس کا اصل مقام دینا حکمت ہے، اور یہاں حکمت سے مراد دین کی معرفت، تأویل کی سمجھ اور شریعت کی فہم ہے، اور قتادہ نے کہا: اس سے مراد سنت ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ حق و باطل کے درمیان فرق کرنا حکمت ہے، اور ابن قتیبہ نے کہا: علم اور عمل حکمت ہے، اور کوئی شخص اُس وقت تک صاحب حکمت نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ ان دونوں کا جامع نہ ہو، اور ابن درید نے کہا: ہر وہ بات جس سے تم نصیحت حاصل کرو یا وہ بات تمہیں کسی عظمت سے ہمکنار کر دے یا قیامت کے عذاب سے بچا لے تو وہ حکمت ہے"۔

(فتح البيان ج ١ ص ٢٨٥)

قاضی شوکانی ایک مقام پر لکھتے ہیں:

"حکمت سے مراد علم ہے اور کہا گیا ہے کہ فہم ہے اور کہا گیا ہے کہ قول میں اصابت (درستگی) ہے، اور اس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ حکمت کو ان تمام معانی پر محمول کیا جائے، اور

اصل حکمت وہ ہے جو انسان کو حماقت سے باز رکھے، اور ہر قبیح چیز کا ارتکاب حماقت ہے"۔

(فتح القدیر ملخصاً ج۱ ص۳۱۹)

نواب صاحب نے اِن کے علاوہ مزید یہ اقوال بھی لکھے ہیں:

"حکمۃ سے مراد نبوۃ ہے، خشیت ہے، عقل ہے، تقویٰ اور ورع ہے، قرآن کی معرفت ہے، دین کی فقہ ہے، اللہ تعالیٰ کے احکام میں غور وفکر کرنا اور اس کی اطاعت کرنا ہے، اور سیدنا ابن عباس ؓ سے مروی ہے کہ قرآن مجید کی ناسخ ومنسوخ، محکم ومتشابہ آیات، مقدم ومؤخر آیات، قرآن کے حلال وحرام اور دیگر امور کی معرفت حکمت ہے۔ نیز اُن سے منقول ہے کہ قرآن کی تفسیر حکمت ہے، اور قرآن میں فقہ کا حصول حکمت ہے، اور حضرت ابوالدرداءؓ فرماتے ہیں: قرآن اور اس کی فہم حکمت ہے۔ امام نخعی نے بھی یہی فرمایا ہے، اور امام مجاہد فرماتے ہیں: حکمت سے مراد قرآن ہے اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے قرآن میں اصابت (درست فہم) عطا فرماتا ہے۔ نیز وہ فرماتے ہیں: قول میں اصابۃ بھی حکمت ہے، اور حضرت ابوالعالیہ اور مطر الوراق فرماتے ہیں: خوفِ الٰہی حکمت ہے۔ یہ تمام اقوال ایک دوسرے کے قریب ہیں کیونکہ حکمت احکام سے مصدر ہے اور قول وعمل میں مطابقت کا نام حکمت ہے۔ حکمت کی تفسیر میں جتنے اقوال مذکور ہوئے سب حکمت کی قسم سے ہیں اور حکمت ایک جنس ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کی کتاب حکمت ہے اور اس کے نبی کریم ﷺ کی سنت حکمت ہے، اور اصل حکمت وہ ہے جو حماقت سے باز رکھے اور ہر قبیح چیز کا ارتکاب حماقت ہے"۔

(فتح البیان ملتقطاً ج۲ ص۱۳۰)

حکمت کے معانی کا خلاصہ اور اس کا مفاد

اگر مذکورہ بالا تفصیل کا خلاصہ پیش کیا جائے تو حکمت کے معانی میں یہ مخصوص الفاظ سامنے آتے ہیں:

۱۔ قرآن کی تاویل

۲۔ قول وعمل میں مطابقت

۳۔ سنت

۴۔ حق وباطل کے مابین فرق کرنے کی قوت

۵۔ علم وعمل کی جامعیت

۶۔ ناسخ ومنسوخ، محکم ومتشابہ، مقدم ومؤخر آیات، قرآن کے حلال وحرام اور دیگر امور کی معرفت

۷۔ فہم قرآن

۸۔ خوف الٰہی

۹۔ اصل حکمت حماقت سے باز رہنا ہے۔

یہ نو معانی ہیں، جس شخص میں حکمت اپنے اِن تمام معانی کے ساتھ پائی جائے تو وہ کس شان ومقام کا حامل ہوتا ہے؟ اس کو امام خلیل بن احمد فراہیدی متوفی ۱۷۵ھ نے انتہائی جامع انداز میں بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

الحكمة: مرجعها إلى العدل والعلم والحلم.

"حکمت: عدل، علم اور تدبر کی طرف لوٹتی ہے"۔

(كتاب العين للفراهيدي ص ۲۰٤)

حکمت کے اس معنی کو مدنظر رکھتے ہوئے ذرا اُس حدیث کو ذہن میں لائیے جس میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی لختِ جگر سیدتنا فاطمۃ الزہراء علیہا السلام کو اُن کے نکاح کے وقت فرمایا تھا کہ ہم نے تمہارا نکاح اُس شخص کے ساتھ کیا ہے جو ہماری امت میں اسلام میں سب پر مقدم، علم میں سب سے زیادہ اور تدبر میں سب سے بڑھ کر ہے۔ پھر یہاں یہ بھی خیال رہے کہ جب یہ ارشاد فرمایا گیا تھا اُس وقت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی عمر مبارک تقریباً اکیس [۲۱] برس کی تھی، لہٰذا خود اندازہ کیجئے کہ بعد میں حکمت مرتضوی کا عالم کیا ہوگا؟

حکمۃ کے معانی کا مولا علی رضی اللہ عنہ پر اطلاق

اوپر معانی حکمۃ کا جو خلاصہ پیش کیا گیا ہے اُن میں سے ہر ہر معنی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی علمی اور عملی شخصیت پر پورا پورا صادق آتا ہے۔ یہاں ہم قارئین کرام کی علمی اور روحانی ضیافت کے لیے ہر معنی کی تائید میں احادیث وآثار پیش کر رہے ہیں، ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیے:

حکمت کا پہلا معنیٰ: تاویل قرآن

حکمت کا پہلا معنیٰ ہے: قرآن کریم کی تاویل، اور اس میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو ایسا کمال عطا ہوا تھا جس پر

چھوٹے بڑے تمام حضرات رشک کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابوسعید خدری ؓ بیان کرتے ہیں:

كنا جلوساً ننتظر رسولَ اللّٰه ﷺ، فخرج إلينا قد انقطع شسع نعله، فرمى به إلى علي ؓ، فقال: إن منكم رجلاً يقاتل الناس على تأويل القرآن كما قاتلتُ على تنزيله، قال أبو بكر: أنا؟ قال: لا، قال عمر: أنا؟ قال: لا، ولكن خاصف النعل.

"سیدنا ابوسعید خدری ؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے انتظار میں بیٹھے تھے کہ آپ ہماری طرف تشریف لائے۔ آپ کی نعل (جوتی) مبارک کا تسمہ ٹوٹ چکا تھا تو اسے آپ نے سیدنا علی ؓ کی طرف پھینکا، پھر فرمایا: تم میں سے ایک شخص تفسیر قرآن پر اسی طرح جہاد کرے گا جس طرح میں نے تنزیل قرآن پر جہاد کیا ہے۔ سیدنا ابوبکر ؓ نے عرض کیا: کیا وہ میں ہوں؟ فرمایا: نہیں۔ سیدنا عمر ؓ نے عرض کیا: کیا وہ میں ہوں؟ فرمایا: نہیں، لیکن وہ جوتی کی مرمت کرنے والا ہے۔ (اس وقت سیدنا علی ؓ حضور ﷺ کی جوتی کی مرمت فرما رہے تھے)"۔

(السنن الكبرىٰ للنسائي ج٧ص ٤٦٥ حديث٨٤٨٨ وط: ج٥ ص ١٥٤ حديث١ ٨٥٤؛ خصائص علي للنسائي بتحقيق البلوشي ص١٦٦ حديث١٥٦؛ المصنف لابن أبي شيبة ج١٢ص ٦٤ وط: بتحقيق محمد عوامة ج١٧ص ١٠٤، ١٠٥ حديث٣٢٧٤٤، ٣٢٧٤٥؛ مسند أحمد ج٣ ص٣١ حديث١١٢٧٨ وص٣٣ حديث ١١٣٠٩ وص٨٢ حديث١١٧٩٥، وط: ج١٨ص٢٩٦ حديث١١٧٧٣؛ المحصل لمسند الإمام أحمد بن حنبل ج١٤ص ١٢٠، ١٢١ حديث٢١٢٨٦، ٢١٢٨٧؛ فضائل الصحابة ج٢ص٧٧٧؛ صحيح ابن حبان ج١٥ص ٣٨٥ حديث٦٩٣٧؛ مسند أبي يعلىٰ ج٢ص٣٤٢ حديث١٠٨٦؛ المستدرك للحاكم ج٣ص١٢٢ حديث٤٦٧٩؛ دلائل النبوة للبيهقي ج٦ص٤٣٥، ٤٣٦؛ البداية والنهاية ج٥ص٤٧٨؛ جامع المسانيد والسنن لابن كثير ج١٢ ص٣٩، ٤٠ حديث٨٢، ٨٣، ٨٤؛ إتحاف الخيرة المهرة ج٧ ص١٨٧ حديث ٦٦٤٠؛ شرح السنة ج٦ص١٦٧ حديث٢٥٥٧؛ المقصد العلي حديث٨٤٩؛ مجمع الزوائد ج٩ ص ١٣٣ حديث ١٤٧٦٣؛ جمع الجوامع ج١٥ص٥٦٢ حديث١٥١٦٣؛ الخصائص الكبرىٰ ج ٢ ص٢٣٤)

حافظ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

"یہ حدیث امام احمد نے روایت کی ہے اور اس کے تمام راوی صحیح حدیث کے راوی ہیں، ماسوا فطر بن

خلیفہ کے اور وہ ثقہ (لائق اعتماد) ہے"۔

(مجمع الزوائد ج۹ ص۱۳۳ حدیث۱۴۷۶۳)

حافظ ہیثمی نے مسند ابی یعلیٰ کے تمام راویوں کو بھی صحیح کہا ہے۔

(مجمع الزوائد ج۵ ص۱۸۶ حدیث۸۹۵۰)

شیخ شعیب الارنؤوط نے بھی صحیح ابن حبان کی تحقیق میں لکھا ہے کہ اس حدیث کی سند امام مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح ہے۔

(الاحسان بترتیب صحیح ابن حبان ج۱۵ ص۳۸۵)

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی کتاب "فضائل الصحابۃ" کے محقق شیخ وصی اللہ بن محمد عباس نے بھی اس حدیث کی سند کو صحیح کہا ہے۔

(تعلیقات: فضائل الصحابۃ ج۲ ص۷۹۰ حدیث۱۰۸۳)

علامہ ابو اسحاق الحوینی الاثری کے نزدیک بھی اس حدیث کی سند صحیح ہے۔

(کتاب الحلي بتخریج خصائص علي ص۱۳۴)

اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد "کما قاتلتُ علی تنزیله" (جس طرح میں نے تنزیل قرآن پر جہاد کیا ہے) سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح نزولِ قرآن کی تکمیل میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یکتا ہیں اسی طرح تاویلِ قرآن کی تکمیل میں سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ یکتا ہیں حتیٰ کہ شیخین کریمین رضی اللہ عنہما سمیت کوئی بھی شخص اس مرتبہ میں اُن کا شریک نہیں، جیسا کہ متنِ حدیث میں اُن کی آرزو سے ظاہر و باہر ہے۔

تاویلِ قرآن میں بصیرتِ مرتضوی

بچپن میں سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تربیت میں آجانے کی بدولت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ تاویل وفہمِ قرآن میں اُس اعلیٰ مقام پر فائز تھے جہاں کوئی بھی غیر نبی انسان نہیں پہنچ سکا۔ چنانچہ شیخ شعیب الارنؤوط لکھتے ہیں کہ علامہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

قوله "من يقاتل على تأويل القرآن" أي يقاتل البغاة معتمداً فيه علىٰ تأويل القرآن، وهو قوله تعالىٰ: ﴿فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي﴾ وذلک لأن معرفة أن هؤلاء بغاة

يستحقون القتال يحتاج إلى التامل و الفهم، فجعل قتال أولئک مبنياً على التأويل.

قوله: ((على تنزيله)) اي قاتل المشركين معتمداً علىٰ تنزيل الله تعالىٰ قتالهم في القرآن بقوله ﴿قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ﴾ اي فيكم من يجمع بين قتال البغاة والمشركين. وفي هذا الحديث معجزة له ﷺ فقد اخبر قبل الوقوع، فوقع كما اخبر.

"ارشادِ نبوی ﷺ ہے کہ "ایک شخص تاویل قرآن پر قتال کرے گا" اس کا معنی یہ ہے کہ وہ قرآن کی تاویل پر اعتماد کرتے ہوئے باغیوں سے جنگ کرے گا، اور وہ اس ارشادِ الٰہی پر عمل پیرا ہوگا ﴿فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ﴾ (تو تم باغیوں سے جنگ کرو) [الحجرات: ۹] اور یہ اس لیے کہ اُن باغیوں کے مستحقِ قتل ہونے کی معرفت غور و خوض اور فہم کی محتاج ہے، لہٰذا اُن کے ساتھ قتال تاویل پر مبنی ہوا۔

ارشادِ نبوی ﷺ ہے "علی تنزیلہ" (قرآن کی تنزیل کے مطابق قتال) یعنی مشرکین سے نزولِ قرآن کے مطابق جنگ کرنا جو کہ اس آیت میں بیان ہوا: ﴿قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ﴾ (مشرکین سے جنگ کرو) [التوبۃ: ۳۶] یعنی تمہارے درمیان ایک شخص ہے جو مشرکین اور باغیوں کو قتال میں جمع کرے گا، اور اس حدیث میں نبی کریم ﷺ کا کھلا معجزہ ہے کہ آپ نے قبل از واقعہ اطلاع دی تو اُسی طرح واقع ہوا جس طرح آپ نے فرمایا تھا"۔

(حاشية: مسند أحمد ج٦ ص ٤٥١، ٤٥٢ وبتحقيق شعيب الأرنؤوط ج١٨ ص٢٩٧)

اس سے جہاں سیدنا علی ؓ کی بصیرتِ تامہ کا اندازہ ہوتا ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس کسی نے بھی اُن سے اختلاف کیا وہ اُس سے زیادہ یقین و بصیرت کے ساتھ تاویلِ قرآن پر گامزن تھے۔ یہاں اگر حسبِ ذیل آیت بھی مدِ نظر رکھی جائے تو ہر ہر مسئلہ میں حضور ﷺ کے بعد سیدنا علی ؓ کی بصیرت سب پر فائق نظر آئے گی۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ.

"آپ فرما دیجئے یہ میرا راستہ ہے، میں بلاتا ہوں اللہ تعالیٰ کی طرف، واضح دلیل پر ہوں میں اور

(وہ بھی) جو میری پیروی کرتے ہیں"۔

(یوسف:۱۰۸)

"وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ" میں نبی کریم ﷺ کے تمام متبعین شامل ہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سرفہرست ہیں۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

يعني وأصحاب محمد ﷺ كانوا على أحسن طريقة وأقصد هداية، معدن العلم، وكنز الإيمان وجند الرحمان.

"یعنی سیدنا محمد ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم حسین ترین طریقے اور مناسب ترین ہدایت پر تھے، وہ علم کا منبع، ایمان کا مخزن اور رحمان کا لشکر تھے"۔

(معالم التنزیل ج٤ ص٢٨٤)

اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ ان سب پر فائق تھے، کیونکہ تاویلِ قرآن میں جس مقام پر وہ فائز تھے وہاں کوئی دوسرا نہیں پہنچ سکا تھا، یہی وجہ ہے کہ فقط اُن ہی کو بابُ مدینۃ العلم اور بابُ دارالحکمۃ فرمایا گیا اور "خَاصِفُ النَّعْل" فرما کر تاویلِ قرآن میں اُنھیں ہی مقدم فرمایا گیا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جنھوں نے اُن سے اختلاف کیا وہ اُن سب سے زیادہ صاحبِ بصیرت اور صحیح تاویلِ قرآن پر تھے اور وہ جس طرف بلاتے تھے وہی راستہ مناسب ترین تھا۔ یونہی تو زبانِ نبوت ﷺ سے یہ ارشادات صادر نہیں ہوئے تھے:

- علی جدھر رُخ کرے گا حق ادھر ہوگا
- علی تمھیں "يأخذ بكم الصراط المستقيم" صراطِ مستقیم پر چلائے گا۔

ان الفاظ یعنی "يأخذ بكم الصراط المستقيم" کے ساتھ آئندہ صفحات میں یہ حدیث [۴۳] اور [۴۴] نمبر پر مکمل آ رہی ہے۔

حکمۃ کا دوسرا معنی: قول و فعل میں مطابقت

حکمۃ کا دوسرا معنی ہے "قول و عمل میں مطابقت" اور اس معنی پر سیر حاصل گفتگو حدیث الرایۃ کی تشریح میں ہو چکی ہے، اور سیدنا علی علیہ السلام کے اپنے ارشاد سے بھی یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے، چنانچہ وہ اپنی ذات سے نبوت کی نفی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

إني لست بنبي ولا يوحىٰ إلي ولكني أعمل بكتاب الله، وبسنة نبيه ﷺ، ما استطعت له.

''میں نہ نبی ہوں اور نہ ہی میری طرف وحی کی جاتی ہے لیکن میں حسب استطاعت کتاب الٰہی اور سنت نبوی ﷺ پر عمل کرتا ہوں''۔

اپنے علم کے مطابق عمل کرنے میں وہ اس قدر مستقیم تھے کہ حج کے موقعہ پر ایک مرتبہ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے روبرو اُن کے عمل کے خلاف عمل شروع کردیا حالانکہ وہ اُس وقت خلیفہ تھے، اس پر انہوں نے شکوہ بھی کیا لیکن سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں کسی شخص کی خاطر حضور ﷺ کی سنت کو ترک نہیں کرسکتا۔ یہ حدیث باحوالہ غزوۂ خیبر کی حدیث کی تشریح میں گذر چکی ہے۔

حکمة کا تیسرا معنی: سنتِ نبوی ﷺ

حکمة کا تیسرا معنی ہے ''سنت'' یعنی سنتِ نبوی ﷺ جیسا کہ ﴿يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾ سے ظاہر ہے، اور اس معنی میں بھی سیدنا علی المرتضیٰ ''أعلم'' (سب سے بڑے عالم) تھے، جیسا کہ ہم اس سلسلے ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی گواہی اس سے قبل نقل کرچکے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: هو أعلم الناس بالسنة'' (وہ تمام لوگوں سے بڑھ کر سنت کے عالم ہیں)۔ پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ فقط سنت کے بڑے عالم ہی نہیں تھے بلکہ متبع سنت بھی سب سے بڑے تھے جیسا کہ ہم ابھی ابھی حکمت کے دوسرے معنی میں واضح کرچکے ہیں۔

حکمة کا چوتھا معنی: حق وباطل میں فرق کرنے کی معرفت

حکمة کا چوتھا معنی ہے ''حق وباطل کے مابین فرق کرنے کی قوت'' اس معنی میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کامل ہی نہیں بلکہ اکمل تھے۔ چنانچہ قوتِ فیصلہ، پیچیدہ معاملات کی تہہ تک فوراً پہنچنا اور بروقت غلط کو بھانپ لینا، اور خطا کو صواب کی طرف پھیر دینا وغیرہ امور میں وہ اتنا مشہور ہیں کہ محتاج بیان نہیں۔ اگر حکمة کا یہ معنی سیدنا علی علیہ السلام کو سب سے زیادہ حاصل نہ ہوتا تو سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کیوں فرماتے کہ ''عورتیں علی جیسا جننے سے عاجز آگئیں'' اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کیوں فرماتے کہ ''علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہوجاتا''؟ اگر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو حکمت کا یہ معنی حاصل نہ ہوتا تو اسلام چند قدم بھی آگے نہ بڑھ سکتا۔ ذرا غور تو کیجئے کہ جب ابوسفیان نے سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر خلافتِ اولیٰ کی بیعت کرنا چاہی اور کہا کہ خلافت حق ہی آپ کا ہے اور ساتھ ہی یہ اندوہناک آفر کی کہ اگر آپ چاہیں تو میں ان

لوگوں کے مقابلہ کے لیے مدینہ کو حامیوں اور مؤیدین سے بھردوں گا تو اس موقعہ پر سیدنا علی ﷺ نے حکمت سے لبریز یہ جملہ ارشاد فرمایا تھا:

سلامةُ الدينِ أحبُّ إلينا مِنْ غيرِهِ.

"یعنی دین کی بقا ہمیں دوسری باتوں سے زیادہ عزیز ہے"۔

(المرتضیٰ لأبی الحسن علي الندوي، عربي ص٨٩، ومترجم اردو ص١٤٩)

حکمۃ کا پانچواں معنیٰ: علم وعمل کی جامعیت

حکمۃ کا پانچواں معنیٰ ہے "علم وعمل کی جامعیت" قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ حکمت کے معنیٰ میں لکھتے ہیں:

تحقيق العلم وإتقان العمل.

"علم کا محقق ہونا اور عمل کا خوب ہونا حکمت ہے"۔

(تفسير البيضاوي ج١ ص٥٧٠)

اِن دونوں لفظوں کی توضیح میں امام عصام الدین اسماعیل بن محمد حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

فيه تنبيه علىٰ أن من استكمل واحدة منهما دون الآخر فلا يكون حكيماً بل يبقى لئيماً، وإذا أحرز هذا الكمال صار من العلماء الربانيين، وإذا حرم منهما أو من إحداهما انقطع نسبته إلىٰ رب العالمين.

"اس میں تنبیہ ہے کہ جس شخص نے ان دونوں میں سے کسی ایک خوبی میں کمال حاصل کرلیا اور دوسری کو ترک کردیا تو وہ حکیم نہیں بلکہ لئیم ہوگا، اور جو دونوں میں کمال کو پہنچ گیا تو وہ عالمِ ربانی ہوگیا، اور جو ان دونوں سے یا ان میں سے کسی ایک سے محروم رہا تو رب العالمین سے اُس کی نسبت منقطع ہوگئی"۔

(حاشية القونوي علىٰ تفسير البيضاوي ج٥ ص٤٤٦)

اس معنیٰ کی کافی تفصیل حدیث الرایۃ کے تحت آچکی ہے، وہاں ملاحظہ فرمائیں، تاہم ہم نے حکمۃ کا جو دوسرا معنیٰ لکھا ہے وہ بھی تقریباً اس کا مترادف ہے۔ ایک مرتبہ پھر ملاحظہ فرمالیں۔

حکمت کا چھٹا معنیٰ: ناسخ و منسوخ وغیرہ کا علم

حکمت کا چھٹا معنیٰ ہے "ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ، مقدم و مؤخر آیات، قرآن کے حلال و حرام اور دیگر امور کی معرفت" اور ان تمام امور کی معرفت میں سیدنا علی المرتضیٰ ؓ پوری امت سے زیادہ تھے۔ چنانچہ حضرت ابو الطفیل ؓ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا علی ؓ نے ارشاد فرمایا:

"لوگو! مجھ سے سوال کرو! بخدا تم مجھ سے قیامت تک جس چیز کے متعلق بھی پوچھو گے میں تمہیں بتاؤں گا، اور تم مجھ سے قرآن مجید کی بابت سوال کرو، بخدا قرآن کریم کی کوئی ایسی آیت نہیں مگر میں جانتا ہوں کہ وہ رات میں اتری یا دن میں، میدانوں میں نازل ہوئی یا پہاڑوں میں"۔

(كتاب الفقيه والمتفقه ج٢ ص٣٥١، ٣٥٢؛ صحيح كتاب الفقيه والمتفقه ص٤٠٠؛ جامع بيان العلم ج١ ص٤٦٤؛ الإتقان ج٢ ص٤٦٦؛ تهذيب الكمال للمزي ج٢٠ ص٤٨٧؛ تذهيب تهذيب الكمال للذهبي ج٦ ص٤٧٠؛ الإصابة ج٧ ص٢٨١؛ جمع الجوامع ج١٣ ص٦٨، وص٢٢٧ مفصلاً وص٢٣٠)

اس حکمت پر مزید گفتگو آئندہ عنوان کے تحت بھی آرہی ہے۔

حکمت کا ساتواں معنیٰ: فہمِ قرآن

حکمت کا ساتواں معنیٰ ہے "فهم قرآن" اور اس میں سیدنا علی المرتضیٰ ؓ کو وہ کمال حاصل تھا کہ صحابہ کرام ؓ اس پر اظہارِ تعجب فرماتے تھے۔ چنانچہ کتب احادیث میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ صحابہ کرام ؓ نے سیدنا علی ؓ سے پوچھ ہی لیا کہ:

هل عندكم من رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم شيء غير القرآن؟

"کیا تمہارے (یعنی اہلِ بیت کے) پاس رسول اللہ ﷺ کی طرف سے قرآن کے سوا کوئی اور چیز بھی ہے؟

اُنہوں نے فرمایا:

لا، والذي فلق الحبة وبرأ النسمة إلا فهماً يؤتيه الله ﷻ رجلاً في القرآن.

"اس ذات کی قسم جس نے دانے کو چیرا اور جاندار کو پیدا فرمایا، نہیں!، ماسوا اُس مخصوص فہم کے جو

اللہ ﷻ کسی بندے کو قرآن کریم (کے سمجھنے) میں عطا فرماتا ہے"۔

(بخاري حديث٣٠٤٧، ٦٩١٥)

سب سے بڑا مفسر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا شاگرد

سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو فہم قرآن، تفسیر قرآن اور تاویلِ قرآن میں اس قدر حکمت و مہارت تامہ حاصل تھی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے اس علم میں جو حضرات سب سے زیادہ مشہور تھے وہ بھی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے شاگرد تھے۔ مثلاً سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ جبریل امین علیہ السلام نے انہیں قرآن مجید کا بہترین مفسر کہا اور خود نبی کریم ﷺ نے بھی بہترین مفسر فرمایا اور اُن کے حق میں تاویلِ قرآن، فہم قرآن اور حکمتِ قرآن کی دعائیں بھی منقول ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں ان کے لڑکپن میں سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی مجلس میں وہ مقام حاصل ہو گیا تھا جس پر بعض اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مبارک زبان شکوہ کناں ہو گئی تھی۔ بخاری شریف میں ہے کہ حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ نے فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو عرض کیا تھا:

"آپ اس کو ہمارے برابر مقام دیتے ہیں حالانکہ "إن لنا أبناء مثله" (اس کی مثل تو ہمارے بچے ہیں) فرمایا: ہم جس سبب سے اس کو مقام دیتے ہیں اُسے تم خوب جانتے ہو"۔

(بخاري حديث٣٦٢٧، ٤٢٩٤، ٤٤٣٠، ٤٩٦٩، ٤٩٧٠)

اِن کی اسی قرآن فہمی کی وجہ سے سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ انہیں بڑھا نوجوان فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ جب وہ ایک مجلس میں تشریف لائے تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ یوں گویا ہوئے:

ذاكم فتى الكهول إن له لسانا سؤولاً وقلباً عقولاً.

"تمہارے پاس بوڑھا نوجوان آ گیا، اس کے پاس پوچھنے والی زبان اور سمجھنے والا دل ہے"۔

(المستدرك للحاكم ج٤ حديث٦٣٥؛ حلية الأولياء ج١ ص٣٩٣؛ مجمع الزوائد ج٩ ص٢٧٧ وط: ج٩ ص٤٥٢ حديث١٥٥٢٣، وط: ج٩ ص٣٣٢ حديث١٥٥٢٣؛ الإتقان ج ٢ ص٤٦٨، وط: ص٧٨٤؛ الإصابة ج٤ ص١٢٥، سير أعلام النبلاء ج٤ ص٤٤٧)

بایں مقام و مرتبہ یہ عظیم مفسر بابُ مدینۃ العلم سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے شاگرد تھے۔ اس سے قبل کہ ہم اس بات کا ثبوت پیش کریں یہاں حدیث "أنا مدينة العلم وعلي بابها" کی اہمیت کو گھٹانے والے ایک لکھاری کا

اقتباس پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمارے ایک معاصر جو خود کو شیخ الحدیث والتفسیر کہلواتے ہیں، وہ سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کا حضرت ابن مسعود اور ابن عباس ﷺ سے موازنہ کرنے بیٹھ گئے، اور اپنی کتاب کے کئی صفحات اسی سلسلے میں سیاہ کر ڈالے، مکمل اقتباس درج کرنا طوالت کا باعث ہے، فقط اُن کے اُبلتے ہوئے چند الفاظ ملاحظہ ہوں۔ وہ لکھتے ہیں:

''اہل علم وذوق کی توجہ کے لیے ہم عرض کرتے ہیں کہ سیدنا ابن عباس ﷺ کو نبی کریم ﷺ نے ترجمان القرآن اور حبر الامۃ قرار دیا ہے اور انہیں کتاب وحکمت ملنے کی دعادی ہے۔ مسلم کی حدیث میں دین کی فقہ عطا ہونے کی دعادی ہے۔ اس لیے انہیں (افقه الناس) کہا جاتا ہے۔ ان القاب میں سے کوئی ایک لقب بھی اگر مولیٰ علی ﷺ کو مل جاتا تو روافض اور تفضیلی بھنگڑا ڈالنے لگ جاتے''۔

(ضربِ حیدري ص 111)

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ صاحب ''ضربِ حیدری'' کو حدیث مدینۃ العلم سمجھ نہیں آئے گی، کیونکہ ردِّ روافض میں وہ ابن تیمیہ وغیرہ کی سطح پر اتر آئے ہیں اور انہیں کی بولی بول رہے ہیں، اور اُسی کھائی میں گر رہے ہیں جس میں ان سے قبل بہت لوگ گر چکے ہیں۔ ہاں اگر کسی اور شخص نے اس حدیث کو کما حقہ سمجھنا ہو تو وہ قطبِ گولڑہ حضرت سیدنا پیر مہر علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق ملاحظہ فرمائے۔ انہوں نے ابن تیمیہ اور ان جیسے دوسرے لوگوں کی مہذب تردید کی ہے، اور وضاحت فرمائی ہے کہ کس طرح پوری دنیا کو سیدنا علی ﷺ سے علم پہنچا؟ یہ تمام بحث پڑھنے کی چیز ہے۔ اگر اہل علم وانصاف بغور اس تحقیق کو پڑھ لیں تو وہ قائل ہو جائیں گے کہ واقعی سیدنا علی ﷺ باب مدینۃ العلم ہونے میں خصوصیت رکھتے ہیں۔

(تصفیه مابین سنی وشیعه ص۶۳تا۸۹)

باقی صاحب ضربِ حیدری نے جو یہ لکھا کہ:

''ان القاب میں سے کوئی ایک لقب بھی اگر مولیٰ علی ﷺ کو مل جاتا تو روافض اور تفضیلی بھنگڑا ڈالنے لگ جاتے''۔

تو اس پر ہم عرض کرتے ہیں کہ بھنگڑا وگڑا تو تفضیلی اور رافضی ہی ڈالیں گے، البتہ ہم ''حجل'' (رقص) کو جائز سمجھتے ہیں اور چونکہ ہم سنی ہیں، لہٰذا ہمیں اگر ابن عباس ﷺ کی شان میں وارد القاب جیسے القاب بشمول سیدنا علی

ﷺ کسی بھی خلیفۂ راشد بالخصوص خلیفۂ اول امیر المومنین وامام المتقین سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں مل جائیں تو ہم پھر بھی رقص کریں گے۔ بہرکیف خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے لیے تو ہم اُس وقت رقص کریں گے جب اُن کی شان میں ہمیں ابن عباس کے القاب کی طرح القاب دستیاب ہوں گے مگر خلیفۂ رابع سیدنا علی علیہ السلام کی شان پر تو ہمیں ابھی اور فوراً رقص کرنا ہوگا کیونکہ صاحب "ضربِ حیدری" نے جن عظیم القاب والی ہستیوں کا ذکر کیا ہے وہ اپنی تمام تر فضیلتوں کے باوجود سیدنا علی المرتضیٰ علیہ السلام کے تلامذہ میں سے ہیں حتیٰ کہ توڑ مروڑ کے باوجود اس حقیقت کا اعتراف پیر سائیں کو بھی کرنا پڑا، وہ لکھتے ہیں:

"بعض رافضی کہتے ہیں کہ ابن عباسؓ چونکہ مولا علی کے شاگرد تھے لہٰذا یہ سب کچھ انہیں مولا علی سے ملا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ سیدنا ابن عباس نے مذکورہ بالا تمام کمالات محبوب کریم ﷺ سے براہ راست حاصل کیے ہیں جیسا کہ ان احادیث کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ اور سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے استفادہ انہوں نے بعد میں فرمایا ہے"۔

(ضربِ حیدری ص 224)

ہمارا ایمان ہے کہ دعاءِ نبوی ﷺ کی بدولت کسی بھی شخص کو پل بھر میں بلا استاد تمام علومِ ظاہری اور باطنی حاصل ہو سکتے ہیں لیکن ابن عباس رضی اللہ عنہ کے حق میں جو ادعیۂ نبویہ منقول ہیں اُن کی تاثیر یہ ہوئی کہ انہیں پوچھنے والی زبان اور سمجھنے والا دل مل گیا اور انہوں نے لڑکپن میں وہ علوم اپنے سینے میں جمع کر لیے جن پر عشرہ مبشرہ اور بزرگ ترین بدری صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رشک کرتے تھے، اور سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ مشکل مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ چنانچہ عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے ہاں جب کوئی مشکل مسئلہ آتا تو وہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے فرماتے:

قد طرأت علينا أقضية وعضل فأنت لها ولأمثالها ثم يأخذ بقولها.

"ہم پر ایک فیصلہ نے اور دشوار مسئلہ نے چڑھائی کی ہے، پس تم ہی اس کو اور اس کی مانند دشوار مسائل کو حل کر سکتے ہو۔ پھر وہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول کو لیتے"۔

(أسد الغابة ج٣ ص٢٩٦؛ معرفة الصحابة ج٣ ص١٨٢ حديث ٤٢٧٨، و ط: ص١٧٠٢ حديث ٤٢٦٢؛ الاستيعاب ج٣ ص٦٨؛ سير أعلام النبلاء ج٣ ص٣٤٧، و ط: ج٤ ص٤٤٨)

یہاں یہ خیال رہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سوال تو ہر ایک سے کرتے تھے، لیکن اُن کے نزدیک رسول اللہ

ﷺ کے بعد جو ذات حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی تھی وہ باب العلم سیدنا علی المرتضیٰ ؓ کی ذات بابرکات تھی۔ چنانچہ علماء کرام لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عباس ؓ نے فرمایا:

كنا إذا أتانا الثبت عن علي لم نعدل به.

"جب ہمیں سیدنا علی ؓ سے کوئی بات پہنچتی تو ہم اس کے برابر کسی بات کو نہ پاتے"۔

(تهذيب الكمال ج٢٠ ص٢٨٦؛ الإصابة ج٤ ص٤٦٧ وط: ج٧ ص٢٨٠؛ تذهيب تهذيب الكمال للذهبي ج٦ ص٤٧٠؛ الاستيعاب ج٣ ص٢٠٧؛ أسد الغابة ج٤ ص١١٠؛ تاريخ دمشق ج٤٢ ص٤٠٧؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٨ ص٢٦؛ قضاء علي بن أبي طالب ؓ لعبد المنعم ص٢٨)

صاحب "ضربِ حیدری" نے سیدنا ابن مسعود ؓ کی قرآن فہمی کی تعریف بھی کی ہے اور وہ برحق ہے، لیکن خدا کی قدرت دیکھئے کہ وہ بھی بایں مقام و مرتبہ سیدنا علی ؓ کے شاگرد ہیں۔ چنانچہ محدثین کرام لکھتے ہیں:

عن ابن مسعود قال: قرأت على رسول الله ﷺ سبعين سورة، وختمت القرآن على خير الناس علي بن أبي طالب رضي الله تعالىٰ عنه.

"سیدنا ابن مسعود ؓ فرماتے ہیں: میں نے ستر [٧٠] سورتیں رسول اللہ ﷺ سے پڑھیں اور میں نے قرآن کا ختم تمام لوگوں سے بہتر شخص علی بن ابی طالب ؓ کے پاس کیا"۔

(المعجم الكبير ج٤ ص٤٤٥ حديث ٨٣٦٥؛ مجمع الزوائد ج٩ ص٢٨٨ وط: ج٩ ص٤٧٢ حديث ١٥٥٦٠؛ مجمع البحرين ج٣ ص٣٧٩ حديث ٣٦٩٦؛ المناقب للخوارزمي ص٩٣؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٨ ص٢٤)

ایک اور مقام پر ہے کہ سیدنا ابن مسعود ؓ نے فرمایا:

لو أعلم أحدًا أعلم بكتاب الله مني تبلغه المطايا! قال: فقال له رجل: فأين أنت عن علي؟ قال: به بدأت، إني قرأت عليه.

"اگر میں کسی کو اپنے سے زیادہ قرآن کریم کا عالم جانتا تو پہنچ جاتے اس تک میرے اونٹ، اس پر ایک شخص نے کہا: آپ حضرت علی سے کیوں غافل ہیں؟ فرمایا: میں نے ان ہی سے ابتدا کی تھی اور میں اُن کے پاس پڑھ چکا ہوں"۔

(مختصر تاريخ دمشق لابن منظور ج١٨ ص٢٣)

اس اثر (قولِ صحابی) سے معلوم ہوا کہ سیدنا ابن مسعود ؓ نے مدینۃ العلم سے قرآن حاصل کرنے کے بعد بابُ مدینۃ العلم کی طرف بھی رجوع کیا، لیکن حیرت ہوتی ہے کہ اس کے باوجود صاحب ''ضربِ حیدری'' انہیں سیدنا علی ؑ پر ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''سیدنا ابن مسعود ؓ خود فرماتے ہیں کہ اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں قرآن کی کوئی ایسی سورت نہیں جسکے بارے میں مجھے علم نہ ہو کہ کہاں نازل ہوئی اور کوئی ایسی آیت نہیں جسکے بارے میں مجھے علم نہ ہو کہ کس مقصد کے لیے نازل ہوئی اور اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص قرآن کے بارے میں مجھ سے زیادہ علم رکھتا ہے، اگر میرا اونٹ اس تک پہنچ سکتا تو میں اپنا اونٹ اس کی طرف ضرور دوڑا دوں (بخاری حدیث رقم: ۵۰۰۲، مسلم حدیث رقم: ۶۳۳۳)۔

سیدنا علی المرتضیٰ ؓ نے فرمایا: سَلُوْنِیْ سَلُوْنِیْ، سَلُوْنِیْ عَنْ کِتَابِ اللّٰهِ فَوَاللّٰهِ مَا مِنْ آیَةٍ اِلَّا وَ اَنَا اَعْلَمُ اُنْزِلَتْ بِلَیْلٍ اَوْ بِنَهَارٍ یعنی مجھ سے پوچھ لو مجھ سے پوچھ لو مجھ سے کتاب اللہ کے بارے میں پوچھ لو، اللہ کی قسم کوئی ایسی آیت نہیں جس کے بارے میں مجھے علم نہ ہو کہ رات کو اتری یا دن کو (الاصابہ جلد ۲ صفحہ ۱۲۹۶، الاستیعاب صفحہ ۵۳۳)

سیدنا ابن مسعود اور سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہما دونوں کے الفاظ پر غور کیجئے، پہلا فرق یہ دیکھیے کہ دونوں کے اقوال کون کون سی کتابوں میں ہیں۔ دوسرا فرق یہ دیکھیے کہ سیدنا ابن مسعود ؓ اپنے سے زیادہ علم والے کو نہیں جانتے تھے۔ جبکہ مولائے مرتضیٰ نے اپنے سے اعلم کی نفی نہیں فرمائی۔ تیسرا فرق یہ دیکھیے کہ سیدنا ابن مسعود نے سَلُوْنِیْ یعنی مجھ سے پوچھ لو کا اعلان نہیں فرمایا جبکہ مرتضیٰ کریم نے یہ اعلان فرمایا ہے۔ اس اعلان کی وجہ سمجھنا نہایت آسان اور دلچسپ ہے۔ دراصل آپ نے یہ اعلان مکہ شریف اور مدینہ شریف میں بیٹھ کر نہیں فرمایا بلکہ کوفہ میں بیٹھ کر فرمایا۔ حرمین سے دوری کی وجہ سے وہاں کے لوگوں کو اس قسم کے اعلان کی سخت ضرورت تھی۔ آپ نے اپنا دار الخلافہ کوفہ میں منتقل فرما لیا تھا اور آپ کے اس اعلان کو روایت کرنے والے صحابی حضرت ابو طفیل بھی کوفہ کے رہنے والے ہیں''۔

(ضربِ حیدری ص 222,223)

احقر نے معاصر سائیں قاسمی کی عبارت کو تین پیراگراف میں تقسیم کیا ہے، اُن کا آخری پیراگراف اُن کے

ذاتی تبصرہ پرمبنی ہے، جس میں انہوں نے سیدنا علی ؓ کو حضرت سیدنا عبداللہ بن مسعود ؓ سے علماً کم دکھلانے کی کوشش کی ہے۔اس پرانہوں نے جو دلائل پیش کیے ہیں خدارا ذرا اُن دلائل میں غور تو فرمایئے! انہوں نے لکھا:

''پہلا فرق یہ دیکھیے کہ دونوں کے اقوال کون کون سی کتابوں میں ہیں''۔

اس پردہ یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ ابن مسعود ؓ کا قول بخاری میں ہے اور سیدنا علی ؓ کا قول غیر بخاری میں۔اس پر میں عرض کروں گا کہ بہ حیثیت حنفی ان ترجیحات سے اجتناب بہتر ہے، غیر مقلدین کی بولی آپ کے حق میں مفید ثابت نہیں ہوگی، تاہم سیدنا علی ؓ کا یہ ارشاد جس کتاب میں بھی ہے سنداً صحیح ہے، یہی وجہ ہے کہ دورِ حاضر کے نقاد لوگوں نے جب خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''الفقیہ والمتفقہ'' کو چھانٹ کر اُسے صحیح بنانے کی کوشش کی تو اس ارشاد کو خارج نہ کر سکے، جیسا کہ ہم ''حکمت کے چھپے معنی کے تحت'' اس کا حوالہ دے چکے ہیں۔اگر اب بھی تسلی نہ ہوئی ہو تو آیئے ہم اس ارشاد کی مزید تحقیق پیش کیے دیتے ہیں۔امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ حضرت ابوالطفیل ؓ بیان کرتے ہیں:

رأيت أمير المؤمنين علي بن أبي طالب ؓ قام على المنبر فقال: سلوني قبل أن لاتسئلوني ولن تسئلوا بعدي مثلي.

''میں نے سیدنا علی ؓ کو منبر پر جلوہ افروز ہو کر فرماتے ہوئے سنا ہے: لوگو! مجھ سے اس سے قبل سوال کر لو کہ تم مجھ سے سوال نہ کر سکو، اور تم میرے بعد مجھ ایسے شخص سے سوال نہیں کر سکو گے''۔

(المستدرك ج٢ ص٤٦٦، ٤٦٧ وط: ج٢ ص٥٠٧، ٥٠٨ حديث٣٧٣٦ وط: ج٣ ص٣٧١ حديث ٣٧٨٨؛ الصحيح المسبور من التفسير بالمأثور ج٤ ص٣٨٦)

امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ حدیث شیخین کی شرط کے مطابق صحیح ہے۔

بعض احادیث کے الفاظ یوں ہیں:

لاتسئلوني عن آية في كتاب الله ولا عن سنة رسول الله ﷺ إلا أنبأتكم بذلك.

''تم مجھ سے کتاب الٰہی کی جس آیت اور رسول اللہ ﷺ کی جس سنت کے متعلق پوچھو گے تو میں تمہیں اس کے بارے میں ضرور بتلاؤں گا''۔

(تفسير ابن كثير ج١٣ ص٢٠٧؛ تفسير ابن جرير ج٢١ ص٤٨٠، ٤٨١)

بعض روایات میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں:

سلوني قبل أن تفقدوني.

اس سے پہلے کہ تم مجھے نہ پاؤ مجھ سے دریافت کرلو"۔

کبھی فرمایا:

إنكم لن تجدوا أحداً من بعدي يحدثكم.

"بیشک میرے بعد تم کسی کو نہیں پاؤ گے جو تمہیں بیان کرے"۔

(تاریخ دمشق ج۴۲ ص۳۹۷، مختصر تاریخ دمشق ج۱۸ ص۲۲)

معاصر موصوف آگے لکھتے ہیں:

"دوسرا فرق یہ دیکھیے کہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ اپنے سے زیادہ علم والے کو نہیں جانتے تھے۔ جبکہ مولائے مرتضیٰ نے اپنے سے اعلم کی نفی نہیں فرمائی"۔

میں پوچھتا ہوں کہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہ اعلان کہاں فرمایا تھا، مدینہ میں یا کوفہ میں؟ دراصل انہوں نے یہ اعلان کوفہ میں کیا تھا۔ چونکہ وہ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے دور میں کوفہ پر مقرر کیے گئے تھے، اور کوفہ میں اُن سے بڑا عالم کوئی نہیں تھا۔ اگر ان کا یہ اعلان مدینہ منورہ میں تسلیم کیا جائے تو سائیں پیر کی بات پھر بھی نہیں بنتی، اس لیے کہ اُن کا وصال خلیفہ ثالث کے دور میں ہوا اور اُن کی نمازِ جنازہ بھی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے پڑھائی تھی، لہٰذا اُن کے مذکورہ بالا دعویٰ سے خلیفۂ ثالث پر بھی اُن کی علمی برتری ثابت ہوتی ہے، اور یہ سائیں پیر وغیرہ کے موقف کے خلاف ہے، کیونکہ ان کے نزدیک ہر طرح کی فضیلت خلافت کی ترتیب کے مطابق ہونا واجب ہے، اور جب غیر خلیفہ قرآن کا سب سے بڑا عالم ہو تو کیا سائیں پیر کے موقف کے مطابق خلیفۂ وقت کی خلافت جائز ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہو تو پھر ہم کہیں گے کہ جس طرح اعلم (ابن مسعود رضی اللہ عنہ) کی موجودگی میں خلیفۂ ثالث کی خلافت درست تھی، اسی طرح اعلم (علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ) کی موجودگی میں بھی خلیفۂ اول کی خلافت درست تھی۔

پیر سائیں کی فریب کاری

اس جملہ میں پیر سائیں کے استدلال کو پڑھ کر بیساختہ زبان پر یہ الفاظ آگئے: "رب رُسّے تے مت گھسّے" ذرا غور تو کیجئے کہ موصوف فقط اس لیے سیدنا علی علیہ السلام پر سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو ترجیح دے رہے ہیں کہ بقول اُن کے

سیدنا علی علیہ السلام نے اپنے سے زیادہ عالم کی نفی نہیں فرمائی جبکہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے سے زیادہ علم والے کی نفی فرمائی ہے۔اس استدلال کو پڑھ کر دعا ہے کہ اگر کوئی واقعی شیخ الحدیث ہو تو قادر مطلق اسے علم و منصب کی لاج رکھنے کی سعادت بھی عطا فرمائے۔جس بات میں موصوف کو سیدنا علی علیہ السلام کی کم علمی نظر آ گئی اُسی میں تو اُن کی عظمت پنہاں ہے! کیونکہ انہوں نے بعض احادیث کے پیشِ نظر ایسا دعویٰ نہیں کیا،اور وہ بعض احادیث یہ ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک موقعہ پر فرمایا تھا کہ وہ بڑے عالم ہیں تو بخاری شریف میں ہے:"فعتب اللّٰه عليه" (تو اللہ تعالیٰ نے اُن پر عتاب فرمایا تھا)[بخاري ص ٢٦ حديث ١٢٢؛الأحاديث الطوال ص ٩٥ حديث ٤٣] تاہم ہمیشہ الفاظ کو بھی نہیں دیکھا جاتا بلکہ موقعہ کی نزاکت کو مدنظر رکھنا بھی دانشمندی کا تقاضا ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر پبلک کی ضرورت کے پیشِ نظر کوئی صاحبِ علم و صلاحیت اس قسم کا اظہارِ خیال کرے تو اُسے تکبر نہیں سمجھا جائے گا۔سو جہاں سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اپنے سے زیادہ عالم کی نفی نہیں فرمائی تو وہاں اُن کی تواضع ہے اور جہاں نفی فرمائی ہے وہاں اُن کے مدنظر پبلک کی ضرورت تھی۔قرآن میں جو حضرت یوسف علیہ السلام کے "إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ" کے الفاظ آئے وہ ایسی ہی ضرورت کے پیشِ نظر تھے۔افسوس کہ معاصر مذکور شیخ الحدیث والتفسیر کہلانے کے باوجود محض رافضیت کی ضد میں ایسی واضح حقیقت سے عمداً روگرداں ہیں اور سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ اُن کے شاگرد کا تقابل کرنے میں کوشاں ہیں۔إنا لله وإنا إليه راجعون.

پیر سائیں کے تیسرے فرق کی عبارت قدرے طویل ہے،لہٰذا پورے اقتباس کے لیے آپ خط کشیدہ الفاظ میں غور فرمائیں،مگر میں اُن کا ایک آدھ پُر فریب جملہ دوبارہ نقل کیے دیتا ہوں،وہ لکھتے ہیں:

''دراصل آپ نے یہ اعلان مکہ شریف اور مدینہ شریف میں بیٹھ کر نہیں فرمایا بلکہ کوفہ میں بیٹھ کر فرمایا''۔

اس جملہ سے پیر سائیں یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ حرمین شریفین سے کہیں دور کوفہ میں یہ اعلان کیا گیا جہاں واقعی سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بڑا عالم کوئی نہیں تھا۔واہ پیر جی واہ! بلاشبہ آپ اپنے خفیہ حملوں اور مبہم جملوں پر ایوارڈز کے مستحق ہیں،تاہم وہ آپ کو آپ کے مداحوں سے ملیں گے۔ہم پرانی روش کے لکیر کے فقیر لوگ تو آپ کی تحقیق کی قدر و منزلت سے ہی نابلد ہیں،لہٰذا ہم اس مسئلہ میں پرانی روش کے مطابق اُن ہستیوں کی طرف رجوع کرتے ہیں جو تقریباً تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے چشمہ ہائے علم سے سیراب ہوئیں اور اُن ہی سے دریافت کرتے ہیں کہ اُنہوں نے کس کو کیسا پایا؟ آیئے یہ معلومات اُس ہستی سے لیتے ہیں جنہوں نے فقط مدینہ،مکہ،شام اور کوفہ ہی نہیں بلکہ آفاق

عالم میں جہاں کوئی صحابی رسول موجود تھا اُس سے علم لیا، حتی کہ اُن کے بارے میں حضرت شعبی ﷛ فرماتے ہیں:

ما رأيت أحداً كان أطلب للعلم في أفق من الأفاق من مسروق.

''میں نے آفاق میں کسی کو حضرت مسروق ﷛ سے زیادہ علم طلب کرنے والا نہیں دیکھا''۔

(علل الحديث لابن المديني ص۲۸۲؛المعرفة والتاريخ للفسوي ج۲ ص۳۲۵؛تاريخ بغداد ج۱۳ ص۲۳۴؛تهذيب الكمال ج۲۷ ص۴۵۴؛تذهيب تهذيب الكمال ج۸ص۴۱۹؛تاريخ دمشق ج۵۷ ص۴۰۵؛مختصر تاريخ دمشق ج۲۴ ص۲۴۵؛سير أعلام النبلاء ج۵ ص۱۰۳؛تهذيب التهذيب ج۸ص۱۳۳)

یہ ثقہ تابعی اور کوفی ہیں۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں: یہ مخضرمین یعنی اُن لوگوں میں سے ہیں جو نبی کریم ﷺ کی ظاہری حیات میں ایمان تو لا چکے تھے مگر دیدار نہ پا سکے تھے۔ انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق ﷛ کی اقتدا میں نماز پڑھی ہے اور ایک قول کے مطابق سیدنا ابوبکر ﷛ سمیت تمام اکابر صحابہ ﷛ سے براہ راست روایت لی ہے۔ یہ حضرت ابن مسعود ﷛ کے تلامذہ میں سے ہیں، انہوں نے کوفہ میں ابن مسعود سے علم لیا تھا، اور ابن مسعود ﷛ کا ان سے بڑا کوئی شاگرد نہیں تھا۔ امام علی بن المدینی ﷛ فرماتے ہیں:

ما أقدِّم على مسروق أحداً من أصحاب عبدالله، صلّى خلف أبي بكر ولقي عمرو علياً.

''میں سیدنا عبداللہ بن مسعود ﷛ کے تلامذہ میں سے کسی کو مسروق ﷛ پر مقدم نہیں سمجھتا، انہوں نے سیدنا ابوبکر کے پیچھے نماز پڑھی اور سیدنا عمر و علی ﷛ سے ملاقات کا شرف پایا''۔

(علل الحديث ص۲۸۲؛تاريخ بغداد ج۱۳ ص۲۳۴؛سير أعلام النبلاء ج۵ ص۱۰۵؛تهذيب التهذيب ج۸ص۱۳۴)

امام شعبی ﷛ نے ایک مرتبہ فرمایا:

''میں تمہیں ایک قوم کا حال اس طرح بتاتا ہوں گویا کہ تم انہیں دیکھ رہے ہو: حضرت شریح علم قضا میں سب سے بڑے عالم تھے، اور حضرت عبیدہ علم قضا میں اُن کے لگ بھگ تھے، حضرت علقمہ پر سیدنا ابن مسعود ﷛ کے علم کی انتہا ہوتی ہے اور وہ علم اُن سے تجاوز نہیں کرتا'' وأما

مسروق فأخذ عن كل"(اور رہے حضرت مسروق تو انہوں نے ہر ایک سے علم لیا)"۔

(تاريخ دمشق ج٥٧ص ٤٠٩؛ مختصر تاريخ دمشق ج٢٤ص ٢٤٥)

آیئے دیکھتے ہیں کہ جنہوں نے ہر ایک سے علم لیا اُن کا ذاتی تجربہ کیا ہے؟ وہ فرماتے ہیں:

شاممتُ أصحابَ محمد ﷺ فوجدتُ علمَهم انتهى إلى ستة: علي، وعمر، وعبد اللّٰه، وزيد، وأبي الدرداء، وأبي. ثم شاممتُ الستة، فوجدتُ علمَهم انتهىٰ إلى علي وعبد الله.

"میں نے سیدنا محمد ﷺ کے صحابہ کرام کی صحبت اختیار کی تو میں نے اُن سب کے علم کی انتہا چھ حضرات تک پائی: حضرات علی، عمر، عبداللہ، زید بن ثابت، ابوالدرداء اور ابی بن کعب۔ پھر میں نے ان چھ حضرات کی صحبت اختیار کی تو اُن کے علم کی انتہا دو پر پائی: سیدنا علی اور عبداللہ بن مسعود"۔

(سير أعلام النبلاء ١ص ٤٩٣وج٣ص ٣١٠؛ علل الحديث للمديني ص١٠٣؛ المعجم الكبير ج٩ ص٩٦ حديث ٨٥١٣؛ المعرفة والتاريخ للفسوي ج١ص ٤٤٤؛ تاريخ دمشق ج٣٣ ص١٥٤، ١٥٥، وج٤٢ص ٤٠٩؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٨ص ٢٦، ٢٧وج ١٤ص ٦٢؛ إعلام الموقعين ج٢ص ٢٥؛ مجمع الزوائد ج٩ص ١٦٠ وط: ج٩ص ٢٥١ حديث ١٤٩٤٣، وط: ج١٨ص ٤٣٦ حديث ١٤٩٣٩)

انہوں نے اسی حقیقت کو دوسرے مقام پر یوں ادا کیا ہے:

انتهى العلم إلى ثلاثة: عالم بالمدينة، وعالم بالشام، وعالم بالعراق. فعالم بالمدينة علي بن أبي طالب، وعالم بالكوفة: عبد الله بن مسعود، وعالم الشام أبو الدرداء، فإذا التقوا ساءَ ل عالمُ الشام وعالمُ العراق عالمَ المدينة ولم يسألهم.

"علم کی انتہا تین شخصوں پر ہوتی ہے: عالم مدینہ، عالم شام اور عالم عراق پر۔ پس عالم مدینہ علی المرتضیٰ ہیں، عراق کے عالم عبداللہ بن مسعود ہیں اور شام کے عالم ابوالدرداء ہیں۔ پس جب ان کی باہم ملاقات ہوتی تو شام اور عراق کے دونوں عالم مدینہ کے عالم سے سوال

کرتے اور وہ [عالمِ مدینہ] اُن سے سوال نہ کرتا"۔

(تاریخ دمشق ج۴۲ ص۴۱۰؛ مختصر تاریخ دمشق ج۱۸ ص۲۷؛ المناقب للخوارزمي ص۱۰۲؛ إعلام الموقعين لابن القيم ج۲ ص۲٤)

یہ فقط حضرت مسروقؓ کا ذاتی مشاہدہ ہی نہیں بلکہ یہ بات خود اُن کے استاذِ گرامی سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی منقول ہے، چنانچہ امام محب الدین الطبری، شیخ احمد عز دعنایہ اور دکتور علی محمد مصطفیٰ لکھتے ہیں:

عن أبي الزهراء، عن عبد الله قال: علماء الأرض ثلاثة: عالم بالشام، وعالم بالحجاز، وعالم بالعراق. فأما عالم أهل الشام فهو أبو الدرداء، وأما عالم أهل الحجاز فهو علي بن أبي طالب، وأما عالم العراق فاخ لكم. وعالم أهل الشام وعالم أهل العراق يحتاجان إلى عالم أهل الحجاز، وعالمُ أهل الحجاز لايحتاج إليهما.

"حضرت ابوالزہراءؓ سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: روئے زمین پر تین علماء ہیں: ایک عالم شام میں، ایک عالم حجاز مقدس میں اور ایک عالم عراق میں۔ اہل شام کے عالم سیدنا ابوالدرداءؓ ہیں، اہل حجاز کے عالم سیدنا علی بن ابی طالبؓ ہیں اور اہل عراق کا عالم تمہارا (یہ) بھائی ہے۔ اہل شام کا عالم اور اہل عراق کا عالم دونوں اہل حجاز کے عالم کے محتاج ہوتے ہیں اور اہل حجاز کا عالم اُن دونوں کا محتاج نہیں ہوتا"۔

(الرياض النضرة ج۳ ص۱۷۱؛ موسوعة العشرة المبشرون بالجنة ج۱۱ ص۱۲۷)

خیال رہے کہ یہ اُس دور کی بات ہے جب سیدنا علی المرتضیٰؓ ابھی مدینہ معظمہ میں ہی تشریف فرما تھے اور سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کوفہ میں تھے، اور اُن کا کوفہ میں ورودِ مسعود سیدنا فاروقِ اعظمؓ کے دور میں اُن ہی کے حکم پر ہوا تھا۔ پھر ابن مسعود سیدنا عثمان غنیؓ کے دور میں واپس مدینہ معظمہ بلا لیے گئے تھے اور شہادتِ عثمان غنیؓ سے قبل اُن کا وصال ہوا تھا جبکہ سیدنا علی المرتضیٰؑ نے شہادتِ عثمان غنیؓ کے بعد کوفہ کو منتخب فرمایا تھا۔ پھر وہاں پر جو لوگ سیدنا ابن مسعودؓ کے شاگرد تھے وہی اپنے استاذ الاساتذہ (سیدنا علیؑ) کے پاس بھی بغرض استفادہ آئے۔ انہوں نے اپنے استاذ اور دادا استاذ کے علم میں کیا فرق پایا؟ آیئے اُنہیں سے پوچھتے ہیں۔ علم قضا میں حضرت شریح کے موازی اور اُن کے استاذ بھائی حضرت عبیدہؓ بیان کرتے ہیں:

صحبتُ عبد الله سنة، ثم صحبتُ علياً، فكان فضل ما بينهما في العلم كفضل المهاجر على الأعرابي۔

''میں ایک سال تک سیدنا عبداللہ بن مسعود ﷛ کی صحبت میں رہا، پھر سیدنا علی ﷛ کی صحبت میں رہا تو میں نے علمی لحاظ سے ان دونوں کے مابین یوں فرق پایا جیسے مہاجر صحابی کا دیہاتی پر''۔

(تاریخ دمشق ج۴۲ ص۴۰۸؛ مختصر تاریخ دمشق ج۱۸ ص۲۶)

اللّٰہ أکبر کہاں سیدنا علی اور سیدنا ابن مسعود ﷛ کے تلامذہ کا اپنے استاذ اور دادا اُستاذ کے مابین موازنہ اور کہاں پندرھویں صدی کے شیخ الحدیث والتفسیر پیر سائیں غلام رسول قاسمی کی تک بندی؟ حق فرمایا تھا امام سبکی اور امام عسقلانی رحمۃ اللہ علیہما نے کہ بسا اوقات تردیدِ روافض میں تنقیصِ مرتضوی ہو جاتی ہے۔

اس مقام پر ''ضربِ حیدری'' کے معترضین حضرات سے راقم دست بستہ عرض کرتا ہے: غور فرمائیں کہ پیر سائیں کی یہ کارروائی ناصبیت تو نہیں، لیکن کیا اس میں تنقیصِ مرتضوی بھی نہیں؟ اللّٰہُ یُحِبُّ الانْصَاف، دل پر ہاتھ رکھ کر دامنِ انصاف تھامتے ہوئے فیصلہ فرمایئے! کیا آپ کے نزدیک پیر سائیں کا مذکور الصدر موازنہ درست ہے؟ وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا۔

قارئین کرام! یاد رہے کہ سیدنا علی اور ابن مسعود ﷛ کے مابین یہ علمی مفاضلہ و موازنہ فقط ظاہری علم کی حد تک ہے، رہا علمِ باطن تو اس سلسلے میں اُن کے مابین کوئی تقابل ہی نہیں جیسا کہ آگے متن میں خود سیدنا ابن مسعود ﷛ کا مقدس ارشاد آ رہا ہے کہ سیدنا علی المرتضیٰ ﷛ کے پاس علمِ ظاہر بھی تھا اور علمِ باطن بھی۔

علم میں مولا علی ؑ کا مدِ مقابل کہاں؟

سو جب علمِ مرتضوی کے سامنے عظیم القاب والی اِن شخصیات کی یہ حیثیت ہے تو پھر محبانِ مولیٰ علی ؑ جتنی خوشیاں منائیں کم ہیں۔ پس محبانِ مرتضیٰ کو راقم الحروف کا مشورہ ہے کہ وہ جھگڑا و نگڑا تو تفضیلیوں اور رافضیوں کے لیے رہنے دیں مگر اس بات پر ضرور سجدۂ شکر بجالائیں کہ اُن کے آقا جیسا بڑا عالم کوئی بھی غیر نبی انسان نہیں ہے، جیسا کہ تفضیلی مگر عالمِ برحق نوجوانانِ اہل جنت کے سردار سیدنا و مرشدنا امام حسن مجتبیٰ ؑ نے فرمایا تھا:

ما سبقه الأولون ولا يدركه الآخرون۔

"اُن پر اولین سبقت کر سکے اور نہ بعد والے پہنچیں گے"۔

(السنن الكبرى للنسائي ج٧ص٤١٦ حديث٨٣٥٤؛صحيح ابن حبان ج١٥ص٣٨٣ حديث ٦٩٣٦؛مسند أهل البيت لأحمد ص٢٧،٢٨ حديث٢،٣؛مسند أحمد ج١ص١٩٩ حديث ١٧١٩،١٧٢٠؛الزهد لأحمد ص١٩٥ حديث٧٠٩؛فضائل الصحابة ج١ص٦٧٤ حديث٩٢٢ وج٢ص٧٣٧حديث١٠١٣؛المصنف لابن أبي شيبة ج٦ص٣٧٢حديث٣٢٠٨٥ وص٣٧٣ حديث٣٢٠٩٦ وص٣٧٤حديث٣٢١٠١؛مسند أبي يعلى ج١٢ص١٢٥حديث٦٧٥٨؛ المستدرك ج٣ص١٧١حديث٤٨٥٥)

سیدنا علیؓ جملہ صحابہ کرامؓ سے بڑے عالم تھے،انہیں علم میں جو رسوخ حاصل تھا وہ کسی بھی دوسرے صحابی کو حاصل نہیں تھا۔اس حقیقت کو جس خوبصورت اور زوردار انداز میں علامہ محمد بن ابراہیم الوزیر الیمانی نے بیان کیا ہے وہ اُن ہی کا حصہ ہے،وہ لکھتے ہیں:

هذا أمير المؤمنين ـعليه السلام ـاختص من بين الصحابة والقرابة بالعلم الذي لم يماثل فيه،ولم يشارَكْ ولم يشابه فيه،ولم يقارب،بحيث إنه لم يُعلم ـ بعد الأنبياء عليهم السلام ـ نظير له في علمه ،الذي حير العقول، وأسكت الواصفين ، إلى أن قال... إنما هي منح ربانية،ومواهب لدنية،ولكثرة علمهؑ أتهم أن رسول اللهﷺ اخبره من الشريعة بما أخفاه عن الناس،فسأله رجل:ما الذي أسر إليک رسول اللهﷺ؟ فغضب، وقال:والله ما أسرّ إليّ رسول اللهﷺ شيئاً كتمه عن الناس،وإنما عندنا كتاب الله ،وشيء من السنة ذكره ﷺ،أوفهم أوتيه رجلٌ.

"یہ امیر المومنین (سیدنا علی)ؑ ہیں جو صحابہ واہل بیت کے مابین علم میں اس قدر مخصوص تھے کہ اُس میں اُن کا کوئی مدمقابل،شریک،مشابہ اور قریب بھی نہیں تھا،علم میں جو اُن کی حیثیت تھی انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد اُس کی نظیر نہیں جانی گئی،اُن کے علمی مقام نے عقلوں کو حیران اور واصفین کو ششدر کر دیا تھا......یہ محض ربانی عطائیں اور فیوضات الٰہیہ

ہیں۔ کثرتِ علمی کی وجہ سے اُن پر شک کیا جانے لگا کہ شاید رسول اللہ ﷺ نے اُنہیں شریعت کے کچھ ایسے امور بتلائے ہیں جو دوسروں سے مخفی رکھے گئے۔ چنانچہ ایک شخص نے اُن سے سوال کیا: آپ کو رسول اللہ ﷺ نے مخفی طور پر کیا بتایا؟ اس پر اُنہوں نے غضب ناک ہو کر فرمایا: اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ نے مجھے ایسا کچھ نہیں بتایا جسے دوسرے لوگوں سے چھپایا ہو، ہمارے پاس فقط اللہ ﷻ کی کتاب، رسول اللہ ﷺ کی بیان فرمودہ احادیث یا وہ فہم ہے جو کسی شخص کو عطا کی جاتی ہے"۔

(العواصم والقواصم فی الذب عن سنة أبی القاسم ج١ ص٢٤١)

علامہ موصوف ایک اور مقام میں لکھتے ہیں:

ألا ترى أن أبابكر وعمر وعثمان وكثيرا من الصحابة كانوا مجتهدين، ولم يكونوا في الرسوخ في العلم كأمير المؤمنين.

"کیا آپ غور نہیں کرتے کہ حضرت ابوبکر، عمر، عثمان اور صحابہ کرام ﷺ میں سے بہت حضرات مجتہدین تھے، لیکن اُنہیں امیر المومنین کی طرح علم میں رسوخ حاصل نہیں تھا"۔

(العواصم والقواصم ج٨ ص٢٦٥)

ان تصریحات ودلائل کی بنا پر محبانِ علی کو چاہیئے کہ وہ خوشیاں منائیں اور اگر کوئی جلنے والا ہو تو اُسے "مُوتُوا بِغَيْظِكُمْ" (مرجاؤ اپنی گھٹن میں) کا مژدہ بھی سنائیں۔

دفاعِ رافضیت میں تنقیصِ مرتضوی، در ماضی

دراصل جو انداز شیخ الحدیث والتفسیر پیر سائیں غلام رسول قاسمی زید عمرہ نے اختیار کیا ہے یہ ایک پرانی سنتِ سیئہ ہے۔ چنانچہ روافض کی تردید میں بعض قدیم مصنفین نے اپنے قارئین کو یہ طریقہ بتایا ہے کہ اگر روافض سیدنا علی المرتضٰی ﷺ کی شان میں کوئی حدیث بیان کریں تو پہلے تو تمہیں چاہیئے کہ ویسی یا اُس سے ملتی جلتی کوئی حدیث خلفاء ثلاثہ ﷺ کی شان میں لاؤ، اگر یہ نہ ہو سکے تو پھر عشرہ مبشرہ کے باقی حضرات کی شان میں آئی ہوئی کوئی حدیث لے آؤ، اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کسی بھی صحابی کی شان میں وارد شدہ ویسی حدیث پیش کر کے روافض کی تردید کر دو۔ چنانچہ روافض کی تردید میں قدیم وجدید جتنے مصنفین نے بھی لکھا ہے تقریباً سب اسی طریقے پر چلے ہیں۔ ابن تیمیہ

نے تو اس نہج پر چلتے ہوئے تمام حدیں عبور کر ڈالیں، حتیٰ کہ خصائص مرتضوی کے انکار میں ایک مقام پر یہاں تک لکھ دیا کہ علی کی شان میں دو حدیثوں کے سوا اور کوئی صحیح حدیث ہے ہی نہیں، حالانکہ ابن تیمیہ حنبلی ہے اور امام احمد ﷺ کی تحقیق کے مطابق جس قدر صحیح احادیث سیدنا علی ﷺ کی شان میں آئی ہیں اس قدر کسی بھی دوسرے صحابی کی شان میں نہیں آئیں۔ شیخ ابن تیمیہ کی اس سنتِ سیئہ پر بعد کے لوگ آنکھیں بند کر کے چلتے رہے اور چل رہے ہیں، حالانکہ امام سبکی، حافظ ابن حجر عسقلانی اور دوسرے اکابرین نے واضح طور پر لکھا ہے کہ روافض کی تردید کرتے کرتے علامہ ابن تیمیہ سے تنقیصِ مرتضوی ہو گئی تھی۔

ابن تیمیہ سے قبل اس طریقہ کو علامہ ابو بکر الباقلانیؒ نے رواج دیا تھا۔ چنانچہ شیخ سعید ممدوح لکھتے ہیں کہ خلفاء اربعہ ﷺ کے فضائل پر علامہ باقلانی کی ایک ضخیم تصنیف "مناقب الأئمة الأربعة" کے نام سے مشہور ہے، جس میں انہوں نے خلفاء ثلاثہ ﷺ کے فضائل پر تو مستقل ایک ایک باب قائم کیا مگر خلیفۂ رابع سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کی شان میں مستقل باب قائم کرنے سے قاصر رہے۔ دوسرے نمبر پر انہوں نے یہی طریقہ چلایا اور تقریباً پوری کتاب میں اپنے قارئین کو تلقین کی کہ اگر روافض شانِ مرتضوی میں یوں کہیں تو تم یوں کہو۔ کتاب کا ایک بڑا حصہ "فَإِنْ قَالُوْا" (اگر وہ یوں کہیں) "فَقُوْلُوْا" (تو تم یوں کہو) سے بھرا ہوا ہے۔ پھر لکھا ہے کہ اگر وہ نسبی قرابت داری کو سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کی فضیلت وغیرہ میں پیش کریں تو تم اس کے مقابلہ میں حضرت عبداللہ بن عباس یا سیدنا عباس بن عبدالمطلب ﷺ کی قرابت داری کو لے آؤ۔ چنانچہ وہ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

فإن قالوا: فقد كان علي ﷺ من أخص عترته وقرابته، وابن عمه لحا، وليس لأبي بكر وعمر هذه المنزلة. قيل لهم ليس الفضل عند الله عز وجلّ حاصلاً بالقرابة من الرسول ﷺ لأنه أفضل من عبد الله بن العباس، وإن كان نسبه من النبي ﷺ مثل نسبه، ولأنه قد وجد من هو أقرب إلى النبي ﷺ ولا فضل له، وفي الجملة فإن التفضيل بالعمل، فإنما يُعْتَبَرُ فيما يَتَعَلَّقُ بقدرَةِ المُكَلَّفِ دون ماجُبِلَ عليه، ممّا لامَدْخَلَ له فيه وليس القَرَابَة والنَّسَبُ مِمَّا يَكْتَسِبُهُ العِبَادُ فلا يَجِبُ أنْ يكونَ به مُعْتَدّ في هذا البابِ، غيرُ تَعْظِيم النَّسَبِ والقَرَابَةِ، لكونِهِ نسب لرسولِ اللّهِ ﷺ وقرابة منه.

"پس اگر وہ کہیں کہ حضرت علی ﷺ نبی کریم ﷺ کے کنبہ اور قرابت داری سے مخصوص ہیں اور

آپ کے چچازاد ہیں اور حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو یہ قربت حاصل نہیں تو کہا جائے گا: اللہ ﷻ کے نزدیک رسول اللہ ﷺ سے قرابت داری کی کوئی فضیلت نہیں، اس لیے کہ حضرت علی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے افضل ہیں اگرچہ اُن کا نسب بھی نبی کریم ﷺ کے ساتھ ان کے نسب کی مانند ہے، اور اس لیے بھی کہ بعض لوگ نسباً اُن سے بھی زیادہ نبی کریم ﷺ کے قرابت دار ہیں حالانکہ اُن کی کوئی فضیلت نہیں، مختصر یہ کہ افضلیت کا تعلق عمل سے ہے، کسی مکلف شخص سے فقط اسی کا اعتبار کیا جائے گا، اور جس فطرت پر وہ پیدا ہوا اُس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، کیونکہ نسب کا فضیلت میں کوئی دخل نہیں، اور قرابت ونسب اُن چیزوں میں سے نہیں جنھیں بندے کسباً حاصل کرلیں، لہٰذا انہیں افضلیت کے باب میں شمار کرنا واجب نہیں، ماسوا اس کے کہ رسول اللہ ﷺ کے نسب وقرابت کی بدولت اُس کی تعظیم کی جائے گی"۔

(مناقب الأئمة الأربعة للباقلاني ص ۳۸۲)

اس عبارت میں پہلے تو علامہ باقلانیؒ نے حضرت ابن عباس اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی قرابت داری کو یکساں کہا ہے، جو بجا ہے۔ پھر سیدنا علی علیہ السلام کی اُن پر فضیلت ذکر فرمائی ہے اور وجہِ فضیلت کو قارئین کے ذہن پر چھوڑ دیا ہے تا کہ وہ خود سوچیں کہ جب قرابت داری میں برابری ہے تو اس فضیلت کی وجہ کوئی اور ہوگی۔ ظاہر ہے کہ وہ سیدنا علی علیہ السلام کی ابن عباس رضی اللہ عنہ پر ایمان وعمل میں سبقت ہے، اور چونکہ باقلانی کا اصل مقصد شیخین کریمین رضی اللہ عنہما سے تقابل ہے، اس لیے وہ قارئین کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ فضیلت کے معاملہ میں قرابت کا کوئی دخل نہیں عمل سے فضیلت ہوتی ہے۔ اس انداز تحریر سے وہ کھل کر تو نہیں مگر دبے الفاظ میں سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو عملاً کم ثابت کرنے کی کوشش میں ہیں مگر راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اگرچہ علامہ باقلانی رحمہ اللہ عظیم شخصیت، اعلیٰ قد کاٹھ اور شہرت کے حامل ہیں مگر علمی دنیا میں قد کاٹھ اور شہرت کی نہیں بلکہ فقط دلائل کی دال گلتی ہے۔ لہٰذا ہم اجاع حق میں عرض کرتے ہیں کہ علامہ باقلانی رحمۃ اللہ علیہ کا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو کم دکھلانے کا یہ انداز حق سے بعید ہے، اور اس پر دلیل وہ صحیح احادیث ہیں جن میں آیا ہے کہ سیدنا علی علیہ السلام نے تمام لوگوں سے قبل اظہارِ ایمان فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بطور تحدیث نعمت اُسے اپنے فضائل میں ذکر کیا ہے، جیسا کہ سنن ابن ماجہ وغیرہا میں صحیح حدیث آئی ہے، اور خود نبی کریم ﷺ نے بھی سیدنا علی علیہ السلام کے اُس وقت کے ایمان کو معتبر سمجھا تھا۔

چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی اور ان کے شاگرد رشید امام الحافظ قاسم بن قطلوبغا حنفی نے "الاختیار" کی

احادیث کی تخریج میں ذکر کیا ہے کہ امام ابن سعد نے "الطبقات" میں از اسماعیل بن ابو اویس، از اُبی، از حسن بن زید بن حسن بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے:

ان رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم دعا علياً إلى الإسلام وهو ابن تسع سنين ويقال دون التسع ولم يعبد وثناً قط لصغره، انتهى.

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو اسلام کی دعوت دی جبکہ وہ نو برس کے تھے اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے بھی کم عمر تھے، اور انہوں نے صغر سنی کی وجہ سے کبھی بت پرستی نہیں کی۔ حدیث مکمل ہوئی۔ ابن قطلو بغا فرماتے ہیں: پس اگر ان کا اسلام مقبول نہ ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں اسلام کی دعوت ہی نہ دیتے"۔

(الطبقات الكبرى لابن سعد ج۳ ص ۲۰؛ القول المستحسن ص ۲۳۱)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو اسلام کی دعوت دینے کا جو ذکر امام ابن قطلو بغا حنفی نے کیا ہے اُس کے الفاظ یہ ہیں:

فادعوك إلى الله وحده وإلى عبادته وكفر باللات والعزى.

"پس میں تمہیں اللہ وحدہ کی طرف بلاتا ہوں اور اس کی عبادت کی دعوت دیتا ہوں اور لات وعزی کی نفی کا حکم کرتا ہوں"۔

(السيرة النبوية لابن إسحاق ص ۱۱۸)

چونکہ چند گھنٹوں کے توقف کے بعد سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اِس دعوت کو قبول کر لیا تھا، اس لیے امام ابو القاسم ابن قطلو بغا حنفی اور امام ابن الترکمانی رحمۃ اللہ علیہما کا اس روایت سے یہ بہترین استدلال ہے، جزاھم اللہ تعالیٰ۔ سو جب سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایمانِ مرتضوی کو مقبول ومنظور اور معتبر قرار دیا تو پھر اس کے مقابلہ میں کسی دوسرے شخص کے افکار ونظریات اور تاویلات کی کیا حیثیت ہے؟

دفاعِ روافض میں تنقیصِ مرتضوی، درحال

علامہ باقلانی کی کتاب "مناقب الأئمة الأربعة" کے جن صفحات سے راقم نے اقتباس لیا ہے ان سے اگلے صفحات بھی انہوں نے حضرت سیدنا عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کی نسبی قرابت داری کی عظمت پر مگر محض سیدنا

علی المرتضیٰ ﷺ کی نسبی قرابت کے مقابل میں وقائعی نقطہ نظر سے لکھے ہیں۔ یہ بات میں اُن کی نیت پر حکم لگانے کے طور پر نہیں کہہ رہا بلکہ اُن کا اسلوب ہی اسی کی غمازی کر رہا ہے۔ اگر خوفِ طوالت نہ ہوتا تو میں کچھ سطور نقل کرتا، تاہم ایسا کچھ نمونہ شیخ الحدیث والتفسیر پیر سائیں غلام رسول قاسمی کی کتاب سے پیش کرتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں

"اگر قرابت داری افضلیت کا معیار ہے تو حضرت امیر حمزہ اور سیدنا عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہما دونوں مولا علی کی نسبت حضور ﷺ کے زیادہ قریب ہیں۔ کہاں چچا اور کہاں چچا کا بیٹا۔ چچا کا بیٹا چچا کی موجودگی میں میراث سے بھی محروم رہتا ہے۔ بلکہ ان سب ہستیوں سے زیادہ قرابت دار سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہا کو مولا علی سے بھی افضل ماننا پڑے گا اور خلافت کی حقدار بھی آپ ہی کو ماننا پڑے گا"۔

(ضربِ حیدری ص 238,239)

بلاشبہ قرابت داری میں چچازاد کی بہ نسبت چچا اقرب (زیادہ قریب ہوتا ہے) اور یقیناً نبی کریم ﷺ کے ان دونوں چچاؤں کا بڑا مقام ہے اور حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ چچا باپ کی مانند ہے، یہی وجہ ہے کہ عام صحابہ ﷺ ہی نہیں بلکہ خاص اور اکابر صحابہ کرام ﷺ حضرت عباس بن عبد المطلب ﷺ کو اسی نگاہ سے دیکھتے تھے حتیٰ کہ خلیفہ ثانی سیدنا عمر بن خطاب ﷺ تو سیدنا عباس بن عبد المطلب ﷺ کے وسیلہ سے بارش طلب کرتے تھے لیکن بایں ہمہ سیدنا علی ﷺ کی افضلیت کا تعلق محض قرابت داری سے نہیں بلکہ اُن کی افضلیت اُس سبقت پر مبنی ہے جو انہیں تمام رشتہ دار مسلمانوں اور تمام صحابہ کرام ﷺ پر حاصل ہے۔ خود سیدنا عباس بن عبد المطلب ﷺ کو بھی یہی گمان تھا کہ وہ بحیثیتِ چچا سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ سے افضل یا زیادہ محبوب ہیں مگر ایک سوال کے جواب میں نبی اکرم ﷺ نے اُن کی اصلاح فرمادی تھی۔ چنانچہ ایک طویل حدیث (جس کے بعض جملے تطبیق طلب ہیں) کے آخر میں ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے سیدنا عباس بن عبد المطلب ﷺ کو محبت میں آخر میں رکھا تو انہوں نے عرض کیا:

یارسول اللہ! جعلت عمک آخرھم؟ قال: إن علیاً قد سبقک بالھجرۃ.

"یارسول اللہ! آپ نے اپنے چچا کو اُن کے آخر میں کردیا؟ فرمایا: علی ہجرت میں آپ پر سبقت کرچکے ہیں"۔

(جامع الترمذي ص ٨٦٥ حديث ٣٨١٩؛ المعجم الكبير ج١ ص ١١١ حديث ٣٧٣؛ المستدرك ج٢ ص ٤١٦ وط: ج٣ ص ١٩٢ حديث ٣٦١٥؛ الأحاديث المختارة ج٤ ص ١٦٠، ١٦١ حديث ١٣٧٩،

١٣٨٠؛ مسند فاطمة الزهراء للسيوطي ص ٦٧ حديث ١٦٠؛ مشكاة ج ٢ ص ٥١٧ حديث ٦١٧٧؛ تحفة الأحوذي ج ١٠ ص ٢٩٩ حديث ٣٨٢٨)

اس توضیحِ نبوی ﷺ کے بعد وہ حضرات جو قرابتِ نبوی ﷺ میں سیدنا علی المرتضیٰ ؓ کے برابر تھے، سب معترف ہو گئے تھے کہ علی المرتضیٰ ؓ کی اولیت ہی اُن کی ہمہ قسم کی افضلیت کی اساس ہے۔ چنانچہ سیدنا عباس بن عبد المطلب ؓ کے پوتے حضرت خالد بن قثم بن عباس ؓ سے دریافت کیا گیا کہ:

من أين ورث عليٌّ رسولَ الله ﷺ؟ قال: إنه كان أوّلنا به لحوقاً، وأشدّنا به لزوقاً.

''سیدنا علی ؓ کیسے رسول اللہ ﷺ کے وارث ٹھہرے؟ انہوں نے جواب دیا: وہ ہم سب سے پہلے آپ ﷺ کے ساتھ شامل ہوئے اور ہم سب سے بڑھ کر آپ ﷺ کے ساتھ وابستہ رہے''۔

(السنن الكبرى للنسائي ج٧ ص ٤٤٧ حديث ٨٤٣٩، وط: ج ٥ ص ١٣٩ حديث ٨٤٩٣؛ المعجم الكبير ج ١٩ ص ٤٠ حديث ٨٥، ٨٦؛ المستدرك للحاكم ج ٣ ص ١٢٥، وط: ج ٣ ص ١٣٦ حديث ٤٦٣٣؛ مختصر تاريخ دمشق ج ١٨ ص ٢٠؛ إزالة الخفاء ج ٤ ص ٤٦٥)

امام حاکم نے فرمایا: یہ صحیح السند حدیث ہے اور امام بخاری اور امام مسلم نے اسے ذکر نہیں کیا، لیکن امام ذہبی نے کہا: میں کہتا ہوں: اس حدیث کی سند میں ایک ''شریک'' نامی راوی ہے اور اس کی حدیث کو ''حدیثِ حسن'' میں شمار کیا جاتا ہے ''صحیح'' میں نہیں''۔

(تلخيص المستدرك ج ٣ ص ١٢٥)

دوسری حدیث میں سوال کے الفاظ یوں ہیں:

أعلي ورث رسول الله ﷺ دون جدك وهو عمه؟ قال: إن علياً أولنا به لحوقاً، وأشدنا به لزوقاً.

''آپ کے دادا (عباس بن عبد المطلب ؓ) کی بجائے حضرت علی کیسے رسول اللہ ﷺ کے وارث بن گئے، حالانکہ آپ کے دادا حضور ﷺ کے چچا ہیں؟ انہوں نے کہا: بیشک علی ؓ ہم سب سے پہلے حضور اکرم ﷺ کے ساتھ شامل ہوئے اور ہم سب سے بڑھ کر آپ

کے ساتھ وابستہ رہے"۔

(السنن الكبرى للنسائي ج٧ ص٤٤٧ حديث ٨٤٤٠، وط: ج٥ ص١٣٩ حديث ٨٤٩٤؛ خصه علي ص١٠٥ حديث ١٠٦؛ تهذيب الخصائص علي ص٩١ حديث ١٠٣، ١٠٤)

حضرت خالد بن قثم بن عباس بن عبدالمطلب ﷺ نے جس سبقت مرتضوی کا ذکر کیا ہے اُس سے سبقتیں ہیں۔ ایک تو وہ جو نبی کریم ﷺ نے بعثت کے پہلے روز سیدنا علی ﷺ کو دعوت دی تھی اور چند گھنٹو بعد انہوں نے قبول فرمائی تھی، اور دوسری سبقت کا ذکر درج ذیل حدیث میں ہے:

''حضرت ربیعہ بن ناجذ ﷺ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے سیدنا علی بن ابی طالب ﷺ سے عرض کیا: اے امیر المومنین آپ اپنے چچازاد (نبی کریم ﷺ) کے وارث اپنے چچاؤں کی بجائے کیونکر ہوئے؟ اُنہوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے بنو عبدالمطلب کو جمع کیا، یا فرمایا کہ بلایا پھر ان کے لیے ایک مد طعام تیار کیا تو انہوں نے کھایا حتیٰ کہ وہ سب سیر ہو گئے اور کھانا جوں کا توں باقی رہ گیا، گویا کہ اس کو چھوا ہی نہیں گیا۔ پھر آپ نے ایک چھوٹے سے پیالہ میں پانی منگوایا جسے اُنہوں نے پیا حتیٰ کہ سیراب ہو گئے اور پانی یونہی باقی رہ گیا گویا کہ اسے چھوا، یا پیا ہی نہیں گیا۔ پھر آپ نے فرمایا: اے اولادِ عبدالمطلب! میں تمہاری طرف خصوصاً اور لوگوں کی طرف عموماً مبعوث کیا گیا ہوں، اور تم نے میرا یہ معجزہ اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔ لہٰذا تم میں سے کون اس بات پر میری بیعت کرتا ہے کہ وہ میرا بھائی، میرا ساتھی اور میرا وارث ہو؟ لیکن کوئی بھی نہ اٹھا تو میں اٹھا اور میں سب سے چھوٹا تھا، تو آپ نے فرمایا: بیٹھ جاؤ! پھر آپ نے تین مرتبہ یہ الفاظ دہرائے تو ہر مرتبہ میں اٹھا اور آپ نے فرمایا: بیٹھ جاؤ حتیٰ کہ تیسری مرتبہ آپ نے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ سیدنا علی ﷺ نے فرمایا: پس اِس سبب سے میں اپنے چچاؤں کی بجائے اپنے چچازاد (ﷺ) کا وارث ٹھہرا''۔

(السنن الكبرى للنسائي ج٧ ص٤٣٢ حديث ٨٣٩٧ وط: ج٥ ص١٢٦ حديث ٨٤٥١؛ مسند أحمد ١ ص١٥٩ حديث ١٣٧١، وط: ج٢ ص٤٦٦ حديث ١٣٧١؛ المحصل ج١٧ ص ٢١٤ ح ٢٤٩٥٩؛ فضائل الصحابة ج٢ ص٨٠٧ حديث ١١٠٨ وص ٨٧١ حديث ١١٩٦ وص ٨٨٧ ح ١٢٢٠؛ تفسير ابن أبي حاتم ج٩ ص٢٨٢٦؛ المعجم الأوسط ج٢ ص١٩٩٢ حديث ١٩٩٢؛

دمشق ج٤٢ص٤٦، ٤٧؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٧ص٣٠٧ تا٣١٢؛ تفسير الطبري ج١٩ص ١٤٨؛ تهذيب الآثار للطبري ج١ص٣٧٤حديث١٥٥٨؛ تاريخ الطبري ج١ص٥٤٣؛ تفسير ابن كثير ج١٠ص٣٧٨؛ الطبقات الكبرى لابن سعد ج١ص٨٩، ٩٠، وط: ج١ص١٥٨، وط: ج١ص١٤٧؛ دلائل النبوة للبيهقي ج٢ص١٧٩، ١٨٠؛ الدر المنثور ج٦ص٣٢٨؛ سبل الهدىٰ ج٢ص٣٢٤؛ حجة الله على العالمين ص٤٣٣، ٤٣٤)

حافظ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور اُن کے تمام راوی ثقہ ہیں، اور شیخ احمد شاکر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: اس کی سند صحیح ہے۔

(مجمع الزوائد ج٨ص٥٣٢حديث١٤١٠٩، وط: ج٨ص٣٨١حديث١٤١٠٩؛ مسند أحمد بتحقيق أحمد شاكر ج٢ص١٦٤، ١٦٥حديث١٣٧١)

ایک اور حدیث میں ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے بار بار دعوت دی اور ہر بار سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! اس دعوت کو میں قبول کرتا ہوں تو حضور ﷺ نے فرمایا:

أنت يا علي، أنت يا علي.

"اے علی آپ، اے علی آپ"۔

(مسند البزار ج٢ص١٠٥حديث٤٥٥؛ كشف الأستار ج٣ص١٣٨حديث٢٤١٧)

حافظ ہیثمی فرماتے ہیں:

"امام بزار رحمۃ اللہ علیہ کی ایک سند کے تمام راوی صحیح ہیں، ماسوا شریک کے اور وہ ثقہ ہیں"۔

(مجمع الزوائد ج٨ص٥٣٢حديث١٤١١٠، وط: ج٨ص٣٨١حديث١٤١١٠)

معلوم ہوا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی وجہِ افضلیت محض قرابت داری نہیں بلکہ اُن کی وہ سبقت ہے جو اُنہیں اہل بیت اور غیر اہل بیت سب پر حاصل ہے، اور وہ ہے اُن کا ایمان اور نماز وغیرہ اعمال میں سب پر مقدم ہونا، ماسوا دو چار نمازوں کے، جن میں اُن پر سیدتنا خدیجۃ الکبریٰ سلام اللہ علیہا کو سبقت حاصل تھی۔ دوسرا کوئی بھی انسان بعد از اعلانِ نبوت سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر ایمان و نماز کے لحاظ سے سبقت نہیں رکھتا۔ اس حقیقت کو حضرت عفیف الکندی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں انتہائی صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اور محدثین نے اسے صحیح حدیث کہا ہے، حوالہ جات کے لیے "شرح خصائص علي رضی اللہ عنہ" کی پانچویں حدیث ملاحظہ فرمائیں۔ امام احمد رضا حنفی رحمۃ اللہ علیہ نے

اس حدیث کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ اُس وقت نبی کریم ﷺ کے ساتھ سیدہ خدیجہ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ فقط دو ہی مسلمان تھے۔ چنانچہ وہ سیدنا عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کی زبانی لکھتے ہیں کہ انہوں نے کہا:

''یہ جوان میرے بھتیجے محمد بن عبداللہ ﷺ ہیں اور یہ لڑکے میرے بھتیجے علی اور یہ بی بی خدیجہ ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہما، میرے یہ بھتیجے کہتے ہیں کہ آسمان وزمین کے مالک نے انہیں اس دین کا حکم دیا ہے، اور اُن کے ساتھ ابھی یہی دو مسلمان ہوئے ہیں''۔

(فتاوی رضویہ ج ۵ ص ۹۲)

خط کشیدہ الفاظ آپ کی توجہ کے مستحق ہیں اور خصوصاً ''اُن کے ساتھ ابھی یہی دو مسلمان ہوئے ہیں'' کے الفاظ میں غور فرماتے ہوئے بتلایئے کہ اگر کوئی شخص فقط ایک دن ہی صحبتِ نبوی، ایمان، اسلام اور نماز میں سبقت رکھتا ہو تو کیا اُس کا تقابل اُس شخص کے ساتھ کیا جاسکتا ہے جو ابھی مسلمان ہی نہ ہوا ہو؟

مذہبی تعصب کی وجہ سے حق سے روگردانی

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ایک طرف تو نبی کریم ﷺ سیدنا عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کو اپنے باپ کی مانند تسلیم فرماتے ہیں لیکن دوسری طرف اُن پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو فضیلت دیتے ہیں، اور اس کے ساتھ ساتھ آپ یہ بھی جان چکے ہیں کہ اس فضیلتِ مرتضوی کو خود سیدنا عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ اور اُن کی اولاد بھی تسلیم کر چکی ہے، لیکن حیرت ہے کہ ایک مخصوص طبقہ کی ضد میں لکھنے والے لوگوں کو یہ حقیقت ہضم نہیں ہوئی اور انہوں نے ان ہی حضرات کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مدمقابل کے طور پیش کرنے کی ناکام کوشش کر ڈالی، حالانکہ ان حضرات نے نہ صرف یہ کہ نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں عظمتِ مرتضوی کا اعتراف کیا بلکہ بعد میں حسبِ موقعہ اس عظمت کو بیان بھی کیا۔

غور فرمایئے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی سبقتِ ایمانی کی فضیلت کو اُن کے اقارب میں تمام اکابر واصاغر تسلیم فرما چکے ہیں لیکن ایک مخصوص فرقہ کی ضد میں لکھنے والے لوگ نہیں تسلیم کرتے، اس کی وجہ کیا ہوگی؟ مزید غور فرمایئے کہ جب سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ بارگاہِ نبوی ﷺ سے استفادہ واستفاضہ میں سبقت کی بدولت اپنے بزرگوں پر سبقت لے گئے تو پھر دوسرے حضرات پر اُن کی سبقت وفضیلت میں کونسی بات مانع ہوسکتی ہے؟

خصوصیت مرتضوی رضی اللہ عنہ پر ڈاکٹر اسرار کا بیان

ایک مخصوص فرقہ کی ضد میں آکر جس حقیقت کا بعض اسلاف واخلاف انکار کر رہے ہیں اُس حقیقت کو مشہور

مقرر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب متوفی ۲۰۱۰ء نے اچھے انداز میں بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"غلام احمد پرویز صاحب نے حضرت عمرؓ کی سیرت کا عنوان "شاہکار رسالت" رکھا ہے لیکن میری رائے میں یہ لفظ حضرت علی کی شخصیت کے لیے زیادہ موزوں ہے کیونکہ بالکل ابتدائی عمر ہی سے آپ کو حضور کی تربیت میں پرورش پانے کا موقع ملا۔ پھر ایمان لانے کے بعد سے ہجرت تک اور ہجرت کے بعد حضرت فاطمہ سے نکاح تک آپ حضور ﷺ کے گھر میں ان کے ساتھ رہے۔ مکی دور میں حضرت علی سے متعلق صرف چند واقعات روایات میں آتے ہیں، کیونکہ اُس وقت آپ کی عمر بہت چھوٹی تھی لیکن نوعیت کے اعتبار سے یہ واقعات کافی اہم ہیں۔ پہلا واقعہ تیرہ برس کی عمر میں پیش آیا جب حضور ﷺ نے حکم خداوندی کی تعمیل میں بنو ہاشم کے لیے کھانے کا اہتمام کیا تاکہ اُنھیں اسلام کی دعوت دیں۔ اس کے جواب میں بنو ہاشم میں سے کھڑا ہوا تو کون! ایک تیرہ سالہ بچہ علی بن ابی طالب۔ اس موقع پر ان کی زبان سے جو جملے نکلے وہ تاریخی جملے ہیں۔ ذرا چشم تصور سے دیکھئے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے خاندان کو اللہ کی طرف بلا رہے ہیں اور حاضرین میں سے کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ کھڑا ہوتا ہے تو تیرہ برس کا ایک بچہ اور کہتا ہے کہ "اگرچہ میں عمر میں سب سے چھوٹا ہوں، اگرچہ میری آنکھیں دکھتی ہیں، اگرچہ میری ٹانگیں پتلی ہیں لیکن میں آپ کا ساتھ دوں گا"۔ اور تمام لوگ قہقہہ لگا کر دلوں میں شاید یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ یہ ہیں جو دنیا کی تاریخ کا رخ بدلنے کے لیے کھڑے ہوئے ہیں اور یہ تیرہ سالہ بچہ ہے جو ان کی مدد اور اعانت کے لئے خود کو پیش کر رہا ہے"۔

(مثيل عيسىٰ علي مرتضىٰ، [تحریر شدہ خطاب]: ڈاکٹر اسرار أحمد ص ۴۲،۴۴)

خلاصہ یہ ہے کہ سیدنا علیؑ دار حکمت کے باب ہونے کے لحاظ سے ہر طرح کی خیر کثیر سے مالا مال ہیں، عقل ہو، فہم ہو، علم ہو، عمل ہو، کثرتِ ثواب ہو یا محبوبیتِ خدا و مصطفیٰ ہو۔ ہر خیر میں اُنھیں دوسروں پر برتری حاصل ہے۔ تسلیم کہ ہر ایک معزز صحابی کو حکمت عطا ہوئی مگر سیدنا علیؓ کے علاوہ کسی بھی دوسرے شخص کو حکمت کا دروازہ نہیں فرمایا گیا۔ دیکھئے! قرآن کریم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید بن حارثہؓ پر انعام فرمایا۔ [الأحزاب: ۳۷] جہاں اس سے یہ دلیل نہیں لی جا سکتی کہ دوسروں پر انعام الٰہی اور انعام نبوی نہیں ہوا، وہاں اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن مجید اور حدیث میں نام ذکر کے یہ اعلان فقط سیدنا زید

بن حارثہ ﷺ کی شان میں آیا اور یہ اُن کی خصوصیت ہے۔ اسی طرح "دار الحکمۃ" یا "مدینۃ العلم" کا باب ہونا بھی اُس ہستی کی خصوصیت ہے جن کی شان میں یہ اعلان ہوا، اور جن کا نام لیا گیا۔

قرابت داری کا وجہِ افضلیت ہونا

پیر سائیں نے ایک بات یہ بھی لکھی کہ:

"بلکہ ان سب ہستیوں سے زیادہ قرابت دار سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہا کو مولا علی سے بھی افضل ماننا پڑے گا اور خلافت کی حقدار بھی آپ ہی کو ماننا پڑے گا"۔

(ضربِ حیدری ص 239)

میں کہتا ہوں کہ بلاشبہ قرابتِ نبوی ﷺ بھی وجہِ افضلیت ہے۔ افضلیت ہوتی کیا ہے؟ صاف اور آسان لفظوں میں اگر کہا جائے تو سببِ افضلیت محض قربِ نبوی ﷺ ہے۔ یہ قرب کسی غیر ذی روح اور غیر ذوی العقول مخلوق کو مل جائے تو وہ اپنی ہم جنس دوسری چیزوں سے افضل ہو جاتی ہے، جیسا کہ جبل اُحد، اُستنِ حنانہ اور حضور ﷺ کی سواری کے جانور وغیرہ، اور اگر ذی عقول مثلاً آدمی کو مل جائے تو وہ اپنے ہم جنس دوسرے انسانوں سے افضل ہو جاتا ہے، جیسا کہ حبشہ کا بلال اور فارس کا سلمان کفار قریش سے یا تاخیر سے اسلام قبول کرنے والے طلقاء قریش پر سبقت لے گئے۔ پھر اس قربت کے علاوہ ایک اور قربت بھی وجہِ افضلیت ہے مگر اُس کی فضیلت اسی قربت پر موقوف ہے، اور وہ ہے قربتِ نسب۔ اگر کسی شخص میں یہ دونوں قربتیں جمع ہو جائیں اور وہ تاخیر سے بھی آئے تب بھی وہ عند اللہ، عند الرسول اور عند المسلمین دوسروں سے افضل ہوتا ہے۔ اسی افضلیت کے پیشِ نظر سیدنا فاروقِ اعظم ﷺ نے سیدنا عباس بن عبد المطلب ﷺ کے وسیلہ سے بارش مانگی تھی اور اللہ تعالیٰ نے اُن کے اس اقدام کو پسند فرمایا تھا اور بارش نازل فرما دی تھی، ورنہ سبقتِ اسلامی اور نماز و جہاد وغیرہ کے لحاظ سے تو فاروقِ اعظم ﷺ خود اور دوسرے کئی حضرات سیدنا عباس بن عبد المطلب ﷺ سے افضل تھے۔

اگر قرابتِ نبوی ﷺ کی عظمت کو مزید سمجھنا مقصود ہو تو سیدنا فاروقِ اعظم ﷺ کے درج ذیل طرزِ عمل میں غور فرمایئے!

"حضرت عروہ بن زبیر ﷺ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص حضرت عمر ﷺ کی مجلس میں حضرت علی المرتضیٰ ﷺ کی برائی کرنے لگا تو اُنہوں نے فرمایا:

تعرف صاحب هذا القبر؟هو محمد بن عبد الله بن عبد المطلب، وعلي بن أبي طالب بن عبد المطلب،فلا تذكر علياً إلا بخير.

"کیا تم اس قبر والے کو جانتے ہو؟ یہ ہیں محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب! اور علی ہیں ابن ابی طالب بن عبدالمطلب، پس تم خیر کے علاوہ علی رضی اللہ عنہ کا ذکر نہ کیا کرو"۔

(فضائل الصحابة ج٢ص٧٩٥رقم١٠٨٩؛تاريخ دمشق ج٤٢ص٥١٩؛مختصر تاريخ دمشق ج ١٨ص٧٧؛الرياض النضرة ج٤ص ١٠٦)

یہی فضیلت زبانِ نبوی سے یوں منقول ہے۔حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

الناس من شجر شتى وأنا وعلي من شجرة واحدة.

"لوگ مختلف شجروں سے ہیں اور میں اور علی ایک شجرہ سے ہیں"۔

(المعجم الأوسط ج٤ص٢٦٣حديث١٦٥١؛مجمع البحرين ج٣ص٣٧٣حديث٣٦٨٢؛ مجمع الزوائد ج٩ص١٠٠حديث١٤٥٨٢؛تاريخ دمشق ج ٤٢ص٦٤؛مختصر تاريخ دمشق ج ١٧ص٣١٦)

اللہ تبارک وتعالیٰ بھی تو قرابت کی عظمت کا اہتمام فرماتا ہے،جیسا کہ "وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا" سے ظاہر ہے،اور اُس کی حکومت کے کارکن بھی اس کا خیال رکھتے ہیں۔چنانچہ امام ابن سعد،امام حاکم اور امام احمد رضا حنفی رحمۃ اللہ علیہم لکھتے ہیں:

"حضرت محمد بن عمر بن علی رضی اللہ عنہ اپنے والد گرامی سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں نے جعفر طیار رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ جنت میں اُڑ رہے تھے اور ان کے قدموں سے خون بہہ رہا تھا،اور میں نے دیکھا کہ زید رضی اللہ عنہ جعفر رضی اللہ عنہ سے نیچے نیچے اُڑ رہے تھے۔میں نے کہا: میرا نہیں خیال تھا کہ زید رضی اللہ عنہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ سے کم ہوں گے۔اس پر جبرائیل علیہ السلام حاضر ہوئے اور عرض کیا:

إن زيداً ليس بدون جعفر ولكنا فضلنا جعفراً لقرابته منك.

"بیشک حضرت زید رضی اللہ عنہ حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ سے کم نہیں تھے لیکن ہم نے آپ کی قرابت کی

بدولت حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو فضیلت دی ہے"۔

(الطبقات الکبریٰ لابن سعد ج٤ ص٣٣٨ ؛ط: ج٤ ص٢٨ ؛ط: ج٤ ص٣٥ ؛المستدرك ج ٣ ص٢٠٩ ؛ط: ج٤ ص٢٢٠ حديث٤٩٩١ ؛فتاوی رضویة ج٢٣ ص٢٣٦)

پھر غور فرمائیے کہ اس قدر قرابتِ نبوی ﷺ کے ساتھ ساتھ جس خوش نصیب کو سبقتِ اسلام وصلوٰۃ بھی حاصل ہوئی اور وہ بایں سبب اپنے قرابت داروں سے افضل ٹھہرا تو وہ دوسروں سے کتنا افضل ہوگا؟

پیر سائیں کا یہ لکھنا کہ پھر قرابتِ نبوی ﷺ کے باعث تو سیدۃ النساء کو مولیٰ علی سے بھی افضل ماننا پڑے گا اور خلافت کی حقدار بھی انہیں کو ماننا پڑے گا۔ اس پر میں عرض کرتا ہوں کہ ہماری عقل بھی یہی کہتی ہے اور ہمارا جی بھی یہی چاہتا ہے کہ خونِ نبوی ﷺ کی بدولت سیدۂ کائنات مولیٰ علی علیہما السلام سے افضل ہوں اور کچھ ائمہ اہل سنت اس بات کے قائل بھی ہیں اور بعض اسی جہت سے سیدۂ کائنات علیہا السلام کو خلفاءِ اربعہ سے بھی افضل مانتے ہیں، جیسا کہ قاضی ثناء اللہ نقشبندی اور علامہ آلوسی وغیرھما۔ ام المومنین سیدتنا عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا تو قرابت داری سے قطع نظر مطلقاً فرماتی تھیں کہ فاطمۃ الزہراء کے ابا کے علاوہ میں نے کسی کو فاطمۃ الزہراء سے افضل نہیں دیکھا، صلوات اللہ وسلامہ علیہم۔ پھر اسی خونِ نبوی ﷺ کے قیاس پر سیدۂ کائنات کے لختِ جگر اپنے ابا سے افضل قرار پاتے ہیں مگر اس قیاس اور اپنی قلبی چاہت کے باوجود راقم الحروف سیدۂ کائنات اور اُن کی اولاد صلوات اللہ وسلامہ علیہم کو سیدنا علی علیہ السلام سے افضل نہیں کہہ سکتا۔ کیوں؟ اس لیے کہ فرمانِ نبوی ﷺ سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے۔ چنانچہ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

أخبرنا زكريا بن يحيى عن ابن أبي عمر قال: حدثنا سفيان، عن ابن أبي نجيح، عن أبيه، عن رجل قال: سمعتُ علياً على المنبر بالكوفة يقول: خطبتُ إلى رسول الله فاطمة عليها السلام فزوَّجني، فقلتُ يا رسول الله! أنا أحبُّ إليك أم هي؟ فقال: هي أحبُّ إليَّ منك، وأنتَ أعزُّ عليَّ منها.

"حضرت ابن ابی نجیح رحمہ اللہ اپنے والد اور ایک دوسرے شخص سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کوفہ میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو منبر پر فرماتے ہوئے سنا کہ میں نے نبی کریم ﷺ کی طرف فاطمہ علیہا السلام کے نکاح کا پیغام بھیجا تو آپ نے میرے ساتھ نکاح کر دیا پھر (ایک مرتبہ) میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں آپ کو زیادہ محبوب ہوں یا وہ؟ فرمایا: وہ مجھے تم سے

زیادہ محبوب ہے اور تم میرے نزدیک اُس سے زیادہ معزز ہو"۔

(السنن الکبریٰ للنسائي ج۷ص٤٦١ حدیث٨٤٧٨وط:ج٥ص١٥٠حدیث٨٥٣١؛سنن سعید بن منصور ج١ص١٦٧،١٦٨ حدیث٦٠٠؛مسند الحمیدي ج١ص٢٢،٢٣حدیث٣٨؛ فضائل الصحابة ج٢ص٧٨٣حدیث١٠٧٦؛بحر الفوائد،المشهور بمعاني الأخبار،للكلاباذي ج١ ص ٤٥٤،٤٥٥؛جمع الجوامع ج١٣ص٢٥)

چونکہ اس حدیث میں سیدنا علی ؑ کے حق میں سیدۂ کائنات سے زیادہ معزز ہونے کی تصریح ہے، لہٰذا اس صراحت کی موجودگی میں سیدنا علی کو سیدہ علیہما السلام سے مفضول ماننا مشکل ہے۔ اسی طرح حسنین کریمین بھی خونِ نبوی ﷺ ہیں مگر اُن پر بھی سیدنا علی علیہم السلام کی افضلیت میں تصریح آئی ہے۔ امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں:

سیدنا ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

الحسن والحسين سيدا شبابِ أهل الجنة وأبوهما خير منهما.

"حسن اور حسین نوجوانانِ اہلِ جنت کے سردار ہیں اور ان کے والد اُن دونوں سے بہتر ہیں"۔

(سنن ابن ماجه ج١ص٤٤حدیث١١٨؛المستدرك للحاكم ج٣ص١٦٧حدیث٤٨٣٢، ٤٨٣٣؛المعجم الكبير ج٣ص٣٠حدیث٢٦١٧وج١٩ص٢٩٢حدیث٦٥٠؛مجمع الزوائد ج٩ ص١٨٤،وط:ج ٩ ص٢٩٣حدیث١٥٠٨٨،١٥٠٨٩،وط: ج٩ص ٢١٢حدیث١٥٠٨٨، ١٥٠٨٩؛الجامع الصغير حدیث٣٨٢١)

یہاں "خیر" سے مراد فضیلت ہے، چنانچہ امام مناوی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

خير منهما: أي أفضل كما يصرح به لفظ رواية الطبراني: أفضل منهما.

"ان دونوں سے بہتر: کا معنی ہے ان دونوں سے افضل، جیسا کہ امام طبرانی کی روایت میں صراحتاً "افضل منهما" کے الفاظ آئے ہیں"۔

(فيض القدير ج٦ص٣٠٠٨)

امام مناوی علیہ الرحمۃ نے طبرانی کی جس حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ یہ ہے:

"حضرت حذیفہ بن یمان ؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز ہم نے رسول اللہ ﷺ

کے چہرۂ اقدس میں مسرت کے آثار دیکھے تو عرض کیا: یارسول اللہ! ہم آپ کے چہرہ مبارک میں مسرت کے آثار دیکھ رہے ہیں۔ فرمایا: میں کیوں نہ مسرور ہوں جبکہ میرے پاس جبریل علیہ السلام نے حاضر ہو کر بشارت دی کہ: إن الحسن والحسین سیدا شباب أهل الجنة وأبوهما أفضل منهما "بیشک حسن اور حسین نوجوانانِ جنت کے سردار ہیں اور ان کے ابا اُن دونوں سے افضل ہیں"۔

(المعجم الکبیر ج۳ ص۲۷ حدیث ۲۶۰۸؛ مجمع الزوائد ج۹ ص۱۸۴ حدیث ۱۵۰۸۷ وط: ج۹ ص۲۹۳ حدیث ۱۵۰۸۷، وط: ج۹ ص۲۱۲ حدیث ۱۵۰۸۷)

اِن تصریحاتِ نبوی ﷺ کی وجہ سے سیدۂ کائنات اور حسنین کریمین علیہم السلام کی سیدنا علی المرتضیٰ علیہ السلام پر افضلیت کا قول درست نہیں۔ شیخ عبدالغنی مجددی دہلوی لکھتے ہیں:

فيه فضيلة لعلي فإنه سيد السيدين.

"اس میں سیدنا علی علیہ السلام کی فضیلت ہے، کیونکہ وہ سید السیدین ہیں"۔

(إنجاح الحاجة مع شروح أخرىٰ ص۱۰۹)

باقی رہا پیر سائیں کا یہ کہنا کہ خلافت کی حق دار بھی سیدہ ہوتیں۔ اس پر ہم عرض کرتے ہیں: پہلی بات تو یہ ہے کہ شرعی طور پر کسی خاتون کی سربراہی فلاح کا موجب نہیں ہو سکتی، اور دوسری بات یہ ہے کہ سیدۂ کائنات علیہا السلام کی خلفاء کرام رضی اللہ عنہم پر افضلیت کے مذہب کی ہم تردید نہیں کرتے کیونکہ ہمارا عقیدہ تو یہ ہے کہ زمین کے جس مقام سے جسمِ نبوی ﷺ متصل ہے وہ مقام جنت تو کیا عرش و کرسی سے بھی افضل ہے اور سیدہ کائنات علیہا السلام تو ہیں ہی خود جسمِ نبوی ﷺ کا حصہ مگر بایں ہمہ ہم پوچھتے ہیں کہ شریعت میں یہ کہاں ہے کہ خلافت کے لیے افضل ہونا شرط ہے؟ نہ شریعت میں ایسی کوئی شرط ہے اور نہ ہی خلافت کی ترتیب کے لیے افضلیت کی ترتیب کو بطور شرط رکھا گیا ہے۔ چنانچہ آئندہ سطور میں ایک حدیث آرہی ہے جس میں غیر مبہم طور پر سیدنا ابوبکر صدیق، سیدنا فاروقِ اعظم اور سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہم کی اہلیتِ خلافت کو برابر بیان کیا گیا ہے اور افضل ومفضول کی بات نہیں فرمائی گئی، اور یہی مذہبِ اہلِ سنت ہے کہ جس شخص پر جمہور اربابِ تقویٰ مسلمانوں کا اتفاق ہو جائے اُس کی خلافت حق ہے، اگرچہ افضل کوئی اور شخص ہو۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ خلیفہ کا سب سے زیادہ محبوب ہونا، سب سے بڑا عالم ہونا اور سب سے افضل ہونا شرط ہے، قرآن وحدیث اور اہلِ سنت کے مذہبِ تحقیق میں یہ سب بے بنیاد اور بلا دلیل

دعوے ہیں۔ آیئے جب نوکِ قلم پر یہ الفاظ آہی گئے ہیں تو اس پر علماء عقائد کی تصریحات بھی ملاحظہ فرمالیں۔

کیا خلافت کے لیے افضلیت شرط ہے؟

شیعہ اور اکثر معتزلہ کے نزدیک خلیفہ کے لیے شرط ہے کہ وہ اپنے زمانے کے تمام لوگوں یا جن پر وہ خلیفہ ہوا اُن سب سے افضل ہو لیکن علماء اہل سنت کے نزدیک یہ شرط نہیں، لہٰذا اگر مفضول کی خلافت پر اہل تقویٰ مسلمانوں کا اجماع ہو جائے تو اس کی خلافت منعقد ہو جاتی ہے۔ چنانچہ امام نسفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ولايشترط في الإمام أن يكون معصوماً ولاأن يكون أفضل من أهل زمانه.

"اور یہ شرط نہیں ہے کہ خلیفہ معصوم ہو اور نہ ہی یہ شرط ہے کہ وہ اہل زمانہ سے افضل ہو"۔

(متن العقائد للنسفي ملحق بشرح العقائد ص ۲۲۲)

اس پر شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

كما زعمت الشيعة، وإن وافقهم بعض أهل السنة.

"جیسا کہ شیعہ سمجھتے ہیں، اگرچہ بعض اہل سنت نے اُن کی موافقت کی ہے"۔

(ميزان العقائد حاشية شرح العقائد ص ۱۵۸)

یہ بعض اہل سنت کون ہیں، آگے امام تفتازانی کی عبارت میں اس کی تصریح آرہی ہے۔

علامہ عبد العزیز پرہاروی لکھتے ہیں:

ولايشترط أن يكون أفضل من أهل زمانه، خلافاً للشيعة، وغرضهم ابطال خلافة من عدا الأئمة اثنا عشر.

"اور خلیفہ کا اہلِ زمانہ سے افضل ہونا شرط نہیں، بخلاف شیعہ کے، اور اس سے اُن کا مقصد بارہ اماموں کے علاوہ دوسروں کی خلافت کو باطل قرار دینا ہے"۔

(النبراس شرح شرح العقائد ص ۳۲۰)

علامہ ابن حجر مکی نے خلافت کے لیے افضل ہونے کی شرط کو شیعہ کی خرافات قرار دیا ہے۔

(الصواعق المحرقة ص ۵۷)

علامہ سعد الدین تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

ولا يشترط أن يكون هاشمياً ولا معصوماً ولا أفضل من ولي عليهم.

''اور اُس کا ہاشمی ہونا، معصوم ہونا اور جن پر وہ خلیفہ ہو اُن سے افضل ہونا شرط نہیں''۔

(شرح المقاصد ج۳ ص ۴۷۰؛ شرح العقائد ص ۱۵۸)

قاضی عبد الرحمان الایجی اور سید شریف علی بن محمد الجرجانی رحمۃ اللہ علیہما لکھتے ہیں:

في إمامة المفضول مع وجود الفاضل، منعه قوم كالإمامية.

''فاضل کی موجودگی میں مفضول کی خلافت کو ایک قوم نے ممنوع کہا ہے، جیسا کہ شیعہ''۔

(شرح المواقف ج۸ ص ۴۰۵)

علامہ سعد الدین تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

واشترطت الشيعة أن يكون هاشمياً بل علوياً، وعالماً بكل أمر حتى المغيبات، قولاً بلا حجة، مع مخالفة الإجماع، وأن يكون أفضل أهل زمانه، لأن تقديم المفضول قبيح عقلاً. ونقل عن الأشعري.

''شیعہ نے شرط عائد کی ہے کہ خلیفہ ہاشمی بلکہ علوی ہو، اور تمام امور کا عالم ہو، حتیٰ کہ غیبی امور کا بھی، یہ قول اجماع کی مخالفت کے ساتھ بلا دلیل بھی ہے، اور انہوں نے یہ بھی شرط عائد کی ہے کہ وہ اہل زمانہ سے افضل ہو، اس لیے کہ مفضول کو مقدم کرنے میں عقلی قباحت ہے، اور اشعری سے بھی یہی قول منقول ہے''۔

(شرح المقاصد ج۳ ص ۴۸۲؛ أصول الدين ص ۳۱۸، ۳۱۹)

افسوس کہ نہ صرف یہ کہ صاحب ''ضربِ حیدری'' بلکہ اُن کی کتاب کے بعض مقرظین بھی اسی شیعہ عقیدہ پر گامزن ہیں، چنانچہ ایک مقرظ صاحب لکھتے ہیں:

''فاضل کی موجودگی میں مفضول کو خلیفہ بنانا صحیح نہیں''۔

(تقریظ: ضربِ حیدری بار پنجم ص 44)

خیال رہے کہ ہم نے جن کتب سے یہ عبارات نقل کیں اُن میں سے اکثر میں افضل کی موجودگی میں مفضول کی امامت کی حکمتوں اور مصلحتوں کا ذکر بھی موجود ہے۔ اربابِ علم وانصاف اگر ان مقامات میں غور کریں گے تو انہیں حکمتوں اور مصلحتوں کے ساتھ ساتھ افضلیت کا قطعی یا ظنی ہونا بھی سمجھ آجائے گا۔

امام اشعری رحمہ اللہ کا بلا دلیل قول

آپ نے جان لیا کہ اہل سنت کے اسلاف کرام میں سے علامہ اشعری رحمۃ اللہ علیہ اس مسئلہ میں شیعہ کے موافق ہیں مگر اہل سنت میں تنہا ہیں، اور آپ یہ بھی جان چکے ہیں کہ امام تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ نے شیعہ کے قول کو بلا دلیل اور خلاف اجماع قرار دیا ہے تو پھر خود انصاف فرمایئے کہ بعینہ وہی قول امام اشعری سے منقول ہو تو وہ کیوں کر دلیل پر مبنی اور اجماع کے مطابق ہو سکتا ہے؟ لیکن افسوس کہ امام اشعری رحمہ اللہ سے جب ایک طرف یہ خلاف اجماع اور بلا دلیل قول صادر ہو گیا تو دوسری طرف انہوں نے شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کی افضلیت کی قطعیت کا قول بھی کر دیا، اور ظاہر ہے کہ انہوں نے یہ کہنا ہی تھا، حالانکہ اہل تحقیق کے نزدیک یہ مسئلہ قطعی نہیں ظنی ہے، مگر ہر زمانہ کے ضرورت مند لوگ علامہ اشعری کے اِن دونوں مرجوح قولوں کو چلائے جا رہے ہیں۔

اس ضمنی بحث کے بعد اب ہم پھر حکمت کے بقیہ معانی کی طرف آتے ہیں۔

حکمۃ کا آٹھواں معنی: خوفِ الٰہی

حکمۃ کا آٹھواں معنی ہے: ''خوفِ الٰہی'' اور سیدنا علی المرتضیٰ ؓ میں یہ معنی اپنے آخری درجہ پر تھا۔ کیونکہ جو جس قدر زیادہ ولی اللہ ہوتا ہے اتنا ہی اُس کے دل میں خوفِ الٰہی زیادہ ہوتا ہے، اور مولیٰ علی کا سید الاولیاء ہونا تو مسلّم ہے، اس لیے کہ آپ ہر مومن کے ولی اور مولیٰ ہیں۔ خود نبی کریم ﷺ نے اُن کے خوفِ خدا اور معاملات الٰہی میں اُن کی سختی کا ذکر حلفاً فرمایا۔ چنانچہ سیدنا ابو سعید خدری ؓ بیان کرتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے سیدنا علی ؓ کی شکایت کی تو حضور ﷺ ہمارے درمیان خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے، میں نے آپ کو فرماتے ہوئے سنا:

أيها الناس لا تشكوا علياً فوالله إنه لأخشن في ذات الله أو في سبيل الله.

''لوگو! علی کی شکایت نہ کیا کرو، خدا کی قسم! وہ ذات الٰہی یا راہ الٰہی میں سب سے زیادہ سخت ہے''۔

(مسند أحمد ج٣ ص٨٦ وط: ج٤ ص٢١٧ حديث ١١٨٣٩، وط: ج١٨ ص٣٣٧ حديث ١١٨١٧؛ غاية المقصد في زوائد المسند حديث ٣٦٥٧؛ المستدرك ج٣ ص١٣٥، وط: ج٣ ص ١٤٥ حديث ٤٦٥٤؛ حلية الأولياء ج١ ص٦٨؛ جامع المسانيد لابن الجوزي ج٣ ص٩٢ حديث ١٩٧٩؛ تقريب البغية للهيثمي ج٣ ص ١٠١ حديث ٣٣٠٢؛ مجمع الزوائد ج٩ ص ١٢٩، وط: ج٩ ص١٧٤ حديث ١٤٧٣٥، وط: ج٩ ص١٢١ حديث ١٤٧٣٥؛ ذخائر العقبىٰ ص١١٩؛ تاريخ دمشق ج٤٢ ص

٢٠٠؛ البداية والنهاية ج ٧ ص ٥٧٢؛ جامع المسانيد لابن كثير ج١٢ ص٤٨٨ حديث ٨٧٠؛ المسند الجامع ج٦ ص٤٧٩ حديث ٤٦٥٦)

امام حاکم نے اس حدیث کو شیخین کی شرط کے مطابق صحیح کہا ہے اور امام ذہبی نے اُن کی موافقت فرمائی ہے، اور حافظ ہیثمی نے فرمایا ہے: اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔

علامہ سندھی لکھتے ہیں:

أي أن فيه خشونة في الله، لا يراعي فيه أحداً، وهذا لا يوجب الشكاية منه.

''یعنی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے دل میں اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں سختی ہے، جس میں وہ کسی کی رعایت نہیں کرتے، اور یہ چیز اُن کی شکایت کا موجب نہیں ہوسکتی''۔

(حاشية مسند أحمد ج٧ ص٥٥؛ تعليقات لشعيب الأرنوط على مسند أحمد ج١٨ ص ٣٣٧)

زبانِ نبوت کی اس ضمانت سے معلوم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں یا بعد از وصالِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ہر اقدام ذاتِ الٰہی کی خاطر تھا، لہٰذا بعد از وصالِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم جو لوگ اُن سے برسرِ پیکار ہوئے اُن میں پہلا گروہ خطاءِ اجتہادی پر تھا، دوسرا گروہ بغاوت و معصیت پر تھا اور تیسرا گروہ ''يمرقون من الدين'' (دین سے خارج تھا، جبکہ ان سب کے مقابلہ میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا اقدام محض خوفِ الٰہی اور حکمت پر مبنی تھا۔

حکمت کا نواں معنیٰ: حماقت سے باز رہنا

حکمت کا نواں معنیٰ ہے ''حماقت سے باز رہنا'' حماقت کا انجام رسوائی اور ندامت ہوتی ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں حتمی ضمانت دی تھی کہ وہ کبھی رسوا نہیں ہوں گے۔ ارشاد فرمایا:

لا يخزيه الله أبداً.

''اللہ تعالیٰ انہیں کبھی رسوا نہیں فرمائے گا''۔

(مسند أحمد ج١ ص٣٣١ حديث ٣٠٦٢؛ فضائل الصحابة ج٢ ص٨٥٠ حديث ١١٦٨؛ السنن الكبرى للنسائي ج٧ ص٤١٦ حديث ٨٣٥٥، وط: ج٥ ص١١٢ حديث ٨٤٠٩؛ المستدرك ج٣ ص ١٣٢ حديث ٤٧٠٨؛ كتاب السنة لابن أبي عاصم ص٦٠٢، ٦٠٣ حديث ١٣٥١؛ المعجم الكبير ج ١٢ ص٩٧ حديث ١٢٥٩٣؛ المعجم الأوسط ج٣ ص١٦٥ حديث ٢٧١٥؛ مجمع البحرين ج٣

ص٣٨٦ حديث٣٧١٦؛ مجمع الزوائد ج٩ ص١١٩ حديث١٤٦٩٦، وط: ج٩ ص ١٥٨ حديث ١٤٦٩٦، وط: ج٩ ص١١٠ حديث١٤٦٩٦؛ إتحاف الخيرة المهرة ج٧ ص ١٩٥ حديث ٦٦٦٢؛ تاريخ دمشق ج٤٢ ص٩٧ تا ١٠٢؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٧ ص٣٢٨؛ الرياض النضرة ج٤ ص١٥٠؛ البداية والنهاية ج٥ ص ٤٥٠، وط: ج٧ ص٥٦١؛ الإصابة ج٤ ص٤٤٦٦؛ إزالة الخفاء ج ٤ ص٤٤٥، ٤٤٦)

امام حاکم رحمہ اللہ نے اس حدیث کی سند کو صحیح قرار دیا ہے اور امام ذھبی نے اُن کی تائید فرمائی ہے۔

(المستدرك للحاكم ج٣ ص١٣٢)

حافظ نور الدین ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اس حدیث کو امام احمد رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے، اور امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے "المعجم الكبير" اور "المعجم الأوسط" میں مختصراً روایت کیا ہے، اور امام احمد کے راوی صحیح حدیث کے راوی ہیں ماسوا ابو بلج الفزاری کے، وہ ثقہ ہے اور اس میں کچھ ضعف ہے''۔

(مجمع الزوائد ج٩ ص١١٩)

فضائل الصحابہ کے محقق وصی اللہ بن محمد عباس اور ابو اسحاق الحوینی الاثری کے نزدیک بھی اس حدیث کی سند حسن ہے۔

(تحقيق: فضائل الصحابة ج٢ ص٨٥٠؛ كتاب الحلي بتخريج خصائص علي رضی اللہ عنہ ص٤٤)

شیخ محمد احمد شاکر نے کہا ہے: اس کی سند صحیح ہے۔

(مسند أحمد ج٣ ص٣٣١، ٣٣٢ حديث٣٠٦٢)

دنیا و آخرت میں بھلا وہ ہستی کیونکر رسوا ہو سکتی ہے جو دارِ حکمت کا باب ہو؟ لیکن افسوس کہ بعض بداندیشوں نے لکھ مارا کہ کیوں نہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اپنے اعمال پر شرمندہ ہوئے تھے اور ایک جنگ کے بعد مقتولین کو دیکھ کر کہا تھا: کاش! میں پیدا ہی نہ ہوتا۔ اس پر جواباً عرض ہے کہ ہاں آپ نے یہ فرمایا تھا لیکن اس لیے نہیں کہ آپ کو اپنے اقدام میں شک تھا بلکہ اس لیے کہ دوسروں نے ایسی جنگوں تک نوبت پہنچا دی تھی، ورنہ انسان کو افسوس اور پشیمانی تو اُس عمل پر بھی ہوتی ہے جو اُس کے اختیار سے بھی باہر ہو۔ چنانچہ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے خود اسی اقدام اور اُس پر افسوس کے متعلق بعض اکابرین سے پوچھا گیا تو انہوں نے انتہائی حسین جواب دیا۔ امام ابن عساکر رحمۃ

اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"ایک شخص نے حضرت شریک سے کہا: آپ مجھے حضرت علی کے اُس قول کے متعلق بتلائیں جو انہوں نے جنگ جمل کے دن حضرت حسن کو فرمایا تھا: "لیت اباک کان مات قبل هذا اليوم بعشرين سنة" (اے حسن! کاش تیرا باپ آج سے بیس برس قبل مر چکا ہوتا) کیا وہ اپنے اقدام میں شک کرتے تھے؟ اس پر حضرت شریک نے فرمایا: تم مجھے حضرت مریم رضی اللہ عنہا کے اِس قول کے متعلق بتلاؤ: "يَا لَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا" (کاش! میں اس سے پہلے مر چکی ہوتی) [مریم: ۲۳] کیا وہ اپنی پاک دامنی میں شک کرتی تھیں؟ اس پر وہ شخص خاموش ہو گیا"۔

(تاریخ دمشق لابن عساکر ج۴۲ ص۴۵۹)

خلاصہ یہ ہے کہ سیدنا علی اس قدر حکمت سے مالا مال تھے کہ اُنہوں نے زندگی بھر ایسا قدم نہیں اٹھایا جو بعد میں دینی یا اخروی لحاظ سے اُن کے لیے ندامت و رسوائی کا باعث ہوا ہو۔ بھلا جس کے قلب و لسان کی ہدایت و ثبات کے بارے میں دعائے نبوی ﷺ صحیح سند کے ساتھ ثابت ہو اُس سے کیونکر ایسا قدم اٹھ سکتا ہے جو باعث ندامت ہو؟

لفظ حکمت پر مزید گفتگو آئندہ صفحات میں حدیث نمبر (۳۴) کے تحت بھی آئے گی۔





سیدنا علی ﷺ بابُ مدینۃِ العلم

﴿۳۲﴾ ورواہ الحاکم من طریق مجاھد، عن ابن عباس عن النبي ﷺ، ولفظه:

أنا مدینة العلم وعليٌّ بابها فمن أراد العلم فلیأتها من بابها.

وقال الحاکم: صحیح الإسناد ولم یخرجاه.

﴿۳۲﴾ اور اس حدیث کو امام حاکم نے مجاھد کی سند سے بہ روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں:

میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں، لہٰذا جو شخص علم کا ارادہ رکھتا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اس کے دروازہ سے آئے۔

امام حاکم نے فرمایا: یہ حدیث صحیح السند ہے اور اسے امام بخاری اور امام مسلم نے روایت نہیں کیا۔

﴿۳۳﴾ ورواہ أیضاً من حدیث جابر بن عبد اللّٰه، ولفظه:

أنا مدینة العلم وعليٌّ بابها فمن أراد العلم فلیأت الباب.

﴿۳۳﴾ اور انہوں نے اس حدیث کو حضرت جابر بن عبد ﷺ سے بھی روایت کیا ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں: میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں، لہٰذا جو شخص علم کا ارادہ رکھتا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ دروازہ سے آئے۔

حدیث "أنا مدینةُ العلم" کا حکم

اس حدیث پر بعض لوگوں نے اعتراضات کیے ہیں لیکن بالآخر عند المحققین یہ حدیث حسن بلکہ صحیح ثابت ہوئی ہے، راقم الحروف نے اپنی کتاب "شرح خصائص علي ﷺ" میں اس پر مفصل مگر آسان گفتگو کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں صفحہ ۱۸۰ تا ۱۸۶، الطبعة الخامسة.

حدیثِ ھذا کی سند پر اعتراض

اکثر اہلِ تحقیق محدثین کرام کے نزدیک یہ حدیث سنداً حسن اور کچھ کے نزدیک صحیح ہے، جبکہ بعض نے اس کی سند پر اعتراضات بھی کیے ہیں۔ جن محققین نے اس حدیث کو حسن اور صحیح قرار دیا ہے بالاختصار ہم اُن کے حوالہ جات "شرح خصائص علي ﷺ" میں پیش کر چکے ہیں۔ یہاں ہم مزید اعتراضات درج کر کے اُن کا تحقیقی

جائزہ لے رہے ہیں۔ بیده الخير وهو المستعان.

حکیم محمود احمد ظفر لکھتا ہے:

"اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ سیدنا علیؓ کو علوم نبوت سے حظ وافر حاصل تھا، لیکن بعض حضرات نے ان کے علمی تفوق کے اظہار کے لیے بعض احادیث بھی وضع کی ہوئی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

انامدينة العلم وعلى بابها (حاکم جلد ۳ ص ۴۹۲)

"میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہے۔"

امام ترمذی نے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں:

انادار الحكمة وعلى بابها (ترمذی جلد ۴ ص ۳۲۹ مع تحفۃ الاحوذی)

"میں حکمت کا گھر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے۔"

امام ترمذیؒ نے لکھا ہے کہ یہ حدیث غریب اور منکر ہے اسے بعض راویوں نے شریک سے نقل کیا ہے اور اس میں صنابحی کا کوئی ذکر نہیں کیا اور ہم نے شریک کے علاوہ اور کسی ثقہ راوی سے اس حدیث کو نہیں پایا۔

اس روایت کو امام ترمذیؒ نے اسماعیل بن موسی الفزاری سے روایت کیا ہے۔ اس اسماعیل کا حدود اربعہ کیا ہے؟ یہ غالی قسم کا شیعہ تھا۔ ابن ابی شیبہ اور ہناد کا بیان ہے کہ یہ فاسق ہے اور اسلاف کو گالیاں دیتا ہے۔ یہ کوفہ کا رہنے والا ہے اور سری کذاب کا بھانجا ہے۔ ابوداؤد اور ابن ماجہ نے اس سے روایت لی ہے لیکن بخاری، مسلم اور نسائی نے اس سے کوئی روایت نہیں لی۔ (میزان الاعتدال جلد ۱ ص ۲۵۱) بہر حال اس روایت کے تمام راوی مجروح ہیں۔ ابن جوزی اور سراج القزوینی وغیرہ نے اس روایت کو موضوع قرار دیا ہے۔

امام شوکانی نے الفوائد المجموعہ فی احادیث الموضوعہ ۳۴۸ اور امام سخاوی نے المقاصد الحسنہ ص ۵۰۴ پر اس روایت کو موضوعات میں شمار کیا ہے۔ اہل علم حضرات کے لیے الفوائد المجموعہ ص ۳۴۷ کا مطالعہ نہایت ضروری ہے"۔

(امیر المومنین سیدنا علی ؓ از حکیم محمود احمد ظفر ص 471)

بعض نواصب کی کذب بیانی اور خیانتیں

اس عبارت میں حکیم محمود احمد ظفر نے کئی خیانتیں اور حماقتیں کی ہیں۔ پہلی خیانت یہ ہے کہ اس نے اسماعیل بن موسیٰ الفزاری کے متعلق فقط جرح نقل کر دی ہے اور اس کے متعلق تعدیل کے اقوال سے جان بوجھ کر آنکھیں بند رکھی ہیں، حالانکہ جس "میزان الاعتدال" سے اس نے جرح نقل کی ہے اُسی میں اس کے متعلق یہ بھی مذکور ہے کہ:

"امام ابوحاتم نے فرمایا: یہ سچا ہے اور امام نسائی نے فرمایا: اس سے حدیث لینے میں کوئی حرج نہیں"۔

(میزان الاعتدال ج۱ ص٤١٤)

حکیم ظفر نے لکھا کہ اس سے فقط ابوداود اور ابن ماجہ نے روایت لی ہے، جبکہ امام ذہبی لکھتے ہیں:

"اس سے امام ابوداود، امام ترمذی، امام ابن ماجہ، امام ابوعروبہ، امام ابن خزیمہ اور ایک بڑی جماعت نے روایت کیا ہے"۔

(میزان الاعتدال ج۱ ص٤١٣)

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے مزید یہ بھی لکھا ہے:

"امام بخاری نے اس سے اپنی کتاب "خلق افعال العباد" میں روایت لی ہے اور امام ابویعلیٰ، محدث الساجی، محدث مطین، بقی بن مخلد اور ایک طائفہ نے حدیث لی ہے"۔

نیز حافظ رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

"محدث مطین نے کہا ہے: یہ سچا ہے، اور امام ابن حبان نے اس کو "کتاب الثقات" میں لکھا ہے: "یخطیء" (غلطی کرتا ہے) اس پر حافظ لکھتے ہیں: میں نے "کتاب الثقات" کا وہ نسخہ دیکھا جو حافظ ابوعلی البکری کے ہاتھ سے لکھا ہوا ہے، اُس میں "یخطیء" (غلطی کرتا ہے) کے الفاظ نہیں ہیں، اور آجری نے امام ابوداود سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: "صدوق فی الحدیث" (حدیث میں سچا ہے)"۔

(تہذیب التہذیب ج۱ ص٣٤٥)

حکیم محمود احمد ظفر نے دوسری بات یہ لکھی ہے:

''بہر حال اس روایت کے تمام راوی مجروح ہیں۔ابن جوزی اور سراج القزوینی وغیرہ نے اس روایت کو موضوع قرار دیا ہے''۔

اس بات کا جواب ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے مشکاۃ المصابیح کی احادیث پر اعتراضات کے جواب میں ابن جوزی اور قزوینی وغیرہ کی تردید میں لکھا ہے کہ یہ حدیث موضوع نہیں بلکہ اس کو حسن قرار دینا جائز ہے۔حکیم ظفر وغیرہ ایسے لکھاریوں کو ان باتوں کا علم ہوتا ہے مگر یہ لوگ عمداً حقائق سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں،اور یہ ایک خیانت ہے۔

حکیم ظفر نے ایک بات یہ بھی لکھی ہے:

''امام شوکانی نے الفوائد المجموعہ فی احادیث الموضوعہ صفحہ ۳۴۸ اور امام سخاوی نے المقاصد الحسنہ ص ۵۰۴ پر اس روایت کو موضوعات میں شمار کیا ہے۔اہل علم حضرات کے لیے الفوائد المجموعہ ص ۳۴۷ کا مطالعہ نہایت ضروری ہے''۔

حکیم ظفر کی یہ سراسر کذب بیانی ہے، کیونکہ علامہ شوکانی اور امام سخاوی دونوں نے اس حدیث کو موضوع نہیں بلکہ حسن تسلیم کیا ہے۔حکیم ظفر نے جھوٹ کو لوگوں کے ذہنوں میں بٹھانے اور رعب ڈالنے کے لیے یہ بھی لکھ دیا کہ:

''اہل علم حضرات کے لیے الفوائد المجموعہ ص ۳۴۷ کا مطالعہ نہایت ضروری ہے''۔

اہل علم تو جب پڑھیں گے پڑھ لیں گے مگر اس فقیر بے علم نے ''الفوائد المجموعة'' کا مطالعہ کیا تو الحمدللہ مجھے حکیم ظفر ایسے لوگوں سے اچھا پڑھنا اور سمجھنا آ گیا۔وہ یہ کہ حکیم ظفر کو اس حدیث پر فقط شوکانی کی ابتدائی اختلافی بحث نظر آئی جبکہ مجھے اُن کی آخری فیصلہ کن تحریر بھی نظر آ گئی۔چنانچہ قاضی شوکانی تفصیلی بحث ونظر کے بعد آخر میں اپنا مختار قول یوں لکھتے ہیں:

قال الحافظ ابن حجر: والصواب خلاف قولهما معاً يعني: ابن الجوزي والحاكم، أن الحديث من قسم الحسن، لايرتقي إلى الصحة، ولاينحط إلى الكذب. انتهى. وهذا هو الصواب، لأن يحيى بن معين والحاكم قد خولفا في توثيق أبي الصلت ومن تابعه، فلايكون مع هذا الخلاف صحيحاً، بل حسنا

لغيره.

”حافظ ابن حجر نے فرمایا ہے: صواب (صحیح بات) ان دونوں یعنی ابن الجوزی اور حاکم کے قول کے خلاف ہے۔ بیشک یہ حدیث حسن کی قسم سے ہے، صحت کی طرف ترقی کرتی ہے اور نہ ہی کذب کی طرف گرتی ہے، انتہاء۔ اور یہی بات ہی صحیح ہے، کیونکہ امام یحییٰ بن معین اور امام حاکم کا ابوالصلت اور اس کے پیروکاروں کی توثیق (معتبر قرار دینے) میں اختلاف ہے، لہٰذا اس اختلاف کی موجودگی میں یہ حدیث صحیح نہیں بلکہ دوسری احادیث کے ساتھ مل کر حسن ہے“۔

(الفوائد المجموعة للشوكاني ص ٣٧٤)

امام سخاوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس حدیث پر مفصل گفتگو فرمائی ہے اور چونکہ حدیث ”انا مدينة العلم وعليٌّ بابها“ حضرت ابن عباس سے روایت ہے اس لیے انہوں نے آخری جملہ یہ لکھا ہے:

وأحسنها حديث ابن عباس بل هو حسن.

”اور ان سب سے حسین ترین ابن عباس کی حدیث ہے بلکہ وہ حسن ہے“۔

(المقاصد الحسنة ص ١٢٤)

خود غور فرمایئے کہ جن حضرات نے اس حدیث کو حسن تسلیم کیا ہے انہیں کے بارے میں لکھنا کہ انہوں نے اس حدیث کو موضوع قرار دیا، کتنی بڑی جرأت اور جھوٹ ہے؟ اللہ ﷻ رحیم، کریم، حلیم بلکہ ارحم الراحمین ہونے کے باوجود جھوٹوں کے بارے میں فرماتا ہے: لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ.

حدیثِ ہٰذا کو موضوع کہنے والوں کی غفلت

امام ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر حکم لگانے والے تمام قسم کے لوگوں، یعنی اس کو صحیح، حسن، ضعیف اور موضوع کہنے والوں کا ذکر کیا ہے، اور اسے موضوع کہنے والوں میں امام قزوینی، امام ابن الجوزی اور امام ذہبی وغیرہ کا ذکر کیا ہے اور انہیں اس سلسلے میں متساہل قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

وهؤلاء وإن كانوا أجلاء لكنهم تساهلوا تساهلاً كثيراً كما علم مما قررته، وكيف ساغ الحكم بالوضع مع ما تقرر أن رجاله كلهم رجال الصحيح إلا واحداً فمختلف فيه!

"یہ حضرات اگرچہ بڑے علماء ہیں لیکن انہوں نے بہت زیادہ تساہل (غفلت) سے کام لیا ہے، جیسا کہ وضاحت کی جاچکی ہے، اور بھلا اس حدیث پر وضع کا حکم کیسے درست ہوسکتا ہے جبکہ اس کے تمام راوی صحیح حدیث کے راوی ہیں، سوائے ایک کے جس میں اختلاف ہے!"۔

(المنح المكية في شرح الهمزية لابن حجر المكي ص ٥٨٤)

یعنی اس راوی کے کذاب یا متروک وغیرہ ہونے پر کوئی اتفاق نہیں ہوا۔

واقعی اسلاف کو گالیاں دینا برا ہے

حکیم ظفر نے اسماعیل بن موسیٰ الفزاری کے بارے میں ایک بات یہ بھی لکھی ہے:

"یہ غالی قسم کا شیعہ تھا۔ ابن ابی شیبہ اور ہناد کا بیان ہے کہ یہ فاسق ہے اور اسلاف کو گالیاں دیتا ہے"۔

ہم کہتے ہیں کہ واقعی اسلاف یا کسی کو بھی گالیاں دینا برا ہے، لیکن اس راوی کو غالی شیعہ یا رافضی مجہول صیغوں سے کہا گیا ہے، قائل کا نام نہیں بتایا گیا، مثلاً کہیں یہ الفاظ ہیں:

أنكروا منه غلواً في التشيع.

"انہوں نے اس پر تشیع میں غلو کی وجہ سے اعتراض کیا ہے"۔

(تهذيب التهذيب ج١ ص ٣٤٥)

یہ معترضین کون ہیں؟ کچھ پتا نہیں۔ اسی طرح تقریب میں صیغۂ مجہول سے آیا ہے:

رُمِيَ بالرفض.

"اس پر رافضیت کا الزام لگایا گیا ہے"۔

(تقريب التهذيب ج١ ص ٥٥)

میں پوچھتا ہوں کہ کون سا محب اہل بیت ہے جو اس الزام سے محفوظ رہا ہو؟ یہ شخص بھی اگر شیعی تھا تو قدیم اصطلاح کے مطابق محب اہل بیت کے معنیٰ میں تھا۔ چنانچہ امام ذہبی کے قلم سے ایک مقام پر لفظ شیعی کے ساتھ یہ لفظ بھی لکھا گیا:

كوفي، ثقة، شيعي متوالي.

"کوفی ہے، معتبر ہے، محبت کرنے والا شیعی ہے"۔

(تاریخ الإسلام للذهبي ج٦ ص٤٢٥)

باقی رہا حافظ عبدان وغیرہ کا یہ کہنا کہ یہ اسلاف کو سبّ وشتم کرتا تھا تو یہ غیر واضح لفظ ہے، اسلاف سے کون لوگ مراد ہیں؟ کیا وہ شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کو برا کہتا تھا؟ اگر یہ ثابت ہو جائے تو واقعی وہ شخص غالی شیعہ ہی نہیں بلکہ رافضی تھا، ورنہ نہیں۔

ارے میاں! کیا بات کرتے ہو؟ بعض محدثین نے تو مروان ایسے ملعون سے حدیث لے لی جو نہ صرف یہ کہ خود منبر پر سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو سبّ وشتم کرتا تھا بلکہ دوسروں کو اُن کے گھروں سے طلب کر کے آرڈر کرتا تھا کہ وہ بھی منبر پر آ کر سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ پر سبّ وشتم کریں۔ جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ کتب میں تصریح ہے، اور تفصیل راقم کی تصنیف "شرح خصائص علي رضی اللہ عنہ" میں موجود ہے۔ ایک اور بدبخت شخص تھا جو شب وروز سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ پر [معاذ اللہ] لعنت کرتا تھا اور کہتا تھا کہ انہوں جنگِ صفین میں اُس کے آباء کو قتل کیا تھا۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی اور علامہ ذہبی لکھتے ہیں

"احمد بن سعید الدارمی احمد بن سلیمان المروزی سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا: میں نے اسماعیل بن عیاش سے سنا، انہوں نے فرمایا کہ میں نے حریز بن عثمان کے ساتھ مصر سے مکۃ المکرمہ تک سفر کیا: "فجعل يسب علياً ويلعنه" (تو وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر سبّ وشتم اور لعنت کرتا رہا) وہ کہا کرتا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے علی کی شان میں لوگ جو یہ حدیث نقل کرتے ہیں "انت مني بمنزلة هارون من موسى" حق ہے لیکن سننے والے نے خطا کی ہے۔ اس سے پوچھا گیا اصل الفاظ کیا ہیں؟ کہنے لگا "انت مني بمنزلة قارون من موسى" (میرے نزدیک تیرا مقام ایسا ہے جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کے نزدیک قارون کا۔ معاذ اللہ) جب اُس سے کوئی محدث پوچھتا کہ کیا تو علی پر لعنت کرتا ہے؟ تو وہ انکار کرتا اور جب اس سے کہا جاتا کہ تو علی پر رحمت نہیں بھیجتا تو کہتا اُن پر سو بار رحمت ہو، اور وہ یہ سب کچھ اس لیے کرتا کہ کہیں اُس سے روایتِ حدیث میں اجتناب نہ کیا جائے"۔

(تهذيب التهذيب ج٢ ص٢٢١؛ ميزان الاعتدال ج٢ ص٢١٩ ملخصاً وموضحاً)

بعض نواصب کی ایک چال

حکیم ظفر نے اس راوی کی مذمت میں ایک بھڑاس یہ بھی نکالی ہے کہ "یہ سدی کذاب کا بھانجا تھا" میں کہتا ہوں: بھانجا تو کیا بعض نے نواسہ بھی لکھا ہے لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اگر کوئی ابوجہل کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو، ہر ایک کا عمل اپنا ہے، بیشک سدی کذاب ہوگا لیکن فزاری کو تو کسی نے بھی کذاب نہیں لکھا اور زیر بحث حدیث کا راوی یہی ہے، سدی نہیں، اور ہمیں اسی سے واسطہ ہے سدی سے نہیں۔ تعجب ہے کہ حکیم کہلانے والے لوگ بھی ایسی مغالطہ آفرینی سے باز نہیں آتے۔

حدیث "أنا مدينة العلم" کے متابع

اس حدیث کے منکرین کو یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ اس حدیث کے متابع بھی ہیں جن کی طرف خود امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی بایں الفاظ "وفي الباب عن ابن عباس" (اور اس سلسلہ میں ابن عباس ﷺ سے حدیث ہے) اشارہ فرمایا ہے۔ متابع: متابعت سے ہے اور اصول حدیث کی اصطلاح میں متابعت کی توضیح میں محدثین کرام رحمۃ اللہ علیہم لکھتے ہیں:

> "مثلاً کوئی حدیث از حماد، از ایوب، از ابن سیرین، از ابوھریرہ ﷺ، از نبی کریم ﷺ منقول ہو پھر وہی حدیث ایوب سے حماد کے علاوہ کوئی دوسرا بھی نقل کرے، یا ابن سیرین سے ایوب کے علاوہ کوئی دوسرا بھی نقل کرے، یا حضرت ابوھریرہ سے ابن سیرین کے علاوہ کوئی دوسرا بھی نقل کرے، یا نبی کریم ﷺ سے ابوھریرہ ﷺ کے علاوہ کوئی دوسرا اصحابی بھی نقل کرے تو یہ تمام صورتیں حسب مراتب متابعت کہلاتی ہیں"۔

(تقريب النووي موضحاً ج١ ص٢٨٢، ٢٨٣؛ فتح المغيث ج١ ص٢٢٩ ؛وط: ج٢ ص ٢٢، ٢٣؛ نتيجة النظر في نخبة الفكر للشمني ص١٠٦)

یعنی جو حدیث زیر بحث ہو اور وہ دوسری سند سے آئی اور اُس سند میں کسی بھی مقام پر کوئی دوسرا راوی ہو تو اسے متابعت کہتے ہیں۔ یہاں اگرچہ حدیث کے الفاظ میں قدرے فرق ہے کہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو "أنا دار الحكمة وعلي بابها" سے نقل کیا ہے مگر حدیث "أنا مدينة العلم وعليٌّ بابها" کو اس کا مترادف مانتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ حدیث ابن عباس سے بھی منقول ہے، یعنی سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کے علاوہ ایک اور صحابی

سے بھی منقول ہے اور یہ بھی اس کی متابعت ہے۔ جس نکتہ کی طرف امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اشارہ فرما گئے اُسی کو مدنظر رکھتے ہوئے امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے حدیث "أنا دار الحكمة وعليٌّ بابها" کو نقل فرما کر اس کی سند کو صحیح قرار دیا، پھر اس کی متابعت کے درپے ہوئے تو ارشاد فرمایا:

وقد وافق علياً في رواية هذا الخبر عن النبي ﷺ غيره. حدثني محمد بن إسماعيل الضراري قال: حدثنا عبد السلام بن صالح الهروي قال: حدثنا أبو معاوية، عن الأعمش، عن مجاهد، عن ابن عباس قال: قال رسول الله ﷺ: أنا مدينة العلم وعلي بابها، فمن أراد المدينة فليأتها من بابها.

''اور اس حدیث میں سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی دوسرے صحابی نے بھی موافقت کی ہے۔ مجھے محمد بن اسماعیل الضراری نے بیان کیا، انہوں نے کہا: ہمیں عبدالسلام بن صالح الہروی نے بیان کیا، انہوں نے کہا: ہمیں ابومعاویہ نے از اعمش، از مجاہد از ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کیا، وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں علم کا شہر ہوں اور علی رضی اللہ عنہ اُس کا دروازہ ہیں، لہٰذا جو شخص شہر کا ارادہ رکھتا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ دروازہ سے آئے''۔

(تهذيب الآثار لابن جرير الطبري ج١ ص٣٩٥ ،وط: ج٤ ص١٠٥ حديث١٧٣)

مصنف (امام جزری رحمۃ اللہ علیہ) نے بھی اسی ترتیب پر یہ احادیث ذکر فرمائی ہیں، بلکہ انہوں نے اور امام ابونعیم نے فرمایا ہے کہ "أنا دار الحكمة وعلي بابها" کو بھی اصبغ بن نباتہ اور حارث نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

(حلية الأولياء لأبي نعيم ج١ ص١٠٣ ؛تقريب البغية ج٣ ص٨٦ حديث٣٢٥٨)

اس صورت میں امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی سند میں جو دو راوی سلمہ بن کہیل اور صنابحی ہیں امام ابونعیم کی بیان کردہ سند میں اُن دونوں کی جگہ پر اصبغ بن نباتہ اور حارث ہیں اور یہ بھی اس سند کی متابعت کی ایک صورت ہے۔

نیز یہ حدیث عبدالسلام بن صالح ابوالصلت الہروی سے محمد بن اسماعیل الفزاری کی جگہ پر ایک سند میں محمد بن عبدالرحیم الہروی، دوسری سند میں حسن بن علی المعمری، تیسری سند میں اسحاق بن الحسن بن میمون الحربی، چوتھی سند میں قاسم بن عبدالرحمٰن الانباری اور پانچویں سند میں حسین بن فہم ہے۔ یہ سب اس حدیث کے متابع ہیں، اور جب اس حدیث کے اس قدر متابع ہیں تو پھر اس کا حکم کیا ہے؟ محدثین کرام فرماتے ہیں کہ جب ایک ہی حدیث

کی سند میں کسی مقام پر کوئی دوسرا راوی آ جائے تو اُس حدیث کی اصل ضرور ہوتی ہے۔ چنانچہ امام سخاوی اور دوسرے محدثین کرام رحمۃ اللہ علیہم لکھتے ہیں:

فإن ذلک وجد يعلم به أن للحديث أصلاً يُرجعُ إليه، وإلا فلا.

"پھر اگر متابعت کی کوئی صورت پائی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس حدیث کی اصل ہے، اس کی طرف رجوع کیا جائے گا، ورنہ نہیں"۔

(فتح المغيث ج ١ ص ٢٢٩ و ط: ج ٢ ص ٢٢، ٢٣؛ تدريب الراوي ج ١ ص ٢٨٢)

متابع کی بدولت حدیثِ ہٰذا کا درجہ

چونکہ اس حدیث کے متعدد متابع ہیں اس لیے یہ حدیث حسن ہی نہیں بلکہ صحیح کے درجہ پر پہنچ گئی۔ کس کس محدث نے اس کو حسن اور صحیح تسلیم کیا ہے؟ یہ تفصیل جاننے سے قبل ایک مصنف کی سادگی یا تجاہلِ عارفانہ ملاحظہ ہو۔ ہمارے معاصر قاسمی صاحب لکھتے ہیں:

"واضح رہے کہ حدیث مدینۃ العلم کو حاکم نے صحیح لکھا ہے جب کہ یحییٰ بن معین، ذہبی، ابن تیمیہ، ابن جوزی، ابن کثیر اور کئی دوسرے محدثین نے اسے سراسر موضوع اور من گھڑت قرار دیا ہے، امام بخاری نے اسے منکر لکھا ہے، شاہ عبد العزیز نے مطعون لکھا ہے۔ تفضیلیہ سے پوچھنا یہ ہے کہ ان محدثین پر آپ کا کیا فتویٰ ہے؟ لیکن علامہ جلال الدین سیوطی اور حضرت ملا علی قاری علیہما الرحمہ نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے (تاریخ الخلفاء صفحہ ۱۳۳، مرقاۃ جلد ۱۱ ص ۳۳۶) یہی ہمارا اختیار ہے"۔

(ضربِ حیدری ص 229)

اس عبارت کو بار بار غور سے پڑھیے! پہلے تو پیر سائیں نے اس حدیث کو موضوع کہنے والے پانچ محدثین کے نام لکھے پھر اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے "اور کئی دوسرے محدثین" کا لفظ بھی بڑھایا، پھر کہا: یہ سب محدثین اس حدیث کو موضوع ہی نہیں بلکہ سراسر موضوع کہتے ہیں، پھر امام بخاری اور شاہ عبد العزیز سے اس حدیث کا "منکر" اور "مطعون" ہونا لکھا، پھر لفظ "لیکن" لگا کر آخر میں فقط امام جلال الدین سیوطی اور ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہما سے اس حدیث کا حسن ہونا لکھا، اور دوسرے محدثین کے مقابلہ میں اِن دو حضرات کو اِس مسئلہ میں تنہا

اور منفرد ظاہر کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے باوجود خود کو زیادہ محدثین کی بجائے آخری دو کے ساتھ رکھا اور کہا: ''یہی ہمارا اختیار ہے''۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس حکمت کے پیشِ نظر پیر شیخ الحدیث والتفسیر نے سات اور دوسرے کئی محدثین کے مقابلہ میں فقط دو محدثین کے موقف کو ''یہی ہمارا اختیار ہے'' فرمایا ہوگا؟ اگر یہ حکمت معلوم ہو جائے تو اس حدیث کی سند و متن پر پڑا ہوا غبار از خود صاف ہو جائے گا۔ بہرحال اس حدیث کو حسن یا صحیح قرار دینے میں امام سیوطی اور ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہما تنہا نہیں بلکہ دوسرے محدثین وعلماء کی بھی بڑی تعداد نے اس حدیث کو حسن یا صحیح تسلیم کیا ہے۔ چند محدثین وعلماء کے اسماء مع حوالہ ملاحظہ ہوں:

امام ابن جریر طبری، امام زرکشی، حافظ ابن حجر عسقلانی، امام سخاوی، علامہ ابن طولون صالحی، امام صالحی شامی، علامہ ابن حجر مکی، امام مناوی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، علامہ محمد طاہر پٹنی، امام زرقانی، علامہ ابن عراق الکنانی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، علامہ بدخشانی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، سیدنا پیر مہر علی شاہ گیلانی، قاضی شوکانی، نواب صدیق حسن خاں قنوجی، علامہ عبدالرحمان مبارکپوری اور علامہ قاوقجی وغیرھم۔

(تهذيب الآثار للطبري ج١ ص٣٩٥، وط: ج٤ ص١٠٥ حديث١٧٣؛ اللآلی المنثورة في الأحاديث المشهورة ص١٦٥؛ لسان الميزان ج٢ ص٢١٨؛ أجوبة الحافظ ابن حجر عسقلاني ملحق بمشكاة ج٢ ص٥٥٥؛ المقاصد الحسنة ص١٢٤ حديث١٨٩؛ الشذرة ص١٣١؛ الصواعق المحرقة ص١٢٢؛ سبل الهدیٰ والرشاد ج١ ص٥٠٩؛ الفتاوى الحديثية لابن حجر مكي ص ٢٣٠؛ فيض القدير ج٥ ص٢٢٩٩، ٢٣٠٠؛ تذكرة الموضوعات للفتني ص٩٥؛ زرقاني على المواهب ج٤ ص ٢١٥؛ تنزيه الشريعة المرفوعة للكناني ج١ ص٣٧٨؛ الأسرار المرفوعة ص٧٢؛ مرقاة شرح المشكاة ج ١٠ ص٤٧٠؛ إزالة الخفاء ج٤ ص٤٥١؛ نزل الأبرار للبدخشاني ص٧٣؛ السيف المسلول للفاني فتي ص١١١؛ تصفية ما بين سني وشيعة ص٦٣، ٨٩؛ الفوائد المجموعة للشوكاني ص ٣٧٤؛ تحفة الأحوذي ج١٠ ص٢١٣؛ الدين الخالص للقنوجي ج٣ ص٣١٢؛ اللؤلؤ المرصوع فيما لا أصل له أو بأصله موضوع ص٤٩، ٥٠)

یہ فقط وہ علماء و محدثین ہیں جن کی کتب تک ہمیں رسائی حاصل ہوئی، اور تا حال جن کی کتب ہمیں دستیاب نہیں ہوئیں وہ ان کے علاوہ ہیں۔ تعجب ہے کہ جب اس حدیث کو صحیح اور حسن تسلیم کرنے والے علماء و محدثین کی اتنی

بڑی تعداد موجود ہے تو پھر پیر شیخ الحدیث والتفسیر کو اس حدیث پر تردید کا مواد زیادہ اور اس کے ثبوت کا مواد کم کیوں ملا؟ بہر حال پیر شیخ الحدیث والتفسیر کو اس حدیث پر تقویت کا مواد کم ملنے کی وجہ جو بھی ہو اُسے عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ذات جانتی ہے، لیکن اس سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آگئی کہ "فکر ہر کس بقدرِ ہمت او ست" کے مطابق یہ پندرھویں صدی کے پیر سائیں کی فکری پرواز ہے جبکہ ہمارے ایسے اسلاف کرام جو عالمِ بیداری میں دیدار نبوی ﷺ سے بہرہ ور ہوتے تھے اُن کی فکری پرواز یہ تھی کہ اُن پر اس حدیث کی صحت دن بدن کھلتی چلی گئی حتیٰ کہ اُن کے نزدیک پہلے یہ حدیث حسن تھی پھر انہیں صحیح کے مقام پر نظر آنے لگی، پھر انہوں نے استخارہ کیا تو انہیں یقین ہو گیا کہ یہ واقعی صحیح حدیث ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب "شرح خصائص علی ؓ" الطبعۃ الرابعۃ صفحہ ۱۸۵۔

فکر ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست

جب میرے سامنے امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ فکری پرواز اور دوسری طرف اپنے دور کے پیر سائیں کی مذکورہ فکری پرواز آئی تو میرے ذہن میں مفکر اسلام رحمۃ اللہ علیہ کا یہ کلام گردش کرنے لگا۔

دل زندہ و بیدار اگر ہو تو بتدریج
بندے کو عطا کرتے ہیں چشمِ نگراں اور
احوال و مقامات پہ موقوف ہے سب کچھ
ہر لحظہ ہے سالک کا زماں اور مکاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے، شاہیں کا جہاں اور

(بالِ جبریل ص ۱۳۲)

استخارہ کے بغیر حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کی پرواز بھی اس کے قریب قریب ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

فقیر گوید نظر بر سند قول ابن حجر صواب است، اما بکثرت شواهد حکم بصحت تواند نمود۔

”فقیر کہتا ہے کہ سند کو دیکھا جائے تو ابن حجر کا قول درست ہے، لیکن اگر شواہد کی کثرت کو دیکھا جائے تو اس حدیث پر صحت کا حکم لگایا جا سکتا ہے“۔

(السیف المسلول ص ۱۱۱)

فائدہ

حال ہی میں مجھے سیدنا علیؓ کی شان میں ایک محقق کتاب موصول ہوئی، اُس میں اِس حدیث کو اس انداز سے صحیح ثابت کیا گیا ہے جسے پڑھ کر انکار کی مجال نہیں رہتی۔ لیکن اب چونکہ میری یہ کتاب مرتب ہو چکی ہے، اس لیے اُس کی تفصیل پیش کرنے سے قاصر ہوں۔ اہل علم کو چاہیے کہ وہ ضرور اس کا مطالعہ فرمائیں۔ یہ کتاب دار الکتب العلمیۃ، بیروت سے شائع ہوئی ہے، اس کے مصنف کا نام علامہ سامی انور جاھین ہے، اور کتاب کا نام (فضائل أمير المؤمنين علي بن أبي طالب، من خلالِ حديثي العترة وباب المدينة) ہے۔

پیر سائیں کی عدم توجہ کا عالم

پیر سائیں نے توجہ نہیں فرمائی اور امام المحدثین حضرت یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ کو بھی اُن محدثین میں شامل کر دیا جنہوں نے اس حدیث کو موضوع کہا ہے، حالانکہ انہوں نے اس حدیث کو صحیح بھی فرمایا ہے۔ چنانچہ خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

أخبرنا محمد بن أحمد بن رزق، أخبرنا أبو بكر مكرم بن أحمد بن مكرم القاضي، ثنا القاسم بن عبد الرحمان الأنباري، حدثنا أبو الصلت الهروي، حدثنا أبو معاوية عن الأعمش، عن مجاهد، عن ابن عباس قال: قال رسول اللهﷺ: أنا مدينة العلم وعلي بابها، فمن أراد العلم فليأت بابه، قال القاسم: سألت يحيى بن معين عن هذا الحديث فقال: هو صحيح.

”ہمیں محمد بن احمد بن رزق نے بیان کیا، انہیں قاضی ابوبکر مکرم بن احمد بن مکرم نے بیان کیا، انہیں قاسم بن عبدالرحمان الانباری نے بیان کیا، انہیں ابوالصلت الھروی نے بیان کیا، انہیں ابو معاویہ نے از اعمش، از مجاہد، از ابن عباسؓ بیان کیا، حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے، پس جس کو

علم چاہیے تو وہ اُس کے دروازے سے آئے۔ قاسم الانباری فرماتے ہیں: میں نے یحییٰ بن معین سے اس حدیث کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا: یہ صحیح ہے"۔

(تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۵۰؛ تاریخ دمشق ج ۴۲ ص ۳۸۰؛ فتح الملك العلي بصحة حديث باب مدينة العلم علي للغماري ص ۷)

یحییٰ بن معین سے "لا اصل لہ" (اس حدیث کی کوئی اصل نہیں) کا قول بھی منقول ہے لیکن اُن سے اس حدیث کی صحت کا قول بھی تو منقول ہے تو پھر کس قول کو لیا جائے گا؟ یہ فیصلہ اُن کے بعد جمہور محدثین کرام نے کر دیا ہے کہ انہوں نے صحت کے قول کو قبول کیا ہے اور دوسرے قول کو مسترد کر دیا ہے۔

پیر سائیں نے کہا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو منکر کہا ہے۔ میں پوچھتا ہوں: کس کتاب میں؟ پھر اگر کہا بھی ہے تو اُن کی اس حدیث کے متابع کی طرف توجہ نہیں گئی ہوگی، اگر اُن کی توجہ ادھر ہو جاتی تو وہ ایسا حکم نہ لگاتے، کیونکہ کبھی منکر حدیث بھی اپنے متابع کی بدولت حدیث حسن کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے۔ چنانچہ امام ابو الحسن علی بن محمد بن عراق الکنانی لکھتے ہیں:

والحديث المنكر إذا تعددت طرقه ارتقىٰ إلى درجة الضعيف القريب بل ربما يرتقي إلى الحسن.

"اور منکر حدیث کے جب متعدد طرق ہوں تو وہ درجہ ضعیف کے قریب بلکہ بسا اوقات درجہ حسن تک پہنچ جاتی ہے"۔

(تنزيه الشريعة المرفوعة ج ۱ ص ۲۸۳)

یہی وجہ ہے کہ بعد کے کبار محدثین نے اس حدیث کو حسن اور صحیح کے درجہ پر مانا ہے۔

پھر پیر سائیں نے ابن تیمیہ، ابن قیم اور ابن کثیر کے نام بھی اس حدیث کو موضوع کہنے والوں میں لکھ دیے ہیں، حالانکہ ابن تیمیہ اس مسئلہ میں کوئی حجت نہیں، اس لیے کہ وہ فضائل مرتضوی کی احادیث پر ہاتھ صاف کرنے میں مشہور ہیں، چنانچہ انہوں نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ حضرت علی المرتضیٰ علیہ السلام کی شان میں فقط دو صحیح حدیثیں آئی ہیں۔

ابن قیم اور ابن کثیر کی تحریر میں ہر چند کہ اپنے استاذ کی تحریر کی بہ نسبت کچھ نرمی ہوتی ہے مگر کبھی کبھار وہ بھی اپنے استاذ کی پیروی میں اعتدال سے ہٹ جاتے ہیں۔ باقی رہا امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کا معاملہ تو اُن کے بارے

میں بھی علماء ربانیین کے تحفظات ہیں یہاں تک کہ بعض علماء نے کہا ہے کہ اگر آیت ﴿وَمَآ أَرْسَلْنَاکَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾ مولیٰ علی ﷺ کی شان میں نازل ہوئی ہوتی تو ذہبی اسے بھی ضعیف کہہ دیتے، مگر راقم الحروف کے نزدیک یہ مبالغہ ہے۔ میں کہتا ہوں: اگر امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو سراسر موضوع کہا ہے تو اُن کا یہ قول امام یحییٰ بن معین، امام ابن جریر طبری، امام علائی، امام زرکشی اور حافظ ابن حجر عسقلانی وغیرہ رحمۃ اللہ علیہم کے اقوال کی روشنی میں مسترد ہے، وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ۔

پیر سائیں نے یہ بات بھی لکھی ہے کہ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو مطعون کہا ہے۔ اس پر میری گذارش ہے کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فتاوی عزیزی میں تو اس حدیث کو بطور استشہاد لائے ہیں۔ چنانچہ وہ ایک سوال پر علم اور حکمت کے فرق میں لکھتے ہیں:

حکمت بمعنی علم نافع است، اگر مکتسب باشد در اصطلاح صوفیہ آں را حکمت نگویند بلکہ علم وفضیلت نامند، واگر آں علم بطریق وہب بر دل شخصے واقع شود آں را حکمت نامند. وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ . وَكُلًّا آتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ، وخواہ آں علم متعلق بعقائد باشد یا باعمال یا باخلاق، وایں معنی مخصوص بہ انبیاء نیست، وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ أَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ، بعد ازاں آیہ وَإِذْ قَالَ لُقْمَانُ لِابْنِهٖ، تا آخر رکوع بیان بعضے حکمت ایشاں است، آرے ازیں باب ہرچہ بوحی آید آں مخصوص بانبیاء است، وہب اعم ست نبی وغیر نبی دراں شریک اند، ولہذا در حدیث شریف وارد شدہ "أنا دار الحكمة وعلي بابها" ودر روایت مشہور "أنا مدينة العلم وعلي بابها" واقع شود، مراد از علم دریں جا ہمیں معنی است.

’’حکمت علم نافع کے معنی میں ہے، اگر محنت سے حاصل ہو تو اس کو صوفیہ کی اصطلاح میں حکمت نہیں کہتے بلکہ علم اور فضیلت کا نام دیتے ہیں، اور اگر وہی علم بطور عطا کسی شخص کے دل پر وارد ہو تو اس کو حکمت کا نام دیتے ہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے: اور ہم نے اسے حکمت اور عدل کے ساتھ قوتِ فیصلہ دی، اور ارشاد ہے: اور ہر ایک کو ہم نے حکمت اور علم عطا فرمایا۔

خواہ وہ علم عقائد کے متعلق ہو یا اعمال واخلاق کے، اور یہ معنی انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ مخصوص نہیں۔ ارشاد باری تعالی ہے: اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا فرمائی کہ اللہ کا شکر ادا کر۔ یہ اور اس کے بعد والی آیت ﴿وَإِذْ قَالَ لُقْمَانُ لِابْنِهِ﴾ اور یاد کرو جب لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا) سے لے کر رکوع تک حکمت ہی کا ذکر ہے۔ ہاں اس سلسلہ میں جو وحی کی صورت میں آئے وہ انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہے۔ عطا عام ہے اس میں انبیاء اور غیر انبیاء سب شریک ہیں، چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے: ''میں حکمت کا گھر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے'' اور مشہور روایت میں ہے: ''میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے'' یہاں علم سے مراد بھی (حکمت کا) معنی ہے''۔

(فتاوی عزیزی ج١ ص١٢٨)

لہٰذا اگر شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے اس حدیث کے مطعون ہونے کا قول منقول ہو تو وہ اُن کے اپنے استدلال اور جمہور محدثین کرام کی تحقیق کے خلاف ہونے کی وجہ سے لائق توجہ نہیں ہوگا۔

حدیث ''مدینۃ العلم'' کے شواہد

جس طرح حدیث ھذا کی سند کے متابع ہیں اسی طرح اس کے متن کی صحت کے شواھد بھی بکثرت موجود ہیں۔ محدثین کرام کی اصطلاح میں شواھد اسے کہتے ہیں کہ جو بات کسی حدیث میں بیان کی گئی ہو وہی بات باختلاف الفاظ وسند دوسری احادیث سے بھی ثابت ہو تو ایسی تمام احادیث وآثار کو شواھد کہا جاتا ہے۔ زیر بحث حدیث میں سیدنا علی المرتضی رضی اللہ عنہ کے خصوصی اور وہبی علم کی بات ہو رہی ہے، دیکھنا یہ ہے کہ آیا ایسی بات دوسری احادیث سے بھی ثابت ہے یا نہیں؟ اگر ثابت ہو جائے تو سمجھا جائے گا کہ زیر تشریح حدیث سند کے ساتھ ساتھ متن کے لحاظ سے بھی صحیح اور جید ہے۔ آیئے اس تناظر میں چند احادیث ملاحظہ فرمائیں۔

١۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

عَلِيٌّ عَيْبَةُ علمي.

''علی میرے علم کا خزانہ ہے''۔

(الكامل لابن عدي ج٥ ص١٦١؛ الجامع الصغير حديث٥٥٩٣؛ جمع الجوامع ج٥ ص١٧٥

حديث ١٤٣١٨ وط: ج ٥ ص ٧٣٣ حديث ١٥٧٦١؛ جامع الأحاديث الكبير للسيوطي ج ٦ ص ١٩٨ حديث ١٤٣١٨؛ سبل الهدىٰ ج ١١ ص ٢٩٧؛ كنوز الحقائق للمناوي ج ١ ص ٣٨٦ حديث ٤٧٦٦؛ كنز العمال ج ١١ ص ٦٠٣ حديث ٣٢٩١١)

امام مناوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اس حدیث کی سند میں ضرار بن صرد ہے جسے امام بخاری اور امام نسائی رحمۃ اللہ علیہما نے متروک فرمایا ہے، اور امام یحیی بن معین نے اس کی تکذیب فرمائی ہے۔ راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ امام مناوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ حکم نقل کرنے میں ضرورت سے زائد اختصار کیا ہے، کیونکہ اُن کے سامنے حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف موجود تھیں اور حافظ رحمہ اللہ نے ضرار بن صرد کو مآل کار صدوق (سچا) قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

صدوق له أوهام وخطاء ورمي بالتشيع.

''سچا ہے، اس کے کچھ وہم اور غلطیاں ہیں اور اُس پر شیعیت کا الزام لگایا گیا ہے''۔

(تقريب التهذيب ج ١ ص ٢٥٩)

یہ تینوں باتیں دلالت کرتی ہیں کہ اس کے متروک ہونے پر محدثین کا اتفاق نہیں ہوسکا، یہی وجہ کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو متروک تو فرمایا ہے مگر اس سے اپنی کتاب ''خلق افعال العباد'' میں حدیث بھی لی ہے، جیسا کہ حافظ رحمہ اللہ نے تصریح فرمائی ہے۔

(تهذيب التهذيب ج ٤ ص ٨٤)

اس سے معلوم ہوا کہ نہ تو امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ سے اس راوی کی تکذیب کو کلیۃً قبول کیا گیا ہے، اور نہ ہی امام بخاری نے اس کو مطلقاً متروک سمجھا ہے، اور علماء اصول حدیث کا قاعدہ ہے کہ کسی راوی کے متروک ہونے پر اگر سب متفق نہ ہوں تو اس سے حدیث لی جائے گی۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ عبد اللہ بن لہیعہ کے حالات میں لکھتے ہیں:

قال يعقوب: وقال لي أحمد: مذهبي في الرجال أني لا أترك حديث محدث حتى يجتمع أهل مصر على ترك حديثه.

''محدث یعقوب بیان کرتے ہیں: مجھے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: راویانِ حدیث میں میرا مذہب یہ ہے کہ میں کسی راوی کی حدیث کو ترک نہیں کرتا جب تک کہ شہر کے تمام لوگ اس

کی حدیث کے ترک پر جمع نہ ہوں"۔

(تهذيب التهذيب ج٤ ص٤٥٢)

امام ابن الصلاح اور دوسرے علماءِ اصولِ حدیث نے لکھا ہے کہ مشہور محدث احمد بن صالح رحمۃ اللہ علیہم کا مذھب بھی یہی ہے، ملاحظہ فرمائیں:

(الشذا الفياح من علوم ابن الصلاح للأبناسي ج١ ص٢٧٠؛ فتح المغيث للسخاوي ج١ ص٣٩٨، وط: ج٢ ص٢٩٠؛ الرفع والتكميل ص١٤٠)

امام نسائی ﷫ جنہوں نے اس حدیث کے راوی ضرار بن صرد کو متروک کہا، خود اُن کا اپنا مذھب بھی یہی ہے۔ چنانچہ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ "السنن الصغریٰ للنسائي" کی شرح کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

قال النسائي: لايترک الرجل عندي حتیٰ يجتمع الجميع علی ترکه، فأما إذا وثقه ابن مهدي، وضعفه يحيی القطان مثلاً، فإنه لايترک لما عرف من تشديد يحيی، ومن هو مثله في النقد.

"امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: میرے مذھب کے مطابق کسی راوی کو اس وقت تک ترک نہیں کیا جائے گا جب تک کہ سب اس کے ترک پر جمع نہ ہوں۔ مثال کے طور پر کسی راوی کو ابن مھدی ثقہ قرار دیں اور یحییٰ القطان اسے ضعیف قرار دیں تو اسے ترک نہیں کیا جائے گا، کیونکہ یحییٰ کی شدت معروف ہے، اور یہی حکم اُن کے بارے میں ہے جو اُن کی طرح تنقید میں سخت ہیں"۔

(زهر الربیٰ علی المجتبیٰ للسيوطي ج١ ص٤)

آپ نے غور فرمایا کہ دو محدثین امام بخاری اور امام نسائی رحمۃ اللہ علیہما نے ضرار بن صرد کو متروک قرار دیا تھا لیکن اس کے باوجود اول الذکر نے ان سے اپنی بعض تصانیف میں حدیث روایت کی ہے اور ثانی الذکر نے فرمایا ہے کہ اُن کا مذھب یہ ہے کہ جب تک کسی راوی کے ترک پر سب متفق نہ ہوں تو وہ اسے ترک نہیں کرتے۔ اس قول پر اگرچہ ثانی الذکر محدث کما حقہ پورے نہیں اترے، کیونکہ اُن کی شرائط تو شیخین کی شرائط سے بھی سخت ہیں حتیٰ کہ بعض علماء حدیث نے انہیں مُتَعَنِّتِيْن میں بھی شامل کیا ہے تاہم اُن کے اپنے اور امام احمد بن حنبل، امام احمد بن صالح اور دوسرے محدثین کے بیان فرمودہ ضابطہ کے مطابق ضرار بن صرد نہ متروک ہے اور نہ ہی کذاب، لہٰذا اس کی روایت کردہ حدیث قابلِ عمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو لے لیا ہے اور اُن

کے نزدیک یہ حدیث موضوع نہیں ہے، کیونکہ انہوں نے "الجامع الصغیر" کے مقدمہ میں فرمایا ہے کہ انہوں نے اپنی اس کتاب کو موضوع روایات سے محفوظ رکھا ہے، ہر چند کہ وہ اس سلسلے میں مکمل کامیاب نہیں ہوئے تاہم اُن کی یہ تصنیف زیادہ تر موضوع احادیث سے پاک ہے۔ یہ حدیث بھی ان کے نزدیک ضعیف تو ہے مگر موضوع نہیں، اور علامہ امام مناوی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی یہ حدیث موضوع نہیں کیونکہ انہوں نے اس کی بہترین تشریح فرمائی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"عَيْبَة: اُس چیز کو کہتے ہیں جس میں کوئی شخص اپنی نفیس چیزیں رکھے۔ ابن درید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: وہ امور باطنیہ جن پر کوئی دوسرا شخص مطلع نہ ہو، ان کے بیانِ اختصاص کے لیے اس لفظ سے پہلے کوئی ایسی مختصر ضرب المثل نہیں آئی، اور اس میں سیدنا علی ﷛ کی انتہائی مدح ہے"۔

(فيض القدير ج٨ ص٤٤٠٤ ،وط: ج٤ ص٣٥٦)

۲۔ ام المومنین سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

علي مع القرآن والقرآن مع علي، لن يتفرقا حتى يردا عليّ الحوض.

"علی (﷛) قرآن کے ساتھ اور قرآن علی (﷛) کے ساتھ ہے، دونوں جدا نہ ہوں گے حتیٰ کہ اکٹھے حوض کوثر پر میرے پاس آئیں گے"۔

(المستدرك ج٣ ص١٢٣ حديث٤٦٨٥؛ المعجم الأوسط ج٥ ص١٣٥ حديث٤٨٨٠؛ المعجم الصغير ج٢ ص٢٨ حديث٧٢٠؛ تاريخ دمشق ج٤٢ ص٤٤٩؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٨ ص٤٥؛ مجمع البحرين ج٣ ص٣٨٥ حديث٣٧١٣؛ مجمع الزوائد ج٩ ص١٣٤ ،وط: ج٩ ص١٨٣ حديث١٤٧٦٧ ،وط: ج٩ ص١٢٩ حديث١٤٧٦٧؛ سبل الهدىٰ ج١١ ص٢٩٧؛ جمع الجوامع ج٥ ص١٧٥ حديث١٤٣١٩ ،وط: ج٥ ص٧٣٢ حديث١٥٧٥٨؛ جامع الأحاديث الكبير ج٦ ص١٩٨ حديث١٤٣١٩؛ كنز العمال ج١١ ص٦٠٣ حديث٣٢٩١٢؛ در السحابة ص٢٢٨)

یہ حدیث سیدنا علی ﷛ کی اعلمیت پر دلالت کرتی ہے، اس لیے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام ﷡ میں تفسیر و تاویل میں جو مقام سیدنا علی ﷛ کو حاصل تھا وہ کسی دوسرے کو حاصل نہیں تھا۔ چنانچہ قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں فرمایا ہے کہ مجھے خیال پیدا ہوا کہ میں فن تفسیر میں ایک ایسی کتاب تصنیف کروں جو اُن خالص اقوال پر مشتمل ہو:

ما بلغني من عظماء الصحابة.

"جو مجھے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم سے پہنچے ہیں"۔

اس پر محی الدین شیخ زادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"انہوں نے اعاظم صحابہ سے سیدنا علی، ابن عباس عبادلہ (عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، ابن مسعود، عبداللہ بن عمرو بن العاص) ابن زبیر، ابن عمر، أبي بن کعب اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کو مراد لیا ہے۔

وصدرهم علي، حتى قال ابن عباس: ما أخذت من تفسير القرآن فعن عليّ رضي الله عنه.

اور ان سب کے صدر سیدنا علی رضی اللہ عنہ ہیں حتیٰ کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ انہوں نے جو کچھ تفسیرِ قرآن میں لیا ہے وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ہے"۔

(حاشية محي الدين شيخ زاده على تفسير البيضاوي ج١ ص٢١؛ فيض القدير للمناوي ج٨ ص ٤٠٤٤، ٤٠٤٥، وط: ج٤ ص٣٥٧؛ التفسير والمفسرون للمحمد حسين الذهبي ج١ ص٨٩، ٩٠؛ البرهان في علوم القرآن للزركشي ج١ ص١٠١)

٣۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

عليٌ بابُ علمي ومبيِّنٌ لأمتي ما أُرسِلتُ به من بعدي.

"علی میرے علم کا دروازہ ہے اور جس چیز کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں اُسے میرے بعد میری امت کو کھول کھول کر بتانے والا ہے"۔

(فردوس الأخبار ج٣ ص٩١؛ سبل الهدى ج١١ ص٢٩٣؛ جمع الجوامع ج٥ ص١٨٦ حديث ١٤٣٩٩، وط: ج٥ ص٥٣٦ حديث ١٥٧٦٧؛ الأجوبة المرضية للسخاوي ص٩٧٨؛ الشذرة ج١ ص١٣١؛ كشف الخفاء ج١ ص١٨٥)

٤۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

أعلم أمتي من بعدي علي بن أبي طالب.

"میرے بعد میری امت کا سب سے بڑا عالم علی بن ابو طالب ہے، رضی اللہ عنہ"۔

(الفردوس بمأثور الخطاب ج١ ص٤٥١ حديث ١٤٩٤؛ المناقب للخوارزمي ص٨٢؛ جمع

الجوامع ج١ ص٤٥٤ حديث٣٤١٤، وط: ج١ ص٧٠٩ حديث٣٥٩٧؛ كنوز الحقائق ج١ ص٧٥ حديث٨٤٧؛ جامع الأحاديث الكبير ج١ ص٤٩١ حديث٣٤١٤؛ كنز العمال ج١١ ص٦١٤ حديث٣٣٠١٩)

۵۔ اوپر کی دونوں حدیثوں کی سند میرے سامنے نہیں ہے تاہم ان کا مضمون بالکل بے غبار ہے، اور اس کی تائید حضرت سعید بن المسیب ﷺ کے اِس مشاہدہ سے ہوتی ہے، وہ فرماتے ہیں:

ما كان أحدٌ بعدَ رسولِ الله ﷺ أعلم من علي بن أبي طالب.

''رسول اللہ ﷺ کے بعد سیدنا علی بن ابو طالب ﷺ سے بڑا عالم کوئی نہیں تھا''۔

(الكنىٰ والأسماء للدولابي ج٢ ص٢١٤؛ كنز العمال ج١٣ ص١٣٠ حديث٣٦٤١٥)

٦۔ حضرت انس ﷺ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا علی ﷺ کو فرمایا:

أنتَ تبين للناس ما اختلفوا فيه من بعدي.

''لوگ میرے بعد اختلاف میں پڑیں گے تو تم اس کی وضاحت کرو گے''۔

(المستدرك ج٣ ص١٢١، وط: ج٤ ص٩٠ حديث٤٦٧٨؛ المناقب للخوارزمي ص٨٥؛ سبل الهدى ج١١ ص٢٩٧؛ كنوز الحقائق ج٢ ص٣٦٧ حديث١٠٠٠٣؛ در السحابة ص٢٢٨: الإيماء إلىٰ زوائد الأمالي والأجزاء، نبيل الجرار ج٢ ص٥٢١ حديث٧٦٢؛ معجم ابن الاعرابي ج ٣ ص ٥٢١ حديث ٧٦٢)

اگر یہ حدیث غیر موضوع ہو تو پھر اس تفہیم و تبیین کا سیدنا علی ﷺ کے ساتھ مخصوص ہونا محتاجِ بیان نہیں۔ ہر بامطالعہ شخص جانتا ہے کہ قرآن کی تاویل و تفسیر میں سیدنا علی ﷺ یکتا تھے۔ خیال رہے کہ بعد از وصالِ نبوی ﷺ سیدنا علی المرتضی ﷺ کے سامنے کسی بھی مسئلہ میں اختلاف کی تین صورتیں آتی تھیں:

1۔ صحابہ کرام ﷺ کے مابین اختلاف اور بالآخر اُن کا مولیٰ علی ﷺ کی بارگاہ میں رجوع،

2۔ خلیفۂ وقت سے کسی حکم کا صادر ہو جانا اور از خود اور بروقت سیدنا علی ﷺ کا اُس کی اصلاح فرمانا اور اُن کی اصلاح کا قبول ہونا،

اُن کے سامنے یہ دونوں صورتیں سابق خلفاء راشدین ﷺ کے اَدوار میں پیش آتی رہیں اور اختلاف رونما ہونے کی صورت میں جس ہستی کے فرمان کو حرفِ آخر کی حیثیت رہی وہ فرمانِ مرتضوی تھا۔

سیدنا علی ﷺ کا قول حرفِ آخر، چند مثالیں

تمام خلفاء اور صحابہ کرام ﷺ سیدنا علی المرتضٰی ﷺ کے قول کو حرفِ آخر سمجھتے تھے، جیسا کہ اس سے قبل سیدنا ابن عباس ﷺ کا ارشاد گذر چکا ہے کہ جب ہمیں سیدنا علی ﷺ سے کوئی بات مل جاتی تو ہم اُس کے برابر کسی بات کو نہ پاتے۔خلفاء راشدین ﷺ کے ہاں بھی بوقتِ اختلاف قولِ مرتضوی کا یہی مرتبہ تھا۔اس سلسلہ میں سیدنا فاروقِ اعظم ﷺ کا طرزِ عمل اور رجوع الی الحق تو محتاجِ بیان ہی نہیں، اور سیدنا عثمانِ غنی ﷺ بھی ارشادِ مرتضوی کو مسترد نہ کر سکے جیسا کہ ہم گذشتہ صفحات میں حجِ قِران کے مسئلہ میں ایک حدیث نقل کر چکے ہیں۔خلیفۂ اول سیدنا ابوبکر صدیق ﷺ کی سیرت میں بھی ہمیں یہ بات ملتی ہے کہ انہوں نے بوقتِ اختلاف تمام صحابہ کرام ﷺ کے مقابلہ میں تنہا قولِ مرتضوی کو مقدم رکھا۔چنانچہ علامہ ابن زنجویہ الرازی اور علامہ ابوالقاسم زمخشری لکھتے ہیں:

''جب مانعین زکوۃ نے زکوۃ دینے سے انکار کر دیا تو حضرت ابوبکر ﷺ نے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام ﷺ کو جمع کر کے اُن سے مشورہ لیا تو کسی نے کہا: آپ انہیں اُن کے حال پر چھوڑ دیں یہاں تک کہ اسلام اُن کے دلوں میں مضبوط ہو جائے، اور بعض نے کہا: فی الحال آپ انہیں اُن کی زکوۃ کے معاملہ میں اُن کی مرضی پر چھوڑ دیں وہ جہاں چاہیں اسے رکھیں، بعد میں اُن کا مواخذہ کر لینا۔اس پر حضرت ابوبکر صدیق ﷺ نے حضرت علی المرتضٰی ﷺ سے دریافت کیا:

ما تقول يا أبا الحسن؟ قال: أقول إن تركت لهم شيئا مما كان أخذه منهم رسول الله ﷺ فأنت على خلاف سنة الرسول ﷺ، فقال: أما لئن قلت ذاك لأقاتلنهم، وإن منعوني عقالاً.

''اے ابوالحسن آپ کیا فرماتے ہیں؟ فرمایا: میں کہتا ہوں کہ اگر آپ نے انہیں کوئی ایک چیز بھی چھوڑ دی جو رسول اللہ ﷺ نے اُن سے لیتے تھے تو آپ سنتِ رسول ﷺ کے خلاف ہوں گے۔اس پر انہوں نے فرمایا: جب آپ یہ فرماتے ہیں تو اگر انہوں نے مجھے اونٹ کے پاؤں باندھنے والی رسی بھی نہ دی تو میں ضرور اُن سے جنگ کروں گا''۔

(مختصر كتاب الموافقة ص٤٦، ٤٧؛ الرياض النضرة ج١ ص١٢٧؛ كنز العمال ج٦ ص٥٣١ حديث ١٦٨٤٥؛ موسوعة العشرة المبشرون بالجنة ج١١ ص١٢٧ وج١٢ ص٥٠؛ فقه علي

لدكتور رواس قلعجي ج٤ ص(١١)

تنبیہ

خیال رہے کہ راقم الحروف دوسرے صحابہ یا خلفاء راشدین ﷺ کے بارے میں یہ نہیں باور کرارہا کہ اُن سے اکثر غلطیاں ہوتی تھیں بلکہ میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ چونکہ وہ عملاً خلیفہ، حاکم، قاضی اور مفتی تھے اور ہمیشہ سوالات اُس شخص کے پاس آتے ہیں جو مسندِ افتاء پر فائز ہو، مقدمات اس کے پاس آتے ہیں جو حاکم یا قاضی ہو۔ سو جب خلفاء راشدین ﷺ کے پاس کوئی سوال، استفتاء یا مقدمہ آجاتا اور پھر کبھی اُس کے حل میں پیچیدگی یا اختلاف کی صورت پیدا ہوجاتی تو سیدنا علی المرتضیٰ ؑ کے قول کو حرفِ آخر سمجھا جاتا۔ فرمانِ نبوی ﷺ "أنت تبين للناس ما اختلفوا فيه من بعدي" (لوگ میرے بعد اختلاف میں پڑیں گے تو تم اس کی وضاحت کروگے) کا یہی مطلب ہے۔

3۔ اختلاف رونما ہونے کی تیسری صورت وہ تھی جو اُس وقت پیش آئی جب خود سیدنا علی ؑ خلیفہ تھے اور اُن کے مدمقابل مختلف اوقات میں انفرادی طور پر نہیں بلکہ جماعتی اور لشکری صورت میں آئے اور سب قرآن کو پیش نظر رکھ کر اپنے اپنے موقف کو سامنے لاتے رہے۔ کوئی گروہ قصاص کا طالب تھا، کسی نے ﴿وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطَانًا﴾ کو دلیل بنا رکھا تھا اور کوئی ''إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ'' کا نعرہ بلند کر رہا تھا، اور سب نے اپنی اپنی فہم میں خود کو قرآن کریم کے مطابق حق پر سمجھ رکھا تھا اور اسی فہم کو وہ کما حقہ نافذ العمل کرانے کی خاطر لشکر کشی یا عملی جنگ پر اتر آئے تھے مگر ہر جنگ کے بعد کے احوال سے لے کر اب تک منطقی نتائج کے لحاظ سے ہر عقل مند یہ کہنے پر مجبور ہے کہ اُن سب کے مقابلہ میں تنہا سیدنا علی المرتضیٰ ؑ صواب پر تھے اور مدمقابل بالترتیب صواب سے دور، پھر دور، پھر دور تھے۔ یہ ہے فرمانِ نبوی ﷺ "أنت تبين للناس ما اختلفوا فيه من بعدي" (لوگ میرے بعد اختلاف میں پڑیں گے تو تم اس کی وضاحت کروگے) کا مطلب۔ اِس آخری اور تیسری صورت کو ایک ارشادِ نبوی ﷺ میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ:

''ہم نے تنزیل قرآن کی تکمیل پر جہاد کیا ہے اور خاصف النعل (یعنی سیدنا علی ؑ) تاویل قرآن پر جہاد کرے گا''۔

جیسا کہ اس سے قبل باحوالہ یہ حدیث مبارک گزر چکی ہے۔

سیدنا علی علیہ السلام ہی باب العلم کیوں؟

بعض ذہنوں میں سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فقط سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو ہی باب العلم کیوں فرمایا ہے، کسی دوسرے کو کیوں نہیں فرمایا؟ مجھے اس کی دو وجہیں سمجھ آتی ہیں:

ا۔ ایک یہ کہ وحی اترنے کے بعد اور اعلانِ نبوت سے قبل مذکرین میں سب سے پہلے جس خوش نصیب کو اظہارِ ایمان اور مسلسل مدینۃ العلم ﷺ کی معیت کی سعادت حاصل ہوئی وہ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ ہی کی ذات بابرکات ہے، اور ﴿ أَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ ﴾ کے حکم الٰہی پر مدینۃ العلم ﷺ نے اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو مدعو کیا تو اُنہیں سب سے پہلا بلانے اور جمع کرنے والا بھی باب العلم رضی اللہ عنہ ہی تھا، پھر اُسی مجلس میں سب سے پہلے جس نے مدینۃ العلم ﷺ کے بھرپور ساتھ دینے کی حامی بھری وہ بھی باب العلم رضی اللہ عنہ ہی تھا، اور یہی وہ کم سن تھا جس کے حق میں اُسی مجلس میں زبانِ نبوت سے یہ الفاظ صادر ہوئے تھے کہ "اس کی بات سننا اور اس کی طاعت کرنا" سو چونکہ اسلام کے سب سے پہلے بلاوے میں مدینۃ العلم ﷺ اور لوگوں کے مابین واسطہ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی ذاتِ مقدسہ تھی اس لیے اُن ہی کا حق تھا کہ اُنہیں بابِ مدینۃ العلم کے عظیم الشان اعزاز سے نوازا جاتا، یعنی حق بہ حقدار رسید۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ علم ایک خزانہ ہے، امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

العلم خزائن ومفاتيحها السؤال.

"علم خزانے ہیں اور اُن کی چابیاں سوالات ہیں"۔

(جامع بيان العلم وفضله لابن عبدالبرج۲ ص۳۷۹)

بلاشبہ مدینۃ العلم ﷺ کا دروازہ کسی پر بند نہیں تھا، سوال کی چابی سے جو چاہتا اُس سے خزانہ حاصل کرلیتا تھا مگر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں فقط ایک باب العلم رضی اللہ عنہ کی ہی ذات پاک تھی جن پر سوال اور بلاسوال علم کی بارش ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ محدثین کرام لکھتے ہیں:

أخبرنا محمد بن بشار، قال: حدثني أبو المَسَاوِر، قال: حدثنا عوف، عن عبد الله بن عمرو بن هند الجَمَلي، عن علي رضي الله عنه قال: كنتُ إذا سألتُ رسولَ الله ﷺ أعطيتُ، وإذا سكتُّ ابتدأني.

''حضرت عبداللہ بن عمرو بن ہند الجملی سیدنا علی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ اُنہوں نے فرمایا: جب میں رسول اللہ ﷺ سے سوال کرتا تھا تو آپ جواب عطا فرماتے تھے اور جب میں خاموش ہوتا تو آپ ازخود عطا فرماتے تھے''۔

(السنن الكبرى للنسائي ج٧ص٤٥٠ حديث٨٤٥٠؛فضائل الصحابة ج٢ص٨٠٣ حديث ١٠٩٩؛سنن الترمذي ص٨٤٧ حديث٣٧٢٢وص٨٤٨حديث٣٧٢٩؛المصنف لابن أبي شيبة ج٦ص٣٦٨ حديث٣٢٠٦٠، ٣٢٠٦١، وط: ج١٠ ص ٦٨١ حديث ٣٢٦٦٨، وط: ج ١١ص١٣٧ حديث٣٢٦٠٦؛أطراف الغرائب والأفراد للدارقطني ج١ص١٠٨ حديث ٤٤٠٢؛ المستدرك للحاكم ج٣ص ١٢٤ حديث٤٦٨٧، وط: ج٣ص ١٣٥ حديث ٤٦٣٠؛ الأحاديث المختارة ج٢ص ٢٣٥ حديث٦١٤؛مشكاة ج٢ص٥٠٤ حديث٦٠٩٥؛حلية الأولياء لأبي نعيم ج٤ ص٤٢٥ حديث٦٠٨٣؛الطبقات الكبرى لابن سعدج٢ص٤٢٠؛مختصر تاريخ دمشق ج١٨ص ١٦؛الرياض النضرة ج٣ص١٦٥؛الصواعق المحرقة ص١٢٣)

امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن اور امام حاکم نے صحیح قرار دیا ہے، اور امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہم نے حاکم کی تائید کی ہے، نیز فضائل الصحابۃ کے محقق شیخ وصی اللہ بن محمد عباس نے بھی اس کو صحیح کہا ہے۔

سیدنا علی ﷺ کی اعلمیت کا سبب ہی یہی تھا کہ ازخود اُن پر مدینۃ العلم ﷺ کے علم کی بارش ہوتی تھی، چنانچہ ایک مرتبہ خود اُن ہی سے اُن کی اعلمیت کا سبب پوچھا گیا کہ کیا وجہ ہے کہ آپ صحابہ کرام ﷺ سے حدیث میں زیادہ ہیں؟ تو فرمایا:

إني كنت إذا سألته أنبأني وإذا سكتُ ابتدأني.

''میں جب حضور ﷺ سے سوال کرتا تو آپ مجھے بتاتے اور جب خاموش ہوتا تو ازخود کرم فرماتے''۔

(الطبقات الكبرى لابن سعد ج٢ص٤٢٠، وط: ج٢ص٢٥٨؛مختصر تاريخ دمشق ج١٨ ص ١٦؛الصواعق المحرقة ص١٣٢)

فقط یہ سائلین ہی سیدنا علی ﷺ کو حدیث کا بڑا عالم نہیں سمجھتے تھے بلکہ ام المومنین سیدتنا عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی فرماتی تھیں ''إنه أعلم الناس بالسنة'' (بیشک وہ تمام لوگوں سے بڑھ کر سنت کے عالم ہیں) اور جو

سنت کا بڑا عالم ہو وہی قرآن کا بڑا عالم ہوتا ہے، چنانچہ سیدنا فاروقِ اعظم ﷛ فرماتے ہیں:

إنه سيأتي ناسٌ يجادلونكم بشبهات القرآن فخذوهم بالسنن، فإن أصحاب السنن أعلم بكتاب الله.

''عنقریب کچھ لوگ آئیں گے جو تمہارے ساتھ متشابہاتِ قرآن میں بحث و تکرار کریں گے، تم ان کا مواخذہ احادیث سے کرنا، بیشک اصحابِ حدیث سب سے بڑھ کر قرآن کریم کے عالم ہیں''۔

(سنن الدارمي ج١ ص٣٧ حديث١١٩؛ شرح أصول اعتقاد أهل السنة للالكائي ج١ ص٧٠ حديث ٢٠٢؛ الشريعة للآجري ص٥٥؛ جامع بيان العلم لابن عبدالبر ج٢ ص١٠١٠؛ الإبانة للعكبري ج١ ص٢٥٠، ٢٥١؛ شرح السنة للبغوي ج١ ص١٧٩؛ كتاب الباعث على إنكار البدع والحوادث لأبي شامة ص٦٩؛ مفتاح الجنة للسيوطي ص٧١؛ جمع الجوامع للسيوطي ج ١٣ ص ٢٦٨ حديث١٠٠٧)

اگر کسی انسان کو انصاف کی نگاہ حاصل ہو تو اُسے ایک طرف قرآن میں اعلم (سب سے بڑا عالم) اور دوسری طرف حدیث میں اعلم (سب سے بڑا عالم) سیدنا علی ﷛ کے سوا کوئی دوسرا نظر نہیں آئے گا حتیٰ کہ سیدنا علی ﷛ خود بھی اِس نعمتِ عظمیٰ میں اپنے آپ کو یکتا سمجھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ وہ سراپا تواضع ہونے کے باوجود اس نعمتِ عظمیٰ پر خاموش نہ رہ سکے۔ چنانچہ حضرت زاذان ﷛ سے ایک حدیث میں ہے کہ لوگوں نے سیدنا علی ﷛ سے صحابہ کرام ﷡ کی خوبیوں کے متعلق دریافت کیا تو وہ شوق سے بیان فرماتے رہے اور آخر میں انہوں نے عرض کیا:

فحدثنا عنك يا أمير المؤمنين. قال ﷛: مهلاً نهى الله عن التزكية. قال: فقال قائل: فإن الله تعالىٰ يقول: ﴿وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ قال ﷛: فإني أحدثكم بنعمة ربي تبارك وتعالىٰ: كنتُ إذا سألتُ أُعطيتُ وإذا سكتُّ أُبتديتُ، وبين الجوارح مني مليء علماً جماً.

''امیر المومنین آپ اپنے متعلق بھی کچھ بیان فرمائیے۔ فرمایا: رہنے دو، اللہ تعالیٰ نے خودستائی سے منع فرمایا ہے۔ اس پر کسی نے عرض کیا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿اپنے رب کی نعمتوں کو بیان کیجئے﴾ فرمایا: تو میں اپنے رب تبارک و تعالیٰ کے احسان کے طور پر بیان کرتا ہوں

کہ میں جب بھی سوال کرتا تو مجھے عطا کیا جاتا اور جب خاموش ہوتا تو مجھ پر کرم کی ابتدا کی جاتی، اور میرے پہلو علم کثیر سے لبریز ہیں“۔

(فضائل الصحابة ج٢ ص٨٠٣ حديث١٠٩٩؛ المعجم الكبير ج٦ ص٢١٣، ٢١٤ حديث٦٠٤١؛ حلية الأولياء ج١ ص١٢٩، ١٨٧؛ إتحاف الخيرة المهرة للبوصيري ج٧ ص٢٠٨ حديث ٦٦٨١، وط: ج٩ ص٢٧٤، ٢٧٥ حديث٨١٨٩؛ المطالب العالية ج٤ ص٨١ حديث٤٠٢٢، وط: ج١٦ ص٢٥٩ حديث٣٩٩٠؛ إعلام الموقعين ج٢ ص٢٥؛ مختصر تاريخ دمشق ج٦ ص٢٥٢؛ جمع الجوامع ج١٣ ص١٢٨ حديث٦٠٨١؛ كنز العمال ج١٣ ص١٦٠ حديث٣٦٤٩٢)

خط کشیدہ الفاظ کو بار بار پڑھئے اور غور فرمایئے کہ علم کی اِس فراوانی کا سبب کیا تھا؟ اس کا سبب فقط مدینۃ العلم ﷺ کا وہ خصوصی کرم تھا جو دوسرے کسی بھی انسان پر نہیں تھا۔ حتیٰ کہ جب مدینۃ العلم ﷺ کی ذات پاک غصہ میں ہوتی اور اُس وقت کسی کو جرأت کلام نہ ہوتی تو تب بھی باب العلم ؑ پر مدینۃ العلم ﷺ کے کرم کی بارش برابر جاری رہتی۔ چنانچہ ام المؤمنین سیدتنا ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

أن النبي ﷺ كان إذا غضب لم يجترئ أحدٌ منا يكلمه غير علي بن أبي طالب.

”بیشک نبی کریم ﷺ جب غضب ناک ہوتے تو ہم میں سے کوئی انسان آپ کے ساتھ کلام کرنے کی جرأت نہ کرتا، ماسوا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما کے“۔

(المستدرك ج٣ ص١٢٩ حديث٤٧٠٣؛ المعجم الأوسط ج٤ ص٣١٨ حديث٤٣١٤؛ حلية الأولياء ج٩ ص٢٢٧؛ مجمع البحرين ج٣ ص٣٧٨، ٣٧٩ حديث٣٦٩٥؛ مجمع الزوائد ج٩ ص١١٦، وط: ج٩ ص١٥٢ حديث ١٤٦٨٣؛ الصواعق المحرقة ص١٢٣؛ الجامع الصغير حديث ٦٧٥٣؛ تاريخ الخلفاء للسيوطي ص ١٣٢، ١٣٣؛ كنوز الحقائق ج٢ ص٦٠ حديث ٥٧١٩؛ الكواكب الدرية ج١، القسم الأول ص٩٩؛ كنز العمال ج ٧ ص١٤١ حديث ١٨٤٠٥؛ در السحابة ص٢١٤، ٢١٥؛ نزل الأبرار للبدخشاني ص٣٨)

خود غور فرمایئے: جو خوش بخت انسان مدینۃ العلم ﷺ کی ذات پاک کو اس قدر محبوب ہو اور جس کی اُس بارگاہ میں اِس قدر رسائی ہو وہ باب العلم نہیں ہوگا تو پھر اور کون ہوگا؟

حدیث مدینة العلم پر من گھڑت اضافہ

مدینۃ العلم ﷺ کا باب ہونا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خصوصیت ہے۔ جن لوگوں کو یہ خصوصیت پسند نہیں آئی انہوں نے اس خصوصیت کی نفی میں بڑے پاپڑ بیلے ہیں۔ کسی نے تاویلیں کیں، کسی نے اس کے مقابلہ میں پہلے ضعیف ترین روایات پیش کیں پھر اُن کی بھی تاویلیں کیں اور جب بس نہ چلا تو خود اسی حدیث میں اپنی طرف سے اضافہ کرنے سے بھی باز نہ آئے۔ جس شخص نے اس حدیث میں اپنی طرف سے اضافہ کیا تھا اس کا نام اسماعیل بن علی بن مثنیٰ الاستراباذی الواعظ ہے، یہ شخص ۴۴۸ھ میں مرا تھا، حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ اس کے حالات میں لکھتے ہیں:

"مغیث بن علی الصوری بیان کرتے ہیں کہ ہمیں سہل بن بشر نے اپنے الفاظ میں کئی بار بیان کیا کہ اسماعیل دمشق میں وعظ کرتا تھا: ایک مرتبہ ایک شخص نے کھڑے ہو کر اس سے حدیث "أنا مدينة العلم وعليٌّ بابها" کے متعلق دریافت کیا تو وہ کہنے لگا:

هذا مختصر، وإنما هو: "أنا مدينة العلم وأبوبكر أساسها، وعمر حيطانها، وعثمان سقفها، وعلي بابها. قال: فسألوه أن يخرج لهم إسناده فوعدهم به.

یہ مختصر ہے اور پوری یوں ہے: میں علم کا شہر ہوں اور ابوبکر اس کی بنیاد ہے، اور عمر اس کی دیواریں ہے، اور عثمان اس کی چھت ہے اور علی اس کا دروازہ ہے۔ سہل کہتے ہیں: لوگوں نے اس سے سند کا مطالبہ کیا تو اس نے ان سے وعدہ کیا"۔

(لسان الميزان ج١ ص٦٥٢ رقم الترجمة ١٣٣٢، وط: ج٢ ص١٥٢ رقم الترجمة ١٢٠٦)

وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو، جھوٹے شخص کا کیا وعدہ؟ پھر یہ فقط جھوٹا ہی نہیں تھا بلکہ کذاب ابن الکذاب (جھوٹا جھوٹے دا پتر) بھی تھا۔ چنانچہ امام ابن السمعانی لکھتے ہیں:

كان يقال له كذاب ابن كذاب.

"اس کو جھوٹا جھوٹے کا بیٹا کہا جاتا تھا"۔

حافظ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''عبدالعزیز النخشبی، شافع بن ابوعوانہ، ابوسعد بن ابوبکر الاسماعیلی، امام حاکم، امام سلمی اور ابوالفضل الخزاعی اور دوسرے حضرات فرماتے ہیں: یہ قصے بیان کرتا تھا اور جھوٹ بولتا تھا، اور اس کے چہرے پر متقین والی علامت نہیں تھی۔ نخشبی فرماتے ہیں: میں ابونصر عبید اللہ بن سعد السجزی کے پاس مکۃ المکرمۃ میں حاضر ہوا تو اس کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا: وہ جھوٹا جھوٹے کا بیٹا ہے، نہ اس سے حدیث لی جاتی ہے اور نہ ہی اس کی کوئی عزت ہے۔ میں نے اس کی اور اس کے باپ کی احادیث کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ وہ من گھڑت متنوں کو صحیح سندوں پر چڑھادیتا ہے''۔

(لسان المیزان ج۱ ص۶۵۲ ،وط: ج۲ ص۱۵۲)

امام ذہبی لکھتے ہیں:

قال ابن طاهر: مزقوا حديثه بين يديه ببيت المقدس.

''ابن طاہر کہتے ہیں: لوگوں نے اس کے روبرو بیت المقدس کے اندر اس کی (جھوٹی) حدیثیں پھاڑ ڈالی تھیں''۔

(میزان الاعتدال ج۱ ص۳۹۸ رقم الترجمۃ ۱۳۳۱؛ لسان المیزان ج۱ ص۶۵۱، وط: ج۲ ص۱۵۱)

ہمارے دور میں ایک ایسے ہی مقرر نے مزید اضافہ یوں بیان کیا ہے: ''**ومعاوية حلقتها**'' (اور معاویہ اس کی کنڈی ہے)۔ اس مقرر نے ایک سیمینار میں متعدد احادیث موضوعہ بیان کیں، میں نے اُن موضوع احادیث کا جائزہ لیا ہے، ان شاء اللہ عنقریب شائع ہوگا۔

نزہۃ المجالس کو پڑھنے کا حکم

اب تک کذاب ابن الکذاب (جھوٹے، جھوٹے دے پتر) قسم کے لوگ اس موضوع (یعنی من گھڑت) روایت کو چلا رہے ہیں۔ تحریر و تقریر میں بھی چلا رہے ہیں اور موبائل و نیٹ ورک پر بھی اس کثرت سے اس جھوٹی روایت کو {Message} کیا جاتا ہے کہ اس سے پڑھے لکھے لوگ بھی متاثر ہونے لگے، حتیٰ کہ مجھے میرے ایک خاص کرم فرما بزرگ نے بھی {Message} کر کے فرمایا کہ جب پوری حدیث یوں ہے تو اسے پورا بیان کرنا چاہیے اور آپ کو بھی اپنی کتاب ''شرح خصائص علیؓ'' میں مکمل لکھنا چاہیے تھا۔

جھوٹ کے ساتھ جرأت کی حد یہ ہے کہ اس جھوٹی روایت پر "نزھۃ المجالس" کے ساتھ ساتھ بخاری کا حوالہ بھی دیا گیا۔ بخاری اور کسی بھی معتبر کتاب میں یہ حدیث نہیں ہے، البتہ "نزھۃ المجالس" میں موجود ہے، لیکن ہمارے عوام تو کیا اکثر علماء اور خطباء کہلانے والے لوگ بھی نہیں جانتے کہ "نزھۃ المجالس" کس پائے کی کتاب ہے؟ کسی غیر عالم یا پیشہ ور مقررین کے نزدیک تو اس کتاب کا مرتبہ ہوگا مگر ماہرینِ علم حدیث کے ہاں ایسی کتابوں کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ چنانچہ مشہور حنفی محدث وفقیہ شیخ عبدالفتاح ابوغدۃ رحمۃ اللہ علیہ معتبر محدثین کرام کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

قال شيخنا العلامة الفقيه المحدث الأديب الشيخ علوي المالكي المكي حفظه الله تعالىٰ وأطال بقاء ه في عافية وهناء ة في آخر جزئه: (المنهل اللطيف في أحكام الحديث الضعيف ص ٢٩): فائدة: ذكر العلماء كتباً لا ينبغي للإنسان ينقل منها حديثاً إلا بعد المراجعة والتنقيب بل بعضها يغلب فيه ذكر الأحاديث الموضوعة، وذلك: مثل كتاب (شمس المعارف ونزهة المجالس لعبد الرحمن الصفوري، فلا ينبغي الاعتماد عليها لكثرة الأحاديث الموضوعة فيها حتى إن برهان الدين محدث دمشق حذر من قراء تها، وحرّمها الجلال السيوطي، ومثلها: سيرة الكبرىٰ صاحب فتوح مكة، ذكر ابن حجر رحمه الله أنها كذب وغالبها باطل، وكذا (فتوح الشام للواقدي، وقصص الأنبياء، وبدائع الزهور) ومؤلفات الواحدي، والكلبي، فقد نص على حرمتها الجلال السيوطي، ثم قال فكم من مؤلف حاطب ليل وجارف سيل وناقد لا يفرق بين الصحيح والضعيف، ويظن أن كل مدوّر رغيف، ويأتي ببعض الحجج الواهية التي للهاوية. والله أعلم.

"ہمارے شیخ العلامہ، الفقیہ المحدث الادیب الشیخ علوی المالکی اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرمائے اور باعافیت انہیں عمر دراز عطا فرمائے اپنی کتاب "المنهل اللطيف في أحكام الحديث الضعيف" کے آخر صفحہ ۲۹ میں فرماتے ہیں، فائدہ: علماء کرام نے چند کتابیں ذکر فرمائی ہیں کسی شخص کو ان سے کوئی حدیث نہیں نقل کرنا چاہیئے البتہ خوب تحقیق اور اصل کتب

احادیث کی طرف رجوع کرنے کے بعد نقل کر سکتا ہے، بلکہ بعض کتابیں ان میں ایسی ہیں جن میں اکثر موضوع احادیث مذکور ہیں۔ مثلاً کتاب "شمس المعارف" اور عبدالرحمن صفوری کی "نزهة المجالس" پس ان پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے، اس لیے کہ ان میں کثرت سے موضوع روایات ہیں حتی کہ محدث دمشق امام برھان الدین ان کتابوں کو پڑھنے سے اجتناب فرماتے تھے، اور امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں پڑھنا حرام قرار دیا ہے، اور اسی طرح کتاب "سیرة الکبری" جو صاحب فتوح مکہ کی تصنیف ہے۔ امام ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ جھوٹ پرمبنی ہے اور اس کا اکثر حصہ باطل ہے اسی طرح واقدی کی "فتوح الشام" ثعلبی کی "قصص الأنبياء" اور "بدائع الزهور" اور واحدی کی تصانیف۔ پس امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ان سب کا پڑھنا حرام قرار دیا ہے۔ پھر امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: بہت سے مصنف حاطب اللیل اور جارف السیل (رات کو لکڑیاں جمع کرنے والے جو سانپ کو بھی لکڑی گمان کرتے ہیں، اور بہتے پانی کے کنارے بیٹھ کر ہر چیز کو پکڑنے والے کی طرح) ہیں اور ناقد ہیں تو ایسے جو صحیح اور ضعیف میں فرق نہیں کر سکتے اور ہر گول چیز کو روٹی گمان کرتے ہیں اور ایسی دلیلیں لاتے ہیں جو انہیں جہنم میں پہنچانے کا سبب بنتی ہیں، واللہ اعلم"۔

(المنهل اللطيف في أحكام الحديث الضعيف ص ٢٩ مطبعة مصطفى محمد مصر ١٣٥٧هـ، بحوالہ تعليقات "الأجوبة الفاضلة للأسئلة العشرة الكاملة ص ١٣٩ مكتب المطبوعات الإسلامية بحلب الطبعة الثالثة ١٤١٤هـ)

"بابُ مدينةِ العلم" ہونا مرتضوی خصوصیت

امام سیوطی، امام برھان الدین دمشقی، امام ابن حجر مکی، امام علوی بن عباس مالکی مکی اور شیخ عبدالفتاح ابوغدة رحمۃ اللہ علیہم کی اس تصریح سے معلوم ہوا کہ حدیث مدینۃ العلم پر مذکورہ بالا اضافہ موضوع ہے اور "نزهة المجالس" وغیرہ ایسی غیر معتبر کتابوں کے علاوہ کہیں سے اس کا اتہ پتہ معلوم نہیں ہوتا، سو جب یہ اضافہ موضوع، من گھڑت اور باطل ہے تو پھر دلائل نقلیہ کی رو سے ثابت ہو گیا کہ مدینۃ العلم ﷺ کا باب ہونا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خصوصیت ہے۔

حدیث گھڑنے والے کی جہالت

اپنی طرف سے کلام بنا کر حضور اکرم ﷺ کی طرف منسوب کرنے والا جہاں تمام کذابوں سے بڑا کذاب ہے وہیں وہ "دروغ گو را حافظہ نباشد" کے مصداق حدیث گھڑنے اور الفاظ کے چناؤ میں بھی ایسی غلطی کر جاتا ہے کہ جھوٹ از خود عیاں ہو جاتا ہے۔ زیر بحث حدیث گھڑنے والے سے بھی یہ سنگین غلطی ہوئی کہ اس نے سیدنا ابو بکر صدیقؓ کے متعلق جو الفاظ اپنی طرف سے گھڑے ہیں اُن ہی سے اُس کا کذب عیاں ہو رہا ہے۔ وہ الفاظ یہ ہیں "وابو بکر أساسها" (اور ابو بکر اس شہر کی اساس ہیں) اساس بنیاد کو کہتے ہیں، اور اس حدیث میں مدینہ (شہر) حضور اکرم ﷺ کو کہا گیا ہے، تو کیا سیدنا ابو بکر صدیقؓ نبی کریم ﷺ کی بھی اساس ہیں؟

عظمتِ علمِ مرتضوی کو گھٹانے کے حربے

جب کچھ لوگوں نے دیکھا کہ حدیث مدینۃُ العلم کو اکثر محدثین کرام نے حسن یا صحیح قرار دیا ہے تو انہوں نے اس کی معنوی اہمیت کو گھٹانے کے دوسرے حربے استعمال کرنا شروع کر دیئے۔ چنانچہ مشہور ناصبی حکیم محمود احمد ظفر لکھتا ہے:

> "اگر اس حدیث کو صحیح بھی مان لیا جائے پھر بھی اس کے یہ معنی نہیں جو شیعہ حضرات یا بعض کودن قسم کے سنی لوگ سمجھتے ہیں۔ شہر کا دروازہ ایک نہیں ہوتا۔ شہر کے دروازے ایک سے زائد ہوتے ہیں۔ اور نبوت کے شہر علم کے بھی ایک سے زائد دروازے تھے بلکہ ہر صحابی رسول نبوت کے شہر علم کا دروازہ تھا جس کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں تعبیر کیا۔
>
> اصحابی کالنجوم بایهم اقتدیتم اهتدیتم
>
> "میرے صحابہ کرامؓ آسمان علم کے ستارے ہیں۔ ان میں سے جس کی پیروی بھی کرو گے راہِ ہدایت پاؤ گے"۔

(امیر المؤمنین سیدنا علیؓ از حکیم محمود احمد ظفر ص 471)

اس حدیث سے "شیعہ حضرات یا بعض کودن (بے وقوف) قسم کے سنی لوگ" کیا مطلب لیتے ہیں؟ ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ ہاں ہمیں بلا تکلف جو بات سمجھ آتی ہے وہ یہ ہے کہ زبانِ نبوت ﷺ سے باب العلم ہونے کی عظمت فقط سیدنا علی المرتضیٰؓ کو حاصل ہوئی، اس لیے ہم ہر طرح کی تاویلات کے بغیر فقط مرتضیٰ کرم

اللہ وجہہ کو ہی باب العلم مانتے ہیں۔اس پر اگر کوئی سفیہ شخص ہمیں بھی کودن کہے تو ہم پر ایسی بکواسات کا کچھ اثر نہیں ہوتا، کیوں؟:

- اس لیے کہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بعض مسائل میں جس ہستی کے قول کو حرفِ آخر سمجھا تھا وہ باب العلم سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی ذات بابرکات ہے،
- جس کی عدم موجودگی کی صورت میں خلیفۂ ثانی سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ موت کو ترجیح دیتے تھے وہ بھی باب العلم سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی ذات بابرکات ہے،
- جس ہستی کے وجودِ مسعود سے ایسے علم کی بنیاد پڑی جس کے بغیر کوئی انسان عالم ہو ہی نہیں سکتا وہ بھی باب العلم سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی ذات بابرکات ہے، حتیٰ کہ نواصب کے سلوف ابن زیاد اور حجاج بن یوسف وغیرہ بھی اس علم کی اساس وترویج میں تلمیذِ مرتضیٰ سیدنا ابوالاسود الدئلی رضی اللہ عنہ کے محتاج ہوئے تھے،
- اور جس ہستی کو تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مقابلہ میں نبی اکرم ﷺ نے "أَكْثَرُهُمْ عِلْماً" (سب سے زیادہ عالم) فرمایا وہ بھی باب العلم سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی ذات بابرکات ہے، جب حقیقت یہ ہے تو پھر ہم پر کسی محدث کی تاویل اثر کرتی ہے اور نہ ہی ہم نام نہاد شیعہ کی تردید میں ایسی تاویلات کو لازم سمجھتے ہیں۔یہ تاویلات اُن لوگوں کے نزدیک اہم سمجھی جاتی ہیں جن کے نزدیک خلافت کے لیے اعلم اور افضل ہونا لازم ہے، جبکہ عند اہل السنۃ اگر مفضول کی خلافت پر اتفاق ہو جائے تو اُس کی خلافت برحق ہوتی ہے، جیسا کہ خلفاءِ ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی خلافت برحق تھی۔

کس صحابی کی اعلمیت منصوص ہے؟

خیال رہے کہ درجہ بدرجہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم علماء تھے لیکن تاحال ہمارے مطالعہ کے مطابق جس ہستی کو نبی کریم ﷺ نے "أَكْثَرُهُمْ عِلْماً" (اُن سب سے زیادہ عالم) فرمایا وہ فقط سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی ذات بابرکات ہے۔اگر بلا قید کسی دوسرے صحابی کے حق میں ایسے الفاظ زبانِ نبوی ﷺ سے منقول ہوں اور ہمارے مطالعہ میں نہ آئے ہوں تو مطلع ہونے پر ہم اس خصوصیت پر مصر نہیں ہوں گے۔"بلا قید" کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ حلال وحرام میں أعلم حضرت معاذ بن جبل، أفرضهم یعنی علم میراث میں اعلم حضرت زید بن ثابت، أقرأ یعنی قراءت میں اعلم حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے لیکن بلا اضافت اور بلا قید مطلقاً اعلم یعنی "أعلم أمتي من بعدي" یا پھر "أَكْثَرُهُمْ عِلْماً" فقط سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی شان میں منقول ہے۔سیدنا ابوبکر صدیق

ﷺ کے حق میں بعض صحابہ کی زبان پر "کان أبو بکر أعلمنا" (ابوبکر ہم سب سے بڑے عالم تھے) کے الفاظ آئے ہیں مگر اُن کی شان میں زبانِ نبوت سے ایسے الفاظ راقم الحروف کے مطالعہ میں نہیں آئے۔ لہٰذا امتی پر لازم ہے کہ وہ امتی کی حیثیت سے صحابی کے قول کے مقابلہ میں فرمانِ نبوی ﷺ کو ترجیح دے۔ صاحب "ضربِ حیدری" نے بھی یہ اصول بیان کیا ہے مگر وہ خود اس پر کاربند نہیں ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"اگر کسی بات کو حرفِ آخر کہا جاسکتا ہے تو وہ نبی کریم ﷺ ہی کا ارشادِ عالی ہے"۔

(ضربِ حیدري ص235)

اس کے باوجود وہ سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کو نہ تو اعلم مانتے ہیں، نہ "أکثرهم علماً" مانتے ہیں اور نہ ہی بلاتاویل باب العلم مانتے ہیں، بلکہ جن حضرات کی شان میں باب العلم کے الفاظ زبانِ نبوت ﷺ سے صادر نہیں ہوئے انہیں باب العلم تو کیا بلکہ بابٌ لِلْباب قرار دیتے ہیں۔ اُن کے اِس قول کی تفصیل اور پھر اُس کی تردید آگے آرہی ہے۔

"أصحابي کالنّجوم" کی تحقیق

ہمارے اکثر حضرات نام نہاد شیعہ اور روافض کی ضد میں سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کے باب العلم ہونے کی عظمت کو گھٹانے کی خاطر حدیث مدینۃ العلم کے مقابلہ میں جہاں دوسری مختلف مشقتیں برداشت کرتے ہیں وہیں اِس روایت کو لانے کی زحمت بھی گوارا فرماتے ہیں حالانکہ اس پر شدید جرح کی گئی ہے۔ اگرچہ یہ روایت متعدد الفاظ میں بنائی اور لائی گئی مگر اس کی کوئی سند اور متن محفوظ نہیں ہے۔ اس کے راویوں کو شدید ضعیف، ساقط، متروک، کذاب، وضاع (حدیث گھڑنے والا) کہا گیا ہے اور خود اس حدیث کو موضوع (گھڑی ہوئی) کہا گیا ہے۔

ایک مقام پر یہ حدیث ان الفاظ میں لائی گئی:

ثنا حمزة الکاتب، ثنا نعیم بن حماد، ثنا عبد الرحیم بن زید العمي عن أبیه، عن سعید بن المسیب، عن عمر بن الخطاب [قال]: قال رسول الله ﷺ: سألتُ ربي فیما اختلف فیه أصحابي مِنْ بَعْدِي، فأوحی الله ﷻ إليّ: یا محمد إنّ أصحابک عندي بمنزلة النجوم بعضُهم أضْوَأ من بعض، فمن أخذ بشيء مما هم علیه من اختلافهم فهو عندي علی هُدًی.

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے اپنے رب سے اپنے بعد اپنے صحابہ کے اختلاف کے بارے میں دریافت کیا تو اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی فرمائی: اے محمد ﷺ بیشک آپ کے صحابہ میرے نزدیک آسمان میں ستاروں کی مانند ہیں، اُن میں سے بعض بعض سے زیادہ روشن ہیں، جس اختلاف پر وہ تھے کسی شخص نے اس میں کسی چیز کو بھی اپنا لیا تو وہ میرے نزدیک ہدایت پر ہے"۔

(الكامل في ضعفاء الرجال ج٤ ص١٥١)

اس کی سند میں ایک شخص عبدالرحیم بن زید ہے، امام ذہبی لکھتے ہیں:

"یحییٰ بن معین نے فرمایا ہے: یہ کذاب ہے"۔

(ميزان الاعتدال ج٤ ص٣٣٦)

یہ حدیث ایک اور شخص زید بن الحواری سے بھی منقول ہے، امام ذہبی اس کے حالات میں یہ حدیث لائے اور آخر میں فرمایا: فهو باطل. (پس یہ باطل ہے)۔

(ميزان الاعتدال ج٣ ص١٥٢)

یہ حدیث بایں سند و الفاظ بھی منقول ہے:

أخبرنا أبو الفتوح منصور بن علي الأنماطي، ثنا أبو محمد الحسن بن رشيق، ثنا محمد بن جعفر بن محمد ثنا جعفر يعني ابن عبد الواحد، قال: قال لنا وهب بن جرير بن حازم عن أبيه، عن أبي صالح، عن أبي هريرة، عن النبي ﷺ قال: مثل أصحابي مثل النجوم من اقتدى بشيء منها اهتدى.

"نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میرے صحابہ کی مثال ستاروں کی مانند ہے، جس شخص نے ان میں سے کسی چیز کی اقتدا کی وہ ہدایت پا گیا"۔

(مسند الشهاب ج٢ ص٢٧٥ حديث ١٣٤٦)

اس کی سند میں ایک شخص جعفر بن عبدالواحد ہے، امام ذہبی اور حافظ رحمۃ اللہ علیہما لکھتے ہیں:

"امام دارقطنی نے فرمایا: یہ حدیث گھڑتا تھا اور امام ابوزرعہ نے فرمایا: اس نے ایسی احادیث

روایت کیں جن کی کوئی اصل نہیں،......اور یہ روایت بھی اس کی آفتوں میں سے ایک آفت ہے"۔

(ملخصاً: میزان الاعتدال ج۲ ص۱٤۱؛ لسان المیزان ج۲ ص۲۰۸، ۲۰۹)

حافظ رحمہ اللہ نے ایک اور مقام پر لکھا ہے:

وفي إسناده جعفر بن عبد الواحد الهاشمي، وهو كذاب.

"اس کی سند میں ایک شخص جعفر بن عبدالواحد ھاشمی ہے اور وہ کذاب (بڑا جھوٹا) ہے"۔

(تلخیص الحبیر ج٤ ص٤٦٣)

یہ حدیث اِس سند اور اِن الفاظ سے بھی منقول ہے:

ثنا الحسين بن عبد الله القطان، ثنا أيوب الوزان، ثنا غسان بن عبيد، ثنا حمزة الجزري عن نافع، عن ابن عمر، قال: قال رسول الله ﷺ إنما أصحابي مثل النجوم فأيهم أخذتم بقوله اهتديتم.

"حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میرے صحابہ کی مثال ستاروں کی طرح ہے، پس تم کسی کے قول کو لو گے تو ہدایت پاؤ گے"۔

(الكامل في ضعفاء الرجال ج۳ ص۲٦۳)

یہ ایک اور سند سے بھی مروی ہے اور دونوں میں ایک شخص حمزہ النصیبی الجزری ہے، امام ابن عدی فرماتے ہیں:

"یہ حدیثیں گھڑتا تھا، یحییٰ بن معین فرماتے ہیں: حمزہ جزری، یہ حمزہ بن ابوحمزہ النصیبی ہے، یہ ایک پیسہ کے برابر بھی نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ منکر الحدیث ہے، امام نسائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ متروک ہے"۔

(الكامل في ضعفاء الرجال ج۳ ص۲٦۲)

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

متروك متهم بالوضع.

"یہ متروک ہے، اس پر حدیث گھڑنے کا الزام ہے"۔

(تقریب التهذیب ج۱ ص۱۳۹)

حمزہ الجزری نے حضرت نافع سے روایت لی ہے، امام ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

ولا يرويه عن نافع من يحتج به.

''حضرت نافع سے جس شخص نے یہ حدیث روایت کی ہے اس سے دلیل نہیں لی جاتی''۔

(جامع بيان العلم وفضله ج۲ ص ۹۲۴)

ہر چند کہ سنن ترمذی کی بعض روایات میں اس شخص کا نام آ گیا ہے تاہم اس کے متروک ہونے میں اتفاق ہے، چنانچہ حافظ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

قلت: هو متفق على تركه، بل قال ابن عدي: إنه يضع.

''میں کہتا ہوں: اس کے متروک ہونے پر اتفاق ہے، بلکہ ابن عدی نے فرمایا: یہ حدیث گھڑتا ہے''۔

(موافقة الخُبْر الخَبَر في تخريج أحاديث المُختَصَر ج۱ ص ۱۴۶)

الغرض اس روایت کی کوئی ایک سند بھی وضاع، کذاب یا متروک راوی سے خالی نہیں۔ قاضی شوکانی اہل حدیث (غیر مقلد) لکھتے ہیں:

وهذا الحديث لم يصح عن رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم، كما هو معلوم عند أهل هذا الشان، فقد اتفقوا على أنه غير ثابت.

''یہ حدیث رسول اللہ ﷺ سے صحیح ثابت نہیں، جیسا کہ محدثین کو معلوم ہے، پس اُن کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ حدیث ثابت نہیں ہے''۔

(قطر الولي على حديث الولي للشوكاني ص ۱۵۰)

حتیٰ کہ صاحب ''ضربِ حیدری'' کو بھی لکھنا پڑا:

''اس حدیث کی سند قابل اعتماد نہیں''۔

(ضربِ حیدری ص 226)

لہٰذا تمام اکابر واصاغر کا اس حدیث سے استدلال کرنا جہاں محلِ نظر ہے وہیں تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہے۔ کیوں؟ تفصیل آئندہ عنوان کے تحت ملاحظہ فرمائیے!

ازروئے متن اس روایت کا معنیٰ

جب اس حدیث کی اسنادی حالت یہ ہے تو پھر بعض نامور لوگوں کا اس کو خصوصاً حدیث مدینۃ العلم کے مقابلہ میں پیش کرنا انتہائی افسوس ناک ہے، جس روایت کی تمام سندوں میں اس قدر کذاب اور وضّاع (گھڑنے والے) راوی موجود ہیں اُس سے اِس قدر طمطراق سے دلیل پکڑنا اصول حدیث کی گردن پر چھری چلانے کے مترادف ہے، تاہم بعض حضرات اس حدیث کو کسی حد تک قابلِ حجت گردانتے ہیں۔ راقم نے بھی اس حدیث کو اپنی کتاب "انوار العرفان" میں علامہ عبدالحی لکھنوی کے حوالے سے نقل کیا تھا مگر ساتھ ہی لکھا تھا کہ اس پر بحث ونظر ہے۔ بہرحال اگر یہ روایت قابل استدلال مان بھی لی جائے تو اس میں سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ بھی شامل ہیں بلکہ ہر وہ حدیث جس میں "أصحابي" (میرے صحابہ) کا لفظ آیا ہے اُس میں سیدنا علی ﷺ کا نمبر اول ہے کیونکہ سب سے اولین صحابی سیدنا علی ﷺ ہی ہیں۔ علامہ سید پیر نصیر الدین گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہی خوب فرمایا تھا۔

اصحابي کالنجوم کا ارشاد بجا

سب سے مگر بلند ستارا علی کا ہے

پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر ایسی حدیث میں خصوصاً وہ صحابہ کرام ﷺ مراد ہیں جو مہاجرین وانصار میں السابقون الأوّلون ہیں، بعد والے صحابہ کرام ﷺ اس حکم کے یونہی پابند ہیں جیسا کہ بعد والے تمام اہل اسلام پابند ہیں۔ ایسے ہی "اللّٰه، اللّٰه في أصحابي" اور "لاتسبوا أصحابي" وغیرھا احادیث میں جو امرونہی آئے ہیں وہ اولین صحابہ کرام ﷺ کی شان میں ہیں اور بعد والے صحابہ کرام اور اہلِ اسلام ﷺ اُن ارشادات کے پابند ہیں، جیسا کہ حافظ ابن حجر عسقلانی اور دوسرے محدثین کرام نے تصریح فرمائی ہے۔ تفصیل کے لیے راقم کی تصنیف "شرح خصائص علي ﷺ" کا مطالعہ فرمائیں۔ خود اسی حدیث کا مصداق بھی اولین صحابہ کرام ﷺ ہیں۔

چنانچہ علامہ عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کو قابل حجت سمجھنے کی صورت میں لکھتے ہیں:

والمراد بالأصحاب من لازمه من المهاجرين والأنصار وغيرهم غُدوةً وعشيةً، وَصَحِبَهُ في السفر والحضرِ، وتلقّي الوحيَ منه، وأخذ عنه الشريعة والأحكام وآداب الإسلام، وعرف الناسخ والمنسوخ، كالخلفاء الراشدين، لا كلُّ من رآه مرّةً أو أكثر.

"اصحابي کالنجوم" کے حکم سے باہر نہیں بلکہ وہ اسبق الصحابة ہونے کے باعث سب سے زیادہ اس شان کے حامل ہیں اور حدیث "انامدینةُ العلم و عليٌ بابها" میں اُن کی مستقل اور خصوصی شان کا بیان ہے۔

جب متاخرین صحابہ بھی "اصحابي کالنجوم" کے حکم کے پابند ہیں تو پھر اُن بعض طلقاء کے بارے میں اس حدیث کی توجیہ کیا ہوگی جو خلفاء ثلاثہ کی سیرت پر نہیں چلے اور جنہوں نے سیدنا علی المرتضیٰ کو آخر تک خلیفہ تسلیم کیا اور نہ ہی اُن کی پیروی کی؟

پیر سائیں کی تاویلاتِ فاسدہ کا انجام

کچھ لوگ حدیث "اصحابي کالنجوم" سے تمام صحابہ کرام کو باب العلم ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ راقم الحروف ایسے تمام حضرات سے پوچھتا ہے کہ اس حدیث میں سیدنا علی المرتضیٰ شامل ہیں یا نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہو تو اس استثناء پر دلیل کیا ہے؟ اور اگر جواب اثبات میں ہو تو پھر حدیث "انامدینةُ العلم و عليٌ بابها" میں جو تنہا سیدنا علی کے باب العلم ہونے کا ذکر ہے وہ اُن کی مخصوص شان کیوں نہیں؟ سادہ اور آسان بات تو یہ ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے دوسرے کسی بھی صحابی کو باب العلم نہیں فرمایا اور فقط ایک ہی صحابی کو باب العلم فرمایا ہے تو جس کی شان میں یہ الفاظ آئے ہیں خواہ وہ کوئی ہو، اخلاص وانصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ اُسے بلاچون وچرا تسلیم کیا جاتا، لیکن افسوس کہ سیدنا علی کی یہ اور دوسری تمام خصوصیات ترجیح خلافت بترتیب افضلیت کے مفروضہ کی نذر کردی جاتی ہیں اور طرح طرح کی تاویلات کا سہارا لے کر ان خصوصیات کو دھندلا دیا جاتا ہے۔ ہمارے معاصر شیخ الحدیث والتفسیر پیر سائیں غلام رسول قاسمی زید عمرہ بھی ایسی ہی ہیرا پھیری پر گامزن ہیں۔ چنانچہ وہ "تمام صحابہ علم کے دروازے ہیں" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

> "خود مولیٰ علی نے صدیق اکبر سے اور بعض دیگر صحابہ سے دین روایت فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث شریف کے الفاظ اس طرح ہیں کہ عَنْ عَلِيٍّ قَالَ حَدَّثَنِي أَبُوْ بَكْرٍ وَصَدَقَ أَبُوْ بَكْرٍ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ إِلىٰ آخِرِهِ حضرت علی المرتضیٰ نے فرمایا کہ مجھے ابو بکر نے حدیث بتائی اور ابو بکر نے سچ فرمایا۔ فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا جب کوئی آدمی گناہ کبیرہ کر بیٹھتا ہے پھر کھڑا ہو کر وضو کرتا ہے پھر نماز پڑھتا ہے پھر اللہ سے بخشش مانگتا ہے تو اللہ اسے بخش دیتا ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی اَلَّذِيْنَ إِذَا

''اصحاب سے مراد مہاجرین، انصار اور دوسرے ایسے حضرات ہیں جنہوں نے حضور ﷺ کی معیت کو صبح وشام لازم پکڑا، سفر وحضر میں آپ کی صحبت میں رہے، براہِ راست آپ سے وحی کا فیض لیا، آپ سے شریعت، احکام اور آدابِ اسلام اخذ کیے اور ناسخ ومنسوخ کو پہچانا، جیسا کہ خلفاءِ راشدین رضی اللہ عنہم، نہ کہ ہر وہ شخص جس نے حضور ﷺ کو ایک یا ایک سے زائد مرتبہ دیکھا''۔

(تحفة الأخيار بإحياء سنة سيد الأبرار للكنوي ص ٦٣)

معتبر محدثین کرام نے تنہا اس حدیث کو لائقِ حجت نہیں سمجھا تاہم انہوں نے فرمایا حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے منقول صحیح مسلم کی ایک حدیث صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان میں لفظ ''النجوم'' سے ایک مخصوص معنی کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم کی حدیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

والذي رويناه هاهنا من الحديث الصحيح يؤدي بعض معناه.

''اور ہم نے یہاں جو صحیح حدیث روایت کی ہے وہ اس کے کچھ معنیٰ کی تائید کرتی ہے''۔

(الاعتقاد للبيهقي ص ٤٣٩ وط: ص ٤٤١)

وہ ''کچھ'' معنیٰ کیا ہے؟ اس کی توضیح میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

قلتُ: صدق البيهقي، هو يؤدي صحة التشبيه للصحابة بالنجوم خاصة، أما في الاقتداء فلا يظهر في حديث أبي موسىٰ، نعم يمكن أن يتلمح ذلك من معنى الاهتداء بالنجوم.

''میں کہتا ہوں: امام بیہقی نے سچ فرمایا ہے، یہ حدیث خصوصاً صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نجوم سے تشبیہ دینے کی صحت کی تائید کرتی ہے، رہا اقتداء کا معنیٰ تو حدیثِ ابوموسیٰ سے یہ معنیٰ ظاہر نہیں ہوتا، ہاں ممکن ہے لفظ ''النجوم'' سے ہدایت کے معنیٰ کی طرف تلمیح (باریک رمز) ہو''۔

(تلخيص الحبير ج ٤ ص ٤٦٤)

یہی بات حق ہے مگر اس سے اوّلین وسابقین اور خاص صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مراد ہیں۔ چنانچہ جلیل القدر صحابی سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

من كان مستناً فليستن بمن قد مات، فإن الحي لا تؤمن عليه الفتنة، أولئك أصحاب محمد ﷺ، كانوا أفضل هذه الأمة، أبرها قلوباً، وأعمقها علماً، وأقلها

تكلفاً، إختارهم الله لصحبة نبيه ﷺ، وإقامة دينه، فاعرفوا لهم فضلهم، واتبعوهم في آثرهم، وتمسكوا ما استطعتم من أخلاقهم ودينهم، فإنهم كانوا على الهدى المستقيم.

''جو شخص طریقہ اپنانا چاہتا ہو تو وہ اُن لوگوں کا طریقہ اپنائے جو وفات پا چکے ہیں، کیونکہ زندہ لوگ فتنے سے محفوظ نہیں ہیں، وہ سیدنا محمد ﷺ کے صحابہ تھے، اس امت کے افضل حضرات تھے، قلبی طور پر پوری امت سے بڑھ کر نیک، علمی طور پر پوری امت سے زیادہ عمیق اور تکلف سے بہت دور تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے نبی ﷺ کی صحبت اور اپنے دین کے قیام کے لیے منتخب فرمایا، تم اُن کی فضیلت کو پہچانو، اُن کے نقش قدم کی پیروی کرو اور حتی المقدور اُن کی عادات کو اپناؤ! بلاشبہ وہ ہدایت مستقیمہ پر فائز تھے''۔

(الراعي والرعية لأبي الخير التبريزي ص ٢٠؛ حلية الأولياء ج ١ ص ٣٠٥؛ شرح السنة ج ١ ص ٢١٤؛ جامع بيان العلم ج ٢ ص ٩٤٧؛ شرح العقيدة الطحاوية لابن أبي العز حنفي ص ٥٤٦؛ تحفة الأخيار للكنوي ص ٦٧)

اس عبارت میں ''فليستن بمن قدمات'' سے مقصود قدیم اور اوّلین صحابہ کرام ﷺ ہیں، کیونکہ سیدنا ابن مسعود ﷺ نے یہ بات اگر اپنی عمر کے آخری حصہ میں بھی فرمائی ہو تو انہوں نے خلیفۂ راشد سیدنا عثمانِ غنی ﷺ کے دور میں وصال فرمایا ہے۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ محض کسی صحابی کا پہلے وفات پا جانا ہی دوسروں کے حق میں باعثِ ہدایت نہیں بلکہ اُس کا زیادہ صحبت یافتہ ہونا اور سنتِ نبوی کے زیادہ آثار چھوڑنا ہی دوسروں کے حق میں باعثِ ہدایت ہے۔ دیکھئے! فرمانِ نبوی ﷺ ہے: ''عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين'' (تم پر میری اور خلفاءِ راشدین کی سنت لازم ہے) لہٰذا اگر سیدنا ابن مسعود ﷺ کی زبانِ اقدس سے یہ ارشاد اُن کی حیات کے آخری دور میں صادر ہوا ہو تو اُس وقت تو دو خلفاءِ کرام حضرت عثمان غنی اور سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ حیات تھے۔ دور کیا جائیے، خود سیدنا ابن مسعود ﷺ کا شمار اُن جلیل القدر اور مقتدیٰ صحابہ کرام ﷺ میں ہوتا ہے جو نہ صرف یہ کہ بارگاہِ نبوت کے منتخب و پسندیدہ تھے بلکہ زبانِ نبوت نے نام زد کر کے فرمایا تھا کہ ان کے طریقہ کو اپنانا۔ چنانچہ معلمِ کائنات ﷺ کا ارشاد ہے:

۱۔ تمسكوا بعهد ابن مسعود.

''ابن مسعود ﷺ کے طریقے کی پیروی کرنا''۔

(سنن الترمذي حديث ۳۸۱٤؛ مشكل الآثار حديث ٦٥٢٨)

۲۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''عبدالرحمٰن بن یزید ﷺ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے سیدنا حذیفہ ﷺ سے عرض کیا کہ کوئی ایسا شخص بتلائیں جو رسول اللہ ﷺ کے اسوہ حسنہ، آپ کی ہدایت اور سیرت کے زیادہ قریب ہو، تاکہ ہم اس سے ہدایت حاصل کریں تو انہوں نے فرمایا: ہم حضور ﷺ کے اسوہ حسنہ، آپ کی ہدایت اور سیرت کے زیادہ قریب حضرت عبداللہ بن مسعود ﷺ کے سوا کسی کو نہیں جانتے''۔

(بخاري حديث ۳۷٦۲)

۳۔ حضرت ابن مسعود ﷺ اس حد تک حضور اقدس ﷺ کی سیرت طیبہ کا نمونہ تھے کہ ﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوىٰ﴾ کی شان والی زبان سے ان کے حق میں یہ کلمات صادر ہوئے:

رضيتُ لأُمتي ما رضي لها ابن أم عبد.

''میں نے اپنی امت کے لیے وہ پسند کرلیا جس کو ابن مسعود نے اس (امت) کے لیے پسند کرلیا''۔

(المستدرك ج۳ ص۳۱۷ وط: ج٤ ص۳۷۸ حديث ٥٤۳۸؛ مجمع الزوائد ج۹ ص٤۷٥؛ المطالب العالية ج٤ ص۱۱۳ حديث ٤۱۰۱؛ إتحاف الخيرة المهرة ج۱ ص۱۲۲ حديث ۹۹؛ مجمع البحرين ج۳ ص٤۲٥ حديث ۳۸۳۳؛ المعجم الأوسط ج۷ ص٦۹، ۷۰ حديث ٦۸۷۹؛ كشف الأستار ج۳ ص۲٤۹ حديث ۲٦۷۹؛ الجامع الصغير حديث ٤٤٥۸)

ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ سیدنا ابن مسعود ﷺ کے ارشاد ''فَلْيَسْتَنّ بمن قد مات'' سے سابقین صحابہ کی پیروی مقصود ہے، اور چونکہ انہوں نے دورِ صحابہ میں ہی یہ ارشاد فرمایا تھا اس لیے اُن کی اِس تلقین کے مخاطب تاخیر سے اسلام قبول کرنے والے صحابہ کرام ﷺ بھی ہیں۔ سو جب قدیم صحابہ کرام ﷺ مراد ہیں تو پھر یہ بات نصوصِ صریحہ سے ثابت اور ناقابلِ تردید ہے کہ سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ سے زیادہ قدیم الصحبۃ کوئی صحابی نہیں ہے۔ بعد از اعلانِ نبوت سب سے پہلے انہوں نے ہی اظہارِ اسلام کی سعادت پائی تھی اور اُن پر کوئی شخص سبقت نہیں کرسکا تھا، ماسوا اُم المومنین سیدتنا خدیجۃ الکبریٰ سلام اللہ علیہا کے۔ لہٰذا حدیث ''اصحابي كالنجوم'' کے قابلِ حجت ہونے کی صورت میں سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ اس کے اوّلین مصداق قرار پاتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ

"اصحابي كالنّجوم" کے حکم سے باہر نہیں بلکہ وہ اسبقُ الصحابة ہونے کے باعث سب سے زیادہ اس شان کے حامل ہیں اور حدیث "أنامدينةُ العلمِ وعليّ بابها" میں اُن کی مستقل اور خصوصی شان کا بیان ہے۔

جب متاخرین صحابہ بھی "اصحابي كالنجوم" کے حکم کے پابند ہیں تو پھر اُن بعض طلقاء کے بارے میں اس حدیث کی توجیہ کیا ہوگی جو خلفاء ثلاثہ ﷺ کی سیرت پر نہیں چلے اور جنہوں نے سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کو آخر تک خلیفہ تسلیم کیا اور نہ ہی اُن کی پیروی کی؟

پیر سائیں کی تاویلاتِ فاسدہ کا انجام

کچھ لوگ حدیث "اصحابي كالنّجوم" سے تمام صحابہ کرام ﷺ کو باب العلم ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ راقم الحروف ایسے تمام حضرات سے پوچھتا ہے کہ اس حدیث میں سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ شامل ہیں یا نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہو تو اس استثناء پر دلیل کیا ہے؟ اور اگر جواب اثبات میں ہو تو پھر حدیث "أنامدينةُ العلمِ وعليّ بابُها" میں جو تنہا سیدنا علی ﷺ کے باب العلم ہونے کا ذکر ہے وہ اُن کی مخصوص شان کیوں نہیں؟ سادہ اور آسان بات تو یہ ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے دوسرے کسی بھی صحابی کو باب العلم نہیں فرمایا اور فقط ایک ہی صحابی کو باب العلم فرمایا ہے تو جس کی شان میں یہ الفاظ آئے ہیں خواہ وہ کوئی ہو، اخلاص وانصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ اُسے بلاچون وچرا تسلیم کیا جاتا، لیکن افسوس کہ سیدنا علی ﷺ کی یہ اور دوسری تمام خصوصیات ترتیب خلافت بترتیب افضلیت کے مفروضہ کی نذر کر دی جاتی ہیں اور طرح طرح کی تاویلات کا سہارا لے کر ان خصوصیات کو دھندلا دیا جاتا ہے۔ ہمارے معاصر شیخ الحدیث والتفسیر پیر سائیں غلام رسول قاسمی زید عمرہ بھی ایسی ہی ہیرا پھیری پر گامزن ہیں۔ چنانچہ وہ "تمام صحابہ علم کے دروازے ہیں" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

"خود مولیٰ علی ﷺ نے صدیق اکبر ﷺ سے اور بعض دیگر صحابہ سے دین روایت فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث شریف کے الفاظ اس طرح ہیں کہ عَنْ عَلِيٍّ ﷺ قَالَ حَدَّثَنِي أَبُوْ بَكْرٍ وَصَدَقَ أَبُوْبَكْرٍ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ إِلىٰ آخِرِهٖ حضرت علی المرتضیٰ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے ابو بکر نے حدیث بتائی اور ابو بکر نے سچ فرمایا۔ فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا جب کوئی آدمی گناہ کبیرہ کر بیٹھتا ہے پھر کھڑا ہو کر وضو کرتا ہے پھر نماز پڑھتا ہے پھر اللہ سے بخشش مانگتا ہے تو اللہ اسے بخش دیتا ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی اَلَّذِيْنَ إِذَا

فَعَلُوْا فَاحِشَةً الآية (ترمذی حدیث رقم ۳۰۶، ابوداؤد حدیث رقم: ۱۵۲۱، ابن ماجہ حدیث رقم: ۱۳۹۵)

اب بتایئے، باب العلم کے حصر والی بات کہاں گئی؟ یہاں تو صدیق اکبر صرف باب العلم ہی نہیں بلکہ بابُ لِلْبَاب بن چکے ہیں"۔

(ضرب حیدری ص 220,221)

پیر سائیں نے اس سے اگلی سطور میں بھی ایسی ہی گل افشانی فرمائی ہے اور یہ غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی کہ کسی کی کوئی فضیلت زبانِ نبوت سے صادر نہ ہوئی ہو تو اسے اپنی طرف سے ثابت کرنے میں خرابی بھی لازم آسکتی ہے۔ پیر سائیں بلکہ شیخ الحدیث صاحب نے دین روایت کرنے پر حضرت سیدنا ابو بکر صدیق ﷛ کو سیدنا علی المرتضیٰ ﷛ کا بابُ لِلْبَاب تو لکھ دیا مگر یہ نہ سوچا کہ اُن کے استدلال کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ یوں لگتا ہے کہ قاسمی صاحب اس استدلال کے وقت شیخ الحدیث کی سطح سے اتر کر محض دورِ حاضر کے پیروں کی سطح پر آگئے ہیں۔ بہر حال اگر پیر سائیں کے اس استدلال کو درست تسلیم کیا جائے تو سیدنا ابراہیم خلیل اللہ اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہما السلام سید الانبیاء والمرسلین ﷺ کے بابُ لِلْبَاب قرار پائیں گے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے تسبیح فاطمہ کو حضرت خلیل اللہ ؑ سے روایت فرمایا ہے اور یہ دین ہی نہیں بلکہ مغزِ دین ہے۔

(سبل الهدى ج۳ص۸۹؛ شرح الزرقاني على المواهب ج۸ص۳۵)

نیز نبی کریم ﷺ کو سیدنا خلیل اللہ ؑ کی ملت کی پیروی کا حکم بھی ہے تو کیا وہ نبی کریم ﷺ سے افضل یا آپ کے حق میں بابُ لِلْبَاب ہو گئے؟ بلکہ قرآن مجید میں نبی کریم ﷺ کو یہ حکم بھی ہوا ہے کہ آپ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کے طریقے کو اپنائیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ" (تو تم انہیں کی راہ چلو) [الأنعام: ۹۱] تو کیا یہ سارے انبیاء کرام علیہم السلام حضور ﷺ کے حق میں بابُ لِلْبَاب ہو گئے؟

تخفیفِ نماز کے سلسلہ میں سیدنا کلیم اللہ ؑ نے بارگاہِ امام الانبیاء ﷺ میں عرض کیا تھا:

"میں بنی اسرائیل کو اس سے بھی آسان عمل پر خوب آزما چکا ہوں، پس وہ کمزور پڑ گئے اور تارک ہو گئے اور آپ کی امت جسم و بدن اور سماعت و بصارت کے لحاظ سے بہت کمزور ہے، اس پر نبی کریم ﷺ حضرت جبریل ؑ کی طرف متوجہ ہوئے تو انہوں نے بھی تخفیف کا اشارہ کیا"۔

(بخاري، صحيح مسلم، شرح الزرقاني على المواهب ج۸ص۳۸)

بتلائیے! کیا یہ دونوں (کلیم وجبریل علیہما السلام) امام الانبیاء ﷺ کے استاد اور آپ کے حق میں بـــابُ لِلُّبَابِ ہو گئے؟

اگر کتب حدیث میں غور کیا جائے تو بہت سی ایسی مثالیں مل سکتی ہیں کہ اکابر نے اصاغر سے حدیث روایت کی ہے، مثلاً خود حضرت سیدنا ابو بکر ﷺ نے اپنے آزاد کردہ غلام حضرت سیدنا بلال ﷺ سے حدیث روایت کی ہے۔ چنانچہ امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

حدثنا عبد الرحمان بن سلم الرازي، ثنا الهيثم بن اليمان، ثنا أيوب بن سيار، عن المنكدر، عن جابر، عن أبي بكر ﷺ، عن بلالٍ، قال: قال رسول الله ﷺ: يا بلال! أصبحوا بالصبح، فإنه خيرٌ لكم.

"سیدنا ابو بکر حضرت بلال ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے بلال! نماز صبح کو اجالے میں پڑھا کرو، یہ تمہارے لیے بہتر ہے"۔

(المعجم الكبير ج١ ص٢٦٧، ٢٦٨ حديث١٠٠٩؛ مسند الشاشي ج٢ ص٣٤٧ حديث ٩٤١؛ كشف الأستار عن زوائد البزار ج١ ص١٩٤ حديث٣٨٣؛ مجمع الزوائد ج١ ص٣١٦؛ موطا: ج٢ ص٦٤ حديث١٧٦٩؛ مختصر زوائد البزار ج١ ص١٩٨ حديث٢٣٨)

علماء اصول حدیث نے مستقل ابواب قائم فرمائے ہیں، مثلاً "رواية الأكابر عن الأصاغر" (بڑوں کا چھوٹوں سے روایت کرنا) "رواية الصحابة عن التابعين" (صحابہ کرام ﷺ کا تابعین ﷺ سے روایت کرنا) حتیٰ کہ یہ بھی لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بعض امتیوں سے روایت کیا۔ مثلاً نبی کریم ﷺ نے زرعہ بن سیف بن ذی یزن کو خط لکھا اور اُس میں فرمایا:

أن مالك بن مُرَرِّد الرهاوي قد حدثني......

"مجھے مالک بن مرزّد رھاوی نے بیان کیا......"۔

(تدريب الراوي ج٢ ص٧١٢)

نیز نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

حدثني عمرُ أنه ما سابق أبابكر إلىٰ خيرٍ قط إلا سبقه.

"مجھے عمر نے بیان کیا کہ اس نے جب بھی کسی نیکی میں ابو بکر کے ساتھ مقابلہ کیا تو ابو بکر

سبقت لے گئے"۔

(تاریخ بغداد ج٥ص٢٨٢ موطا: ج٦ص٢٤٤؛ فتح المغیث ج٤ص١٢٥)

نیز متعدد علماء حدیث نے لکھا ہے کہ حدیث "الموت كفارة لكل مسلم" (موت ہر مسلمان کے حق میں کفارہ ہے) کو حضرت ابوبکر صدیق ﷺ نے سیدنا بلال ﷺ سے روایت فرمایا ہے۔

(تدریب الراوي ج٢ص٩١٧؛ جامع الشروح بمقدمة ابن الصلاح ج٢ص٤٠٠)

دور کیا جایئے خود پیر شیخ الحدیث کے ذاتی استدلال کے خلاف خود اُن کی اپنی اسی کتاب سے شہادت موجود ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"سب لوگ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں جبکہ نبی کریم ﷺ نے حضرت تمیم داری ﷺ سے دجال کا قصہ حَدَّثَنِيْ تَمِيْمُ الدَّارِيُّ فرما کر روایت کیا ہے۔ (مسلم حدیث رقم:٧٣٨٦)"۔

(ضربِ حیدری ص243)

سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ نے سیدنا ابوبکر صدیق ﷺ سے روایت لی تو پیر شیخ الحدیث والتفسیر نے اس پر بڑے طمطراق سے یوں تبصرہ کیا تھا:

"اب بتایئے، باب العلم کے حصر والی بات کہاں گئی؟ یہاں تو صدیق اکبر صرف باب العلم ہی نہیں بلکہ بابُ لِلْبَابِ بن چکے ہیں"۔

(ضربِ حیدری ص221)

کیا وہ یہی تبصرہ حضور ﷺ اور حضرت تمیم داری کے مابین اور سیدنا ابوبکر و بلال ﷺ کے مابین بھی کرنا پسند فرمائیں گے؟ فیا للعجب!

راوی اور مستنبط میں فرق

اصل بات یہ ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق ﷺ سے صاحب "ضربِ حیدری" نے جو روایت نقل کی ہے اُس میں مولیٰ علی ﷺ سے سیدنا ابوبکر صدیق ﷺ کی ایک مخصوص تعظیم کا ذکر ہے، اور وہ ہے خلیفۂ اول کی صداقت کی عظمت۔ معاصر مذکور نے جو الفاظ نقل کیے ہیں اُن سے قبل سیدنا علی ﷺ کے کچھ تمہیدی الفاظ بھی مذکور ہیں۔ چنانچہ اسماء بن الحکم الفزاری بیان کرتے ہیں: میں نے سیدنا علی ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

إذا سَمِعْتُ مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ حَدِيثًا نَفَعَنِي اللّٰهُ مِنْهُ بِمَا شَاءَ أَنْ يَنْفَعَنِي بِهِ، وإذا حَدَّثَنِي رَجُلٌ مِنْ أَصْحَابِهِ اسْتَحْلَفْتُهُ،فإذا حَلَفَ لِي صَدَّقْتُهُ،وإِنَّهُ حَدَّثَنِي أَبُو بَكْرٍ، وَصَدَقَ أَبُو بَكْرٍ.

''جب میں رسول اللہ ﷺ سے کوئی حدیث سنتا تو اللہ تعالیٰ مجھے اس سے جو نفع عطا فرماتا سو عطا فرماتا،اور جب مجھے حضور ﷺ کا کوئی صحابی حدیث بیان کرتا تو میں اُس سے حلف لیتا سو جب وہ مجھے حلف دے دیتا تو میں اُس کی تصدیق کرتا،اور بیشک مجھے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حدیث بیان کی اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سچ فرمایا''۔

(سنن الترمذي ص۱۰۹ حديث۴۰٦ وص٦۷٦ حديث۳۰۰٦؛سنن أبي داود ج۲ ص۱۱۷ حديث ۱۵۲۱؛سنن ابن ماجه ج۲ ص۱٦٤ حديث۱۳۹۵)

اس میں فقط عظمتِ صدیقی کا اظہار مطلوب ہے ورنہ جو ہستی ''علي مع القرآن والقرآن مع علي'' کی شان رکھتی ہو اور جس کا ارشاد ہو کہ اُسے قرآن کی ہر ہر آیت کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ کب،کہاں اور کیوں نازل ہوئی،وہ کیونکر سورۂ آل عمران کی اس آیت سے بے خبر ہوگی؟اور اگر کسی وجہ سے سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ براہِ راست نبی کریم ﷺ سے یہ حدیث نہ سن سکے ہوں تو فقط حدیث روایت کرنے کی وجہ سے کوئی شخص دوسرے شخص کے حق میں باب العلم نہیں بن جاتا۔اگر ہمارا معاصر اپنے اس استدلال پر بضد ہو تو وہی خرابیاں لازم آئیں گی جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔نیز صحاح میں تصریح آئی ہے کہ ایک حدیث چھوٹے چھوٹے صحابیوں کو معلوم تھی مگر خلیفۂ ثانی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے علم میں نہیں تھی۔چنانچہ سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''ایک مرتبہ انہوں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ہاں آکر تین مرتبہ اجازت مانگی تو انہیں اجازت نہ دی گئی،گویا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ مشغول تھے،حضرت ابوموسیٰ لوٹ گئے تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فارغ ہو کر فرمانے لگے:کیا ابھی عبداللہ بن قیس(ابوموسیٰ)کی آواز نہیں آئی تھی؟انہیں اجازت دو۔عرض کیا گیا:وہ واپس چلے گئے۔آپ نے انہیں طلب فرمایا تو انہوں نے عرض کیا:ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ اگر تین مرتبہ اجازت مانگنے یا سلام کرنے پر اجازت نہ ملے تو لوٹ جایا کرو۔فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا:اس پر گواہ پیش کرو۔پس وہ انصار کی ایک مجلس میں آئے اور اس حدیث کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے کہا:ہم آپ کے حق میں اس گواہی کے لیے قوم میں سے سب سے

چھوٹے کو بھیجیں گے۔ پس حضرت ابو سعید خدری ﷺ اُن کے ساتھ گئے۔

فقال عمر: أخفي علي هذا من أمر رسول اللهﷺ؟ ألهاني الصفق بالأسواق.

”تو حضرت عمر ﷺ نے فرمایا: کیا رسول اللہ ﷺ کا یہ حکم مجھ پر مخفی رہ گیا؟ بازار کی تجارت نے مجھے اس سے غافل رکھا“۔

دوسرے مقام پر یہ الفاظ استفہامیہ ہمزہ کے بغیر یوں ہیں:

خفي عليّ هذا من أمر النبيﷺ، ألهاني الصفق بالأسواق.

”نبی کریم ﷺ کا یہ حکم مجھ پر مخفی رہ گیا، بازار کی تجارت نے مجھے بے خبر رکھا“۔

(بخاري ص ٣٣١ حديث ٢٠٦٢ وص ١٢٦٤ حديث ٧٣٥٣؛ صحيح مسلم ص ٩٥٩ حديث ٥٦٣١؛ سنن أبي داود ج ٤ ص ٤٤٧ حديث ٥١٨٢؛ موطا إمام مالك ج ٢ ص ٤٤٧ حديث ١٨٤٩)

سائیں پیر شیخ الحدیث کے محدثانہ استدلال کے مطابق یہاں حضرت ابو موسیٰ اشعری، حضرت ابو سعید خدری اور اس حدیث سے باخبر دوسرے انصار صحابہ ایک مہاجر صحابی اور خلیفہ راشد ﷺ کے باب لِلُبَاب ثابت ہوتے ہیں کہ نہیں؟ فَاعْتَبِرُوْا یَا أُولِی الْأَبْصَارِ!!

سائیں پیر کے اس بھونڈے استدلال کے باعث بہت سے صحابہ سیدنا ابو بکر صدیق ﷺ کے بھی باب لِلُبَابِ ثابت ہوتے ہیں۔ کیونکہ سیدنا ابو بکر صدیق ﷺ کا طرزِ عمل تھا کہ جب ان کے ذہن مبارک میں کتاب وسنت کی کوئی تصریح نہ ہوتی تو وہ صحابہ کرام ﷺ سے دریافت فرماتے۔ چنانچہ امام دارمی اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہما لکھتے ہیں:

كان أبوبكر إذا ورد عليه الخصم نظر في كتاب الله، فإن وجد فيه ما يقضي بينهم قضىٰ به، وإن لم يكن في الكتاب، وعَلِمَ من رسول الله ﷺ في ذلك الأمر سنة قضىٰ به، فإن أعياه خرج فسأل المسلمين، وقال: أتاني كذا وكذا، فهل علمتم أن رسول الله قضىٰ في ذلك بقضاء؟ فربما اجتمع إليه النفر كلهم يذكر من رسول الله ﷺ فيه قضاءً، فيقول أبوبكر: الحمد لله الذي جعل فينا من يحفظ على نبيناﷺ.

”سیدنا ابو بکر ﷺ کے پاس جب کوئی مقدمہ آتا تو پہلے وہ کتاب اللہ میں اس کا حل تلاش کرتے،

اگر اُس میں حل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ فرماتے، اور اگر کتاب اللہ میں کوئی حل نہ ملتا اور اس مسئلہ میں اُنہیں کوئی سنت معلوم ہوتی تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے، اگر اُنہیں کوئی سنت یاد نہ ہوتی تو باہر نکل کر صحابہ کرام ﷺ سے دریافت فرماتے کہ اِس اِس طرح مسئلہ سامنے آیا ہے، کیا تمہارے علم میں اس سلسلہ میں خدا کے رسول ﷺ کا کوئی فیصلہ ہے؟ بسا اوقات صحابہ کرام ﷺ کی ایک جماعت نبی کریم ﷺ کی کوئی سنت بیان کرتی تو حضرت ابوبکر ﷺ فرماتے: اُس اللہ کے لیے حمد ہے جس نے ہمارے اندر ایسے لوگوں کو رکھا ہے جو رسول اللہ ﷺ کی سنت کو محفوظ رکھتے ہیں"۔

(سنن الدارمي ج١ ص٤٢ حديث١٦١؛ السنن الكبرىٰ ج١٠ ص١١٥ وط: ج١٠ ص١٩٦ حديث ٢٠٣٤١؛ تهذيب السنن الكبرىٰ للذهبي ج٨ ص٤٠٦ حديث١٥٧٠٧؛ كنز العمال ج٥ ص٦٠٠ حديث١٤٠٦٣؛ جمع الجوامع ج١١ ص٦٩ حديث٣٠٣، وط: ج١٤ ص٢١٥ حديث ٣٤٣)

امام اسماعیلی رحمۃ اللہ علیہ کی "المعجم" میں الفاظ ہیں:

الحمد لله الذي جعل فينا من يحفظ علينا ديننا.

"اُس اللہ کے لیے حمد ہے جس نے ہمارے اندر ایسے لوگوں کو رکھا ہے جو ہمارے لیے ہمارا دین محفوظ رکھتے ہیں"۔

(كتاب المعجم لأبي بكر الإسماعيلي ص٤١٧، ٤١٨)

غور کیجئے کہ دین کی جو بات سیدنا ابوبکر صدیق ﷺ کو معلوم نہ ہوتی تو وہ باہر نکل کر صحابہ کرام ﷺ سے دریافت فرماتے اور معلوم ہونے پر شکرِ الٰہی بجالاتے۔ بتلایئے! کیا سائیں پیر شیخ الحدیث کے پیرانہ اور محدثانہ استدلال کے مطابق یہ سب صحابہ کرام ﷺ سیدنا ابوبکر ﷺ کے لیے بابُ لِلْباب ثابت ہوتے ہیں کہ نہیں؟

یہ تو پھر بھی محض روایتِ حدیث کا معاملہ ہے جبکہ سیدنا ابوبکر ﷺ نے تو سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کے استنباط، فقاہت اور دلالت سے استفادہ فرمایا تھا۔ چنانچہ عبداللہ بن ابی اوفی الخزاعی بیان کرتے ہیں:

"ایک جہاد کے موقعہ پر حضرت ابوبکر صدیق نے حضرات علی، عمر، عثمان، عبدالرحمان بن عوف، سعد بن ابی وقاص، سعید بن زید، ابوعبیدہ بن الجراح، مہاجرین وانصار اور اہل بدر وغیرہم ﷺ کو طلب فرمایا اور اُن کے سامنے معاملہ رکھا، ہر ایک نے اپنی اپنی رائے پیش کی۔

وعلي رضي الله عنه في القوم لا يتكلم. قال أبوبكر: ما ذا ترى يا أبا الحسن؟ فقال: أرى أنك إن سرت إليهم بنفسك، أو بعثت إليهم نصرت عليهم إن شاء الله. فقال: بشرك الله بخير، ومن أين علمت ذلك؟ قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: لا يزال هذا الدين ظاهراً على كل من ناواه، حتىٰ يقوم الدين وأهله ظاهرون، فقال: سبحان الله ما أحسن هذا الحديث، لقد سررتني به سرّك الله.

''اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کچھ کلام نہ فرمایا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ابوالحسن آپ کی کیا رائے ہے؟ فرمایا: میری رائے یہ ہے کہ آپ خود تشریف لے جائیں یا انہیں بھیجیں ہر حال میں دشمن کے خلاف آپ کی مدد کی جائے گی۔ اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے، یہ آپ نے کیسے جان لیا؟ فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا تھا: یہ دین اُس وقت تک ہر دشمن پر غالب رہے گا جب تک قائم رہے گا اور اس کے پیروکار راہِ راست پر چلتے رہیں گے۔ اس پر سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ کتنی اچھی حدیث ہے! آپ نے ہمیں خوش کر دیا ہے، اللہ آپ کو بھی خوش رکھے''۔

(تاریخ دمشق ج۲ص۶۴؛ کنز العمال ج۵ص۶۷۰ حدیث۱۴۱۷۲؛ جمع الجوامع ج۱۱ص۹۳،۹۲ حدیث۳۹۴؛ موسوعة العشرة المبشرون بالجنة ج۱۲ص۵۲)

خلافتِ صدیقی کی حقانیت

یہاں یہ ضمنی بات ذہن نشین رہے کہ اس حدیث سے جہاں سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا باب العلم یا اعلم ہونا ثابت ہوتا ہے وہیں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کا حق ہونا اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا حق پر قائم ہونا بھی ثابت ہوتا ہے، اور چونکہ یہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا عقیدہ ہے اس لیے اس میں روافض کی بھرپور تردید ہے۔

اب اصل بحث کی طرف آتے ہیں۔ اگر سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو یہ روایت پہلے سے معلوم تھی تو پھر اُنہیں فقط سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے استدلال سے فائدہ پہنچا ہے، اور اگر انہیں یہ حدیث معلوم نہیں تھی تو پھر اُنہیں مولیٰ علی رضی اللہ عنہ سے ڈبل فائدہ پہنچا ہے کہ حدیث بھی معلوم ہوئی اور اُس حدیث سے استدلال کی صورت بھی۔

اگر محض استدلال والے فائدہ کو مدنظر رکھا جائے تو یہ ایسا فائدہ ہے جیسا کہ امام اعمش کو امام اعظم سے پہنچا تھا (الا یہ کہ سیدنا علی سیدنا ابوبکر کے شاگرد نہیں) امام اعظم نے امام اعمش سے حدیث لی تھی اور انہوں نے امام اعظم کی فقہ وفہم سے استفادہ کیا تھا۔ علماء کرام لکھتے ہیں کہ جب امام اعمش کی مجلس میں امام اعظم نے ایک مشکل مسئلہ حل فرمایا تو امام اعمش نے ازراہِ تعجب پوچھا: تم نے یہ مسئلہ کہاں سے حل کیا؟ فرمایا: اُن احادیث سے جو آپ سے حاصل ہوئیں۔ اس پر امام اعمش نے فرمایا:

يا معشر الفقهاء! أنتم الأطباء ونحن الصيادلة.

''اے فقہاء کی جماعت! تم طبیب ہو اور ہم دوا فروش، پنساری ہیں''۔

(فضائل أبي حنيفة لابن أبي العوام ص۱۰۲؛ كتاب الفقيه والمتفقه ج۲ ص۱۶۳، ۱۶۴؛ نصيحة أهل الحديث للخطيب ص۴۴، ۴۵؛ مجموعة رسائل في علوم الحديث ۱۳۴؛ جامع بيان العلم وفضله ج۲ ص۱۰۲۹؛ مناقب الإمام أبو حنيفة ملحق بالجواهر المضية ج۲ ص ۴۸۴؛ أخبار أبي حنيفة وأصحابه للصيمري ص۲۷؛ مناقب الإمام أبي حنيفة للذهبي ص۳۵؛ الخيرات الحسان للهيثمي ص۱۲۴؛ أثر الحديث الشريف للعوامة ص۱۱۰، ۱۱۱؛ عقود الجمان ص ۳۲۱)

یہ تو تھے خلیفۂ اول جبکہ خلیفۂ ثانی سیدنا فاروقِ اعظم تو مولیٰ علی کو اُن کی مخصوص فہم کی بدولت **كَاشِفُ الشُّبُهَاتِ** (مشکل کشا) فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ محدثین کرام نے ایک طویل حدیث لکھی ہے کہ ایک مرتبہ سیدنا فاروقِ اعظم کی خدمت میں ایک ذوجسم (دو پیٹ، دو بدن وغیرہ والا) بچہ لایا گیا، جس کا معاملہ سلجھانا مشکل ہو گیا تو مولیٰ علی کی خدمت بابرکت میں معاملہ پیش کیا گیا تو اُن کی فہمِ رسا کی بدولت مسئلہ حل ہو گیا۔

فقال عمر يا ابن أبي طالب افمازلت كاشف كل شبهة ومُوضِح كل حكم.

''اس پر حضرت عمر نے فرمایا: اے ابوطالب کے فرزند! آپ ہمیشہ ہر شبہ کو کھولنے والے اور ہر حکم کی وضاحت کرنے والے ہیں''۔

(كنز العمال ج۵ ص۸۳۴ حديث ۱۴۵۰۹؛ موسوعة العشرة المبشرون بالجنة ج۱۵ ص۵۳)

یہ عاجز پھر عرض کرتا ہے کہ الفاظِ حدیث روایت کرنے سے زیادہ مشکل کتاب وسنت سے استنباط کرنا ہے، اور سیدنا علی کو ایسے لاینحل مسائل کے حل کرنے میں ایسی مہارت اور یدِ طولیٰ حاصل تھا کہ وہ خلفاء کرام سمیت تمام صحابہ کرام کی ضرورت تھے اور وہ سب حضرات ضرورت مند تھے۔ چنانچہ علامہ عبدالحی الکتانی رحمۃ اللہ علیہ

لکھتے ہیں:

وسوال كبار الصحابة له ورجوعهم إلى فتاويه وأقواله في المواطن والمعضلات مشهور.

''اکابر صحابہ کرام کا اُن سے سوال کرنا اور اہم مقامات اور پیچیدہ مسائل میں اُن کے فتووں اور فرمودات کی طرف رجوع کرنا مشہور ہے''۔

(نظام الحكومة النبوية ج٢ ص٢٤٧)

علامہ ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

كان أبو بكر وعمر يشاورانه، ويرجعان إلى رأيه، وكان كل الصحابة مفتقراً إلى علمه.

''حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما اُن سے مشورہ لیتے تھے اور اُن کی رائے کی طرف رجوع کرتے تھے، اور تمام صحابہ کرام اُن کے علم کے محتاج تھے''۔

(المنتظم لابن الجوزي ج٥ ص٦٨؛ موسوعة العشرة المبشرون بالجنة ج١٢ ص٥٦)

علامہ ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ ایک اور مقام میں لکھتے ہیں:

وكان الخلق يحتاجون إلى علم عليّ، حتى قال عمر: آه من معضلة ليس لها أبو الحسن.

''مخلوق سیدنا علی المرتضیٰ کے علم کی محتاج تھی، حتیٰ کہ سیدنا عمر نے فرمایا: آہ، وہ مشکل جس کو حل کرنے کے لیے ابوالحسن نہ ہوں''۔

(التبصرة لابن الجوزي ج١ ص٤٤٩)

فاروقِ اعظم باب العلم کے منتظر

سیدنا علی کی ایسی ہر فضیلت کی اہمیت کو گھٹانے کی خاطر شیخ الحدیث والتفسیر پیر سائیں غلام رسول قاسمی اور اُن کے ہم مزاج لوگ بہت زیادہ ایچ پیچ اور آئیں بائیں شائیں سے کام لینے کی کوشش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جی! یہ حضرت عمر کی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت ہے، وہ ہر ایک کو شاباش دیتے تھے اور اُس کی علمیت ودانائی کو

سراہتے تھے، انہوں نے فلاں صحابی کے بارے میں فلاں موقعہ پر یوں فرمایا اور فلاں موقعہ پر یوں۔ لیکن سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے ارشاد "فما زلت كاشف كل شبهة ومُوضِح كل حكم" (آپ ہمیشہ ہر شبہ کو کھولنے والے اور ہر حکم کی وضاحت کرنے والے ہیں) نے اور علامہ ابن الجوزی قرشی صدیقی کے واضح الفاظ نے پیر سائیں وغیرہ کی نکتہ آفرینیوں پر پانی پھیر دیا ہے۔

پیر سائیں اور اُن کے ہم مزاج لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی اعلیٰ ظرفی برحق ہے لیکن انہوں نے ایسے زوردار اور وقیع الفاظ کسی بھی دوسرے صحابی کے بارے میں نہیں فرمائے جیسے اُنہوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے حق میں فرمائے ہیں۔ بتلایئے! انہوں نے اور کس صحابی کی شان میں ایسے الفاظ ادا فرمائے ہیں؟

- حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے کوئی بات پوچھی تو انہوں نے اُس کا شافی جواب دیا، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے کہا:

نعوذ بالله من أن أعيش في قوم لست فيهم يا أبا حسن.

"ہم اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آتے ہیں کہ میں ایسی قوم میں زندہ رہوں جس میں اے ابوالحسن آپ موجود نہ ہوں"۔

(المستدرك للحاكم ج١ ص٤٥٧ حديث١٧٢٥؛ تاريخ دمشق ج٤٢ ص٤٠٥؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٨ ص٢٥؛ شعب الإيمان للبيهقي ج٣ ص٤٥١ حديث٤٠٤٠؛ الجامع لشعب الإيمان ج٥ ص٤٨٠، ٤٨١ حديث٣٧٥٩؛ جمع الجوامع ج١٣ ص٦٧ حديث٥٧٧٥؛ الرياض النضرة ج٤ ص١٤٢؛ ذخائر العقبىٰ ص١٠٠)

- حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ نے تو اس بات کو صیغۂ استمرار کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

كان عمر يتعوذ بالله من معضلة ليس فيها (وفي رواية: ليس لها) أبو حسن.

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ اُس مشکل سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگا کرتے تھے جسے حل کرنے کے لیے ابوالحسن علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ نہ ہوں"۔

(فضائل الصحابة ج٢ ص٨٠٣ حديث١١٠٠؛ الطبقات الكبرى لابن سعد ج٢ ص٤٢١؛ صفة الصفوة ج١ ص١٦٥؛ تلقيح فهوم أهل الأثر لابن الجوزي ص٧٩ وط: ص١١١؛ تاريخ دمشق ج٤٢ ص٤٠٦؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٨ ص٢٥؛ سير أعلام النبلاء (سيرة) ص٦٢٨؛ الاستيعاب

ج۳ص۲۰۶؛أسد الغابة ج٤ص۱۱۰؛إعلام الموقعين لابن القيم ج۱ص۲۵، وط: ج۲ص۲۷؛ البداية والنهاية ج٥ص٤٧٦،وط: ج۷ص۵۹۳؛تاريخ الخلفاء ص۱۳۲؛الرياض النضرة ج٤ ص ۱۳۹؛الإصابة ج٤ص٤٦٧؛تذكرة الخواص لسبط ابن الجوزي ص۱۲۵؛الصواعق المحرقة ص ۱۲۷؛المنح المكية لابن حجر مكي ۵۸۱؛قضاء علي بن أبي طالب ﷺ ص۱۳)

پھر فقط یہ بات نہیں کہ اچانک سیدنا علی ﷺ سے کوئی ایک آدھ پیچیدہ مسئلہ حل ہو گیا تو حضرت عمر ﷺ نے اُس پر واہ واہ فرما کر شاباش دے دی بلکہ وہ تو مشکل مسائل کے حل کے لیے سیدنا علی ﷺ کے منتظر رہتے تھے کہ اُن سے ملاقات ہو تو یہ مسائل اُن سے حل کرائے جائیں۔ چنانچہ امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''فاروقِ اعظم کے فرزند حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب ﷺ نے حضرت علی بن ابو طالب ﷺ سے کہا: اے ابو الحسن! اکثر آپ موجود ہوتے ہیں تو ہم نہیں ہوتے اور ہم ہوتے ہیں تو آپ نہیں ہوتے، تین باتیں ایسی ہیں جن کے متعلق میں نے آپ سے دریافت کرنا ہے۔ حضرت علی ﷺ نے کہا: وہ کیا ہیں؟ فرمایا: انسان کسی شخص سے محبت کرتا ہے حالانکہ اُسے اُس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا ہوتا، اور کسی شخص سے بغض رکھتا ہے حالانکہ اُسے اُس سے کوئی نقصان نہیں پہنچا ہوتا؟ فرمایا: ہاں، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ روحیں فضا میں باہم لشکر کی طرح رہتی ہیں، آپس میں ملاقات کرتی ہیں تو ایک دوسری کو آزماتی ہیں، پس جن میں وہاں الفت ہو جاتی ہے تو (وہ اپنے جسمانی پیکر میں یہاں) ایک دوسری کو چاہتی ہیں، اور جو وہاں غیر مانوس رہتی ہیں تو (وہ اپنے جسمانی پیکر میں یہاں) ایک دوسری سے بغض رکھتی ہیں۔ حضرت عمر ﷺ نے فرمایا: ایک بات حل ہو گئی۔ پھر فرمایا: انسان بات کرتے کرتے اچانک بھول جاتا ہے حالانکہ وہ سمجھتا ہے کہ اسے یاد ہے؟ اس پر حضرت علی ﷺ نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ دلوں میں سے کوئی دل ایسا نہیں مگر اس کے لیے ایک ابر ہے جیسا کہ چاند کے سامنے بادل آ جاتا ہے، چاند ہمارے سامنے روشن ہوتا ہے مگر جب اُس کے سامنے بادل آ جاتا ہے تو وہ تاریک ہو جاتا ہے اور جب اُس سے بادل ہٹ جاتا ہے تو وہ روشن ہو جاتا ہے، اور اسی طرح بندہ ہمارے درمیان بات کر رہا ہوتا ہے کہ اُس کے قلب پر بادل چھا جاتا ہے تو وہ بات کو بھول جاتا ہے اور جب وہ بادل ہٹ جاتا ہے تو اسے بات یاد آ جاتی

ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: دو باتیں حل ہوگئیں۔ پھر فرمایا: انسان خواب دیکھتا ہے جن میں بعض سچے ہوتے ہیں اور بعض جھوٹے؟ فرمایا: ہاں، میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ کوئی بندہ یا بندی نیند کرتے ہیں پھر جب اُس کی نیند گہری ہوتی ہے تو اُس کی روح عرش کی طرف پرواز کرتی ہے، پھر جس کی آنکھ عرش کے قریب کھلتی ہے تو اس کا خواب سچا ہوتا ہے، اور جو عرش سے دور ہوتا ہے تو اس کا خواب جھوٹا ہوتا ہے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

ثلاث كنتُ في طلبهن ،فالحمد لله الذي أصبتهن قبل الموت.

''تین باتیں تھیں میں جن کی میں طلب میں تھا، الحمد للہ میں نے انہیں وفات سے قبل پالیا''۔

(المعجم الأوسط ج٦ص١٠٥، ١٠٦حديث٥٢١٦؛ كتاب الروح لابن القيم ص٤٢، ٤٣ وط: ص٧٩، ٨٠، وط: ص٢٣٥، ٢٣٦؛ مجمع الزوائد ج١ ص١٦٢، وط: ج١ ص٣٩٨ حديث ٧٣٨، وط: ج١ ص٢١٨ حديث٧٣٨؛ جمع الجوامع ج١٣ ص١٠٧ حديث٥٩٧٧؛ كنز العمال ج ص١٦٩ حديث٣٦٥١٢)

جب لسانِ حق فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ سے مولیٰ علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی دوسرے کی شان میں مذکورالصدر الفاظ کی طرح الفاظ نہیں آئے، اور جب خلیفۂ اول سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مرتضوی استنباط سے فائدہ حاصل فرمایا، خوش ہوئے اور دعا بھی دی، اور جب ابن جوزی ایسے محدث نے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو علمِ مرتضوی کا محتاج کہا ہے تو پندرھویں صدی کا کوئی شیخ الحدیث اگر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے باب العلم ہونے کی تصریح کو نہیں مانتا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اور اگر وہ اپنی ناقص فہم کی بنا پر کسی اور ہستی کو بزعمِ خویش بــابُ لِــلُّـبــاب بناتا ہے تو بناتا رہے، اُس کے بنانے سے کچھ بنتا نہیں بلکہ بگڑتا ہے، جیسا کہ آپ نے بالتفصیل اُس کے استدلال کا فساد ملاحظہ فرمایا۔ کوئی جسے چاہے بــابُ لِلُّبــاب کہتا رہے مگر اُمت کسی کی بات کو نہیں فقط شارع ﷺ کے ارشاد کو ماننے کی مکلف ہے۔ اس لیے کہ امت کے سامنے ایک ضابطہ اور اصول موجود ہے:

كل مأخوذ من قوله ومردود عليه إلا رسول الله ﷺ.

''ہر شخص کا قول مقبول بھی ہوتا ہے اور مردود بھی، سوائے رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے''۔

لہٰذا اُمت ہر ذی علم کے علم وفہم کو تو تسلیم کرتی ہے مگر کسی پیر وغیرہ کے بنائے ہوئے باب العلم یا بــــابُ لِلُّباب کو نہیں مانتی اور مرشد الکل اور ''وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَى'' کی شان والے امام الانبیاء علیہم السلام نے جس کو

باب العلم بنایا اور فرمایا ہے فقط اسی کو باب العلم مانتی ہے۔

کیا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو باب العلم سمجھنا رافضیت ہے؟

معاصر مذکور نے ایک تو شریعت پر یہ زیادتی کی کہ جس ہستی کو نبی کریم ﷺ نے فقط باب العلم بھی نہیں فرمایا انہیں انہوں نے بابُ لِلْبَاب بنادیا اور دوسری زیادتی یہ کی کہ جس ہستی کو نبی اکرم ﷺ نے واقعۃً باب العلم فرمایا ہے انہیں باب العلم سمجھنے کو رافضیت قرار دے دیا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''باب العلم ہونے کو مولا علی کا خاصہ سمجھنا اہل سنت کا نہیں بلکہ روافض کا عقیدہ ہے''۔

(ضربِ حیدری ص 229)

ایسے فتوے پڑھ کر تعجب ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ جس ہستی کو باب العلم فرما چکے ہیں اسے باب العلم کہنا اور ماننا سنت ہونا چاہیئے اور کہنے اور ماننے والے کو سنی کہنا چاہیئے کیونکہ وہ سنت ہی پر عمل پیرا ہے، لیکن جب بھاری القاب والے لوگ ایسے شخص کو رافضی کہہ دیتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ شاید یہ لوگ اپنے نام کے ساتھ بھاری القاب کا لاحقہ اور سابقہ لگاتے ہی اس لیے ہیں کہ عوام الناس پر ان کی دھوکہ دہی اور خیانت کا رعب قائم ہو سکے۔ آیئے! رفض کی صحیح تعریف جانتے ہیں تا کہ ہر قسم کے دھوکہ سے محفوظ رہا جاسکے۔

رفض کس بلا کا نام ہے؟

اِن ہی بھاری القاب کی وجہ سے صاحب ''ضربِ حیدری'' کے مذکورہ فتوی کی تحقیق ضروری ہے، کیونکہ اس سے عام انسان تو کیا اچھا خاصا پڑھا لکھا شخص بھی حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ سو میں نے بہت تحقیق کی لیکن بسیار تلاش کے باوجود مجھے یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ خصوصاً سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو باب العلم سمجھنا رافضیت ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر رافضیت کیا ہے؟ آیئے یہ حقیقت اسلاف کرام سے معلوم کرتے ہیں۔ علامہ محمد بن یعقوب فیروز آبادی لکھتے ہیں:

والروافض كل جند تركوا قائدهم، والرافضة: الفرقة منهم وفرقة من الشيعة بايعوا زيد بن علي، ثم قالوا له: تبرأ من الشيخين فأبى وقال: كانا وزيري جدي فتركوه، ورفضوه، وارفضوا عنه، والنسبة رافضي.

''روافض: ہر ایسا لشکر جو اپنے قائد کو چھوڑ دے روافض ہے، اور رافضہ اُن میں سے ایک فرقہ ہے، اور شیعہ میں سے ایک فرقہ ہے جنہوں نے امام زید بن علی علیہ السلام کی بیعت کی، پھر وہ اُن سے

کہنے لگے: آپ شیخین سے برأت کا اظہار کیجئے۔امام نے اُن کے مطالبہ کو مسترد کر دیا اور فرمایا: وہ میرے جد کریم ﷺ کے وزیر تھے۔اس پر انہوں نے امام کو چھوڑ دیا اور اُن سے الگ ہو گئے، اور رفض سے منسوب کو رافضی کہتے ہیں"۔

(القاموس المحیط ص ۸۳۰)

امام ابن منظور افریقی اور امام زبیدی رحمۃ اللہ علیہما نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔

(لسان العرب ج۵ ص۲۱۷؛تاج العروس ج۱۰ ص۶۲)

اہل حدیث مصنف علامہ وحید الزماں لکھتے ہیں:

"رفضونا فهم الروافض: امام زید بن علی بن حسینؑ نے فرمایا: ان لوگوں نے ہمیں چھوڑ دیا یہی رافضی ہیں۔ ہوا یہ تھا کہ امام زید بن علی علیه وعلیٰ آبائه السلام نے ہشام بن عبد الملک پر خروج کرنا چاہا، سچے شیعہ اُولیٰ یعنی اہل سنت والجماعت نے آپ کی رفاقت اختیار کی، یہاں تک کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی مال وزر سے آپ کی مدد کی اور پوشیدہ طور پر آپ کی اعانت اور امداد کے لیے اور ہشام کو منصوبہ خلافت سے ہٹانے کے لیے فتویٰ دیا۔ آپ کے لشکر میں کچھ نام کے شیعہ بھی تھے جو اب رافضی کہلاتے ہیں، انہوں نے حضرت زید سے کہا کہ تم شیخین (یعنی حضرات ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما) پر تبرا کرو تو ہم تمہارا ساتھ دیں گے۔ آپ نے اس سے انکار کیا اور فرمایا: یہ ہرگز نہیں ہو سکتا وہ میرے نانا یعنی رسول مقبول ﷺ کے وزیر اور مشیر اور خاص رفیق تھے، تب اُن جھوٹے شیعوں نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس وقت آپ نے یہ فرمایا: ان لوگوں نے ہم کو چھوڑ دیا یہی رافضی ہیں"۔

(لغات الحدیث ج۲ ص۱۳۳)

علامہ انور شاہ کشمیری لکھتے ہیں:

واعلم أن الرافضي عند علماء الجرح والتعديل من سبّ الصحابة، ومن كان حبه مع أهل البيت أزيد كانوا يسمونه شيعياً، ولم يكن العرف عندهم كما شاع الآن.

"جان لو کہ علماء جرح وتعدیل کے نزدیک رافضی وہ ہے جو صحابہ کرام ؓ کو برا کہے، اور

جس شخص کی اہل بیت کے ساتھ محبت زیادہ ہوتی اسلاف اسے شیعی کہتے تھے، اور اُن کے عرف میں وہ معنی مروّج نہیں ہوا تھا جو اَب مروّج ہے"۔

(فيض الباري ج٢ ص ٤٥٥، وط: ج٤ ص ٢٦٣)

آج کل عرفِ عام میں شیعہ اور رافضی میں کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا، شیخین کریمین کو امام وخلیفۂ برحق ماننے والے مگر سیدنا علی کو افضل اور اہل بیت کرام علیہم السلام سے زیادہ محبت کرنے والے کے حق میں بھی شیعی اور رافضی دونوں لفظ استعمال کر دیے جاتے ہیں اور شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کو برا کہنے والے کے حق میں بھی شیعہ اور رافضی دونوں لفظ بول دیے جاتے ہیں، یعنی ان دونوں لفظوں کو مترادف المعنیٰ گمان کر لیا گیا ہے، حالانکہ یہ تحقیق اور احتیاط کے منافی ہے۔

شیخ الحدیث والتفسیر کہلانے والے معاصر مذکور نے بھی اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھا اور عصر حاضر کے ایسے علماءِ حق کو فقط شیعہ بھی نہیں بلکہ رافضی تک کہہ دیا جن کی شیخین کریمین اور سیدنا عثمان ذی النورین ﷛ کے فضائل ومناقب پر مستقل تصانیف ہیں، اور جنہوں نے سیدنا علی ﷛ کے فضائل ومناقب پر مبنی کتابوں میں بھی سیدنا ابوبکر ﷛ کو عند الجمہور افضل لکھا ہے لیکن اس میں قطعیت کو تسلیم نہیں کیا۔ بتلایئے انہیں کیونکر رافضی کہا جا سکتا ہے؟ لیکن جو لوگ جذبات میں آ جاتے ہیں تو اُن سے دامنِ احتیاط چھوٹ جاتا ہے، اگر دمِ تحریر و تقریر اپنے غصہ پر قابو ہو تو عالم شخص بخوبی جانتا ہے کہ رافضی کسے کہتے ہیں اور شیعہ کسے۔ یہ فقط غیر علماء کا وطیرہ ہے کہ وہ سیدنا علی ﷛ کو اعلم اور افضل ماننے والوں کو بھی رافضی قرار دیتے ہیں۔

قارئین کرام کو معلوم ہونا چاہیے کہ جو شخص شیخین کریمین رضی اللہ عنہما پر سب وشتم کرے اسے رافضی کہتے ہیں اور ایسا شخص کسی تعظیم کے لائق نہیں، جبکہ شیعی اُسے کہتے ہیں جو بشمول شیخین کریمین تمام صحابہ کرام ﷛ کی تعظیم کرے لیکن اُس کی محبت اہل بیت کرام علیہم السلام سے زیادہ ہو، اور ایسا شخص لائق تعظیم ہے حتیٰ کہ امام احمد رضا حنفی رحمۃ اللہ علیہ نے ایسے محدثین کو ائمہ اہل سنت اور اس غلبۂ محبت کو محض سنیت فرمایا ہے، جیسا کہ ہم اس سے قبل لکھ چکے ہیں۔ نیز علامہ عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ "کس شیعہ سے روایت قبول کی جائے اور کس سے نہیں"؟ کی توضیح میں لکھتے ہیں:

فتُقبَلُ رواية أرباب التشيع بالمعنى المشهور في عرف المتقدمين، وهو اعتقاد تفضيلِ علي علىٰ عثمان، أو اعتقادُ أن علياً أفضل الخلق بعد رسول الله ﷺ،

وأنه مصيب في حروبه كلها، ومخالفها مخطيء، وبهذا المعنى نُسِبَ جمْعٌ من أهل الكوفة المتقدمين إلى التشيّع. ولا تقبل رواية المتشيع بالمعنى المشهور في عرف المتأخرين، وهو التبري من الشيخين أبي بكر وعمر، وسبهما وسب غيرهما من الصحابة المخالفين لعلي ﷺ أو تكفير أكثر الصحابة سوى علي ومن وافقه.

''پس وہ لوگ جو متقدمین کے عرفی معنی کے لحاظ سے شیعہ کہلاتے ہیں اُن کی روایت قبول کی جائے گی، اور وہ عرفی معنی یہ اعتقاد رکھنا ہے کہ سیدنا علی المرتضیٰ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہما سے افضل ہیں، یا یہ اعتقاد رکھنا ہے کہ سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ رسول اللہ ﷺ کے بعد مخلوق میں سے افضل ترین ہیں، اور وہ تمام جنگوں میں حق پر تھے اور اُن کے مخالفین خطا پر تھے، اور اسی معنیٰ میں اکثر اہل کوفہ کی طرف تشیع کی نسبت کی جاتی ہے۔

مگر اُن ارباب تشیع کی روایت قبول نہیں جائے گی جو متاخرین کے عرفی معنی کے لحاظ سے شیعہ ہیں، اور وہ شیخین کریمین رضی اللہ عنہما سے براءت اور اُن پر اور دوسرے ایسے تمام صحابہ کرام پر سبّ وشتم کرنا ہے جو سیدنا علی ﷺ کے مخالفین تھے، یا سیدنا علی اور اُن کے موافقین کے علاوہ تمام صحابہ کرام ﷺ کو کافر قرار دینا ہے''۔

(ظفر الأماني بشرح مختصر السيد الشريف الجرجاني ص ٤٩١)

اس عبارت کے دوسرے پیراگراف سے معلوم ہوا کہ متاخرین کے نزدیک شیخین کریمین رضی اللہ عنہما سے بیزاری اور اُن کی تکفیر شیعیت ہے، اور اِس کے پہلے پیراگراف سے معلوم ہوا کہ متقدمین کے نزدیک سیدنا علی کو سیدنا عثمان ﷺ یا نبی کریم ﷺ کے بعد پوری مخلوق سے افضل ماننا شیعیت تھی۔

کیا مجھ ایسا سادہ شخص یہ پوچھنے کا حق نہیں رکھتا کہ شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کو سبّ وشتم کرنا اور باب العلم افضلیت کو سیدنا علی ﷺ کا خاصہ سمجھنا کیا یکساں جرم ہے کہ پیر سائیں قاسمی نے مؤخر الذکر بات کو بھی رافضیت قرار دے دیا ہے؟ یاد رکھنا چاہیئے کہ الوہیت ونبوت کے علاوہ سیدنا علی ﷺ کی کسی بھی افضلیت کا عقیدہ رکھنا رافضیت نہیں بلکہ فقط شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کو سبّ وشتم کرنا اور اُن سے بیزاری کا اظہار کرنا رافضیت ہے۔ چنانچہ غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے متبوع امام سے پوچھا گیا تو انہوں نے یہی تصریح فرمائی، قاضی ابویعلیٰ لکھتے ہیں:

حدثنا عبد الله بن احمد بن حنبل قال: سألتُ أبي عن الرافضي؟ قال: الذي يسبُّ أبابكر وعمر رضي الله عنهما.

''ہمیں امام عبداللہ بن احمد بن حنبلؒ نے بیان کیا: میں نے اپنے ابا حضور سے رافضی کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا: رافضی وہ ہے جو حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو برا کہے''۔

(طبقات الحنابلة للقاضي أبي يعلىٰ الحنبلي ج۲ ص ۱۰)

حافظ ذہبی نے امام ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہما سے ابوعروبہ کے متعلق نقل کیا ہے:

كان أبو عروبة غالياً في التشيع، شديد الميل علىٰ بني امية.

''ابوعروبہ شیعیت میں غالی تھا، بنوامیہ کے بارے میں سخت تھا''۔

اس پر حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

قلتُ: كل من أحب الشيخين فليس بغال، بلىٰ من تعرض لهما بشيء من تنقص، فإنه رافضي غال.

''میں کہتا ہوں: ہر وہ شخص جو شیخین کریمین ؓ سے محبت کرے تو وہ غالی نہیں، بلکہ جو تنقیص کے ساتھ اُن سے روگردانی کرے تو وہ رافضی غالی ہے''۔

(سير أعلام النبلاء للذهبي ج۱٤ ص ۵۱۱؛ تذكرة الحفاظ للذهبي ج۲ ص ۷۷۵؛ تاريخ الإسلام للذهبي ج۲۳ ص ۵٦۱)

امام ذہبی ایک اور مقام پر شیعیت کے درجے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وإن ترقىٰ إلى الشيخين بذم، فهو رافضي خبيث.

''اور اگر وہ شیخین کی برائی کی طرف چلا جائے تو وہ خبیث رافضی ہے''۔

(سير أعلام النبلاء للذهبي ج۷ ص ۳۷۰)

لہٰذا آج کل کے غصہ ور لکھاری لوگ حقائق کے خلاف جو کچھ لکھتے اور بولتے رہتے ہیں نہ تو اُن کے لکھنے اور بولنے سے کچھ فرق پڑتا ہے اور نہ ہی کسی غیر محتاط اور غیر معتدل شخص کے رافضی کہنے سے کوئی رافضی ہو جاتا ہے۔

دراصل دورِ حاضر میں ہو یہ رہا ہے کہ پہلے تو بعض لوگ از خود مسلک کے امیر اور امام بن جاتے ہیں، پھر شیخ چلی کی طرح اقتدار کے اسی نشہ میں سرشار ہو کر جس پر غصہ آتا ہے اسے ٹھوکر لگا کر سنیت یا اسلام سے خارج کر

دیتے ہیں۔ تف ہے ایسے خودساختہ مذہبی اقتدار پر اور پھٹکار ہے ایسے فتووں اور اُفکار پر۔

کیا اعلمیتِ مرتضوی کا قول رافضیت ہے؟

تاویلاتِ فاسدہ سے سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کی ہر خصوصیت کا انکار محض اس لیے کیا جاتا ہے کہ کچھ لوگوں نے ترتیبِ خلافت کے مطابق ترتیبِ افضلیت کو لازم سمجھ لیا ہے، اسی لیے وہ کسی بھی فضیلت میں سیدنا علی ﷺ کو دوسرں سے افضل سمجھنے کے روادار نہیں، کیونکہ اس سے ان کا مفروضہ غلط ثابت ہوتا ہے۔ حدیث مدینۃ العلم کی تاویلاتِ فاسدہ کا باعث بھی یہی مفروضہ ہے۔ کیونکہ اگر باب العلم ہونا سیدنا سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کا خاصہ مان لیا جائے تو پھر از خود اُن کا اعلم ہونا ثابت ہوتا ہے، اور ایسا تصور کرنا بھی اُن کے مفروضہ کے منافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیر شیخ الحدیث والتفسیر لکھتے ہیں:

''صدیق اکبر کو محض سیاسی خلیفہ کہنا خالص گستاخی اور رافضیت ہے، انکی اعلمیت کا انکار دوسری گستاخی اور رافضیت ہے''۔

(ضربِ حیدری ص 230)

اس اقتباس کے پہلے جملے پر مکمل تبصرہ کرنے سے تو میں قاصر ہوں، البتہ اتنا ضرور عرض کرتا ہوں کہ اسے گستاخی اور رافضیت قرار دینا نہ صرف یہ کہ بے بنیاد بات ہے بلکہ حماقت ہے۔ اس لیے کہ لفظ سیاست متعدی المعنیٰ ہے اور بعض علماء نے سیدنا ابوبکر صدیق ﷺ کی سیاست کو تو متعدی کہا ہے مگر اُن کی ولایت کو متعدی نہیں کہا۔ پہلے سیاست کا معنیٰ سمجھ لیجیے پھر ولایت کے متعدی اور غیر متعدی ہونے پر بات ہوگی۔ اہلِ لغت لکھتے ہیں:

''دیکھ بھال کرنا، سدھانا، امور کی تدبیر وانتظام کرنا (سیاست ہے)''۔

(المنجد مترجم ص ۴۰۳، مصباح اللغات ص ۴۰۶)

لہٰذا اگر کوئی شخص فقط ظاہری دیکھ بھال اور امور کی تدبیر وانتظام اپنے نائب کے سپرد کرے تو وہ اس کی دنیوی سیاست (دیکھ بھال) کا خلیفہ ہوگا اور اگر وہ روحانی معاملات اپنے نائب کے سپرد کرے تو وہ نائب اس کی روحانی سیاست (دیکھ بھال) کا خلیفہ ہوگا۔ جب یہ بات سمجھ لی گئی تو پھر بڑی معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ بعض اکابرین کے نزدیک سیدنا ابوبکر صدیق ﷺ کی ولایت وروحانیت متعدی نہیں بلکہ لازم (غیر متعدی) تھی۔ چنانچہ امام احمد رضا حنفی رحمۃ اللہ علیہ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

''آیہ کریمہ جس طرح افضلیت صدیق پر دلیل ساطع، یونہی ان کے عرفان الٰہی وولایت ذاتی میں کافۂ امت سے زیادت پر برہانِ قاطع''۔

پھر ''ولایتِ ذاتی'' پر حاشیہ میں لکھتے ہیں:

''قولہ ولایت ذاتی: اس لیے کہ ولایتِ متعدیہ میں حضرت مولیٰ [علی علیہ السلام] کا تقدم سبھی کو مسلّم''۔

(مطلع القمرین ص ۲۰۰)

ولایت کا متعدی اور غیر متعدی ہونا

امام احمد رضا قادری رحمۃ اللہ علیہ کے حاشیہ کی یہ عبارت عقل کے خلاف تو نہیں لیکن میری عقل سے بلند ضرور ہے۔ اس عبارت میں نہ جانے کس دلیل کی بنا پر سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ولایت کو لازم اور مولیٰ علی علیہ السلام کی ولایت کو متعدی کہا گیا ہے، اگر یہاں دلیل بھی ساتھ لکھ دی جاتی تو معاملہ آسان ہوتا۔ میرے خیال کے مطابق شاید "من كنت مولاه" اور "إن علياً مني وأنا منه" اور "وهو ولي كل مؤمن من بعدي" کے پیش نظر مولیٰ علی رضی اللہ عنہ کی ولایت کو متعدی فرمایا گیا ہوگا۔ کیونکہ ایسے الفاظ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی بھی دوسرے شخص کی شان میں نہیں آئے۔ سو جب ہر ہر مومن کے مولیٰ اور ولی ہونے کے باوجود مولیٰ علی علیہ السلام کو وصالِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ظاہری ولایت نہیں سونپی گئی تو لامحالہ اُن کی شان میں وارد حدیث کسی نہ کسی معنیٰ میں تو اُن پر صادق آئے گی۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہی معنیٰ ہے جسے امام احمد رضا قادری رحمۃ اللہ علیہ نے سبھی کے نزدیک مسلّم فرمایا ہے۔ لہٰذا یہ عقیدہ رکھنا حدیث پاک کے عین مطابق ہے کہ سیدنا علی علیہ السلام جس جس کے مولیٰ اور ولی ہیں اُن کی مقدس روح بلا استثنا اپنی شانِ متعدی سے ہر اس شخص کو روحانی فیض پہنچاتی ہے۔ اس سے صاحبِ ''ضربِ حیدری'' کی وہ بات بھی غلط ثابت ہو جاتی ہے جو انہوں نے شاہ ولی اللہ کی طرف منسوب کتاب قرۃ العینین سے بایں الفاظ نقل کی ہے:

''اگر بیعت وصحبت کا اعتبار کیا جائے تو شیخین کے سلاسل مولائے مرتضیٰ سے زیادہ ثابت ہوتے ہیں بلکہ خود سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو بھی شیخین سے فیض پہنچتا ہے''۔

(ضربِ حیدری ص196,206)

ظاہر بات ہے کہ جب سیدنا ابو بکر صدیق ﷺ کی ولایت لازم (غیر متعدی) ہے تو اُن سے سیدنا علی ﷺ کو کیونکر فیض پہنچ سکتا ہے؟ بہر حال یہ ناکارہ روحانیت کا طالب ہے اس لیے روحانی معاملات پر گفتگو کرنا اس کے بس کا روگ نہیں۔ قارئین کرام خود ہی غور وفکر کر لیں کہ مذکورہ بالا دونوں قولوں میں سے کونسا قول زیادہ قابلِ قبول ہے۔ دونوں قول اکابر کے ارشادات ہیں مگر باہم متضاد ہیں۔ اول الذکر کے نزدیک ولایتِ صدیقی لازم (غیر متعدی) ہے اور ثانی الذکر کے نزدیک متعدی ہے، کیونکہ ثانی الذکر کے مطابق خود سیدنا علی ﷺ کو بھی شیخین سے فیض پہنچتا ہے۔

قارئین کرام جس قول کو اختیار فرمائیں اُن کی اپنی پسند مگر مجھ ناکارہ کا عقیدہ یہ ہے کہ اہل بیت کرام علیہم السلام دوسروں کے نہیں بلکہ دوسرے اُن کے فیض کے بعینہٖ اسی طرح محتاج ہیں جس طرح وہ قرآن کریم کے محتاج ہیں۔ آخر "إني تارك فيكم الثقلين" میں قرآن مجید کے علاوہ اور کس بات پر زور دیا گیا ہے؟ یہ وہ حقیقت ہے جس کو لسانِ حق سیدنا فاروقِ اعظم ﷺ نے انتہائی بلیغ انداز میں بیان فرمایا تھا۔ چنانچہ ردِّ روافض میں مشہور مصنف علامہ ابن حجر ہیثمی مکی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

عن ابن المسيب (ﷺ) قال عمر ﷺ: تحبّبوا إلى الأشراف وتودّدوا، واتقوا على أعراضكم من السفلة واعلموا أنه لايتم شرف إلا بولاية علي ﷺ.

"حضرت ابن المسیب ﷺ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا عمر ﷺ نے ارشاد فرمایا: اشراف (سادات) سے محبت اور مودّت کرو، اور اپنی عزت کی خاطر گھٹیا لوگوں سے ہوشیار رہو، اور جان لو کہ کوئی شرف ومرتبہ علی ﷺ سے محبت رکھے بغیر پورا نہیں ہوتا"۔

(الصواعق المحرقة ص ١٧٨؛ جواهر العقدين للسمهودي ص ٣٨١؛ رشفة الصادي ص ١٥٢)

سیدنا فاروقِ اعظم ﷺ کے ایک اور ارشاد سے تو معلوم ہوتا ہے کہ بنیادی ھدایت کے حصول میں بھی انسانیت اہل بیت کرام علیہم السلام کی مرہونِ منت ہے۔ چنانچہ علامہ ابن زنجویہ رازی لکھتے ہیں:

"ایک شخص نے حضرت علی المرتضیٰ ﷺ کی شکایت کی، اس وقت وہ حضرت عمر ﷺ کی مجلس میں تشریف فرما تھے، حضرت عمر ﷺ نے اُن کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہا: اے ابوالحسن! اٹھیے! اور اپنے مدعی کے برابر کھڑے ہو جائیے، حضرت علی ﷺ اٹھ کر اپنے مدعی کے برابر کھڑے ہو گئے، تھوڑی سی بحث وتکرار کے بعد مدعی کا مقدمہ غلط ثابت ہو گیا تو حضرت علی ﷺ

اپنی نشست پر جا بیٹھے۔ حضرت عمر ﷺ نے اُن کے چہرۂ اقدس میں ناگواری کے آثار محسوس فرمائے تو پوچھا: یا ابا الحسن! میں آپ کے چہرہ پر ناگواری محسوس کر رہا ہوں، کیا آپ کو کوئی بات ناپسند آئی؟ فرمایا: یا امیر المومنین ہاں، پوچھا کیا؟ فرمایا: آپ نے مجھے میرے دشمن کے سامنے کنیت کے ساتھ پکارا (اور یہ انداز تعظیم پر دلالت کرتا ہے) آپ نے یوں کیوں نہ کہا: "قم یا علي فاجلس مع خصمک؟" اے علی اٹھ! اپنے مدعی کے ساتھ بیٹھ۔ اس پر حضرت عمر ﷺ نے حضرت علی المرتضیٰ ﷺ کے سر اقدس کو پکڑ کر اُن کی مبارک پیشانی کو چوما اور کہا: "بأبي أنتم هدانا الله، وبكم أخرجنا من الظلمات إلى النور" (میرے ماں باپ قربان جائیں، تم ہی لوگ ہو جن کے ذریعہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے ھدایت دی اور تمہارے ہی ذریعے ہمیں تاریکیوں سے نور کی طرف نکالا)"۔

(مختصر كتاب الموافقة ص ١٥٥، ١٥٦؛ المناقب للخوارزمي ص ٩٨)

مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کے نزدیک تو سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ اپنی جسدی پیدائش سے قبل بھی اس مقام کے ماوئ و ملجا تھے۔ لہٰذا روحانی متعدی فیضِ ولایت کے منبع و مصدر یقیناً سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ ہیں اور انہیں تقدم بھی حاصل ہے لیکن سیدنا ابو بکر صدیق ﷺ کا فیض ولایت بھی محض لازم نہیں بلکہ متعدی بھی ہے۔

کیا اعلمیتِ مرتضوی سے کوئی مستثنیٰ ہے؟

یہ تو تھا صاحب "ضربِ حیدری" کی عبارت کے پہلے جملہ پر قلم برداشتہ ایک تبصرہ، جبکہ یہاں ہمارا اصل موضوع اُن کی عبارت کا دوسرا جملہ ہے، اور وہ یہ ہے:

"اُن (سیدنا ابو بکر ﷺ) کی اعلمیت کا انکار دوسری گستاخی اور رافضیت ہے"۔

(ضربِ حیدري ص 230)

ہم پہلے وضاحت کر چکے ہیں کہ شیخین کریمین رضی اللہ عنہما سے براءت (اظہارِ بیزاری) یا اُن پر سب وشتم کرنا ہی رافضیت ہے، اس کے علاوہ کسی دوسری چیز کا نام رافضیت نہیں ہے۔ پیر سائیں جو سیدنا ابو بکر صدیق ﷺ کی اعلمیت کے انکار کو رافضیت قرار دے رہے ہیں یہ اُن کی ذاتی رائے ہے، شریعتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ کی زبانِ اقدس سے سیدنا ابو بکر صدیق ﷺ کے حق

میں نہیں بلکہ سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کی شان میں آیا ہے کہ وہ علم میں سب سے بڑھ کر ہیں۔اس سے قبل ہم وضاحت سے اور باحوالہ لکھ چکے ہیں کہ حضرت ابن مسعود، ابن عباس اور تابعین میں سے حضرت مسروق ﷺ نے تصریح فرمائی ہے کہ حضور ﷺ کے صحابہ کرام میں سیدنا علی ﷺ سے بڑا عالم کوئی نہیں تھا لیکن شیخ الحدیث والتفسیر قاسمی چونکہ اپنے اصول کے پابند ہیں اس لیے انہیں یہ تحقیق قبول نہیں، اُن کے نزدیک یہ محض مبالغہ آرائی یا اپنے استاذ کے ساتھ حسن ظن ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"باب العلم سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کے علم کے بارے میں سیدنا ابنِ عباس ﷺ اور کسی تابعی کا قول اگر اعلیت کا ملتا ہو تو اس کا تعلق خلفاءِ ثلاثہ کے بعد کے دور سے ہے۔ خاص کر معاصرین اور شاگرد حضرات جب اپنے استاد کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہیں تو وہ اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے کی حد تک بات کر رہے ہوتے ہیں اور اس میں ان کا اپنے استاد یا معاصر سے حسنِ ظن غالب ہوتا ہے۔ حضرت فاروقِ اعظم ﷺ سے ایک آدمی نے کہا میں نے آپ جیسا نہیں دیکھا۔ آپ نے فرمایا تم نے ابوبکر کو دیکھا ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ فرمایا اگر تم کہتے ہاں، تو تمہاری خیر نہیں تھی لو قلت نعم لاو جعتک ضرباً (کنز العمال جلد ۱۲ صفحہ ۲۲۳)۔ اور اگر کسی ایسے شاگرد کی طرف منسوب قول ہو بھی موضوع اور احادیثِ مرفوعہ صحیحہ سے متصادم، تو کونسا محقق اسے شمار میں لائے گا۔ لہٰذا اس موضوع پر اگر کسی بات کو حرفِ آخر کہا جا سکتا ہے تو وہ نبی کریم ﷺ ہی کا ارشادِ عالی ہے"۔

(ضربِ حیدری ص 117)

صاحبِ "ضربِ حیدری" نے ٹھیک کہا کہ شاگرد یا معاصر حسنِ ظن کی بنا پر کسی کی افضلیت بیان کرے تو وہ افضلیت فقط اس کے نزدیک ہوگی دوسرے لوگ اس سے مستثنیٰ ہوں گے، اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ فاروقِ اعظم ﷺ کی تعریف میں جس شخص نے اظہارِ خیال کیا اس نے حضرت ابوبکر صدیق ﷺ کو نہیں دیکھا تھا، لیکن اگر شاگرد نہیں بلکہ استاذ اپنے تلامذہ میں سے کسی شاگرد کو سب سے زیادہ عالم کہے تو کیا اسے بھی مبالغہ یا حسن ظن کہا جائے گا؟ نبی کریم ﷺ نے اپنی لختِ جگر سیدۂ کائنات رضی اللہ عنہا کو ان کے نکاح کے موقعہ پر فرمایا تھا:

أما ترضين أني زوّجتک أقدم أمتي سلماً وأكثرهم علماً وأعظمهم حلماً؟

"کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ میں نے تمہارا نکاح ایسے شخص سے کیا ہے جو میری امت میں

اسلام کے لحاظ سے سب پر مقدم، علم کے لحاظ سے سب سے زیادہ اور بُردباری کے لحاظ سے سب سے اعظم ہے؟"۔

(مسند أحمد ج٥ ص٢٦ و ج٦ ص٧٩٤ حديث ٢٠٥٧٣؛ فضائل الصحابة ج٢ ص٩٥٨ حديث ١٣٤٦؛ المعجم الكبير ج٢٠ ص٢٢٩؛ المصنف لابن أبي شيبة ج٦ ص٣٧٦ حديث ٣٢١٢٢، وط: ج١٧ ص١٣٥، ١٣٦ حديث ٣٢٧٩٤؛ الآحاد والمثاني ج١ ص ١٤٢ حديث ١٦٩؛ المعجم الكبير ج١ ص٥١ حديث ١٥٦، وط: ج١ ص٥٧ حديث ١٥٤؛ الاستيعاب ج٣ ص٢٠٣، عن أبي إسحاق؛ سير أعلام النبلاء ج٢ ص٦٢؛ تاريخ دمشق ج٤٢ ص١٢٦؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٧ ص٣٣٧، ٣٤١؛ الرياض النضرة ج٤ ص١٣٨؛ مسند فاطمة الزهراء للسيوطي ص٥٠ حديث ٦٧؛ در السحابة ص ٢٠٥؛ نزل الأبرار للبدخشاني ٦٤؛ موسوعة آل بيت النبي الأطهار للسعيد ص٢٠٠)

حافظ ہیثمی نے فرمایا ہے:

"اس حدیث کو امام احمد اور امام طبرانی نے روایت کیا ہے، اور اس کی سند میں ایک شخص خالد بن طہمان ہے، امام ابوحاتم اور دوسرے علماء نے اس کی توثیق فرمائی ہے اور باقی تمام راوی ثقہ ہیں"۔

(مجمع الزوائد ج٩ ص١٠١ وط: ج٩ ص١٢٣ حديث ١٤٥٩٥، وط: ج٩ ص ٨٥ حديث ١٤٥٩٥)

شیخ احمد شاکر نے فرمایا ہے: اس کی سند حسن ہے۔

(مسند أحمد ج١٥ ص١٧٤ حديث ٢٠١٨٥)

واضح رہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں "كان أبو بكر أعلمنا" (ابوبکر ہم سب سے بڑے عالم تھے) کا جملہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا قول ہے، اور حرفِ آخر صحابی کا قول نہیں بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہوتا ہے۔ نیز یہ بھی خیال رہے کہ اس حدیث میں سیدہ کو یوں نہیں فرمایا گیا کہ اُن کا نکاح اہل بیت کے ایسے فرد سے ہو رہا ہے جو علم وحلم میں سب سے زائد ہے بلکہ فرمایا گیا ہے کہ امت کے ایسے فرد سے ہو رہا ہے جو علم وحلم میں سب سے زائد ہے۔ لہٰذا جب حرفِ آخر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کا ارشاد ہے تو امتی تو اسی کو اعلم مانے گا جس کو اُس کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلم فرمایا ہے، اور اس صورت میں وہ رافضی نہیں بلکہ سنت کا پیروکار ہونے کی بدولت سنی ہی ہوگا۔

یہاں یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ یا کسی بھی دوسرے صحابی کی اعلمیت میں کوئی صریح ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم موجود ہونے کے باوجود اگر کوئی شخص اس کی اعلمیت کا انکار کرے تو تحقیق کی جائے گی کہ آیا اس کا

یہ انکار کسی تاویل کے باعث ہے یا بلا تاویل ہے؟ اگر اس انکار کا باعث کوئی تاویل ہوئی تو اس کے مطابق حکم لگایا جائے گا، مگر رافضی پھر بھی نہیں کہا جائے گا۔ کیونکہ رافضی اُسے کہا جاتا ہے جو سیدنا ابوبکر صدیق ﷛ سے اظہارِ بیزاری کرے یا اُن پر سب و شتم کرے۔ تعجب ہے کہ قاسمی صاحب شیخ الحدیث والتفسیر پھر پیر کہلانے کے باوجود بے احتیاطی کا وہ راگ الاپ رہے ہیں جو جہلاء کا راگ ہے۔ اس سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ اس بے قاعدہ تحریر پر قاسمی صاحب نے اس قدر تقریظات حاصل کر لیں!

اعتدال و توازن

تعجب ہے کہ ہمارے معاصر نے ترتیبِ خلافت کے برعکس محض اعلمیتِ سیدنا صدیق اکبر ﷛ کے انکار کو رافضیت قرار دے دیا! وہ تو ترتیبِ خلافت کے مطابق افضلیت کے قائل ہیں، لہٰذا اُنہیں چاہیے تھا کہ وہ یوں فتویٰ صادر فرماتے کہ فقط صدیق اکبر ہی نہیں بلکہ جو شخص سیدنا عمر و عثمان ﷞ کی اعلمیت کا انکار کرے تو وہ بھی رافضی ہے۔ بہر حال اُنہوں نے رافضیت کی ضد میں اعلمیتِ صدیقی کے انکار کو رافضیت قرار دے دیا مگر ہم اُنہیں اعلمیتِ مرتضوی کے انکار پر ناصبی کہنے سے گریزاں ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ ناصبیت فقط سیدنا علی ﷺ کی عدم طاعت، اُن کی خلافتِ حقہ کا قولی و عملی انکار، اُن سے اظہارِ بیزاری، اہل بیت سے بغض اور اُن پر سب و شتم کرنے کا نام ہے۔ لہٰذا جو شخص تاویلاً سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کے کسی مخصوص وصف اور فضیلت کا قائل نہ ہو تو اسے ناصبی کہنا مشکل ہے۔ باقی دلوں کے حال علیم بذات الصدور ﷻ کو معلوم ہیں۔

سب بابُ العلم تو ارشادِ نبوی ﷺ کا کیا فائدہ؟

اس سے قبل ہم "أصحابي كالنجوم" روایت کی سند، متن اور اس کے معنوی اطلاق پر بالتفصیل گفتگو کر چکے ہیں۔ قاسمی صاحب اور دوسرے لوگ زیادہ تر اسی روایت کی وجہ سے کہتے ہیں کہ سب صحابہ علم کے دروازے ہیں۔ قاسمی صاحب نے تو پہلے باقاعدہ عنوان قائم کیا ہے کہ "تمام صحابہ علم کے دروازے ہیں" پھر اس پر کسی صحابی کی شان میں وارد شدہ حدیث یا اُس سے منقول کوئی مسئلہ یا روایت نقل کر کے لکھ دیا ہے کہ یہ صحابی بھی باب العلم ہے۔ جیسا کہ ہم اس سے قبل "ضربِ حیدری" سے سیدنا ابوبکر صدیق ﷛ سے ایک روایت نقل کرنے کی مثال پیش کر چکے ہیں اور اُس پر تبصرہ بھی کر چکے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے سیدنا فاروقِ اعظم ﷛ کے محدث ہونے، حضرت ابوہریرہ ﷛ کے دو علم حاصل کرنے، حضرت حذیفہ ﷛ کے صاحب السر ہونے، سیدنا ابن مسعود ﷛ کے

قرآن داں ہونے، چار آدمیوں سے قرآن سیکھو! ابن مسعود، معاذ بن جبل، ابی بن کعب اور سالم ﷺ کی روایت نقل کرنے، ابن عباس ﷺ کے مفسر ہونے کی روایات وغیرہ سے استدلال کرتے ہوئے استفسار کیا ہے کہ یہ سب صحابہ علم کے دروازے ہیں کہ نہیں؟

میں کہتا ہوں: اگر شیخ الحدیث صاحب کے اسی طرز استدلال کو اپنایا جائے تو پھر سیدنا علی المرتضیٰ ؑ کی شان میں ایسی احادیث سب سے زیادہ آئی ہیں، مثلاً:

- علی ؑ سے بڑا کوئی قاضی نہیں،
- اے اللہ! اس کی زبان کو ثابت رکھ اور اس کے دل کو کھول دے،
- علی ؑ قرآن کے ساتھ اور قرآن علی ؑ کے ساتھ،
- علی ؑ سب سے بڑھ کر سنت کے عالم ہیں، (سیدتنا عائشہ رضی اللہ عنہا)
- اُن پر سوال اور بلا سوال علم نبوی ﷺ کی بارش ہوتی تھی،
- خود اللہ تعالیٰ نے اُن کے ساتھ سرگوشی فرمائی، (یہ حدیث ضرب حیدری میں بھی ہے)
- علی ؑ "اکثرهم علماً" علم میں سب سے بڑھ کر ہیں،
- حکمت کے دس حصوں میں سے نو حصے فقط علی ؑ کو عطا ہوئے،
- اولین و آخرین میں سے کوئی اُن کے علم کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ (امام حسن ؑ)

یہ اور ان کے علاوہ ایسی احادیث ہیں جنہیں پیش کر کے صاحب ''ضرب حیدری'' کے طرز استدلال کے مطابق مولیٰ علی ؑ ایک بار نہیں بلکہ کئی بار اُسی طرح باب العلم ثابت ہوتے ہیں جس طرح قاسمی صاحب نے دوسرے صحابہ کرام ﷺ کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن سوال پھر بھی قاسمی صاحب اور اُن کے ہمنواؤں پر قائم رہے گا کہ اُن کے نزدیک حدیث "انا مدينة العلم و عليٌّ بابها" میں مولیٰ علی کو باب العلم فرمانے کی کوئی حکمت یا کوئی مفاد ہے یا نہیں؟

تمام علماء ابواب العلم کیوں نہیں؟

پیر شیخ الحدیث والتفسیر نے حدیث "اصحابي كالنجوم" سے تمام صحابہ ﷺ کو علم کے دروازے ثابت کرنے کی کوشش میں مولیٰ علی ؑ کے باب العلم ہونے کی عظمت کو گھٹانے کی جو سعی لاحاصل کی ہے، اگر اس

کو درست تسلیم کیا جائے تو پھر تو تب سے اب تک تمام علماء کرام ہر سائل کے حق میں ہی نہیں بلکہ تمام سامعین و قارئین کے حق میں بھی باب العلم ثابت ہوتے ہیں۔ چنانچہ امام ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وإنما كل واحد منهم نجم جائز أن يقتدي به العامي الجاهل بمعنى ما يحتاج إليه من دينه، وكذلك سائر العلماء مع العامة، والله أعلم.

"اور اُن میں سے ہر ایک صحابی نجم (ستارہ) ہے، جائز ہے کہ عام شخص اُس کی پیروی کرے، بایں معنیٰ کہ وہ اپنے دین میں اُس کا محتاج ہے، اور ایسے ہی تمام علماء کرام کا معاملہ عوام کے ساتھ ہے، واللہ اعلم"۔

(جامع بيان العلم وفضله ج٢ ص ٩٢٤)

بتلائیے جب سب صحابہ کرام ﷡ اور علماء عظام رحمۃ اللہ علیہم ضرورت دینیہ کے حل کے لحاظ سے ہر عامی اور اپنے سے چھوٹے عالم کے حق میں باب العلم ہیں تو پھر مولیٰ علی ﷤ کی شان میں فرمانِ نبوی "أنا مدينة العلم وعليٌّ بابها" کا کیا فائدہ ہوا؟

حق بات یہ ہے کہ سیدنا علی ﷤ تمام صحابہ اور سب اہل اسلام کے حق میں باب العلم ہیں۔ صحابہ کرام ﷡ کے حق میں اس طرح کہ جب صحابہ کرام ﷡ کے مابین کسی علمی مسئلہ میں اختلاف ہوا تو اس میں حرف آخر سیدنا علی المرتضیٰ ﷛ کے ارشاد کو سمجھا گیا، جیسا کہ ہم مانعینِ زکوۃ وغیرہ کے مسائل میں لکھ چکے ہیں کہ خلیفۂ اول سیدنا ابو بکر صدیق ﷛ نے مولیٰ علی ﷤ کے قول کو حرفِ آخر قرار دیا، اور یہ بھی ہم کئی بار لکھ چکے ہیں کہ ترجمان القرآن سیدنا ابن عباس ﷛ نے فرمایا ہے کہ جب انہیں سیدنا علی المرتضیٰ ﷛ سے کوئی بات مل جاتی تو پھر وہ کسی دوسری طرف رُخ نہیں فرماتے تھے، اور غیر صحابہ کے حق میں مولیٰ علی ﷤ کے باب العلم ہونے کا اس سے وقیع ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اُس علم کے مؤسس وموجد ہیں جس کے بغیر کوئی عربی اور عجمی شخص عالم ہو ہی نہیں سکتا، وللہ الحمد۔

مولیٰ علی ﷛ کے باب العلم ہونے کی نبوی توضیح

مجھ ناکارہ کے ذہن میں سیدنا علی المرتضیٰ ﷛ کے باب العلم ہونے کی ایک توجیہ آئی ہے، اگر اُس میں غور کیا جائے تو مولیٰ علی ﷛ کے باب العلم ہونے کی ایک نبوی توضیح سامنے آتی ہے۔ وہ یہ کہ حدیث پاک میں ہے کہ نبی کریم ﷺ سے نزولِ قرآن کی تکمیل ہوئی اور سیدنا علی المرتضیٰ ﷛ سے تاویلِ قرآن کی تکمیل ہوئی۔ حضور ﷺ

تمام علوم کا مدینہ ہیں جبکہ تمام علوم کا سرچشمہ قرآن کریم ہے اور مولیٰ علی علیہ السلام ان علوم کا باب ہیں۔ حضور ﷺ نے نزولِ قرآن کی تکمیل کے مراحل میں جس قدر جنگیں کیں اُن تمام جنگوں میں مولیٰ علی رضی اللہ عنہ سرفہرست تھے حتیٰ کہ پرچم نبوی ﷺ بھی اُنہیں کے مبارک ہاتھوں میں ہوتا تھا۔ نیز جنگوں کے علاوہ مخالفینِ اسلام کے ساتھ معاہدے بھی ہوئے اور مولیٰ علی رضی اللہ عنہ نہ صرف یہ کہ ہر معاہدہ کے متن سے آگاہ تھے بلکہ اُس کے کاتب بھی وہ خود تھے۔ پھر اگر اُن معاہدوں کی تنسیخ کی ضرورت پیش آئی تب بھی وہ ناگزیر ثابت ہوئے، حتیٰ کہ ایک آدھ مرتبہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بھیجا گیا تو اُن کے پیچھے سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو بھیجنا پڑا۔ چونکہ یہ تمام امور وحیِ الٰہی کی روشنی میں طے ہوتے رہے اور مولیٰ علی رضی اللہ عنہ حضرت ھارون علیہ السلام کی طرح عملاً اِن میں شریک کار رہے اس لیے وہ تفسیرِ قرآن، منشاءِ ایزدی اور مزاجِ نبوی ﷺ کی معرفت میں ماہر ہو گئے، اسی لیے اُن کی شان میں فرمایا گیا کہ ”علی قرآن کے ساتھ اور قرآن علی کے ساتھ“ پھر جب اُن کے دورِ خلافت میں اہلِ اسلام کے ساتھ بوجوہ جنگ کرنے کی نوبت آ گئی تو انہوں نے جنگیں تو کیں مگر جنگوں کے تمام امور میں ترمیم فرما دی، اسی ترمیم کو ایک حدیث میں تاویلِ قرآن کے ساتھ موسوم کیا گیا۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے کہ ”ہم نے نزولِ قرآن کی تکمیل میں جنگیں کیں اور ”خـاصِـفُ الـنـعـل“ یعنی علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ تاویلِ قرآن پر جنگیں کرے گا“۔ اہلِ اسلام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ مسلمان باغیوں کے خلاف جنگ کرنے میں سیرتِ نبوی ﷺ کا نمونہ مولیٰ علی رضی اللہ عنہ کی عملی جنگوں کے علاوہ کہیں نہیں ملتا۔

قوموں کے نشیب و فراز اور جنگی امور کے شرعی ماہرین پر یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ جنگی معاملات میں حالتِ جنگ و امن کے تمام اصول و قوانین کو سامنے رکھتے ہوئے قدم اٹھانا ہوتا ہے جس کے لیے تمام اصول و ضوابط کا ازبر اور مستحضر ہونا لازمی ہوتا ہے، اور ظاہر ہے کہ شرعی جنگ میں جو قانون چلتا ہے وہ قرآن و سنت پر مبنی ہے اور قرآن و سنت حضور ﷺ کی عملی زندگی کا نام ہے اور چونکہ مولیٰ علی رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر اس عملی زندگی کا عالم دوسرا کوئی شخص نہیں ہے اسی لیے بابُ العلم فقط اُنہیں کو فرمایا گیا ہے۔ والحمد لله علىٰ فضله.

علمی جہت سے افضلیتِ مرتضوی

بعض علماء کرام نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہر ایک کی افضلیت کا خاص پہلو ذکر کیا ہے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی اعلمیت کو اُن کا خصوصی وصف قرار دیا ہے۔ چنانچہ امام عبدالحیی الکتانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وعلي أفضلهم من جهة العلم.

''اور علمی جہت سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ اُن سب سے افضل ہیں''۔

(التراتیب الإداریة ج۲ ص۱۵۹)

ایک اور مقام میں لکھتے ہیں:

وقد سبق ويأتي عن جماعة أن علياً كان أفضل الصحابة من جهة العلم.

''پہلے ذکر ہو چکا ہے اور عنقریب ایک جماعت کا بیان آئے گا کہ علمی جہت سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے افضل تھے''۔

(التراتیب الإداریة ج۲ ص۲٤٦)

پیچھے آپ امام ابن جوزی اور دوسرے علماء کرام کے حوالے سے پڑھ چکے ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ علم میں اس قدر فائق تھے کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس سلسلے میں اُن کے محتاج تھے۔ لہٰذا یہاں یہ پہلو عقل کی آنکھ سے اوجھل نہیں رہنا چاہیے کہ علمی جہت وہ جہت ہے جس کی بنا پر تمام فرشتوں کو ابوالبشر سیدنا آدم علیہ السلام کے سامنے گھٹنے ہی نہیں بلکہ ماتھے بھی ٹیکنے پڑے تھے۔





سیدنا علی ؓ کے لیے حکمت کے نو حصے

﴿٣٤﴾ أخبرنا أبو علي بن هلال سماعاً،أنبانا أبوالحسن ابن البخاري، أخبرنا القاضي أبوالمكرم الأصبهاني في كتابه،أخبرنا أبوعلي الحداد، أخبرنا أبونعيم الحافظ، أخبرنا أبو أحمد الغطريفي، حدثني أبوالحسين بن أبي مقاتل،أخبرنا محمد بن عبيد بن عتبة، أخبرنا محمد بن علي الوهبي الكوفي، أخبرنا أحمد بن عمران بن سلمة، وكان ثقة عدلاً مرضياً، أخبرنا سفيان الثوري، عن منصور عن إبراهيم،عن علقمة،عن عبد الله، قال:

كنت عند النبي ﷺ،فسئل عن علي ؓ،فقال:قُسِّمَتِ الحكمةُ عشرة أجزاء فأعطي علي تسعة أجزاء والناس جزءاً واحداً.

كذا رواه الحافظ أبونعيم في الحلية.

﴿٣٤﴾ حضرت علقمہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: ہم نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر تھے کہ سیدنا علی المرتضیٰ ؓ کے متعلق دریافت کیا گیا تو حضور ﷺ نے فرمایا: حکمت دس حصوں میں تقسیم کی گئی، پس نو حصے علی کو دیئے گئے اور ایک حصہ دوسرے لوگوں کو دیا گیا۔

اسی طرح اس حدیث کو حافظ ابونعیم نے "حلیة الأولیاء" میں روایت کیا ہے۔

(حلية الأولياء ج١ ص١٠٤ حديث١٩٨ ،وط: ج١ ص٦٥؛تقريب البغية للهيثمي ج٣ص٨٥حديث ٣٢٥٤؛سنن الأصفهاني ج٢ ص٥٦٠حديث٣٤٦٩؛المناقب للمغازلي ص٢٨٦حديث٣٢٨؛ تاريخ دمشق ج٤٢ص٣٨٤؛مختصر تاريخ دمشق ج١٨ص١٧؛كنزالعمال ج١١ص٦١٥ حديث٣٢٩٨٢،وج١٣ص١٤٦حديث٣٦٤٦١؛مطالب السؤول ص٦٠،وط: ص ٧٣؛ الكواكب الدرية للمناوي ج١ ،القسم الأول ص٩٨)

حدیث "قُسِّمَتِ الحِکْمَةُ" کی تحقیق

امام ذہبی اس حدیث کو احمد بن عمران بن سلمہ کے ترجمہ میں لائے ہیں اور لکھا ہے: "لایُدریٰ من ذا" (معلوم نہیں کہ یہ کون ہے؟) اور آخر میں لکھا ہے: "فهذا كذب" (یہ حدیث جھوٹی ہے)"۔

(ميزان الاعتدال ج١ ص٢٦٦)

اس پر حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے حافظ ابونعیم سے احمد بن عمران بن سلمہ کے حق میں پہلے یہ الفاظ نقل کیے ہیں: "کان عدلاً ثقةً مرضیاً" (وہ عادل، ثقہ اور پسندیدہ شخص تھے) پھر لکھا ہے:

وفي هذا مخالفة لما ذكره المصنف.

"اور اس میں مصنف (ذہبی) نے جو کچھ ذکر کیا ہے، اس کی مخالفت ہے"۔

(لسان الميزان ج۱ ص۳۵۴، ۳۵۵، ط: ج۱ ص۵۵۸)

نیز امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کا احمد بن عمران بن سلمہ کے بارے میں "لایُدریٰ من ذا" (نہ معلوم یہ شخص کون ہے؟) لکھنا بھی مضر نہیں ہے، کیونکہ اُن کا کسی کو نہ جاننا اُس کے مجہول ہونے کی دلیل نہیں ہوسکتی، ممکن ہے کوئی راوی ایک محدث کے نزدیک مجہول ہو مگر دوسرے کے نزدیک معروف ہو۔ چنانچہ حافظ ابن عساکر نے اس حدیث کو دو سندوں سے ذکر کیا ہے، ایک یہی سند جو مصنف نے حافظ ابونعیم سے نقل فرمائی ہے اور دوسری وہ سند جس میں انہوں نے احمد بن عمران بن سلمہ کا تعارف کرایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

أحمد بن عمران بن سلمة بن عجلان، مولیٰ یحییٰ بن عبد الله.

"احمد بن عمران بن سلمہ بن عجلان، یحییٰ بن عبداللہ کا غلام ہے"۔

(تاريخ دمشق ج۴۲ ص۳۸٤)

جب یہ معلوم ہوگیا کہ احمد بن عمران بن سلمہ، یحییٰ بن عبداللہ کا غلام تھا تو پھر ذہبی کے نزدیک اس کا مجہول ہونا مضر نہیں، لیکن حافظ رحمہ اللہ کی مذکور الصدر عبارت کے بعد ایک آدھ جملہ یوں بھی مرقوم ہے:

وقال الأزدي: مجهول، منكر الحديث، وأسند له هذا الحديث عن العتبي المذكور وقال: إن العتبي تفرد به.

"ازدی نے کہا: یہ مجہول ہے، اس کی حدیث تسلیم نہیں کی جاتی، اور ازدی نے اس کی اسی حدیث کو عتبی مذکور سے ذکر کیا اور کہا: عتبی اس کی روایت میں تنہا ہے"۔

(لسان الميزان ج۱ ص۳۵٤، ۳۵۵، ط: ج۱ ص۵۵۸)

ممکن ہے کوئی ذہنی مریض حافظ رحمہ اللہ کے اس جملہ سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے تو ہم پہلے سے آگاہ کر دیتے ہیں کہ یہ حافظ رحمہ اللہ کا مختار قول نہیں، کیونکہ خود ازدی ہی اُن کے اور دوسرے محدثین کے نزدیک مختار (پسندیدہ) شخص نہیں ہے۔ چنانچہ امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ ابان بن اسحاق کے حالات میں پہلے اُن کے

خلاف ابوالفتح ازدی کی یہ جرح لائے ہیں:"قال أبو الفتح الأزدي متروک" (ابوالفتح الازدی نے کہا: یہ متروک ہے) پھر لکھا ہے:

قلتُ: لا يعرک، فقد وثقه أحمد العجلي، وأبو الفتح يسرف في الجرح، وله مصنف كبير إلى الغاية في المجروحين، جمع فاوعىٰ، وجرح خلقاً بنفسه لم يسبقه أحد إلى التكلم فيهم، وهو المتكلم فيه.

"میں کہتا ہوں: اس کو ترک نہیں کیا گیا، بیشک محدث احمد العجلی نے اس کی توثیق کی ہے، اور ابوالفتح الازدی جرح کے حکم میں زیادتی کرتا ہے، اس کی ایک انتہائی ضخیم تصنیف ہے جو اس نے مجروحین کے ذکر سے بھر دی ہے، اور ایک جم غفیر کو اپنے طور پر مجروح کہا ہے، اس سے پہلے اُن راویوں کے خلاف کسی نے کلام نہیں کیا، اور خود محدث ازدی میں کلام ہے"۔

(میزان الاعتدال ج۱ ص۱۱۷)

خود حافظ رحمۃ اللہ علیہ احمد بن شبیب بصری کے حالات میں پہلے ابوالفتح ازدی کا یہ قول لائے ہیں: "قال أبو الفتح الأزدي منكر الحديث غير مرضي" (ابوالفتح الازدی نے کہا: یہ منکر الحدیث، نہ پسندیدہ ہے) پھر لکھا ہے:

قلتُ: لَمْ يلتفتْ أحدٌ إلى هٰذا القولِ بل الأزديُ غير مرضي.

"میں کہتا ہوں: کسی نے اس قول کی طرف توجہ نہیں کی بلکہ ازدی ہی ناپسندیدہ ہے"۔

(تهذيب التهذيب ج۱ ص۶۷، وط: ج۱ ص۲۶)

بعض معاصرین کی بے قاعدگی

کچھ عرصہ قبل ہمارے بعض ساتھیوں نے سیدنا علی المرتضیٰ علیہ السلام کی اعلمیت کے ثبوت میں (ماہنامہ سوئے حجاز کے شمارہ جات میں) متعدد دوسری احادیث کے ساتھ ساتھ زیر بحث حدیث بھی ذکر فرمائی تھی تو اس پر بعض غیر معتدل لوگوں نے اعتراض کیا تھا اور کہا تھا کہ حافظ ابن کثیر کے نزدیک یہ حدیث موضوع ہے۔ لہٰذا یہاں ہم پہلے ابن کثیر کا اعتراض نقل کرتے ہیں پھر اس کا جائزہ لیں گے۔ حافظ ابن کثیر یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"حافظ ابن عساکر اس حدیث پر خاموش رہے ہیں اور انہوں نے اس پر تنبیہ نہیں فرمائی، حالانکہ

یہ حدیث منکر بلکہ موضوع ہے، اس سند کے ساتھ سفیان ثوری پر چڑھادی گئی ہے، جس شخص نے اس کو گھڑا اور جھوٹ باندھا، اللہ اس کو رسوا کرے"۔

(البدایۃ والنہایۃ ج۷ ص ۵۹۳)

یہ بات درست ہے کہ اکثر مقامات پر حافظ ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ احادیث موضوعہ پر حکم لگاتے ہیں، لیکن جب اُنہیں کسی حدیث پر وضع کا حکم لگانا مشکل ہو تو وہ اُس حدیث کو مختلف سندوں سے درج کرتے ہوئے آگے نکل جاتے ہیں، یہاں بھی انہوں نے ایسا ہی کیا ہے اور اس حدیث کو دو سندوں کے ساتھ بیان فرما کر سکوت اختیار کیا ہے، اور کسی محدث کی اصلی اور بنیادی ذمہ داری ہوتی ہی یہی ہے کہ وہ مکمل سند کے ساتھ حدیث درج کر دے۔ ابن عساکر نے اصل ضابطہ میں کوئی کمی نہیں چھوڑی، لہٰذا اگر کوئی دوسرا شخص اس حدیث کو موضوع وغیرہ کہے تو اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ وضاحت کرے کہ یہ حدیث سند یا متن کی فلاں خامی کی وجہ سے ضعیف یا موضوع ہے۔ ابن کثیر نے اس ضابطہ کو نظر انداز کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ حدیث منکر بلکہ موضوع ہے، اور یہ اُن کا محض تحکم ہے جو اصول کی دنیا میں کسی طرح قابل قبول نہیں ہوتا۔

بعض مصنفین کے بارے میں احتیاط

جن غیر معتدل لوگوں نے ابن کثیر کے تحکم سے تائید حاصل کرنے کی کوشش کی انہیں یقیناً یہ معلوم ہے کہ ابن کثیر وغیرہ متشددین قسم کے لوگوں سے فضائل کی احادیث میں تو تائید لی جاتی ہے لیکن فضائل کے علاوہ امور میں احتیاط برتی جاتی ہے، مگر اُن غیر معتدل لوگوں کو جب کہیں اور سے تائید نہ مل سکی تو "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا" کے مطابق انہوں نے ابن کثیر کے سخت حکم کو نقل کرنا ہی اپنے حق میں غنیمت جانا۔ سو ایسے تجاہلِ عارفانہ کے ماہرین کو سمجھانا مشکل ہے البتہ ہم اپنے قارئین کرام کے لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ اُن پر ابن کثیر کا طبعی میلان واضح کر دیں۔

اہل سنت میں ابن کثیر کے متعلق ایک محتاط انداز پایا جاتا ہے، اُن سے فضائل کی کسی حدیث کے اثبات یا کسی راوی کی تعدیل کو تو اتمامِ حجت کے طور پر لیا جاتا ہے لیکن ان کی نفی، نکیر اور تجریح پر اعتماد نہیں کیا جاتا۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ بعض مُتَعَنِّتِیْن (سختی کرنے، دشوار چیز کو لاگو کرنے اور درست چیز کو توڑنے والوں) کو ٹوٹ کر چاہتے تھے۔ وہ ابن تیمیہ کے شاگرد ہی نہیں بلکہ اُن کی محبت میں بھی گرفتار تھے، اور علماء کرام نے ابن تیمیہ کو مُتَعَنِّتِیْن میں شمار کیا ہے اور حدیث پاک میں ہے کہ "المرء علیٰ دین خلیلہ" (انسان اپنے گہرے دوست کے دین پر ہوتا

ہے)ابن کثیر پر بھی یہ گہری محبت اثر کرگئی تھی۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ ابن کثیر کے تعارف میں لکھتے ہیں:

وأخذ عن ابن تيمية ففتن بحبه وامتحن لسببه.

"انہوں نے ابن تیمیہ سے علم لیا تو ان کی محبت میں مبتلا ہوگئے اور اسی لیے آزمائش سے دوچار ہوئے"۔

(الدرر الكامنة في أعيان المائة الثامنة ج١ ص٢١٨)

ماضی قریب میں بعض محققین اہل سنت (کتاب "مقام رسول ﷺ" کے مصنف شیخ الحدیث علامہ مولانا منظور احمد فیضی رحمۃ اللہ علیہ) نے بھی چند مصنفین اور بعض تصانیف کے تعارف میں کتاب لکھی تھی، اور ابن تیمیہ سے شدید محبت کے باعث انہوں نے بھی ابن کثیر سے احتیاط کا مشورہ دیا تھا۔ کیونکہ مشہور ہے کہ "للناس فيما يعشقون مذاهب" (لوگ جس چیز میں عشق رکھتے ہیں وہ ان کا مذھب ہوتا ہے) یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ "الجنس يميل إلى الجنس" (جنس جنس کی طرف مائل ہوتی ہے) چنانچہ بہت سے مقامات پر ابن کثیر ابن تیمیہ کی طرف مائل ہوگئے۔ مثلاً ابن تیمیہ نے مذاہب اربعہ کے برعکس طلاق ثلاثہ کا انکار کیا تو ابن کثیر بھی اسی موقف پر چل پڑے۔ ابن تیمیہ نے مشہور حدیث ردالشمس کو موضوع کہا تو ابن کثیر بھی اسی پر ڈٹ گئے۔ ابن تیمیہ نے حدیث مدینۃ العلم کو موضوع کہا تو ابن کثیر بھی اسی روش پر چل دیے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ابن کثیر دمشقی ہیں، اسی لیے وہ نواصب و بنوامیہ کی تعریف کرتے ہیں، اُن کا ناجائز دفاع کرتے ہیں اور اُن کی پردہ پوشی کرنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ دوسری طرف محبانِ اہل بیت پر کبھی واضح اور کبھی مبہم جرح کردیتے ہیں۔ ابن کثیر کی "البداية والنهاية" میں ایسے مقامات بہت آتے ہیں، یہاں ہم بطور نمونہ ایک آدھ مقام کی نشاندہی کررہے ہیں۔ امام احمد بن حنبل حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

سمعتُ رسولَ اللهِ ﷺ يقول: ليرعفن جبارٌ من جبابرة بني أمية على منبري هذا.

"میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: عنقریب ضرور بنوامیہ کے ظالموں میں سے ایک ظالم کی میرے اس منبر پر نکسیر پھوٹے گی"۔

(مسند أحمد ج٢ ص٣٨٦، وط: ج٣ ص٤١٢ حديث ٨٩٨٨، وط: ج٩ ص٧٣، ٧٤ حديث ٨٩٧٨، وط: ج١٤ ص٥٤٧ حديث ٩٠٠٠؛ المحصل لمسند الإمام أحمد بن حنبل ج ١٩ ص

۲۷۸ حدیث ۲۷۶۵۸)

دوسرے مقام پر راوی کا بیان ہے:

فحدثني من رأى عمرو بن سعيد بن العاص رعف على منبر رسول الله ﷺ حتى سال رعافه.

''مجھے اُس شخص نے بیان کیا جس نے عمرو بن سعید بن العاص کو دیکھا کہ منبر نبوی ﷺ پر اس کی نکسیر پھوٹی حتی کہ بہنے لگی''۔

(مسند أحمد ج۲ ص۵۲۲، وط: ج۳ ص۷۷۲ حديث ۱۰۷۷٤، وط: ج۱٦ ص٤٤٤ حديث ۱۰۷٦٤، وط: ج۹ ص۵٦۰ حديث ۱۰۷۱۱؛ المحصل لمسند الإمام أحمد بن حنبل ج۱۹ ص۲۷۸ حديث ۲۷٦۵۹؛ المسند الجامع ج۱۸ ص۳۸۸ حديث ۱۵۱۷۰؛ مجمع الزوائد ج۵ ص۲٤۰، وط: ج۵ ص٤۳۳ حديث ۹۲۲۷، وط: ج۵ ص۳۱۱ حديث ۹۲۲۷؛ تاريخ دمشق ج٤٦ ص۳٦؛ تاريخ الإسلام للذهبي ج۵ ص۲۰٤)

ابن کثیر اس حدیث کے ایک راوی کے متعلق لکھتے ہیں:

قلت: علي بن زيد بن جدعان في روايته غرابة ونكارة وفيه تشيع.

''میں کہتا ہوں: علی بن زید بن جدعان کی روایت میں غرابت اور نکارت ہے اور اس میں تشیع تھا''۔

(البداية والنهاية لابن كثير ج٦ ص۳٤۹)

دوسری طرف جس جابر شخص [عمرو بن سعید بن العاص اُموی] کی نکسیر پھوٹی تھی اس کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہیں:

وعمرو بن سعيد هذا، يقال له الأشدق، كان من سادات المسلمين وأشرافهم في الدنيا لا في الدين، رأى النبي ﷺ وروى عن جماعة من الصحابة.

''اور اِس عمرو بن سعید کو اشدق کہا جاتا تھا، یہ مسلمانوں کے سرداروں اور معزز لوگوں میں سے تھا لیکن دنیا میں، دین میں نہیں۔ اِس نے حضور ﷺ کو دیکھا ہے اور صحابہ کی ایک

جماعت سے روایت کی ہے"۔

(البداية والنهاية ج٦ ص ٣٥٠)

اس عبارت میں ابن کثیر نے دو غلطیاں ہی نہیں بلکہ زیادتیاں کی ہیں:

١۔ اولاً یہ کہ عمرو بن سعید بن العاص اُموی کو مسلمانوں کا سردار اور معزز کہہ دیا جبکہ یہ جابر و لئیم شخص تھا۔

٢۔ ثانیاً یہ کہ اس کو صحابی بنا دیا حالانکہ سید عالم ﷺ کے وصال اقدس کے وقت اس کے باپ کی عمر فقط آٹھ برس تھی۔

سچ فرمایا تھا حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے کہ:

"ابن کثیر "عوالی" اور "عالی" وغیرہ فنون کی تمیز میں محدثین کے طریقہ پر نہیں تھے"۔

(الدرر الكامنة في أعيان المائة الثامنة ج١ ص٢١٨)

ابن کثیر نے یہاں تو جزماً اور حتماً لکھ دیا کہ عمرو بن سعید نے حضور ﷺ کو دیکھا تھا مگر دوسرے مقام پر بعض خدشات کے پیش نظر اُن کی قطعیت میں لچک آگئی مگر وہ پھر بھی اپنی کاری گری دکھا گئے، وہ اس طرح کہ یہاں انہوں نے عمرو بن سعید کو فقط دنیوی طور پر سادات و اشراف مسلمین سے لکھا، دوسرے مقام پر دنیا کی قید اٹھا کر مطلقاً کہہ دیا کہ وہ سادات مسلمین سے تھا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

يقال له إنه رأى النبي ﷺ وكان من سادات المسلمين ومن الكرماء المشهورين يعطي الكثير.

"کہا جاتا ہے کہ اس نے حضور ﷺ کو دیکھا تھا اور وہ سادات مسلمین سے تھا اور مشہور معززین سے تھا، بہت عطا کرتا تھا"۔

(البداية والنهاية ج٩ ص ٧٥)

آیئے ابن کثیر کے اس ممدوح کے چہرہ سے ذرا پردہ اٹھا کر دیکھتے ہیں کہ یہ کون تھا اور کیسا تھا؟ بخاری شریف میں ہے کہ اس نے مکہ معظمہ کی طرف لشکر بھیجنا چاہا تو اس کو جلیل القدر صحابی حضرت ابو شریح (خویلد بن عمرو) رضی اللہ عنہ نے منع کیا اور فرمایا کہ مکہ پر چڑھائی فقط لمحہ بھر کے لیے حضور ﷺ کے لیے حلال تھی بعد میں کسی کے لیے حلال نہیں۔ اس پر اُس نے کہا تھا: میں تم سے بہتر سمجھتا ہوں۔

(بخاري حديث ١٠٤، ١٨٣٢، ٤٢٩٥ ملخصاً)

علامہ انور شاہ کشمیری اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں:

(عمرو بن سعید) والي المدينة من جهة يزيد: ولم يذكر المحدثون سوء حاله، إلا أني رأيت حكاية بالإسناد تدل علىٰ شقاوته، حتى أخشى عليه سلب الإيمان، فلا أدري هل خفيت عليهم أو ماذا؟

"عمرو بن سعید مدینہ مقدسہ پر یزید کی جانب سے گورنر تھا، محدثین کرام نے اُس کے برے حال کا ذکر نہیں کیا، مگر میں نے سند کے ساتھ ایک واقعہ پڑھا ہے جو اس کی بدبختی پر دلالت کرتا ہے، حتیٰ کہ میں اُس کے ایمان کے سلب ہونے کا خدشہ محسوس کرتا ہوں، سو میں نہیں جان سکا کہ آیا محدثین پر اُس کا حال مخفی رہا یا وہ کسی اور سبب سے خاموش رہے؟"۔

(فيض الباري ج١ ص٣٣٦، وط: ج١ ص٢٨٧)

علامہ کشمیری صاحب نے عمرو بن سعید کے بارے میں جن خدشات کا اظہار کیا ہے وہ محض خدشات نہیں بلکہ حقائق ہیں اور محدثین کرام اس شخص کے بارے میں یکسر خاموش نہیں رہے بلکہ انہوں نے ڈھکے چھپے انداز میں اس کا پردہ چاک کر دیا ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی، امام عینی حنفی، اور امام قسطلانی رحمۃ اللہ علیہم لکھتے ہیں:

وعمرو بن سعيد هو ابن العاصي بن سعيد بن العاصي بن أمية القرشي الأموي يعرف بالأشدق، وليست له صحبة ولا كان من التابعين بإحسان.

"عمرو بن سعید، یہ سعید بن العاصی بن سعید بن العاصی بن اُمیہ قریشی اموی ہے، اشدق کے لقب سے معروف ہے، اس کو صحابیت حاصل نہیں تھی اور نہ ہی یہ نیکی میں صحابہ کرام ﷺ کا پیروکار تھا"۔

(فتح الباري ج١ ص٢٦٨؛ عمدة القاري ج٢ ص٢١٢؛ إرشاد الساري ج١ ص٢٩٧؛ التوشيح للسيوطي ص٢٧٨؛ الفجر الساطع ج١ ص٢٥٨)

ابن الملقن اور حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

كان يلقب لطيم الشيطان.

"اس کا لقب لطیم الشیطان (شیطان کا طمانچہ کھایا ہوا) تھا"۔

(تهذيب التهذيب ج٦ ص١٤٩؛ الإعلام بفوائد عمدة الأحكام لابن الملقن ج٣ ص٢٤٩)

امام بدر الدین عینی، امام قسطلانی اور ابن الملقن لکھتے ہیں:

هو عمرو بن سعيد بن العاص المعروف بالأشدق لطيم الشيطان ليست له صحبة، وعرف بالأشدق لأنه صعد المنبر فبالغ في شتم علي ﷺ فأصابه لقوة ولّاه يزيد بن معاوية المدينة.

"یہ عمرو بن سعید بن العاص المعروف اشدق ہے، لطیم الشیطان ہے، اس کو صحبت نبوی حاصل نہیں تھی اور یہ اشدق سے اس لیے معروف ہے کہ اس نے منبر پر چڑھ کر سیدنا علی ﷺ پر سب وشتم کرنے میں مبالغہ کیا تو اس کو لقوہ ہو گیا، اس کو یزید بن معاویہ نے مدینہ پر گورنر مقرر کیا تھا"۔

(عمدة القاري ج١٠ ص٢٦٦؛ إرشاد الساري ج٤ ص٣٦٨؛ الإعلام بفوائد عمدة الأحكام لابن الملقن ج٣ ص٢٤٩)

علی بن زید، جس میں فقط تشیع تھا اور اس پر بھی مکمل اتفاق نہیں، اُس کو اور اس کی حدیث کو ابن کثیر نے "في روايته غرابة ونكارة وفيه تشيّع" سے اڑا دیا اور سادہ لوح مسلمانوں پر رعب ڈالنے کی کوشش کی، حالانکہ عرفِ متقدمین میں تشیع محض حب اہل بیت کا نام تھا جیسا کہ محققین نے تصریح فرمائی ہے، اور دوسری طرف جو بنو امیہ کے ظالموں میں سے ایک ظالم تھا، جو لطیم الشیطان تھا اور جو سیدنا علی ﷺ پر سب وشتم میں مبالغہ کرتا تھا، اس کی تعریف میں رطب اللسان ہو گئے۔ افسوس، صد افسوس کہ ہمارے ہی کچھ لوگ ایسے ابن کثیر سے فضائل میں نہیں بلکہ جرح میں تائید لینے لگے۔ یقیناً یہ کارروائی اُن کے ذہنی عدم توازن پر دلالت کرتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس حدیث کو سنداً کوئی محدث موضوع تو کیا شدید ضعیف بھی ثابت نہیں کر سکا اور امام ذہبی یا ابن کثیر کا اس کے متن پر کذب یا وضع کا حکم لگانا محض تحکم ہے جو لائق التفات نہیں۔

لفظِ حکمۃ کے مزید معانی اور شانِ مرتضوی ﷺ

اس سے قبل حدیث "أنا دار الحكمة وعلي بابها" کے تحت اس لفظ کے نو (۹) معانی اور اُن کی سیدنا علی ﷺ کی علمی شخصیت پر مطابقت بیان ہو چکی ہے۔ یہاں ہم بفضلِ الٰہی اس لفظ کے مزید دلچسپ معانی اور اُن کی سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کی علمی اور روحانی شخصیت پر مطابقت پیش کر رہے ہیں۔

حکمت بمعنی طبعی فہم

امام ابن عطیہ اور امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

الحكمة: المعرفة بالدين، والفقه في التأويل، والفهم الذي هو سجية.

''حکمت: معرفت دین، تاویل کی سمجھ اور ایسی فہم کو کہتے ہیں جو طبعی ہو''۔

(المحرر الوجيز ج۱ ص ۲۱۲؛ تفسير قرطبي ج۲ ص ۱۳۰، وط: ج۲ ص ۴۰۲)

حکمت کی اس تعریف میں فقط لفظِ فہم کو کافی نہیں سمجھا گیا بلکہ ساتھ ہی فرمایا گیا ''الذي هو سجية'' ''سجية'' کا لغوی ترجمہ ہے ''طبیعت اور عادت'' اور اس سے مراد وہ فطری عادت وطبیعت ہے جس پر انسان پیدا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر انسان کی طبعی عادات میں اکثر اُس کے خاندان کی طبعی عادات کا اثر بھی ہوتا ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ عجم کے مقابلہ میں عرب ذہن وذکاء اور عقل وفہم میں زائد ہیں اور یہ بھی متعدد احادیث سے ثابت ہے کہ پورے عرب سے قریش زیادہ افضل ہیں اور قریش سے بنو ھاشم افضل ہیں۔ لہٰذا قریش کے مقابلہ میں بنو ہاشم کا حکمت وفہم میں زیادہ ہونا بھی لازم ہے۔

قریش اور بنو ہاشم کی ذہانت میں فرق

یہاں ہم اپنے قارئین کرام کی دلچسپی کے لیے عام قریش اور ہاشمیوں کی طبعی فہم کے فرق میں پہلے ہاشمیوں کے جد کریم حضرت ھاشم کی فہم پر چند سطور نقل کرتے ہیں پھر سیدنا علی ﷛ کی طبعی فہم کی طرف آئیں گے۔ ہاشمی، ہاشم کی طرف نسبت کی وجہ سے ہے، اور سیدنا ہاشم سیدنا عبدالمطلب کے والدگرامی تھے۔ ان کا اصل نام عمرو تھا، چونکہ وہ شدید قحط سالی میں شوربے میں روٹی کے ٹکڑے کر کے اغنیاء اور فقراء کو برابر کھلاتے تھے اس لیے ان کا لقب ہاشم پڑ گیا اور اسی لفظ نے نام کی جگہ لے لی، حتیٰ کہ مشہور حدیث (قَلَّبْتُ الأرض مشارقها الخ) میں جبریل امین ﷺ کی زبان پر بھی یہی لفظ جاری ہوا تھا۔ اکثر علماء سیرت نے لکھا ہے کہ مکہ میں قحط پڑتا تھا تو بعض خاندان زندگی سے مایوس ہو کر ایک جگہ خیمہ میں اکٹھے ہو جاتے تاکہ عام لوگوں کی نگاہوں سے مخفی رہیں اور بالآخر موت کے منہ میں چلے جائیں۔ چنانچہ علماء کرام لکھتے ہیں:

> ''زبیر بن بکار نے اپنی کتاب ''الموفقیات'' میں حضرت عمر بن عبدالعزیز ﷛ سے روایت کیا ہے کہ قبیلہ قریش کے ہاں زمانہ جاہلیت میں ایک رسم ''اعتفاد'' کے نام سے مروج تھی۔ جب کوئی خاندان مفلس وقلاش ہو جاتا تو وہ شہر سے دور صحرا میں نکل جاتے وہاں جا کر اپنے خیمے نصب کر دیتے پھر ان خیموں میں روپوش ہو جاتے، یہاں تک کہ وہیں فاقہ کشی کے

باعث یکے بعد دیگرے دم توڑ دیتے اور کسی کو خبر نہ ہونے دیتے کہ وہ مفلس اور کنگال ہو گئے ہیں اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ انہیں ایک نوالہ تک بھی میسر نہیں جس سے اُن کا سلسلۂ حیات قائم رہ سکے "حتی نشا هاشم بن عبد مناف فلما ربل وعظم قدره في قومه" (یہاں تک ہاشم بن عبد مناف جوان ہوئے پھر جب قوم میں ان کی قدر و منزلت بلند ہوئی) اور انہیں اس ہولناک رسم کا پتا چلا تو انہوں نے اپنی قوم کو اکٹھا کر کے یہ خطبہ دیا:

''اے گروہِ قریش! قبیلہ کی عزت افراد کی کثرت سے ہوتی ہے اور اہلِ عرب میں تمہیں مال کی فراوانی اور افراد کی کثرت سے برتری حاصل ہے، اور بلاشبہ اس اِعْتِفاد کی رسم نے تمہارے بہت سے خاندانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ میری ایک تجویز ہے اگر آپ لوگ اس کو سنیں۔ قوم نے کہا: فرمائیے، آپ کی ہر تجویز عمدہ ہوتی ہے، لہٰذا آپ حکم فرمائیں ہم تعمیل کریں گے۔ حضرت ھاشم ؓ نے فرمایا: میری رائے یہ ہے کہ تم میں سے جو مفلس اور کنگال ہے ان کو میں دولت مند خاندانوں کے ساتھ ملا دوں اور ہر غنی کے ساتھ ایک فقیر کو مع اس کے کنبہ کے ملا دوں۔ جب تم لوگ اپنے تجارتی کارواں لے کر موسم گرما اور سرما میں شام و یمن کی طرف جاؤ تو تمہارے بینادار بھائی تمہارا ہاتھ بٹائیں اور جب اس کاروبار میں تمہیں نفع ہو تو اس نفع میں تم ان کو شریک کر لو تا کہ وہ تمہارے سایہ میں عزت اور خوشحالی کی زندگی بسر کریں اور فاقہ کشی کے باعث انہیں مرنے کی نوبت نہ آئے۔ اس طرح یہ اعتفاد کی قبیح رسم ختم ہو جائے گی۔ سب نے اس رائے کو بہت پسند کیا تو حضرت ہاشم نے ہر غنی کے ساتھ ایک مفلس خاندان کو ملا دیا اور اس حکمتِ عملی سے ساری قوم کو ایک دوسرے کے ساتھ جمع کر دیا''۔

(تفسير القرطبي ج ۲۰ ص ۱۸۹ ،وط: ج ۲۲ ص ۵۰۲ ؛ الدر المنثور ج ۸ ص ٦٣٦، وط: ج ۱۵ ص ٦٧٤ ؛ التحرير والتنوير ج ۳۰ ص ۵۵۸ ؛ سبل الهدیٰ ج ۱ ص ۲٦۹)

ایسے حالات میں پہلے تو سیدنا ھاشم نے خود بہ کثرت طعام کھلانا شروع کیا اور شوربے میں روٹی کے ٹکڑے بھگو کر امراء اور فقراء کی ٹولیوں کو بڑے بڑے برتنوں میں اکٹھا کھلانے کا اہتمام فرمایا تا کہ معلوم نہ ہو سکے کہ کس نے کتنا کھایا۔ اس موقعہ پر ایک عرب شاعر نے کہا تھا۔

عَـمَـرو الـذي هشـم الثـريـد لـقـومـه
ورجـال مـكـة مُسْنِتُـون عِـجَـاف

''عمرو[ھاشم] نے اپنی قوم کے لیے شوربہ میں روٹی کو بھگویا، درآنحالیکہ مکہ کے لوگ قحط کی وجہ سے لاغر ہو گئے تھے''۔

اُن کے اس جود وکرم کا سلسلہ بڑھتا چلا گیا حتیٰ کہ وہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چرندو پرند تک کے لیے اونٹ ذبح کرانے لگے، اور اُن کے کرم وسخاوت کی شہرت اطراف واکناف میں پھیل گئی، اور جب لوگوں کے دلوں میں ان کی عظمت راسخ ہوگئی تو پھر انہوں نے اس عظیم کارِ خیر میں دوسرے لوگوں کو بھی شریک ہونے کا موقعہ عطا فرمایا۔

چنانچہ علامہ ابن عمر بحرق حضرمی لکھتے ہیں:

''سیدنا ہاشم قحط کے ایام میں تمام اہلِ مکہ کو جمع فرماتے اور اُن کے اہلِ ثروت کو حکم فرماتے کہ وہ فقراء پر خرچ کریں، اس کی برکت یہ ہوتی "حتى يأتي الله بالغيث" (کہ اللہ تعالیٰ بارانِ رحمت نازل فرما دیتا) پھر وہ ایک وفد کے ساتھ قیصر کے ہاں تشریف لے گئے اور اُس سے قریش کے لیے ایک امان نامہ [ویزہ] لکھوایا اور اس امان نامہ کے ساتھ اپنے بھائی مطلب کو یمن کی طرف بغرض تجارت بھیجا، اسی طرح دوسرے بادشاہوں سے بھی ایسے اجازت نامے لیے اور قریش کے تاجروں کو موسمِ سرما اور گرما میں تجارت کے لیے تیار کیا۔ پس وہ گرمیوں میں شام کا رخ کرتے کیونکہ وہاں موسم سرد ہوتا ہے اور سردیوں میں یمن کی طرف جاتے۔ سو اس سے اُن کی روزی میں وسعت آگئی "وانقذهم الله من الخوف والجوع ببركة هاشم" (اور اللہ تعالیٰ نے انہیں خوف اور بھوک سے سیدنا ہاشم علیہ السلام کی برکت سے نکال دیا) سورۃ القریش میں اسی احسان کا ذکر ہے''۔

(حدائق الأنوار في سيرة النبي المختار ملخصاً ص ۹۳، ۹۴)

امام زرقانی اور محمود شکری آلوسی لکھتے ہیں:

''وہ مسافروں کو سوار کیا کرتے، لوگوں کے مالی حقوق اپنی جیب سے ادا کرتے، اللہ کے رسول ﷺ کا نور اُن کے چہرہ پر ضوفشاں رہتا تھا، جو آدمی اُن کی زیارت کرتا اُن کے ہاتھوں کو چوم لیتا، جب بھی وہ کسی چیز کے پاس سے گزرتے تو وہ سجدہ میں گر جاتی، اُن کی سخاوت

بطور ضرب المثل عرب میں مشہور تھی۔ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے قریش کے دو سفروں کا آغاز کیا ایک تجارتی سفر سردیوں میں دوسرا تجارتی سفر گرمیوں میں"۔

(زرقاني على المواهب ج۱ ص۱۳۸؛ بلوغ الأرب ج۲ ص۲۸۳)

اس عظمت وشہرت کی بنا پر سیدنا ھاشم علیہ السلام کے بھتیجے امیہ بن عبد شمس کے دل میں اُن کے خلاف حسد پیدا ہوگیا۔ چنانچہ سیرت نگار حضرات لکھتے ہیں:

"اپنے والدِ گرامی کے بعد ہاشم اپنی خصال حمیدہ کے باعث قوم کے سردار بن گئے، ان کے جود و کرم کا بادل ہر وقت برستا رہتا تھا، امیہ بہ تکلف بڑا بننے کی کوشش کرتا تھا۔ لوگوں نے اسے سمجھایا کہ ہاشم سے ریس چھوڑ دو، لیکن وہ باز نہ آیا اس نے ہاشم کو منافرہ (فیصلہ کے لیے کسی کے پاس جانے) کا چیلنج دیا۔ سیدنا ھاشم نے اپنے عالی منصب کے پیشِ نظر اس چیلنج کو قبول کرنے سے گریز کیا تو لوگوں نے انہیں مجبور کیا کہ وہ اس چیلنج کو قبول کریں۔ اس پر سیدنا ھاشم نے اُمیہ کو فرمایا:

أنافرک علیٰ خمسین ناقة سود الحدق تنحر بمكة والجلاء عن مكة عشر سنين.

"میں تمہارے منافرے کے چیلنج کو قبول کرتا ہوں جو بازی ہار جائے گا وہ ایسی پچاس اونٹیاں ذبح کرے گا جن کی آنکھیں کالی ہوں اور وہ مکہ سے دس سال کے لیے جلا وطنی اختیار کرے گا"۔

امیہ نے یہ شرط منظور کر لی۔ عسفان کے کاہن الخزاعی کو حکم مقرر کیا گیا، دونوں فریق اپنے حامیوں کے ساتھ عسفان روانہ ہوئے۔ اس سے پہلے کہ کاہن کو دونوں فریق اپنی آمد کے مقصد سے آگاہ کرتے اس نے خود ہی بولنا شروع کر دیا:

والقمر الباهرُ والكوكب الظاهر والغمام الماطرُ بالجو من طائر لقد سبق هاشمُ أُميةَ علیٰ مفاخر.

"قسم ہے چمکنے والے چاند کی، دمکنے والے ستارے کی، برسنے والے بادل کی اور فضا میں اُڑنے والے پرندوں کی کہ ہاشم اُمیہ پر مفاخر میں بازی لے گئے"۔

اس پر سیدنا ہاشم نے از خود پچاس کالی آنکھوں والی اُونٹنیوں کو ذبح کیا اور عوام میں اُن کا گوشت تقسیم فرمایا، اور امیہ بازی ہارنے کے باعث دس سال تک شام میں خود اختیار کردہ جلاوطنی کی زندگی گزارتا رہا۔ "فكانت هذه اول عداوة وقعت بين هاشم وأمية، وتوارثت ذلك بنوهما" (سو یہ پہلی عداوت ہے جو سیدنا ہاشم اور اُمیہ کے مابین واقع ہوئی اور اُن دونوں کی اولاد میں چلی)"۔

(أعلام النبوة للماوردي ص ٢٥٢، ٢٥٣؛ سيرة الحلبي ج١ ص٧؛ السيرة النبوية لزيني دحلان مكي ج١ ص٢٠؛ سبل الهدى ج١ ص٢٧١؛ بلوغ الأرب للشكري الآلوسي ج١ ص٢٨٣)

اعتفاد کی ہولناک رسم اور سیدنا ہاشم کے جود و کرم کا یہ مختصر سا تذکرہ پڑھنے کے بعد اگر علماء کرام خصوصاً اور عوام عموماً سورۃ البقرۃ کی مشہور آیت "يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ" کا ماقبل کی آیات کے ساتھ ملا کر مطالعہ کریں تو انہیں سمجھ آجائے گی کہ واقعی بنو ہاشم کو حکمتِ وافرہ عطا تھی۔ ذرا سی توجہ فرمائیں تو راقم الحروف مختصراً عرض کرتا ہے: اس آیت سے ماقبل کی بعض آیات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ خرچ کرنے والوں کو سات سو گنا اور جسے چاہے اس سے بھی بڑھا کر عطا فرماتا ہے۔ [البقرة: ٢٦١] پھر ایک اور آیت میں فرمایا: کہ ایسے لوگوں کو دوگنا پھل دینے والا باغ عطا فرماتا ہے۔ [البقرة: ٢٦٥] پھر تیسرے مقام پر راہِ خدا میں خرچ کرنے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا، وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ. يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّآ أُولُوا الْأَلْبَابِ.

"شیطان ڈراتا ہے تمہیں تنگ دستی سے اور حکم کرتا ہے تم کو بے حیائی کا، اور اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے تم سے اپنی بخشش اور فضل کا، اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا جاننے والا ہے، وہ عطا فرماتا ہے حکمت جسے چاہتا ہے اور جسے عطا کی گئی حکمت تو یقیناً اُسے خیر کثیر دی گئی، اور نصیحت قبول نہیں کرتے مگر باریک عقل والے"۔

[البقرة: ٢٦٨، ٢٦٩]

اب اس پوری تفصیل اور آیات کو مدنظر رکھتے ہوئے شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کے یہ زرّیں تفسیری الفاظ بھی ملاحظہ فرمایئے! وہ لکھتے ہیں:

فيعطيه حكمة الإنفاق لينفق من الحكمة الإلهية، لكونه متصفا بصفاته. ﴿وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا﴾ لأنها أخص صفات الله. ﴿وَمَا يَذَّكَّرُ﴾ أن الحكمة أشرف الأشياء، وأخص الصفات. ﴿إِلَّا أُولُوا الْأَلْبَابِ﴾ الذين نوّر الله عقولهم بنور الهداية فصفاها عن شوائب الوهم، وقشور الرسوم والعادات، وهو النفس.

فجزاء الإنفاق الأوّل، هو الإضعاف، وجزاء الثاني، هو الجنة الصفاتية، المثمرة للأضعاف، وجزاء الثالث، هو الحكمة اللازمة للوجود والموهوب، فانظر كم بينها من التفاوت؟.

﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ﴾ (وہ عطا فرماتا ہے حکمت جسے چاہتا ہے) یعنی خرچ کرنے میں اخلاص اور رضاءِ الٰہی، پس اسے خرچ کرنے کی حکمت عطا فرماتا ہے تا کہ وہ حکمتِ الٰہی سے خرچ کرے، اس لیے کہ وہ صفات الٰہی سے متصف ہے۔ ﴿وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا﴾ (اور جسے عطا کی گئی حکمت تو یقیناً اُسے خیر کثیر دی گئی) کیونکہ یہ اللہ تعالٰی کی مخصوص ترین صفت ہے۔ ﴿وَمَا يَذَّكَّرُ﴾ (اور نصیحت قبول نہیں کرتے) کیونکہ حکمت تمام چیزوں سے معزز ترین چیز اور مخصوص ترین صفت ہے۔ ﴿إِلَّا أُولُوا الْأَلْبَابِ﴾ (مگر باریک عقل والے) یعنی وہ جن کی عقلوں کو اللہ تعالٰی نورِ ھدایت سے منور فرماتا ہے تو انہیں شکوک شبہات، رسم وعادات کی آلودگیوں اور نفس پرستی سے منزہ فرما دیتا ہے۔

سو پہلے خرچ کی جزا دوگنا بڑھانا ہے، اور دوسرے خرچ کی جزا صاف ستھرا اور دوگنا پھل دینے والا باغ ہے، اور تیسرے خرچ کی جزا جود وعطا کو سمجھنے کی حکمتِ لازمہ ہے، پس تم غور کرو کہ ان سب کے درمیان کتنا فرق ہے؟"۔

(تفسير القرآن الكريم لابن عربي ج١ ص١٥٤، ١٥٥)

یعنی راہِ الٰہی میں خرچ کرنے پر کسی کو دوگنا مال، کسی کو دوگنا ثمر والا باغ اور کسی کو حکمت عطا کی جاتی ہے، اور سیدنا ہاشم کی طرح اخلاص والوں کو یہ تیسری جزا عطا ہوتی ہے۔ ہر چند کہ سیدنا ہاشم کو نورِ وحی نہیں پہنچا تھا مگر انہیں

اخلاص وللٰہیت بھرپور طور پر عطا تھی اور اسی کو حکمت کہتے ہیں۔ وہ جو خرچ کرتے تھے اُس میں محض رضاءِ الٰہی کا جذبہ اور زائرین بیت اللہ کی تعظیم مقصود ہوتی تھی، یہی وجہ ہے کہ وہ زور دے کر فرماتے تھے کہ اس مقصد کے لیے فقط حلال ہی خرچ کیا جائے۔ چنانچہ امام صالحی شامی اور امام ابن زینی دحلان مکی رحمۃ اللہ علیہما لکھتے ہیں کہ جب ذی الحج شریف کا چاند نظر آتا تو حضرت ھاشم ایک خطبہ دیتے جس میں ارشاد فرماتے:

"اے گروہ قریش! تم اللہ کے گھر کے پڑوسی ہو، اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس کے متولی ہونے کی عزت عطا فرمائی ہے اور اس کا ہمسایہ بننے کی خصوصیت سے نوازا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے گھر کی زیارت کرنے والے اور اس کا ادب و احترام کرنے والے ابھی آئیں گے اور وہ اس کے مہمان ہوں گے، اور اللہ تعالیٰ کے مہمانوں کی عزت و تکریم کرنے کے تم زیادہ حقدار ہو۔ پس تم اس کے مہمانوں اور اس کے گھر کے زائرین کی عزت کرنا۔ اس گھر کے رب کی قسم اگر میرے پاس اتنا سرمایہ ہوتا تو میں خود ہی یہ سارا بوجھ اٹھاتا۔ میں اپنے پاکیزہ اور حلال مال سے اس مقصد کے لیے خرچ کروں گا، ایسا مال جس کے حاصل کرنے میں نہ قطع رحمی کی گئی ہے اور نہ ظلم روا رکھا گیا ہے اور نہ اس میں کچھ حرام داخل ہے۔ پھر فرماتے:

وأسألكم بحرمة هذا البيت أن لايُخرج رجلٌ منكم من ماله لكرامة زوّار بيت الله ومعونتهم إلا طيّباً لم يؤخذ ظلماً ولم يقطع فيه رحم ولم يؤخذ غصباً.

اور میں تم سے بھی اس گھر کی حرمت کے واسطہ سے التماس کرتا ہوں کہ جو شخص زائرین بیت اللہ کی تعظیم اور اُن کی خدمت کے لیے مالی تعاون کرے تو پاکیزہ مال دے، جس کے حصول میں کسی کے ساتھ نہ ظلم کیا گیا ہو، نہ قطع رحمی کی گئی ہو اور نہ ہی زبردستی چھینا گیا ہو"۔

(سبل الهدىٰ والرشاد ج١ ص ٢٧٠؛ السيرة النبوية لابن زيني دحلان مكي ج١ ص ٢٣؛ بلوغ الأرب ج١ ص ٢٩٤؛ ضياء النبي ﷺ ج١ ص ٤٤٢، ٤٤٣)

خود غور کیجیے! کہاں کسی شخص کا بغض و عناد اور حسد کی وجہ سے مقابلہ بازی میں خرچ کرنا اور کہاں خلوص وللٰہیت سے خرچ کرنا؟ حضرت ھاشم رضی اللہ عنہ کی یہ فکری پرواز اُس حکمت کی بدولت تھی جو انہیں "مَـجِبِيَّة" طبعاً اور فطرتاً حاصل تھی۔ پھر یہی حکمت سیدنا عبد المطلب رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آئی اور وہ بعینہٖ اسی جذبہ و خلوص کے ساتھ خرچ کرتے اور اُن کا بھروسہ بھی رب تعالیٰ پر ایسا ہی تھا۔ یہ وہی عبد المطلب تو ہیں جنہوں نے فرمایا تھا کہ اس کعبہ کا ایک رب

ہے جو اس کی ضرور حفاظت فرمائے گا۔ بتلایئے ہم جو وحیِ متلو اور غیر متلو کے نور کو پانے کے دعویدار ہیں، کیا ہمارے اندر بھی یقین کی وہ دولت ہے، جو وحی کے نور کے بغیر حضرت عبد المطلب رضی اللہ عنہ کو حاصل تھی؟

قرآن کریم بعد میں اترا مگر ان ہستیوں کی سیرت میں قبل از نزولِ قرآن فرمودات قرآن کی جھلک نظر آتی تھی۔ چنانچہ سیرت نگار حضرات نے لکھا ہے کہ حضرت عبد المطلب:

''نذر کو پورا کرنے کا حکم کرتے تھے، محارم کے ساتھ نکاح سے منع کرتے تھے، چور کے ہاتھ کاٹتے تھے، بچیوں کو زندہ درگور کرنے سے منع کرتے تھے، شراب اور زنا کو حرام قرار دیتے تھے، برہنہ طواف کعبہ سے منع فرماتے تھے، حتیٰ کہ اوامر و نواہی سے جو باتیں اُن کے عمل میں تھیں بعد میں اُن میں سے اکثر قرآن و سنت میں آئیں''۔

(السيرة الحلبية ج١ ص٧؛ شرح الزرقاني على المواهب ج١ ص١٥٥؛ السيرة النبوية لابن زيني دحلان مكي ج١ ص٢٣؛ بلوغ الأرب ج١ ص٢٩٥، ٢٩٦ ملخصاً)

امام زرقانی اور امام ابن زینی دحلان مکی لکھتے ہیں:

''حضرت عبد المطلب اول وہ شخص ہیں جنہوں نے غارِ حراء میں اللہ جل جلالہ کی عظمت و جلال میں غور و فکر کے لیے خلوت کی، اور وہ مجابُ الدعاء تھے''۔

(شرح الزرقاني ج١ ص١٣٥؛ السيرة النبوية لابن زيني دحلان مكي ج١ ص٢٢)

اسی خاندان سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بطور نبی منتخب فرمایا گیا اور نبوت مخصوص اور محض رب کے فضل سے عطا ہوتی ہے مگر پھر بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے ان آباء و اجداد کی حکمت و دانائی پر فخر تھا اور آپ فخراً فرماتے تھے کہ میں اُن کا بیٹا ہوں۔ چنانچہ جب غزوہ حنین میں بھگدڑ مچ گئی اور دشمن نے گھیر لیا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سواری سے اتر کر مقابلہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

أنا النبي لا كذب
أنا ابن عبد المطلب.

''میں نبی ہوں کوئی جھوٹ نہیں، میں عبد المطلب کا بیٹا ہوں''۔

(بخاري حديث ٢٨٦٤، ٢٨٧٤، ٢٩٣٠، ٣٠٤٢، ٤٣١٥، ٤٣١٦)

علامہ سید ابو الحسن علی ندوی نے بنو ہاشم کی اس حکمت و دانائی کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد اس کا جو

خلاصہ پیش کیا ہے وہ لائق مطالعہ ہے، وہ لکھتے ہیں:

''بنی ہاشم قبیلۂ قریش کی سنہری اور اہم کڑی تھے، تاریخ وسیر کی کتابوں نے ان کے جو واقعات وحالات ہمارے لیے محفوظ کر دیے ہیں (اور وہ اصل حقیقت سے بہت کم ہیں) اگر ہم حقیقت کا جائزہ لیں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ اُن میں شریفانہ انسانی احساسات کی کتنی نمود تھی، اور ہر چیز میں اعتدال، عقل سلیم، بیت اللہ کی اللہ کی نگاہ میں جو وقعت وحرمت ہے، اس کا پورا احساس، ظلم وحق تلفی سے گریز، عالی ہمتی، کمزوروں ومظلوموں کے ساتھ شفقت وہمدردی، سخاوت وشجاعت۔ مختصر یہ کہ عربوں کے نزدیک "الفروسیة" (ہر طرح کی برتری) کے جتنے اوصاف عالیہ اور صفات حمیدہ ہیں، اور اس میں جتنے بلند ولطیف معانی پوشیدہ ہیں، ان کا جلوہ ان کی سیرت میں ہمیں نظر آتا ہے، یہ وہ سیرت وکردار ہے جو رسول اللہ ﷺ کے آباء کرام کے ہر طرح شایانِ شان ہے، اور آپ نے جس اعلیٰ وبلند اخلاق کی اپنے قول وعمل سے دعوت دی اس کے ساتھ ہم آہنگ''۔

(السيرة النبوية للندوي عربي ص ۷۵، ترجمة: نبي رحمت ﷺ ص ۹۸)

حکمت سے مالا مال جن ہستیوں پر نبی کریم ﷺ کو فخر تھا وہی ہستیاں سیدنا علی المرتضیٰ ؓ کے بھی آباء واجداد ہیں، لہٰذا مولیٰ علی کو "مــجبية" (طبعی، فطری اور موروثی طور پر) بھی حکمت عطا ہوئی۔ یہاں کوئی کہہ سکتا ہے کہ کبھی اللہ تعالیٰ مردہ سے بھی زندہ کو نکالتا ہے۔ بالکل حق ہے مگر خانوادۂ بنو ہاشم پہلے سے زندہ اور ازل سے منتخب شدہ خاندان ہے۔ اگر یہ خانوادہ معنوی طور پر مردہ خاندان ہوتا تو نہ جبریل علیہ السلام اس خاندان کی عظمت بیان کرتے اور نہ حضور اکرم ﷺ اس خاندان کے فرزند ہونے پر فخر فرماتے۔

پھر اسی خانوادہ سے خالقِ کائنات ﷻ نے اپنے فضل سے ایک ہستی کو امام الانبیاء بنایا اور بعد از اعلانِ نبوت دوسری ہستی کو اُس امام الانبیاء علیہم السلام کی گود عطا فرما کر اُسے امام الاولیاء بنا دیا۔

یہاں معاً میرے ذہن میں ایک ایسی حدیث آئی ہے جو "شرح خصائص علي ؓ" کی تصنیف کے دوران کئی بار میری نگاہ میں آئی لیکن میں اسے چھوڑ کر آگے نکل جاتا رہا، اب جب میں نے غور کیا کہ اللہ تعالیٰ نے بنو ہاشم سے حضور ﷺ کو منتخب فرمایا اور حضور ﷺ نے اس خاندان سے مولیٰ علی علیہ السلام کو منتخب فرمایا اور حضور ﷺ کا انتخاب درحقیقت خالق کائنات ہی کا انتخاب ہے تو میں دوبارہ اُس حدیث کی تلاش میں نکلا کہ اگر اس

کے موضوع ہونے پر اتفاق نہ ہوتو اسے یہاں نقل کرنا انتہائی مناسب ہے۔ چنانچہ امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ نے سیدہ فاطمۃ الزہراء علیہا السلام کا نکاح سیدنا علی المرتضیٰ سے کیا تو سیدہ نے عرض کی: یارسول اللہ! آپ نے میرا نکاح ایک فقیر شخص کے ساتھ کردیا ہے، جو کسی چیز کا بھی مالک نہیں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

أما ترضين يا فاطمة أن الله اختار من أهل الأرض رجلين أحدهما أباك والأخر بعلك.

''فاطمہ! کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اہل زمین سے دو شخصوں کو منتخب فرمایا، اُن میں سے ایک تمہارا بابا ہے اور دوسرا تمہارا شوہر؟''۔

(المعجم الكبير ج ١١ ص ٩٤ حديث ١١١٥٣، ١١١٥٤، وط: ج ٥ ص ٢٢٧ حديث ١٠٩٩٠، ١٠٩٩١؛ تاريخ بغداد ج ٤ ص ٤١٨؛ فضائل فاطمة الزهراء ص ٩٩ حديث ١٣٢؛ المستدرك ج ٣ ص ١٣٠، وط: ج ٣ ص ١٤٠ حديث ٤٦٤٥؛ المناقب للخوارزمي ص ١١٢؛ تاريخ دمشق ج ٤٢ ص ١٣٥، ١٣٦؛ مسند فاطمة الزهراء ص ٥٠ حديث ٦٦؛ نزل الأبرار للبدخشاني ص ٦٤)

حافظ ہیثمی فرماتے ہیں:

''اس حدیث کو امام طبرانی نے از ابراہیم بن الحجاج از امام عبدالرزاق روایت کیا ہے، ذہبی کہتے ہیں: یہ ابراہیم غیر معروف ہے، اور اس حدیث کے باقی تمام راوی صحیح حدیث کے راوی ہیں، اور انہوں نے یہ حدیث ایک اور ضعیف سند سے بھی روایت کی ہے''۔

(مجمع الزوائد ج ٩ ص ٢٢١، وط: ج ٩ ص ١٤٤ حديث ١٤٦٥٩، وط: ج ٩ ص ١٠٠ حديث ١٤٦٥٩)

امام علی متقی الہندی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس کی سند حسن ہے۔

(كنز العمال ج ١٣ ص ١٠٨، ١٠٩ حديث ٣٦٣٥٥)

سو پہلے تو سیدنا علی المرتضیٰ کو موروثی طور پر حکمت و طبعی فہم عطا تھی، یعنی اُن کے اندر جوہر قابل موجود تھا، پھر اس جوہرِ قابل کے ساتھ ساتھ اُنہیں آغوشِ نبوی بھی حاصل ہوگئی تو سونے پر سہاگہ ہوگیا۔ اس لیے اگر حکمت کے دس حصوں میں سے نو حصے فقط اُن ہی کے حصے میں آئے ہوں تو یہ بالکل حق ہے۔

حکمتِ کسبی اور عطائی

اس سے قبل طبعی اور موروثی حکمت وفہم پر روشنی ڈالی گئی اب ہم اس کے ساتھ ساتھ کسبی اور عطائی دونوں پر گفتگو کر رہے ہیں۔ یوں تو ارشادِ الٰہی "قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِندِ اللّٰهِ" کے مطابق ہر خیر اللہ ﷻ ہی کی طرف سے ہے تاہم دنیا میں اچھے اسباب اور اکتساب کا حاصل ہونا بھی ایک حقیقت ہے۔ چنانچہ مشاہدہ گواہ ہے کہ اگر کوئی انسان طبعی اور موروثی طور پر ذکی اور فہیم ہو اور پھر اسے مربی اور ناصح بھی اچھا مل جائے تو وہ دیکھتے ہی دیکھتے ایسے کمال کو پہنچ جاتا ہے کہ دنیا دنگ رہ جاتی ہے، اور اگر یہ دونوں چیزیں نہ ہوں تو پھر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ امام راغب اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

ولايبلغ الحكمة إلا أحدُ رجلين: إما مهذب في فهمه، موفق في فعله، ساعده معلم ناصح وكفاية وعمر. وإما إلهي يصطفيه الله فيفتح عليه أبواب الحكمة بفيض إلهي، ويلقي إليه مقاليد جوده، فيبلغه ذروة السعادة، وذلك فضل الله يؤتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم.

"دو میں سے ایک شخص حکمت کو پا سکتا ہے: یا تو وہ جس کو درست عقل وفہم دی گئی ہو، اس کا عمل بھی درست ہو، مشفق ومہربان معلّم اس کی مدد کرے اور اُسے با کفایت روزی اور عمر حاصل ہو۔ یا پھر وہ شخص حکمت کو پا سکتا ہے فیضِ الٰہی جس کی مدد کرے، یعنی اللہ تعالیٰ اسے منتخب فرما لے تو فیضِ الٰہی سے اس پر حکمت کے دروازے کشادہ ہو جاتے ہیں اور اس کے جود وکرم کی کنجیاں اس کے سپرد ہو جاتی ہیں تو وہ سعادت کی چوٹی پر پہنچ جاتا ہے، اور یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے اپنے فضل سے نوازتا ہے، اور اللہ عظیم فضل والا ہے"۔

(كتاب الذريعة إلى مكارم الشريعة للأصفهاني ص١٤٢)

خیال رہے کہ اسلاف کرام نے حکمت کے یہ معانی کسی مخصوص شخص کو مدنظر رکھ کر نہیں لکھے، لہٰذا ان معانی کی روشنی میں غور فرمائیے کہ کوئی ایسا شخص ہے جس کو سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر عطائی اور کسبی حکمت کو سمیٹنے کے مواقع زیادہ نصیب ہوئے ہوں؟

اس بات کو مزید سمجھنے کے لیے درج ذیل عبارت بھی بہت مفید ہے۔ علامہ ابن عاشور لکھتے ہیں:

ومن يشاء الله تعالىٰ إيتاء ه الحكمة هو الذي يخلقه مستعداً إلىٰ ذلک، من سلامة عقله واعتدال قواه، حتىٰ يكون قابلاً لفهم الحقائق منقاداً إلى الحق إذا لاح له، لايصده عن ذلک هوى ولا عصبية ولا مكابرة ولاأنفة، ثم ييسر له أسباب ذلک من حضور الدعاة وسلامة البقعة من العتاة، فإذاانضم إلىٰ ذلک توجهه إلى الله بأن يزيد أسبابه تيسيراً ويمنع عنه مايحجب الفهم فقد كمل له التيسير.

''اللہ تعالیٰ جس شخص کو حکمت دینا چاہتا ہے تو اُسے اُس کے لیے تیار پیدا کرتا ہے، اُسے عقل اور قوائے جسمانی کی سلامتی سے نوازتا ہے، تاکہ وہ حقائق کو سمجھنے کے قابل ہو اور جب حق اُس پر عیاں ہو جائے تو خواہشِ نفس، عصبیت، مخالفت اور بڑائی اُسے حق کو قبول کرنے سے روکے نہیں۔ پھر اُس کے لیے حکمت کو پانے کے اسباب بھی آسان ہوں، حکمت کی طرف بلانے والوں کی بارگاہ میں حاضر ہونا آسان ہو اور وہ جس خطے کا باشندہ ہو وہ غباوت سے سلامت ہو، پھر ان ساری باتوں کے ساتھ وہ اپنی توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف کرلے تو اُس کے حق میں حصولِ حکمت کے اسباب مزید آسان ہو جاتے ہیں اور اس توجہ کی بدولت اُس کی فہم سے تمام حجابات مرتفع ہو جاتے ہیں تو معاملہ مکمل آسان ہو جاتا ہے''۔

(تفسیر التحریر والتنویر لابن عاشور ج٣ ص٦١)

اس عبارت میں پانچ باتیں قابلِ غور ہیں:

١۔ عقل کی سلامتی

٢۔ قوائے جسمانی کا اعتدال

٣۔ حکمت عطا کرنے والوں کا میسر ہونا

٤۔ خطے کا غباوت سے سلامت ہونا

٥۔ توجہ کا اللہ تعالیٰ کی طرف مرکوز ہونا۔

خود غور فرمائیے کہ ان پانچ باتوں میں سے وہ کون سی بات ہے جو کامل طور پر سیدنا علی المرتضیٰ ؑ کی ذات میں موجود نہ تھی؟

۱۔ عقل اس قدر وافر عطا تھی کہ خود حضور ﷺ نے شہادت دی "أعظمهم حلماً" (وہ میری پوری امت سے زیادہ حلم والے) ہیں، اور یہ وہ خوبی ہے جو سیدنا اسماعیل علیہ السلام کو ارزانی ہوئی تھی۔ سیدنا خلیل اللہ علیہ السلام کے اولاد مانگنے پر ارشاد ہوا:

فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ.

"تو ہم نے انہیں مژدہ سنایا ایک حلیم فرزند کا"۔

(الصّٰفّٰت: ۱۰۱)

یہ حلم ہی تھا جس کی بدولت گردن ذبح ہونے کے لیے جھک گئی اور مخلوق کی عقل سراپا سوال ہو کر گویا ہوئی۔

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

سیدنا علی علیہ السلام کو اس حلم و عقل سے اس قدر وافر حصہ عطا ہوا تھا کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس پر حیران ہو کر سراپا استفسار تھے کہ اُن کو قرآن کے سوا کوئی اور چیز بھی حاصل ہے؟ فرمایا: اور تو ہمارے پاس کچھ نہیں مگر اللہ نے قرآن فہمی عطا فرما رکھی ہے۔ (بخاری)

۲۔ سیدنا علی علیہ السلام کے قوائے جسمانی کا کیا پوچھنا، یہ وہ قوائے جسمانی ہیں جن کی قوت و فہم پر ہر میدان کی فتح موقوف تھی۔

۳۔ حصولِ حکمت کے لیے اُنہیں سید الانبیاء والمرسلین ﷺ کی نہ صرف یہ کہ صحبت بلکہ آغوشِ تربیت حاصل ہوئی، پھر سونے پر سہاگہ یہ کہ انہوں نے یہ مربی خود جا کر تلاش نہیں کیا تھا بلکہ اس مربی اعظم ﷺ نے انہیں از خود منتخب فرمایا تھا۔

۴۔ جس خطے میں اُن کی ولادت باسعادت ہوئی اللہ تعالیٰ نے اُس خطے کو اپنے حرم کے لیے منتخب فرمایا، اُسی کو روئے زمین کا وسط (سنٹر) بنایا، وہاں جو شہر ہے اُس کو ام القریٰ قرار دیا، اُس میں جو بیت اللہ ہے اُسے "هُدًى لِّلْعَالَمِينَ" (تمام جہانوں کے لیے سبب ہدایت) بنایا اور اُس کے جوف میں انہیں پیدا فرمایا۔

۵۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی توجہ اس حد تک اللہ تعالیٰ کی طرف مرکوز تھی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: علی کی شکایت نہ کیا کرو، وہ اللہ کی خاطر ناراض ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اُن پر کسی کافر نے تھوک دیا تھا تو انہوں نے اسے

چھوڑ دیا تھا۔

ان پانچوں باتوں کوذہن کے ایک گوشہ میں رکھتے ہوئے درج ذیل حدیث میں جس کرم نبوی ﷺ کاذکر ہے اُس میں بھی غور فرمائیں! نبی کریم ﷺ نے سیدنا علی ؓ کوفرمایا:

وما دعوتُ لنفسي بشيء إلا قد دعوتُ لک بمثله، وما دعوتُ بشيء إلا استجيبَ لي، أوقال: أعطيتُ، إلا أنه قيل لي: لانبي بعدي.

"میں نے اپنے لیے جو مانگا اسی کی مثل تمہارے لیے بھی مانگا، اور میں نے جو دعا مانگی وہ قبول کی گئی، یا فرمایا: میں نے جو بھی مانگا وہ مجھے عطا کیا گیا، مگر یہ کہ مجھے فرمایا گیا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا"۔

(السنن الكبرىٰ للنسائي ج۷ص٤٦٢ حديث٨٤٨، وط: ج٥ص١٥١ حديث٨٥٣٣؛ السنة لابن أبي عاصم ص٥٨٢ حديث١٣١٣؛ خصائص علي ص١٥٧ حديث١٤٨، وط: ص ٢٠٤ حديث ١٤٨؛ أمالي للمحاملي ص٢٠٣ حديث١٨٥؛ المعجم الأوسط ج٨ص٤٧ حديث٧٩١٣؛ تاريخ دمشق ج٤٢ص٣١٠، ٣١١؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٧ص٣٧٧؛ مجمع البحرين ج٣ص٣٧٦ حديث٣٦٨٩؛ مجمع الزوائد ج٩ص١١٠، وط: ج٩ص١٤٠، ١٤١ حديث١٤٦٤٩؛ جمع الجوامع ج١٣ص١١٢ حديث١٢٠١٢؛ الإيماء ج٥ص١٨٨ حديث٤٥٥١)

امام سیوطی لکھتے ہیں: امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہما نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

(جمع الجوامع ج١٣ص١١٢)

دوسری طرف فضلِ الٰہی میں غور فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں ہاشمی خاندان میں پیدا فرمایا، کعبہ معظمہ میں ولادت کی سعادت سے نوازا، پہلی نگاہ میں دیدار نبوی ﷺ سے بہرہ ور فرمایا، پہلی غذا کے لیے آپ دہنِ نبوی ﷺ کا بندوبست فرمایا اور آخر تک کاشانہ نبوی ﷺ اور آغوشِ نبوی ﷺ کو قرارگاہ بنایا۔ للہ بتلائیے! ماسوائے نبوت کے طبعی، اکتسابی، عطائی اور فضل وکرم کی کوئی ایسی اعلیٰ صورت باقی رہ گئی ہے جو ذاتِ مرتضوی کو عطا نہ ہوئی ہو؟ جب اسباب، اکتساب اور فضل کی ساری کی ساری اعلیٰ صورتیں اُن میں جمع ہیں تو پھر خود غور فرمائیے کہ اُنہیں دس میں سے حکمت کے نو (۹) حصے کیونکر نہ عطا ہوں گے؟

حکمت اور خمر (شراب)

یہ عنوان قائم کرنے کی ایک خاص وجہ ہے، اور وہ یہ کہ کچھ عرصہ قبل ہمارے ایک معاصر مقرر (جو اَب دنیا میں نہیں رہے) نے اپنے خطاب میں درج ذیل حدیث بیان کردی تھی۔ امام ترمذی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

حدثنا عبد بن حُميد، قال: حدثنا عبد الرحمان بن سعد، عن ابي جعفر الرازي، عن عطاء بن السائب، عن أبي عبد الرحمان السُّلَمي، عن علي بن ابي طالب قال: صنع لنا عبد الرحمان ابن عوف طعاماً فدعانا وسقانامن الخمر فأخذتِ الخمرُ مِنّا وحضرتِ الصلاةُ، فقدّموني فقرأتُ: قل يا أيها الكافرون لا أعبد ما تعبدون ونحن نعبد ما تعبدون، قال: فانزل الله تعالىٰ: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ﴾ قال ابو عيسىٰ: هذا حديث حسن غريب صحيح.

"عبد بن حمید سے روایت ہے، انہوں نے کہا: ہمیں عبدالرحمان بن سعد نے از ابوجعفر رازی، از عطاء بن سائب، از ابوعبدالرحمان السلمی بیان کیا، انہوں نے سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا، انہوں نے فرمایا: حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ نے ہمارے لیے کھانا تیار کیا، پھر ہمیں مدعو کیا اور شراب پلائی، شراب نے ہماری کچھ عقل لے لی، نماز کا وقت آپہنچا تو انہوں نے مجھے آگے بڑھا دیا، میں نے پڑھا: کہہ دو! اے کافرو تمہیں عبادت کرتا میں اُن کی جن کی تم عبادت کرتے ہو، اور ہم اُن کی عبادت کرتے ہیں جن کی تم عبادت کرتے ہو تو اس پر اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا: ﴿اے ایمان والو! نہ قریب جاؤ نماز کے جب کہ تم نشہ کی حالت میں ہو یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو جو زبان سے کہتے ہو﴾ امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن، غریب، صحیح ہے"۔

(جامع الترمذي ص ٦٨٠ حديث ٣٠٢٦)

روایت مع درایت، نقل مع عقل چاہیے

چونکہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی تحسین وتصحیح فرمائی ہے اس لیے ہمارے معاصر نے اس پر اعتماد کر کے اسے من وعن بیان کر دیا اور درایت سے کام نہ لیا۔ اس پر اہل اسلام میں جو ایک ہیجان پیدا ہوا وہ فطری

تھا، اس بیان کی بہت زیادہ تردید کی گئی، لیکن سب سے زیادہ مؤثر اور وقیع تردید وہ مانی گئی جو علامہ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری حفظہ اللہ تعالیٰ کے خطاب کی صورت میں سامنے آئی تھی، جزاہ اللہ تعالیٰ، مگر افسوس کہ مجھے تا حال اُس خطاب کو سننے کا موقعہ نہیں ملا۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے اُس بیان سے چند روز بعد مجھے بعض احباب نے کئی بار حکم فرمایا کہ اس مسئلہ پر ضرور کچھ لکھئے۔ میں ہر مرتبہ اُن کی فرمائش پر ہنس دیتا اور دل ہی دل میں کہتا: جب اس کی تردید میں ڈاکٹر محمد طاہر القادری ایسے قادر الکلام کا طویل خطاب آچکا ہے تو اَب مزید کچھ لکھنے وغیرہ کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن اب جب لفظ حکمت کے معانی پر گفتگو میں حکمتِ مرتضوی رضی اللہ عنہ زیر بحث آئی تو مناسب معلوم ہوا کہ اس پر کچھ سطور تحریر کر دی جائیں تا کہ ذریعۂ بخشش ہو جائے۔ فنقول وباللہ التوفیق.

ہمارے نزدیک جامع الترمذی کی یہ روایت درایت اور فطری اصولوں کے خلاف ہے، کیونکہ پیچھے آپ پڑھ چکے ہیں کہ حکمت حماقت کی ضد ہے اور شراب ام الخبائث (تمام حماقتوں اور برائیوں کی بنیاد) ہے اور حماقت کا نتیجہ رسوائی ہوتا ہے، اور آپ یہ بھی پڑھ چکے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ علی کو کبھی رسوا نہیں فرمائے گا۔ لہٰذا یہ کیونکر ممکن ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے شراب نوشی کا ارتکاب ہو اور اُس کے نتیجہ میں اُن سے حالت نماز میں اس حد تک غلط الفاظ نکل جائیں کہ معنیٰ ہی یکسر بدل جائے؟

علاوہ ازیں فطری بات ہے کہ ۔

صحبتِ صالح ترا صالح کند
صحبتِ طالح ترا طالح کند

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو بچپن سے آغوشِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تربیت پانے کی سعادت حاصل ہوئی اور اسی تربیت کی بدولت انہیں تمام ذکور سے قبل اسلام و نماز کی سعادت حاصل ہوئی، اور مشاہدہ گواہ ہے کہ کسی حقیقی متقی انسان کی صحبت کی بدولت بدکار شخص نیکوکار بن جاتا ہے، سو جب صحبت کی یہ تاثیر مسلّم ہے تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ جو محض صحبت نبوی میں نہیں بلکہ تربیتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تھے تو اُن پر امام الانبیاء علیہ وعلیہم السلام کی صحبت و تربیت کا کوئی اثر نہیں ہوا ہوگا؟

یہاں یہ امر بھی واضح رہے کہ ترمذی کی اس حدیث کو سورۃ النساء کی مذکورہ بالا آیت کی شان نزول کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور محققین کا اتفاق ہے کہ یہ سورۃ غزوۂ اُحد کے بعد ۳ ہجری میں نازل ہوئی، اور اُس وقت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی عمر مبارک تقریباً ۲۳ یا ۲۴ برس کی تھی۔ بتلایئے! بچپن سے لے کر عمر کے اس حصے تک کیا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو

نزولِ قرآن کے بغیر محض نبوی طرزِ زندگی سے اتنا بھی معلوم نہیں ہوا تھا کہ شراب ایک مضر اور عقل کو ڈھانپ دینے والی چیز ہے؟ یقیناً اُن پر شراب اور ہر برائی کی حقیقت عیاں تھی بلکہ اُنہیں یہ شعور آباؤ اجداد سے ہی منتقل ہوا تھا۔ چنانچہ اُن کے دادا کریم سیدنا عبدالمطلب اور والدگرامی سیدنا ابوطالب ﷺ اپنے فطری شعور اور ہاشمی حکمت کی بدولت شراب کو حرام سمجھتے تھے۔ علماء سیرت لکھتے ہیں:

وكان ممن حرّم الخمر في الجاهلية.

''اور وہ اُن لوگوں میں سے تھے جنہوں نے زمانۂ جاہلیت میں شراب کو حرام کر رکھا تھا''۔

(سبل الهدیٰ ج۱ ص۲۶۷؛ السیرة الحلبیة ج۱ ص۷ و ص۱۸٤؛ السیرة النبویة لابن زیني دحلان مكي ج۱ ص۲۳)

جب یہ خاندان وحی کے بغیر فطرتاً شراب کی برائی سے آشنا تھا تو یہ بات کیسے تسلیم کی جا سکتی ہے کہ اسی خاندان کا ایک شخص جو تقریباً پچھلے پندرہ سولہ سال سے نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا وہ شراب کی برائی اور اُس کے نتیجے میں ظاہر ہونے والی حماقت سے بے خبر تھا؟

جامع ترمذی کی روایت کا جائزہ

اب تک ہماری گفتگو جامع ترمذی کی روایت پر ایک فکری اور درایتی تبصرہ کے طور پر تھی، اب ہم اس کا روایتی (اسنادی) جائزہ لیتے ہیں۔ محدثین کے نزدیک یہ حدیث اپنے متن اور سند دونوں لحاظ سے اختلاف کا شکار ہے، اور یہ اختلاف اِس حدیث کے اُس راوی کی وجہ سے ہے جو چوتھے نمبر پر ہے، یعنی عطا بن سائب، آخری عمر میں ان کا حافظہ قائم نہیں رہا تھا، اسی لیے علماء اسماء الرجال کا فیصلہ ہے کہ ان سے جن لوگوں نے پہلے دور میں احادیث لیں اُن کی احادیث اُن سے زیادہ قابلِ اعتماد ہیں جنہوں نے بعد کے دور میں لیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے جہاں ان کی ثقاہت (وثاقت) بیان کی وہیں یہ بھی بیان کیا کہ ان سے قبل از اختلاط اور بعد از اختلاط حدیث لینے کے بارے میں محدثین کے متعدد اقوال نقل ہیں، پھر انہوں نے ایسے تمام اقوال نقل فرمائے اور آخر میں لکھا:

''میں کہتا ہوں: ہمیں محدثین کے اِس مجموعی کلام سے یہ خلاصہ حاصل ہوا کہ عطاء بن سائب سے سفیان ثوری، شعبہ، زہیر، زائدہ، حماد بن زید اور ایوب کی روایت صحیح ہے اور ان کے سوا کسی

اور شخص کی روایت صحیح نہیں۔ لیکن محدثین نے اِس سے حماد بن سلمہ کی روایت میں اختلاف کیا ہے۔ظاہر یہ ہے کہ حماد نے اُن سے دو مرتبہ حدیث سماعت کی ہے: پہلی مرتبہ ایوب کی معیت میں جیسا کہ امام دارقطنی کا کلام اس کی طرف اشارہ کرتا ہے، اور دوسری مرتبہ اُس دور میں سماعت کی جب عطا ابن سائب بصرہ آئے تھے اور اُن سے جریر اور اُس کے ساتھیوں نے احادیث سنی تھیں''۔

(تهذيب التهذيب ج٥ ص٤٧٤، وط: ج٣ ص١٠٥)

امام مزی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''امام حمیدی نے حضرت سفیان بن عیینہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے حضرت عطا ابن سائب رضی اللہ عنہ سے ایک عرصہ پہلے احادیث سنی تھیں پھر ایک مرتبہ وہ ہمارے ہاں تشریف لائے تو جو احادیث میں نے پہلے سن رکھی تھیں اُن میں سے بعض کی دوبارہ سماعت کی تو معاملہ خلط ملط پایا، لہٰذا میں نے اُن سے اجتناب کیا اور اُن سے حدیث لینا چھوڑ دیا''۔

(تهذيب الكمال ج٢٠ ص٩٢؛ تهذيب التهذيب ج٥ ص٥٧٢)

آخر عمر میں عطاء بن سائب کے حافظہ کی اسی کمزوری کے پیشِ نظر حافظ منذری رحمۃ اللہ علیہ نے زیرِ بحث حدیث کے تحت پہلے ان کے متعلق جرح نقل کی ہے اور آخر میں لکھا ہے:

''اس حدیث کی سند اور متن میں اختلاف ہے۔ سند کا اختلاف یہ ہے کہ اس کو سفیان ثوری اور ابو جعفر رازی نے عطاء بن سائب سے متصلاً روایت کیا ہے اور سفیان بن عیینہ، ابراہیم بن طہمان اور داود بن زبرقان نے عطاء سے مرسلاً روایت کیا ہے۔

اور متن میں اختلاف یہ ہے کہ سنن ابی داود اور ترمذی کا متن وہی ہے جو اوپر ذکر ہوا، جبکہ امام نسائی اور ابو جعفر النحاس کی کتب میں ہے کہ نماز کی امامت حضرت عبد الرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ نے کرائی تھی، اور امام بزار کی مسند میں ہے کہ لوگوں نے ایک شخص کو کہا تو اس نے نماز پڑھائی اور اُس کا نام ذکر نہیں کیا''۔

(مختصر سنن أبي داود ج٢ ص٥٣٩؛ تحفة الأحوذي ج٨ ص٣٧٥)

امام منذری رحمۃ اللہ علیہ نے جامع ترمذی اور سنن ابی داود کے متن کو یکساں قرار دیا ہے لیکن وہ مکمل

یکساں نہیں البتہ تقریباً برابر ہے۔ جامع ترمذی میں حضرت عبدالرحمان بن عوف کا ذکر میزبان کے طور پر ہے جبکہ سنن ابی داود میں وہ مہمان کے طور پر مذکور ہیں۔ حافظ رحمہ اللہ اس فرق کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

واختلف علیٰ عطاء في اسم الداعي وفي اسم المصلي.

''اور حضرت عطاء پر میزبان اور امام کا نام مختلف (گڑبڑ) ہو گیا''۔

(الکافي الشاف في تخریج أحادیث الکشاف ص ۷۷)

اس کے بعد حافظ رحمہ اللہ نے اس گڑبڑ پر جامع ترمذی، سنن ابی داود اور مستدرک سے بطور نمونہ احادیث پیش فرمائی ہیں۔ جامع ترمذی کی حدیث آپ پڑھ چکے ہیں اور سنن ابی داود کی حدیث میں دو فرق ہیں: ایک سند میں اور ایک متن میں۔ سند میں یہ فرق ہے کہ ترمذی کی سند میں حضرت عطاء سے روایت کرنے والا راوی ابو جعفر رازی ہے اور ابوداود کی سند میں اُس کی جگہ پر حضرت سفیان ثوری ہیں، اور یہ مذکورہ بالا اُن چار راویوں میں سے پہلے راوی ہیں جنھوں نے حضرت عطاء سے قبل از اختلاط سماعت کی تھی۔

متن میں یہ فرق ہے کہ سنن ابی داود میں میزبان عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ نہیں بلکہ ایک اور انصاری شخص ہیں اور سیدنا عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ اُس میں مہمان ہیں، البتہ اس میں امامت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی مذکور ہے۔

(سنن أبي داود ج ۳ ص ۴۳۸ حدیث ۳۶۷۱، وط: ص ۶۶۱ حدیث ۳۶۷۱)

اوپر حافظ منذری رحمہ اللہ نے نماز کے امام متعلق جس اختلاف کا اشارہ دیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ نماز کی امامت سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے نہیں بلکہ کسی اور شخص نے کرائی تھی۔ وہ اور شخص کون تھے؟ اس سلسلے میں ''المستدرك'' میں تفصیل موجود ہے۔ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو متعدد سندوں سے روایت کیا ہے، اُن میں سے ایک حدیث از سفیان، از عطاء بن سائب، از عبدالرحمان سلمی ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

دعانا رجل من الأنصار قبل أن تحرم الخمر، فقدم عبد الرحمان بن عوف وصلی بهم المغرب فقرأ ﴿قل یأیها الکافرون﴾ فالتبس علیه..

''شراب کی حرمت سے قبل ایک انصاری شخص نے ہماری دعوت کی تو حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر نماز مغرب کی امامت کی تو انہوں نے پڑھا ﴿قل یا أیها الکافرون﴾ تو اُن پر تلاوت خلط ملط ہو گئی......''۔

اس حدیث پر امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے:

''اس حدیث میں عطاء بن سائب سے متن میں اختلاف ہو گیا، اس کی تین صورتیں ہیں، یہ اُس کی پہلی صورت ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے''۔

المستدرک میں اس کے بعد والی حدیث کی سند میں بھی حضرت سفیان ثوری راوی ہیں اور اُس میں بھی حضرت عبدالرحمان بن عوف ﷺ کی امامت کا ذکر ہے، اور پھر اس کے بعد والی حدیث کی سند میں حضرت سفیان ثوری کا نام نہیں مگر اُس میں سیدنا علی ﷺ کی امامت کا ذکر ہے۔ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے ان سب احادیث کو درج کرنے کے بعد لکھا ہے:

هذه الأسانيد كلها صحيحة، والحكم لحديث سفيان الثوري، فإنه أحفظ من كل من رواه عن عطاء بن السائب.

''ان تمام احادیث کی سندیں صحیح ہیں اور قابل قبول حدیث سفیان ثوری کی ہے، کیونکہ وہ ہر اُس راوی سے بڑے حافظ ہیں جس نے عطاء بن سائب سے اس حدیث کو روایت کیا''۔

(المستدرك ج٤ ص١٤١، ١٤٢، وط: ج٥ ص١٩٦، ١٩٧ حديث٧٣٠٢، ٧٣٠٣، ٧٣٠٤، وط: ج٤ ص١٥٨، ١٥٩ حديث٧٢٢٠، ٧٢٢١، ٧٢٢٢)

ایک اور مقام پر امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ سیدنا علی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

دعانا رجل من الأنصار قبل تحريم الخمر، فحضرت صلاة المغرب فتقدم رجل فقرأ: ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ﴾ فالتبس عليه فنزلت: ﴿لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ﴾.

''شراب کی حرمت سے قبل ایک انصاری شخص نے ہماری دعوت کی تو نماز مغرب کا وقت آ گیا، ایک شخص نے آگے بڑھ کر امامت کی تو اُس نے پڑھا ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ﴾ اُس پر تلاوت خلط ملط ہو گئی تو اس پر یہ آیت اتری: ﴿جب تم نشہ کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب مت جاؤ یہاں تک کہ وہ سمجھنے لگو جو کہتے ہو﴾۔

یہ حدیث صحیح السند ہے اور شیخین نے اسے ذکر نہیں کیا، اور اس حدیث میں ایک بڑا فائدہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ خارجی لوگ اس نشہ کو اور اس تلاوت کو امیر المؤمنین علی بن ابی طالب ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف منسوب نہیں کرتے، اور اللہ تعالیٰ نے سیدنا علی ﷺ کو اس تہمت

سے دور رکھا ہے، کیونکہ وہی تو اس حدیث کے راوی ہیں"۔

(المستدرك ج۲ ص۳۰٦، وط: ج۳ ص۳۰ حدیث ۳۲۵۲ وط: ج۲ ص۳۳٦ حدیث ۳۱۹۹؛ عون المعبود ج۱۰ ص۱۰۷)

یعنی ظاہر ہے کہ یہ عمل اگر سیدنا علی ؓ سے سرزد ہوا ہوتا تو اس حدیث کا مرکزی راوی اُن کے علاوہ کوئی تو اور شخص ہوتا، حالانکہ متصل سند سے سیدنا علی ؓ کے علاوہ کوئی اور صحابی راوی نہیں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ سیدنا علی ؓ اس حدیث کے راوی ہیں اور جس شخص نے شراب پی تھی اور اُس سے تلاوت خلط ملط ہوئی تھی وہ کوئی اور ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس سلسلے میں بعض اُن احادیث کو ترجیح دی ہے جن میں سیدنا علی ؓ کے علاوہ کسی اور شخص کا نماز پڑھانا مذکور ہے۔ چنانچہ وہ ایسی ایک حدیث کے بعد لکھتے ہیں:

هذا أصح طرقه، لأن الثوري سمع من عطاء قبل اختلاطه.

"یہ زیادہ صحیح حدیث ہے، اس لیے کہ سفیان ثوری نے عطاء کے حافظہ کی خرابی سے قبل سماعت کی تھی"۔

(العجاب في بيان الأسباب للعسقلاني ج۲ ص۸۷۳)

تربیت نبوی ﷺ کی تاثیر کہاں؟

اگر بوجہ شرب الخمر نماز میں بھول جانے کا یہ واقعہ سیدنا عبدالرحمان بن عوف کا ہو یا کسی اور صحابی کا ہو بہر حال وہ شرعی جرم کے زمرہ میں نہیں آتا اس لیے کہ ابھی حرمت خمر (شراب) کا حکم نازل نہیں ہوا تھا، تاہم معاشرتی اور فطری طور پر زمانۂ جاہلیت میں بھی اس عمل کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی تھی۔ اس لیے اس عمل کی نسبت سیدنا علی المرتضیٰ ؓ کی طرف کرنا متعدد وجوہ سے درست نہیں۔

۱۔ اوّلاً اس لیے کہ بعض کتب سیرت میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اُنہیں اپنے لعابِ دہن سے گھٹی دی تھی، لہٰذا یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایسی مبارک ومقدس چیز کے ساتھ خمر جیسی رجس اور خبیث چیز جمع ہو؟

۲۔ ثانیاً اس لیے کہ وہ بچپن سے تربیتِ نبوی ﷺ میں تھے اور نبی کریم ﷺ کو تربیت کا اس قدر اہتمام تھا کہ آپ قبل از نزولِ قرآن بھی اپنے افرادِ خانہ کی تربیت قرآنی اصولوں کے مطابق فرماتے تھے۔ بطور مثال ایک واقعہ سماعت فرمایئے! حضرت زید بن حارثہ ؓ (جنہیں زید بن محمد کہا جاتا تھا) فرماتے ہیں کہ اعلان نبوت سے

قبل ایک مرتبہ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ طواف کعبہ کے لیے گیا، وہاں دو بت نصب تھے، ایک کو اساف اور دوسرے کو نائلہ کہا جاتا تھا، دورانِ طواف مشرکین انہیں چھوتے تھے لیکن مجھے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لا تمسحهما فإنهما رجس.

"انہیں نہ چھونا بلاشبہ یہ پلید ہیں"۔

(مسند أبي يعلىٰ ج۱۳ ص ۱۷۰، ۱۷۲ حديث ۷۲۱۲؛ كشف الأستار عن زوائد البزار ج۳ ص ۲۸۳ حديث ۲۷۵۵؛ المستدرك ج۳ ص ۲۱۶، وط: ج٤ ص ۲۲۷ حديث ۵۰۰۹، وط: ج۳ ص ۲۳۹ حديث ٤۹۵٦؛ فضائل الصحابة للنسائي ص ۲۵، ۲٦ حديث ۸۵؛ السنن الكبرىٰ للنسائي ج۷ ص ۳۲۵ حديث ۸۱۳۲؛ المعجم الكبير ج۵ ص ۸۷ حديث ٤٦٦۵؛ دلائل النبوة للبيهقي ج۲ ص ۳٤؛ سير أعلام النبلاء ج۱ ص ٦٦؛ مختصر تاريخ دمشق ج۹ ص ۱۲٤؛ السيرة النبوية لابن كثير ج۱ ص ۳۰٤؛ البداية والنهاية ج۲ ص ۲٤۹، وط: ج۳ ص ٤٤۸، وط: ج۳ ص ۷۷؛ مجمع الزوائد ج۸ ص ٤۱۵ حديث ۱۳۸٦۷، وج۹ ص ٦۹٦ حديث ۱٦۱۸۲، وط: ج۹ ص ۵۱۵ حديث ۱٦۱۸۲؛ المطالب العالية ج٤ ص ۹٦ حديث ٤۰۵۷، وط: ج۱٦ ص ۳۵٤ حديث ٤۰۲٤؛ الخصائص الكبرىٰ ج۱ ص ۱۵۱؛ تهذيب الخصائص الكبرىٰ ص ۷۱)

قرآن کریم میں جس طرح بتوں کو "رجس" فرمایا گیا ہے اسی طرح خمر (شراب) کو بھی "رِجس" کہا گیا ہے۔[المائدة: ۹۰] سو اگر زبانِ نبوی ﷺ اعلانِ نبوت سے قبل بتوں کی "رجس" پر خاموش نہ رہ سکی تو خمر کی "رجس" پر کیسے خاموش رہ سکتی تھی۔

۳۔ ثالثاً اس لیے کہ سیدنا علی ﷺ اس حدیث کے راوی ہیں، سو اگر انہوں نے نشہ کی حالت میں نماز پڑھائی ہوتی اور قراءت میں شرک کی حد تک معنوی تبدیلی کے مرتکب ہوئے ہوتے تو انہیں از خود اس کا شعور نہ ہوتا بلکہ کسی دوسرے کے آگاہ کرنے پر انہیں معلوم ہوتا۔ پس اگر واقعی انہیں کسی اور شخص نے اُن کی اِس غلطی پر متنبہ کیا ہوتا تو اُس شخص سے یہ حدیث کیوں نہ روایت ہوئی؟ جب سیدنا علی ﷺ کے علاوہ کوئی اور شخص اس حدیث کا راوی ہی نہیں تو لامحالہ اس عمل کا مرتکب اُس شخص کو ماننا پڑے گا جس کا ذکر اوپر اُن احادیث میں آچکا ہے جنہیں محدثین کرام نے زیادہ قابلِ قبول قرار دیا ہے۔

حکمت بہ معنیٰ نورِ قلب

علماءِ اسلام نے حکمت کا ایک معنیٰ نور بھی کیا ہے، چنانچہ مفسرین کرام امام مالک رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

الحكمة نورٌ يقذفه الله في قلب العبد.

''حکمت ایک نور ہے جو اللہ تعالیٰ بندے کے قلب میں ڈال دیتا ہے''۔

(الجواهر الحسان في تفسير القرآن للثعالبي ج۱ ص ۳۲۱)

یوں تو نعمتِ اسلام سے بہرہ ور ہر خوش نصیب کو نور عطا ہوتا ہے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

أَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ.

''اللہ ﷻ نے جس شخص کا شرحِ صدر کر دیا تو وہ اپنے رب کی طرف سے نور پر ہے''۔

(الزمر:۲۲)

لیکن اُس خوش نصیب کی سعادت وحکمت کا اندازہ کون کر سکتا ہے جس کی اولین نگاہ نورِ الٰہی پر پڑی، نور (آبِ دہنِ نبوی) اُس کی پہلی غذا بنی اور جس کی اُس گھر میں تربیت ہوئی جہاں شب وروز آیات وحکمتِ الٰہیہ کی تلاوت ہوتی تھی۔ دیکھئے یہ وہ گھر ہے جس میں مختلف قبائل وخاندانوں سے تعلق رکھنے والی خواتین آئیں تو وہ دوسری خواتین سے ممتاز ہو گئیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں پہلے تو اللہ تعالیٰ نے ازواجِ مطہرات کو فرمایا:

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ.

''اے نبی کی ازواجِ (مقدسہ) تم عورتوں میں سے کسی عورت کی مانند نہیں ہو''۔

(الأحزاب:۳۲)

اس کے بعد آیتِ تطہیر آئی اور پھر ارشاد فرمایا:

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ.

''اور یاد رکھو اللہ کی آیتوں اور حکمت کی باتوں کو جو پڑھی جاتی ہیں تمہارے گھروں میں''۔

(الأحزاب:۳٤)

''فِيْ بُيُوْتِكُنَّ'' (تمہارے گھروں میں) کے لفظ میں توجہ کیجئے اور پھر اندازہ فرمائیے کہ اُس ہستی کو حکمت

کس قدر عطا ہوئی ہوگی جسے ہاشمی خانوادے کا سپوت ہونے کے باعث موروثی طور پر بھی حکمت ودیعت ہوئی تھی، اور پھر انہیں حضور ﷺ اور سیدتنا خدیجۃ الکبریٰ علیہا السلام کی آغوش میں پلنے بڑھنے اور ہمیشہ اسی گھر میں رہنے کا شرف حاصل ہوا؟ خیال رہے کہ سیدتنا خدیجۃ الکبریٰ سلام اللہ علیہا کے علاوہ باقی تمام ازواجِ مقدسہ اِس مقدس گھر میں بعد میں آئیں مگر سیدنا علی المرتضیٰ علیہ السلام کو اُن سب سے پہلے یہ مقدس کاشانہ اور آغوشِ نبوی ﷺ کا آشیانہ نصیب ہوا تھا۔ لہٰذا خود سوچئے کہ وہ موروثی حکمت (یعنی جوہرِ قابل) کے ساتھ ساتھ اس نزولی، عطائی اور اکتسابی حکمت سے کس قدر بہرہ ور ہوئے ہوں گے؟ بلاشبہ جس طرح امہات المومنین کو آیات وحکمتِ الٰہیہ کے نزول کی بدولت دوسری معزز خواتین پر قیاس کرنا قرآن کریم کے منافی ہے اسی طرح سیدنا علی علیہ السلام اور کاشانہ نبوی ﷺ کے ہر ہر فرد کو دوسری معزز ہستیوں پر قیاس کرنا بھی قرآن کے منافی ہے۔ یہ حکمتِ وافرہ اہل بیت کی خصوصیت ہے، یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اہل بیت کرام علیہم السلام کی اس مخصوص حکمت پر اللہ ﷻ کا شکر ادا فرماتے تھے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ حمید بن عبداللہ المدنی سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

ذُكِرَ عند النبي ﷺ قضاء قضى به علي بن أبي طالب، فأعجب النبي ﷺ فقال: الحمد لله الذي جعل فينا الحكمة أهل البيت.

''نبی کریم ﷺ کے سامنے ایک فیصلے کا ذکر کیا گیا جو سیدنا علی المرتضیٰ علیہ السلام نے کیا تھا، وہ فیصلہ نبی کریم ﷺ کو پسند آیا تو آپ نے فرمایا: اُس اللہ کے لیے تمام تر حمد ہے جس نے ہم اہل بیت میں حکمت پیدا فرمائی ہے''۔

(فضائل الصحابة ج۲ ص۸۱۲ حديث۱۱۱۳؛ ذخائر العقبىٰ ص۱۰۳؛ الرياض النضرة ج٤ ص١٤٦؛ الصواعق المحرقة ص١٥١؛ جواهر العقدين للسمهودي ص٢٤٢، ٢٤٣؛ ينابيع المودة ج١ ص٢٢٥ وج٢ ص١٧٤؛ قضاء علي بن أبي طالب ص٢٤٧)

ایسی ہی مخصوص وجوہ کی بنا پر ہمارے ائمہ کرام رحمہم اللہ کو فرمانا پڑا کہ اہل بیت پر کسی کو قیاس نہ کیا جائے، جیسا کہ ہم امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا ارشاد نقل کر چکے ہیں۔ نیز اس سلسلہ میں خود ایک فرمانِ مرتضوی بھی منقول ہے۔ ابوالبختری بیان کرتے ہیں کہ سیدنا علی علیہ السلام نے ایک خطاب میں ارشاد فرمایا:

ألا إن خير هذه الأمة بعد نبيها ابوبكر وعمر، فقال رجل: وأنت يا أمير

المؤمنين ؟ فقال: نحن أهل البيت لا يوازينا أحد.

''یاد رکھو! نبی کریم ﷺ کے بعد اس امت کی بہترین ہستیاں حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما ہیں، ایک شخص نے کہا: یا امیر المومنین اور آپ؟ فرمایا: ہم اہل بیت ہیں ہمارے ساتھ کسی کا موازنہ نہیں ہو سکتا''۔

(جمع الجوامع ج۱۱ ص۵۲ حدیث۲۱۹ و ج۱۳ ص۱۰۳ حدیث۹۰۵۰)

امام محب الطبری رحمۃ اللہ علیہ نے ایسا فرمان خود نبی کریم ﷺ سے بھی نقل کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

عن أنس ﷺ قال: قال رسول الله ﷺ: نحن أهل بيت لا يقاس بنا أحد.

''حضرت انس ﷺ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہم اہل بیت ہیں ہم پر کسی کو قیاس نہ کیا جائے''۔

(ذخائر العقبیٰ ص۱۰۳؛ کنوز الحقائق ج۲ ص۲۳۲؛ کنز العمال ج۱۲ ص۱۰۴ حدیث ۳۴۲۰۱؛ ینابیع المودة ج۲ ص۶۸، ۸۳، ۱۱۴، ۱۱۷ و ج۱ ص۴۵۹)

اِس کی اور اس سے پہلی حدیث کی سند میرے سامنے نہیں ہے اس لیے فی الوقت میں سند کے بارے میں کچھ کہنے سے قاصر ہوں، البتہ ان دونوں حدیثوں کا متن قرآن کریم کی مذکورہ بالا آیات، احادیثِ صحیحہ، عقلِ سلیم اور امت کے تعامل کے عین مطابق ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

نو حصے حکمت عطا ہونے کی ایک فطری وجہ

امتیازاتِ اہل بیت کرام کی متعدد وجوہ ہو سکتی ہیں لیکن سب سے اہم وجہ اُن کے گھر پر آیات و حکمتِ الٰہیہ کی تلاوت کا ہونا ہے اور یہی منصوص و مخصوص وجہ ہے، پھر اہل بیت میں سیدنا علی ﷺ کے سب سے زیادہ ممتاز ہونے کی وجہ بھی یہی ہے۔ کیونکہ اُنہیں ہاشمی حکمت و فہم کے ساتھ ساتھ نزولِ وحی سے بھی قبل یہ گھر اور یہ آغوش حاصل ہو گئی تھی، یہی وجہ ہے کہ حکمت سب سے زیادہ اُنہیں کے حصہ میں آئی حتیٰ کہ وہ دس حصوں میں سے نو حصے لے گئے۔ امیر المومنین فی الحدیث امام محمد بن اسحاق بن یسار ﷺ نے مولیٰ علی ﷺ کی اس خوش بختی کو بہترین انداز میں بیان فرمایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

وكان مما أنعم الله به على عليٍّ أنه كان في حجر الرسول صلى الله عليه وآله

وسلم قبل الإسلام.

''سیدنا علیؓ پر یہ اللہ تعالیٰ کا انعام ہے کہ وہ قبل از اسلام حضور اکرم ﷺ کی آغوشِ تربیت میں تھے''۔

(السيرة النبوية لابن إسحاق ص ۱۸۲؛ السيرة النبوية لابن هشام ج۱ ص۲۸۹؛ دلائل النبوة للبيهقي ج۲ ص۱۶۱؛ معرفة الصحابة لأبي نعيم ج۱ ص۹۹ حديث ۳۱۰؛ المناقب للخوارزمي ص۵۱؛ أسد الغابة ج۴ ص۱۰۱؛ سير أعلام النبلاء ج۱ ص۸۲؛ البداية والنهاية ج۳ ص۲۲۰؛ السيرة النبوية لابن كثير ج۱ ص۴۴۸؛ مناقب علي والحسنين لمحمد فؤاد عبد الباقي ص۱۲)

دکتور محمد حسین ذہبی نے سیدنا علیؓ کے علم، فصاحت، قوتِ فیصلہ، ملکۂ استنباط اور پیچیدہ امور کو حل کرنے میں مہارت وغیرہ کا شاندار بیان کیا اور آخر میں لکھا کہ یہ تمام امور باعث تعجب نہیں اس لیے کہ انہوں نے آغوشِ نبوی ﷺ میں تربیت پائی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

كان ؓ بحراً في العلم، وكان قوي الحجة، سليم الاستنباط، أوتي الحظ الأوفر من الفصاحة والخطابة والشعر، وكان ذا عقل قضائي ناضج، وبصيرة نافذة إلى بواطن الأمور، وكثيراً ما كان يرجع إليه الصحابة في فهم ماخفي واستجلاء ما أشكل، وقد ولّاه رسول اللهﷺ قضاء اليمن، ودعا له بقوله: "اللّٰهم ثبّتْ لسانَه واهدِ قلبَه" فكان موفقاً ومسدداً، فيصلاً في المعضلات، حتىٰ ضرب به المثل فقيل: "قضية ولا أبا حسن لها" ولاعجب، فقد تربىٰ في بيت النبوة، وتغذى بلبان معارفها، وعمته مشكاة أنوارها.

''سیدنا علیؓ علم کے سمندر تھے، قوی الدلائل اور محفوظ استنباط والے تھے، انہیں فصاحت، خطابت اور فنِ شاعری میں وافر حصہ حاصل تھا، فیصلہ کن عقل اور پختہ رائے والے تھے، اُن کی بصیرت معاملات کی تہہ تک پہنچنے والی تھی، اکثر صحابہ کرامؓ مخفی اور مشکل معاملات میں اُن کی طرف رجوع کرتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے انہیں یمن کا قاضی بنایا تو ان الفاظ میں اُن کے حق میں دعا فرمائی: ''اے اللہ! اس کی زبان کو ثابت رکھنا اور اس کے دل کو کھول دینا'' پس انہیں قول وعمل میں توفیقِ ایزدی حاصل تھی، پیچیدہ امور کو حل کرنے میں ماہر تھے، حتیٰ کہ اُن کی اسی شان کی

وجہ سے محاورہ بن گیا تھا: ''مشکل آگئی پر ابوالحسن نہیں ہے'' اور اس میں کوئی تعجب نہیں، کیونکہ انہوں نے بیتِ نبوت میں تربیت پائی تھی، معارفِ نبوت کا دودھ اُن کی غذا تھی اور سینۂ نبوی ﷺ کے انوار اُن پر عام تھے''۔

(التفسير والمفسرون للدكتور محمد حسين الذهبي ج١ ص٨٩)

یعنی آغوشِ نبوی ﷺ میسر آنے کی وجہ سے سینۂ نبوی ﷺ کے انوار اُن پر سایہ فگن ہوئے تو اُن انوار کی بدولت اُن کو پوری امت کے مقابلہ میں حکمت زیادہ عطا ہوئی، حتیٰ کہ دس میں سے نو (۹) حصے اُن کا مقدر بن گئے۔ پھر یہ وہ انوار ہیں جو صحبت و معیتِ نبوی ﷺ کی برکت سے از خود اُنہیں ملے تھے جبکہ وہ انوار اس کے علاوہ ہیں جو نبی کریم ﷺ ان کے لیے بارگاہِ الٰہی سے مانگتے تھے۔ سیدنا ابن عباس ؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا معمول تھا کہ آپ رات کے آخری حصہ میں اُٹھ کر یوں دعا مانگا کرتے تھے:

اللّٰهم اجعل في قلبي نوراً وفي بصري نوراً وفي سمعي نوراً وعن يميني نوراً وعن يساري نوراً وفوقي نوراً وتحتي نوراً وأمامي نوراً وخلفي نوراً واجعل لي نوراً.

''اے اللہ! میرے دل میں نور کردے، میری آنکھوں میں نور کردے، میرے کانوں میں نور کردے، میرے دائیں نور کردے، میرے بائیں نور کردے، میرے اوپر نور کردے، میرے نیچے نور کردے، میرے آگے نور کردے، میرے پیچھے نور کردے، اور میرے لیے نور [ہی نور] کردے''۔

(بخاري ص١٠٩٨ حديث ٦٣١٦)

صحیح مسلم میں یہ الفاظ بھی ہیں:

وَاجْعَلْنِيْ نُوْرًا.

''اور مجھے سراپا نور کردے''۔

(صحيح مسلم ص٣٠٩ تا ٣١٢)

خیال رہے کہ رات کا یہ آخری حصہ وہ وقت ہے جب سیدنا علی المرتضیٰ ؓ بارگاہ نبوی ﷺ میں حاضر ہوتے تھے، اور حضور ﷺ جو کچھ اپنے لیے مانگتے تھے، بعینہ وہی کچھ سیدنا علی المرتضیٰ ؓ کے لیے بھی مانگتے تھے، جیسا کہ ہم چند سطور قبل حدیث پاک نقل کر چکے ہیں۔ لہٰذا خود اندازہ فرمائیے! نبوت کے علاوہ جس سعادت

مندکو نو حصے حکمت اور اس قدر نور حاصل ہوا ہو تو پھر دوسری کونسی چیز ہو سکتی ہے جو انہیں حاصل نہ ہوئی ہو؟

ورودِ حکمت قلب میں ہو تو مشاہدہ کا عالم

آپ نے ابھی پڑھا کہ حکمت ایک نور ہے جو اللہ تعالیٰ بندے کے قلب میں ڈال دیتا ہے، اور یہ بھی پڑھا کہ نبی کریم ﷺ جو کچھ اپنے لیے مانگتے تھے وہی کچھ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے لیے بھی مانگتے تھے، اور یہاں یہ حدیث بھی پیشِ نظر رہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

يا علي! إني أحب لك ما أحب لنفسي.

''اے علی! میں تمہارے لیے وہی پسند کرتا ہوں جو اپنے لیے پسند کرتا ہوں''۔

(مسند أحمد ج١ ص١٤٦، وط: ج١ ص٤٠٦ حديث ١٢٤٤، وط: ج٢ ص ٤٠٢ حديث ١٢٤٤؛ منتخب مسند عبد بن حُميد ج١ ص١١٤ حديث٦٧؛ مسند أبي داود الطيالسي ص ٢٦ حديث ١٨٢، وط: ج١ ص١٠٢ حديث١٧٨؛ مسند البزار ج٣ ص٨٤ حديث٨٥٤؛ المصنف لعبد الرزاق ج٢ ص٩٤ حديث٢٨٣٩؛ السنن الكبرىٰ للبيهقي ج٣ ص٢١٢، وط: ج٣ ص ٣٠١ حديث ٥٧٩٠؛ جمع الجوامع ج١٣ ص٥٦ حديث٥٦٥٢)

یہ جامع اور تشریح طلب الفاظ ہیں جبکہ ایک اور حدیث میں اس جامعیت کی قدرے تفسیر بھی موجود ہے۔ چنانچہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''میں شب و روز رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوتا تھا، اور جب میں آپ سے سوال کرتا تو آپ مجھے جواب دیتے اور جب خاموش ہوتا تو از خود ابتدا فرماتے، آپ پر جو بھی آیت نازل ہوئی میں نے اسے پڑھا اور اس کی تفسیر و تاویل کو جانا، اور آپ نے میرے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی کہ جو کچھ آپ نے مجھے سکھایا میں اس کو نہ بھولوں، سو میں کسی حرام، حلال، امر، نہی، طاعت اور معصیت کو نہیں بھولا، اور آپ نے میرے سینے پر اپنا دستِ مبارک رکھ کر دعا فرمائی:

اللهم املأ قلبه علماً وفهماً وحكماً ونوراً، ثم قال لي: أخبرني ربي عزوجل أنه قد استجاب لي فيك.

''اے اللہ! اس کے قلب کو علم، حکمت، فہم اور نور سے بھر دے، پھر مجھے بتلایا کہ اللہ عزوجل

نے تمہارے حق میں میری دعا قبول فرمالی ہے"۔

(تاریخ دمشق ج٤٢ ص٣٨٦؛مختصر تاریخ دمشق ج١٨ ص١٨)

اس حدیث میں آیا کہ علم،فہم اور حکمت کو اس کے قلب میں اتار دے،سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حکمت نور بن کر قلب میں اتر جائے تو اس کا فائدہ کیا ہوتا ہے؟علماء کرام فرماتے ہیں:اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ پھر قلب کو بھی آنکھیں مل جاتی ہیں۔چنانچہ امام راغب اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

فللقب عين كما أن للبدن عيناً، فمن صحت عين قلبه،واعانه نور الله اطلع علىٰ حقائق الأشياء،وأدرك العالم العلوي وهو في الدنيا، فيرىٰ مالاعين رأت ولا اذنٌ سمعت ولا خطر علىٰ قلب بشر،ولكون الاطلاع عليه ممكناً، قال أمير المؤمنين علي ﷺ:لو كشف الغطاء ما ازددتُ يقيناً.

"پس دل کی بھی آنکھ ہوتی ہے جیسا کہ بدن کی آنکھ ہوتی ہے،سو جس شخص کے دل کی آنکھ تندرست ہو اور نورِ الٰہی اُس کی اعانت فرمائے تو اُسے تمام چیزوں کی حقیقت پر اطلاع ہوجاتی ہے،اور وہ دنیا میں رہتے ہوئے عالم بالا کے حقائق کا ادراک کرتا ہے،پھر وہ،وہ کچھ دیکھتا ہے جسے کسی آنکھ نے دیکھا نہیں،کسی کان نے سنا نہیں اور کسی دل پر اُس کا خیال گذرا نہیں،اور یہ ساری اطلاع ممکن ہے،جیسا کہ امیر المومنین علی ﷺ نے فرمایا:اگر مجھ سے پردہ اٹھا دیا جائے تو میرے یقین میں اضافہ نہیں ہوگا"۔

(كتاب الذريعة إلىٰ مكارم الشريعة ص١٤٩)

یہاں ایک طرف یقینِ مرتضوی کی کاملیت میں غور فرمایئے تو دوسری طرف یہ بھی جان لیجئے کہ یقین سے افضل کوئی چیز نہیں ہے۔چنانچہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ خلیفۂ اول امیر المومنین سیدنا ابوبکر صدیق ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خطبہ دیا تو اُس میں یہ بھی ارشاد فرمایا:تم اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگا کرو،پھر فرمایا:

فلم يؤت أحد قط بعد اليقين أفضل من العافية.

"کسی شخص کو یقین کے بعد عافیت سے افضل کچھ نہیں دیا گیا"۔

(مسند أحمد ج١ ص٣ حديث ٥، موطا: ج١ ص١٨٤ حديث ٥؛ مسند الحميدي ج١ ص٣ حديث ٢؛

مسند أبي داود الطيالسي ج۱ ص۷۱ حدیث ۱۱۶، ۱۱۹؛ مسند البزار ج۱ ص۴۶ حدیث ۷۵؛ سنن ابن ماجه ج۴ ص۲۷۳ حدیث ۳۸۴۹؛ الأدب المفرد ج۱ ص۳۸۱ حدیث ۷۲۴؛ جامع الأصول لابن أثير الجزري ج۳ ص۲۲۴ حدیث ۲۳۵۸؛ كتاب اليقين لابن أبي الدنيا ص۴۶)

جب یقین سے بڑھ کر اور کوئی چیز نہیں تو جاننا چاہیے کہ سیدنا علی ﷛ کو یہ دولت اس قدر کامل حاصل تھی کہ انہیں اس میں مزید اضافہ کی کوئی ضرورت نہیں تھی، جیسا کہ اُن کے ارشاد "لو كشف الغطاء" سے ظاہر ہے، تاہم اس یقین کی اعلیٰ منزلت کو سمجھنے کی خاطر مجھ ایسے مادہ پرست شخص کے لیے حسب ذیل واقعہ کا اندراج مناسب ہوگا۔ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''ایک مرتبہ حضرت علی ﷛ کی خدمت میں ایک سائل حاضر ہوا، آپ نے اپنے صاحبزادے حضرت حسن یا حضرت حسین رضی اللہ عنہما سے فرمایا کہ اپنی والدہ (حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا) سے کہو کہ میں نے جو چھ درہم تمہارے پاس رکھے ہیں ان میں سے ایک دے دو۔ صاحبزادہ گئے اور یہ جواب لائے کہ وہ آپ نے آٹے کے واسطے رکھوائے تھے۔ حضرت علی ﷛ نے فرمایا کہ آدمی اپنے ایمان میں اُس وقت تک سچا نہیں ہوتا جب تک اس کو اپنے پاس کی موجود چیز سے اُس چیز پر زیادہ اعتماد نہ ہو جو اللہ ﷻ کے پاس ہے، اپنی والدہ سے کہو کہ وہ چھ درہم سب کے سب دے دو۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے تو یاد دہانی کے طور پر فرمایا تھا ان کو اس میں کیا تأمل ہوسکتا تھا اس لئے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے (سب) دے دیئے۔ حضرت علی ﷛ نے وہ سب سائل کو دے دیئے۔ حضرت علی ﷛ اپنی اس جگہ سے اٹھے بھی نہیں تھے کہ ایک شخص اونٹ فروخت کرتا ہوا آیا، آپ نے اس کی قیمت پوچھی اس نے ایک سو چالیس درہم بتائے، آپ نے وہ (بطور) قرض خرید لیا اور قیمت کی ادائیگی کا بعد کا وعدہ کر لیا تھوڑی دیر بعد ایک اور شخص آیا اور اونٹ کو دیکھ کر پوچھنے لگا کہ یہ کس کا ہے؟ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میرا ہے اس نے دریافت کیا کہ فروخت کرتے ہو؟ حضرت علی ﷛ نے فرمایا ہاں، اس نے قیمت دریافت کی۔ حضرت علی ﷛ نے دو سو درہم بتائے، وہ خرید کر لے گیا۔ حضرت علی ﷛ نے ایک سو چالیس درم اپنے قرض خواہ یعنی پہلے مالک کو دے کر ساٹھ درہم حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو لا کر دے دیئے۔ حضرت فاطمہؓ نے پوچھا کہ یہ کہاں سے آئے؟ حضرت علی ﷛ نے فرمایا کہ

اللہ ﷻ نے اپنے نبی ﷺ کے واسطے سے وعدہ فرمایا ہے کہ جو شخص ایک نیکی کرتا ہے اس کو دس گنا بدلہ ملتا ہے"۔

(جمع الجوامع ج۱۳ ص ۲۵۰ حدیث ۶۸۲۵، وط: ج۱۸ ص ٥٤ حدیث ۱٤٥۹؛ کنز العمال ج ۱۰ ص ۵۷۲، ۵۷۳ حدیث ۱٦۹۹۷٦؛ فضائل صدقات للسہارنفوري حصّہ اوّل ص ۱۱۶، ۱۱۷)

دلِ بینا کے مشاہدہ کا عالم

امام راغب اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا صحت مند دل کی آنکھ جو حقائق دیکھ سکتی ہے وہ کسی دوسرے شخص کے خیال میں بھی نہیں آسکتے۔ روحانی دنیا میں صحت مند دل کونسا ہوتا ہے؟ آیئے قرآن کریم سے پوچھتے ہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ. (الحج: ٤٦)

"بلاشبہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں لیکن وہ دل اندھے ہوجاتے ہیں جو سینوں میں ہیں"۔

علامہ ابن قیم الجوزیہ لکھتے ہیں:

"اللہ ﷻ نے دلوں کو بینا اور نابینا بنایا ہے، جیسا کہ آنکھیں بینا اور نابینا ہوتی ہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں لیکن سینوں میں جو دل ہیں وہ اندھے ہوجاتے ہیں۔ [الحج: ٤٦] پس قلب دیکھتا بھی ہے اور سنتا بھی، اندھا بھی ہوتا ہے اور بہرا بھی، اور اُس کا اندھا اور بہرا پن آنکھ کے اندھے پن اور کان کے بہرے پن سے زیادہ مضر ہوتا ہے"۔

(مدارج السالکین ج۳ ص ۲۳۱، ۲۳۲، وط: ج۳ ص ۲۵۷)

وہ ایک اور مقام میں لکھتے ہیں:

والقلبُ يبصرُ الحقَّ كما تبصرُ العينُ الشمسَ.

"قلبِ بینا حق کو یوں دیکھتا ہے جس طرح آنکھ آفتاب کو دیکھتی ہے"۔

(إغاثة اللهفان ج۱ ص ۸۰، وط: ج۱ ص ۸٤)

علامہ ابن قیم نے ایک اور مقام پر قلبی آنکھ کی قوت کو یوں بیان کیا ہے:

إذا قوي نوره واشراقه انكشفت له صور المعلومات وحقائقها على ما هي عليه.

''جب دل کا نور اور اس کی روشنی قوی ہو جائے تو اس پر معلومات کی صورتیں اور اُن کی حقیقتیں یوں منکشف ہو جاتی ہیں جیسی کہ وہ ہیں''۔

(إغاثة اللهفان ج۱ ص ۲۱ موط: ج۱ ص ۲۷)

شیخ نجم الدین الکبریٰ رحمۃ اللہ علیہ نے سورۃ الحج کی آیت [۴۶] سے بہترین استنباط کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

فإن صح وصف القلوب بالسمع والبصر صح وصفه بسائر صفات الحق من وجوه الإدراكات، فكما تبصر القلوب بنور اليقين تدرك نسيم الإقبال بمشام السر، وفي الخبر: إني لأجد نفس الرحمان من قبل اليمن، وقال تعالى مخبراً عن يعقوب عليه السلام أنه قال: ﴿إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ﴾ وما كان ذلك إلا الإدراك السرائر دون اشتمام الريح في الظاهر.

''پس اگر قلوب کو سمع اور بصر سے متصف کرنا درست ہے تو پھر انہیں وجوہ ادراک کے حوالہ سے تمام صفات حق سے متصف کرنا بھی درست ہے، پس جس طرح قلوب نور یقین سے دیکھتے ہیں اسی طرح وہ باطنی مشام سے سونگھتے بھی ہیں۔ حدیث شریف میں ہے: میں یمن سے رحمان کی خوشبو پا رہا ہوں اور اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں خبر دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ﴿بیشک میں یوسف علیہ السلام کی خوشبو پا رہا ہوں، [یوسف: ۹۴]﴾ اور یہ ادراک محض باطنی قوت سے تھا، ظاہری حواس کا اس میں کوئی دخل نہیں تھا''۔

(التأويلات النجمية ج٤ ص ٢٧١؛ تفسير الملا علي القاري ج٣ ص ٣٨٧، ٣٨٨)

حقیقت یہ ہے کہ قلبِ بینا پر جو اصل حقائق عیاں ہوتے ہیں وہ اِس مادی اور حسی زبان سے بیان ہو سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی حسی آنکھ اور کان انہیں دیکھ اور سن سکتے ہیں۔ چنانچہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ صوفیہ کے احوال میں لکھتے ہیں:

فإن جميع حركاتهم وسكناتهم في ظاهرهم وباطنهم مقتبسة من نور مشكاة

النبوة وليس وراء نور النبوة على وجه الأرض نورٌ يستضاء به.

''ان کی تمام ظاہری اور باطنی حرکات وسکنات سینۂ نبوی ﷺ کے نور سے نور لیتی ہیں اور روئے زمین پر نورِ نبوت ﷺ کے علاوہ اور کوئی نور نہیں ہے جس سے روشنی حاصل کی جائے''۔

ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں:

من أول الطريقة تبتدئ المشاهدات والمكاشفات حتى إنهم في يقظتهم يشاهدون الملائكة وأرواح الأنبياء ويسمعون منهم أصواتاً ويقتبسون منهم فوائد ثم يترقى الحال من مشاهدة الصور والأمثال إلى درجات يضيق عنها نطاق النطق.

''اور ان کے سلوک کی ابتدا میں مشاہدات اور مکاشفات کا آغاز ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ وہ بیداری میں فرشتوں کا اور انبیاء کرام علیہم السلام کی روحوں کا مشاہدہ کرتے ہیں اور ان کی آوازیں سنتے ہیں اور ان سے فوائد حاصل کرتے ہیں، پھر صورتوں اور مثالوں کے مشاہدہ سے ترقی کرتے ہوئے ایسے درجات کی طرف بلند ہوتے ہیں جن کی حقیقت کے بیان سے زبانیں عاجز ہیں''۔

(المنقذمن الضلال ص٦٢،٦٣)

امام غزالی کا یہ کلام امام سیوطی، امام قسطلانی، امام ابن حجر مکی، امام زرقانی اور امام نبہانی رحمۃ اللہ علیہم نے بھی ذکر کیا ہے۔

(الحاوي للفتاوي ج٢ ص٢٥٧ ،وط: ص٦٦٢؛ المواهب اللدنية ج٢ ص٦٧١؛ فتاوى حديثية ص ٣٩٢؛ زرقاني على المواهب ج٧ ص٢٩٦؛ سعادت الدارين ص٣٨٦،٣٨٧)

لہٰذا بندۂ مومن کو چاہیئے کہ وہ رب تعالیٰ سے لو لگائے تا کہ وہ اسے دل بینا عطا فرمائے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''إِذَا طَلَبْتَ اللّٰهَ تَعَالىٰ بِالصِّدْقِ اَعْطَاكَ اللّٰهُ مِرْآةً تُبْصِرُ فِيْهَا كُلَّ شَيْءٍ مِنْ عَجَائِبِ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ.

''اگر تم صدق واخلاص سے اللہ تعالیٰ کو چاہو تو اللہ تعالیٰ تمہیں ایک آئینہ عطا فرمائے گا، جس میں تم عجائباتِ دنیا اور آخرت کی ہر چیز کا مشاہدہ کرو گے''۔

(التبيان في آداب حملة القرآن ص٢٧)

اسی لیے علامہ علیہ الرحمۃ نے تلقین فرمائی ہے۔

دل بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

کیونکہ جنہیں زندہ دل عطا ہو جاتا ہے تو اُن پر کائنات پست و بالا کی ہر چیز روشن ہو جاتی ہے، جیسا کہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "تُبْصِرُ فِيهَا كُلَّ شَيْءٍ مِنْ عَجَائِبِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ"۔ اسی حقیقت کو یوں بھی بیان کیا گیا ہے۔

دل زندہ و بیدار اگر ہو تو بتدریج
بندے کو عطا کرتے ہیں چشم نگراں اور
احوال و مقامات پہ موقوف ہے سب کچھ
ہر لحظہ ہے سالک کا زماں اور مکاں اور

(بال جبریل ص ۱۳۳)

جب صوفیہ اور اولیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم کا یہ مقام ہے کہ اُنہیں ہر لحظہ ایک اور چشمِ نگراں عطا کی جاتی ہے تو پھر "ولي كل مؤمن من بعدي" اور "من كنتُ مولاه فعليٌ مولاه" یعنی سید الاولیاء علی الاطلاق کے مشاہدے کا عالم کیا ہوگا؟ اور جب ارواحِ انبیاء کرام علیہم السلام سے ملاقات کرنے والوں کی عظمتِ مشاہدہ کا یہ مقام ہے تو پھر اُس ہستی کی معرفت، ادراک اور عظمتِ مشاہدہ کا عالم کیا ہوگا جو جسماً اور روحاً ہمہ وقت اور خصوصاً تہجد کے وقت سید الانبیاء والمرسلین علی نبینا وعلیهم الصلوة والتسليم کے ساتھ ہوتی تھی؟ کیا کوئی اندازہ اور قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اُس ذاتِ مقدسہ کو کیسا دلِ زندہ حاصل ہوگا؟ اُنہیں ایک اور چشمِ نگراں جو عطا ہوئی ہوگی وہ کیسی ہوگی؟ اور اُن پر عجائباتِ کائنات اور اسرار و رموز جو منکشف ہوتے ہوں گے اُن کا عالم کیا ہوگا؟

یا رب العالمین! تیری بارگاہ میں التجا ہے کہ تو اپنے اُس محب اور محبوب کے طفیل اس ناکارہ کو بھی دلِ بینا عطا فرما، آمین!

پیر کی پیری کا عالم

قارئین کرام جب آپ کو حکمتِ مرتضوی کی کچھ نہ کچھ عظمت سمجھ آ گئی ہے اور یہ بھی جانا جا چکا ہے کہ جس دل

میں نورِ حکمت اتر جائے تو اُس پر کائنات پست و بالا کی ہر شئے عیاں ہو جاتی ہے تو اب ذرا پیر شیخ الحدیث والتفسیر کی وہ گوہر افشانی ملاحظہ فرمائیں جو انہوں نے روافض یا بعض نامور علماء اسلام کی ضد میں فرمائی ہے۔ وہ حضرت حذیفہ اور مولیٰ علی ؓ کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت حذیفہ ؓ کا لقب ہے: صاحبُ سرِّ رسول اللّٰہ الذی لا یعلمہ غیرہ یعنی رسول اللہ ﷺ کے ہمراز، جس راز کو اُن کے سوا کوئی نہیں جانتا (بخاری حدیث رقم: ۳۷۶۱، مستدرک حاکم حدیث رقم: ۵۴۶۳)۔

ذرا چشمِ تصور سے غور فرمایئے۔ یہ الفاظ اگر مولا علی ؓ کے بارے میں فرمائے گئے ہوتے تو یار لوگوں کی طرف سے باطن کے نام پر حشر برپا کر دیا جاتا۔ اگرچہ ہر صحابی صاحبِ سر ہے اور خود سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم بھی صاحبِ اسرار ہیں لیکن یہاں الذی لا یعلمہ غیرہ کی قید موجود ہے اور ہم ثابت صرف یہ کرنا چاہتے ہیں کہ ہر صحابی شہرِ علم کا دروازہ ہے''۔

(ضربِ حیدری ص222)

پیر سائیں کی یہ عبارت انتہائی سطحی اور ظاہر پرستی پر مبنی ہے اور اس پر متعدد وجوہ سے بات ہو سکتی ہے:

۱۔ ''لایعلمہ غیرہ'' کا لفظ ارشادِ نبوی ﷺ نہیں بلکہ حضرت قتادہ ؓ کا قول ہے، لہٰذا اُن کی معلومات کی حد تک یہ درست ہو سکتا ہے، لیکن عین ممکن ہے کہ کسی اور شخص کو یہ اور ان کے علاوہ دوسرے اسرار بھی معلوم ہوں۔ بلاشبہ حضرت حذیفہ ؓ کو حضور ﷺ کے بتلانے سے منافقین کے نام اور فتنوں کا علم تھا مگر جن لوگوں کو مخصوص قوتِ استنباط عطا ہوتی ہے تو وہ کسی کے بتلائے بغیر اور کسی سے سنے بغیر قرآن کریم سے ہی ہر شے کی حقیقت معلوم کر لیتے ہیں اور اُن پر تمام منافقین، اشقیاء اور سعداء واضح ہو جاتے ہیں۔

۲۔ پیر سائیں نے ہر صحابی کو صاحبِ سر لکھا ہے، کس دلیل کی بنا پر؟ اگر قلبی آنکھ کے وا ہونے کی وجہ سے لکھا ہے تو یہ بات ہر صحابی کی قلبی استطاعت کے مطابق درست ہے، اور اگر اس پر کوئی نص ہے تو وہ پیش کرنا چاہیے تھی، اور اگر نص نہیں ہے تو پھر پیر نے فقط مولیٰ علی ؓ کے باب العلم ہونے کی اہمیت کو گھٹانے کی خاطر محض اپنی طرف سے یہ سخاوت کی ہے۔

۳۔ پیر سائیں نے کہا: ''خود سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم بھی صاحبِ اسرار ہیں'' راقم الحروف کہتا ہے کہ ہم بھی مولیٰ علی ؑ کو صاحبِ اسرار مانتے ہیں مگر دلائل سے، پیر کے پاس اس سلسلے میں کونسی نص ہے؟ اگر کوئی

نص ہے تو بیان کیوں نہیں کی، اور اگر نص نہیں ہے تو پھر کس سبب سے انہیں صاحب سر ہی نہیں بلکہ صاحب اسرار کہا؟ پھر جب صاحب اسرار کہا تو حضرت حذیفہ ﷺ کے ساتھ موازنہ کیوں کیا؟ بہر حال پیر شیخ الحدیث والتفسیر اسی مقام پر مولیٰ علی ﷺ کے صاحب اسرار ہونے کی کوئی واضح دلیل نقل کرتے تو بات کچھ اور ہوتی۔ ممکن ہے پیر سائیں نے مولیٰ علی ﷺ کو صاحب حکمت ہونے کی وجہ سے صاحب اسرار کہا ہو۔ کیونکہ انہوں نے اپنی کتاب کے اگلے صفحہ پر سیدنا ابن عباس سے مولیٰ علی ﷺ کا مفاضلہ و موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ”نبی کریم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عباس ﷺ کو دعا دی کہ اللهم علمه الكتاب والحكمة یعنی اے اللہ اسے کتاب اور حکمت سکھا (بخاری حدیث رقم: ۷۵، ۳۷۵۶، ۷۲۷۰)
> حکمت علم الاسرار ہی کا نام ہے“۔

(ضرب حیدری ص222)

اگر حکمت علم الاسرار ہی کا نام ہے تو پھر پیر سائیں کس حدیث کی بنا پر مولیٰ علی ﷺ کو صاحب حکمت اور صاحب حکمت ہونے کی وجہ سے صاحب اسرار مانتے ہیں؟ آیا ”انا دار الحكمة وعلي بابها“ کی وجہ سے یا پھر ”قُسِّمَتِ الْحِكْمَةُ فِيْ عَشَرَةِ أَجْزَاءٍ“ کی وجہ سے؟ اگر پہلی حدیث کی وجہ سے مانتے ہیں تو اس میں مولیٰ علی ﷺ کو دار حکمت کا باب فرمایا گیا ہے اور ابن عباس اور تمام صحابہ اس باب کے محتاج تھے (کما قاله ابن الجوزي) اور اگر دوسری حدیث کی وجہ سے مانتے ہیں تو وہ بھی زیر بحث حدیث ہے اور اس میں ہے کہ مولیٰ علی ﷺ کو دس میں سے نو حصے حکمت عطا کی گئی۔

۴۔ پیر شیخ الحدیث والتفسیر نے حضرت حذیفہ ﷺ کو صاحب السر لکھنے کے بعد انہیں باب العلم بنانے کی کوشش کی ہے، حالانکہ وہ صاحب السر (محرم راز) تھے اور راز وہ ہوتا ہے جو کسی دوسرے پر منکشف نہ ہو، اس لحاظ سے انہیں ”صاحب السر“ (اسرار والے) کہنا موزوں ہے، باب العلم یا باب الاسرار کہنا موزوں نہیں، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام ﷺ نے انہیں ”صاحب السر“ تو فرمایا ہے مگر باب العلم یا باب السر نہیں فرمایا۔ باب العلم فقط وہ ہستی ہے جسے مدینۃ العلم ﷺ نے باب العلم بنایا بھی اور فرمایا بھی۔ شارع ﷺ کے بعد کسی محدث یا پیر فقیر کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے کو باب مدینۃ العلم بنا سکے۔

"لَایَعْلَمُہٗ غَیْرُہٗ" سے استدلال کا فساد

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ "لَایَعْلَمُہٗ غَیْرُہٗ" کا لفظ استاذ الکل یعنی معلّمِ کائنات ﷺ نے نہیں فرمایا بلکہ یہ ایک صحابی کا قول ہے، اگر استاذ الکل ﷺ نے فرمایا ہوتا تو پھر کہا جا سکتا تھا کہ جو کچھ انہوں نے اپنے اس شاگرد کو سکھایا اُسے دوسرا کوئی نہیں جانتا، بلکہ نبی کریم ﷺ نے تو انہیں اپنا صاحب السر بھی نہیں فرمایا۔ بات فقط اتنی ہے کہ انہیں شر اور فتنہ وفساد وغیرہ کے بارے میں معلومات جمع کرنے کا اہتمام رہتا تھا تاکہ ان سے بچا جا سکے، اس لیے وہ حضور ﷺ سے سوال کرتے اور آپ انہیں جواب دیتے، بعض اوقات کثرتِ سوالات کی وجہ سے حضور ﷺ انہیں فرماتے: اے حذیفہ! قرآن پڑھو۔ آخر اس ارشادِ نبوی ﷺ کا اس کے علاوہ اور کیا مقصد ہے کہ قرآن میں ہر چیز کا بیان ہے۔ پھر خود غور فرمایئے کہ مولیٰ علی ایسے صدر المفسرین کو ایسے سوالات کی کیا ضرورت تھی؟ مگر تعجب ہے کہ سائیں پیر نے لکھ دیا ہے:

> "خود سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم بھی صاحب اسرار ہیں لیکن یہاں الـــذی لایعلمہ غیرہ کی قید موجود ہے اور ہم ثابت صرف یہ کرنا چاہتے ہیں کہ ہر صحابی شہر علم کا دروازہ ہے"۔

(ضربِ حیدری ص222)

سائیں پیر شیخ الحدیث والتفسیر "لایعلمہ غیرہ" سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ہر چند کہ مولیٰ علیؓ بھی صاحب اسرار تھے مگر "لایعلمہ غیرہ" کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو اسرار حضرت حذیفہؓ کے سینے میں تھے انہیں اُن کے سوا کوئی دوسرا شخص نہیں جانتا تھا۔ ہم پوچھتے ہیں کہ اگر یہی بات ہے تو "لایعلمہ غیرہ" کا اطلاق شیخین کریمین رضی اللہ عنہما پر بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ اگر ہوتا ہے تو پھر وہ اعلم الصحابہ نہیں رہتے، اور اگر اُن پر اطلاق نہیں ہوتا اور فقط سیدنا علی المرتضیٰؓ پر ہوتا ہے تو کیا اس پر کوئی دلیل بھی ہے؟

سیدنا علی المرتضیٰؓ کا صاحبُ السر ہونا

سائیں پیر نے جو حضرت حذیفہؓ یا کسی صحابی کو صاحب اسرار ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے اس سے اُن کا مقصد فقط یہ ہے کہ سیدنا علی المرتضیٰؓ کے تقابل میں بعض صحابہ کرامؓ کو پیش کر کے مولیٰ علیؓ کے اَعلم ہونے اور اُن کے باب العلم ہونے کی عظمت کو پست دکھایا جا سکے، کیونکہ اسی صورت میں ان کی مزعومہ سُنیت قائم

رہ سکتی ہے۔ لیکن یہ اُن کی انتہائی سادگی ہے، انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ نبی کریم ﷺ نے جو خود کو مدینۃ العلم فرمایا ہے تو نہ تو علم الاسرار اُس مدینہ سے باہر ہے اور نہ ہی مولیٰ علی علیہ السلام سے اُس علم کی نفی کی گئی ہے، یعنی یوں تو نہیں فرمایا کہ علم الاسرار کے ماسوا علی میرے علم کا باب ہے۔ سو جب حضور ﷺ نے ایسی کوئی استثنائی بات نہیں فرمائی تو کسی امتی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ مطلقاً باب العلم کا تقابل اُن حضرات کے ساتھ کرتا پھرے جنہیں نبی کریم ﷺ نے مطلقاً باب العلم نہیں فرمایا؟

خیال رہے کہ خود پیر شیخ الحدیث والتفسیر نے حکمت کو علم الاسرار تسلیم کیا ہے، [اگرچہ ابن عباس کے حق میں] اور علماء کرام نے لکھا ہے کہ علم جب محنت وکسب سے ہاتھ آئے تو اسے حکمت نہیں کہا جاتا اور جو فیض وکرم سے مل جائے تو اسے اگر علم بھی کہا جائے تو در حقیقت وہ حکمت ہوتی ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے حدیث "انا مدينة العلم وعلي بابها" کو اسی معنیٰ میں لیا ہے۔ پھر جس خوش نصیب کو دس میں سے نو حصے حکمت عطا ہوئی، جسے دارِ حکمت کا باب فرمایا گیا اور جسے مدینۃ العلم کا باب فرمایا گیا تو اُس کا کسی دوسرے کے ساتھ مفاضلہ کیوں اور موازنہ کیسا؟ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ علم ہو یا حکمت سب وراثتِ نبوی ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

الحكمة: أي العلم النافع علىٰ ماهو في نفس الأمر الموصل إلى رضاء الله تعالىٰ والعمل به وذلك لايتصور إلا بالوحي، فهو للأنبياء أصالة ولغيرهم وراثة.

"حکمت ایسے علم نافع اور اُس پر عمل کو کہتے ہیں جو حقیقۃً رضاءِ الٰہی سے ہمکنار کرنے والا ہو، اور وحی کے بغیر اس کا تصور نہیں کیا جاسکتا، پس یہ انبیاء کرام علیہم السلام کو براہ راست ملتا ہے اور امتیوں کو وراثت کے طور پر"۔

(تفسیر المظهري ج۱ ص ٤٢٤)

جب نبوی علم وحکمت کے ورثاء علماء کرام ہیں تو جو سب سے بڑا عالم ہوگا وہی سب سے بڑا وارث ہوگا، اور چونکہ مولیٰ علی علیہ السلام سے بڑا عالم کوئی نہیں ہے اس لیے اُن سے بڑھ کر کوئی وارث بھی نہیں ہے۔ چنانچہ سیدنا علی المرتضیٰ علیہ السلام خود فرمایا کرتے تھے کہ مجھ سے بڑھ کر حضور ﷺ کا اور کوئی وارث نہیں ہے۔

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا علی علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کی حیات میں فرماتے

تھے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا (تو کیا اگر وہ انتقال فرمائیں یا شہید کر دیئے جائیں پھر جاؤ گے تم اُلٹے پاؤں)[آل عمران : ١٤٤] خدا کی قسم! اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہدایت سے بہرہ ور کیا ہم اُلٹے پاؤں نہیں پلٹیں گے۔ اللہ کی قسم! اگر حضور ﷺ کا وصال ہو گیا یا آپ کو شہید کر دیا گیا تو میں ضرور اس بات پر جہاد جاری رکھوں گا جس بات پر آپ ﷺ نے جہاد کیا تھا، یہاں تک کہ میں شہید ہو جاؤں۔ پھر فرمایا:

واللّٰه إني لأخوه ووليه ووارثه وابن عمه، فمن أحق به مني.

"خدا کی قسم! میں رسول اللہ ﷺ کا بھائی، آپ کا ولی اور وارث ہوں اور آپ کا چچا زاد ہوں تو پھر اُن کا حقدار مجھ سے زیادہ کون ہے؟"۔

(السنن الكبرىٰ للنسائي ج٧ص٤٣١حديث٨٣٩٦، وط: ج٥ص١٣٥حديث٨٤٥٠؛ فضائل الصحابة ج٢ص٨١٠؛ خصائص علي بتحقيق البلوشي ص٨١،٨٢حديث٦٥؛ المعجم الكبير ج١ص٦٦حديث١٧٤؛ المستدرك ج٣ص١٢٦، وط: ج٤ص٩٥حديث٤٦٩١؛ تفسير ابن أبي حاتم ج٣ص٧٧٧؛ الدر المنثور ج٢ص٣٣٨؛ ذخائر العقبىٰ ص١٠٩،١١٠)

امام حاکم نے اس حدیث کی صحت کا قول کیا ہے، اور حافظ ہیثمی نے فرمایا ہے کہ اس حدیث کو امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہم نے روایت کیا ہے اور ان کے تمام راوی صحیح حدیث کے راوی ہیں۔

(مجمع الزوائد ج٩ص١٣٤، وط: ج٩ص١٨٣حديث١٤٧٦٥)

جب یہ حدیث صحیح ہے تو پھر سیدنا علی ﷛ کا دعویٰ اور ارشاد بھی حق اور سچ ہے، اس لیے کہ اُن کی مقدس زبان سے حق کے سوا کچھ نہیں نکل سکتا۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم اہل بیت کرام علیہم السلام کو معصوم سمجھتے ہیں۔ نہیں! بلکہ یہ بھی زبانِ نبوی ﷺ کی عصمت ہے، کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے اُن کے سینہ مبارک پر اپنا دستِ مبارک رکھتے ہوئے اُن کے حق میں دعا فرمائی تھی:

اللّٰهم اهْدِ قلبَه وسَدِّدْ لسانَه.

"اے اللہ! اس کے قلب کو کھول دے اور اس کی زبان کو سلامت رکھ"۔

(مسند أحمد ج١ص١١١، وط: ج١ص٣٢٤حديث٨٨٢، وط: ج٢ص٢٢٥حديث٨٨٢؛ السنن الكبرى للنسائي ج٧ص٤٢١حديث٨٣٦٥، وط: ج٥ص١١٦حديث٨٤١٩؛ المصنف لابن شيبة

ج١٥ ص٥٣ حديث٢٩٧٠٨ وج١٧ ص٩٦ حديث٣٢٧٣١؛ المستدرك ج٣ ص١٣٤ حديث ٤٧١٤؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٨ ص١٩؛ المنح المكية ص٥٨١؛ مناقب علي والحسنين لمحمد فؤاد عبد الباقي ص١٠٩، ١١٠)

دوسرے مقام پر حتمی اور دائمی ضمانت دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اذهب فإن الله عزّ وجلّ سيهدي قلبَک ويُثَبِّتُ لِسانَک.

''جاؤ اللہ ﷻ تمہارے دل کو کھول دے گا اور تمہاری زبان کو ثابت رکھے گا''۔

(مسند أحمد ج١ ص١٣٦ حديث١١٤٥ وص٧٣ حديث٦٣٦ وص٨٨ حديث٦٦٦، وط: ج٢ ص٩٢ حديث٦٦٦، وص٤٥١ حديث١٣٤٢؛ السنن الكبرى للنسائي ج٧ ص٤٢٠ حديث٨٣٦٣؛ سنن ابن ماجه ج٣ ص٩٠ حديث٢٣١٠؛ سنن أبي داود ج٣ ص٤٠٦؛ سنن الترمذي ص٣٢٢ حديث١٣٣١؛ تحفة الأخيار ج٥ ص٨ حديث٣٠٧٧ وص٩ حديث ٣٠٧٩؛ مسند البزار ج٢ ص٢٩٨ حديث٧٢١ وج٣ ص١٢٥ حديث٩١٢؛ مسند أبي داود الطيالسي حديث٩٨، وط: ج١ ص١٦٦ حديث١٠٠؛ مسند أبي يعلى ج١ ص١٥٦ حديث٢٨٨ وص١٦٦ حديث٣١١ وص٢٠٤ حديث٣٩٧؛ المستدرك للحاكم ج٣ ص١٣٤ حديث٤٧١٤؛ السنن الكبرىٰ للبيهقي ج١٠ ص٨٦ حديث٢٠١٥٤، ٢٠١٥٥؛ المصنف لابن أبي شيبة ج٦ ص١٣ حديث ٢٠٠٨٩ وص٣٦٨ حديث٣٢٠٥٩؛ الطبقات الكبرىٰ لابن سعد ج٢ ص٤٩)

سو جب سیدنا علی ؓ اپنے اس دعویٰ میں سچے ہیں تو پھر اُن سے بڑھ کر علوم واسرارِ نبویہ کا وارث کوئی نہیں اور حضور ﷺ کے علوم کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ قرآن کریم

۲۔ حکمت، یعنی سنت

علم نبوی ﷺ کی پہلی صورت کے بارے میں سیدنا علی ؑ کی شان میں آیا ہے کہ ''قرآن علی کے ساتھ ہے اور علی قرآن کے ساتھ'' اور دوسری صورت کے بارے میں آیا ہے کہ حکمت کے دس حصوں میں سے نو حصے علی المرتضیٰ ؓ کو دیئے گئے، اسی لیے ام المومنین سیدتنا عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں: ''إنه أعلم الناس بالسنة'' (وہ تمام لوگوں سے بڑھ کر سنت کے عالم ہیں) اور قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اُس نے کتاب

وحکمت نازل فرما کر اپنے محبوب ﷺ کو وہ سب کچھ سکھا دیا جسے وہ نہیں جانتے تھے۔[النساء:۱۱۳] لہٰذا خود غور فرمائیے کہ جس خوش نصیب کو علومِ نبویہ ﷺ کی یہ دونوں صورتیں پوری امت سے زیادہ عطا ہوں تو کیا اُس کا کوئی مدمقابل ہوسکتا ہے؟

سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کو قرآن میں غور کرنے کا حکم

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ جن کے متعلق پیر سائیں نے دعویٰ کیا ہے کہ اُن کے پاس جو اسرار تھے وہ کسی دوسرے کے پاس نہیں تھے، انہوں نے جب بار بار حضور ﷺ سے شرور و فتن کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے انہیں فرمایا:

یاحذیفة! تعلّم کتابَ اللّٰه واتبع ما فیه ثلاث مراتٍ.

"حذیفہ! کتابِ الٰہی کو سیکھو اور جو کچھ اُس میں ہے اس کی پیروی کرو، یہ ارشاد تین مرتبہ فرمایا"۔

اس کے باوجود وہ سوالات کرتے رہے اور حضور ﷺ جواب مرحمت فرماتے رہے"۔

(سنن أبي داود ج ٤ ص ۱۲۷ حديث ٤٢٤٦، وبتحقيق الألباني ص ٧٥٧ حديث ٤٢٤٦، وط: ج ٤ ص ٢٨٨ حديث ٤٢٤٦)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ایسا ملکۂ استنباط حاصل نہیں ہوگا جس کی بدولت وہ از خود کتابِ الٰہی کے سمندر میں غوطہ لگا کر اسرار و رموز کو نکال لاتے، کیونکہ کتابِ الٰہی کی شان میں آیا ہے کہ:

فیه نبأ ما کان قبلکم وفصل ما بینکم وخبر ما ھو کائن بعدکم.

"اُس میں اُس کی خبر ہے جو پہلے ہو چکا اور اس کا فیصلہ ہے جو تمہارے مابین ہوتا ہے اور اُس کی اطلاع ہے جو تمہارے بعد ہونے والا ہے"۔

(مسند أحمد ج ۱ ص ۹۱، وط: ج ۱ ص ۲۷۹ حديث ٧٠٤؛ جامع الترمذي ص ٦٥٣ حديث ٢٩٠٦؛ الجامع الكبير وهو جامع الترمذي ج ٥ ص ٢٩، ٣٠ حديث ٢٩٠٦؛ سنن الدارمي ج ٢ ص ٣٢٤ حديث ٣٣٣١، ٣٣٣٢؛ مسند البزار ج ٣ ص ٧٠ حديث ٨٣٤، ٨٣٦؛ مسند أبي يعلىٰ ج ١ ص ١٩٠ حديث ٣٦٢؛ ومسند أبي يعلىٰ مجلد واحد ص ١٠٨ حديث ٣٦٧، وط: ج ١ ص ٣٠٢ حديث ٣٦٧؛ مشكاة ج ١ ص ٣٩٢ حديث ٢١٣٨)

یعنی ماضی، حال اور مستقبل کے تمام امور کا قرآن کریم میں بیان موجود ہے لیکن ان تمام امور پر مطلع وہ ہوتا

ہے جس کو قسامِ ازل ﷻ کی بارگاہ سے حکمت، خصوصی فہم اور قوتِ استنباط عطا ہو۔

سیدنا علی علیہ السلام کا ملکہٗ استنباط

خیال رہے کہ لوگوں میں سے بعض کو پروردگار کی طرف سے قوتِ حافظہ زیادہ عطا ہوتی ہے، بعض کو قوتِ استنباط زیادہ عطا ہوتی ہے اور بعض کو دونوں قوتیں وافر عطا ہوتی ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بھی یہی تقسیم کارفرما تھی، اُن میں سے جن خوش نصیبوں کو یہ دونوں قوتیں عطا تھیں اُنہیں کم سن ہونے کے باوجود وہ مقام حاصل تھا جو اکابر، عشرہ مبشرہ اور بدری صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حاصل تھا۔ مولیٰ علی علیہ السلام کے شاگرد سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کو کم سن صحابی ہونے کے باوجود یہی مقام حاصل تھا۔ چنانچہ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ ایسا عادل و مدبّر خلیفۂ راشد بھی اُنہیں اپنی مجلس میں بدری اور بعض عشرہ مبشرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے برابر مقام دیتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ وہ جلیل القدر صحابی جن کو حضور اکرم ﷺ کی حیات وصحت میں حضور ﷺ کے امام بننے کا شرف حاصل ہوا تھا، یعنی حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ اُنہیں فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے اس طرزِ عمل پر اعتراض ہوا تو انہوں نے کہا:

> ''آپ اس بچے کو ہمارے برابر مقام دیتے ہیں حالانکہ ''إن لنا أبناء مثله'' (ہمارے بیٹے اس کی مثل ہیں) فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس سبب سے میں اس کو عزت دیتا ہوں تم اسے بخوبی جانتے ہو۔ پھر ایک اور مجلس میں فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس بات کی عملی شہادت پیش فرمائی، سب حاضرین سے سورۃ النصر کی بابت سوال فرمایا اور آخر میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا تو انہوں نے صحیح جواب دیا۔ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا: (بیٹا) ہم بھی اس مسئلہ میں اتنا ہی جانتے ہیں جتنا تم''۔

(بخاري: حديث ٣٦٢٧، ٤٢٩٤، ٤٤٣٠، ٤٩٦٩، ٤٩٧٠ ملخصاً)

سیدنا علی رضی اللہ عنہ صدر المفسرین

ابن عباس رضی اللہ عنہ کے حق میں یوں دعاءِ نبوی ہے: ''اے اللہ اس کو کتاب وحکمت سکھادے'' اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے حق میں یوں دعاءِ نبوی ہے ''اے اللہ! جو میں اپنے لیے مانگتا ہوں وہی علی کے لیے بھی مانگتا ہوں'' تو انہیں نبوت کے علاوہ سب کچھ دیا گیا، اور یہ جامع ترین دعا ہے اس لیے ہر چند کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ بڑے مفسر تھے مگر وہ سیدنا علی علیہ السلام کے شاگرد تھے۔ پوری امت میں سیدنا علی علیہ السلام سے بڑا مفسر کوئی نہیں ہوا، وہ تمام علوم میں سب

پر فائق تھے حتیٰ کہ تفسیر قرآن میں صدر المفسرین تھے، جیسا کہ ہم اس سے قبل شیخ زادہ، امام مناوی اور دوسرے علماء کرام سے نقل کر چکے ہیں، اور جب مولیٰ علی ؓ صدر المفسرین ہیں تو پھر کونسی چیز ایسی ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں نہ ہو؟ امام سیوطی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"ابن سراقہ نے کتاب الاعجاز میں امام ابوبکر بن مجاھد رحمۃ اللہ علیہما سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے ایک روز ارشاد فرمایا:

ما من شيء في العالم إلا وهو في كتاب الله.

"کائنات میں ایسی کوئی چیز نہیں جو قرآن مجید میں مذکور نہ ہو"۔

(الإتقان ج٢ ص ٢٦٠؛ معترك الأقران للسيوطي ج١ ص١٤)

یعنی اگر صراحۃً کسی چیز کا ذکر قرآن مجید میں نہ بھی ہو تو پھر بھی اہل فہم وارباب استنباط ہر چیز کی اصل قرآن کریم سے معلوم کر لیتے ہیں۔ چنانچہ امام زرکشی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وفي القرآن علم الأولين والأخرين وما من شيء إلا ويمكن إستخراجه منه لمن فهمه الله تعالى .

"قرآن مجید میں تمام اولین اور آخرین کا علم موجود ہے، اور کوئی ایسی چیز نہیں مگر اس کا ثبوت قرآن سے نکالنا اُس شخص کے لیے ممکن ہے جسے اللہ تعالیٰ نے فہم خاص سے نوازا ہو"۔

(البرهان في علوم القرآن ج٢ ص ٣٢٠؛ الإتقان للسيوطي ج٢ ص ٢٦٠؛ معترك الأقران للسيوطي ج ١ ص ١٤؛ روح المعاني ج١٤ ص٢٦٦)

حضرت ابوہریرہ ؓ سے تقابل

جب بعد کے اہل فہم قرآن کریم سے ہر چیز معلوم کر سکتے ہیں تو پھر اُس ہستی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جس کو ہاشمی حکمت وفہم حاصل تھی، جس کو لعابِ نبوی کی گھٹی عطا ہوئی، جسے معلّم کائنات کے اولین صحابی اور اولین شاگرد ہونے کی سعادت حاصل ہوئی، جس کی تربیت پر ایسی خصوصی توجہ فرمائی گئی کہ سوال اور بلاسوال اُس پر علوم وحکمت کی بارش ہوتی تھی اور جسے دس میں سے نو حصے حکمت عطا ہوئی؟ ہاں، ہاں قرآن وحکمت کی بدولت اُن پر فقط عالم دنیا ہی نہیں بلکہ عالمِ بالا کی بھی ہر شے عیاں تھی۔ جیسا کہ ہم امام راغب اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ

کے حوالہ سے لکھ چکے ہیں، اور امام غزالی، علامہ ابن قیم، امام سیوطی، امام قسطلانی اور امام صالحی شامی رحمۃ اللہ علیہم نے تو صوفیہ کرام کے بارے میں بھی ایسی تصریحات فرمائی ہیں۔

لہٰذا خود غور فرمایئے کہ اگر کوئی شخص علوم و اسرار کی جامع ایسی ہستی کا تقابل شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کے ساتھ ہی نہیں بلکہ دوسرے صحابہ کرام ﷺ کے ساتھ کرنا شروع کر دے تو کیا یہ تفریط اور شانِ مرتضوی میں تنقیص نہیں؟ پیر شیخ الحدیث والتفسیر نے تو حد ہی کر دی ہے، انہوں نے فہم و حکمت کے سلطان کا تقابل اُن حضرات سے کرنا شروع کر دیا جو محض روایتِ حدیث میں شہرت رکھتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں: کیا کسی مشہور محدث کا تقابل سراج الامہ سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ ﷺ سے کیا جا سکتا ہے؟ یہ تقابل کوئی متعصب غیر مقلد تو کر سکتا ہے مگر کسی مقلد سے متوقع نہیں، لیکن پیر شیخ الحدیث والتفسیر نے ایسا تقابل کر ہی ڈالا، چنانچہ وہ "تمام صحابہ علم کے دروازے ہیں" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

> "سیدنا ابو ہریرہ ﷺ فرماتے ہیں میں نے حضور ﷺ سے دو علم سیکھے۔ ایک وہ ہے جسے میں بیان کرتا ہوں اور ایک وہ ہے کہ اگر میں بیان کر دوں تو لوگ میری گردن کاٹ دیں لو بثثتہ لقطع ھذا البلعوم (بخاری حدیث رقم ۱۲۰)"۔

(ضربِ حیدری ص 222)

اس کے بعد پیر سائیں نے حضرت حذیفہ ﷺ کے صاحب السر ہونے کی روایت نقل کی، پھر لکھا:

> "ذرا چشمِ تصور سے غور فرمایئے۔ یہ الفاظ اگر مولا علی ﷺ کے بارے میں فرمائے گئے ہوتے تو یار لوگوں کی طرف سے باطن کے نام پر حشر بپا کر دیا جاتا"۔

(ضربِ حیدری ص 222)

اللہ اکبر عالم اور اس قدر لکیر کا فقیر! بھائی! کیا محض سماعی اور سماعی مع وجدانی علم برابر ہیں؟ کیا حدیث کا راوی اور مستنبط فقیہ برابر ہیں؟ اگر نہیں تو پھر ان میں کیا فرق ہے؟ یہ ہم اُن سے پوچھتے ہیں جن کے بارے میں خود پیر شیخ الحدیث والتفسیر لکھتے ہیں:

> "یہ تھے شیخ اکبر قدس سرہ جو اللہ کریم جل شانہ اور نبی کریم ﷺ سے پوچھ پوچھ کر کتابیں لکھنے کے عادی تھے"۔

(ضربِ حیدری ص 189)

اس سے قبل کہ ہم شیخ اکبر کی عبارت پیش کریں، یہ واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اہل اللہ اور صوفیہ پر اللہ ﷻ اور اُس کے حبیب مکرم ﷺ کے ایسے کرم ہوتے ہیں اور شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ بھی ایسے مقام پر فائز ہوں گے لیکن اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ کوئی غیر نبی انسان اختلاف سے مبراء ہے اور نہ ہی قرآن کے علاوہ کوئی کتاب خطا واغلاط سے پاک ہے۔ بعض مصنفین انجام کی فکر سے بے نیاز ہو کر اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے ایسی باتیں لکھ دیتے ہیں، قاسمی صاحب نے بھی اسی ذوق میں لکھ دیا ہے اور یہ نہیں سوچا کہ شیخ اکبر ؒ نے خدا ورسول [جل جلالہ وصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم] سے پوچھ پوچھ کر کہیں قاسمی صاحب کے نظریہ کے خلاف ہی نہ لکھ دیا ہو، اور لطف کی بات یہ ہے کہ انہوں نے لکھ ہی دیا ہے، چنانچہ قاسمی صاحب ترتیب خلافت بترتیب افضلیت کے وجوب کے قائل ہیں جبکہ شیخ اکبر اس کے خلاف ہیں، جیسا کہ ہم حدیث نمبر [۳۴،۳۵] کے تحت اُن کی عبارات پیش کریں گے۔ بہر حال جس شیخ اکبر کا مرتبہ پیر سائیں کے نزدیک یہ ہے وہی شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

قال الجنيد: لا يبلغ أحد درج الحقيقة حتىٰ يشهد فيه ألف صديق بأنه زنديق، وذلک لأنهم يعلمون من الله ما لا يعلمه غيرهم، وهم أصحاب العلم الذي كان يقول فيه علي بن أبي طالب ؓ حين يضرب بيده إلىٰ صدره ويتنهد: إن ههنا لعلوماً جمةً لو وجدت لها حملة، فإنه كان من الأفراد ولم يُسمع هذا من غيره في زمانه إلا أبي هريرة ذكر مثل هذا، خرّج البخاري في صحيحه عنه أنه قال: حملت عن النبي ﷺ جرابين: أما الواحد فبثثته فيكم، وأما الآخر فلو بثثته لقطع مني هذا البلعوم، البلعوم مجرى الطعام، فأبو هريرة ذكر أنه حمله عن رسول الله ﷺ، ونحن نتكلم فيمن أعطي عين الفهم في كلام الله تعالىٰ في نفسه وذلک علم الأفراد.

”حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اُس وقت تک کوئی شخص درجاتِ حقیقت تک نہیں پہنچتا جب تک کہ ہزار صدیق اُس کے بارے میں گواہی نہ دیں کہ وہ زندیق ہے، اور یہ اس لیے کہ وہ بارگاہِ الٰہی سے وہ جانتے ہیں جسے اُن کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور وہ ایسے علم والے ہیں جس کے بارے میں سیدنا علی المرتضیٰ ؓ نے اپنے سینہ مبارک پر ہاتھ مارتے ہوئے اور سرد آہ بھرتے ہوئے فرمایا تھا: یہاں علوم کا انبار ہے، کاش! اس کو اٹھانے والے ہوتے۔

بیشک سیدنا علی ؓ افراد سے تھے اوران کے زمانے میں ایسی بات کسی سے نہیں سنی گئی ماسوا ابوہریرہ ؓ کے، انہوں نے ایسی بات فرمائی تھی۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں اُن سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے نبی کریم ﷺ سے دوعلم حاصل کیے ہیں: اُن میں سے ایک کوتم میں پھیلادیا ہے اوراگر دوسرے کو پھیلاؤں تو میری یہ گردن کاٹ دی جائے گی۔
پس ابوہریرہ ؓ نے ذکر کیا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ علم اٹھایا، لہٰذا وہ اس میں بغیر ذوق کے محض ناقل ہیں لیکن وہ بھی ایک علم ہے اس لیے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا تھا، اور ہم فقط اس شخص کی بات کر رہے ہیں جس کو کلام الٰہی میں خصوصی فہم عطا کیا گیا ہو، جو فی نفسہٖ علم رکھتا ہو اور یہ افراد کا علم ہے"۔

(الفتوحات المكية، الباب الثلاثون ج١ ص٤٧٦ وط: ج١ ص٣٠٣)

اس مقام پر راقم الحروف خصوصاً اپنے اُن سنی علماء کرام سے ملتمس ہے جن سے انتہائی کاریگری سے "ضربِ حیدری" پر تقاریظ حاصل کرلی گئیں، وہ غور فرمائیں کہ صاحب "ضربِ حیدری" کس سطح پر اتر آئے ہیں کہ بابُ مدینۃ العلم اور بابُ دارالحکمۃ کا تقابل متاخرین صحابہ اور سیدنا علی المرتضیٰ ؓ کے تلامذہ کے ساتھ کرنے بیٹھ گئے۔
کیا کوئی حنفی شخص اس بات پر راضی ہوگا کہ امام اعظم ابوحنیفہ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہما کے مابین تقابل کیا جائے؟

سیدنا علی ؓ کے ساتھ اللہ ﷻ کی سرگوشی

اب تک بطور استدلال سیدنا علی ؓ کا اعلم اور محرمِ رازِ نبی ہونا ثابت کیا گیا اور اب ہم اس پر تصریحات پیش کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے وہ حدیث ملاحظہ فرمائیے جس میں تصریح ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے سیدنا علی ؓ کے ساتھ سرگوشی فرمائی۔ چنانچہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

عن جابر قال: دعا رسول الله ﷺ علياً يوم الطائف فانتجاه، فقال الناس: لقد طال نجواه مع ابن عمه، فقال رسول الله ﷺ: ما انتجيته ولكن الله انتجاه.

"حضرت جابر ؓ بیان کرتے ہیں کہ طائف کے دن رسول اللہ ﷺ نے سیدنا علی ؓ کو بلا کر اُن سے سرگوشی فرمائی تو لوگ کہنے لگے: حضور ﷺ کی سرگوشی اپنے چچازاد کے ساتھ طویل ہو گئی، اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے اس کے ساتھ سرگوشی نہیں کی لیکن اللہ ﷻ نے

اُس کے ساتھ سرگوشی فرمائی ہے"۔

(جامع الترمذي ص۸٤۸ حديث ۳۷۲٦؛ مسند أبي يعلىٰ ج۲ ص۳۲۳ حديث ۲۱٦۰ وط: ج٤ ص ۱۱۸ حديث ۲۱٦۳؛ جامع الأصول ج٦ ص۳۱۸، ۳۱۹؛ مصابيح السنة ج٤ ص ۱۷۵ حديث ٤۷۷۳؛ أسد الغابة ج٤ ص۱۱٦؛ تاريخ دمشق ج٤۲ ص۳۱٦، ۳۱۷؛ مختصر تاريخ دمشق ج۱۷ ص۳۷۸؛ الرياض النضرة ج٤ ص۱٤٦؛ جمع الجوامع ج ۱٤ ص۲۲۱ حديث ۱۰۲۸۵؛ جمع الفوائد ج۲ ص٤۰۸ حديث ۸٦۹۱ وط: ج۳ ص۵۱۳ حديث ۸٦۹۱؛ إزالة الخفاء ج٤ ص ٤٦۲؛ در السحابة للشوكاني ص ۲۰۲)

صاحب "ضربِ حیدری" نے بھی اس حدیث کا ترجمہ نقل کیا ہے اور اس پر امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی تحسین بھی نقل کی ہے۔

(ضربِ حیدری ص 221)

وہ کون لوگ تھے جنہوں نے اس موقعہ پر کہا تھا کہ سرگوشی طویل ہوگئی؟ اس سلسلے میں ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

"یہ منافقین یا عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے"۔

(مرقاة شرح المشكاة ج۱۰ ص٤۷۱؛ تحفة الأحوذي ج۱۰ ص۲۱٦)

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ خیال درست نہیں ہے، اس لیے کہ بعض روایات میں ہے کہ یہ سوال حضرت سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کیا تھا اور بعض روایات میں اُن کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام بھی منقول ہے، ملاحظہ ہو:

(المعجم الكبير ج۲ ص۸ حديث ۱۷۳۵؛ معرفة الصحابة لأبي نعيم ج۱ ص٤٤۱ وط: ص ۵۳۳، ۵۳٤ حديث ۱٤۹۵؛ تاريخ دمشق ج٤۲ ص۳۱۵)

کیا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ واقعی اللہ تعالیٰ نے سرگوشی فرمائی تھی؟ اس سلسلے میں محدثین کرام لکھتے ہیں:

"یہ سرگوشی اللہ تعالیٰ کے خاص حکم پر کی گئی، اسی لیے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی، اور یہ اس ارشادِ باری تعالیٰ کی طرح ہے: ﴿وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى﴾ [الأنفال: ۱۷] (اور نہیں پھینکی (مشتِ خاک) آپ نے، جب پھینکی آپ نے، لیکن اللہ نے پھینکی)

(شرح الطيبي ج۱۲ ص۳۸۸۷؛ مرقاة ج۱۰ ص٤۷۱؛ تحفة الأحوذي ج۱۰ ص۲۱٦)

اس طویل سرگوشی میں سیدنا علی ﷺ کو کیا کیا بتایا گیا ہوگا؟ اس کا مکمل علم تو اللہ ﷻ اور اُس کے رسول ﷺ کو ہے البتہ محدثین حضرات نے لکھا ہے کہ:

كان ذلك أسراراً إلٰهية وأموراً غيبية.

"یہ اسرارِ الٰہی اور غیبی امور تھے"۔ ✿

(شرح الطيبي على المشكاة ج١٢ ص٣٨٨٧؛ مرقاة شرح المشكاة ج١٠ ص٤٧١؛ تحفة الأحوذي ج١٠ ص٢١٦؛ التعليق الصبيح علىٰ مشكاة المصابيح ج٧ ص٣٢٨)

اب آپ حضرت حذیفہ ﷺ اور سیدنا علی ﷺ کے مابین مفاضلہ کریں۔ حضرت حذیفہ ﷺ ازخود شر اور فتنوں کے متعلق سوالات کرتے تھے اور حضور ﷺ جواب مرحمت فرماتے تھے اور کبھی کبھی جواب دینے سے گریز بھی فرماتے تھے، جبکہ سیدنا علی ﷺ پر خدا کا ایسا مخصوص کرم تھا کہ ہر روز اُن پر سوال و بلا سوال علم کی بارش ہوتی تھی اور کبھی حکمِ الٰہی پر اُن کے ساتھ خاص اور طویل سرگوشی بھی ہوتی تھی۔ بتلایئے! کیا ازخود سوال کرنے والے شخص اور اللہ تعالیٰ کے منتخب شخص میں کوئی فرق نہیں؟ اور کیا اِس میں بھی کوئی فرق نہیں کہ ایک کو فقط اُس کے سوال کا جواب دیا جائے اور دوسرے کو بلا سوال اسرارِ الٰہیہ بتائے جائیں؟ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ کیا مُخلِصْ اور مُخلَصْ میں کوئی فرق نہیں؟ خدارا کچھ تو سوچیے! جس ہستی کو شیخین کریمین اور دوسرے صحابہ کرام ﷺ کی موجودگی میں بہ حکمِ خداوندی اسرار و غیوب کے لیے منتخب کیا گیا اُس کا مفاضلہ و موازنہ شیخین کریمین رضی اللہ عنہما سے ہی نہیں بلکہ دوسرے صحابہ کے ساتھ کرنا، کیا یہ انصاف ہے؟

یہاں یہ بھی یاد رہے کہ نبی کریم ﷺ کی سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کے ساتھ سرگوشی اور اسرار و غیوب سے آگاہی کا یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہا حتیٰ کہ آخری سرگوشی بھی اُن ہی کے ساتھ ہوئی تھی۔ ام المومنین سیدتنا ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے ایک لمبی حدیث کے شروع میں اُن کی ہمیشہ کی سرگوشی کا ذکر یوں فرمایا ہے:

أن أقرب الناس عهداً برسول الله صلى الله عليه وسلم علي ﷺ.

"تمام لوگوں سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ کے قریب ترین علی ﷺ تھے"۔

✿ اس حدیث کی تشریح میں ملا علی القاری رحمۃ اللہ علیہ سے بوجہ عدم تدبر ایک نامناسب توجیہ ہوگئی، جس کی وضاحت حدیث نمبر[٢٧] کے تحت کی جائے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

یہاں عہد سے اسرار ورموز کا امین ہونا مراد ہے، اس لیے کہ اسی حدیث پاک کے آخر میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کی ظاہری حیات کے آخری لمحات میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے آپ کی طرف سر جھکایا:

فكان آخر الناس به عهداً، فجعل يساره ويناجيه.

''پس وہ سب لوگوں سے آخر میں آپ سے ملنے، سرگوشی کرنے والے اور محرم راز تھے''۔

(السنن الكبرى للنسائي ج٧ ص٤٦٥ حديث٨٤٨٠ط: ج٥ص١٥٤ حديث٨٥٤٠؛ المصنف لابن أبي شيبة ج٦ص٣٦٨ حديث٣٢٠٥٧؛ وط: ج١٠ ص٤٨٠ حديث٣٢٦٦٤ ،وط: ج١١ ص١٣٦ حديث٣٢٦٠٢؛ مسند أحمد ج٦ص٣٠٠ حديث٢٧١٠٠؛ مسند أبي يعلىٰ ج١٢ ص٣٦٤ حديث٦٩٣٤؛ المستدرك للحاكم ج٣ص١٣٨ حديث٤٧٢٦؛ المعجم الكبير ج١٠ ص١٠٨ حديث١٩٣٣٠؛ تاريخ مدينة دمشق ج٤٢ص٣٩٤؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٨ ص٢١)

ایک حدیث شریف میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

صاحبُ سري علي بن أبي طالب.

''علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ میرا محرم راز ہے''۔

(الفردوس بمأثور الخطاب ج٢ ص٣٠٥ حديث٣٧٩٣؛ فردوس الأخبار ج٢ ص٥٦١ حديث٣٦٠٩؛ تاريخ دمشق ج٤٢ ص٣١٧؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٧ ص٣٧٩؛ كنوز الحقائق ج١ ص٣٤٤ حديث٤٣٠٩؛ ينابيع المودة ج٢ ص٧٧)

محرم راز وہی ہوتا ہے جو بلا ضرورت راز کو افشا نہ کرے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مقدس سینہ میں اگر چہ قیامت تک کے لیے تمام احوال و اسرار محفوظ تھے مگر وہ بلا ضرورت افشا کرنے سے اجتناب فرماتے تھے، ہاں مگر جب ضرورت پیش آئی تو ماضی حال اور مستقبل کو عیاں فرمادیا۔ بطور نمونہ چند ارشادات ملاحظہ فرمائیں:

- ابو سالم الجیشانی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے ایک مرتبہ کوفہ میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو بیان کرتے ہوئے سنا:

مامن ثلاثمائة تخرج إلا و لو شئت سميت سائقها و ناعقها إلى يوم القيامة.

''کوئی ایسا گروہ جو فقط تین سو افراد پر مشتمل ہو اور فتنہ کے لیے نکلے، اگر ہم چاہیں تو قیامت تک کے لیے اس کے محرک اور قائد کا نام بتلا سکتے ہیں''۔

(كتاب الفتن لنعيم بن حماد ص١٧)

❀ حضرت زر بن حبیش ﷺ کی حدیث میں تو سو (۱۰۰) افراد کا ذکر ہے، یعنی سو افراد پر مشتمل اگر کوئی فتنہ گر جماعت ہوگی تو میں اس کے قائد اور محرک وغیرہ کو جانتا ہوں، حتیٰ کہ فرمایا:

ما بينكم وبين قيام الساعة.

''تمہارے احوال سے لے کر قیامت تک''۔

(كتاب الفتن لنعيم بن حماد ص ۲۰)

❀ بعض مرتبہ تو سیدنا علی ﷺ نے بعض حضرات کو نامزد کر کے فرمایا کہ عنقریب تمہیں مجبور کیا جائے گا کہ تم مجھے برا کہو۔ چنانچہ حضرت ابو عیاض مولیٰ عیاض بن ربیعہ الاسدی ﷺ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ نے اُنہیں فرمایا:

''تم پر ایک ایسا شخص مسلط ہوگا جو تمہیں مجھ پر سب و شتم کرنے اور مجھ سے تعلق ختم کرنے پر مجبور کرے گا۔ رہا مجھ پر سبّ و شتم کرنے کا معاملہ تو اس میں تمہارے لیے نجات ہوگی اور میرے درجات میں اضافہ ہوگا، اور رہا مجھ سے قطع تعلق، تو وہ ہرگز نہ کرنا کیونکہ میں دین فطرت پر قائم ہوں''۔

(تاريخ دمشق ج۴۲ ص۵۸۸؛ مختصر تاريخ دمشق ج۱۸ ص ۹۸؛ جمع الجوامع ج۱۳ ص ۱۵۸ حديث ۶۲۶۹، وط: ج۱۷ ص ۶۵۴ حديث ۰۰ ۹؛ كنز العمال ج۱۱ ص ۳۰۲ حديث ۳۱۵۷۵)

امام ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہ اثر تفصیلاً روایت کیا ہے، اُس کے آخری الفاظ یہ ہیں:

وإنكم ستعرضون على سبّي وعلى البراءة مني، فمن سبّني فهو في حِلّ من سبّي، ولا تبرؤوا من دِيني فإني على الإسلام.

''اور بیشک تمہیں مجھ پر سبّ و شتم کرنے اور مجھ سے قطع تعلق کرنے پر مجبور کیا جائے گا، سو جو شخص مجھ پر سب و شتم کرے گا تو وہ اُس کی خلاصی کا سبب ہوگا، اور تم میرے دین سے لاتعلق نہ ہونا کیونکہ میں اسلام پر قائم ہوں''۔

(المصنف لابن أبي شيبة ج۲۱ ص ۹۵ حديث ۳۸۴۰۹، وط: ج۱۴ ص ۵۲، ۵۳ حديث ۳۸۲۵۰، وط: ج۱۳ ص ۲۶۵ حديث ۳۸۲۷۰؛ تاريخ دمشق ج۴۲ ص۵۸۸؛ كنز العمال ج۵ ص ۷۸۰ حديث ۱۴۳۶۸؛ موسوعة العشرة المبشرون بالجنة ج۱۵ ص ۵۴)

شیخ محمد عوامہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اس کی سند حسن ہے۔

(المصنف لابن أبي شيبة ج ۲۱ ص ۹۵)

حضرت حجر المدری بیان کرتے ہیں کہ مجھے سیدنا علی بن ابی طالب نے فرمایا:

كَيْفَ بِكَ إِذَا أُمِرْتَ أَنْ تَلْعَنَنِيْ ؟

''اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تمہیں مجھ پر لعنت کرنے کا حکم کیا جائے گا؟ میں نے عرض کیا:

أَوَ كَائِنٌ ذٰلِكَ؟ (کیا یہ ہونے والا ہے؟) فرمایا: ہاں۔ میں نے عرض کیا: پھر میں کیا کروں؟

فرمایا: '' اِلْعَنِّي وَلَا تَبَرَّأْ مِنِّيْ '' (بظاہر) مجھ پر (زبان سے) لعنت کر لینا اور (قلباً) مجھ سے جدا نہ ہونا) راوی کا کہنا ہے کہ پھر محمد بن یوسف (حجاج کے بھائی کا دور آیا) اور وہ منبر کے پہلو میں کھڑا ہوا، اور حضرت حجر المدری کو حکم کیا کہ علی پر لعنت کر! انہوں نے کہا:

إِنَّ الْأَمِيْرَ أَمَرَنِيْ أَنْ أَلْعَنَ عَلِياً مُحَمَّدُ بْنُ يُوْسُفَ، اَلْعَنُوْهُ لَعَنَهُ اللّٰهُ.

''امیر نے مجھے آرڈر کیا ہے کہ میں علی پر لعنت کروں، محمد بن یوسف، تم اس پر لعنت کرو، اللہ کی اس پر لعنت ہے''۔

اس کے بعد مجلس منتشر ہوگئی لیکن اس حکمت کو ایک شخص کے سوا کوئی اور نہ سمجھ سکا''۔

(كتاب الأذكياء لابن الجوزي ص ١١٦؛ أخبار الظراف والمتماجنين لابن الجوزي ص ٦٧، وط: ص ٧١؛ مرآة الزمان لسبط ابن الجوزي ج ٩ ص ٤٥٢، ٤٥٣؛ تاريخ دمشق ج ٥٦ ص ٣١٠، ٣١١؛ مختصر تاريخ دمشق ج ٢٣ ص ٣٦٦، ٣٦٧؛ جمع الجوامع للسيوطي ج ١٣ ص ٤٢٨ حديث ٨٠٤٤، وط: ج ١٨ ص ٤٨٦ حديث ٢٦٤٦؛ تاريخ الخلفاء للسيوطي ص ١٣٨)

مطلب یہ ہے کہ حضرت حجر المدری نے اُموی جابر حاکم کے دباؤ کے پیشِ نظر لعنت کے الفاظ تو ادا کر دیئے لیکن انتہائی ذہانت وفطانت سے ''اَلْعَنُوْهُ'' کی ضمیر خود اُسی حاکم کی طرف لوٹا کر اُسی پر لعنت کر گئے اور وہ احمق خوش فہمی کا شکار رہا۔ اندازہ فرمایئے کہ بنو امیہ کے دور میں ایسے مکروہ واقعات کا پیش آنا کوئی نئی بات نہیں تھی، لیکن مولیٰ علی کا خاص ایک بندے کو مخاطب کر کے فرمانا کہ خاص طور پر تجھے بھی ایسا واقعہ پیش آئے گا اسرار الٰہیہ پر اطلاع کی کتنی واضح دلیل ہے؟ علامہ ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

فهذا من كرامات علي وإخباره بالغيب.

"یہ سیدنا علی ﷛ کی کرامت ہے اور غیب کی اطلاع ہے"۔

(الصواعق المحرقة ص۱۲۸)

امام ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے مختلف مقامات پر ابوعبداللہ الضبی، شیبان بن مخزوم عثمانی اور ھرثمہ بن سلمی سے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں:

"بعض غزوات سے واپسی پر ہم سیدنا علی المرتضیٰ ﷛ کے ساتھ تھے کہ وہ ایک مقام پر اترے اور وہاں کی مٹی اُٹھا کر سونگھی تو فرمایا: واہ اے مٹی! تجھ پر ایک ایسی قوم شہید ہوگی جو بلا حساب جنت میں داخل ہوگی، اور وہ کربلاء کا مقام تھا"۔

(مختصر تاریخ دمشق ج۷ ص۱۳۵، ۱۴۷، ۱۴۸ ملخصاً؛ جمع الجوامع ج۱۳ ص۵۷ حدیث ۵۶۵۶، وط: ج۱۷ ص۳۱۳ حدیث۲۸۶)

امام محب الدین طبری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"اصبغ بن نباتہ ﷛ بیان کرتے ہیں کہ ہم سیدنا علی ﷛ کے ساتھ تھے کہ وہ سیدنا امام حسین ﷛ کی قبر اقدس کے (بنائے جانے کے) مقام سے گذرے تو فرمایا: یہ اُن کی سواریوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے، یہاں اُن کی سواریوں کے کجاوے رکھے جائیں گے اور یہ وہ جگہ ہے جہاں آلِ محمد ﷺ کی ایک جماعت کا خون گرے گا، اُس وقت اُن پر آسمان و زمین روئیں گے"۔

(الریاض النضرة ج٤ ص۱۷۲، ۱۷۳؛ ذخائر العقبیٰ ص۱۱۷؛ جواهر العقدین ص۴۰۲؛ الصواعق المحرقة ص۱۹۳؛ إزالة الخفاء ج٤ ص٤٩٥؛ حقائق عن التصوف لعبد القادر عیسیٰ ص۳٤٦)

غرضیکہ کسی ضرورت یا خاص موقعہ کی مناسبت سے سیدنا علی ﷣ اپنے مقدس سینے میں مخفی اسرار سے کبھی کبھار یا تو قولاً پردہ اٹھاتے تھے یا پھر اپنے باطنی علم کے مطابق کوئی عمل کر گزرتے تو لوگوں کو بعد میں معلوم ہوتا کہ یہ بات سیدنا علی ﷛ کو پہلے سے معلوم تھی۔ درج ذیل عنوان کی سطور میں غور فرمائیں تو آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی۔

اپنے ماہ و سال اور ایام کا علم ہونا

سیدنا علی ﷛ کو اپنی زندگی کے ماہ و سال اور ایام بھی معلوم تھے۔ چنانچہ امام ابن اثیر الجزری رحمۃ اللہ علیہ

سند کے ساتھ لکھتے ہیں:

''حضرت عثمان بن مغیرہ بیان کرتے ہیں کہ جب ماہِ رمضان المبارک جلوہ گر ہوا تو سیدنا علی المرتضیٰ نے ایک رات سیدنا امام حسن کے ہاں گذاری اور ایک رات سیدنا امام حسین کے ہاں گذاری اور ایک شب حضرت عبداللہ بن جعفر کے ہاں گذاری۔ وہ تین لقموں سے زیادہ نہیں لیتے تھے اور فرماتے تھے: اللہ تعالیٰ کا حکم آئے اور میرا پیٹ بھرا ہوا ہو؟ بس میں ایک دو راتوں کا مہمان ہوں''۔

(أسد الغابة ج٤ ص١٢٨؛ تاريخ مدينة دمشق ج٤٢ ص٥٥٥؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٨ ص٨٨؛ جمع الجوامع ج١٣ ص٣٧٤ حديث ٧٧٤٣، وط: ج١٨ ص٣٥٩ حديث ٢٣٤٥؛ سراج الطالبين للشيخ دحلان الجمفسي الكديري ج١ ص٤٢٥)

آخری دن کا حال سنئے، امام ابن عساکر اور دوسرے علماء کرام نے لکھا ہے:

''جب سیدنا علی نمازِ فجر کے لیے آرہے تھے تو بطخوں نے اُن کے سامنے شور مچانا شروع کردیا، لوگوں نے انہیں ہٹانا چاہا تو اُنہوں نے فرمایا:

ذروهن فإنهن نوائح، فضربه ابن ملجم.

''انہیں رہنے دو یہ نوحہ کررہی ہیں، پھر اُن پر ابن ملجم نے حملہ کردیا''۔

(تاريخ دمشق ج٤٢ ص٥٥٥؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٨ ص٨٨، ٨٩؛ مقتل أمير المؤمنين علي بن أبي طالب من موسوعة ابن أبي الدنيا ج٨ ص٢٩٦؛ أسد الغابة ج٤ ص١٢٨؛ الكواكب الدرية ج١، القسم الأول ص١١٢؛ جمع الجوامع ج١٣ ص٣٧٤ حديث ٧٧٤٤، وط: ج١٨ ص٣٦٠ حديث ٢٣٤٦؛ المنح المكية لابن حجر مكي ص٥٨٦؛ جواهر العقدين ص٤٠٠؛ سراج الطالبين للشيخ دحلان الجمفسي ج١ ص٤٢٥؛ كرامات صحابة للتهانوي ص٤٢)

امام ابن اثیر الجزری رحمۃ اللہ علیہ یہ روایات نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

وهذا يدل على أنه علم السَّنة والشهرَ والليلة التي يُقتَل فيها، والله أعلم.

''یہ اس امر پر دلالت ہے کہ سیدنا علی کو شہادت کا سال، ماہ اور تاریخ معلوم تھی، واللہ اعلم''۔

(أسد الغابة ج٤ ص١٢٨)

خلاصہ یہ ہے کہ بابُ مدینۃ العلم ہونے، بابُ دارالحکمۃ ہونے، دس میں سے حکمت کے نو حصوں کے امین ہونے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ سرگوشی کرنے وغیرہ احادیث ودلائل کی وجہ سے یہ عقیدہ رکھنا حق ہے کہ سیدنا علی المرتضیٰ علیہ السلام سے بڑھ کر نہ تو کوئی دوسرا شخص عالم تھا اور نہ ہی اُن سے بڑھ کر کوئی اور شخص اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا محرم راز تھا، واللہ اعلم۔

حکمت کا ثمرہ، اچھا انجام

علماء کرام نے حکمت کے چند معانی ایسے لکھے ہیں جن میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حکمت ایک ایسی معنوی قوت ہے جو حکیم (صاحبِ حکمت) کو اُس کے ہر قول وعمل میں اچھے انجام سے ہمکنار کرتی ہے اور برے نتیجہ سے محفوظ رکھتی ہے۔ چنانچہ اگر علامہ السید الشریف الجرجانی کے بیان کردہ درج ذیل چار معانی میں غور کیا جائے تو یہی مفہوم برآمد ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

۱۔ الحكمة: يستفاد منها ما هو الحق في نفس الأمر بحسب طاقة الإنسان.

"جس کے ذریعے انسان حسبِ استطاعت یقینی حق سے مستفید ہو وہ حکمت ہے"۔

۲۔ كل كلام وافق الحق فهو حكمة.

"ہر وہ کلام جو حق کے موافق ہو تو وہ حکمت ہے"۔

۳۔ هي وضع شيء في موضعه.

"کسی چیز کو اس کا صحیح مقام دینا حکمت ہے"۔

۴۔ هي ما له عاقبة محمودة.

"جس عمل کا انجام بہتر ہو وہ حکمت ہے"۔

(كتاب التعريفات للشريف ص٦٦)

ظاہر ہے کہ اس سے محض دنیوی نشیب وفراز اور نفع ونقصان کی تمیز مراد نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ شرعی اور ایمانی دانائی بھی مراد ہے۔ چنانچہ علامہ ابن قیم الجوزیہ حکمت کے مذکورہ بالا معانی کے بعد لکھتے ہیں:

وأحسن ما قيل في الحكمة: قول مجاهد ومالك: إنها معرفة الحق والعمل به، والإصابة في القول والعمل، وهذا لايكون إلا بفهم القرآن، والفقه في شرائع

الإسلام وحقائق الإيمان.

والحكمة: حكمتان: علمية وعملية. فالعلمية: الاطلاع على بواطن الأشياء، ومعرفة ارتباط الأسباب بمسبباتها، خلقاً وأمراً، قدراً وشرعاً، والعملية: كما قال صاحب المنازل: وهي وضع الشيء في موضعه.

''اور حکمت کے بارے میں جو بہترین بات کہی گئی وہ امام مجاھد اور امام مالک کا یہ قول ہے کہ حق کی معرفت اور اس پر عمل اور قول و فعل میں درستگی حکمت ہے، اور اس کا فہم قرآن، احکام اسلامی اور حقائقِ ایمانی کی سمجھ کے بغیر کوئی تصور نہیں۔

اور حکمت کی دو قسمیں ہیں: [۱] علمی [۲] عملی۔ علمی حکمت تمام چیزوں کے باطن پر مطلع ہونا ہے، اور اسباب کی اُن کے مسبب کے ساتھ ایجادی، حکمی، تقدیری اور شرعی ہم آہنگی کی معرفت کا ہونا ہے، اور عملی حکمت وہ ہے جو ''صاحب المنازل'' (منازل السائرین) نے بیان فرمائی: اور وہ ہے ہر چیز کو اس کا اصل مقام دینا''۔

(مدارج السالکین ج۲ ص ٤٤٨، وط: ج۲ ص ٤٩٨)

چند توضیحی تمثیلات کے بعد علامہ ابن قیم نے لکھا ہے:

فالحكمة إذاً: فعل ما ينبغي، على الوجه الذي ينبغي، في الوقت الذي ينبغي. والله تعالىٰ أورث الحكمة آدم وبنيه. فالرجل الكامل: من له إرث كامل من أبيه، ونصف الرجل ـ كالمرأة ـ له نصف ميراث. والتفاوت في ذلك لا يحصيه إلا الله تعالىٰ.

''پس اس توضیح کی روشنی میں حکمت ایسا فعل ہوگا جو مناسب ہو، ایسے طریقے پر ہو جو مناسب ہو اور ایسے وقت میں ہو جو مناسب ہو۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام اور اُن کی اولاد کو حکمت کا وارث بنایا، پس کامل رجل (مرد) وہ ہے جس کے پاس اپنے باپ کی کامل وراثت ہو، اور آدھا رجل (مرد) وہ ہے جس کے پاس عورت کی طرح آدھی میراث ہو، اور اس (حکمت کے ملنے) میں تفاوت کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا''۔

(مدارج السالکین ج۲ ص ٤٤٩، وط: ج۲ ص ٤٩٩)

علامہ سید شریف الجرجانی اور ابن قیم نے لفظِ حکمت کے جو معانی بیان کیے ہیں اُنہیں مدنظر رکھ کر سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کی مکمل زندگی کا بالعموم اور اُن کی خلافت کی زندگی کا بالخصوص جائزہ لیا جائے اور پھر خصوصاً اُن لڑائیوں پر تحقیقی نگاہ ڈالی جائے جو کفار کے ساتھ نہیں (کیونکہ اُن کے ساتھ جنگ کرنے میں ایک پہلو سے آسانی ہوتی ہے کہ حق کے مقابلہ میں کھلا باطل ہوتا ہے) بلکہ اپنوں کے ساتھ ہوئی تھیں، اور اُن میں سے بعض جنگوں کے سربراہ مبشرون بالجنۃ تھے، بعض میں اُن سے کم درجہ کے لوگ تھے اور بعض میں بہ کثرت قرآن پڑھنے والے مگر بدعقیدہ لوگ تھے۔ ایسے میں صواب وخطا میں تمیز کرنا انتہائی دشوار تھا، مگر سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کو پروردگار کی طرف سے نورِ حکمت اور بصیرت اس قدر وافر مقدار میں عطا تھی کہ بغیر کسی مشیر کے آپ نے جو بھی قدم اُٹھایا بالآخر وقت نے ثابت کر دیا کہ آپ کا ہر اقدام صواب پر مبنی تھا، اور ایسا ہونا ضروری تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں دس میں سے حکمت کے نو حصے عطا فرمائے تھے، اور یہی سید شریف جرجانی اور ابن قیم کے بیان کردہ معانی کا خلاصہ مفہوم ہے کہ حکمت اچھے انجام سے ہمکنار کرتی ہے، اور کسی انسان کا سب سے اچھا انجام یہ ہے کہ وہ دنیا و آخرت کی رسوائی اور شرمندگی سے محفوظ رہے اور رحمتِ ایزدی سے مالا مال ہو جائے۔ امام زجاج رحمۃ اللہ علیہ نے لفظ حکمت کی کیا ہی خوب تفسیر فرمائی ہے، وہ "وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا" (جسے حکمت دی گئی اسے خیر کثیر دی گئی) کے تحت لکھتے ہیں:

أي أعطي كل العلم وما يُوصِل إلىٰ رحْمَةِ الله.

"یعنی اسے کُل علم اور ہر وہ چیز دی گئی جو رحمتِ الٰہیہ تک پہنچاتی ہے"۔

(معاني القرآن وإعرابه للزجاج، ج۲ ص ۳۵۲)

اسی جملہ کے تحت اسی مفہوم کو ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے یوں ادا کیا ہے:

جامعاً لخير الدنيا والآخرة.

"صاحب حکمت دنیا و آخرت کی خیر کو جمع کرنے والا ہوتا ہے"۔

(تفسير ملا علي القاري ج۱ ص ۲۴۰)

یہ وفورِ حکمت ہی کی برکت تھی جو ہر ہر مقام پر مولیٰ علی علیہ السلام کو اُن کے اچھے انجام کی فکر میں رکھتی تھی۔ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے اُنہیں مستقبل میں آنے والی کچھ مشکلات کے بارے میں آگاہ فرمایا تو انہیں اُن کی حکمت نے خاموش نہ رہنے دیا، انہیں اپنے دین کی فکر لاحق ہو گئی اور وہ سوال کرنے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ امام حاکم رحمۃ

اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیدنا علی المرتضی رضی اللہ عنہ کو فرمایا:

أما إنک ستلقیٰ بعدي جهداً، قال: في سلامة مِنْ ديني؟ قال: في سلامة من دينک.

''تمہیں میرے بعد مشکل پیش آئے گی، عرض کیا: میرے دین کی سلامتی میں؟ فرمایا: ہاں تمہارے دین کی سلامتی میں''۔

(المستدرك ج٣ص١٣٩ حديث٤٧٣٢؛المصنف لابن أبي شيبة ج١٧ص١٢٧ حديث ٣٢٧٨٠، و ط: ج١٠ص٤٨٣ حديث٣٢٧١٤،وط: ج١١ص١٥٠ حديث٣٢٦٥٣؛الخصائص الكبرىٰ ج٢ص٢٣٥،وط: ج٢ص٢٥٤ حديث٢٣٩٨؛نزل الأبرار ص٦١؛الأنوار الباهرة ص٧٩)

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں یمن کی طرف قاضی بنا کر بھیجنا چاہا تو اُس وقت بھی اُن کی حکمت ودانائی نے انہیں خاموش نہ رہنے دیا اور عرض کرنے لگے: میں کم عمر شخص ہوں، کیسے فیصلے کروں گا تو اس پر انہیں دائمی ہدایت اور قوتِ فیصلہ سے نواز دیا گیا، جبکہ بعض لوگوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مملکت کے ملنے کی پیش گوئی فرمائی تو اُن سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ وہ عرض کرتے یا رسول اللہ: دعا فرمادیجئے! میں اس ذمہ داری عہدہ برآ ہوسکوں۔ فکر اپنی اپنی، نصیب اپنا اپنا۔

بعض روایات میں سیدنا علی علیہ السلام سے ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں سینے سے لگا کر رو پڑے تو انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کو کیا چیز رُلاتی ہے؟ فرمایا:

ضغائن في صدور أقوام لايبدونها لک إلا من بعدي،قال: قلت: يارسول الله في سلامة من ديني؟ قال: في سلامة من دينک.

''تمہارے بارے میں بعض قوموں کے سینوں میں کینے ہیں جو وہ میرے بعد ظاہر کریں گے۔ وہ فرماتے ہیں: میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میرے دین کی سلامتی میں؟ فرمایا: تمہارے دین کی سلامتی میں''۔

(مسند أبي يعلىٰ ج١ص٢٥٦ حديث٥٦١،وط: ج١ص٤٢٦،٤٢٧ حديث٥٦٥؛مسند البزار ج ٢ ص٢٩٣ حديث٧١٦؛المناقب للمكي ص٦٥؛إتحاف الخيرة المهرة ج٧ص١٩١ حديث ٦٦٥٢،

وط: ج٩ص٢٥٣حديث٨٩٣٤؛ كشف الأستار ج٣ص١٨٣ حديث٢٥٢٣ ؛مختصر زوائد البزار للعسقلاني ج٢ص٣١٣حديث١٩٢٢؛ المطالب العالية ج٤ص٦٠،٦١ حديث ٣٩٦٠، وط: ج ١٦ص١٠١ حديث٣٩٣٣؛ تاريخ دمشق ج٤٢ص٣٢٢،٣٢٣؛ إزالة الخفاء ج٤ص٥٠٥)

حافظ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"اس حدیث کو امام ابو یعلیٰ اور امام بزار نے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں فضل بن عمیرہ ہے، امام ابن حبان نے اس کی توثیق فرمائی ہے اور دوسروں نے تضعیف، اور باقی تمام راوی ثقہ ہیں"۔

(مجمع الزوائد ج٩ص١١٨،١١٩، وط: ج٩ص١٥٦ حديث ١٤٦٩٠)

حالانکہ اِس سے قبل بھی سیدنا علی رضی اللہ عنہ اپنے انجام خیر سے باخبر تھے کیونکہ وہ نہ صرف یہ کہ غزوۂ بدر کے عظیم مجاہد تھے، غزوۂ خیبر میں محبوبِ خدا کے لقب سے سرفراز ہوئے تھے، عشرہ مبشرہ میں شامل تھے بلکہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بارہا یہ بشارت بھی سن چکے تھے کہ وہ جنت میں آپ کے ساتھ آپ ہی کے درجہ میں ہوں گے۔ اس کے باوجود اُن کا اپنے دین کی سلامتی کے متعلق فکرمند ہونا اُس وفورِ حکمت کی دلیل ہے جو اُنہیں تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے زیادہ حاصل تھی۔




سب سے بڑے قاضی سیدنا علی رضی اللہ عنہ

﴿۳۵﴾ وأخبرنا الحسن بن أحمد، عن علي بن أحمد، أخبرنا محمد بن أحمد اللبان كتابةً، أخبرنا الحسن بن أحمد المقري، أخبرنا أحمد بن عبد الله الحافظ، حدثنا عبد الله بن جعفر بن الهيثم، أخبرنا جعفر بن محمد الصايغ، أخبرنا قبيصة بن عقبة، أخبرنا سفيان، عن حبيب بن أبي ثابت، عن سعيد بن جبير، عن ابن عباس رضي الله عنه، قال:

قال عمر رضي الله عنه: علي أقضانا وأبيّ أقرأنا.

﴿۳۵﴾ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: علی ہمارے سب سے بڑے قاضی ہیں اور ابی بن کعب ہمارے سب سے بڑے قاری ہیں۔

(بخاري ص٧٦١ حديث ٤٤٨١؛ مسند أحمد ج٥ ص١١٣، وط: ج٧ ص٧٧، ٧٨ حديث ٢١٤٠٠، ٢١٤٠١، ٢١٤٠٢؛ المستدرك ج٣ ص٣٠٥، وط: ج٤ ص٣٥٩ حديث ٥٣٨٠؛ حلية الأولياء ج١ ص١٠٦؛ الاستيعاب ج٣ ص٢٠٥؛ الطبقات الكبرى لابن سعد ج١ ص٤٢٠، وط: ج٢ ص٢٩٣)

فائدہ

اس حدیث کی تشریح آئندہ حدیث کے تحت ملاحظہ فرمائیں۔

﴿۳۶﴾ وأخرج الحاكم في صحيحه، من حديث ابن مسعود، قال:

كنا نتحدث أن أقضى أهل المدينة علي بن أبي طالب رضي الله عنه.

وقال: صحيح ولم يخرجاه.

﴿۳۶﴾ اور امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ اپنی صحیح میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں: انہوں نے فرمایا: ہم کہا کرتے تھے کہ اہلِ مدینہ کے سب سے بڑے قاضی علی بن ابی طالب ہیں رضی اللہ عنہ۔

اور انہوں نے فرمایا: یہ اثر (فرمانِ صحابی) صحیح ہے اور شیخین (امام بخاری و مسلم رحمۃ اللہ علیہما) نے اسے ذکر نہیں فرمایا۔

(المستدرك ج٣ ص١٣٥، وط: ج٤ ص١٠٧ حديث ٤٧١٣؛ إتحاف الخيرة المهرة ج٧ ص١٨٩ حديث ٦٦٤٣، وط: ج٩ ص٢٥٠ حديث ٨٩٢٥؛ المطالب العالية ج٤ ص٥٧ حديث ٣٩٥١، وط:

ج١٦ ص٧٥ حديث٣٩٢٤؛ موسوعة الحافظ ابن حجر العسقلاني ج٣ ص ٤٨٩؛ الرياض النضرة ج٤ ص١٤٣؛ الطبقات الكبرى لابن سعد ج١ ص٤٢٠، وط: ج٢ ص٢٩٢؛ نزل الأبرار للبدخشاني ص٥٠)

میری اُمت کا بڑا قاضی

مصنف (امام جزری المقری) رحمۃ اللہ علیہ نے سیدنا علی المرتضیٰ ﷜ کے سب سے بڑے قاضی ہونے کا ذکر فقط دو صحابہ یعنی سیدنا فاروق اعظم اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے، حالانکہ یہی بات خود نبی کریم ﷺ سے بھی ثابت ہے۔ چنانچہ حضرت انس ﷜ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

أَقْضٰى أُمَّتِيْ عَلِيٌّ.

''میری اُمت کا سب سے بڑا قاضی علی ہے''۔

(مصابيح السنة ج٤ ص١٨٠ حديث٤٧٨٧؛ شرح السنة ج١٤ ص١٣٢ حديث ٣٩٣٠، وط: ج ٨ ص١١٠ حديث٣٩٢٩؛ مشكاة ج٢ ص٥٠٨ حديث ٦١٢٠؛ الرياض النضرة ج٤ ص١٤٣؛ ذخائر العقبىٰ ص١٠١؛ الإحكام في تمييز الفتاوى عن الأحكام للقرافي ص٤٦)

أَقْضٰى یا أَفْضَل؟

حضرت عبداللہ بن مسعود ﷜ کا یہ ارشاد بعض کتبِ حدیث میں ''أَقْضٰى'' کی بجائے ''أَفْضَل'' سے بھی منقول ہے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

حدثنا عبد الله، قال: حدثني جدي، قثنا أبو قطن، قثنا شعبة، عن أبي إسحاق، عن عبد الله بن يزيد، عن علقمة، عن عبد الله وهو ابن مسعود، قال: كنا نتحدث أن أفضل أهل المدينة علي بن أبي طالب.

''حضرت عبداللہ بن مسعود ﷜ فرماتے ہیں: ''ہم بیان کیا کرتے تھے کہ اہل مدینہ میں افضل علی بن ابی طالب ہیں ﷜''۔

(فضائل الصحابة ج٢ ص٨٠٢ حديث١٠٩٧؛ مسند البزار ج٥ ص٥٥ حديث١٦١٦؛ كشف الأستار ج٣ ص١٩٥ حديث٢٥٥٠؛ مختصر زوائد البزار للعسقلاني ج٢ ص٣١١ حديث ١٩٢٠؛

فتح الباري ج۷ص۱۷ ٤؛الرياض النضرة ج٤ ص١٥٦)

"فضائل الصحابة" کے محقق شیخ وصی اللہ بن محمد عباس نے لکھا ہے: اس حدیث کی سند صحیح ہے۔

(فضائل الصحابة ج۲ ص ۸۰۱)

حافظ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

"اس حدیث کو امام بزار نے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں ایک شخص یحییٰ بن سکن ہے، حافظ ابن حبان نے اس کی توثیق کی ہے اور صالح جزرہ نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے، اور اس کے باقی راوی ثقہ ہیں"۔

(مجمع الزوائد ج۹ ص ۱۱٦ وط: ج۹ ص ۱۵۲ حدیث ۱٤٦۸۰ وط: ج۹ ص ۱۰۵ حدیث ۱٤٦۸۰)

واضح رہے کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی سند میں یہ راوی نہیں ہے، لہٰذا حافظ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ حکم "مسند البزار" کی سند پر تو لاگو ہو سکتا ہے لیکن "فضائل الصحابة" کی سند پر نہیں لگایا جا سکتا۔

بعض علماء کرام کا تکلف

امام محب الدین طبری رحمۃ اللہ علیہ نے الگ الگ مقامات پر یہ حدیث "أَقْضى" اور "أَفْضَلُ" دونوں لفظوں سے نقل فرمائی ہے، لیکن انہیں "أَقْضى" پر تو نہیں مگر "أَفْضَلُ" پر کچھ وضاحت ناگزیر محسوس ہوئی، چنانچہ انہوں نے لکھا ہے:

هو محمول عند من يقول بالترتيب المقدم علىٰ أنه كذلك بعدهم.

"وہ لوگ جو مذکورہ ترتیب کے مطابق افضلیت کے قائل ہیں اُن کے نزدیک سیدنا علی اُن (خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم) کے بعد افضل ہیں"۔

(الرياض النضرة ج٤ ص١٥٦)

شکر ہے کہ ہمارے علماء کرام فقط اس تاویل تک محدود رہے اور کسی محدث نے لفظ "افضل" کو تصحیف یا تحریف کے کھاتہ میں نہیں ڈالا، یعنی یہ نہیں کہا کہ دراصل یہ لفظ "أَقْضى" ہی تھا مگر بعض روافض نے اسے "أَفْضَلُ" بنا دیا۔ ہمارے نزدیک ایسا کہنے کی گنجائش ہی نہیں البتہ یہ بات قرین قیاس ہے کہ یہ اثر (قول صحابی) درحقیقت لفظِ "أَفْضَلُ" سے ہی ہو، اس لیے کہ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے لیے "أَقْضى" ہونا کوئی ایسی انہونی بات نہیں تھی جس کو ابن مسعود رضی اللہ عنہ اس انداز سے بیان فرماتے بلکہ اُن کا "أَقْضى" ہونا تو معروف و مسلّم بات تھی اور خود

زبانِ نبوی ﷺ سے اُن کا "اَقْضٰی" ہونا ثابت تھا اور فاروقِ اعظمؓ بھی یہی فرماتے تھے۔

باقی رہی امام محبّ الطبری کی یہ بات کہ ترتیب افضلیت بترتیب خلافت کو لازم وواجب سمجھنے والوں کے نزدیک سیدنا علیؓ کی یہ افضلیت خلفاء ثلاثہؓ کے بعد ہے تو یہ اُن لوگوں کے نزدیک ہوگی مگر اس سے یہ سمجھنا کہ سیدنا ابن مسعودؓ کے نزدیک بھی ایسا ہی تھا تو یہ درست نہیں۔ اس لیے کہ وہ یہ بات سیدنا علی المرتضیٰؓ کی شہادت کے بعد نہیں بلکہ پہلے فرمایا کرتے تھے، کیونکہ اُن کا وصال خلیفۂ ثالث امیر المومنین سیدنا عثمان غنیؓ کی شہادت سے بھی دو برس قبل ہوا تھا۔ اُنہیں خلیفۂ دوم سیدنا فاروقِ اعظمؓ نے عالم اور قاضی کی حیثیت سے کوفہ بھیجا تھا، وہ وہیں اسلام کی اشاعت وخدمت میں مشغول رہے حتیٰ کہ خلیفۂ ثالث حضرت عثمان غنیؓ نے اپنے دور میں اُنہیں واپس بلالیا اور اُن کا انتقال ۳۲ھ میں مدینہ مقدسہ میں ہی ہوا، نماز جنازہ حضرت عثمان غنی اور بعض اقوال کے مطابق سیدنا عمار بن یاسر یا سیدنا زبیر بن عوامؓ نے پڑھائی اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔

(أسد الغابة ج ۳ ص ۴۰۰؛ الإصابة ج ٤ ص ۲۰۰)

لہٰذا اہل علم ایک طرف تو اس بات میں غور فرمائیں کہ اُن کا انتقال ۳۲ھ میں مدینہ مقدسہ میں ہوا، (اور سیدنا عثمان غنی کی شہادت ۳۵ھ میں ہوئی) دوسری طرف اس بات میں غور فرمائیں کہ وہ دورِ فاروقی میں کوفہ بھیجے گئے تھے، اور پھر ساتھ ہی ماضی استمراری پرمبنی اُن کے الفاظ "كُنَّا نَتَحَدَّثُ" (ہم کہا کرتے تھے) میں بھی توجہ فرمائیں کہ وہ کب، کہاں اور کن لوگوں کے سامنے "کہا کرتے تھے" عقلاً جو بات سمجھ آتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے کوفہ کے لوگوں کو فرمایا ہوگا، فقط عقلاً ہی نہیں بلکہ نقلاً بھی یہی حقیقت ہے، کیونکہ اس حدیث کے مرکزی راوی سیدنا علقمہ بن قیسؓ ہیں اور وہ تابعی اور کوفی ہیں، لہٰذا ثابت ہوا کہ ابن مسعودؓ نے کوفہ کے لوگوں کے سامنے یہ بات فرمائی تھی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے کس سابقہ دور کی بات دہرائی ہوگی؟ تو یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ دورِ فاروقی میں مدینہ منورہ سے کوفہ بھیجے گئے تھے، لہٰذا اگر حیاتِ نبوی ﷺ اور دورِ صدیقیؓ میں اس بات کا وقوع تسلیم نہ بھی کیا جائے تو بہرحال دورِ فاروقی میں تو اس قول کی صحت کا انکار نہیں کیا جاسکتا، اور یہ کم وبیش سیدنا علیؑ کی خلافت سے بیس بائیس برس قبل کا قول ہوسکتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ خلافت دوسرے حضرات کی تھی مگر ابن مسعود اور اُن کے رفقاء کے نزدیک تمام اہل مدینہ سے افضل سیدنا علیؑ تھے، اور اس کو وہ بیان بھی کرتے تھے۔ لہٰذا اس سے بداہۃً ثابت ہوا کہ اُن کے نزدیک ترتیب افضلیت ترتیب خلافت کے مطابق لازم نہیں تھی، البتہ اگر اس قول کے برعکس اُن سے کوئی دوسرا قول بھی منقول ہو تو پھر الگ بات ہے، لیکن ہمارے

سامنے ایسا کوئی قول نہیں آیا۔ اگر کسی صاحبِ علم کی نگاہ میں سیدنا ابن مسعود ﷺ کا کوئی دوسرا قول ہو تو برائے کرم ہمیں ضرور مطلع فرمائیں تا کہ ہم سیدنا ابن مسعود ﷺ کے متعلق تفضیلی، مبتدع، گمراہ اور سفیہ وغیرہ کی بدگمانی سے محفوظ رہ سکیں، اور اگر اُن سے کوئی دوسرا قول منقول نہ ہو تو پھر دوسرے مسلمانوں کے لیے بھی جائز ہونا چاہیے کہ وہ بھی "أصحابي كالنجوم فبأيهم اقتديتم اهتديتم" (میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں پس تم جس کی پیروی کرو گے ہدایت پاؤ گے) پر عمل کرتے ہوئے اُن کے عقیدہ کو اپنا لیں۔ نیز "أصحابي كالنجوم" کے علاوہ ابن مسعود ﷺ کو تو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اُن کی شان میں آیا: "رضيتُ لأمتي ما رضي لها ابن أم عبد" (میں نے اپنی امت کے لیے وہ پسند کیا جسے ابن مسعود ﷺ نے اُس کے لیے پسند کیا) لہٰذا جو لوگ کم از کم "أصحابي كالنجوم" کو لائقِ حجت تسلیم کرتے ہیں اُن کے نزدیک تو ابن مسعود ﷺ کے ارشاد کے مطابق سیدنا علی ﷺ کو افضل ماننا باعثِ ہدایت ہونا چاہیے، اس لیے کہ ترتیبِ افضلیت بترتیبِ خلافت پر کوئی اجماعِ امت تو ہوا نہیں کہ ایسی افضلیت گمراہی قرار پائے۔

قضا کی تعریف

یہ گفتگو تو تھی حدیث میں "افضل" کے الفاظ کے متعلق جبکہ یہاں یہ حدیث لفظ "اقضى" سے بھی آئی ہے، لہٰذا اب ہم قضا کی تعریف کرتے ہیں۔ لغت میں لفظ قضاء کے متعدد معانی ہیں اور ہماری بحث میں جو لغوی معنی مقصود ہے وہ ہے "الحكم أو المنع" (حکم یا منع)۔ میر سید شریف الجرجانی لکھتے ہیں:

القضاء: لغةً الحكم.

"لغوی طور قضاء کا معنی حکم ہے"۔

(كتاب التعريفات ص ١٢٤)

امام فیروز آبادی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

القضاء، ويقصر: الحكم.

"قضاء اور قضی کا معنی ہے حکم"۔

(القاموس المحيط ص ١٧٠٨)

فقہاء کرام کی اصطلاح میں قضاء کیا ہے؟ امام تمرتاشی رحمۃ اللہ علیہ اس کی توضیح میں لکھتے ہیں:

فصل الخصومات وقطع المنازعات.

"جھگڑوں کا فیصلہ کرنا اور تنازعات کو طے کرنا قضاء ہے"۔

یعنی شرعی تقاضوں کے مطابق، اسی لیے امام ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ آگے لکھتے ہیں:

ولابُد أن يزيد فيه علىٰ وجه خاص وإلا دخل فيه نحو الصلح بين الخصمين.

"اور اس میں "علىٰ وجه خاص" (خاص طریقہ پر) کا اضافہ ضروری ہے، ورنہ اس میں ہر دو لڑنے والوں کے درمیان صلح کرانا بھی داخل ہوگا"۔

(رد المحتار ج۸ ص ۲۰)

مالکی فقیہ برھان الدین ابن فرحون لکھتے ہیں:

الإخبار عن حكم شرعي علىٰ سبيل الإلزام.

"لازم کرنے کے طور پر حکم شرعی سے آگاہ کرنا قضا ہے"۔

(تبصرة الحكام ص ۱۲)

شافعی فقیہ شمس الدین شربینی لکھتے ہیں:

إظهار حكم الشرع في الواقعة ممن يجب عليه قضاؤه.

"حقیقت میں جو حکم شرعی قاضی پر واجب ہے اُس کا اظہار کرنا قضا ہے"۔

(مغنی المحتاج، ج٤ ص ۳۷۲)

حنبلی فقیہ منصور بن یونس البھوتی لکھتے ہیں:

تبيين الحكم الشرعي والإلزام به وفصل الخصومات.

"حکم شرعی کو کھول کر بیان کرنا، اُسے لازم کرنا اور تنازعات کا فیصلہ کرنا قضا ہے"۔

(كشاف القناع ج٦ ص ۳۰٦)

قاضی کے لیے شرعی علوم کی ضرورت

ہر دین، دھرم اور مذھب کا اپنا قانون ہوتا ہے اور قاضی کے لیے اُس قانون میں کامل مہارت ضروری

ہوتی ہے، اور کسی بھی مذہب کے قانون میں ماہر ہونا معمولی بات نہیں۔ شریعتِ اسلامیہ میں بھی قاضی کے لیے قوانین شریعیہ میں مہارت لازمی ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص قاضی بنا دیا جائے اور اسے قانونی مہارت حاصل نہ ہو تو پھر وہ شرعی قانونی ماہرین سے راہنمائی حاصل کرے اور اُن کی تقلید میں فیصلہ صادر کرے۔ کتب فقہ میں یہ تفصیل موجود ہے، اور جن اسلامی ممالک میں شریعتِ محمدیہ کا قانون رہا تو وہاں کے قاضی یا تو علماء کرام تھے یا پھر انہیں علماء کرام کی راہنمائی حاصل رہی، اب بھی جہاں شریعتِ اسلامیہ کو قانونی حیثیت حاصل ہے وہاں یہی طریقہ کار فرما ہے۔ چشمِ بد دور، ہمارے ملکِ پاک میں بھی اسی مقصد کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل قائم ہے۔ بہر حال یا تو قاضی کا خود ماہر ہونا یا اُسے حقیقی شرعی اور قانونی ماہرین کی راہنمائی کا حاصل ہونا ضروری ہے۔

زیرِ بحث احادیث میں جس ہستی کو "أقضی" (سب سے بڑا قاضی) فرمایا گیا ہے انہیں کسی یونیورسٹی نے قاضی ہونے کا سرٹیفکیٹ نہیں دیا اور نہ ہی میرٹ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کسی ملک کے صدر نے انہیں قاضی بنا دیا انہیں تو "وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوىٰ" کی شان والی زبان اقدس نے قاضی فرمایا، قاضی ہی نہیں بلکہ "أقضی" بنا دیا، اور جب ایسی زبان اقدس سے انہیں سب سے بڑے قاضی ہونے کا سرٹیفکیٹ ملا تو یقیناً میرٹ کی بنیاد پر ہی ملا ہوگا۔ اگر یہ بات حق ہے اور یقیناً حق ہے تو آیئے پہلے تو یہ دیکھتے ہیں کہ کسی شرعی قاضی کے لیے کون کونسے علوم میں مہارت ضروری ہے، پھر یہ دیکھیں گے کہ "أقضی" (سب سے بڑے قاضی) کے لیے کتنا ماہر ہونا ضروری ہے؟ آیئے قرآن کریم کی روشنی میں اس کا اندازہ لگاتے ہیں، ارشادِ الٰہی ہے:

وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ.

"اور اگر آپ فیصلہ فرمائیں تو فیصلہ فرمایئے اُن میں انصاف سے"۔

(المائدة: ٤٢)

جس انصاف کا اللہ تعالیٰ حکم فرما رہا ہے اُسے کہاں سے لیا جائے؟ اس پر ارشادِ الٰہی ہے:

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ.

"پس تم اُن کے درمیان اُس کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے نازل فرمایا"۔

(المائدة: ٤٨)

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کیا نازل فرمایا ہے؟ آیا فقط قرآن کریم نازل ہوا یا کوئی اور چیز بھی نازل ہوئی؟ اس پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَأَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ.

''اور اللہ نے آپ پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی''۔

(النساء:۱۱۳)

یعنی قرآن مجید کے ساتھ حکمت بھی نازل ہوئی، اور حکمت کا لفظ جب کتاب کے ساتھ ہو تو بالاتفاق اس سے سنت مراد ہوتی ہے، لیکن اسی کو بعض مقامات پر ایک اور لفظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے اور ہماری اس بحث کو سمجھنے کے لیے وہ لفظ بہت مفید ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ.

''اللہ وہ ہے جس نے نازل کی حق کے ساتھ کتاب اور میزان''۔(الشوریٰ:۱۷)

دوسرے مقام پر ارشادِ ایزدی ہے:

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ.

''بیشک ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو روشن دلیلوں کے ساتھ اور ہم نے اتاری ان کے ساتھ کتاب اور میزان تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں''۔(الحدید:۲۵)

جیسے الکتاب کے بعد الحکمۃ سے سنت مراد ہوتی ہے یہاں بھی ''الکتاب'' کے بعد ''المیزان'' سے سنتِ نبوی ﷺ مراد ہے، بلکہ محدثین و عرفاء کرام فرماتے ہیں کہ خود حضور ﷺ ہی میزان ہیں۔ چنانچہ خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ حضرت سفیان بن عیینہ ؓ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ فرمایا کرتے تھے:

ان رسول اللّٰه ﷺ هو الميزان الأكبر فعليه تُعرض الأشياء علىٰ خُلُقِهٖ وسيرته وهَدْيِه فما وافقها فهو الحق وما خالفها فهو الباطل.

''بیشک رسول اللہ ﷺ میزانِ اکبر ہیں۔ پس آپ کے خُلق، آپ کی سیرت اور آپ کی ہدایت پر تمام اشیاء پیش کی جائیں، جو چیز اس میزان کے موافق ہو وہ حق ہے اور جو چیز اُس کے مخالف ہو وہ باطل ہے''۔

(الجامع لأخلاق الراوي وآداب السامع ج۱ ص۷۹)

امام راغب اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ نے لفظ حکمت اور میزان کو ایک دوسرے کی جگہ پر استعمال کرتے ہوئے

بہت خوب لکھا ہے، فرماتے ہیں:

لولا الكتاب لأصبح العقل حائرًا ،ولولا العقل لم ينتفع بالكتاب، وقيل: الكتاب بمنزلة اليد، والحكمة بمنزلة الميزان، ولا تعرف المقادير إلا بهما، ولذلک عبر عن الحكمة بالميزان في قوله تعالىٰ ﴿اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ﴾.

”اگر کتاب نہ ہوتی تو عقل دنگ رہ جاتی اور اگر عقل نہ ہوتی تو کتاب سے فائدہ نہ اٹھایا جاسکتا، اور کہا گیا ہے کہ کتاب ہاتھ کی مانند ہے اور حکمت میزان کی طرح ہے اور ان دونوں کے بغیر اوزان کی شناخت نہیں ہوسکتی، اسی لیے فرمانِ الٰہی (اللہ وہ ہے جس نے نازل کی حق کے ساتھ کتاب اور میزان) میں حکمت کو میزان سے تعبیر کیا گیا ہے“۔

(الذريعة إلىٰ مكارم الشريعة ص ١٤٢)

یعنی جس طرح اشیاء کی مقدار اور وزن کے لیے ہاتھ اور ترازو دونوں ضروری ہیں اسی طرح شریعتِ اسلامیہ کی قضاء کے لیے کتاب وسنت دونوں ضروری ہیں، اور قاضی کا ان دونوں میں خود ماہر ہونا یا اُسے ماہرین کی جماعت کا مہیا ہونا بہ طور شرط لازم ہے۔

جو ”أَقْضیٰ“ وہی ”أَعْلَمُ“ وہی ”أَفْهَمُ“

جب شرعی قضاء کے لیے قاضی کا قرآن وسنت میں خود ماہر ہونا یا اُسے ماہرین علماء کرام کی ایک ٹیم کا مہیا ہونا بہ طور شرط لازم ہے تو پھر خود غور فرمایئے کہ جس ہستی کو زبانِ نبوی ﷺ نے ”أَقْضیٰ“ فرمایا وہ کتاب وسنت میں کتنی ماہر ہوگی؟ صاف ظاہر ہے کہ قاضی تو تمام خلفاء کرام اور کچھ دوسرے صحابہ کرام ﷢ بھی تھے مگر اُمت میں سب سے بڑے قاضی فقط سیدنا علی المرتضیٰ ﷜ تھے، اور چونکہ شریعتِ اسلامیہ کے قاضی تھے جو کہ موقوف ہے قرآن وسنت پر اس لیے وہ سب سے بڑھ کر قرآن وسنت کے عالم تھے۔ آخر نبی کریم ﷺ نے یونہی تو نہیں فرمایا تھا کہ ”علی قرآن کے ساتھ اور قرآن علی کے ساتھ“ اور محض اپنی لختِ جگر کو وقتی تسلی دینے کے لیے تو نہیں فرمایا تھا کہ وہ ”أكثرهم علماً“ (سب سے زیادہ عالم ہے) اور اُم المومنین سیدتنا عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا مبالغۃً تو نہیں فرماتی تھیں کہ ”علی تمام لوگوں سے بڑھ کر سنت کے عالم ہیں“۔

پھر قرآن وسنت کے ساتھ ساتھ قضا کے لیے غیر معمولی فہم بھی انتہائی لازم ہے۔ اسی لیے سیدنا علی ؑ کو ۹۹ فیصد اور الفاظ حدیث کے مطابق دس میں سے نو حصے حکمت عطا فرمائی گئی تھی، علاوہ ازیں حضور ﷺ نے اپنا یداللّٰہی دستِ مبارک رکھ کر اُن کے حق میں دعا فرمائی تھی: ''اے اللہ! اس کی زبان کو ثابت رکھنا اور اس کے دل کو کھول دینا'' اور یہ ایسا کرم ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کریم ﷺ پر کیا تو حضور ﷺ نے فرمایا: ''فتجلیٰ لي كلُّ شيء وعرفتُ'' (مجھ پر ہر چیز روشن ہوئی اور میں نے پہچان لی) سیدنا علی ؑ پر بھی اسی کرم کی بدولت ہر چیز روشن ہوگئی اور وہ تمام علومِ ظاہری اور باطنی میں درجۂ کمال کو پہنچ گئے، جیسا کہ متن کی اگلی حدیث میں سیدنا ابن مسعود ؓ کی شہادت سے یہ حقیقت ثابت ہو رہی ہے۔

''أقضاكم عليٌّ'' کا پُر تکلف معنیٰ

یہ ایسے حقائق ہیں جن کا انکار قرآن وحدیث کا عام قاری بھی نہیں کرتا، لیکن جن لوگوں کے نزدیک ترتیب افضلیت بترتیب خلافت لازم ہے، جو روافض کی تردید میں اس قدر بے احتیاطی سے چلتے ہیں کہ انہیں احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ کتنا دور چلے گئے، اور جن کے نزدیک بہرصورت خلیفہ کا افضل ہونا یا افضل کا خلیفہ ہونا واجب ہے (حالانکہ یہ شیعہ کا مذہب ہے) وہ عالم وفاضل ہونے کے باوجود اِن بدیہی حقائق سے اغماض کرتے ہیں اور کمزور ترین تاویلات کا سہارا لیتے ہیں۔ اِس وقت راقم الحروف کے سامنے ایسے متاولین کی متعدد عبارات موجود ہیں مگر راقم ایک بڑی شخصیت کی عبارت نقل کر رہا ہے تاکہ عبرت حاصل ہو کہ کسی کی تردید میں انسان کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ شیخ المحدثین امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک استفتاء (سوال) آیا جس میں تین احادیث کے متعلق دریافت کیا گیا، اُن میں سے تیسری حدیث ''أقضاكم عليٌّ'' ہے۔ سائل نے پوچھا: کیا حضرت علی حضرات ابوبکر وعمر ؓ سے بھی بڑے قاضی تھے؟ اگر وہ بڑے قاضی تھے تو پھر اُن دونوں حضرات نے متعدد مسائل میں اُن سے اختلاف کیوں کیا؟ اور اگر وہ بڑے قاضی نہیں تھے تو پھر ''أقضاكم'' کا کیا معنی ہے؟

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:

وأما حديث: أقضاكم علي فليس فيه أنه أقضىٰ من أبي بكر وعمر رضي الله عنهما، فإنه يقتضي أنه أقضىٰ من المخاطبين، ولا يلزم من كون واحد أقضىٰ من جماعة أن يكون أقضىٰ من كل واحد، ولا يلزم من كونه أقضىٰ أن يقلده

شيره.

''اور باقی رہی حدیث ''أقضاكم عليٌّ'' تو اس میں یہ نہیں ہے کہ وہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے بھی بڑے قاضی تھے، کیونکہ اس فرمان کا تقاضا ہے کہ وہ اُن لوگوں سے بڑے قاضی ہوں جو اُس وقت مخاطب (حضور ﷺ کے سامنے) تھے، اور یہ ثابت نہیں ہے کہ وہ دونوں حضرات بھی مخاطبین (حاضرین) میں موجود تھے، اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ جو شخص ایک جماعت سے ''أقضى'' (بڑا قاضی) ہو تو وہ ہر ایک سے بڑا قاضی ہو، اور نہ یہ لازم ہے کہ ''أقضى'' کی دوسرا شخص تقلید کرے''۔

(فتاوى الإمام النووي ص١٥١، ١٥٢)

امام نووی سے قبل ایسا ہی تکلف امام باقلانی رحمۃ اللہ علیہما سے بھی منقول ہے، وہ لکھتے ہیں:

فإن قالوا: فإنه قال: أقضاكم علي، قيل لهم يحتمل أن يكون عن جماعة منهم دون سائرهم.

''پس اگر وہ کہیں کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: علی تمہارا ''أقضى'' ہے، تو انہیں کہا جائے گا: احتمال ہے کہ اس سے حضور ﷺ کی مراد سب صحابہ کی بجائے اُن میں سے کچھ لوگ ہوں''۔

(مناقب الأئمة الأربعة للباقلاني ص٣٧٨)

اس جواب میں جو تکلف ہے وہ کسی عقل مند پر مخفی نہیں، لہٰذا ہمیں اس پر تبصرہ کی ضرورت نہیں، البتہ ہم اتنا عرض کر دیتے ہیں کہ اِن محدثین کا تکلف سے مملو یہ جواب سائل کے نقل کردہ الفاظ ''أقضاكم عليٌّ'' کے پیش نظر ہے لیکن کوئی محدث درج ذیل حدیث سے کس طرح کسی کو مستثنیٰ کر سکتا ہے؟

أَقْضٰى أُمَّتِيْ عَلِيٌّ.

''میری اُمت کا سب سے بڑا قاضی علی ہے''۔

(مصابيح السنة ج٤ ص١٨٠ حديث٤٧٨٧؛ شرح السنة ج٨ ص١١٠ حديث٣٩٢٩؛ مشكاة ج٢ ص٥٠٨ حديث٦١٢٠؛ الرياض النضرة ج٤ ص١٤٣؛ ذخائر العقبىٰ ص١٠١؛ الإحكام للقرافي ص٤٦؛ موسوعة الحافظ ابن حجر ج٣ ص٥٥٤؛ ينابيع المودة ج١ ص٢٢٥)

بتلایئے! کیا شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کو ''أُمَّتِيْ'' کے لفظ سے مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے؟

اسی طرح حسب ذیل حدیث میں بھی یہ تکلّف چلنا مشکل ہے۔ حضرت انس ﷺ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

أرحم أمتي بأمتي أبوبكر، وأشدهم في دين الله عمر، وأصدقهم حياءً عثمان، وأقضاهم عليّ بن أبي طالب، وأقرؤهم لكتاب الله أبي بن كعب، وأعلمهم بالحلال والحرام معاذ بن جبل، وأفرضهم زيد بن ثابت، ألا وإن لكل أمةٍ أميناً وأمين هذه الأمة أبو عبيدة بن الجرّاح.

''میری امت میں میری امت پر سب سے زیادہ رحیم ابوبکر ہے، دینِ الٰہی میں سب سے زیادہ سخت عمر ہے، سب سے زیادہ باحیا عثمان ہے، سب سے بڑا قاضی علی ہے، کتابِ الٰہی کا سب سے بڑا قاری ابی بن کعب ہے، حلال وحرام کا سب سے بڑا عالم معاذ بن جبل ہے، علم میراث کا بڑا عالم زید بن ثابت ہے اور یاد رکھو! ہر امت کا ایک امین ہوتا ہے اور اس امت کا امین ابوعبیدہ بن الجراح ہے ﷺ''۔

(سنن ابن ماجه ج١ ص١٠٢ حديث١٥٤؛ المصنف لعبدالرزاق ج١٠ ص٢٢٠ حديث٢٠٥٥٥، وط: ج١ ص٣٨٣ حديث٢٨٢٧؛ جمع الجوامع ج١ ص٥٩١، ٥٩٢ حديث٢٩٦٤، ٢٩٦٥، ٢٩٦٦، ٢٩٦٧)

یہی حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی روایت ہے، البتہ اُس کے شروع کے الفاظ ''أرحم أمتي'' کی بجائے ''أرء ف أمتي'' ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

(مسند أبي يعلیٰ ج٥ ص١٦٢ حديث٥٧٣٦؛ المستدرك ج٣ ص٥٣٥، وط: ج٤ ص٦٨٩ حديث ٦٣٣٥؛ إتحاف الخيرة المهرة ج٧ ص١٦٠ حديث٦٥٧٢؛ المطالب العالية ج٤ ص٨٥ حديث ٤٠٣١؛ موسوعة الحافظ ابن حجر ج٣ ص٤٥٤؛ الجامع الصغير حديث٩٠٨؛ جمع الجوامع ج١ ص٣٦٤ حديث٢٦٨٢، وط: ج١ ص٥٦٨ حديث٢٨٥٩)

سائل کے جواب میں آگے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک تکلّف یوں بھی فرمایا ہے:

لا يلزم من كون واحد أقضىٰ من آخر أن يكون أعلم منه مطلقاً وإنما يقتضي رجحانه في معرفة القضاء فقط.

''کوئی دوسرے سے ''اَقْضیٰ'' ہو تو اس سے اُس کا مطلقاً اَعْلَم (بڑا عالم) ہونا لازم نہیں آتا، فقط اتنی بات ہے کہ وہ معرفتِ قضا میں راجح ہوتا ہے''۔

(فتاوي الإمام النووي ص ١٥٣)

امام نووی کے کلام کا اکثر حصہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہما نے بھی نقل کر دیا ہے۔

(مرقاة شرح المشكوة ج ١٠ ص ٤٩٤)

فقط معرفتِ قضا کتنی ہوتی ہے؟

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ''إنّما'' اور ''فقط'' لگا کر ''اَقْضیٰ'' شخص کی جو فقط معرفتِ قضا میں ترجیح تسلیم فرمائی ہے تو کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ شریعت محمدیہ علی صاحبها الصلاة والتسلیم کی قضا کی معرفت کتنی ہوتی ہے، اور قاضی کا اُس میں ماہر ہونا کتنا ضروری ہوتا ہے؟ اگر ہم پر فقط قاضی اسلام کی شرائط ہی واضح ہو جائیں تو ہمیں ''اَقْضیٰ'' کے متعلق جاننے کی حاجت نہیں رہے گی۔

قارئین کرام! میرے دل میں امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کی جتنی عظمت پہلے تھی اب بھی اتنی ہی ہے، کیونکہ ہم اپنے اسلاف کرام کی تعظیم کے شرعی طور پر پابند ہیں لیکن انہیں معصوم ماننے کے پابند نہیں ہیں، اور ہر چند کہ امام نووی کا مقام بلند بھی ہے اور مسلّم بھی حتیٰ کہ امام سبکی رحمۃ اللہ علیہ جیسے محدث اُن کے بیٹھنے کے مقام پر رُخسار رگڑتے تھے مگر اس کے باوجود عَفَا اللّٰہُ عَنَّا یہ ناکارہ یہاں اُن کے قول کو نہ صرف یہ کہ تسلیم نہ کرنے پر بلکہ مسترد کرنے پر مجبور ہے۔ کیونکہ اُنہوں نے اسلام میں ''اَقْضیٰ'' شخص کے علم کو ''فقط معرفت قضا'' وغیرہ الفاظ سے جو محدود ظاہر کرنے کا تأثر دیا ہے وہ تأثر کتاب وسنت اور لغتِ عرب کی رو سے نرم سے نرم الفاظ میں مردود ہے۔

اس سے قبل کہ ہم ''فقط معرفتِ قضا'' کے متعلق مزید عبارات نقل کریں قارئین کرام سے گذارش ہے کہ وہ اُن سطور کو ایک مرتبہ پھر دیکھ لیں جو اس بحث کے شروع میں ''اَقْضیٰ'' کی نہیں بلکہ فقط قاضی کی اہلیت میں لکھی گئی ہیں۔ سو اب ہم بتوفیقِ الٰہی پہلے قاضی کے علمی کمال میں مزید عبارات نقل کرتے ہیں پھر ''اَقْضیٰ'' کے اُس معنی کی طرف آئیں گے جو تکلّف سے پاک ہے۔ امام کاسانی حنفی رحمۃ اللہ علیہ ''اَقْضیٰ'' کی نہیں بلکہ فقط قاضی کی شرائطِ کمال کے بارے میں لکھتے ہیں:

وأما شرائط الفضيلة والكمال فهو أن يكون القاضي عالماً بالحلال والحرام

وسائر الأحكام، قد بلغ في علمه ذلك حد الاجتهاد، عالماً بمعاشرة الناس ومعاملتهم عدلاً ورعاً عفيفاً.

"اور باقی رہیں فضیلت وکمال کی شرائط تو وہ یہ ہیں کہ قاضی حلال وحرام اور تمام احکام کا عالم ہو، اس سلسلے میں اُس کا علم اجتہاد کی حد کو پہنچ چکا ہو، وہ لوگوں کے رہن سہن کو جاننے والا ہو اور اُن کے معاملات میں عادل، پرہیزگار اور عفت مآب ہو"۔

(بدائع الصنائع ج۹ ص۹۳)

امام کمال الدین ابن الھمام حنفی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۶۸۱ھ) لکھتے ہیں:

والكمال فيه أن يكون عدلاً عفيفاً عالماً بالسنة وبطريق من قبله من القضاة.

"اور قضا میں کمال یہ ہے کہ قاضی عادل ہو، پاک دامن ہو، سنت کا عالم ہو اور جو قاضی اُس سے قبل گذر چکے ہوں اُن کے طریقہ کو جانتا ہو"۔

(فتح القدیر ج۷ ص۲۳٤)

فائدہ

خیال رہے کہ جب سیدنا علی ﷺ کی شان میں لفظ "أقضى" فرمایا گیا تھا تو اُس سے پہلے حضور ﷺ کے علاوہ کوئی قاضی نہیں گذرا تھا، ہاں سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام کی شریعتیں گذر چکی تھیں اور سیدنا علی ﷺ ان سب کے عالم تھے۔ پھر جب سیدنا فاروقِ اعظم ﷺ کی شہادت کے بعد سیدنا علی ﷺ کے سامنے شرائط رکھی گئی تھیں اور حضرت عبدالرحمان بن عوف ﷺ نے کہا تھا: کیا آپ کتاب وسنت اور شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کے طریقہ کے مطابق حکومت چلائیں گے تو انہوں نے آخری شرط کو ماننے سے انکار فرما دیا تھا۔

(البدایۃ والنہایۃ ج۷ ص۲۸۲)

اِس ضمنی فائدہ کے بعد اب ہم پھر فقہاء کرام رحمۃ اللہ علیہم کی عبارات کی روشنی میں قاضی کی شرائط کی طرف آتے ہیں۔ امام تمرتاشی اور امام نسفی رحمۃ اللہ علیہما لکھتے ہیں:

وينبغي أن يكون موثوقاً به في عفافه وعقله وصلاحه وفهمه وعلمه بالسنة والآثار ووجوه الفقه والاجتهاد شرط الأولوية.

''اور مناسب ہے کہ قاضی کی پاک دامنی، اُس کی عقل، اُس کی نیکی، اُس کی فہم اور اُس کے سنت و آثار کے علم پر اعتماد ہو، اور فقہ و اجتہاد کی وجوہ کا علم اولیت کی شرط ہے''۔

(تنویر الأبصار متن الدر المختار ج۸ ص۳۶؛ کنز الدقائق مع البحر الرائق ج٦ ص٤٤٣)

امام ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وكونه فقيه النفس: أي شديد الفهم بالطبع، وعلمه باللغة العربية وكونه حاوياً لكتاب الله تعالىٰ فيما يتعلق بالأحكام، وعالماً بالحديث متناً ومسنداً وناسخاً ومنسوخًا.

''اور اس کا فقیہ النفس یعنی طبعی طور پر انتہائی فہیم ہونا، لغتِ عرب کا عالم ہونا، قرآن کریم کے احکام پر حاوی ہونا اور حدیث شریف کے متن، سند، ناسخ و منسوخ کا ماہر ہونا شرط ہے''۔

(ردالمحتار ج۸ ص۳۶، وط: ج۸ ص۳۸)

امام موفق الدین ابن قدامہ حنبلی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۶۲۰ھ نے پہلے قاضی کی تین موٹی شرائط لکھی ہیں پہلی دو کا تعلق جسمانی وجاہت و شخصیت سے ہے جن کی انہوں نے تفصیل فرمائی ہے، اور اُن کے نزدیک تیسری شرط اجتہاد ہے، اور وہ اُس کی توضیح میں لکھتے ہیں:

فمن شرط الاجتهاد معرفة ستة أشياء: الكتاب، والسنة، والإجماع، والاختلاف، والقياس، ولسان العرب، أما الكتاب: فيحتاج أن يعرف منه عشر أشياء: الخاص، والعام، والمطلق، والمقيد، والمحكم، والمتشابه، والمجمل، والمفسر، والناسخ، والمنسوخ في الآيات المتعلقة بالأحكام وذلك نحو خمسمائة، ولا يلزمه معرفة سائر القرآن، وأما السنة: فيحتاج إلى معرفته مايتعلق منها بالأحكام دون سائر الأخبار من ذكر الجنة والنار والرقائق، ويحتاج أن يعرف منها ما يعرف من الكتاب ويزيد معرفة التواتر والآحاد والمرسل والمتصل والمسند والمنقطع والصحيح والضعيف.

''پس اجتہاد کی شرائط میں چھ چیزوں کی معرفت ہے: قرآن، سنت، اجماع، اختلاف، قیاس اور لغتِ عرب۔ پھر قرآن کی دس چیزوں کی معرفت کی حاجت ہوتی ہے: خاص، عام، مطلق، مقید،

محکم، متشابہ، مجمل، مفسر اور احکام کی آیات میں ناسخ ومنسوخ کی معرفت، اور وہ تقریباً پانچ سو آیات ہیں، اور پورے قرآن کی معرفت ضروری نہیں، اور سنت میں اُن احادیث کی معرفت کی حاجت ہوتی ہے جو احکام کے متعلق ہیں، جنت وجہنم اور وعظ ورقائق کی احادیث کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی، اور احکام کی احادیث کے متعلق اُن ہی چیزوں کی معرفت لازم ہوتی ہے جن کی قرآن میں معرفت لازم ہے، اور مزید یہ کہ قاضی علمِ حدیث میں متواتر، آحاد، مرسل، متصل، مسند، منقطع، صحیح اور ضعیف کی معرفت کا بھی محتاج ہوتا ہے"۔

(المغني ج۱۳ ص۴۳۲)

امام شمس الدین عبدالرحمان بن قدامہ حنبلی نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔

(الشرح الكبير بهامش المغني ج ۱۳ ص۴۳۳)

خود امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے قضا کی اہمیت پر متعدد آیاتِ قرآنی اور احادیث نبویہ ﷺ درج کرنے کے بعد لکھا ہے:

وإن كان جماعة يصلحون للقضاء اختار الإمام أفضلهم وأورعهم.

"اور اگر ایک جماعت قضا کی صلاحیت رکھتی ہو تو امام (سربراہ) کو چاہیئے کہ جو اُن سب سے افضل اور سب سے زیادہ متقی ہو اُس کا انتخاب کرے"۔

(المجموع مع شرح المهذب ج۲۲ ص ۲۱۵، وط: ج۲۱ ص۴۱۵)

آگے ایک مقام پر لکھتے ہیں:

ولا يجوز أن يكون جاهلاً بطريق الأحكام، لما روي أن النبي ﷺ قال: القضاة ثلاثة: قاضيان في النار، وقاض في الجنة، فأما الذي في الجنة فرجل عرف الحق فحكم به فهو في الجنة، وأما اللذان في النار فرجل عرف الحق فجار في حكمه فهو في النار، ورجل قضى للناس على جهل فهو في النار، ولأنه إذا لم يجز أن يفتي الناس وهو لا يلزمهم الحكم، فلأن لا يجوز أن يقضي بينهم وهو يلزمهم الحكم أولى.

"اور قاضی کا احکام کے طریقوں سے جاہل ہونا جائز نہیں، اس لیے کہ نبی کریم ﷺ

نے فرمایا: قاضی تین ہیں: ایک جنتی اور دو جہنمی ہیں۔ جنتی وہ ہے جس نے حق کو جانا اور اس کے مطابق فیصلہ کیا، اور جو دو جہنمی ہیں اُن میں ایک وہ ہے جس نے حق کو پہچانا لیکن اپنے فیصلہ میں ظلم کو جاری کیا تو وہ جہنم میں ہے، اور دوسرا وہ جس نے جہالت کے ساتھ فیصلہ کیا تو جہنم رسید ہوا۔ اور اس لیے بھی کہ جب مفتی کا جاہل ہونا جائز نہیں حالانکہ مفتی کا فتویٰ لازم نہیں ہو جاتا تو پھر قاضی کا جاہل ہونا بدرجہ اولیٰ ناجائز ہے کہ اُس کا فیصلہ فوراً لازم ولاگو ہو جاتا ہے"۔

(المجموع مع شرح المهذب ج۲۲ ص۲۱۷ ،وط: ج۲۱ ص۴۲۲)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کی اپنی عبارت میں یہ تصریح آگئی کہ قاضی کا عالم ہونا مفتی سے بھی زیادہ ضروری ہے تو ذرا ہمارے دور سے پیچھے جھانکیں (کیونکہ ہمارے دور میں تو ہر کہ و مہ مفتی بن بیٹھا ہے) اور خود امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے کے مفتی کی اہلیت کو مدنظر رکھیں پھر اُن کے دور کے قاضی کی اہلیت کا اندازہ فرمائیں۔ پھر اگر عقل و انصاف ساتھ دیں تو امت کے تمام اولین و آخرین قاضیوں کی علمیت و اہلیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ذرا اُس ہستی کے علم، فہم، ذکاوت، فطانت اور حکمت کا اندازہ لگائیں جس کو زبانِ نبوت ﷺ سے "أقضى أمتي" پوری امت سے بڑے قاضی ہونے کا مرتبہ ملا۔

اگر آپ نے غور وفکر کی یہ زحمت گوارا فرمائی تو لا محالہ یہ حقیقت آپ پر از خود واضح ہو جائے گی کہ جب کوئی مصنف، محدث، متکلم اور مفسر کسی حدیث یا لفظ کی تشریح وتفسیر میں خالی الذہن ہو کر مشغول ہو تو اُس کی ذہنی وسعت کس قدر عروج پر ہوتی ہے اور جب اُس کے سامنے مسلک یا مذھب کی بات یا تقابل و تفاضل کا معاملہ آجائے تو پھر اُس کا ذہن کس قدر گھٹن کا شکار ہو جاتا ہے؟ اور پھر اِس سے آپ پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی عمداً یا سہواً تنقیص، اُن کی مظلومیت اور ترتیبِ افضلیت بہ ترتیب خلافت کے لزوم کے نتائج بھی از خود آشکار ہو جائیں گے۔

یاد رکھیے!! "خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا كَدَرَ" اور "خطائے بزرگاں گرفتن خطا است" وغیرہ سب محاورے مجھے یاد ہیں اور الحمد للہ سب بزرگوں کا ادب بھی میرے دل میں موجود ہے مگر کسی بزرگ کی عظمت حدیث نبوی ﷺ یا مولی المومنین سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے زیادہ نہیں ہے۔ پھر یہ حقیقت بھی تو مسلمہ ہے کہ "الحَقُّ أَحَقُّ أَنْ يُتَّبَعَ" (حق زیادہ حق رکھتا ہے کہ اُس کی اتباع کی جائے) لہذا ہمیں چاہیے کہ ہم مذکورہ محاورہ جات کے ساتھ ساتھ یہ اصول بھی ہمیشہ ذہن میں رکھیں کہ "كُلٌّ مَأخُوذٌ مِنْ قَوْلِهِ وَمَرْدُودٌ عَلَيْهِ إِلَّا رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ" (ہر شخص کا قول قبول بھی ہوتا ہے اور مردود بھی، ماسوا رسول اللہ ﷺ کے قول کے) اور یہ بھی کہ "يَابَى

اللّٰهُ الْعِصْمَةَ إِلَّا لِكَلَامِهٖ وَكَلَامِ رَسُوْلِهٖ ﷺ" (اللہ تعالیٰ اپنے اور اپنے رسول ﷺ کے کلام کی عصمت کے سوا ہر کلام کی عصمت کا انکار فرماتا ہے)۔

سوان اصول وضوابط کی روشنی میں ہم بلا تأمل عرض کرتے ہیں کہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے سائل کے جواب میں لفظ "اقضی" کی جو تاویل کی ہے وہ قرآن وسنت، مذاہب اربعہ اور خود امام نووی کی "المجموع" کی عبارت کی روشنی میں لائق التفات نہیں۔

"أَقْضَاكُمْ عَلِيٌّ" کا بلا تکلّف معنیٰ

استفتاء کے جواب میں مستفتی (سائل) کو خاموش کرنے یا روافض کی تردید کے پیشِ نظر آپ نے لفظ "أَقْضَاكُمْ عَلِيٌّ" کی پُر تکلّف تاویل ملاحظہ فرمائی، اب تکلّف سے پاک معنیٰ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

امام مناوی رحمۃ اللہ علیہ "اقضاهم علي" کے تحت لکھتے ہیں:

أي أعرفهم بالقضاء بأحكام الشرع، قال السمهودي: ومعلوم أن العلم هو مادة القضاء... قالوا: وكما أنه أقضى الصحب في العلم الظاهر فهو أفقههم بالعلم الباطن.

"یعنی احکام شریعت کے ساتھ سب سے زیادہ قضا کی معرفت رکھنے والا، امام سمہودی فرماتے ہیں: اور یہ مسلّم ہے کہ علم ہی قضا کا مادہ ہے،...... اور علماء کرام فرماتے ہیں: جس طرح وہ تمام صحابہ کرام ؓ سے علمِ ظاہر میں "اقضی" تھے تو وہ علم باطن میں بھی سب سے زیادہ باریک بین تھے"۔

(فیض القدیر ج۲ ص۹۰۳، وط: ج۱ ص۴۵۹)

امام سمہودی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: "یہ مسلّم ہے کہ قضا کا مادہ ہی علم ہے۔ اس پر ہم کہتے ہیں: اور یہ بھی مسلّم ہے کہ علم کا منبع کتاب وسنت ہیں اور مسلمان قاضی میں ان ہی دو چیزوں اور عقل وفہم کا دوسروں سے زیادہ ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ ابو الحسن حنفی سندھی رحمۃ اللہ علیہ "أقضاهم علي" کے تحت لکھتے ہیں:

هذه منقبة عظيمة، لأن القضاء بالحق، والفصل بينه وبين الباطل يقتضي علماً كثيراً وقوةً عظيمةً في النفس.

''یہ عظیم فضیلت ہے، اس لیے کہ حق کا فیصلہ اور حق و باطل کے مابین فرق کرنا کثیر علم کا اور باطن میں عظیم قوت کا تقاضا کرتا ہے''۔

(شرح سنن ابن ماجه ج۱ ص۱۰۲)

علامہ محمد ادریس کاندھلوی نے بھی اسی طرح لکھا ہے:

(التعليق الصبيح علىٰ مشكاة المصابيح ج۷ ص۳۳۷)

قضا کتنا کثیر علم اور باطن میں کس قدر عظیم قوت کا تقاضا کرتی ہے؟ اس کو مختصر جملہ میں امام تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ نے یوں بیان کیا ہے:

وقوله ﷺ: أقضاكم علي، والأقضىٰ: أكملُ وأعلمُ.

''حضور ﷺ کا ارشاد ہے: علی تم میں أقضیٰ ہے اور أقضی سب سے زیادہ کامل اور سب سے بڑا عالم ہوتا ہے''۔

(شرح المقاصد ج۵ ص۲۹٦، وط: ج۳ ص۵۲۲)

اس عبارت میں لفظ ''أكملُ'' سے ذہنی قوت وصلاحیت کا بیان مقصود ہے اور ''أعلمُ'' سے علم کی کثرت مراد ہے، اِس اجمال کی تفصیل قاضی عبدالرحمان الایجی رحمۃ اللہ علیہ کی درج ذیل عبارت میں موجود ہے، وہ لکھتے ہیں:

إن فضيلة المرء على غيره إنما تكون بما لهٗ من الكمالات وقد اجتمع في علي ﷺ منها ما تفرق في الصحابة، وهي أمور:

الأول: العلم، وعليٌّ أعلم الصحابة، لأنه كان في غاية الذكاء والحرص على التعلم، ومحمد ﷺ أعلم الناس وأحرصهم على إرشاده وكان في صغره في حجره، وفي كبره ختناً له يدخل عليه كل وقت، وذلك يقتضي بلوغه في العلم كل مبلغ، وأما أبوبكر فاتصل بخدمته في كبره وكان يصل إليه في اليوم مرةً أو مرتين، ولقوله عليه السلام: أقضاكم علي، والقضاء يحتاج إلى جميع العلوم.

''ہر آدمی کی دوسرے پر فضیلت اپنے کمالات کی وجہ سے ہوتی ہے، سیدنا علی ﷺ میں وہ تمام کمالات یکجا جمع تھے جو دوسرے صحابہ کرام ﷺ میں متفرق طور پر موجود تھے، اور وہ یہ امور ہیں:

اولاً علم ہے: سیدنا علی رضی اللہ عنہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بڑے عالم تھے کیونکہ وہ انتہائی ذکی اور علم حاصل کرنے میں حریص تھے، اور سیدنا محمد ﷺ تمام انسانوں سے بڑے عالم ہیں اور وہ انہیں علم دینے میں حریص تھے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی گود میں پرورش پائی، نوجوانی میں آپ ﷺ کے داماد بنے اور ہر وقت آپ ﷺ کے ساتھ رہے۔ ان تمام باتوں کا تقاضا یہی ہے کہ علم میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی رسائی ہر لحاظ سے کامل ہو۔ رہا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا معاملہ تو وہ حضور ﷺ کی خدمت میں بڑی عمر میں آئے، آپ سے اُن کی ملاقات دن میں ایک یا دو دفعہ ہوا کرتی، اور اس لیے بھی سیدنا علی رضی اللہ عنہ بڑے عالم تھے کہ حضور ﷺ نے اُن کے حق میں فرمایا: علی تم میں "اقضی" (سب سے بڑے قاضی) ہیں اور قضا تمام علوم کی محتاج ہوتی ہے"۔

(المواقف مع شرحه ج۸ص ۳۷۰،وط: ج۸ص ۴۰۲)

غور فرمایئے! امام تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ نے "اقضی" کو "اکمل" اور "اعلم" فرمایا، قاضی عبدالرحمان الایجی رحمۃ اللہ علیہ نے قضاء کو تمام علوم کی محتاج فرمایا، اور حق بھی یہی ہے کہ قاضی ہر لحاظ سے کامل ہوتا ہے، حتیٰ کہ فقہاء کرام نے جسمانی کمال کو بھی قاضی کی صفات میں بیان فرمایا ہے، مگر معنوی کمال تو قاضی کے لیے شرط کی حیثیت رکھتے ہیں، پھر "اقضی" کی تو بات ہی الگ ہے۔

لفظ "اقضی" کی اسی جامعیت کا لحاظ رکھتے ہوئے سیدنا خواجہ گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وحاکم ترین شما بحق علی است، وحاکم نه باشد تا أَصْدَقُ وَأَعْدَلُ وَأَعْلَمُ وَأَقْرَأُ نه بود، پس صفت أقضی جامع صفات مذکوره است، واین مقام محبوب مراد است که هرجاکه صفتِ حمیده شد درذاتِ او بکمال وتمام موجود بود.

"اور تمہارا حاکم ترین کا ارشاد علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی شان میں آیا) اور کوئی حاکم نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ سب سے زیادہ سچا، سب سے بڑھ کر عادل، سب سے بڑھ کر عالم اور سب سے بڑھ کر قاری نہ ہو۔ پس صفتِ "اقضی" تمام مذکورہ صفات کی جامع ہے، اور یہ مقام محبوب ہے کہ جہاں بھی صفت حمیدہ پائی جائے گی وہ بہ تمام وکمال اُن کی ذات میں موجود ہوگی"۔

(جوامع الکلم ص ۱۱۳،ومترجم اردو ص ۱۹۹)

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؑ کا ذکر صحابہ سے ان الفاظ میں کیا "أقضاكم علي" اقضی سے مراد دوسروں سے بڑا قاضی ہوتا ہے، پس اقضی وہی ہوسکتا ہے جو دوسروں سے بڑا عالم بھی ہو"۔

(فوائد الفواد ص ۲۰۵)

علامہ محمد بن قاسم الترکمانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

أقضاكم علي، فالأقضىٰ إنما يمكن أن يكون من كان أعلم.

"علی تمہارے بڑے قاضی ہیں، پس بڑا قاضی ہونا فقط اس کے لیے ممکن ہے جو سب سے بڑا عالم ہو"۔

(القول المستحسن ص ۳۳۳)

علامہ کمال الدین محمد بن طلحہ القرشی العدوی الشافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس حدیث کی خوب تشریح فرمائی ہے، وہ لکھتے ہیں:

ويكفي علياً ؑ علواً في مقام العلم والفضيلة أن جعله رسول اللهﷺ حافظاً للعلم والحكمة، ومن ذلك ما نقله القاضي أبو محمد الحسين بن مسعود البغوي: أن رسول اللهﷺ خصص جماعة من الصحابة كل واحد بفضيلة، خصّص علياً بعلم القضاء، فقال: وأقضاهم علي. وقد صدع بالحديث بمنطوقه وصرح بمفهومه أن أنواع العلم وأقسامه قد جمعها رسول الله ﷺ لعليؑ دون غيره، فإن كل واحد ممن خصه رسول الله ﷺ بفضيلةٍ خاصيةٍ لم يتوقف حصول تلك الفضيلة علىٰ غيرها من الفضائل والعلوم، فإنه ﷺ قال: أفرضهم زيد بن ثابت، وأقرأهم أبي، وأعلمهم بالحلال والحرام معاذ بن جبل، ولا يخفى أن علم الفرائض لايفتقر إلىٰ علم آخر، ومعرفة القراءة لاتتوقف علىٰ سواها، وكذلك العلم بالحلال والحرام، بخلاف علم القضاء، فالنبي ﷺ قد أخبر بثبوت هذه الصفة العالية لعليؑ مع زيادة فيها، فإن صيغة أفعل

تقتضي وجود أصل ذلك الوصف والزيادة فيه علىٰ غيره، وإذا كانت هذه الصفة العالية قد أثبتها له فتكون حاصلة له،ومن ضرورة حصولها له أن يكون ﷺ متصفاً بها ولايتوصف إلاأن يكون كامل العقل،صحيح التمييز، جيد الفطنة، بعيداً عن السهو والغفلة، يتوصل بفطنته إلىٰ وضوح ما أشكل وفصل ما أعضل.

''اور سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے لیے علم وفضیلت کی یہ بلندی کافی ہے کہ انہیں رسول اللہ ﷺ نے علم وحکمت کا حافظ بنادیا، اس حقیقت کے دلائل میں سے ایک دلیل وہ ہے جسے قاضی امام ابومحمد حسین بن مسعود بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت میں سے ہرایک کوایک فضیلت سے مختص فرمایا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو علم قضا سے مخصوص کرتے ہوئے فرمایا''وأقضاهم علي'' (اوران سب سے بڑا قاضی علی ہے) یقیناً حدیث کے الفاظ سے کھول دیا گیا اور اس کے مفہوم سے واضح کردیا گیا کہ علم کی تمام انواع واقسام کو رسول اللہ ﷺ نے دوسروں کے علاوہ حضرت علی علیہ السلام کے لیے جمع فرمادیا۔ بیشک اُن میں سے ہرایک کو رسول اللہ ﷺ نے ایک ایسی مخصوص فضیلت سے مختص فرمایا جس کا حصول کسی دوسری فضیلت اور علم کے حصول پر موقوف نہیں۔ پس حضور ﷺ نے فرمایا: زید بن ثابت رضی اللہ عنہ علم میراث میں بڑے عالم ہیں، حضرت ابی بن کعب قراءت میں بڑے عالم ہیں اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ حلال وحرام میں بڑے عالم ہیں، اور یہ امر مخفی نہیں ہے کہ علم فرائض دوسرے علم کا محتاج نہیں، اور قراءت کی معرفت اُس کے سوا دوسرے علوم پر موقوف نہیں اور یہی صورت حال حلال وحرام کے علم کی ہے، بخلاف علم قضا کے۔ پس نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس صفتِ عالیہ سے اُس میں مزید اضافہ کے ساتھ آگاہ فرمایا، کیونکہ صیغہ اسم تفضیل چیز کے اصل وجود کا تقاضا بھی کرتا ہے اور دوسروں سے اُس چیز میں زیادہ ہونے کا بھی، اور جب اس صفتِ عالیہ کو حضور ﷺ نے اُن کے لیے ثابت کردیا تو یہ انہیں حاصل ہوگئی اور اس کے حصول سے لازماً وہ اس صفت سے متصف ہوگئے، اور وہ اس سے متصف نہیں ہوئے مگر کامل عقل، فرق کرنے کی صحیح تمیز اور ایسی عمدہ مہارت کے بعد جو بھول وغفلت سے دور ہو، جو مہارت قاضی

موصوف پر پیچیدہ ترین مسئلہ واضح کردے اور مشکل ترین گتھی حل کردے"۔

(مطالب السؤول في مناقب آل الرسول ص ۶۲ ،و ط:ص ۷۸، ۷۹)

علامہ کمال الدین رحمۃ اللہ علیہ کی اس تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ دوسرے صحابہ کرامؓ کے حق میں بھی اسم تفضیل کا صیغہ استعمال فرمایا گیا ہے لیکن سیدنا علیؑ کی شان میں ایسا لفظ منتخب فرمایا گیا جو دوسرے تمام لفظوں کی معنویت کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے جبکہ اُن کی شان میں منقول الفاظ میں سے کوئی لفظ اِس لفظ (قضاء) کی معنویت کا متحمل نہیں۔ وہ الفاظ جس جس صحابی کی شان میں آئے وہ صحابی اُس علم میں تو ماہر کی حیثیت رکھتا ہے مگر اُسے دوسرے علم میں ماہر نہیں کہا جاسکتا۔ یوں سمجھئے جیسا کہ ہمارے دور میں کوئی ڈاکٹر کان کا، کوئی آنکھ کا، کوئی دانت کا، کوئی دل کا اور کوئی جلد کا Speciallist (ماہر) تو ہوتا ہے مگر اُسے دوسرے شعبوں میں تھوڑی سی سدھ بدھ کے علاوہ کوئی مہارت نہیں ہوتی۔ ہاں اگر پہلے دور کی طرح کوئی شخص پورے جسم کا Physician (معالج) ہو تو وہ اکیلا ان تمام اسپیشلسٹ ڈاکٹرز سے افضل ہوتا ہے۔ سو نبی کریم ﷺ نے سیدنا علیؑ کی شان میں ایسا جامع لفظ استعمال فرمایا جو تمام شان والوں کی شان کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے اور یہ نبی کریم ﷺ کی شانِ جامعیت کی عظیم دلیل ہے۔ اسی لیے بلا تکلّف معنیٰ کرنے والے علماء کرام نے بلاتردد فرمایا ہے کہ قضاء تمام علوم کی محتاج ہوتی ہے اور قاضی تمام علوم میں ماہر ہوتا ہے۔

چونکہ یہ لفظ سیدنا علیؑ کی شان میں آیا ہے اس لیے ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص اس ساری تشریح کو شیعہ نوازی کے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش کرے، اس لیے یہاں ہم ایک ایسے عالم دین کی عبارت وشہادت پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں جو تردید شیعیت میں پوری دنیا میں مشہور ہیں۔ اُن کے نزدیک یہ لفظ اپنے اندر اتنی جامعیت رکھتا ہے جسے عبارات سے واضح ہی نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ صاحب "الصواعق المحرقة في الرد على أهل البدع والزندقة" علامہ ابن حجر ہیتمی مکی شافعی رحمۃ اللہ علیہ تنبیہ کا عنوان قائم کرکے لکھتے ہیں:

مما يدل علىٰ أن الله سبحانه وتعالىٰ اختص عليّاً من العلوم بما تقصر عنه العبارات :قوله صلى الله عليه[وآله] وسلم:أَقْضَاكُمْ عَلِيٌّ ، وهو حديث صحيح لا نزاع فيه،وقوله صلى الله عليه[وآله] وسلم: أنا دارالحكمة وعليٌّ بابها.

"وہ نصوص جو اس پر دلالت کرتے ہیں کہ اللہ ﷻ نے سیدنا علیؑ کو ایسے علوم سے مخصوص فرمایا

جن کے بیان سے عبارتیں قاصر ہیں اُن میں ایک نص حضور ﷺ کا یہ ارشاد ہے: "علی تم سب سے بڑا قاضی ہے"۔ یہ صحیح حدیث ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں، اور آپ ﷺ کا یہ ارشاد بھی کہ: میں حکمت کا گھر ہوں اور علی اس کا باب ہے"۔

(المنح المكية ص ۵۸۳)

جو اقضیٰ ہو وہی أعلم ہوتا ہے

جو سب سے بڑا قاضی ہو وہ معرفتِ کتاب وسنت میں بھی سب سے زیادہ عالم ہوتا ہے، اگر اس کے عملی شواہد درکار ہوں تو علامہ ابن قیم جوزیہ حنبلی کی کتاب "الطرق الحكمية في السياسة الشرعية" یا راقم الحروف کی کتاب "شرح خصائص علي ﷺ" صفحہ ۲۵۰ تا ۲۶۰، حدیث نمبر ۳۴ ملاحظہ فرمائیں۔ آپ پر یہ حقیقت عیاں ہو جائے گی کہ کئی مرتبہ سابقہ خلفاء کرام ﷺ نے فیصلہ صادر فرما دیا تھا اور اس کی تعمیل ہوا چاہتی تھی اور کسی شخص کو اُس حکم پر اعتراض بھی نہ تھا کہ اچانک سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ نے کتاب وسنت کی روشنی میں اُس فیصلہ کو کالعدم کرا دیا، اور میں قربان جاؤں خلفاء کرام ﷺ کی حق پرستی، حقیت اور حقانیت پر کہ انہوں نے بلا تاخیر اپنے صادر شدہ فیصلہ کو واپس لے لیا اور قاضی القضاۃ سیدنا علی ﷺ کا شکریہ ادا کیا اور ساتھ ہی فرمایا: "میں اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آتا ہوں کہ میں ایسی قوم میں زندہ رہوں جس میں اے ابوالحسن آپ نہ ہوں" اور کبھی فرمایا: "اے علی! اللہ تعالیٰ مجھے آپ کے بعد زندہ نہ رکھے"۔ اللہ تعالیٰ کے ان کے مربی و مرشد پر بیحد درود وسلام ہوں اور اُن کے طفیل ان قدسی صفت خلفاء کرام اور تمام صحابہ کرام ﷺ پر بھی بے حساب صلوۃ وسلام ہوں۔

اور یہ بھی دعا ہے کہ اللہ ﷻ ہمیں بلا تکلف معنیٰ ومفہوم کو آگے پہنچانے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

اس حدیث کی تشریح کے آخر میں ہم اپنے قارئین کرام کے سامنے عصر حاضر کے بعض آزاد محققین کی عبارت پیش کرنا بھی مناسب سمجھتے ہیں۔

سیدنا علی ﷺ کے اقضیٰ ہونے پر آزاد تحقیق

عرب دنیا کے ایک آزاد محقق نے اکابر صحابہ کرام ﷺ کی فقہ پر کتب لکھی ہیں، مثلاً فقہِ ابی بکر، فقہ عمر، فقہ ابن عباس اور فقہ ابن مسعود وغیرہ، اور ان میں سے ہر جلد (اردو مترجم) تقریباً نوسو [۹۰۰] صفحات پر مشتمل ہے، اسی

طرح اسی محقق نے ایک ضخیم جلد "فقہِ علی" پر بھی لکھی ہے۔اس سے ہرلکھاری شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس محقق نے کتنا مطالعہ کیا ہوگا اور اِس کی ان حضرات میں سے ہرایک کے بارے میں معلومات کتنی وسیع ہوں گی؟ یہ آزاد محقق اپنے اِس وسیع مطالعہ کی روشنی میں کسی تقابل اور فضیلت وافضلیت کے تصور کے بغیر لکھتے ہیں:

"عام صحابہ کرام کی فقہی آرا پر اصحاب فتویٰ وروایت صحابہ کی فقہی آرا کو فوقیت حاصل ہے۔ان میں حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ ابن عباس، حضرت عبداللہ ابن مسعود، حضرت زید بن ثابت اور ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم اجمعین شامل ہیں۔

حضرت علی ؑ کا علمی مرتبہ ومقام اِن تمام حضرات میں سب سے اونچا ہے،اس کی دلیل حضور ﷺ کی وہ حدیث ہے جو امام احمدؒ نے مسند احمد میں روایت کی ہے۔حضور ﷺ نے اپنی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:"کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہو کہ میں تمہارا نکاح اپنی امت کے ایسے شخص کے ساتھ کر رہا ہوں جو اسلام لانے میں سب سے مقدم،علم میں سب سے بڑھ کر تحمل وبردباری میں سب سے ارفع ہے"۔

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی نظروں میں حضرت علیؓ کی بڑی قدر ومنزلت تھی،اور کسی اہم معاملہ میں آپ سے مشورہ کیے بغیر وہ کوئی قطعی فیصلہ نہیں کرتے تھے، حضرت ابوبکرؓ اپنے دور خلافت میں حضرت علیؓ سے مشورے لیتے رہے،حضرت عمرؓ کا طریقہ بھی یہی رہا بلکہ حضرت عمرؓ تو آپ سے کثرت سے مشورے کرتے،حضرت عثمان بھی اپنے دور خلافت میں آپ سے مشورے کرتے رہے۔کنزل العمال میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے مرتدین کے معاملہ میں حضرت علیؓ سے مشورہ لیا،حضرت علیؓ نے فرمایا:"اللہ تعالیٰ نے صلوۃ اور زکوۃ کو اکٹھا کر دیا ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ آپ ان دونوں کو الگ کر دیں"۔اس پر حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: "اگر یہ لوگ مجھے زکوۃ میں ایک رسی بھی دینے سے انکار کردیں جو وہ حضور ﷺ کے زمانے میں دیتے تھے تو میں اس کے لئے ان سے اسی طرح جنگ کروں گا جس طرح حضور ﷺ نے ان سے جنگ کی تھی"۔

مصنف عبدالرزاق میں ہے کہ ایک شخص نے حضرت عمرؓ سے حالت احرام میں بعض چوپایوں کو پکڑ لینے کے بارے میں مسئلہ پوچھا تو آپ نے سائل سے کہا:"کیا تم علی کو جانتے

ہو؟ جاؤ جا کران سے یہ مسئلہ پوچھو، ہمیں توان سے مشورہ کرنے کا حکم ملا ہے"۔

اب حضرت عمرؓ کا یہ قول کہ "ہمیں حکم ملا ہے" اس حقیقت پر صاف دلالت کرتا ہے کہ حکم دینے والا حضور ﷺ کی ذات کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ کلامِ سلف میں اس فقرے کا یہی مطلب لیا جاتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ بہت سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین مسائل میں حضرت علیؓ کی رائے کے متلاشی ہوتے تھے، اگر انہیں حضرت علیؓ کا قول مل جاتا تو پھر وہ اپنے لئے حضرت علیؓ کی مخالفت کو جائز نہ سمجھتے، ابن قدامہؒ مقدسی نے اپنی کتاب "المغنی" میں حبر الامت حضرت عبداللہؓ بن عباس سے یہ قول نقل کیا ہے کہ "جب ہمیں حضرت علیؓ کا کوئی قول مل جائے تو پھر ہمیں اسے چھوڑ کر کسی اور کے قول کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں رہتی"۔

مندرجہ بالا حقائق کے باوجود جب ہم حضرت علیؓ سے منقول فقہی آراء کا حضرت عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ یا حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے منقول فقہی آراء سے مقابلہ کرتے ہیں تو ہمیں حضرت علیؓ کی فقہی آراء تعداد میں سب سے کم ملتی ہیں۔

میرے خیال میں درج ذیل باتیں اس قلت کا سبب ہیں:

حضرت علی ؓ اپنے پیشرو خلفائے ثلاثہ کے مشیر رہے اور انہیں اپنے مشوروں سے مستفید کرتے رہے، یہ وہ زمانہ تھا جب مملکت اسلامیہ کے انتظامی ڈھانچے کی تکمیل کی گئی اور ایک واضح لائحہ عمل مرتب کیا گیا۔ اس لئے آپ کی اکثر اجتہادی آراء کا ظہور سرکاری حکموں اور سرکاری احکامات میں ہوتا تھا، اور آپ کی حیثیت اس نامعلوم سپاہی کی رہتی جس نے اسلامی حکومت کی تنظیم میں سب سے بڑھ کر حصہ لیا تھا"۔

(انسائیکلوپیڈیا ٤، فقہ حضرت علی ؓ دکتور محمد رواس قلعجي ص ١٠، ١٢)

جب ڈاکٹر محمد رواس قلعجی کے قلم سے آخری خط کشیدہ ڈھائی لائنوں کا تجزیہ سامنے آہی گیا ہے تو ہم قلم برداشتہ اس پر بطور نمونہ ایک شہادت پیش کئے دیتے ہیں۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے خلیفۂ اول سیدنا ابوبکر صدیق ؓ کے علم میں ایک فصل قائم فرمائی ہے "فصل: في علمه وأنه أعلم الصحابة وأذكاهم" (اُن کے علم میں ایک فصل، اور بیشک وہ تمام صحابہ کرام ؓ سے بڑے عالم اور اُن سب سے زیادہ ذہین تھے) پھر اس کے تحت

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کی "تھذیب الأسماء واللغات" سے یہ کلام نقل فرمایا ہے:

"ہمارے حضرات نے اُن کی علمی عظمت پر اُن کے اُس قول سے استدلال کیا ہے جو صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ انہوں نے فرمایا: خدا کی قسم! میں اُن لوگوں کے خلاف ضرور جنگ کروں گا جنہوں نے نماز اور زکوٰۃ میں فرق کیا، اللہ کی قسم! اگر انہوں نے اونٹ کی وہ رسی مجھ سے روکی جو وہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں پیش کرتے تھے تو میں اُس کے روکنے پر اُن سے جنگ کروں گا۔ شیخ ابو اسحاق نے اِس حدیث سے اور دوسری احادیث سے اپنی "طبقات" میں استدلال کیا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بڑے عالم تھے، کیوں:

لأنهم كلهم وقفوا عن فهم الحكم في المسألة.

"اس لیے کہ باقی سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس مسئلہ کو سمجھنے سے قاصر رہے تھے"۔

(تاريخ الخلفاء للسيوطي ص٣٧؛ تهذيب الأسماء واللغات للنووي ج٢ ص٤٧٩)

امام نووی، امام سیوطی اور ان کے علاوہ جو علماء کرام صحیحین کی اِس حدیث کے مدنظر یہ استدلال کیا، اِس حدیث تک محدود رہ کر اُن کا استدلال درست ہے مگر سارا علم فقط صحیحین میں نہیں، لہٰذا اگر دوسری کتب کو مدنظر رکھا جائے تو پھر حقیقت یہ ہے کہ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اس مسئلہ پر عزیمت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مشورہ کا ثمرہ تھی۔ ہر چند کہ میں تقابل سے گھبراتا ہوں اور بحمد اللہ میرے دل میں اکابر کی تعظیم ہے مگر نبی کریم ﷺ کی تعظیم تمام عظمتوں پر مقدم ہے اور آپ کا ارشاد ہے کہ علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا علم میری پوری امت سے زیادہ ہے، اور فرمایا: وہ باب العلم ہے، اور فرمایا: وہ باب الحکمۃ ہے، اور فرمایا: اُسے حکمت کے نو حصے عطا کیے گئے۔ پس اگر کسی مسئلہ کی حکمت کو سمجھنے میں اُن کی ذہانت وعلم قاصر کو مانا جائے تو اس سے ارشادِ نبوی ﷺ کا معاذ اللہ جھوٹا ہونا لازم آئے گا، اور یہ ناممکن ہے۔ لہٰذا بعض علماء کرام کا فقط صحیحین کی حدیث کو مدنظر رکھتے ہوئے مذکورہ بالا استدلال اپنی جگہ مگر یہ سمجھنا کہ اِس موقعہ پر فہم مرتضوی بھی قاصر رہی تھی، درست نہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ارشادِ نبوی ﷺ پورا نہ ہو؟ واقعہ یہ ہے کہ اس مسئلہ میں جہاں تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کا موقف رخصت پر مبنی تھا وہیں تنہا مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا مشورہ عزیمت پر مبنی تھا، انہوں نے فرمایا تھا:

"اگر آپ نے انہیں کوئی ایک چیز بھی چھوڑ دی جو رسول اللہ ﷺ نے اُن سے لیتے تھے تو آپ سنتِ رسول ﷺ کے خلاف ہوں گے"۔

(مختصر كتاب الموافقة ص٤٦، ٤٧؛ الرياض النضرة ج١ ص١٢٧؛ كنز العمال ج٦ ص٥٣١

حديث١٦٨٤٥؛موسوعة العشرة المبشرون بالجنة ج١١ص١٢٧وج١٢ص٥٠؛فقه علي لدكتور رواس قلعجي ج٤ص١١)

یہ مکمل واقعہ حدیث "أنا مدينة العلم وعلي بابها" کی تشریح میں گذر چکا ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ دکتور رواس قلعجی کا یہ تجزیہ درست ہے کہ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی اکثر علمی اور اجتہادی آراء کا ظہور سرکاری محکموں اور سرکاری احکامات میں ہوتا تھا،اور اس کی دلیل میں خود سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا وہ جواب بھی ہے جو انہوں نے ایک معترض کو دیا تھا کہ اُن کا معاملہ اس لیے درست رہا کہ اُن کے مشیر ہم تھے لیکن ہمارے مشیر تم ہو۔چنانچہ قاضی محمد برخوردار ملتانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"جب کسی معمولی فہم اور ناعاقبت اندیش کوتہ نظر نے علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں یہ اعتراض پیش کیا کہ جناب خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم نے جس نظم ونسق سے خلافت کو چلایا آپ ویسا نہیں چلا سکے۔علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ہاں یہ سچ ہے لیکن اس میں بھید یہ ہے کہ جس کل کے زور سے انہوں نے کام کیا،اس کا اعلیٰ ترین پرزہ میں تھا اور میری خلافت کے پرزے تم ہو"۔

(غوث أعظم وتذكره مشائخ قادريه ص١٦٤؛مرآة الجنان لليافعي ج١ص٩٥)





سیدنا علی ؓ ظاہر و باطن کے عالم

﴿۳۷﴾ أخبرنا الحسن بن أحمد قراءةً عليه،أخبرنا علي بن أحمد إجازة لم يكن سماعاً،قال: كتب إلينا القاضي أبوالمكارم الأصبهاني، منها إن الحسن بن أحمد المقري أخبره،قال:أخبرنا أبو نعيم الحافظ،حدثنا نذير بن جناح القاضي،أخبرنا إسحاق محمد بن مروان،أخبرنا أبي،أخبرنا عباس بن عبيد الله،أخبرنا غالب بن عثمان الهمداني أبومالک،عن عبيدة،عن شقيق،عن عبد الله بن مسعود رضي الله عنه قال:

إن القرآن أنزل على سبعة أحرف،ما منها حرف إلا له ظهر وبطن، وإن علياً بن أبي طالب عنده منه علم الظاهر والباطن.

﴿۳۷﴾ سیدنا ابن مسعود ؓ بیان کرتے ہیں: قرآن کریم سات حرفوں پر نازل کیا گیا،اُن میں سے ہر حرف کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن،اور بیشک علی بن ابی طالب ؓ کے پاس اُس کا علم ظاہر اور باطن دونوں ہیں۔

(حلية الأولياء ج۱ ص۱۰۵،وط:ج۱ ص۶۵؛تقريب البغية للهيثمي ج۳ ص۸۶ حديث ۳۲۵۷؛ تاريخ دمشق ج۴۲ ص۴۰۰؛مختصر تاريخ دمشق ج۱۸ ص۲۳؛الجواهر الحسان للثعالبي ج۱ ص ۳۵؛الإتقان ج۲ ص۴۶۶؛البرهان الجلي ص۷۱،۷۲؛أنوار العرفان ص۲۳۷)

قرآن مجید کا ایک ظاہر اور ایک باطن

یہ حدیث دو فرامین کا مجموعہ ہے، پہلا حصہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے اور دوسرا حصہ سیدنا ابن مسعود ؓ کا مشاہداتی قول ہے۔الفاظِ نبوی ﷺ پر مشتمل حصہ یہ ہے:

امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ سیدنا ابن مسعود ؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

أنزل القرآن علىٰ سبعة أحرف لكل حرف منها ظهر وبطن، ولكل حرف حد و لكل حد مَطَّلَع.

''قرآن مجید سات حرفوں پر نازل کیا گیا ہے،اس کے ہر حرف کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور ہر حرف کی ایک حد ہے اور ہر حد کے لیے ایک مَطّلع ہے''۔

(المعجم الكبير ج۱۰ ص۱۰۵،۱۰۶ حديث۱۰۱۰۷؛ فضائل القرآن لابن سلّام ص۴۲،۴۳؛

جامع البيان ج۱ ص۲۵؛شرح مشكل الآثار للطحاوي ج۸ حديث ۳۰۹۵؛مسند أبي يعلى ج۵ حديث ۵۱۲۷؛شرح السنة ج۱ حديث ۱۲۲؛مشكاة ج۱ حديث ۲۳۸؛مجمع الزوائد ج۷ حديث ۱۱۵۷۹، ۱۱۵۸٤؛الجامع الصغير حديث ۲۷۲۷؛جامع الأحاديث الكبير ج۲ حديث ٤۸۱۹)

بعض روایات میں یہ حدیث مختصراً ان الفاظ میں مذکور ہے:

أنزل القرآن على سبعة أحرف لكل اية منها ظهر وبطن.

"قرآن سات حرفوں پر نازل کیا گیا ہے، اس کی ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن"۔

(مسند البزار ج۵ ص٤٤۲ حديث ۲۰۸۱؛صحيح ابن حبان ج۱ ص۲۷٦ حديث ۷۵؛مسند أبي يعلى ج٤ ص٤۸۱ حديث ۵۳۸۱؛إتحاف الخيرة المهرة ج٦ ص۳۲۰ حديث ۵۹۳۰؛موارد الظمآن ج۲ حديث ۱۷۸۱؛كشف الأستار ج۳ ص۹۰ حديث ۲۳۱۲؛المطالب العالية ج۳ حديث ۳٤۸۹)

ظَهْرٌ وَبَطْنٌ اور حَدٌّ وَمَطْلَع کا مطلب

ہر چند کہ اس حدیث کو سمجھنے میں خصوصاً "مَطْلَع" کا لفظ مشکل ہے، لیکن ہم اس کے باقی الفاظ کو بھی سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ امام مناوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"قرآن کریم کی ہر آیت یا ہر حرف کی جو تفسیر ظاہر ہے اور اس کا جو معنیٰ سمجھ آتا ہے وہ اس کا ظاہر ہے، اور جس کی تفسیر مخفی ہے اور اس کا سمجھنا مشکل ہے وہ اس کا باطن ہے، یا ظاہر سے مراد الفاظ ہیں اور باطن سے مراد اُن کے معانی ہیں، یا ظاہر سے مراد تلاوت اور اس کی ادا ہے اور باطن سے مراد اس کا معنیٰ و مفہوم ہے، اور اسی طرح ہر حرف کی ایک حد سے مراد اُس کے معنیٰ کی وہ انتہا ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا ہے، اور ہر ظاہر و باطن حد کا ایک "مَطْلَع" (بلند ہونے کی جگہ) ہے، یعنی وہ مقام جس پر پہنچ کر مطلوبہ چیز کو حاصل کیا جا سکے۔ پس ظاہر قرآن کا "مَطْلَع" تو لغات عربیہ میں مہارت، اسبابِ نزول کا تتبع (تلاش) اور ناسخ و منسوخ وغیرہ کی معرفت ہے، اور باطن کا مطلع نفس کی پاکیزگی، ریاضت اور قرآن کے تقاضوں کے مطابق عمل ہے"۔

(فيض القدير ج۵ ص۲۳۱٦، وط: ج۳ ص۵٤)

لغت میں "مَطْلَع" بلندی سے جھانکنے کی جگہ کو کہتے ہیں، نیز جھروکوں سے جھانکنے کے لیے بھی یہ لفظ

مستعمل ہوتا ہے۔ انسان جب جھانکنے کی کوشش کرے تو اس کی نگاہ کے بالمقابل جو اشیاء نظر آتی ہیں وہ اُس مَطْلَع کی بدولت نظر آتی ہیں۔ اس حدیث میں سر کی آنکھ سے نہیں بلکہ قلبی آنکھ سے جھانکنا مراد ہے، اور ہم اس سے قبل قرآن وسنت سے قلبی آنکھ پر تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں۔ سو اگر کوئی انسان قلبی آنکھ سے معانئ قرآن میں جھانکنے کی کوشش کرے تو قدرت کی طرف سے حسبِ استعداد اُس پر جو معانئ قرآن آشکار ہوں وہ اُس قلبی مَطْلَع کی بدولت آشکار ہوتے ہیں۔

امام سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

والمطلع إشراف القلب على المراد بها فقهاً من الله عزّ وجلّ.

"قلب کا آیاتِ قرآنیہ کی مراد پر اللہ ﷻ کی توفیق سے آگاہ ہونا مَطْلَعْ ہے"۔

(تفسیر التستري ص ١٦)

جامعیتِ قرآن اور علمِ مرتضوی

جس طرح نبی اکرم ﷺ خاتم الانبیاء کی حیثیت سے سابقہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کے علوم اور فضائل وکمالات کے جامع ہیں، اسی طرح آپ پر نازل شدہ کتاب بھی خاتم الکتب کی حیثیت سے تمام سابقہ کتب کے علوم کی جامع کتاب ہے۔ چنانچہ امام بیہقی رحمہ اللہ سیدنا حسن بصری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ اُنہوں نے فرمایا:

"اللہ ﷻ نے ایک سو چار کتابیں نازل فرمائیں، اُن سب کے علوم اِن چار کتابوں میں جمع فرمادیے تورات، انجیل، زبور اور قرآن مجید، پھر تورات، انجیل اور زبور کے علوم قرآن میں جمع فرمادیے، پھر قرآن کے علوم طوال مفصل سورتوں میں جمع فرمادیے، پھر طوال مفصل کے علوم سورۃ الفاتحہ میں جمع فرمادیے۔ سو جس شخص نے سورۃ الفاتحہ کی تفسیر جان لی وہ اس شخص کی طرح ہے جس نے اللہ ﷻ کی تمام نازل شدہ کتابوں کی تفسیر جان لی"۔

(شعب الإيمان للبيهقي ج٢ ص٤٥١ حديث ٢٣٧١؛ الجامع لشعب الإيمان للبيهقي ج٤ ص٤٤ حديث ٢١٥٥؛ التفسير الكبير ج١ ص١٤٨؛ اللباب في علوم الكتاب ج١ ص١٦٤؛ بصائر ذوي التمييز ج١ ص١٣١؛ الدر المنثور ج١ ص٢٤، وط: ج١ ص٢١؛ الإتقان في علوم القرآن ج٢ ص٢١١، ٢٥٨؛ معترك الأقران للسيوطي ج١ ص١٣؛ الخصائص الكبرىٰ ج٢ ص٣١٧؛ سبل الهدىٰ

ج ص)

اس حقیقت کو بعض سابقہ کتب میں یوں بیان فرمایا گیا۔امام ابو نعیم اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ حضرت عبد الرحمان بن زیاد بن انعم رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا گیا:

یا موسیٰ إنما مثل کتاب أحمد ﷺ فی الکتب بمنزلۃ وعاء فیہ لبن کلما مخضتہ أخرجت زبدتہ.

"اے موسیٰ! بیشک تمام کتابوں میں احمد ﷺ کی کتاب کی مثال یوں ہے جیسے کسی برتن میں دودھ، کہ جب اُسے بلویا جائے تو مکھن نکال لیا جائے"۔

(حلیۃ الأولیاء ج۱۰ ص۱۱، وط: ج۱۰ ص۱۲، ۱۳؛ الإتقان ج۲ ص۲۶۵؛ معترك الأقران للسيوطي ج۱ ص۱۹)

قرآن کریم کی اسی جامعیت کے پیشِ نظر تلمیذِ مرتضیٰ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے ارشاد فرمایا:

أنزل في هذا القرآن کل علم و کل شيء قد بین لنا في القرآن، ثم تلا هذه الآیة: ﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾.

"اِس قرآن میں ہر علم ہے اور ہر چیز کو ہمارے لیے کھول کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔ پھر انہوں نے یہ آیت پڑھی: ﴿اور ہم نے آپ پر کتاب اتاری ہے اس میں ہر چیز کا تفصیلی بیان ہے"﴾۔[النحل:۸۹]

(جامع البیان ج۱۴ ص۲۱۲؛ تفسیر ابن أبي حاتم ۲۲۹۷؛ المحرر الوجیز ج۳ ص۴۱۵؛ تفسیر ابن کثیر ج۲ ص۷۶۸، وط: ج۸ ص۳۴۲؛ الدر المنثور ج۹ ص۹۹؛ صفوة التفاسیر ج۲ ص۱۲۸)

مشہور ترین عارف سیدی احمد بن علی الرفاعی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

وما نزلت بأحد نازلة إلا وفي کتاب الله لها دلیل من الهدیٰ والبیان.

"کسی شخص کو جو بھی کوئی معاملہ پیش آتا ہے کتابِ الٰہی میں اس کی راہنمائی اور بیان موجود ہے"۔

(حالة أهل الحقیقة مع الله لأحمد الرفاعي ص۱۱۴)

اسی لیے سیدنا علی المرتضیٰ کے شاگرد سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

إذا أردتم العلم فأثیروا القرآن، فإن فیه علم الأولین والآخرین.

''جب تم علم کا ارادہ کرو تو قرآن میں غور کرو، بیشک اس میں اولین اور آخرین کا علم موجود ہے''۔

(كتاب الزهد لابن المبارك ص ٢٨٠؛فضائل القرآن لابن سلام ص٤١، ٤٢)

یہ حدیث حسب ذیل الفاظ میں بھی مروی ہے:

من أراد العلم فليثور القرآن، فإن فيه علم الأولين والأخرين .

''جو شخص اولین اور آخرین کے علم کا ارادہ رکھتا ہو تو وہ قرآن میں خوب غور و فکر کرے''۔

(المعجم الكبير ج٤ ص٤٨٤ حديث٨٥٨٥، ٨٥٨٣، ٨٥٨٤؛المصنف لابن أبي شيبة ج٦ ص ١٢٧؛شعب الإيمان ج٢ ص٣٣٢ حديث ١٩٦٠؛الجامع لشعب الايمان ج٣ ص٣٤٧ حديث ١٨٠٨؛كتاب اللمع ص٦٧؛البرهان للزركشي ج٢ ص٨٧ وص ٢٩٠؛المطالب العالية ج٣ ص ١٣٣؛إتحاف الخيرة المهرة ج١ ص ١٩٠ حديث٢٤٢؛الإتقان ج٢ ص٢٥٨؛معترك الأقران للسيوطي ج١ ص١٢؛الدر المنثور ج٩ ص٩٩؛إتحاف السادة المتقين ج٥ ص١٣٢؛فتح القدير للشوكاني ج٣ ص١٣٣؛التفسير القاسمي ج١ ص٨٦)

حافظ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ حدیث متعدد اسانید سے روایت فرمائی ہے اور ان کی ایک سند کے تمام راوی صحیح حدیث کے راوی ہیں''۔

(مجمع الزوائد ج١٦٥٧ و ط: ج٧ ص٣٤٢ حديث١١٦٦٧)

فہم قرآن کے لیے تقویٰ ناگزیر

جو کچھ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا وہ حق ہے مگر اس کے لیے تبحر علمی کے ساتھ ساتھ تقویٰ اور جتنا علم انسان کو پہلے حاصل ہو چکا ہو اس پر حتی المقدور عمل بھی لازم ہے۔ چنانچہ امام زرکشی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

كتاب الله بحرٌ عميق، وفهمه دقيق، لايصلُ إلى فهمه إلا مَنْ تَبَحر في العلوم وعامَلَ الله بتقواه في السر والعلانية.

''اللہ کی کتاب ایک گہرا سمندر ہے اور اس کو سمجھنا دقیق ہے، اس کی فہم تک رسائی نہیں ہو سکتی مگر اس شخص کو جسے علوم میں تبحر حاصل ہو اور جو جلوت و خلوت میں اللہ تعالیٰ کا تقویٰ کا اختیار

کرے''۔

(البرهان في علوم القرآن ج۲ ص۲۸۹)

آپ ایک اور مقام میں لکھتے ہیں:

ومَنْ لم يكن له علم وفهم وتقوى وتدبر لم يُدرِك من لذة القرآن شيئاً.

''اور جو شخص علم وفہم اور تقویٰ وتدبر سے تہی دامن ہو اُسے لذت قرآن سے کچھ حاصل نہیں ہوتا''۔

(البرهان فی علوم القرآن ج۲ ص۲۹۱)

جس خوش بخت کو تبحر علمی کے ساتھ ساتھ دولتِ تقویٰ بھی نصیب ہو تو اُس کی قرآن فہمی کا مقام ہی کچھ اور ہوتا ہے۔امام صاوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''سیدی خواص رحمہ اللہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے احسانات میں سے ایک احسان مجھ پر یہ ہے کہ اس نے مجھے سورۂ فاتحہ کے علوم میں سے ایک لاکھ ننانوے ہزار علوم عطا فرمائے ہیں''۔

(حاشية الصاوي على الجلالين ج۱ ص۱۲۸)

امام شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

''حضرت علی الخواص رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میں جمیع احکام قرآن کو فقط سورۂ فاتحہ سے مستنبط کرسکتا ہوں''۔

(المنن الكبرى ص٤٧)

سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے شاگرد رشید سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کی قرآن فہمی سے کون ناواقف ہوگا؟ وہ فرماتے ہیں کہ انہیں متشابہات قرآن کا بھی علم ہے۔چنانچہ مفسرین کرام نے ﴿وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ﴾ [آل عمران:۷] (اور نہیں جانتا اس کے صحیح معنیٰ کو مگر اللہ تعالیٰ، اور علم میں رسوخ والے) کے تحت لکھا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے تھے:

أنا ممن يعلم تأويله ،وفي رواية:أنا من الرسخين فى العلم.

''میں اُن میں سے ہوں جو تاویل کو جانتے ہیں، یعنی میں علم میں رسوخ والوں سے ہوں''۔

(جامع البيان ج٥ ص٢٢٠؛ البرهان في علوم القرآن ج٢ ص٢٠٣؛ الروض الندية شرح العقيدة الطحاوية ج٢ ص٢٩٢؛ التفسير المنير للدكتور وهبة الزحيلي ج٣ ص١٥٤)

جب تلامذہ کی قرآن فہمی کا یہ مقام ہے تو اُس استاذ کی تفسیر دانی کا عالم کیا ہوگا جو بابُ مدینۃ العلم ہے، جو بابُ دارالحکمۃ ہے، جس کو دس میں سے حکمت کے نو حصے حاصل تھے، جس کے بارے میں ارشاد ہوا کہ ہم تنزیل قرآن پر جہاد کرتے رہے اور علی تاویلِ قرآن پر جہاد کرے گا، جس کے لیے آقا ﷺ نے ہر وہ خیر مانگی جو اپنے لیے مانگی؟ جی ہاں اُن کی ظاہری تفسیر دانی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے خود فرمایا:

لو شئت لأوقرت سبعين بعيرًا من تفسير فاتحة الكتاب.

''اگر میں چاہوں تو سورۂ فاتحہ کی تفسیر سے ستر اونٹوں کا وزن بنا دوں''۔

(إحياء علوم الدين ج۱ ص۲٦٦؛ حاشية الصاوي على الجلالين ج۱ ص۱۲۸؛ البرهان للزركشي ج ۱ ص۱۰۱)

سیدنا علی کی اعلمیت کو منوانے کا طریقہ

قارئین کرام پر واضح رہے کہ راقم الحروف نے اس مقام پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شانِ علمیت کے ضمن میں ائمہ و علماء اہل سنت کی شانِ علمیت میں جو اقوال نقل کیے ہیں اس میں ایک حکمت ہے۔ وہ یہ کہ اگر فقط سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شانِ علمیت بیان کی جائے تو وہ بہت سے لوگوں کو ہضم نہیں ہوتی اور وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگتے ہیں اور فوراً سند وغیرہ مانگنے لگتے ہیں حتیٰ کہ اُن کے ذہن میں انکار کے تمام تر بہانے آناً فاناً جمع ہو جاتے ہیں۔ ہاں اگر فقط جامعیت قرآن بیان کی جائے اور اُس ضمن میں علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی بھی امتی کی شانِ علمیت تو کیا بلکہ اعلمیت بیان کی جائے تو کسی ذہن میں سند اور نکیر شکیر وغیرہ کا خیال تک پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن نام نہاد شیعہ اور روافض کی ضد میں آ کر کوئی نام نہاد سنی کہاں تک اعلمیتِ مرتضوی کا انکار کرے گا؟ جبکہ حال یہ ہے کہ ہمارے علماء کے پاس جامعیتِ قرآن کی تفہیم کا نمونہ پیش کرنے کے لیے سیدنا علی علیہ السلام اور اُن کے تلامذہ کے علوم کی فراوانی کے علاوہ اور کوئی مثال ہی نہیں۔ خود غور کیجئے اوپر جو عبارات جامعیتِ قرآن میں پیش کی گئیں، خواہ وہ امام غزالی کی عبارت ہو، امام زرکشی کی عبارت ہو، امام شعرانی کی عبارت ہو یا امام صاوی رحمۃ اللہ علیہم وغیرھم کی عبارت ہو، سب نے بات کہاں ختم کی ہے؟ فرق یہ ہے کہ وہ جامعیتِ قرآن کے ضمن میں یہ اقوال لائے ہیں تو وہ ہضم ہو گئے ہیں، اگر وہ یہی اقوال اعلمیتِ مرتضوی کے ثبوت میں لاتے تو بہت سے لوگوں کو ہضم نہ ہوتے۔ بہر حال کوئی مانے یا نہ مانے قرآن کی شان کا بیان ہو تو اعلمیتِ مرتضوی کا بیان ناگزیر ہے اور اگر اعلمیتِ مرتضوی کا بیان ہو تو جامعیتِ قرآن کا بیان

ناگزیر ہے، کیونکہ "علي مع القرآنِ والقرآنُ مع عليٍ" (علی قرآن کے ساتھ اور قرآن علی کے ساتھ) جو آچکا ہے۔

تمام علوم بسم اللہ کی "ب" میں

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

كل العلوم مندرج في الكتب الأربعة وعلومها في القرآن، وعلوم القرآن في الفاتحة، وعلوم الفاتحة في "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" وعلومها في الباء من بسم اللّٰه.

"سب علوم کتب اربعہ میں جمع ہیں اور اُن کے علوم قرآن میں جمع ہیں اور قرآن کے علوم سورۂ فاتحہ میں جمع ہیں اور سورۂ فاتحہ کے علوم "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" میں جمع ہیں اور "بسم اللہ" کے علوم بسم اللہ کی "ب" میں جمع ہیں"۔

(التفسیر الکبیر ج ۱ ص ۸۸)

أَنَا نُقْطَةُ الْبَاءِ

تمام آسمانی علوم بسم اللہ کی "ب" میں کیوں؟ اس لیے کہ یہ وہ "ب" ہے جو بندے کو رب سے ملاتی ہے، اور تمام علوم کی غرض ہی یہی ہے کہ بندے کو اُس کا رب مل جائے، یعنی تمام علوم ذریعہ اور وسیلہ ہیں اور رب تبارک وتعالیٰ کو پانا مقصود ہے، اور یہ "ب" نہ ہو تو رب نہیں ملتا۔ کیوں؟ اس لیے کہ سیدنا علی علیہ السلام ہی یہ "ب" بلکہ اُس کا نقطہ ہیں جو اُس کی شناخت ہے۔ چنانچہ امام مناوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ سیدنا علی علیہ السلام نے فرمایا:

أَنَا نُقْطَةُ الْبَاءِ.

"میں "ب" کا نقطہ ہوں"۔

(الكواكب الدرية في طبقات الصوفية ج ۱، القسم الأول ص ۱۰۹)

یہ "ب" بہت سی بنیادی چیزوں میں ایسی بنیادی حیثیت رکھتی ہے کہ مسلمان کا اُن کے بغیر چارہ ہی نہیں۔ مثلاً بسم اللہ کے شروع میں "ب" لفظِ "بلـــی" کے شروع میں "ب" مکۃ المکرمہ جو ام القریٰ (تمام شہروں کی اصل) ہے، قرآن کریم میں اُسے "بکّۃ" فرمایا گیا ہے، اُس کے شروع میں "ب" بیت اللہ کے شروع میں "ب"

اور بابُ العلم کے شروع میں بھی "ب" ہے۔ یقین فرمایئے جس طرح اوپر کی چار چیزوں کے بغیر چارہ نہیں اسی طرح پانچویں چیز یعنی باب العلم کے بغیر بھی کوئی چارہ نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح تمام سابقہ کتابوں کا علم قرآنِ صامت میں ہے اور قرآنِ صامت کا پورا علم سورۃ الفاتحہ، پھر بسم اللہ اور پھر بسم اللہ کی "ب" میں ہے، اسی طرح تمام سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام کی شریعتوں کا علم مدینۃ العلم ﷺ کی ذات پاک میں ہے اور پھر مدینۃ العلم ﷺ کا علم باب العلم یعنی قرآن ناطق ؓ کی ذات پاک میں ہے، اسی لیے معنوی طور پر بسم اللہ کی "ب" سیدنا علی ؓ کی ذات پاک ہے، لہٰذا جس طرح صوری "ب" کے بغیر قرآن صامت سے استفادہ ناممکن ہے اسی طرح معنوی "ب" کے بغیر خدا اور رسول کو پانا ناممکن ہے۔ اس حقیقت کو امام علی بن احمد بن حسن الحرالی الاندلسی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۶۳۸ھ نے کیا ہی خوب صورت انداز میں بیان فرمایا ہے، امام مناوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

قال: قد علم الأولون والأخرون أن فهمَ كتاب الله منحصر إلىٰ فهم علي ؓ ومن جهل ذلک فقد ضل عن الباب.

"انہوں نے فرمایا: بیشک تمام اولین اور آخرین جانتے ہیں کہ کتاب الٰہی کی فہم سیدنا علی ؓ کی فہم میں منحصر ہے، جو شخص اس بات سے جاہل رہا تو یقیناً وہ دروازہ سے بھٹک گیا"۔

(الكواكب الدرية في طبقات الصوفية ج۲ ص٤٦٦)

علامہ علیہ الرحمۃ نے اس حقیقت کو یوں منظوم فرمایا ہے ؎

اللّٰہ اللّٰہ بائے بسم اللّٰہ پدر
معنیٔ ذبحِ عظیم آمد پسر

(اسرار ورموز ص ۱۱۰)

فہم خاص اور علم لدنی

بلاشبہ قرآن کریم کی تمام تر فہم امام علی ؓ کی ذات بابرکات کو حاصل تھی، آخر انہوں نے یونہی تو نہیں فرمایا تھا:

أو كسرت لي الوسادة ثم جلست عليها لقضيت بين أهل التوراة بتوراتهم وبين أهل الإنجيل بإنجيلهم وبين أهل الزبور بزبورهم وبين أهل الفرقان

بفرقانهم.

''یا میرے لیے بچھونا بچھایا جائے تو میں اُس پر بیٹھ کر اہل تورات کا فیصلہ اُن کی تورات سے، اہل انجیل کا فیصلہ اُن کی انجیل سے، اہل زبور کا فیصلہ اُن کی زبور سے اور اہل قرآن کا فیصلہ اُن کے قرآن سے کروں گا''۔

(شرح المواقف ج۸ص۴۰۲)

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا علم لدنی پر ایک رسالہ ہے، اُس میں وہ سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کے مذکورہ ارشاد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وهذه مرتبة لا تنال بمجرد التعلم الإنساني، بل يتحلى المرء بهذه المرتبة بقوة العلم اللدني، وقال: أيضاً رضي الله عنه يحكىٰ عن عهد موسىٰ عليه السلام أن شرح كتابه أربعون حملاً فلو يأذن الله في شرح معاني الفاتحة لأشرع فيها حتىٰ تبلغ مثل ذلك، يعني أربعين وقراً، وهذه الكثرة والسعة والانفتاح في العلم لايكون إلا لدنياً إلٰهياً سماوياً. فإذا أراد الله تعالىٰ بعبد خيراً رفع الحجاب بين نفسه وبين النفس التي هي اللوح، فيظهر فيها أسرار بعض المكنونات وانتقش فيها معاني تلك المكنونات فتعبر النفس عنها كما تشاء لمن يشاء من عباده وحقيقة الحكمة تنال من العلم اللدني ومالم يبلغ الإنسان هذه المرتبة لايكون حكيماً من مواهب الله تعالىٰ: ﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَآءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوْتِيَ خَيراً كَثِيراً وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّآ أُولُوا الْأَلْبَابِ﴾ [البقرة: ٢٦٩] وذلك لأن الواصلين إلى مرتبة العلم اللدني مستغنون عن كثرة التحصيل وتعب التعليم فيتعلمون قليلاً ويعلمون كثيراً ويتعبون يسيراً ويستريحون طويلاً.

''اس مرتبہ کو محض انسانی تعلیم سے نہیں پایا جا سکتا بلکہ انسان اس مرتبہ کو علم لدنی کی قوت سے پاسکتا ہے، نیز حضرت علی ﷺ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ اُن کی کتاب کی شرح کی گئی تو چالیس اونٹوں کا وزن تیار ہو گیا، سو اگر اللہ تعالیٰ مجھے سورۃ الفاتحہ

کے معانی کی شرح کی اجازت دے تو میں شروع ہو جاؤں گا حتیٰ کہ اُسی کی مانند تیار کردوں گا، یعنی چالیس اونٹوں کا وزن۔ اور یہ کثرت، وسعت اور علمی فراوانی علم لدنی، علم الٰہی اور علم سماوی کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ پس جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اُس کے اور اپنی ذات "جو کہ ایک لوح ہے" کے درمیان سے حجابات مرتفع کر دیتا ہے، پھر اُس میں ایجادات کے اسرار ظاہر ہوتے ہیں اور اُن ایجادات کی حقیقتیں منکشف ہوتی ہیں، پھر وہ ذات اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتی ہے اُن معانی کی تعبیر ظاہر کرتی ہے۔ اور حکمت کی حقیقت کو علم لدنی سے ہی پایا جاتا ہے، اور جو شخص اس مرتبہ تک نہیں پہنچتا وہ حکیم نہیں ہوتا، اس لیے کہ حکمت اللہ تعالیٰ کی عطاؤں میں سے ایک عطا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿اللہ حکمت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور جسے حکمت دی گئی اُسے خیر کثیر دی گئی، اور نہیں نصیحت مانتے مگر باریک عقل والے﴾[البقرة: ٢٦٩] یہ حق ہے، یہی وجہ ہے کہ مرتبہ علم لدنی پر فائز ہستیاں تحصیل علم کی کثرت اور اُس کو سیکھنے کے جھنجھٹ سے بے نیاز ہوتی ہیں، وہ سیکھتے کم ہیں اور جانتے زیادہ ہیں، اُن کی تھکاوٹ قلیل اور راحت طویل ہوتی ہے"۔

(الرسالة اللدنية[من مجموعة الرسائل الغزالي]ص ٧١،٧٠)

مَا فِي السُّطُوْر اور مَا فِي الصُّدُوْر علم میں فرق

یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام علوم قوتِ فہم و استنباط کا اور ظاہری علم پر عمل کا نتیجہ ہیں، چونکہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت میں آیا ہے کہ وہ "سیکھتے کم ہیں اور جانتے زیادہ ہیں" بعض علماء کے نزدیک خصوصی فہم بھی اسی علم کا ایک شعبہ ہے، چنانچہ ایک حدیث پاک میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے بھی خصوصی فہم کو قدرت کی عطا قرار دیا ہے، جبکہ علم باطنی اس کے علاوہ ہے، لیکن بعض علماء کے نزدیک یہ خصوصی فہم بھی علم لدنی ہے اور علم لدنی علم غیب ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن قیم حنبلی لکھتے ہیں:

"علم لدنی کی دلیل خود اس کا وجود ہے اور اس کا ادراک اس کا عیاں ہونا ہے اور اس کا تعارف اس کا حکم ہے۔" لیس بینه وبين الغيب حجاب" (اس کے اور غیب کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہوتا) ایک قوم نے علم لدنی کی تعریف میں اشارہ فرمایا کہ یہ وہ علم ہے جو بندے

کو بغیر کسی واسطہ کے محض اللہ تعالیٰ کے الہام سے حاصل ہوتا ہے، جیسا کہ خضر علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام کے واسطہ کے بغیر حاصل تھا۔ ارشادِ الٰہی ہے: ہم نے اس کو اپنے پاس سے رحمت دی تھی اور خاص اپنی جانب سے اس کو علم سکھایا تھا۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے رحمت اور علم کے درمیان فرق فرمایا ہے۔ رحمت کا ذکر "عند" سے فرمایا اور علم کا ذکر "لدن" سے کیونکہ یہ دونوں کسی انسان کے ذریعہ حاصل نہیں ہوتے، اور "لدن" "عند" سے زیادہ خاص اور معنیٰ زیادہ قریب ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (اے حبیب) دعا مانگئے کہ اے میرے رب جہاں کہیں تو مجھے لیجائے سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں کہیں سے مجھے لے آئے سچائی کے ساتھ لے آ، اور عطا فرما مجھے اپنی جناب سے وہ قوت جو مدد کرنے والی ہو، پس "من لدنه" (خاص اسی کی) مدد کرنے والی قوت "مما عنده" (اس کی جانب کی) قوت سے زیادہ خاص اور زیادہ قریب ہے اور یہ وہ مدد ہے جس سے اس نے حضور ﷺ کی مومنین کے ذریعہ تائید فرمائی جیسا کہ ارشاد فرمایا: وہ اللہ ہے جس نے آپ کی تائید فرمائی اپنی نصرت اور مومنین کی جماعت سے۔ (اگلے الفاظ کی عبارت ملاحظہ ہو:)

والعلم اللدني ثمرة العبودية والمتابعة، والصدق مع الله و الإخلاص له، وبذل الجهد في تلقي العلم من مشكاة رسوله، وكمال الإنقياد له. فيفتح له من فهم الكتاب والسنة بأمر يخصه به، كما قال علي بن أبي طالب ؓ: وقد سئل: هل خصكم رسول الله بشيء دون الناس؟ فقال: لا، والذي فلق الحبة وبرأ النسمة، إلا فهماً يؤتيه الله عبداً في كتابه. فهذا هو العلم اللدني الحقيقي.

"پس علم لدنی عبادت اور اتباع کا ثمرہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ صدق و اخلاص اور نبی کریم ﷺ کی غلامی اور سینۂ نبوی سے علم کے حصول میں کوشش خرچ کرنے کا ثمرہ ہے۔ ایسے شخص کے لیے قرآن و حدیث کی فہم کے دروازے خاص طور پر کھول دیئے جاتے ہیں، جیسا کہ سیدنا علی ؓ کا ارشاد ہے، اُن سے سوال کیا گیا کہ کیا رسول اللہ ﷺ نے آپ کو دوسرے لوگوں سے الگ کسی چیز سے خاص فرمایا تھا؟ تو انہوں نے فرمایا: اُس ذات کی قسم جس نے دانے کو چیرا اور جاندار کو پیدا فرمایا نہیں، مگر وہ فہم جو اللہ ﷻ کسی بندے کو اپنی کتاب میں عطا فرماتا ہے۔ پس یہی

حقیقی علم لدنی ہے"۔

(مدارج السالکین ج۲ ص ٤٤٥، ٤٤٦، وط: ج۲ ص ٤٩٥)

علامہ مجدالدین محمد بن یعقوب فیروز آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔

(بصائر ذوی التمییز ج٤ ص٤٢٦، ٤٢٧)

علامہ ابن تیمیہ نے بھی اس فہم کو علم لدنی کی دلیل قرار دیا ہے۔

(العلم الظاهر والباطن من مجموعة الرسائل المنيرية ج١ ص٢٣٧)

ملا علی قاری رحمہ اللہ کا عدم تدبر

اس مکمل تفصیل سے ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کے اُس خیال کی تردید ہو جاتی ہے جو انہوں نے اُس حدیث کے تحت پیش کیا تھا جس میں سیدنا علی المرتضیٰ ؓ کے ساتھ اللہ ﷻ کی سرگوشی کا ذکر ہے، اور جس کو ہم حدیث نمبر [۳۴] کی تشریح کے تحت نقل کر چکے ہیں۔ علامہ طیبی، عبدالرحمان مبارکپوری، علامہ محمد ادریس کاندھلوی اور خود ملا علی قاری نے اُس سرگوشی کو اسرار الٰہیہ اور امور غیبیہ پر مشتمل قرار دیا مگر ملا علی قاری نے اس کی مزید توجیہ کرنا چاہی تو معاملہ بگاڑ دیا۔ انہوں نے لکھا:

"اس میں ظاہر یہ ہے کہ سرگوشی کا معاملہ ایسے دنیوی اسرار سے ہے جو دین سے متعلق ہیں جیسا کہ غزوات وغیرہ، کیونکہ صحیح بخاری میں ثابت ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے دریافت کیا گیا: کیا تمہارے (اہل بیت کے) پاس کوئی ایسی چیز ہے جو قرآن میں نہ ہو؟ تو انہوں نے فرمایا: اُس ذات کی قسم جس نے دانے کو چیرا اور جاندار کو پیدا فرمایا ہمارے پاس قرآن کے علاوہ کچھ نہیں ماسوا اُس فہم کے جو کسی شخص کو کتاب الٰہی میں دی جاتی ہے اور ماسوا اس کے جو اس تحریر میں ہے۔ عرض کیا گیا: اس تحریر میں کیا ہے؟ فرمایا: دیت کا مسئلہ، قیدی کی رہائی کی ضمانت کا معاملہ اور یہ کہ مسلمان کافر کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا"۔

(مرقاة شرح المشكاة ج١٠ ص٤٧١)

اس عبارت میں ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ سے بوجہ عدم تدبر لغزش ہو گئی:

۱۔ انہوں نے خدائی سرگوشی میں آنے والے اسرار کو فقط دنیوی غزوات وغیرہ کی حد میں بند کر دیا، حالانکہ

ایسے امور کے لیے اس قدر اہتمام کی کیا ضرورت ہے کہ خود اللہ ﷻ سرگوشی فرمائے؟

۲۔ انہوں نے بخاری کی جو حدیث پیش کی ہے اُس کا اِن امور سے کوئی تعلق ہی نہیں، کیونکہ اُس میں سیدنا علی علیہ السلام نے اہل بیت یا اپنی ذات سے قرآن کے علاوہ جن چیزوں کی نفی کی ہے وہ مافي السطور (لکھے ہوئے) علوم کی نفی ہے مافي الصدور (سینوں میں موجود) علوم واسرار کی نفی نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن کریم مکتوب چیز ہے اور سائل نے قرآن کے علاوہ کسی دوسری مکتوب چیز کے متعلق پوچھا تھا جیسا کہ خود سیدنا علی المرتضیٰ علیہ السلام کے جواب سے عیاں ہے۔ انہوں نے اپنے جواب میں پہلے صاف نفی فرمائی پھر لفظ "صحيفة" سے ایک تحریر کو مستثنیٰ فرمایا اور "صحيفة" لکھے ہوئے کاغذ کو کہا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جواب سوال کے مطابق تھا۔ دوسرے مقامات پر اس معنی کی تائید میں خود واضح الفاظ موجود ہیں، چنانچہ ایک مقام پر جواب کے الفاظ یوں ہیں:

ما عندنا كتاب نقرؤه إلا كتاب الله غير هذه الصحيفة.

"ہمارے پاس کتابِ الٰہی کے علاوہ کوئی ایسی کتاب نہیں جسے ہم پڑھیں، اس صحیفہ کے سوا"۔

(بخاري ص ١١٦٦ حديث ٦٧٥٥ وص ٥٢٨ حديث ٣١٧٢)

ایک اور روایت میں جواب کے الفاظ یوں ہیں:

والله ما عندنا من كتاب يقرأ إلا كتاب الله وما في هذه الصحيفة.

"اللہ کی قسم! ہمارے پاس کوئی تحریر نہیں جو پڑھی جائے، ماسوا کتابِ الٰہی کے اور اُس کے جو اِس صحیفہ میں ہے"۔

(بخاري ص ١٢٥٦ حديث ٧٣٠٠)

ایک اور مقام پر اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں سیدنا علی علیہ السلام نے فرمایا:

ما كتبنا عن النبي ﷺ إلا القرآن، وما في هذه الصحيفة.

"ہم نے نبی کریم ﷺ سے کچھ نہیں لکھا ماسوا قرآن کے اور اُس کے جو اِس صحیفہ میں ہے"۔

(بخاري ص ٥٢٩ حديث ٣١٧٩)

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں تو سوال کے الفاظ سے ہی حقیقت واضح ہو جاتی ہے، حضرت شعبی حضرت ابو جُحَیفہ رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

قلتُ لعلي: يا أمير المؤمنين! هل عندكم سوداء في بيضاء ليس في

كتاب الله؟ قال: لا. الحديث

''میں نے سیدنا علی المرتضیٰ ؓ سے عرض کیا: یاامیرالمومنین! کیا آپ کے پاس سفید میں سیاہ ہے، جو کتابِ الٰہی میں نہ ہو؟ فرمایا: نہیں......''۔

(جامع الترمذي ص ۳۴۱ حديث ۱۴۱۲)

المراد به شيء مكتوب.

''اس سے کوئی لکھی ہوئی چیز مراد ہے''

(تحفة الأحوذي ج ٤ ص ٧٦٧)

احادیث کے مختلف الفاظ سے معلوم ہوا کہ سیدنا علی المرتضیٰ ؓ نے جس چیز کی نفی فرمائی ہے اُس سے مافي السطور یعنی لکھی ہوئی وہ چیز مراد ہے جو قرآن کریم کے علاوہ اہل بیت کے لیے خصوصاً چھوڑی گئی ہو، لہٰذا ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کا اِس حدیث سے سرگوشی والی حدیث کے مفہوم کو متعین کرنا دلالۃً اور صراحتاً دونوں طرح درست نہیں۔

۳۔ سیدنا علی ؓ نے جہاں نفی کے بعد صحیفہ کو مستثنیٰ فرمایا وہیں اُس مخصوص فہم کو بھی مستثنیٰ فرمایا جو اللہ تعالیٰ کسی بندے کو قرآن سمجھنے کے لیے عطا فرماتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب سوال لکھی ہوئی چیز کے متعلق تھا تو جواب میں قرآن کے علاوہ دوسری کسی لکھی ہوئی چیز کو مستثنیٰ کیا جاتا، سیدنا علی ؓ نے ''إلا فهما'' (مگر فہم) کے الفاظ سے فہم کو کیوں مستثنیٰ فرمایا؟ جواباً عرض ہے کہ سیدنا علی ؓ نے اِن الفاظ سے سائلین کی حیرت دور فرمائی ہے، کیونکہ وہ سیدنا علی ؓ کی غیر معمولی قرآن دانی کی بنا پر یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ شاید ان کے پاس قرآن کے علاوہ کچھ اور بھی لکھا ہوا مواد موجود ہے، اسی لیے فرمایا: مذکورہ دو تین چیزوں (دیت وغیرہ) کے علاوہ ہمارے پاس دوسری کوئی لکھی ہوئی چیز تو نہیں، ہاں ہمیں خصوصی فہم قرآن عطا ہے۔

ملا علی قاری کی تردید اُنہیں کے کلام سے

سیدنا علی ؑ نے اس ارشاد سے اپنے فہم کی غیر معمولی عظمت کی طرف اشارہ فرمایا ہے، بلاشبہ یہ فہم اس قدر عظیم الشان نعمت تھی کہ اس کی بدولت قرآنی الفاظ کے ظاہری ترجمہ کے پیچھے جو مخفی معانی ہوتے ہیں سیدنا علی ؓ کی مبارک بصیرت اُن معانی کو بھی تاڑ لیتی تھی، اسی لیے علامہ ابن قیم اور دوسرے علماء کرام اس فہم کو علم لدنی

یعنی علم غیب قرار دینے پر مجبور ہوئے۔ لہٰذا اس لحاظ سے بھی ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کا اس حدیث کو چند غزوات کے علم تک محدود کرنے کی دلیل بنانا ایک اور عدم تدبر کا نتیجہ ہے۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کے سابقہ عدم تدبر کو آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ وہ احادیث کی تصریحات کے بھی خلاف ہے، لیکن اس سے بھی زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ انہوں نے خود اپنی دوسری کتب میں بھی اس کے برعکس لکھ دیا ہے۔ چنانچہ قصیدہ بردہ شریف کی شرح میں انہوں نے نبوی علوم واسرار پر گفتگو کرتے ہوئے پہلے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے ان اسرار سے خلفاء اربعہؓ کو بھی آگاہ فرمایا تھا، پھر فرمایا کہ حضرت علیؓ سے منقول بخاری کی حدیث اس کے منافی نہیں ہے۔ چنانچہ وہ نبوی علوم کی مختلف جہتوں پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

فعِلْم أخذ عليّ كتمانه، وعلم خيّرني فيه، وعلم أمرني أن أبلغه، قال علي ؓ: فكان يسر إلىٰ أبي بكر وعمر وعثمان وإليّ ما خير فيه. ذكره جمع من الشراح ولم أقف علىٰ أصل في كتب الحديث، ولاينافي مارواه البخاري عن أبي جحيفة قال: قلتُ: لعلي كرم الله تعالىٰ وجهه، هل عندكم شيء من الوحي ما ليس في القرآن؟ قال: لا، والذي فلق الحبة وبرأ النسمة إلا فهماً يعطيه الله رجلاً في القرآن، ومافي هذه الصحيفة. قلتُ: وما في هذه الصحيفة؟ قال: العقل وفكاك الأسير وأن لايقتل مسلم بكافر.

”پس ایک علم کے چھپانے کا مجھ سے عہد لیا گیا، اور ایک علم کے بارے میں مجھے اختیار دیا گیا، اور ایک علم کے بارے میں مجھے حکم ہوا کہ میں اسے پہنچاؤں۔ سیدنا علیؓ نے فرمایا: جس علم میں حضور ﷺ کو اختیار دیا گیا اُس سے آپ نے حضرات ابوبکر، عمر، عثمان اور مجھے آگاہ فرمایا۔ اس کو تمام شارحین نے ذکر کیا لیکن میں کتب حدیث میں اس کی اصل سے واقف نہیں، اور یہ اُس حدیث کے منافی نہیں جس کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو جُحَیفہؓ سے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: میں نے سیدنا علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ سے دریافت کیا: کیا تمہارے (یعنی اہل بیت کے) پاس وحی میں سے کوئی ایسی چیز ہے جو قرآن میں نہ ہو؟ انہوں نے فرمایا: اُس ذات کی قسم جس نے دانے کو چیرا اور جاندار کو پیدا فرمایا، ہمارے پاس قرآن کے علاوہ کچھ

نہیں ماسوا اُس فہم کے جو کسی شخص کو کتابِ الٰہی میں دی جاتی ہے اور ماسوا اُس کے جو اِس تحریر میں موجود ہے۔ عرض کیا گیا: اِس تحریر میں کیا ہے؟ فرمایا: دیت کا مسئلہ، قیدی کی رہائی کی ضمانت کا مسئلہ اور یہ کہ مسلمان کافر کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا"۔

(الزبدة العمدة في شرح البردة لعلي القاري ص ۹۷)

غور فرمایئے لمرقاة شرح المشكاة میں اس حدیث سے اسرار کی نفی کی گئی اور یہاں فرمایا: جو اسرار خلفاء اربعہ ؓ کو بتلائے گئے یہ حدیث اُن کے منافی نہیں۔ یہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کا واضح تضاد ہے، اور قرآن کریم کے علاوہ کوئی کتاب بھی ایسے تضادات سے مبراء نہیں ہے۔ امام شافعی ؒ نے حق فرمایا تھا کہ "أبى الله أن يكون كتاباً صحيحاً غير كتابه. (اللہ تعالیٰ کو یہ پسند نہیں کہ اُس کی کتاب کے علاوہ کوئی دوسری کتاب مکمل صحیح ہو)۔

ملا علی قاری رحمہ اللہ کی حق پرستی

ہمیشہ غلطی کا امکان اُس سے ہوتا ہے جو کوئی کام کرے، اور ٹھوکر اُس کو لگتی ہے جو چلے۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ معتبر عالم دین تھے، اُن کا شمار اُن علماء کرام میں ہوتا ہے جنہوں نے کثیر اور مفید ترین علمی کام کیا ہے، اور کسی کے کثیر کام میں قلیل اغلاط کا پایا جانا اُس کے معتبر ہونے کے منافی نہیں ہوتا، البتہ اگر کوئی شخص اپنی غلطی پر ڈٹ جائے اور رجوع نہ کرے تو وہ غیر معتبر ہوتا ہے لیکن ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ اس عیب سے منزہ تھے۔ چنانچہ بعض مقامات پر اُن کے قلم کو لغزش آئی لیکن جب اُن پر حق واضح کیا گیا یا از خود اُن پر حق واضح ہو گیا تو انہوں نے رجوع فرمالیا۔ مثلاً انہوں نے اپنی سابقہ کتب میں بعض متشدد علماء کے بارے میں اپنے استاذ امام ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ سے اختلاف کیا لیکن جب اُن پر از خود اُن بعض علماء کی شدت واضح ہوئی تو انہوں نے اپنی بعد کی تصنیف "شرح الشفاء" میں اپنے استاد کی موافقت کر لی۔ اسی طرح وہ نبی کریم ﷺ کے والدین کریمین کے بارے میں سخت موقف رکھتے تھے لیکن بعد میں انہوں نے رجوع کر لیا تھا، چنانچہ شارح "النبراس" قاضی محمد برخوردار ملتانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"قول مستحسن" میں اخیر عمر میں علی قاری کی توبہ لکھی ہے"۔

(غوث اعظم وتذکرہ مشائخ قادریہ وسادات اوچ شریف ص ۱۱)

اسی زیر بحث مسئلہ میں ہی آپ نے دیکھ لیا کہ "مرقاۃ شرح مشکاۃ" میں جو لکھا تھا "قصیدہ بردہ" کی شرح میں اُس کے برعکس لکھا ہے اور یہ بھی رجوع کی ایک صورت اور حق پرستی کی عمدہ مثال ہے۔

یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بہت مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص اپنے مرجوح یا غلط قول سے قولاً یا تحریراً رجوع کر لیتا ہے لیکن چونکہ اُس کا قول یا اُس کی تحریر دور دور تک پہنچ چکی ہوتی ہے اس لیے وہ غلطی جوں کی توں چلتی رہتی ہے۔ چنانچہ امام مناوی اور امام احمد رضا حنفی رحمۃ اللہ علیہما لکھتے ہیں:

قال ابن عباس: ويل للعالم من الأتباع يزل زلة فيرجع عنها ويتحملها الناس فيذهبون في الآفاق.

"سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: عالم سے لغزش ہوتی ہے تو وہ اُس سے رجوع کر لیتا ہے اور اُس کی خبر شہروں شہروں پہنچ کر لغزش اُس سے منقول رہ جاتی ہے"۔

(فیض القدیر ج۱ ص ۲۶۵ حدیث ۱۴۷؛ فتاوی رضویہ ج۹ ص ۳۶۶)

یارب العالمین! تیرا یہ فقیر بندہ عالم نہیں لیکن اس کے باوجود لکھنے کی جسارت کر بیٹھا، سو میری تحریر میں جو کچھ حق ہے اُسے قبول فرما اور جو حق کے خلاف ہو اُس کا خلاف حق ہونا مجھ پر از خود عیاں ہو یا تیرا کوئی بندہ مجھے آگاہ کرے، بہر صورت مجھے باطل کو ترک کر کے حق کو قبول کرنے کی توفیق عطا فرما اور اپنے انعام یافتہ بندوں میں شامل فرما۔ آمین!

علم ما فی الصدور اور علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ

سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے شاگرد حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس قرآن کا علم باطن بھی ہے۔ چونکہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا وصال ۳۲ھ میں ہوا تھا اور اُس وقت حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ خلیفہ تھے، اور ابھی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو ظاہری خلافت نہیں سونپی گئی تھی، اس لیے اگر انہوں نے یہ اظہار خیال اپنی زندگی کے آخری ایام میں بھی فرمایا ہو تب بھی اس سے یہ حقیقت ظاہر ہے کہ اُن کے نزدیک قرآن کے باطنی علوم میں جو مقام سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا تھا وہ کسی دوسرے شخص کا نہیں تھا۔ اس سے یہ مراد نہ لیا جائے کہ دوسرے حضرات کے ہاں علم باطن تھا ہی نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اس علم میں دوسروں سے ممتاز تھے۔ یوں سمجھیے جیسا کہ ہمارے ہاں کہا جاتا ہے: اگر علم نحو حاصل کرنا چاہتے ہو تو فلاں مقام پر چلے جاؤ۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ

دوسرے مقام پر یہ علم پڑھایا ہی نہیں جاتا، بلکہ اس سے وہاں کی مہارت و خصوصیت کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ اسی طرح اگرچہ حسبِ استعداد قرآن کا باطنی علم دوسروں کے پاس بھی تھا اور ہے مگر جو مہارت و خصوصیت سیدنا علی علیہ السلام کو حاصل تھی وہ کسی دوسرے امتی کو حاصل نہیں ہوئی۔ اسی لیے ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت سے بھی قبل تصریح فرمائی کہ علی رضی اللہ عنہ کے پاس قرآن کا علمِ ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مبارک سینہ میں یہ باطنی علم کس شان سے تھا؟ اس کو اُن کے درج ذیل ارشاد سے سمجھا جاسکتا ہے، کمیل بن زیاد سے ایک طویل اثر میں ہے کہ انہیں سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

إن ههنا، وأشار بيده إلىٰ صدره، علماً لو حملته.

"بیشک یہاں علم ہے، اگر اسے اٹھانے والے ہوں اور اپنے ہاتھ سے اپنے سینہ مبارک کی طرف اشارہ فرمایا"۔

(حلية الأولياء ج۱ ص۱۲۱، وط: ج۱ ص۸۰؛ جمع الجوامع ج۱۳ ص۱۷٤ حديث ٦٣٣٤، وط: ج۱۷ ص٦۹۷ حديث ۹٦٥؛ كنز العمال ج۱۰ ص۲٦۲، ۲٦۳ حديث ۲۹۳۹۱)

اس سے علم باطن مراد ہے، کیونکہ سینہ ہی تقویٰ کا مرکز ہے۔ چنانچہ متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ایک ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منقول ہے:

ثم يشير بيده إلىٰ صدره ثلاث مرات، قال: ثم يقول: التقوىٰ ههُنا، التقوىٰ هاهنا.

"پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دستِ اقدس سے سینہ مبارک کی طرف تین مرتبہ اشارہ کیا، پھر فرمایا: تقویٰ یہاں ہوتا ہے، تقویٰ یہاں ہوتا ہے"۔

(مسند أحمد ج۳ ص۱۳٤، وط: ج٤ ص۳٤۹، وط: بتحقيق أحمد شاكر ج۱۰ ص ٤۳۷، ٤۳۸ حديث ۱۲۳۲۲، وط: ج۱۳ ص۱٥۹ حديث ۷۷۲۷؛ مسلم ص۱۱۲٤ حديث ٦٥٤۱ (۲٥٦٤)؛ مسند عبد بن حميد ج۲ ص۳٤٤ حديث ۱٤٤۰؛ مسند أبي يعلىٰ ج٥ ص ۳۰۰، ۳۰۱ حديث ۲۹۲۳؛ مجمع الزوائد ج۱ ص٥۲، وط: ج۱ ص۲۱۲ حديث ۱٦۰)

تقویٰ کی بدولت رزق اور فرقان

حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ تقویٰ کا مرکز سینہ ہے اور قرآن کریم فرماتا ہے کہ تقویٰ کی بدولت رزق اور فرقان عطا ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجاً وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ.

''اور جو تقویٰ اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے راہ نکالتا ہے اور اسے وہاں سے رزق دیتا ہے جہاں اس کا گمان بھی نہیں جاتا''۔

(الطلاق: ۳)

یاد رہے کہ رزق کا اطلاق فقط جسمانی ضروریات کی اشیاء پر نہیں ہوتا بلکہ ظاہری اور باطنی ہر نعمت پر رزق کا اطلاق ہوتا ہے، چنانچہ مذکور الصدر آیت میں تقویٰ کی بدولت رزق اور درج ذیل آیت میں فرقان کے ملنے کا ذکر ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا.

''اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرو تو وہ تمہارے لیے فرقان پیدا فرما دے گا''۔

(الأنفال: ۲۹)

فرقان بھی باطنی طور پر رزق ہے، اس لیے کہ اس سے مراد ایسا علم ہے جس کی بدولت حق و باطل کے مابین فرق کرنے کی تمیز حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ میر سید شریف جرجانی لکھتے ہیں:

الفرقان، هو العلم التفصيلي الفارق بين الحق و الباطل.

''فرقان وہ تفصیلی علم ہے جو حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والا ہو''۔

(كتاب التعريفات ص ۱۱۸)

علامہ فیروز آبادی کے نزدیک لفظ فرقان سے مراد علم اور حکمت ہے اور خازن و نابلسی کے نزدیک نور اور ایسی توفیق ہے جس کی بدولت حق و باطل اور دلائل و شبہات کے مابین واضح فرق ہو جائے۔

(بصائر ذوى التمييز ج۲ ص ۱۳۰؛ تفسير الخازن ج۲ ص ۳۰۶؛ الحديقة الندية ج۲ ص ۲۴۵)

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے رزق سے علم لدنی مراد لیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

﴿وَرِزْقٌ كَرِيمٌ﴾وهو العلم اللدني الذي به غذاء الأرواح.

''عزت والی روزی سے مراد علم لدُنی ہے جو کہ روحوں کی غذا ہے''۔

(روح المعاني ج۱۷ ص۴۳۲)

علامہ ابن قیم الجوزیہ حنبلی لفظ "فرقان" کی تشریح ایسے بہترین پیرایہ انداز میں لائے ہیں جس کا تقاضا ہے کہ اُن کی عبارت کا ایک مخصوص حصہ یہاں نقل کیا جائے۔ انہوں نے ایک مقام پر ایک طرف تو علماء و مفتیانِ کرام کو مشورہ دیا ہے کہ وہ عبادتِ الٰہی پر استقامت کے ساتھ ساتھ دعا بھی کیا کریں کہ انہیں حق و صواب القاء کیا جائے، اور دوسری طرف عوام کو تلقین کی ہے کہ وہ اپنے مسائل اطاعت گزار علماء کرام سے دریافت کیا کریں۔ اسی ضمن میں انہوں نے حضرت عمر ﷺ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے تھے:

اقتربوا من أفواه المطيعين واسمعوا منهم ما يقولون، فإنهم تجلى لهم أمور صادقة.

''اطاعت گزاروں کے مونہوں کا قرب حاصل کیا کرو اور جو کچھ وہ فرمائیں اُسے غور سے سنا کرو، بیشک اُن پر سچے معاملات روشن ہوتے ہیں''۔

(إعلام الموقعين ج٤ ص٢٢٩، وط: ج٦ ص١٩٨، ١٩٩)

شاید اسی لیے حضرت عمر ﷺ نے سیدنا علی ﷺ سے درخواست کی تھی کہ وہ جہاد کو خیر باد کہہ کر علمی مسائل کے حل کی طرف توجہ فرمائیں۔ بہر حال علامہ ابن قیم اس ارشاد کی توضیح میں لکھتے ہیں:

وذلک لقرب قلوبهم من الله، وكلما قرب القلب من الله زالت عنه معارضات السوء، وكان نور كشفه للحق أتم وأقوىٰ، وكلما بعد عن الله كثرت عليه المعارضات، وضعف نور كشفه للصواب، فإن العلم نور يقذفه الله في القلب، يفرق به العبد بين الخطاء والصواب.

وقال مالک للشافعي رضي الله عنهما في أول مالقيه: إني أرى الله قد ألقى علىٰ قلبک نوراً فلا تطفئه بظلمة المعصية، وقد قال تعالىٰ: ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا﴾ ومن الفرقان النور الذي يفرق به العبد بين الحق والباطل، وكلما كان قلبه أقرب إلى الله كان فرقانه أتم، وبالله

التوفيق.

''اور یہ اس لیے کہ اُن کے قلوب اللہ تعالیٰ کے قریب ہوتے ہیں، اور جب دل اللہ تعالیٰ کے قریب ہوتو اُس سے کثیف پردے زائل ہو جاتے ہیں، اور اُس کے کشف کا نورِ حق کو پانے کے لیے کامل اور قوی ہو جاتا ہے، اور جب دل اللہ تعالیٰ سے دور ہو جائے تو اُس پر کثیف پردوں کی کثرت ہو جاتی ہے، اور اُس کے کشف کا نورِ حق کو پانے سے کمزور ہو جاتا ہے۔ بلاشبہ علم ایک ایسا نور ہے جسے اللہ تعالیٰ قلب پر القا فرماتا ہے تو بندہ اُس کی بدولت خطا اور صواب میں فرق کر لیتا ہے۔

امام مالک نے امام شافعی رضی اللہ عنہما سے پہلی ملاقات کے موقعہ پر فرمایا تھا: میں مشاہدہ کر رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے قلب پر نور القا فرما رہا ہے، لہٰذا آپ نے معصیت کی تاریکی سے اس کو بجھانا نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرو تو وہ تمہارے لیے فرقان پیدا فرما دے گا﴾ فرقان سے مراد وہ نور ہے جس کی بدولت بندہ حق اور باطل کے مابین فرق کر لیتا ہے، اور جب اُس کا قلب اللہ تعالیٰ سے زیادہ قریب ہوتا ہے تو اُس کا فرقان (نور) کامل ہو جاتا ہے، اور تمام توفیق اللہ سے ہے''۔

(إعلام الموقعين ج٤ ص٢٢٩، وط: ج٦ ص١٩٨، ١٩٩)

سیدنا علی ﷺ کو عطا شدہ رزق و فرقان

پیچھے آپ پڑھ چکے ہیں کہ حکمت کے معانی میں نور اور علم الاسرار بھی آتے ہیں، اور یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں کہ ان کی بدولت ہر کٹھن سے کٹھن مرحلہ آسان ہو جاتا ہے۔ حسبِ ذیل آیت میں غور فرمائیں کہ زندگی کی پرخطر وادی کو عبور کرنے کے لیے اہلِ ایمان وارباب تقویٰ کے لیے اللہ تعالیٰ کیا پیدا فرماتا ہے:

يَآأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ.

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، وہ تمہیں اپنی رحمت کے دو حصے عطا فرمائے گا اور تمہارے لیے نور پیدا کر دے گا جس میں تم چلو گے اور تمہیں بخش

دے گا"۔(الحدید: ۳۸)

آیت میں "نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ" سے ظاہری قدموں کے ساتھ گلی کوچوں اور پگ ڈنڈی پر چلنا مراد نہیں بلکہ شریعت کی پرخار وادی میں اپنے دامنِ عفت وعظمت کو ہر طرح کے دنیوی، دینی اور اُخروی نقصان دہ کانٹوں سے بچا کر زندگی گزارنا مراد ہے۔ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو یہ نور، یہ حکمت اور یہ باطنی علم کتنا عطا تھا؟ یہ سمجھنے کے لیے آپ کو اُن کی خلافت کی پرپیچ، انتہائی کٹھن اور پیچیدہ زندگی کے ایام میں غور کرنا ہوگا اور بالخصوص یہ پہلو سامنے رکھنا ہوگا کہ اُن سے اختلاف کرنے والے تینوں گروہ اہل اسلام تھے۔ پہلی لڑائی میں اسلام کی معزز ترین ہستیاں اُن سے معرکہ آرا ہوئیں، دوسری لڑائی میں نامور لوگ مظلوم کا روپ دھار کر اُن کے خلاف برسرپیکار ہوئے اور تیسری لڑائی میں پوری مخلوق سے زیادہ قرآن پڑھنے، نمازیں پڑھنے اور روزے رکھنے والے شیریں زبان مگر دل ویران لوگ صف آرا ہوئے۔ ان تینوں لڑائیوں کے معاملہ میں بڑے بڑے متقی حضرات یہ فیصلہ کرنے سے عاجز رہے کہ وہ کس کا ساتھ دیں لیکن سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ بلاشبہ قرآن کے باطنی علوم وحکمت اور اپنے دل کی روشنی میں تاویلِ قرآن کی تکمیل کے لیے کوشاں اور رواں دواں رہے اور کبھی بھی شکوک وشبہات کا شکار نہ ہوئے، حتیٰ کہ بعد میں کتاب وسنت کی روشنی میں ثابت ہوگیا کہ تمام مدمقابل صف آراء اور کنارہ کش لوگوں کی فکر کے مقابلہ میں فکرِ مرتضوی صائب تھی۔ ایسا کیوں؟ اس لیے کہ جتنا فرقان، جتنا نور، جتنی حکمت اور جس قدر قرآن کا باطنی علم ذاتِ مرتضیٰ کو حاصل تھا اور وہ اس کی بدولت یقین کے جس درجہ پر وہ فائز تھے دوسرا کوئی شخص نہیں تھا۔ یہاں میں اپنے قارئین کو مرتضوی یقین محکم کی عظمت کو سمجھنے کے لیے ایک حدیث میں غور کرنے کی زحمت دوں گا۔

"حضرت بسر بن سعید حضرت عبید اللہ بن رافع رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب حروریہ نے سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کی تو انہوں نے نعرہ لگایا: "لا حكم إلا لله" (اللہ کے سوا کوئی حاکم نہیں) سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "كلمة حق أريد بها الباطل" (کلمہ حق ہے، اس سے باطل کا ارادہ کیا گیا ہے) بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان لوگوں کی علامات بیان فرمائی تھیں، میں ان علامات کو ان لوگوں میں پہچانتا ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی زبانوں سے حق بات کہتے ہیں اور وہ بات یہاں سے تجاوز نہیں کرتی۔ یہ فرماتے ہوئے اُنہوں نے حلق کی طرف اشارہ کیا۔ یہ لوگ خدا کی مخلوق میں خدا کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض ہیں۔ ان میں ایک سیاہ رنگ کا شخص ہوگا جس کا ایک ہاتھ بکری کی شرم گاہ یا عورت کے پستان کی طرح

ہوگا۔ پھر جب سیدنا علی ﷜ نے انہیں قتل کیا تو فرمایا تلاش کرو، لوگوں نے تلاش کیا تو نہ پایا۔ اُنہوں نے فرمایا: لوٹ جاؤ پھر تلاش کرو، انہوں نے تلاش کیا تو نہ پایا۔ فرمایا: لوٹ جاؤ (پھر تلاش کرو) خدا کی قسم میں نے نہ کذب بیانی کی ہے اور نہ ہی میری تکذیب ہو سکتی ہے، یہ جملہ سیدنا علی ﷜ نے دو یا تین مرتبہ فرمایا: پھر لوگوں نے اُس شخص کو ایک ویرانے میں پالیا تو لاکر سیدنا علی ﷜ کے سامنے ڈال دیا۔ عبیداللہ بن ابی رافع کہتے ہیں: میں اس ساری کارروائی میں موجود تھا اور اُن کے بارے میں مَیں نے سیدنا علی ﷜ کے ارشاد کو حق پایا"۔

(خصائص علي للنسائي ص١٤٣ حديث ١٧٢ وط: ص ١٨٤ حديث ١٧٧؛ السنن الكبرىٰ للنسائي ج٧ ص ٤٧٢ حديث ٨٥٠٩، وط: ج٥ ص ١٦٠ حديث ٨٥٦٢؛ صحيح مسلم ص ٤٣٤ حديث ٦٤٦٨؛ السنة لابن أبي عاصم ص٤٣٨ حديث ٩٦٥؛ السنن الكبرىٰ للبيهقي ج٨ ص ١٧١، وط: ج٨ ص ٢٩٦، حديث ١٦٧٠١)

ذرا غور فرمایئے! سیدنا علی المرتضیٰ ﷜ نے قبل از جنگ اُس شخص کی تحقیق نہیں کرائی تھی بلکہ ہر قسم کی ظاہری تحقیق کے بغیر محض اپنے نورِ قلب اور قرآن کے باطنی علوم کی بدولت پہلے اُن لوگوں کو کیفرِ کردار تک پہنچایا پھر ایک مخصوص علامت والے شخص کی تلاش شروع کرائی۔ لوگوں نے اس کی نعش کو تین مرتبہ تلاش کرنے کے باوجود نہ پایا اور ہر مرتبہ واپس آکر عرض کیا: وہ نہیں ملا، مگر مرتضوی یقین محکم ذرہ برابر بھی متزلزل نہ ہوا، اور اُنہوں نے قسم کھا کر فرمایا: میں جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ بالکل حق فرما گئے تھے ابن مسعود ﷜ کہ سیدنا علی المرتضیٰ ﷣ کے پاس قرآن کا علم ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔

قولِ ابن مسعود اور مرتضوی علمِ باطنی

سیدنا ابن مسعود ﷜ کے اس ارشاد سے مشہور ترین دو حدیثوں "أنا مدينة العلم وعليٌ بابها، اور" أنا دار الحكمة وعليٌ بابها" کی بھی تائید ہوتی ہے، بلاشبہ علم باطن میں جو مقام سیدنا علی ﷜ کو حاصل تھا وہ اُن کی خصوصیت ہے۔ چنانچہ امام الاولیاء والاصفیاء سیدنا جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

رضوان الله على أمير المؤمنين علي، لولا أنه اشتغل بالحروب لأفَادَنَا من علمنا هذا معاني كثيرة، ذاك امرؤ أُعطي علم اللدني .

''امیر المومنین سیدنا علی المرتضیٰ پر اللہ تعالیٰ کی رضا ہو، اگر وہ جنگوں میں مشغول نہ ہوتے تو ہمیں ہمارے اِس علم میں معانی کثیرہ سے فیض یاب فرماتے، وہ ایک ایسے مرد تھے جنہیں علم لدنی عطا کیا گیا تھا''۔

(رسائل الجنيد ص ٢٦٢؛ اللمع ص ١٢٤؛ القول المستحسن ص ٢٤٠)

مشہور صوفی حضرت الشیخ ابو النصر عبد اللہ بن علی السراج الطوسی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۳۷۸ھ لکھتے ہیں:

وَلأميرِ المؤمنين علي ﷺ خصوصيةٌ من بينِ جميعِ أصحابِ رسولِ اللهِ ﷺ بمعاني جليلة، وإشارات لطيفة وألفاظ مفردة، وعبارة وبيان للتوحيد والمعرفة والإيمان والعلم وغير ذلك.

''امیر المومنین علی ﷺ کو رسول اللہ ﷺ کے جمیع صحابہ کرام ﷺ میں سے واضح معانی، لطیف اشارات، نادر الفاظ و عبارات، توحید و معرفت اور ایمان و علم وغیرہ کے بیان میں خصوصیت حاصل تھی''۔

(اللمع في تاريخ التصوف ص ١٢٤)

راقم الحروف نے جواد پر عرض کیا کہ حضرت ابن مسعود ﷺ کے اس ارشاد سے مشہور ترین دو حدیثوں ''انا مدينة العلم وعليٌّ بابها، اور ''أنا دار الحكمة وعليٌّ بابها'' کی تائید ہوتی ہے، اسی کو علامہ مختار بن احمد قال التجانی الشنقیطی نے یوں لکھا ہے:

وقد أشار رسول الله ﷺ إلى علم الباطن بقوله ''أنا دار الحكمةِ وعليٌّ بابها'' كما أشار الى علم الظاهر بقوله ''أنا مدينة العلم وعليٌّ بابها.

''بیشک رسول اللہ ﷺ نے علم باطن کی طرف اپنے اِس ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے:
''میں حکمت کا گھر ہوں اور علی ﷺ اس کا دروازہ ہیں'' جیسا کہ آپ نے علم ظاہر کی طرف اس ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے ''میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے''۔

(رسالة البيان والتبيان في أن الصوفية مذهبها السنة والقرآن ص ٧٣)

قولِ ابن مسعود اور مرتضوی خلافتِ باطنی

سیدنا ابن مسعود ﷺ کے اس ارشاد سے جہاں مشہور ترین دو حدیثوں "أنا مدينة العلم وعليٌّ بابها" اور "أنا دار الحكمة وعليٌّ بابها" کی تائید ہوتی ہے وہیں سیدنا علی ﷺ کی ولایتِ باطنی بھی ثابت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ قرآن کریم کے باطنی علوم کا مرکز سینہ ہے اور سینے کا علم سینہ بہ سینہ چلتا ہے اور اسی کو معرفت، ولایتِ باطنی یا عشقِ حقیقی کہا جاتا ہے۔ اس حقیقت کو بعض شعراء نے کیا ہی خوبصورت انداز میں سمجھایا ہے ۔

جو آگ کی خاصیت وہی عشق کی خاصیت

اک خانہ بخانہ ہے، اک سینہ بسینہ ہے

اور اب تک یہ ولایتِ باطنی مرتضوی سینہ مبارک سے سینہ بسینہ چل رہی ہے، کوئی صحیح اور سچا مسلمان ایسا نہیں جو اس سلسلے میں سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ سے بے نیاز ہو اور وہ اُس کے ماوٰی، ملجا اور مولیٰ نہ ہوں اور جو شخص اس بات کا منکر ہو تو اس کا کوئی مولیٰ نہیں۔ عام مسلمان تو کیا بلکہ تمام روحانی سلاسل کے ماوٰی وملجا بھی سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ ہی کی ذات پاک ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور حضرت علی بن عثمان ہجویری رحمۃ اللہ علیہما لکھتے ہیں:

> دریاب تصوف بحرے بود بغایت وسیع، اما اشتغال او در ایام خلافت بحروب اوراﷺ از تفصیل آں باز داشت. قال الجنيد رحمه الله: شيخنا في الأصول و البناء علي المرتضى ﷺ.
>
> "تصوف میں وہ ایک انتہائی وسیع سمندر تھے لیکن انہیں اُن کے ایامِ خلافت میں لڑائیوں نے اس کی تفصیل سے مشغول رکھا۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اصول وبناء (روحانیت کی بنیاد) میں ہمارے شیخ علی المرتضیٰ ﷺ ہیں"۔

(إزالة الخفاء ج٤ص٥٠٢؛ كشف المحجوب فارسي ص٧٢، وط: ص٨٧؛ القول المستحن لمحمد بن قاسم التركماني ٢٤٠)

مسلمان کے باطن کو سنوارنے میں تصوّف کو زیادہ دخل ہے اور "من كنت مولاه فعلي مولاه" کے ارشاد سے یہ ولایت سیدنا علی مرتضیٰ ﷺ کے سپرد فرمائی گئی۔ اس سلسلے میں امام محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے بہترین

لکھا ہے، وہ فرماتے ہیں:

ولما امتنع حمل الولاية على الولاية الظاهرة تعين حملها على الولاية الباطنة، إذ لا ثالث البتة.

''اور جب ولایت کو ولایت کے ظاہری معنی پر محمول کرنا ممنوع ہے تو وہ ولایت باطنی پر محمول ہوگی، کیونکہ تیسرا معنی نہیں ہوسکتا''۔

(القول المستحسن ۳۲۸)

علی مرتضیٰ [ﷺ] ولایتِ باطنی کا ماویٰ وملجا

چونکہ سید المرسلین ﷺ نے سیدنا علی مرتضیٰ ﷺ کے ہی حق میں فرمایا کہ وہ ہر مسلمان کے مولیٰ ہیں اس لیے ہر مسلمان کو حسبِ استعداد ولایتِ باطنی اُن ہی سے پہنچتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اولیاء کرام کے تمام سلاسل اُن ہی سے فیض یافتہ ہیں۔ چنانچہ اہل حدیث عالم نواب صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی لکھتے ہیں:

قلت: وأكثر الناس حباً له وكرامة له،أهل السنة عموماً، وأعظمهم انتساباً إليه وتعلقاً به الصوفية الصافية الكرام البررة،فإن سلاسلهم جميعاً، إلا ماشاء الله تعالىٰ، تنتهي إليه ﷺ.

''میں کہتا ہوں: اہل سنت کے عوام سیدنا علی ﷺ کی محبت اور عظمت میں تمام لوگوں سے زیادہ محبت کرنے والے ہیں، اور مقرب نیکوکار اور خالص صوفیہ اُن کے ساتھ نسبت اور تعلق میں سب سے بڑھ کر ہیں، پس سب کے سب سلاسل کی انتہا اُن ہی کی طرف ہوتی ہے، الا ماشاء اللہ''۔

(الدين الخالص للقنوجي ج۳ص ۳۰۵)

نواب صدیق حسن خان کی عبارت میں ''الا ماشاء اللہ'' کے الفاظ میں جو استثناء ہے وہ درست نہیں، کیونکہ امام مناوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

قال الحرالي: سلسلة أهل الطريق تنتهي من كل وجه من جهة المشايخ والمريدين إلى أهل البيت فجهات طرق المشايخ ترجع عامتها إلى تاج

العارفين أبي القاسم الجنيد، وبداية أبي القاسم أخذها من خاله السري، والسري التم بمعروف، وكان معروف مولى علي بن موسى الرضى وعن آبائه فرجع الكل إلى علي، أُولٰئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ.

"امام حرالی (علی بن احمد بن حسن تجیبی متوفی ۶۳۷ھ) فرماتے ہیں: اہلِ طریقت کے سلسلے کی انتہا مشائخ و مریدین کی ہر جہت سے اہل بیت پر ہوتی ہے۔ پس اکثر مشائخ کی جہتوں کے سلسلے تاج العرفاء ابو القاسم جنید بغدادی رحمہ اللہ کی طرف لوٹتے ہیں، اور ابو القاسم کا آغاز اُن کے ماموں شیخ سری رحمہ اللہ سے ہوا، اور سری رحمہ اللہ نے معروف بن فیروز کرخی رحمۃ اللہ علیہ کی پیروی کی، اور حضرت معروف جو کہ سیدنا علی بن موسیٰ رضا کے غلام ہیں نے اُن سے اور اُن کے آباء کرام علیہم السلام سے فیض لیا، پس یہ سب سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کی طرف لوٹتے ہیں اور یہی "حِزْبُ اللّٰہ" جماعتِ الٰہی ہے"۔

(فیض القدیر ج۳ ص۴۵۹، وط: ج۶ ص۳۰۹۹ حدیث ۳۹۶۷)

محدث کبیر سید احمد بن محمد بن صدیق الغماری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔

(البرهان الجلي في تحقيق انتساب الصوفية إلىٰ علي ص ٦٥)

کنیتِ ابوتراب میں ایک باطنی رمز

بعض اہل اللہ نے اسی حقیقت کو سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کی مشہور اور پیاری کنیت "أبو تراب" سے بھی مستنبط کیا ہے۔ حضرت خواجہ باقی باللہ نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کنیت پر فارسی زبان میں ایک نظم تحریر فرمائی تھی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے "شرح سفر السعادۃ" میں وہ نظم بھی نقل فرمائی ہے اور اُس کی تسہیل بھی فرمائی ہے، یہاں ہم بغرضِ اختصار اُس تسہیل کو نقل کر رہے ہیں، شیخ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

بعض اہل تحقیق از اربابِ تصوف را دریں اسم اشارتہائے دقیق ومعاني بليغ ست، كه دلالت بركمال رتبه ونهايت فضيلت او دارد، تراب را اشارت بوجود اہل توحيد وفنا دارند، پس حاصل معنیٰ ابوتراب آن شود كه وے ﷺ اصل ومقتدا وامام ومرجع طائفه فقراء وارباب فنا واہل

کمال است، چنانچه منتهائے سلاسل مشائخ طریقت بذات شریف اوست۔

"اہل تصوف میں سے بعض ارباب تحقیق نے اس کنیت کی روشنی میں دقیق اشارے اور بلیغ معانی بیان کیے ہیں، کہا ہے کہ یہ کنیت سیدنا علی ؓ کے رتبہ کے کمال اور اُن کی انتہائی فضیلت پر دلالت کرتی ہے، ارباب تصوف تراب (مٹی) کو اہل توحید وفنا کے وجود سے تعبیر کرتے ہیں، لہٰذا ابوتراب کا لب لباب یہ ہوا کہ سیدنا علی المرتضیٰ ؓ طبقۂ فقراء، ارباب فنا اور اہل کمال کی اصل، اُن کے پیشوا اور امام ہیں، یہی وجہ ہے کہ مشائخ طریقت کے سلاسل کی انتہا اُن ہی کی ذات شریفہ پر ہوتی ہے"۔

(شرح سفر السعادت فارسي ص ۳۸۸؛ تذکرۂ مشائخ قادریہ وسادات اُوچ شریف للملا برخوردار ملتاني ص ۷۲)

مشہور محدث سید احمد غماری نے بھی حضرت خواجہ باقی باللہ نقشبندی رحمۃ اللہ علیہما کی کتاب "المثنوی" کے حوالے سے اسی طرح لکھا ہے۔

(البرهان الجلي في تحقيق انتساب الصوفية إلىٰ علي ص ۶۹)

اہل بیت سے غیر وابستہ فیضیاب کیونکر؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص بظاہر اہل بیت سے وابستہ نہ ہو، گو منکر بھی نہ ہو تو اسے یہ فیض کیسے ملتا ہے؟ اس کا جواب شاہ عبد العزیز رحمہ اللہ کی درج ذیل عبارت میں موجود ہے، وہ لکھتے ہیں:

ومعنیٰ قطبیت باطنہ آنست کہ حق تعالیٰ بعضے بندگان خود را مخصوص سازد کہ مہبط فیض الٰہی اولاً بالذات ایشاں باشند، واز ایشاں بدیگراں منتقل شود، گو بظاہر کسے تلمذ واکتساب از ایشاں نہ کردہ باشد، مانند آنکہ شعاع آفتاب ازراہ روزنے درخانہ بیفتد، پس اولاً آں روزن روشن شدہ وبواسطہ آں تمام اشیائے خانہ روشن شود، ایں را قطب ارشاد نیز نامند۔

"قطبیت باطنہ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو مخصوص فرما دیتا ہے کہ فیض الٰہی اوّلاً اور بالذات اُس پر نازل ہوتا ہے، پھر اُس سے دوسروں کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اگرچہ بہ ظاہر کوئی ان سے کسب فیض نہ کرے، جیسے سورج کی شعاعیں روشن دان کے ذریعے کسی گھر میں پہنچیں تو اولاً وہ روشندان روشن ہوگا اور اس کے واسطہ سے گھر کی تمام چیزیں روشن ہوں گی، اس کو قطب ارشاد بھی کہتے ہیں"۔

(فتاوی عزیزي فارسي ص۱۲۹)

بعض متشددین کی تردید میں یہ بات علامہ عبدالحکیم شرف قادری نے بھی بیان کی ہے۔

(البریلویۃ کاتحقیقی وتنقیدی جائزہ ص۱۵۱)

اگر یہاں سیدنا فاروق اعظم ﷛ کا وہ قول سامنے رکھا جائے جو انہوں نے سیدنا علی ﷵ کو کہا تھا "اللہ تعالیٰ نے تمہارے ذریعے ہمیں ہدایت دی اور تاریکیوں سے نور کی طرف نکالا" تو یہ حقیقت مزید واضح ہو جائے گی۔

اہل بیت میں قطبیت کا قول یہودیت کیوں؟

خلافتِ باطنی اور ولایتِ باطنی کو قطبیت سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، اور علماء وصوفیہ کرام نے لکھا ہے کہ اس نعمت کے امین سیدنا علی المرتضی اور اُن کی اولادِ مقدسہ ﷡ ہے، انہوں نے فرمایا ہے کہ اسی لیے سیدنا امام حسن مجتبیٰ ﷵ نے فقط چھ ماہ خلافت سنبھالی، کیونکہ اس کے بعد کاٹنے والی ملوکیت کا دور شروع ہونے والا تھا۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ ہمارے بعض معاصرین نے نہ صرف یہ کہ اس بات سے اختلاف کیا (جو کہ ہر ایک کا حق ہوتا ہے) بلکہ وہ غصہ میں اس قدر آگے نکل گئے کہ اس بات کو رافضیت اور یہودیت قرار دینے سے بھی باز نہ رہ سکے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"سادساً ولایت میں افضلیت اور یکتائی کو اولادِ امجاد میں قطبیت کے اجراء کا سبب قرار دینا بھی عجیب رافضیانہ بلکہ یہودیانہ حرکت ہے۔ ہم نے اسے رافضیانہ حرکت کیوں کہا اور یہودیانہ حرکت کیوں کہا؟ خرد ومطالعہ باید"۔

(ضربِ حیدری ص۱۸۷)

عجب چال بازی ہے کہ جب ہمارے معاصر کو کوئی نقلی دلیل نہیں مل سکی تو انہوں نے الٹا دوسروں کو

مطالعہ تصور کرتے ہوئے ''خرد و مطالعہ باید'' کے الفاظ سے رعب ڈالنے کی ناکام کوشش کر ڈالی۔ خدا جانے وہ کیسی عقل اور کیسے مطالعہ کی بات کر رہے ہیں؟ بہر حال اُن کا جو بھی عقلی معیار ہوگا وہ اپنی جگہ لیکن ہم اپنے قارئین کرام کے سامنے چند اکابرین کی عبارات پیش کر رہے ہیں تاکہ وہ خود ہی فیصلہ فرماسکیں کہ وہ حضرات اربابِ عقل و مطالعہ تھے یا نہیں؟

اہل بیت میں ولایت وقطبیت پر علماء کا کلام

ہمارے معاصر کو یہ حقیقت سمجھ آئے یا نہ آئے اور انہیں ہضم ہو یا نہ ہو لیکن علماء کرام نے اپنے اپنے انداز میں اس حقیقت کو بیان بھی کیا ہے اور اس کی حکمت بھی واضح فرمائی ہے۔ آیئے ہم آپ کی خدمت میں علماء کرام کی تصریحات پیش کرتے ہیں۔

امام سمہودی اور شیخ ابو بکر الحضرمی کا کلام

امام سمہودی اور شیخ ابو بکر الحضرمی رحمۃ اللہ علیہما لکھتے ہیں:

وقد أعطى إبراهيم صلوات الله عليه أنبياء من أهل بيته صلوات الله عليهم وأكرم نبينا صلى الله عليه وآله وسلم بكونه خاتم النبيين اقتضى انتفاء ذلك،فعوّض صلى الله عليه وآله وسلم عن ذلك كمال طهارة أهل بيته، فنال منهم درجة الوراثة والولاية خلق لا يحصون .

بل ذهب بعضهم إلى أنه لما لم يتم للحسن رضي الله عنه أمر الخلافة، لأنها صارت ملكاً،وقد قال صلى الله عليه وآله وسلم:إنّا أهل البيت اختار الله لنا الآخرة على الدنيا،عُوضوا من ذلك التصرف الباطن فصار قطب الأولياء في كل زمان من أهل البيت النبوي.

''سیدنا ابراہیم صلوٰت اللہ علیہ کو اُن کے اہل بیت میں انبیاء کرام علیہم السلام عطا کیے گئے تھے اور ہمارے نبی کریم ﷺ کو خاتم الانبیاء کے اعزاز سے نوازا گیا، جس سے سلسلۂ نبوت منقطع ہو گیا تو حضور اکرم ﷺ کو اس کے عوض جو چیز دی گئی وہ آپ کے اہل بیت کرام علیہم السلام کی کمال طہارت ہے، اس طہارت کی بدولت اہل بیت میں سے ایک خلقت

مرتبہ وراثت وولایت پر فائز ہوئی۔......

بلکہ بعض علماء حق اس طرف گئے ہیں کہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ ﷺ کی خلافت کا معاملہ اس لیے آگے نہ چلا کہ آگے ملوکیت کا دور شروع ہو گیا تھا، اور نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ہم اہلِ بیت کے لیے اللہ تعالیٰ نے دنیا کے بدلے میں آخرت کو پسند فرمایا ہے، پس اہلِ بیت کو اس کے بدلے میں تصرّف باطنی عطا فرمایا گیا، سو ہر زمانے میں قطب الاولیاء اہلِ بیتِ نبوت سے ہوتا ہے"۔

(جواهر العقدين ص ٢٠٥، ٢٠٦؛ رشفة الصادي ص ١٢٨)

ابن حجر مکی، محمد بن قاسم اور شیخ صبان کا کلام

امام سمہودی کی عبارت کا دوسرا پیراگراف ردِّ روافض میں مشہور مصنف علامہ ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی نقل کیا ہے۔

(الصواعق المحرقة ص ١٤٥)

علامہ ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ایک اور کتاب میں بھی اسی طرح لکھا ہے، نیز علامہ محمد بن قاسم اور شیخ محمد بن علی الصبان رحمۃ اللہ علیہما نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔

(المنح المكية لابن حجر مكي ص ٥٣٤، ٥٣٩؛ القول المستحسن في فخر الحسن ص ٣٣٣، ٣٣٤؛ إسعاف الراغبين بهامش نور الأبصار ص ١٩٢)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا کلام

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

خلافت نامہ خاتم نبوت چوں بمہر خاتم ولایت رسید تمام شد ودورِ خلافت باختتام کشید، بعد ازاں چنداں شعب وشجرات وفروع وثمرات از خاتم ولایت کہ شجرۂ علم وہدایت بوی منتہی میشود برآمدند کہ بر مثال شجرۂ طوبیٰ ہر طرف ظلال کمال انداختند وعالم را بنورِ جمالِ ولایت منور ساختند، خصوصاً اولاد امجاد واحفاد عالی نژاد آنحضرت کہ بحکم وراثتِ حقیقی ومناسبتِ ذاتی از ہمہ نصیبے وافر وفیضے کامل

تربرداشتندوبحکم عصمتِ ذاتی لوائے ولایتِ معنوي برافراشته، ریاستِ صورت رابدیگراں گذاشتند، وہرگزنورِولایت ازخاندانِ نبوت انقطاع نه پذیرد، وفلك ولایت جز بایں اقطاب قرارنگیرد، وازمیان ایشاں ہرکراخواست قطب اقطاب عالم وغوث بنی آدم ومرجع ثقلین ومشہورِمغربین ساخت تامحي الدین ومجددشرعِ متین گردید، اگرچه جمالِ محمد در تمام آلِ محمدتابان ست لیکن درینجا جمالِ دیگرست وکمال دیگر ست، جمال جمالِ محمدست وکمال کمالِ محمدست.

''جب خاتم نبوت کی خلافت حضرت علی کی ذات گرامی تک پہنچی تو اس شجرِ علم وولایت سے درختِ طوبیٰ کی مانند بے شمار شاخیں پھوٹیں، جن کے کمالات ہر جانب سایہ فگن ہوئے اور ساری دنیا حضرت علی کے نورِ جمالِ ولایت سے روشن ہوگئی، بالخصوص رسول اللہ ﷺ کی اولادِ عالی نژاد نے بحکم وراثتِ حقیقی اور مناسبتِ ذاتی ولایت کا پورا پورا حصہ اور فیض حاصل کیا اور اپنی عصمتِ ذاتی (تطہیر) کی بنا پر ولایتِ معنوی کا علَم بلند کرتے ہوئے ظاہری حکومت دوسروں کے لیے چھوڑ دی۔ خاندانِ نبوت سے نورِ ولایت نہ تو کبھی منقطع ہوا، نہ ہوگا، اور آسمانِ ولایت نے بغیر اِن اقطاب کے کبھی قرار نہیں پکڑا۔ اِن ہی میں سے اللہ تعالیٰ نے جسے چاہا قطب الاقطابِ عالَم، غوثِ بنی آدم اور مرجعِ جن وانس بنا کر مشرق ومغرب میں مشہور ومعروف کر دیا اور حضرت سید عبدالقادر جیلانی ؓ کو دینِ اسلام کا دوبارہ زندہ کرنے والا بنایا۔ اگرچہ جمالِ محمدی ﷺ تمام آل میں تاباں ودرخشاں ہے مگر محی الدین سید عبدالقادر جیلانی ؓ میں اس کا کچھ اور ہی رنگ ہے، جو حقیقتاً جمالِ احمدی اور کمالِ محمدی ﷺ کا مظہرِ اتم ہے''۔

(أخبار الأخیار [بحذف اشعار] ص ۵؛ ترجمه از: مہرِ منیر ص ۲۱)

ملا علی قاری کا کلام

ابن حجر مکی کے شاگرد ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہما نے اسی حقیقت کو اختصار کے ساتھ یوں بیان کیا ہے:

لقد بلغني عن بعض الأكابر أن الإمام الحسن بن سيدنا علي رضي الله

عنهما لما ترك الخلافة لما فيها من الفتنة والآفة، عوّضه الله ﷻ عنه القطب الأكبر وسيدنا الشيخ عبد القادر هو القطب الوسط، المهدي خاتمة الأقطاب.

"مجھے بعض اکابر سے پہنچا ہے کہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ ؓ نے جب فتنہ و آفات کے خیال سے خلافت ترک فرمائی تو اللہ ﷻ نے اُنہیں اس کے بدلے میں قطبیتِ عظمیٰ عطا فرمائی، سیدنا عبد القادر جیلانی ؓ قطب وسطیٰ تھے اور امام مہدی ؑ آخری قطب ہوں گے"۔

(نزهة الخاطر الفاتر قلمي نسخه ص ٦؛ نزهة الخاطر الفاتر مترجم ص ٤١)

امام احمد رضا حنفی کا کلام

یہ عبارت امام احمد رضا حنفی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی نقل کی ہے۔

(فتاوى رضويه ج٢٨ ص٣٩٢)

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایسی گفتگو ایک اور مقام میں بھی کی ہے۔

(مرقاة شرح المشكاة ج٩ ص٣٤٩ حديث ٥٤٥٢)

قاضی محمد برخوردار ملتانی کی عمدہ تطبیق

قاضی برخوردار ملتانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے، چونکہ اردو زبان میں اُن کی کتاب کا عکس حال ہی میں شائع ہو چکا ہے، لہٰذا مکمل تفصیل اُسی میں ملاحظہ فرمائیں، یہاں ہم اُن کی عبارت کا ایک مخصوص اقتباس نقل کر رہے ہیں، لیکن اُس سے پہلے یہ تمہیدی گزارش ضرور پڑھ لیجئے۔

رافضی لوگ درجِ ذیل احادیث:

من كنت مولاه فعلي مولاه

أنت مني بمنزلة هارون من موسیٰ، إلا أنه لا نبي بعدي

علي ولي كل مؤمن بعدي.

سے سیدنا علی المرتضیٰ ؓ کی بلا فصل خلافتِ ظاہری کی دلیل لیتے ہیں اور خلفاء ثلاثہ ؓ کی خلافت کا انکار کرتے ہیں حالانکہ خلفاء ثلاثہ ؓ کی خلافت کی حقانیت پر بھی احادیثِ صحیحہ موجود ہیں۔ دوسری طرف ناصبی اور نام نہاد سنی لوگ سیدنا علی ؑ کی شان میں مذکورہ بالا احادیث کو خلافتِ ظاہری تو کیا خلافتِ باطنی میں بھی تسلیم

نہیں کرتے۔ قاضی برخوردار رحمۃ اللہ علیہ نے ایسی احادیث کے مابین عمدہ تطبیق دی ہے، چنانچہ وہ نام نہاد شیعہ اور روافض کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اب سوال پیدا ہوگا کہ یہ تو سب کچھ ہوا لیکن احادیث صحیح سنیوں کی کتابوں میں موجود ہیں کہ سرورِ عالم ﷺ نے بحق علی مرتضٰی ؓ فرمائیں ''من كنت مولاه فعلي مولاه'' اور یہ حدیث اتنے طرق سے مروی ہے ''كاد أن يكون متواتراً'' (قریب بہ متواتر ہے) ''أنت مني بمنزلة هارون من موسىٰ، إلا أنه لانبي بعدي'' بلکہ بعض حدیثوں میں یہ بھی آیا کہ ''علي ولي كل مؤمن بعدي'' بعض محدثین نے صحیح بھی کہا ہے، ان کا کیا جواب ہے؟ ہم بڑے زور سے اور کھلے منہ کہتے ہیں کہ یہ احادیث صحیحہ ہیں، مولیٰ بمعنی خلیفہ بھی فرض کر لیتے ہیں اور (مانتے ہیں کہ) ''بَعْدِي'' بھی اتصال کے لیے ہے (لیکن) حدیث ''اقتدوا من بعدي أبي بكر وعمر'' (میرے بعد ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی پیروی کرنا) إن لم تجديني فأتي أبابكر'' (اے خاتون! اگر تو مجھے نہ پائے تو ابوبکر ؓ کے پاس آجانا) ''مروا أبابكر يصلي بالناس'' (ابوبکر کو کہو لوگوں کو نماز پڑھائیں) ایک عورت کو کہا: إن جئتِ فلم تجديني فأتي أبابكر فإنه الخليفة من بعدي'' (اگر تم آؤ پھر مجھے نہ پاؤ تو ابوبکر کے پاس آنا بیشک وہ میرے بعد خلیفہ ہے) [فإنه الخليفة من بعدي، ان الفاظ سے کوئی حدیث نہیں ہے، فیضی] اس قسم کی احادیث بکثرت ہیں اور ہیں بھی صحیح، ان میں تطبیق اور توفیق (موافقت) بھی بآسانی ہو سکتی ہے، ہر حدیث کا اپنا محل ہے لیکن انصاف درکار ہے۔ ہم مختصر طور پر اس کا ذکر کر دیتے ہیں، وماتو فيقي إلابالله.

احادیث جو علی مرتضٰی ؓ کے حق میں بیان کی گئیں ان سے مراد ولایت و خلافت باطنہ ہے، جو بلافصل ہے، اور وہ احادیث جو ابوبکر صدیق ؓ کے بارے میں وارد ہوئیں ان سے مراد خلافتِ ظاہرہ ہے، جو بلافصل ہے، فلا تعارض. (لہٰذا کوئی تضاد نہیں ہے)''۔

(تذکرہ مشائخ قادریہ وسادات اوچ شریف ص ۷۰، ۷۱)

علامہ ابن قیم الجوزیہ کا کلام

علامہ ابن قیم الجوزیہ امام مہدی علیہ السلام کے اولادِ حسن مجتبیٰ علیہ السلام میں ہونے کی حکمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وفي كونه من ولد الحسن سرٌّ لطيف، وهو أن الحسن رضي الله تعالیٰ عنه ترک الخلافة لله، فجعل الله من ولده من يقوم بالخلافة الحق، المتضمن للعدل الذي يملأ الأرض، وهذه سنة الله في عباده أنه من ترک لأجله شيئاً أعطاه الله، أو أعطا ذريته أفضل منه.

''اور اُن کے اولادِ حسن سے ہونے میں راز یہ ہے کہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے اللہ کی خاطر خلافت کو ترک کیا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی اولاد سے اُس شخص کو پیدا کر دیا جو ایسی خلافتِ حقہ پر قائم ہوگا جو زمین کو عدل سے بھر دے گی، اور یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں میں طریقہ ہے کہ کوئی شخص اس کی خاطر کوئی چیز ترک کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو یا اُس کی ذریت کو اُس سے افضل سے نوازتا ہے''۔

(المنار المنیف فی الصحیح والضعیف ص ۱۵۱، وط: ص ۱۵۱)

شاہ ولی اللہ اور مولانا گنگوہی کا کلام

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وسر حضرت امیر کرم الله وجهه دراولاد کرام ایشان سریت کرد. چنانکه کسی از اولیاء امت نیست الا بخاندان حضرت مرتضیٰ مرتبط است بوجهی از وجوه.

''حضرت امیر کا راز ولایت اُن کی اولادِ کرام میں سرایت کر گیا۔ چنانچہ اولیاءِ امت میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جو کسی نہ کسی طور پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے خاندانِ امامت سے وابستہ نہ ہو''۔

(التفہیمات الإلٰھیہ ج۱ ص ۱۰۳، ۱۰۴)

ایک اور مقام میں فرماتے ہیں:

''اب امت میں جس کو بھی بارگاہ رسالت سے فیضِ ولایت نصیب ہوتا ہے وہ یا تو

نسبت علی مرتضی ﷺ سے ہوتا ہے یا نسبت غوث اعظم جیلانی ﷺ سے، اس کے بغیر کوئی شخص مرتبۂ ولایت پر فائز نہیں ہوسکتا"۔

(همعات ص٦٢)

مولانا رشید احمد گنگوہی "أنا دار الحكمة وعلي بابها" کے تحت لکھتے ہیں:

أراد بذلك علم الباطن، فإن السلاسل سائرها ومعظمها منتهية إليه.

"اس سے علم باطن مراد ہے، بیشک تمام معتبر سلاسل کی انتہا اُن ہی پر ہوتی ہے"۔

(الكوكب الدري شرح الترمذي ج٤ ص٤١٦، ٤١٧)

شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کا کلام

شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے امامت کی اقسام بیان فرمائی ہیں اور ائمہ اہل بیت کو بالعموم ہر شعبہ میں اور بالخصوص ہدایتِ باطن میں مطلقاً امام فرمایا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

نیز باید دانست که امامت نزد اہل سنت بمعنی پیشوائی در دین نیز اطلاق کنند، وبہمیں معنی امام اعظم وامام شافعیؒ را که درفقه پیشوا بودند، وامام غزالی وامام رازی را که در عقائد وکلام، ونافع وعاصم را که درقراءت امام بودند امام گویند، وائمه اطہار درجمیع این فنون پیشوا بوده اند، خصوصاً در ہدایت باطن وارشاد طریقت که مخصوص با ایشاں بود، بایں جہت ایشانرا اہل سنت علی الاطلاق ائمه دانند۔

"جاننا چاہیئے کہ اہل سنت امامت کو پیشوائے دین کے معنی میں بھی لیتے ہیں، اسی سبب سے امام اعظمؒ اور امام شافعی کو فقہ میں، امام غزالی اور امام رازی کو عقائد اور کلام میں، نافع اور عاصم کو قراءت میں امام کہتے ہیں، اور ائمہ اطہار ان سب فنون میں پیشوا ہوئے ہیں خصوصاً ہدایتِ باطن اور ارشادِ طریقت کہ ان سے مخصوص تھا، اسی سبب سے اہل سنت اُن کو بے قید امام جانتے ہیں"۔

(تحفة اثنا عشر فارسي ١٨٠ ومترجم اردو ص٣٦٠)

شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اس سے زیادہ واضح اور دلچسپ گفتگو سورۃ الحاقۃ کی آیت "وَتَعِيَهَآ أُذُنٌ وَّاعِيَةٌ" [۱۲] اور سورۃ الشمس کی آیت "إِذِ انبَعَثَ أَشْقَاهَا" [۱۲] کے تحت بھی فرمائی ہے، جسے ہم نے بخوف طوالت نقل نہیں کیا، اہل محبت کے لیے یہ دونوں مقام لائق مطالعہ ہیں۔

شیخ احمد سرہندی کا کلام

مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ قطبیت میں مولیٰ علیؑ کی امامت پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اور ایک راہ وہ ہے جو قربِ ولایت سے تعلق رکھتی ہے: اقطاب، اوتاد، ابدال، نجباء اور عام اولیاء اللہ اسی راہ سے واصل ہیں، اور سلوک اسی راہ سے عبارت ہے، بلکہ متعارف جذبہ بھی اسی میں داخل ہے، اور اس راہ میں توسط ثابت ہے اور اس راہ کے واصلین کے پیشوا، اُن کے سردار اور منبعِ فیض حضرت علی المرتضیٰؑ ہیں، کیونکہ یہ عظیم الشان منصب اُن سے تعلق رکھتا ہے۔ اس راہ میں گویا رسول اللہ ﷺ کے دونوں قدم مبارک حضرت علیؑ کے مبارک سر پر ہیں، اور حضرت فاطمہ اور حضرات حسنین کریمینؑ اِس مقام میں اُن کے ساتھ شریک ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ حضرت امیرؑ اپنی جسدی پیدائش سے پہلے بھی اس مقام کے ملجا و ماویٰ تھے، جیسا کہ وہ جسدی پیدائش کے بعد ہیں، اور جسے بھی فیض وہدایت اس راہ سے پہنچی انہیں کے ذریعے پہنچی، کیونکہ وہ اس راہ کے آخری نقطہ کے نزدیک ہیں اور اس مقام کا مرکز ان سے تعلق رکھتا ہے، اور جب حضرت امیرؑ کا دور ختم ہوا تو یہ عظیم القدر منصب بالترتیب حضرات حسنین کریمینؑ کو سپرد ہوا، اور ان کے بعد یہ منصب ائمہ اثنا عشرۃ میں سے ہر ایک کو ترتیب وار اور تفصیل سے سپرد ہوا، اور ان بزرگوں کے زمانہ میں اور اِسی طرح ان کے انتقال کے بعد جس کسی کو بھی فیض وہدایت پہنچی ہے، اگر چہ وہ اقطاب و نجباءِ وقت ہی کیوں نہ ہوں، سب کے ملجاؤ ماویٰ یہی بزرگ ہیں کیونکہ اطراف کو اپنے مرکز کے ساتھ الحاق کیے بغیر چارہ نہیں ہے"۔

(مکتوبات ج۳ ص ۲۵۲ مکتوب نمبر ۱۲۳؛ مہر منیر ص ۲۱)

شیخ عبدالحی الکتانی کا کلام

محمد عبدالحی الکتانی رحمہ اللہ نے "أنا مدينة العلم" کے تحت ظاہری علمِ مرتضوی کے بعد باطنی علم وولایت

کی طرف متوجہ ہوئے تو خوب لکھا، ہم اُن کے مفصل کلام کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"اور تمہیں اتنی دلیل کافی ہے کہ قوم کے تمام علوم کے طریقے اور اُن کے سلسلے اُن ہی تک پہنچتے ہیں، اسلام میں تم ایسا کوئی طریقہ نہیں پاؤ گے جس کی انتہا اُن تک نہ ہوتی ہو، اور جس کی آخری کڑی اُن سے نہ ملتی ہو، یہ اس لیے کہ وہی باب مدینۃ العلم ہیں۔ شیخ مصطفیٰ البکری اپنی کتاب "تشييد المكانة لمن حفظ الأمانة" میں لکھتے ہیں: جب سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے لیے معاملہ مستحکم ہوا تو انہوں نے اپنے علمی حقائق پھیلائے اور اسرار کے دقائق کھولے، اور اُن سے اُن کے فرزندان امام حسن اور امام حسین علیہما السلام اور کمیل بن زیاد اور امام حسن بصری رحمہ اللہ نے طریقۂ ذکر اور تلقین اخذ کیا، اور اُن ہی سے تمام سلاسل کی شاخیں پھیلیں، حتیٰ کہ نقشبندیہ کی بھی۔ نقشبندیہ کے دو سلسلے ہیں: ایک حضرت سلمان سے ہے اور دوسرا سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے تقدیر کے اسرار میں علم جفر پر بھی کلام فرمایا ہے لیکن انتہائی اصطلاحی رموز کے ساتھ، پس قلوبِ عرفاء کے لیے اس علم کے باب بھی وہی ہیں حتیٰ کہ صوفیہ اس میدان میں اسی باب سے داخل ہوئے اور اُن پر وہ اسرار ظاہر ہوئے جو ظاہر ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے علماء پر کشف کے سربستہ راز کو مُحقق فرمایا لیکن انہوں نے اپنی اولاد کو اُن اسرار کے چھپانے کی تلقین فرمائی تا کہ اسرار اہل انکار سے محفوظ رہیں۔ حضرت کُمیل بن زیاد رضی اللہ عنہ نے جب اُن سے حقیقت کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے جواب عطا فرمایا، اس پر انہوں نے عرض کیا: میں اس سے زیادہ وضاحت چاہتا ہوں تو پھر بتلایا، انہوں نے مزید طلب کیا تو مزید بتلایا، پھر فرمایا: فجر طلوع ہو گئی، لہٰذا چراغ بجھا دو، یعنی جو تم نے پوچھا وہ فجر کی طرح روشن ہو گیا، لہٰذا سوال کا چراغ گُل کر دو، تم پر معاملہ واضح ہو گیا اور حقیقت کھل گئی۔

"الدر الثمين" پر قاضی ابن الحاج کے حواشی میں سابقہ گفتگو کے بعد مذکور ہے کہ: علم تصوف کے واضع سیدنا علی کرم اللہ وجھہ ہیں، اور بعض مشائخ نے کہا ہے: انہیں علم لدنی عطا کیا گیا اور ولایت و معارفِ الٰہیہ کی طرف کوئی نسبت اُن کی جہت و حقیقت کے بغیر درست نہیں، پس وہی تمام کے تمام محمدی اولیاء کے امام ہیں، اور ان سب اولیاء کی اصل اور منشاءِ انتساب بارگاہ محمدیہ اور مظہرِ ولایت احمدیہ ہے، اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ دنیا میں تمام عرفاء سے بلند تر ہیں، کیونکہ

نبی کریم ﷺ نے انہیں اپنے اس ارشاد سے مخصوص فرمایا ہے: أنا دارُ الحكمةِ وعليٌّ بابُها" (میں حکمت کا گھر ہوں اور علی اُس کا باب ہیں)، اور اسی طرح انہوں نے اپنی کتاب "الأزهار الطيبة النشر" میں کلام فرمایا ہے، اور اُس میں یہ اضافہ کیا ہے کہ اُن سے حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے اخذ فیض کیا۔ قاضی ابن الحاج نے فرمایا:

اگر تم کہو کہ اس وقت صوفیہ کرام کے چالیس سلاسل کا مرجع حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ ہیں جیسا کہ شیخ حسن عجمی کی "الرحلة العياشية" میں مذکور ہے، اور اُن سب کی انتہا تو سیدنا حسن بصری رضی اللہ عنہ پر ہوتی ہے؟ تو میں اس کے جواب میں کہوں گا کہ سیدنا حسن بصری رضی اللہ عنہ نے سیدنا علی المرتضی علیہ السلام کا دیدار کیا ہے جیسا کہ امام سیوطی اور دوسرے علماء کرام نے اس کی صحت بیان فرمائی ہے، لہٰذا ایسی صورت میں اُنہیں صوفیہ کی طرز پر اُن سے فیض حاصل کرنے میں کوئی مانع نہیں، کیونکہ شیخ سے علم اور تلقین کے حصول میں صوفیہ کے طریقہ میں زبان شرط نہیں بلکہ یہ فیض قلبی توجہ اور کیفیت سے بھی مرید کی ہدایت کا سبب ہو جاتا ہے اور اُس کے قلب میں انوار کا سورج روشن ہو جاتا ہے۔ الخ

اور اس سلسلہ میں "جامع الترمذی" پر ہمارا حاشیہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ ایک ولی کی تردید میں ابن خلدون نے اس مسئلہ میں قلم اٹھایا ہے اور سیدنا علی المرتضی رضی اللہ عنہ کی طرف جو خرقہ کی سند مرفوعاً بیان کی جاتی ہے اُس پر زبانِ طعن دراز کی اور کہا کہ وہ اس معنی سے بیزار ہیں، کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ تحلیہ، لباس کے طریقے اور کسی حال میں مخصوص نہیں بلکہ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ کے بعد تمام لوگوں سے بڑھ کر زاہد اور عبادت گذار تھے، اور اُن میں سے کوئی ایک کسی ایسی چیز کے ساتھ مخصوص نہیں جو دوسروں پر اس کی ترجیح کا سبب بنے، بلکہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دین، زھد اور مجاھدہ میں اسوہ ہیں۔ انتہا ملخصاً۔

شیخ عبد الھادی الابیاری رحمۃ اللہ علیہ کی خوبی اللہ کے لیے ہے کہ انہوں نے اس کلام کی تردید میں "سعود المطالع" میں فرمایا ہے: ہمارے دل میں ابن خلدون کے اس کلام کے متعلق خلش ہے، کیونکہ اس میں اکابر مشائخ پر زیادتی ہے اور اُن کی جانب سے تمام سلاسل کی امام علی رضی اللہ عنہ تک پہنچنے کی جو اجماعی سند ہے اُس کی خلاف ورزی ہے۔ جو شخص صوفیہ کرام کے

احوال پر مطلع ہے اور اُن کے سلاسل کی کتب کا مطالعہ رکھنے والا ہے وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا، اور بیشک نبی کریم ﷺ نے جس شخص کو چاہا اُسے علوم اور طرق میں سے کسی خاص علم اور طریقہ سے مختص فرما دیا۔ اس کی تائید حضرت حذیفہ ﷺ کی حدیث سے ہوتی ہے کہ انہیں حضور ﷺ نے قیامت تک مَاكَانَ وَمَايَكُوْنُ (جو ہو چکا اور جو ہونے والا ہے) کے امور سے آگاہ فرمادیا، اور حدیثِ ابوھریرہ ﷺ سے بھی ہوتی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے علم کے دو برتن حاصل کیے، علیٰ ھذا القیاس۔

اور سیدنا علی ﷺ نے جو کچھ نبی کریم ﷺ سے اخذ کیا ہے اُس پر ایک جماعت نے مستقل کتابیں لکھی ہیں: چنانچہ ابن سلیمان الردانی نے اپنی کتاب "الصلة" میں اُن لوگوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے سیدنا علی ﷺ کی مستقل "مسند" جمع کی ہے۔ ان میں ایک ابو جعفر محمد بن عبداللہ الحضرمی المعروف مطین، دوسرے ابو اسحاق اسماعیل بن اسحاق القاضی اور تیسرے ابو محمد عبدالرحمان بن عثمان ابن ابی نصر وغیرھم ہیں، اور خادمی کی "شرح الطریقة المحمدیة" میں ہے کہ اصول اور فروع میں تمام جماعتیں سیدنا علی ﷺ سے نسبت رکھتی ہیں، اور اسی طرح صوفیہ نسبت باطن میں اور رئیس المفسرین ابن عباس ﷺ تفسیر میں اُن کے شاگرد ہیں"۔

(نظام الحكومة النبوية ج٢ ص٢٤٧، ٢٤٨؛ بريقة محمودية ج٢ ص٨؛ فتح الإلٰه ج١٠ ص٥٩٠)

اس عبارت میں تصریح ہے کہ تمام محمدی اولیاء کے امام سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ ہیں اور مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اس سلسلے میں بارہ اماموں کا ذکر بھی لائے ہیں لیکن ہمارے معاصر پیر سائیں قاسمی کے نزدیک یہ یہودیت و رافضیت ہے۔ آپ وہ مانیں یا نہ مانیں لیکن ہم دوسرے مشائخ نقشبند ﷺ سے بھی اس حقیقت کو ثابت کر دیتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ یہ فقیر (ظہور احمد فیضی) چشتی کے ساتھ ساتھ قادری اور نقشبندی بھی ہے۔ ع: متحد جانند شیرانِ خدا۔

تمام امت پر مرتضوی قطبیت

جب بقول مجدد الف ثانی سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ اپنی جسدی پیدائش سے قبل بھی منبعِ ولایت تھے تو لامحالہ وہ

اُمتِ مسلمہ کے تمام افراد کے لیے منبعِ ولایت اور قطبِ اعظم ہوں گے۔ آخر نبی کریم ﷺ نے یونہی تو نہیں فرمایا تھا کہ: هو وليكم من بعدي، هو ولي كل مؤمن من بعدي، من كنتُ مولاه فعلي مولاه. (یعنی وہ میرے بعد تمہارا اور ہر مومن کا ولی ہے، اور میں جس کا مولیٰ ہوں تو علی بھی اُس کا مولیٰ ہے) اگر کسی کو مجدد الفِ ثانی کی یہ بات سمجھ نہ آئی ہو تو ہم اُن کی خدمت میں مزید مدلل عبارات پیش کر رہے ہیں۔ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ سورۃ آل عمران کی آیت:

وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ.

''اور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تم کفر کرنے لگو حالانکہ تم پر اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں اور تم میں اللہ کے رسول ﷺ موجود ہیں''۔[آل عمران: ۱۰۱]

کے تحت پہلے قتادہ کا یہ قول لائے ہیں:

''اس آیت میں دو واضح علم موجود ہیں: [۱] اللہ کی کتاب [۲] اور اللہ کے نبی۔ پس اللہ کے نبی تو وصال فرما گئے لیکن کتابِ الٰہی کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت اور کرم سے باقی رکھا ہے''۔

پھر لکھا ہے:

قلتُ: ولكن نبي الله ﷺ أرشدنا إلىٰ من ينوبه بعده من خلفائه إلىٰ يوم القيامة.

''میں کہتا ہوں: لیکن اللہ کے نبی ﷺ نے ہمیں اپنے بعد اُن خلفاء سے آگاہ فرمایا ہے جو قیامت تک آپ کے نائب ہوں گے''۔

یہاں خلفاء سے مراد ولایتِ باطنی کے خلفاء ہیں، کیونکہ صحابیت قیامت تک جاری نہیں ہے، اسی لیے اس کے بعد قاضی رحمہ اللہ نے صحیح مسلم اور جامع ترمذی سے حضرت زید بن ارقم اور حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے متعدد الفاظ میں حدیث الثقلین نقل فرمائی ہے، جس میں ہے کہ میں تم میں کتابِ الٰہی اور اپنے اہل بیت چھوڑ رہا ہوں، یہ دونوں قیامت تک ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔ پھر لکھا ہے:

قلتُ: أشار النبي ﷺ إلىٰ أهل البيت لأنهم أقطاب الإرشاد في الولايات، أولهم علي عليه السلام ثم أبناءه إلى الحسن العسكري، وآخرهم غوث الثقلين محي الدين عبد القادر الجيلي رضي الله عنهم أجمعين، لايصل أحد من الأولين والآخرين

إلىٰ درجة الولاية إلا بتوسطهم كذا قال المجدد.

''میں کہتا ہوں: نبی کریم ﷺ نے اہل بیت کرام کی طرف اشارہ فرمایا ہے، اس لیے کہ ولایت میں وہی اقطاب الارشاد (ہدایت کے قطب) ہیں، اُن میں اول سیدنا علی ہیں، پھر سیدنا حسن عسکری تک اُن کی اولاد ہے اور ان کے آخر میں غوث الثقلین محی الدین عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں۔ اولین اور آخرین میں سے کوئی شخص اِن حضرات کے توسط کے بغیر درجۂ ولایت تک نہیں پہنچ سکتا، جیسا کہ مجدد نے فرمایا ہے''۔

(التفسير المظهري ج٢ ص١٠٥، ١٠٦)

فقیہ ابوالخیر اور اُن کے فرزند کا کلام

امام احمد رضا حنفی اور فقیہ اعظم ابوالخیر محمد نور اللہ بصیر پوری رحمۃ اللہ علیہما اور اُن کے فرزند علامہ محمد محب اللہ نوری حفظہ اللہ تعالیٰ نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔

(الملفوظ حصه اول ص١٧٨؛ فتاوى نوريه ج٥ ص١٧٧، ١٧٨؛ مرتضىٰ مشكل كشامولىٰ علي، لمحب الله نوري ص١٨٨)

قاضی ثناء اللہ پانی پتی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ ''كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ'' کے تحت لکھتے ہیں:

رجال هذه الأمة أكثر إرشاداً وأقوىٰ تأثيراً في الناس بالجذب إلى الله تعالىٰ من رجال الأمم السابقة، وكان قطب إرشاد كمالات الولاية علي ما بلغ أحد من الأمم السابقة درجة الأولياء إلا بتوسط روحه، ثم كان بتلك المنصب الأئمة الكرام أبناؤه إلى الحسن العسكري وعبد القادر الجيلي، ومن ثم قال: روقتي قبل قلبي قد صفا لي، وهو علىٰ ذلك المنصب إلى يوم القيامة، ومن ثم قال:

أفلت شموس الأولين وشمسنا
أبداً علىٰ أفق العلىٰ لا تغرب

''اِس امت کے لوگ رشد و ہدایت میں زیادہ ہیں اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں

لانے میں امم سابقہ کے مقابلہ میں قوی التاثیر ہیں، اور کمالاتِ ولایت کے قطب ارشاد سیدنا علی علیہ السلام ہیں، سابقہ امتوں میں کوئی شخص اولیاء کے مرتبہ پر اُن کی مقدس روح کی وساطت کے بغیر نہیں پہنچا، پھر یہ منصب اُن کی اولاد میں ائمہ کرام کو ملا، امام حسن عسکری اور سیدی عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ تک، اسی لیے انہوں نے فرمایا: میرا حال اس سے قبل مصطفیٰ تھا، اور وہ قیامت تک اس منصب پر فائز رہیں گے، جیسا کہ انہوں نے فرمایا:

اولین کے آفتاب ڈوب گئے اور ہمارا خورشید ہمیشہ چمکتا رہے گا کبھی نہیں ڈوبے گا"۔

(تفسیر المظھري ج۲ ص۱۲۲)

فقیہ اعظم ابوالخیر اور اُن کے فرزند علامہ محمد محب اللہ نوری حفظہ اللہ تعالیٰ نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔

(فتاوی نوریہ ج۵ ص۱۷۶، ۱۷۷؛ مرتضیٰ مشکل کشا مولیٰ علی ص۱۸۹)

فقیہ اعظم ابوالخیر کی علمی تحقیق

قاضی پانی پتی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کی اِن دونوں عبارتوں میں ولایت کا پہلا قطب ارشاد سیدنا علی علیہ السلام کو فرمایا گیا پھر حدیث کی روشنی میں بتایا گیا کہ قیامت تک یہ سلسلہ اُن کی اولاد میں چلے گا، اور چونکہ اہل بیت کرام علیہم السلام اور قرآن قیامت تک اکٹھے رہیں گے، لہٰذا جس طرح قرآن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور بعد والے تمام لوگوں کے لیے باعث ہدایت ہے اسی طرح اہل بیت کرام علیہم السلام بشمول صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بعد والے تمام لوگوں کے حق میں قطب ارشاد ہیں، اور اولین قطب سیدنا علی علیہ السلام ہیں۔ حدیث "من کنت مولاہ فعلي مولاہ" اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کی نقل کردہ احادیث کا یہی مفاد ہے۔

اسی حقیقت کو علمی انداز میں حضرت فقیہ اعظم ابوالخیر محمد نور اللہ بصیر پوری رحمۃ اللہ علیہ نے مندرجہ بالا دونوں عبارتوں کے بعد یوں بیان فرمایا ہے:

"ان عبارات سے امس وشمس کی طرح واضح وہویدا ہورہا ہے کہ قطبیتِ کبریٰ اور مرکزیت حضرات اہل بیت کرام کے لئے ہی ہے اور ان کے فیوض برکات اور وساطت سے اور بھی اقطاب ونجباء ہیں اور چونکہ قاضی کے بیان کا ماخذ اور اصل بھی یہی ہے تو لامحالہ اُن کی مراد بھی وہی ہے جس کی طرف ان کے بیان میں واضح اشارات بلکہ تصریحات ہیں کہ وہ فرماتے

ہیں: هم أقطاب الإرشاد في الولايات. "الولايات" جمع مؤنث سالم معرّف باللام ہے جو مفید استغراق ہے تو معنی یہ بنا کہ وہ تمام ولایات میں قطب ارشاد ہیں اور اسی طرح دوسری عبارت میں "قطب إرشاد كمالات الولاية" میں بھی "الولاية" کا الف لام استغراقی ہے اور "کمالات" جمع مضاف بھی مفیدِ استغراق ہے تو معنی یہ بنا کہ ہر قسم کی ولایت کے ایک ایک کمال کے لئے قطب ارشاد ہیں۔

پھر اسی معنی کی توضیح کے لئے فرمایا "لا يصل احد من الأولين والآخرين إلىٰ درجة الولاية إلا بتوسطهم" یہ نفی واثبات کا حصر صاف صاف بتا رہا ہے کہ وہ (اہل بیت کرام) ایسے قطب ہیں کہ سب اولین وآخرین اولیاء ان کے محتاج ہیں اور سب کے کمالات کے وسائط ووسائل ہیں اور یہی معنیٰ مرکزیت کا ہے جو مکتوبات شریف کی ان عبارات سے آفتاب وماہتاب کی طرح نمایاں ہے، تو واضح ہوا کہ اہل بیت کرام کے علاوہ دوسری اقوام میں بھی متشرع ومتدین حضرات ان کے فیوض وبرکات سے قطب ہو سکتے ہیں"۔

(فتاویٰ نوریہ ج۵ ص۱۷۹، ۱۸۰)

جمیع صحابہ کرامؓ کے قطب ولایت

اگر اب بھی بعض لوگوں کو یہ بات سمجھ نہ آئی ہو تو ہم اُن کے سامنے قاضی ثناء اللہ پانی پتی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کے اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ پیش کر دیتے ہیں۔ انہوں نے سورۂ ھود کی آیت [۱۷] کے الفاظ "وَشَاهِدٌ مِّنْهُ" سے سیدنا علیؑ کی ذات پاک کو مراد لیا ہے، پھر اس پر سوال قائم فرماتے ہوئے لکھا ہے:

فإن قيل: فما وجه تسمية علي بالشاهد؟ قلتُ: لعل وجه ذلك أنه أول من أسلم من الناس، فهو أول من شهد بصدق النبيﷺ، والأوجه عندي أن يقال أن عليًا كان قطب كمالات الولاية وسائر الأولياء حتى الصحابة رضوان الله عليهم أتباع له في مقام الولاية، وأفضلية الخلفاء الثلاثة بوجه آخر، كذا حقق المجدد.

"پس اگر کہا جائے کہ سیدنا علیؓ کو شاہد کہنے کی کیا وجہ ہے؟ تو میں کہتا ہوں: شاید یہ

وجہ ہے کہ انہوں نے تمام لوگوں سے پہلے اظہارِ اسلام فرمایا تو وہ نبی کریم ﷺ کی تصدیق کے پہلے شاھد قرار پائے، اور میرے نزدیک بڑی وجہ یہ ہے کہ سیدنا علی علیہ السلام کمالاتِ ولایت کے قطب ہیں اور تمام اولیاء کرام حتیٰ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی مقامِ ولایت میں اُن کے تابع ہیں، اور خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی افضلیت کسی اور پہلو سے ہے، جیسا کہ مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے تحقیق فرمائی ہے"۔

(التفسير المظهري ج٤ ص٣٨٣)

قاضی رحمہ اللہ کی روافض کی تردید میں ایک کتاب ہے، اس میں انہوں نے یہ گفتگو زیادہ تفصیل کے ساتھ فرمائی ہے، یہاں ہم اس کا کچھ حصہ نقل کر رہے ہیں۔ وہ امامت کی اقسام میں لکھتے ہیں:

فیوض وبرکات کارخانه ولایت که ازجنابِ الٰہی براولیاء الله نازل مے شوداول بریك شخص نازل مے شود، وازاں شخص قسمت شده بهریك ازاولیاء عصر موافق مرتبه وبحسبِ استعداداومے رسد، وہیچ کس راازاولیاء الله بے توسط اوفیضے نمی رسید، وکسے ازمردان خدایے وسیلۂ اودرجۂ ولایت نمی یابد، اقطاب واوتادوابدال ونجباء ونقباء وجمیع اقسام اولیاء خدابوے محتاج می باشند، صاحب ایں منصب عالی راامام وقطب ارشادبالاصالة نیزخوانند، وایں منصب عالی ازوقت ظهور آدم علیہ السلام بروح پاك علی مرتضی کرم الله وجهه مقرر بود۔

"بارگاہِ الٰہی سے کارخانۂ ولایت کے فیوض وبرکات جو نازل ہوتے ہیں وہ اوّلاً ایک شخص پر نازل ہوتے ہیں اور اُس شخص سے تقسیم ہو ہو کر اولیاءِ زمانہ کو حسب مرتبہ واستعداد پہنچتے ہیں، اور اولیاء کرام میں سے کسی کو اُس کے واسطہ کے بغیر فیض نہیں پہنچتا اور مردانِ خدا میں سے کوئی شخص اُس کے وسیلہ کے بغیر درجۂ ولایت کو نہیں پاتا، اقطاب اوتاد، ابدال، نجباء، نقباء اور اولیاء اللہ کی تمام قسمیں اس کی محتاج ہوتی ہیں۔ اس بلند منصب والے کو امام اور بالاصالۃ قطبِ ارشاد بھی کہتے ہیں، اور اِس عالی رتبہ پر سیدنا آدم علیہ السلام کے ظہور سے سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی پاک روح مقرر ہے"۔

(السيف المسلول للقاضي فاني فتي نقشبندي ص٢٢٩، ٢٣٠)

حضرت شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی نبی کریم ﷺ کے قلبِ اقدس سے تجلی اول کو قبول کرنے والی پہلی ہستی سیدنا علی بن ابی طالب ؓ کی ذات پاک ہے۔

(الفتوحات المكية ج١ ص ٣٢٣؛ اليواقيت والجواهر ج٢ ص ٢٠، وط: ص ٣٣٩؛ تصفيه مابين سني وشيعه ص ٥٠)

مذکورہ بالا عبارت کے بعد قاضی صاحب نے حسبِ سابق حضور غوث الثقلین ؓ تک قطبیت کو پہنچایا ہے، اور آگے چل کر حدیث "من كنت مولاه" اور حدیث "أنا مدينة العلم" اور حدیث "حب علي عبادة" کو اس بیان کی تائید میں نقل کیا ہے، اور حسبِ سابق خلفاء ثلاثہ ؓ پر سیدنا علی علیہ السلام کی افضلیت کے شبہ کو زائل کرنے کی کوشش بھی فرمائی ہے۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ یہاں اگر سیدنا فاروقِ اعظم ؓ کا وہ ارشاد مدنظر رکھا جائے جو ہم اس سے قبل نقل کر چکے ہیں تو بات مزید واضح ہو جائے گی۔ انہوں نے فرمایا:

واعلموا أنه لايتم شرف إلابولاية علي رضي الله عنه.

"جان لو کہ کوئی شرف و مرتبہ محبتِ علی ؓ کے بغیر پورا نہیں ہوتا"۔

(الصواعق المحرقة ص١٧٨؛ جواهر العقدين للسمهودي ص ٣٨١؛ رشفة الصادي لأبي بكر الحضرمي ص ١٥٢)

قطب الاقطاب فقط اہل بیت سے کیوں؟

علامہ سید محمود آلوسی حنفی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اہل بیت کرام علیہم السلام کی مخصوص طہارت کے فوائد میں قطبیتِ عظمیٰ کو اُنہیں کے لیے ثابت فرمایا ہے اور انہوں نے اس سلسلے میں اُس اختلاف کو بھی حل فرمایا ہے جو حضرت ابوالعباس المرسی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

ولذا نجد عباد أهل البيت أتم حالاً من سائر العباد المشاركين لهم في العبادة الظاهرة، وأحسن أخلاقاً، وأزكى نفساً، وإليهم تنتهي سلاسل الطرائق التي مبناها كما لا يخفى على سالكيها التخلية والتحلية اللتان هما جناحان للطيران إلى حظائر القدس، والوقوف على أوكار الأنس، حتى ذهب قوم إلى

أن القطب في كل عصر لايكون إلامنهم خلافاً للأستاذ أبي العباس المرسي، حيث ذهب كما نقل عنه تلميذه التاج بن عطاء الله إلى أنه قد يكون من غيرهم.

ورأيت في مكتوبات الإمام الفاروقي الرباني مجدد الألف الثاني قدس سره ما حاصله :أن القطبية لم تكن على سبيل الأصالة إلالأئمة أهل البيت المشهورين،ثم إنها صارت بعدهم لغيرهم على سبيل النيابة عنهم حتى انتهت النوبة إلى السيد الشيخ عبد القادر الكيلاني قدس سره النوراني،فنال مرتبة القطبية على سبيل الأصالة، فلما عرج بروحه القدسية إلى أعلى عليين نال من نال بعده تلك الرتبة على سبيل النيابة عنه، فإذا جاء المهدي ينالها أصالة كما نالهاغيره من الأئمة رضوان الله تعالى عليهم أجمعين، ا ه. وهذا مما لاسبيل إلى معرفته والوقوف على حقيته إلابالكشف وأني لي به.

والذي يغلب على ظني أن القطب قد يكون من غيرهم،لكن قطب الأقطاب لا يكون إلامنهم ،لأنهم أزكى الناس أصلاً،وأوفرهم فضلاً، وأن من ينال منهم لاينالها إلاعلىٰ سبيل الأصالة دون النيابة والوكالة، وأنالا أعقل النيابة في ذلک المقام.

”یہی وجہ ہے کہ ہم اہلِ بیت کے عبادت گذاروں کے مقام کوظاہری عبادت میں دوسرے عبادت گذاروں سے بڑھ کر کامل، سب سے بڑھ کر حسین اخلاق اور سب سے بڑھ کر پاکیزہ پاتے ہیں، اور انہیں کی طرف تمام سلاسلِ طریقت کی انتہا ہوتی ہے، جیسا کہ اُن حضرات پر مخفی نہیں جو تخلیہ (برائیوں سے کنارہ کشی میں) اور تحلیہ (عبادات کے زیور) کو اپنانے کی منزل کے راہی ہیں اور یہ دونوں چیزیں حریم قدس میں اُڑان کے لیے روحانی پروں کی اور سکون کے گھونسلوں میں قرار کی حیثیت رکھتی ہیں، حتیٰ کہ ایک قوم اس طرف گئی ہے کہ ہر زمانہ میں قطب وقت فقط اہلِ بیت سے ہوتا ہے، بخلاف استاد ابوالعباس المرسی کے، اُن کے شاگرد تاج الدین بن عطاء اللہ نے اُن سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا: غیر اہل بیت سے بھی قطبِ وقت ہوتا ہے۔

اور میں نے امام ربانی الفاروقی مجدد الف ثانی قدس سرہ کے مکتوبات میں پڑھا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: اہل بیت کے مشہور ائمہ کے علاوہ قطبیت براہِ راست نہیں چلی، پھر اُن کے بعد غیر اہل بیت کے لیے اُنہیں سے نیابت کے طور پر چلتی رہی، حتیٰ کہ سیدنا شیخ عبدالقادر گیلانی قدس سرہ النورانی کی باری آئی تو وہ اصالۃً (براہ راست) قطبیت کے مقام پر فائز ہوئے، پھر جب وہ اپنی روح مقدس کے ساتھ اعلیٰ علیین کی طرف محو پرواز ہوئے تو بعد والوں کو یہ رتبہ اُن کی نیابت میں ملا، پھر جب امام مہدی علیہ السلام جلوہ گر ہوں گے تو وہ دوسرے ائمہ اہل بیت رضی اللہ عنہم کی طرح اصالۃً اس مرتبہ پر فائز ہوں گے۔ مکتوبات کی عبارت پوری ہوئی۔ (امام آلوسی فرماتے ہیں:)

اور اس بات کی معرفت اور اس کی حقیقت تک رسائی کشف کے بغیر نہیں ہوسکتی، اور مجھے کشف کہاں حاصل؟ اور جو چیز میرے گمان پر غالب ہے وہ یہ ہے کہ قطب وقت اہل بیت کے علاوہ بھی ہوتا ہے لیکن قطب الاقطاب فقط اہل بیت سے ہوتا ہے، کیونکہ وہ اپنی اصل (نسب) میں سب سے زیادہ پاکیزہ اور فضیلت میں سب سے وسیع ہیں، اور اُن میں سے جو بھی اس مقام پر فائز ہوتا ہے اصالۃً ہوتا ہے نیابۃً یا وکالۃً نہیں، اور مجھے اس مقام میں نیابت سمجھ نہیں آتی"۔

(روح المعاني ج۱۲ جزء ۲۲ ص۲۸، وط: ج۲۱ ص۳۱۱، ۳۱۲)

دیوبندی مکتب فکر کے عالم حافظ محمد ظفر اللہ شفیق صاحب نے بھی اپنی عظیم الشان اور لائق مطالعہ تصنیف میں اس عبارت کا خلاصہ نقل کیا ہے۔

(امام حسین رضی اللہ عنہ اور واقعۂ کربلا ص ۲۷۱)

استاذ العلماء بندیالوی کی تحقیق

استاذ العلماء علامہ عطاء محمد بندیالوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"یہاں یہ امر جاننا ضروری ہے کہ صوفیہ کرام میں اختلاف ہے کہ اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم کے بغیر درجۂ قطبیت کسی اور کو حاصل ہوسکتا ہے یا نہیں؟ بعض صوفیہ کا مذہب ہے کہ اہل بیت کا غیر قطب نہیں ہوسکتا، اور بعض کے نزدیک غیر اہل بیت بھی

قطب ہوسکتا ہے لیکن قطب بالاصالۃ نہیں ہوسکتا، البتہ اہل بیت کے قطب کا نائب ہوگا، جیسا کہ حضرت امام ربانی شیخ محمد احمد فاروقی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت سے واضح ہو چکا ہے، لیکن اس امر پر تقریباً اجماع ہے کہ "قطب الاقطاب" صرف اہل بیت سے ہوگا"۔

اس کے بعد استاذ العلماء بندیالوی نے علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہا کی مذکورہ بالا عبارت کا آخری پیراگراف بطور دلیل نقل فرمایا ہے۔

(مقدمة: فيوضاتِ حسنية للبنديالوي ص ۵۷، ۵۸)

صاحب خرد و مطالعہ معاصر سے سوال

صاحب "ضرب حیدری" نے لکھا تھا کہ قطبیت کا اجراء اولاد وامجاد میں ماننا یہودیت ورافضیت ہے اور پھر اپنی بات میں مزید وزن پیدا کرنے کے لیے لکھا تھا "خرد و مطالعہ باید" ہماری گزارش ہے کہ اگر وہ خود "صاحب خرد و مطالعہ" ہیں تو بتلائیں کہ امام حرالی، امام ابن حجر مکی، امام سمہودی، امام مناوی، ملا علی قاری، خواجہ باقی باللہ نقشبندی، مجدد الف ثانی نقشبندی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، شاہ عبد العزیز محدث دہلوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی نقشبندی، امام آلوسی حنفی، سید محمد صدیق الغماری، سید ابوبکر الحضرمی، شیخ محمد عبدالحی الکتانی، پیر مہر علی شاہ گیلانی، امام احمد رضا حنفی قادری، فقیہ اعظم ابوالخیر محمد نور اللہ بصیر پوری، حضرت مولانا محمد فیض احمد مہروی، نواب صدیق حسن قنوجی، علامہ عبدالحکیم شرف قادری، صاحبزادہ محمد محب اللہ نوری اور حافظ محمد ظفر اللہ شفیق دیوبندی اور استاذ بندیالوی وغیرھم نے کیا رافضیت اور یہودیت کی وکالت کی ہے؟ پیر سائیں سے ہماری التماس ہے کہ وہ تردید روافض ضرور فرمائیں مگر خدارا کچھ ہاتھ ہولا رکھیں، اسی میں ہم سب کی اُخروی بھلائی ہے۔

کیا فقط خرد و مطالعہ کافی ہے؟

خیال رہے کہ بعض علماء حق نے حدیث شریف "إن اللّٰه يبعث لهذه الأمة علىٰ رأس كل مائة سنة" اور مشہور حدیث "مثل أهل بيتي كمثل سفينة نوح" سے بھی قطبیتِ عظمیٰ اہل بیت کے لیے ثابت فرمائی ہے، لیکن مذکورہ بالا ساری گفتگو ہو یا ان احادیث سے استدلال کی بات ہو، سب کو سمجھنے کے لیے محض خرد و مطالعہ ہی نہیں بلکہ محبت، عشق اور وجدان بھی درکار ہے۔ جس ڈگر پر معاصر موصوف چل پڑے ہیں اُس سے

انسان مرکز سے دور ہو جاتا ہے، جبکہ نبی کریم ﷺ نے بشمول صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تمام امت کو حکم دیا ہے کہ کتاب اللہ (سنت بھی اسی میں شامل ہے) اور اہل بیت کے ساتھ وابستہ رہو، یعنی ع:

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

جن لوگوں کو یہ حقیقت سمجھ نہیں آتی وہ محض ظاہر بین ہیں۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے جہاں صفاتِ اربعہ یعنی عصمت، حکمت، وجاہت اور قطبیتِ باطنیہ کو اہل بیت کے لیے ثابت کیا ہے وہیں انہوں نے بعض لوگوں سے انکار کے خدشہ کے پیش نظر ان الفاظ کو لکھنا بھی ناگزیر سمجھا ہے:

بالجمله اثبات این صفات اربعه عندالتحقیق نه مخالف اہل سنت است گو ظاہر بینان از اطلاق این الفاظ تحاشی نمایند، ونه مخالف تفضیل شیخین که مجمع علیه جمیع اہل حق است.

"خلاصہ یہ ہے کہ از روئے تحقیق ان چار صفات کا (بارہ اماموں کے لیے) ثابت کرنا نہ مذہب اہل سنت کے خلاف ہے، اگرچہ ظاہر بین حضرات ان الفاظ کے استعمال سے گھبرائیں گے اور نہ شیخین کی افضلیت کے خلاف ہے جس پر تمام اہل حق کا اتفاق ہے"۔

(فتاوی عزیزي ص۱۲۹؛البریلویۃ کاتحقیقی وتنقیدی جائزہ ص۱۵۱)

یااللہ العالمین! ہمیں علم ظاہر کے ساتھ ساتھ علم باطن بھی عطا فرما اور خرد کے ساتھ ساتھ ذوق وجنوں بھی عطا فرما۔ آیئے! میرے ساتھ آپ بھی رب العالمین عزوجل کی بارگاہ میں ہاتھ بلند کر کے التجا کیجئے، یااللہ!

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر — شریکِ زمرۂ لایحزنوں، کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں — مرے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر

(بالِ جبریل ص۸۷؛ کلیاتِ اقبال ۳۷۹)

علامہ شرف قادری کی تحقیق

ہم نے شاہ عبدالعزیز کے فارسی کلام کا ترجمہ علامہ شرف قادری کی تصنیف سے نقل کیا ہے، وہ اس کے بعد بعض ظاہر بین لوگوں کی تردید میں لکھتے ہیں:

"اس عبارت سے ظاہر ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور شاہ عبدالعزیز محدث

دہلوی کے نزدیک بارہ امام نہ صرف روحانی پیشوا ہیں بلکہ عصمت، حکمت، وجاہت اور قطبیتِ باطنیہ چاروں صفات کے حامل ہیں اور اللہ تعالیٰ کا فیض اوّلاً ان پر نازل ہوتا ہے اور ان کے واسطہ سے دوسروں تک پہنچتا ہے"۔

(البریلویۃ کاتحقیقی وتنقیدی جائزہ ص ۱۵۱، ۱۵۲)

عجیب اتفاق ہے کہ علامہ عبدالحکیم شرف قادری ایک ایسے شخص کی تردید کے درپے تھے جو کھلا ظاہر بین تھا اور فیض باطنی حتیٰ کہ بیعت وغیرہ الفاظ سے بھی بیزار تھا مگر ہم جس معاصر کی خدمت میں گزارشات پیش کر رہے ہیں وہ بزعم خویش خود پیر سائیں ہے لیکن بدقسمتی سے وہ اپنے ہی اسلاف مثلاً مجدد الف ثانی نقشبندی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی نقشبندی وغیرھم کی تصریحات کا بھی مخالف ہے۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ یہاں علامہ شرف قادری کے ترجمہ کے ساتھ اسلاف کی عبارات مزید پیش کر دیں۔ چنانچہ علامہ شرف قادری شاہ عبدالعزیز کی عبارت نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ومعنی امامت کہ در اولاد حضرت امیر باقی ماندویکے مر دیگرے راوصی آں می ساخت ہمیں قطبیتِ ارشاد ومنبعیتِ فیض ولایت بود، لہٰذا الزام ایں امر برکافۂ خلائق از ائمہ اطہار مروی نشدہ بلکہ یارانِ چیدہ ومصاحبانِ برگزیدہ خود را بآں فیض خاص مشرف می ساختند وہریکے رابقدراستعداداو بایں دولت می نواختند۔

"حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد میں جو امامت باقی رہی اور ان میں سے ایک، دوسرے کو وصی بناتا رہا۔ وہ یہی قطبیت ارشاد اور فیض ولایت کا منبع ہونا تھا، اسی لیے ائمہ اطہار میں سے کسی سے مروی نہیں کہ انہوں نے امامت کا تسلیم کرنا تمام انسانوں پر لازم قرار دیا ہو، بلکہ اپنے چیدہ چیدہ دوستوں اور منتخب مصاحبوں کو اس فیض خاص سے مشرف فرماتے تھے، اور ہر ایک کو اس کی استعداد کے مطابق اس دولت سے نوازتے تھے"۔ (تحفہ اثنا عشریہ ص ۲۱۴)

(البریلویۃ کاتحقیقی وتنقیدی جائزہ ص ۱۵۲)

علامہ عبدالحکیم شرف قادری رحمہ اللہ اگلی عبارت کو چشم بصیرت کے لیے سرمہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نیز پچھلے امام مثل حضرت سجاد و باقر و صادق و کاظم و رضا تمام اہل سنت کے مقتدا اور پیشوا ہوئے

ہیں کہ اہل سنت کے علماء مثلاً زہری، امام ابوحنیفہ اور امام مالک نے ان حضرات کی شاگردی اختیار کی ہے اور اس وقت کے صوفیاء مثلاً حضرت معروف کرخی وغیرہ نے ان حضرات سے کسب فیض کیا اور مشائخ طریقت نے ان حضرات کے سلسلہ کو سلسلۃ الذہب قرار دیا اور اہل سنت کے محدثین نے ان بزرگوں سے فن خصوصاً تفسیر وسلوک میں احادیث کے دفتروں کے دفتر روایت کیے ہیں"۔[تحفہ اثناء عشریہ ص۲۳۳]

(البریلویۃ کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ ص۱۵۲،۱۵۳)

مرتضوی خلافتِ بلافصل پر معتدل قول

روافض آیت مبارکہ "إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ" [المائدۃ:۵۵] کی شانِ نزول کو مدنظر رکھتے ہوئے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو مطلقاً خلیفۂ اول بلافصل ثابت کرتے ہیں اور اہل سنت جہاں اُن کے اس بھونڈے استدلال کو مسترد کرتے ہیں وہیں وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بلافصل باطنی خلافت کا قول بھی کرتے ہیں، جیسا کہ ہم صاحب "شرح النبراس" قاضی برخوردار ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے لکھ چکے ہیں۔ نیز علامہ سید محمود آلوسی حنفی رحمۃ اللہ علیہ روافض کی تفصیلی تردید کے بعد فرماتے ہیں:

"یہ آیت محدثین عظام کے نزدیک سیدنا علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کی شان میں نازل ہوئی، اور امامیہ جیسا کہ آپ جان چکے ہیں اس سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بلافصل خلافت کی دلیل لیتے ہیں، اور ہم نے جو اُن کی تردید کی ہے اسے بھی آپ پڑھ چکے ہیں، والحمد للہ سبحانہ۔ اور بہت سے صوفیہ قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم نے بھی اس آیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مولیٰ علی کی بلافصل خلافت کا قول کیا ہے مگر اُن کے نزدیک یہ خلافتِ باطنیہ ہے، جس سے رشد وہدایت، امداد وتربیت اور روحانی تصرف مراد ہے نہ کہ وہ ظاہری خلافت جس کے مقاصد میں ظاہری حدود کے قیام، لشکروں کی تیاری، اسلام کے دفاع اور تیر وتلوار سے دشمنوں کا قلع قمع کرنا آتا ہے۔ یہ خلافت اُن (صوفیہ) کے نزدیک اُسی ترتیب کے مطابق ہے جیسا کہ اہل سنت کے مذہب میں واقع ہوئی، اور اُن کے نزدیک دونوں خلافتوں کے مابین فرق ایسا ہے جیسا کہ چھلکا اور مغز میں، سو باطنی خلافت ظاہری خلافت کا مغز ہے، اِس سے اسلام کی حقیقت

کی حفاظت کی جاتی ہے اور ظاہری سے اسلام کے ظاہر کو محفوظ رکھا جاتا ہے، اور ہر دور میں یہ مرتبہ قطب وقت کا ہوتا ہے، اور کبھی یہ باطنی خلافت ظاہری خلافت کے ساتھ جمع ہو جاتی ہے، جیسا کہ سیدنا علی کرم اللہ تعالیٰ وجھہ کی ذات میں اُن کی حکومت کے ایام میں جمع ہو گئی تھی اور جیسا کہ سیدنا امام مھدی علیہ السلام کے ظہور کے ایام میں اُن میں جمع ہو جائے گی، یہ اور نبوت رضاعی بہنیں ہیں، اسی طرف نبی کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم سے منقول اِس ارشاد میں اشارہ ہے کہ: ''میں اور علی ایک نور سے پیدا کئے گئے'' اور یہ خلافت سیدنا علی کرم اللہ تعالیٰ وجھہ الکریم میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔

اسی لیے اہل اللہ رضی اللہ عنہم کے سلاسل کی انتہا انہیں پر ہوتی ہے ماسوا اُن معززین کے جن کے سلسلہ کی انتہا سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر ہوتی ہے، جیسا کہ ہمارے نقشبندیہ سادات، اللہ تعالیٰ ہمیں اُن کے علوم سے نفع عطا فرمائے، تاہم اس سلسلہ کا ورود سیدنا علی کرم اللہ تعالیٰ وجھہ پر بھی ہوتا ہے، اور خلافت کی یہ تقسیم بعض عرفاء کرام نے اُن احادیث کے مابین مطابقت کے طور پر فرمائی ہے جن میں واضح طور پر یا اشارۃً ائمہ ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد معروف ترتیب کے مطابق خلافت کا ذکر ہے، اور جن میں صراحۃً یا اشارۃً نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد امیر کرم اللہ تعالیٰ وجھہ کی بلافصل خلافت کا ذکر ہے، پس انہوں نے خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی خلافت میں وارد ہونے والی احادیث کو خلافتِ ظاہری پر محمول کیا ہے، اور امیر کرم اللہ تعالیٰ وجھہ کی خلافت میں وارد ہونے والی احادیث کو خلافتِ باطنی پر محمول کیا ہے اور چاروں خلفاء کرام رضی اللہ عنہم کی خلافت کی حقیت کا قول کیا ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ یہ قول امیر کرم اللہ تعالیٰ وجھہ کی خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم پر افضلیت کی طرف اشارہ کرتا ہے، اور بعض نے تو افضلیت کی تصریح بھی فرمائی ہے اور کہا ہے کہ مفضول کی ظاہری خلافت افضل کی موجودگی میں جائز ہے، لیکن ہم شیخ اکبر قدس اللہ تعالیٰ سرہ سے نقل کر چکے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے درمیان کوئی شخص نہیں ہے، اور ان کا مقصود مرتبۂ فضیلت کے سوا کچھ نہیں، خوب سمجھئے''۔

(تفسير روح المعاني ج ٤ جز ٦ ص ٢٧٣، ٢٧٤، وط: ٧ ص ٣٠٥، ٣٠٦)

روح المعانی میں شیخ اکبر کے قول پر ایک نظر

امام آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کی اِس عبارت میں صوفیہ کرام کی طرف سے مختلف احادیث کے مابین جو مطابقت بیان فرمائی گئی ہے وہ بہت عمدہ ہے اور اکثر صوفیہ کرام کا یہی نظریہ ہے، لیکن علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کی طویل عبارت کے آخر میں شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ کی طرف جو بات منسوب کی گئی ہے جہاں وہ علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کا مختار قول محسوس نہیں ہوتا وہیں ہمیں اُس کی صحت میں بھی شک ہے، کیونکہ ہمارے سامنے شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ کا اس کے برعکس ایسا کلام موجود ہے جس میں وہ کسی کو بھی اہل بیت کے برابر نہیں سمجھتے، چنانچہ وہ ایک مقام میں عظمت ومحبت اہل بیت علیہم السلام پر کلام کرتے ہوئے تلقین فرماتے ہیں:

فلا تعدل بأهل البيت خلقاً

فأهل البيت هم أهل السيادة

''پس تم کسی مخلوق کو اہل بیت کے برابر مت بناؤ، اہلِ بیت ہی اہلِ سیادت ہیں''۔

(الفتوحات المكية ج٧ص ٢٥٥؛مهر منير ص ٢٠)

نیز شیخ اکبر خلافت کی ظاہری ترتیب کو برحق ماننے کے باوجود اُس ترتیب کے مطابق افضلیت کے قائل نہیں ہیں۔ چنانچہ وہ باب نمبر تین سو تین [٣٠٣] میں آیت مبارکہ ﴿ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا ﴾ (اور اللہ تعالیٰ کے لیے سجدہ کر رہی ہے ہر چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے، خوشی اور مجبوری سے)[الرعد: ١٤] کے تحت لکھتے ہیں:

''پس جب اُس خالق کو جس کے قبضۂ قدرت میں ہر چیز ہے، بعض چیزیں مجبوراً سجدہ کرتی ہیں تو پھر اُس کی مخلوق میں جو مرسلین علیہم السلام اُس کے خلفاء اور نائب ہیں اُن کا کیا حال ہوگا؟ پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور دوسرے حضرات کا کیا حال ہوگا؟ پس ناگزیر ہے کہ کوئی خوشی سے طاعت میں داخل ہوگا اور کوئی مجبوری سے مگر مجبوری بایں معنیٰ کہ اُسے کوئی شبہ ہوگا جبکہ وہ دین دار ہو، یا وہ خواہش کا پیروکار ہوگا جبکہ وہ دین دار نہ ہو۔ پس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے جس نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کو ناپسندیدہ جانا تو خواہش نفس کی بنا پر نہیں، وہ خواہش نفس سے دور تھے، یہی اُن کے ساتھ حسنِ ظن کا تقاضا ہے، لیکن اُسے کوئی شبہ تھا جس پر وہ قائم رہا، اُس کی رائے

میں وہ اُن سے خلافت کا زیادہ حقدار تھا لیکن یہ اُس کے خیال میں تھا علمِ الٰہی میں ایسا نہیں تھا۔

فإن اللّٰه قد سبق علمه بأن يجعله خليفة فى الأرض، و كذلك عمرو عثمان وعلي والحسن، ولو تقدم غير ابي بكر لمات أبو بكر في خلافة من تقدمه، ولابد في علم الله أن يكون خليفة فتقدمهم بالزمان بانه أولهم لحوقاً بالأخرة، فكان سبب هذا الترتيب فى الخلافة ترتيب أعمارهم، فلا بد أن يتاخر عنها من يتاخر مفارقته للدنيا ليلي الجميع ذلك المنصب، وفضل بعضهم علىٰ بعض مصروف إلى الله هو العالم بمنازلهم عنده.

بیشک اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ وہ انہیں زمین پر خلیفہ بنائے گا اور اسی طرح حضرات عمر، عثمان، علی اور حسن ﷺ کو بھی، اگر حضرت ابوبکر ﷺ سے قبل کوئی اور شخص خلیفہ ہو جاتا تو حضرت ابوبکر ﷺ اُس کے دورِ خلافت میں ہی بارگاہِ الٰہی میں پہنچ جاتے، اور علمِ الٰہی میں اُن کا خلافت میں تقدم لازم تھا کیونکہ وہ پہلے آخرت میں جانے والے تھے، پس اُن کی خلافت کی یہ ترتیب اُن کی عمروں کی ترتیب کے مطابق تھی، پس ضروری تھا کہ جو دنیا چھوڑنے میں متاخر ہو وہ خلافت میں بھی متاخر ہو، تاکہ یہ منصب سب کو ملے، اور اُن میں سے بعض کی بعض پر فضیلت کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے، وہی ذات اپنے ہاں اُن کے مراتب کو جانتی ہے''۔

(الفتوحات المكية ج ٥ ص ٢٩، وط: ج ٥ ص ٣٢، ٢٤)

اس مفہوم کو امام شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی تلخیص و تسہیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

(اليواقيت والجواهر ج ٢ ص ٧٤، وط: ص ٤٣٩؛ الكبريت الأحمر بهامش اليواقيت والجواهر ج ٢ ص ٨، وط: ص ٣٥١، وط: مفردة ص ٨٥)

شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیٰ نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام کی اتباع کی حکمت میں لکھتے ہیں:

الذي أمرنا الله أن نتبع ملته لتقدمه فيها لا لأنه أحق بها من محمد ﷺ، فللزمان حكم فى التقدم لا فى المرتبة كالخلافة بعد رسول الله ﷺ الذي كان من حكمة اللّٰه تعالىٰ انه أعطاها أبابكر ثم عمر ثم عثمان ثم علياً بحسب

أعمارهم، وكل لها أهل في وقت أهلية الذي قبله، ولابد من ولاية كل واحد منهم وخلع المتأخر لو تقدم لابد منه، حتى يلي من لا بد له عند الله في سابق علمه من الولاية فرتب الله الخلافة ترتيب الزمان للأعمار حتىٰ لايقع خلع مع الإستحقاقِ في كل واحد من متقدم ومتأخر، وما علم الصحابة ذلک إلا بالموت، ومع هذا البيان الإلٰهي فبقىٰ أهل الأهواء في خوضهم يلعبون مع إبانة الصبح لذي عينين بلسان وشفتين، نسأل الله العصمة من الأهواء.

''اللہ تعالیٰ نے جو ہمیں اُن کی ملت کی اتباع کا حکم فرمایا ہے تو اُن کے زمانے کے تقدم کی وجہ سے فرمایا ہے، نہ کہ اس لیے کہ وہ سیدنا محمد ﷺ سے زیادہ حقدار تھے، پس زمانہ کی وجہ سے تقدم کا حکم ہے نہ کہ مرتبہ کی وجہ سے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد خلافت میں حکمتِ الٰہی یہ تھی کہ اُس نے حضرت ابوبکر، پھر عمر، پھر عثمان اور پھر علی رضی اللہ عنہ کو خلافت عطا فرمائی، اُن کی عمروں کے مطابق، اور اُن میں سے ہر ایک اپنے سے پہلے خلیفہ کی خلافت کے وقت میں خلافت کا اہل تھا، اور خلافت ہر ایک کے لیے ضروری تھی، اگر (وفات کے لحاظ سے) متاخر کو پہلے خلیفہ بنا دیا جاتا تو (وفات کے لحاظ سے) مقدم خلافت سے رہ جاتا، جبکہ اللہ تعالیٰ کے علم سابق میں اُس کی خلافت ناگزیر تھی، پس اللہ تعالیٰ نے خلافت کو عمروں کی زمانی ترتیب کے مطابق کر دیا تا کہ اُن میں سے کوئی بھی استحقاق کے باوجود تقدم وتأخر کے باعث خلافت سے رہ نہ جائے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس حکمت کو نہ جانا مگر خلفاء کرام رضی اللہ عنہم کے انتقال سے، پس اس بیانِ الٰہی کے باوجود ہوا پرست لوگ اس میدان میں مغز ماری کر رہے ہیں، حالانکہ دو آنکھیں، زبان اور ہونٹ رکھنے والے شخص پر صبح کے اجالے کی طرح معاملہ واضح ہے، ہم خواہش پرستی سے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آتے ہیں''۔

(الفتوحات المكية ج٧ص٤٩٨وط: ج٧ص٤٠٤)

امام شعرانی سے ایک نادرست اضافہ

اس کلام کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں امام شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ذکر کیا ہے، لیکن اُن سے ایک ایسا

اضافہ ہوگیا جسے شیخ اکبر کے کلام سے کوئی تعلق نہیں، اور وہ یہ ہے:

وكان الشيخ محيي الدين ﷺ، يقول: تقديم أبي بكر في الفضل علىٰ عمر قطعي وتقديم عمر علىٰ غيره ظني.

''حضرت شیخ محی الدین رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت ابوبکر ﷺ کی حضرت عمر ﷺ پر تقدیم قطعی ہے اور حضرت عمر ﷺ کی تقدیم دوسروں پر ظنی ہے''۔

(اليواقيت والجواهر ج٢ ص٧٦، وط: ص٤٤٢؛ الكبريت الأحمر بهامش اليواقيت والجواهر ج٢ ص٩، وط: ص٣٥٢، وط: مفردة ص٨٥)

امام شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ شیخ رحمہ اللہ نے ''الفتوحات المكية'' کے باب پانچ سو اٹھاون [۵۵۸] میں اسم الٰہی ''المُعطِي'' کے تحت مذکورہ بالا کلام فرمایا ہے، لیکن ''الفتوحات المكية'' میں یہ ذکر اسم الٰہی ''المُعطِي'' کے تحت نہیں بلکہ اسم الٰہی ''الشافي'' کے تحت ہے اور اس میں قطعی یا ظنی کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ امام شعرانی رحمۃ اللہ علیہ کا مذکورہ جملے کو شیخ کی طرف منسوب کرنا مناسب نہیں، کیونکہ کسی شخص کو یہ حق تو حاصل ہے کہ وہ کسی دوسرے شخص سے اختلاف کرے لیکن یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اس کی طرف وہ بات منسوب کرے جو اُس نے لکھی یا کہی نہ ہو۔

قطعیت وظنیت شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ کا عقیدہ ہی نہیں، چنانچہ انہوں نے مذکورہ بالا گفتگو کی طرح اسم الٰہی ''الآخر'' کے تحت بھی گفتگو فرمائی ہے، اور اُس کے آخر میں اپنا نظریہ یوں بیان کیا ہے:

فما قدم من قدم منهم لكونه أكثر اهلية من المتاخر منهم في نظري، والله أعلم.

''اُن خلفاء میں سے جو پہلے خلیفہ ہوا میری نگاہ میں وہ بعد والے خلیفہ سے زیادہ اہلیت کی وجہ سے مقدم نہیں ہوا، واللہ اعلم''۔

(الفتوحات المكية ج٨ ص٢٤، وط: ج٨ ص٢١)

بادی النظر میں تو یہ بات شاید کسی کو عجیب لگے لیکن درحقیقت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بات فرمانِ نبوی ﷺ کے عین مطابق ہے، اور وہ فرمان آئندہ چند احادیث میں مختلف الفاظ کے ساتھ آرہا ہے۔

اہل بیت میں ولایتِ باطنیہ پر تکوینی شہادت

واقعاتی، عملی اور تکوینی طور پر اس حقیقت کو یوں بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شریعتِ محمدیہ کو آخری شریعت، پھر یہ شریعت جس کتاب پر مبنی ہے اُس کو آخری کتاب، اس شریعت کے نبی کو آخری نبی اور اس کی اُمت کو آخری امت بنایا ہے، اور چونکہ اب قیامت تک کسی اور نبی، کتاب اور شریعت نے نہیں آنا تھا اس لیے قادرِ مطلق نے اِس آخری شریعت کی اور آخری کتاب کی حفاظت اپنے ذمہ لے کر ایک طرف اس کتاب کو حفظ کرنا آسان فرمادیا تو دوسری طرف اس آخری کتاب کی تشریح میں بطور حکمت وسنت جو کلام نازل فرمایا تکوینی طور پر اُس کی حفاظت کا بھی ایسا شاندار بندوبست فرمادیا کہ پچھلی امتوں اور موجودہ دور کے غیر مسلموں میں اس کی قطعاً کوئی مثال نہیں ملتی۔ بتلایئے! تدوینِ حدیث، علم اصولِ حدیث، اسماء الرجال وغیرہا علوم کی مسلمانوں کے علاوہ کہیں اور مثال ملتی ہے؟

قادرِ مطلق ﷻ کی تکوین پر قربان کہ اُس نے اپنے محبوب ﷺ کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کی حفاظت کا اس حد تک تو انتظام فرمایا کہ قرونِ اولیٰ کے کسی مسلمان کو جب کسی شخص سے حدیثِ نبوی ﷺ مل جاتی تو وہ فقط ایک راوی کا واسطہ کم کرنے اور اُس حدیث کی مزید تصدیق کرنے کی خاطر مسلسل کئی کئی ماہ کی مسافت طے کرتا اور پہلے سے حاصل شدہ حدیث کو مطلوبہ شخص سے سن کر اُسی لمحے واپس چلا آتا۔ بتلایئے! کیا گزشتہ امتیں اپنے قوائے جسمانی کے لحاظ سے اِس امت سے کم تھیں؟ ہرگز نہیں! پھر کیا وجہ ہے، اُن میں یہ ولولہ کیوں نہیں تھا؟ اس لیے نہیں تھا کہ مشیت ایزدی کو منظور نہیں تھا۔ یہ اُمت آغاز سے اب تک اپنے نبی کی کتاب اور اُس کی حدیث کی حفاظت پر جو مسلسل جتی ہوئی (کمربستہ) ہے تو یہ محض قادرِ مطلق ﷻ کا امرِ تکوین ہے جو باطن کارفرما ہے۔

قارئین کرام! جس طرح کتاب وسنت کو قیامت تک تکوینی انتظام کے تحت باقی رکھا گیا ہے اسی طرح حوضِ کوثر پر اکٹھے وارد ہونے تک کتاب کے ساتھ اہل بیت کو بھی باقی رکھا گیا ہے۔ اسی لیے ارشاد فرمایا گیا کہ تمام نسب منقطع ہوجائیں گے ماسوا نسب نبوی ﷺ کے۔ اب تک جو اکثر سادات کرام اپنی لختِ جگر کا نکاح کسی غیر سید سے کرنا گوارا نہیں فرماتے، حتیٰ کہ بعض سادات اور علماء کرام اس مناکحت کو حرام تک قرار دیتے ہیں تو آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ فقط یہی کہ اس احتیاط میں مشیتِ الٰہی شامل ہے۔ تسلیم کہ یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے تاہم جو حضرات نکاحِ سیدہ با غیر سید کے جواز کے قائل ہیں ادب وہچکچاہٹ اُن میں بھی پائی جاتی ہے، اور یقیناً اِس ادب واختلاف

میں نسبِ نبوی ﷺ کی بقا کا راز مضمر ہے۔ سو جس طرح ایک طرف ایک طبقہ قرآن کریم حفظ کر کے بھول جاتا ہے تو دوسری طرف اکثر لوگوں کے یاد رکھنے کی وجہ سے قرآن کریم محفوظ بھی ہے۔ اسی طرح اگر ایک طرف کچھ سادات کرام مناکحت میں احتیاط سے کام نہیں لیتے تو دوسری طرف نسبِ نبوی ﷺ کی حفاظت کرنے والے سادات کرام بھی موجود ہیں اور یقیناً اُن ہی کی بدولت قادرِ مطلق ﷻ نے نسبِ نبوی ﷺ کو محفوظ رکھا ہوا ہے۔

"وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ" اور آلِ پاک

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس نسلِ پاک کی اس قدر حفاظت کیوں؟ جواباً عرض ہے: اس لیے کہ کتاب وسنت سے ظاہر سنورتا ہے اور آلِ رسول کی مقدس ارواح کی بدولت باطن سنورتا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح مادی طور پر دو چیزوں کے ملاپ کے بغیر ثمر کا حصول عادتاً ناممکن ہے اسی طرح دو روحوں کے ملاپ کے بغیر عادتاً روحانی ثمر کا حصول بھی ناممکن ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس طرح آلِ رسول ﷺ کی مقدس ارواح سے دوسری ارواح کو فیض ملتا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے ایک مادی حقیقت میں غور کرنا ہوگا، اور وہ یہ کہ جس طرح ایک درخت سے دوسرے درخت کو تاثیر پہنچتی ہے، اسی طرح ایک روح سے دوسری روح کو فیض پہنچتا ہے۔ قدرتی نظام کے تحت نر درختوں سے مادہ درختوں کو ایک اثر پہنچتا ہے تو جو درخت اُس اثر کو قبول کرتا ہے وہی بار آور ہوتا ہے اور جو قبول نہیں کرتا وہ بانجھ رہتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَأَرْسَلْنَا الرِّيَاحَ لَوَاقِحَ.

"اور ہم بھیجتے ہیں ہواؤں کو باردار بنا کر"۔

(الحجر: ۲۲)

اس آیت کی تفسیر کا خلاصہ پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے۔ وہ لکھتے ہیں:

"علماءِ تفسیر نے ہواؤں کو "لواقح" کہنے کی متعدد وجوہ ذکر کی ہیں: یا تو اس لیے ہواؤں کو "لواقح" کہا جاتا ہے کہ یہ بارش کے پانی بادلوں کے مشکیزوں میں اُٹھائے ہوئے آتی ہیں یا اس لیے کہ بادلوں میں یہ اُس رطوبت کو ملاتی ہیں جس سے ان سے بارش برسنے لگتی ہے، یا اس لیے انہیں "لواقح" کہا گیا کہ یہ درختوں کو باردار کرتی ہیں یعنی نر درختوں کے گابھوں کو لے کر مادہ درختوں کے گابھوں میں جا کر ڈالتی ہیں"۔

ثم يبعث اللواقح فتلقح الشجر.

پھر اللہ تعالیٰ لواقح ہواؤں کو بھیجتا ہے جو درختوں کو باردار کرتی ہیں۔ (قرطبی)

(ضیاء القرآن ج۲ ص۵۳۷،۵۳۸)

سو جس طرح "رِیَاح" (ہواؤں) کے ذریعے نباتات باہم فیض رساں اور فیض یاب ہوتے ہیں اسی طرح "ارواح" (روحوں) کی باہمی ملاقات سے ایک روح دوسری روح سے فیضیاب ہوتی ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

إن أرواح المؤمنين لتلتقيان على مسيرة يوم وليلة ومارآى واحد منهما صاحبه.

"اہل ایمان کی روحیں ایک دن اور رات کی مسافت کے باوجود باہم ملاقات کرتی ہیں، حالانکہ اُن میں سے ایک نے دوسرے کو نہیں دیکھا ہوتا"۔

(مسند أحمد ج۲ ص۱۷۵ حدیث۶۶۳۶ وص۲۲۰ حدیث۷۰۴۸؛ الأدب المفرد حدیث۲۶۱؛ الجامع في الحدیث للمصري ص۲۶۸ حدیث۱۸۰؛ کتاب الروح ص۱۳۶؛ شرح الصدور للسیوطي ۹۷)

معلوم ہوا کہ جس طرح "ریـــاح" (ہواؤں) کی بدولت اشجار میں باہم فیض رسانی ہوتی ہے اسی طرح قدرتی امر سے "ارواح" کی ملاقات سے باہم فیض رسانی ہوتی ہے۔ یہاں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا درج ذیل کلام ایک مرتبہ پھر پڑھ لیجئے:

"قطبیت باطنہ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو مخصوص فرما دیتا ہے کہ فیض الٰہی اوّلاً اور بالذات اُس پر نازل ہوتا ہے، پھر اُس سے دوسروں کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اگرچہ بہ ظاہر کوئی ان سے کسب فیض نہ کرے جیسے سورج کی شعاعیں روشن دان کے ذریعے کسی گھر میں پہنچیں تو اولاً وہ روشندان روشن ہوگا اور اس کے واسطے سے گھر کی تمام چیزیں روشن ہوں گی، اس کو قطب ارشاد بھی کہتے ہیں"۔

(فتاوی عزیزي فارسي ص۱۲۹؛ البریلویة کاتحقیقی وتنقیدی جائزہ ص۱۵۱)

اہل بیت میں ''قطبیت'' کا قول سنیت یا...

پیر سائیں غلام رسول قاسمی نے اہل بیت میں قطبیت کے اجراء کو رافضیت اور یہودیت قرار دیا اور کہا کہ:

''ہم نے اسے رافضیانہ حرکت کیوں کہا اور یہودیانہ حرکت کیوں کہا؟ خرد و مطالعہ باید''۔

(ضربِ حیدری ص۱۸۷)

حیرت ہے کہ جو بات کتاب وسنت کے مطابق ہے اُسے پیر سائیں نے رافضیت و یہودیت کہہ ڈالا۔ دیکھئے! اہل بیت سے روحانی تمسک کو یہودیت قرار دینا اس صورت میں درست ہوتا جب خالق کائنات کی طرف سے اعلان ہوتا کہ اب آل محمد ﷺ سے نبوی فیضِ ولایت کسی دوسری قوم کو دے دیا گیا اور اس اعلان کے باوجود کچھ لوگ یہود و نصاریٰ کی طرح حسد کا شکار ہو کر اس ولایت کو اپنی قوم سے باہر تسلیم نہ کرتے تو تب اس قول کو یہودیانہ حرکت کہنا درست ہوتا۔ لیکن جب ''صراط الذین أنعمت علیهم'' کے ساتھ ساتھ ''إني تارک فیکم الثقلین'' کا حکم حوض کوثر پر پہنچنے تک بلا نسخ قائم و دائم ہے اور قرآن و اہل بیت کا تعلق بلا انقطاع تسلسل کے ساتھ جاری و ساری ہے تو پھر اس سلسلے سے مربوط شخص تو کتاب وسنت کا مطیع و متبع ہوا، اُسے یہودی قرار دینا کہاں کی شریعت اور کیسی خردمندی ہے؟

اہل بیت میں قطبیت کا قول رافضیت کیسے؟

اس قول کے قائل کو رافضی کہنا بھی خرد و مطالعہ کے منافی ہے، کیونکہ رافضی لوگوں میں قطبیت وغیرہ کا کوئی تصور نہیں، وہ روحانیت کو اہل بیت میں محصور سمجھتے ہیں، امام زمانہ پر انحصار کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اُن میں پیری مریدی کا بھی کوئی تصور نہیں، جبکہ اہل سنت کے ہاں غیر اہل بیت سے بھی روحانی فیض کا عطا ہونا ایک حقیقتِ مسلّمہ ہے، البتہ اہل سنت کے ہاں روحانیت کا منبع اہل بیت کرام علیہم السلام ہیں جیسا کہ ہم اس پر متعدد صوفیہ اور علماء اہل سنت کی تصریحات پیش کر چکے ہیں، خصوصاً شیخ اکبر، علامہ آلوسی، استاذ بندیالوی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی نقشبندی اور مجدد الف ثانی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہم کی عبارات۔ مؤخر الذکر دو نقشبندی بزرگوں میں سے اول الذکر نے سیدنا علی علیہ السلام کو خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کا بھی قطب لکھا ہے اور مؤخر الذکر نے سیدنا علی علیہ السلام کو اُن کی جسدی پیدائش سے بھی قبل اس مقام پر فائز اور فیض رساں لکھا ہے۔ لہٰذا ایمان سے بتلایئے! جب اہل سنت غیر اہل بیت شخص کو بھی قطب تسلیم کرتے ہیں لیکن قطب الاقطاب ہر دور میں اہل بیت سے تسلیم کرتے ہیں تو پھر یہ رافضی حرکت کیسے ہوئی؟

اہل خرد ومطالعہ بتلائیں کہ اس موقف کی رافضیت سے کہاں مماثلت ہے؟

علمِ باطن کی برکات

مرتضوی علمِ باطن کی بحث میں مناسب ہی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ حصولِ علمِ باطن پر بھی بات ہو جائے، کیونکہ انسان کے اندر اگر علمِ باطن کا کچھ بھی حصہ نہ ہو تو محض ظاہری علم ہلاکت کا سبب بن جاتا ہے، اسی لیے ہمارے صوفیہ کرام رحمۃ اللہ علیہم نے حصولِ علمِ باطن کی تلقین فرمائی ہے۔ چنانچہ سیدی احمد کبیر الرفاعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

يـا بُـنَـيَّ! اجتهـد فـي تـعلّـم علم السر، فإن بركته كثيرة، أكثر مما تظن. يا بُنَيَّ! من تعلم علم العلانية دون علم السر هلك، وهو لا يشعر.

يـا بُـنَـيَّ! إن أردت أن يكرمك الله بعلم فعليك ببغض الدنيا واعرف حرمة الصالحين.

”پیارے بیٹے! علم باطن سیکھنے میں کوشش کر، بیشک اس کی بڑی برکت ہے، اُس سے زیادہ ہے جو تو گمان کرتا ہے۔ پیارے بیٹے! جس شخص نے علم باطن کے بغیر صرف علم ظاہر سیکھا تو وہ ہلاک ہو گیا اور اسے شعور بھی نہ ہوا۔ پیارے بیٹے! اگر تو چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے علم باطن سے سرفراز فرمائے تو تجھ پر لازم ہے کہ دنیا سے محبت نہ کر اور صالحین کی عظمت پہچان“۔

(حالة أهل الحقيقة مع الله، للرفاعي ص ۷۰)

اس عبارت کے پہلے دو جملوں میں علم باطن کے حصول کی تلقین ہے اور تیسرے جملہ میں اس کے حصول کے ابتدائی طریقہ کا ذکر ہے۔

علم باطن کے لیے الگ کوئی Course [نصاب] نہیں ہوتا بلکہ علمِ ظاہر پر عمل کرنے سے بتدریج قلب کو جو روشنی ملتی رہتی ہے وہی علم باطن ہے۔ اس کو یوں سمجھئے کہ جس طرح بتدریج علم ظاہر سے انسان کی معلومات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، اسی طرح اگر علمِ ظاہر پر عمل کیا جائے اور اُسے قلب پر وارد کیا جائے تو جتنا جتنا اس کے قلب پر ورود ہوتا رہتا ہے اتنا ہی قلب کی معلومات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اسی کو حدیث شریف میں یوں بیان فرمایا گیا ہے:

العـلـم علمانِ: علم في القلب فذلك العلم النافع، وعلم على اللسان فذلك

حجة الله علىٰ خلقه.

''علم دو ہیں: ایک علم قلب میں ہوتا ہے، یہی علم نافع ہے، اور دوسرا علم زبان پر ہوتا ہے، یہ علم اللہ تعالیٰ کی اُس کی مخلوق پر حجت ہے''۔

(كتاب الزهد لابن المبارك ص٣٣٢ حديث١١٦١؛ المصنّف لابن أبي شيبة ج١٩ ص٨٨، ٨٩ حديث٣٥٥٠٢؛ نوادر الأصول ج٢ ص٣١؛ مسند الفردوس ج٤ ص٦٨ حديث٤١٩٤؛ جامع بيان العلم وفضله ج١ ص٦٦١، ٦٦٢؛ إحياء علوم الدين ج١ ص٦٠؛ الترغيب والترهيب ج١ ص ٥٨ حديث٤٠، ٤١؛ الجامع الصغير ص٤٢٥ حديث٥٧١٧؛ القول المستحسن ص ٢٧١ ؛ قطب العارفين للّجائي ص١٥٦؛ الإيماء ج١ ص٢٠٥ حديث٥١)

اگر علم زبان اور حلق سے نیچے اتر کر قلب میں پہنچ جائے تو قلب کی دنیا ہی بدل جاتی ہے، اور اگر فقط زبان پر ہی رہ جائے تو اس سے بڑی کوئی مصیبت نہیں۔ علم کا ورود قلب پر کیسے ہوتا ہے؟ اس کو سید احمد رفاعی رحمۃ اللہ علیہ اوپر بیان فرما چکے ہیں ''أعرِف حرمةَ الصالحين'' یعنی اہل اللہ کی تعظیم سے۔ ورنہ کون ہے جس کی نماز روزہ اور تلاوت خوارج سے زیادہ ہو؟ حضور ﷺ نے خود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو فرمایا تھا کہ تم اُن کے مقابلہ میں اپنی نمازوں، روزوں اور تلاوتِ قرآن کو حقیر جانو گے مگر قرآن ''لايجاوز حناجرهم'' (اُن کے حلق سے تجاوز نہیں کرے گا) یعنی دل پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ علم اگر زبان وحلق سے دل کی طرف بڑھنے لگے تو دل کے اندر آنکھیں پیدا ہونے لگتی ہیں اور اُسی روشنی سے پورا بدن فیض یاب ہونے لگتا ہے، مگر یہ دولت محض فرائض سے نہیں بلکہ اس کے لیے کچھ اضافی ضرورت ہوتی ہے، اور نوافل کا معنی ہے ''اضافہ'' اور نفل تمام فرائض کے ہوتے ہیں۔ جس طرح نماز کے نوافل ہیں اسی طرح روزہ، زکاۃ اور حج کے بھی نوافل ہیں، اور ایک حدیث قدسی میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''بندہ فرائض سے بڑھ کر کسی دوسری چیز سے میرا قرب حاصل نہیں کرسکتا، اور جب فرائض کے بعد وہ مسلسل نوافل کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے تو میں اس کو اپنا محبوب بنالیتا ہوں، پھر جب وہ میرا محبوب ہوجاتا ہے تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے، اور اُس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے''۔

(بخاري، حديث٦٥٠٢)

پھر اس کے ساتھ تلاوت و درود کی کثرت کی جائے تو قلب کے روشن ہونے میں سرعت آجاتی ہے اور

ست روی چلی جاتی ہے، اور اُس روشنی کی بدولت سالک پر قرآن کے باطنی علوم اور سر بستہ اسرار و رموز کے دریچے کھلتے چلے جاتے ہیں، چنانچہ امام مناوی مشہور عارف محمد بن داود الدینوری رحمۃ اللہ علیہما متوفی ۳۶۰ھ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

كلام الله إذا أضاء على السرائر بإشراقه زالت البشرية برعوناتها.

"کلامِ الٰہی کی چمک جب باطن پر پڑتی ہے تو اُس سے بشریت تمام جہالتوں سمیت زائل ہو جاتی ہے"۔

(الكواكب الدرية ج۲ ص۱۲۸)

پھر کیا ہوتا ہے؟ اسے حضرت سعید بن سلّام رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۳۷۳ھ نے یوں بیان فرمایا ہے:

للعارف وقت تضيء له أنوار العلم فتبصّره بعجائب الغيب.

"عارف کے لیے ایک وقت ہوتا ہے جس میں اُس پر علم کے انوار روشن ہوتے ہیں تو وہ اُسے عجائباتِ غیب دکھاتے ہیں"۔

(الكواكب الدرية ج۲ ص۱۲۸)

یہ مقام کب اور کیسے آتا ہے؟ اسے سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے یوں بیان فرمایا ہے:

إن اللّٰه تعالىٰ يتجلىٰ للذاكرين عند الذكر، وتلاوة القرآن، ولا يرونه، لأنه أعز من أن يُرى، وأظهر من أن يخفىٰ، فتفردوا بالله سبحانه، واستأنسوا بذكره، وما نزلت بأحد نازلة إلا وفي كتاب الله لها دليل من الهدى والبيان.

"اللہ تعالیٰ ذاکرین پر ذکر اور تلاوتِ قرآن کے وقت جلوہ فرماتا ہے، جسے وہ دیکھ نہیں سکتے، اس لیے کہ وہ دیکھے جانے سے بلند ہے اور مخفی ہونے سے زیادہ ظاہر ہے، لہٰذا تم اللہ ﷻ کے ساتھ یکسو ہو جاؤ، اور اُس کے ذکر کے ساتھ مانوس ہو جاؤ، کسی شخص کو جو بھی معاملہ پیش آئے تو قرآن کریم میں اُس کی راہنمائی اور بیان موجود ہے"۔

(حالة أهل الحقيقة مع الله للرفاعي ص۱۱٤)

یہ تو ہے علم باطن کے حصول کا درجہ بدرجہ ترقی کرنے کا طریقہ، لیکن اگر کسی شخص کو علم باطن کے حصول میں

اس سے بھی زیادہ جلدی ہوتو پھر اُسے چاہیے کہ اہل اللہ کی صحبت حاصل کرے، اس سے وہ سالوں کا سفر دنوں بلکہ لمحوں میں بھی طے کر سکتا ہے۔ مولائے روم نے سالہا سال علم ظاہر میں کھپا دیئے تھے لیکن مقصود ہاتھ نہیں آیا تھا مگر جب کامل کی نظر پڑ گئی تو یکسر دنیا ہی بدل گئی تھی اور اس پر انہیں کہنا پڑا تھا۔

یک زمانہ صحبت با اولیاء

بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

''اہل اللہ کی لمحہ بھر کی صحبت ریا کاری سے پاک سو سال کی عبادت سے بہتر ہے''۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا بیشتر حصہ علم ظاہر کے پڑھنے پڑھانے اور مناظرہ بازی میں گذر گیا مگر وہ کورے کے کورے رہے، اور جب انہیں صوفیہ کرام کی صحبت میسر آئی تو عالم ہی اور ہو گیا، پھر تو انہوں نے اپنی آپ بیتی پر ایسی کتاب لکھی جس کے نام سے ہی اندر کی کہانی سمجھ آجاتی ہے ''المُنقِذُ مِنَ الضَّلال'' (گمراہی سے نکالنے والی) اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ صوفیہ وہ ہیں جن پر براہ راست سینۂ نبوت سے علوم واسرار وا ہوتے ہیں اور اُن پر ایسے انوار وارد ہوتے ہیں جن کے اظہار سے بیان کی زبان عاجز ہے۔ امام غزالی کی یہ عبارت ہم اس سے قبل نقل کر چکے ہیں۔

یک زمانہ صحبتِ با اولیاء اور مقام مرتضٰی

یقیناً اس تفصیل سے آپ پر علم باطن کی اہمیت اور صحبتِ صلحاء کی افادیت واضح ہو چکی ہوگی، اب اس کی روشنی میں اُس ہستی کے علم باطن کا اندازہ فرمایئے جس کی آنکھ ہی اُس گھر میں کھلی جہاں قرآن کا نزول ہوا، جس کو صحبت، تربیت، شفقت، محبت اور مودت اُس ہستی کی میسر آئی جس ہستی سے بڑی ہستی خدا نے پیدا ہی نہیں فرمائی۔ جب صحبتِ اولیاء کے ایک لمحہ کی یہ تاثیر ہے تو جس کو علی الاطلاق تمام کے تمام صحابہ کرام ﷺ سے صحبتِ نبوی کے لمحات زیادہ حاصل ہوئے اُس کے مقام کا کوئی کیا اندازہ کر سکتا ہے؟ جی ہاں، وہ اس سعادت کی بدولت اَصْحَب، اَعْلَم، اَعْرَف، اَفْقَہ، اَقْضیٰ، اَشْجَع، اَزْھَد، اَحَبّ اور مولیٰ المؤمنین قرار پائے، اور انہیں جس قدر زیادہ صحبت حاصل ہوئی اسی قدر اُن کا باطن زیادہ روشن ہوا۔ اسی لیے سیدنا ابن مسعود ﷺ کو نام لے کر فرمانا پڑا کہ علی کے پاس قرآن کا علم ظاہر اور باطن دونوں ہیں۔ ابن مسعود وہ عظیم قرآن دان صحابی ہیں کہ انہوں نے جب دعویٰ کیا کہ ان سے زیادہ قرآن دان اور کوئی نہیں ہے تو کسی صحابی نے ان کے دعویٰ کی تردید نہ کی مگر دوسری طرف

وہ حضور ﷺ کے اولین صحابی اور اولین شاگرد اور اپنے استاذ سیدنا علی المرتضیٰ ؓ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اُن کے پاس قرآن کا باطنی علم بھی ہے۔

قرآن کا باطنی علم اور مرتضوی کرامت

اس سے قبل آپ پڑھ چکے ہیں کہ جو بھی چیز کائنات میں ہے اُس کا ذکر یا ثبوت قرآن کریم میں موجود ہے، اور اہل فہم ہر چیز کی دلیل قرآن سے حاصل کر سکتے ہیں، اور انہیں ہر پیش آمدہ مشکل یا واقعہ کی قرآن کریم سے راہنمائی مل جاتی ہے۔ اس تفصیل کو مدنظر رکھتے ہوئے درج ذیل واقعہ میں غور فرمائیے اور "علي مع القرآن والقرآن مع علي" اور "إن علي بن أبي طالب عنده منه علم الظاهر والباطن" کی صداقت ملاحظہ فرمائیے۔ ابو سالم کمال الدین محمد بن طلحہ القرشی العدوی اور قدوۃ الصوفیہ ملا عبد الرحمان جامی رحمۃ اللہ علیہما لکھتے ہیں:

"جب سیدنا علی المرتضیٰ ؓ کوفہ تشریف لائے تو اُن کی خدمت میں ایک وفد آیا جن میں ایک نوجوان بھی تھا، وہ آپ کی جماعت میں شامل ہو گیا، تمام جنگوں میں حصہ لیتا تھا۔ پھر عرب قوم کی ایک عورت جس نے کوفہ میں سکونت اختیار کر لی تھی، اُس نے نکاح کی پیش کش کی تو نوجوان کے سربراہوں نے وہ پیش کش قبول کر لی اور شادی ہو گئی۔ پھر ایک روز سیدنا علی ؓ نے نماز فجر پڑھائی تو بعض حاضرین کو فرمایا: تم فلاں محلہ میں جاؤ وہاں ایک مسجد ہے اور اس کے پہلو میں ایک گھر ہے، تمہیں وہاں سے ایک مرد اور عورت کے جھگڑنے کا شور سنائی دے گا، انہیں کہو کہ تمہیں امیر المومنین طلب کر رہے ہیں اور اُنہیں فوراً یہاں لاؤ۔ وہ شخص وہاں پہنچا تو بعینہٖ وہی حالت پائی، یہاں تک کہ واپس آیا تو اُس کے ساتھ وہ نوجوان اور اُس کی عورت تھی۔ سیدنا علی المرتضیٰ ؓ نے فرمایا: کیا وجہ ہوئی کہ آج شب تم نے بڑا لمبا جھگڑا کیا؟ نوجوان نے عرض کیا: یا امیر المومنین! میں نے اس عورت کے ساتھ نکاح کیا، پھر رخصتی ہوئی، پھر جب میں نے آج شب خلوت کرنا چاہی تو میرے دل میں اس کے متعلق نفرت پیدا ہو گئی جس نے مجھے اس کے قرب سے روک لیا، اور اگر ہو سکتا تو میں دن کی آمد سے قبل رات کے اندھیرے میں اس کو گھر سے نکال دیتا، پس ہم ابھی جھگڑے میں مشغول تھے کہ آپ کا حکم آیا تو ہم آپ کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے۔ اس پر سیدنا علی المرتضیٰ ؓ نے حاضرین سے فرمایا: بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں

جو مخاطب کے علاوہ دوسرے شخص کو نہیں سنانا ہوتیں، اس پر اُس نوجوان و عورت کے علاوہ سب اٹھ کر چلے گئے۔ پھر اُس نوجوان نے بیان کیا کہ سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ نے اُس عورت سے پوچھا: کیا تم اس نوجوان کو جانتی ہو؟ اُس نے عرض کیا: نہیں۔ فرمایا: ہم تمہیں ایسی بات بتلاتے ہیں جسے تم جانتی ہو لیکن انکار نہ کرنا۔ اُس نے عرض کیا: ٹھیک ہے۔ فرمایا: کیا تم فلانہ بنت فلاں نہیں ہو؟ کہنے لگی: کیوں نہیں۔ فرمایا: کیا تیرا ایک چچازاد نہیں تھا اور تم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے نہیں تھے؟ کہنے لگی: کیوں نہیں۔ فرمایا: کیا تیرے باپ نے تجھے اُس سے اور اُس کو تجھ سے ملنے سے روک نہیں دیا تھا، اور تجھے اُس کے نکاح میں دینے سے انکار کر دیا تھا، اور اُسے اپنے پڑوس سے بھی خارج کر دیا تھا؟ کہنے لگی: کیوں نہیں۔ فرمایا: کیا تم ایک شب قضائے حاجت کے لیے نہیں نکلی تھی کہ اُس نے تجھے بہلایا، مجبور کیا اور اپنا مطلب نکالا، جس پر تو حاملہ ہوگئی، پھر تو اس معاملہ کو اپنے باپ سے چھپاتی رہی اور اپنی ماں کو بتا دیا، پھر جب بچہ پیدا ہونے کا وقت آیا تو تیری ماں نے تجھے رات کے وقت نکالا تو تم نے ایک بچے کو جنم دیا، پھر اُسے کپڑے میں لپیٹ کر دیوار کے باہر اُس مقام پر پھینکا جہاں قضائے حاجت کی جاتی تھی، پھر ایک کتا آ کر سونگھنے لگا تو تیرے دل میں خدشہ پیدا ہوا کہ وہ کہیں اُسے کھا نہ جائے، تو تو نے ایک پتھر پھینکا تو وہ کتے کی بجائے اُس بچے کے جا لگا اور اُسے زخمی کر دیا، پھر تو اور تیری ماں نے جا کر اُس کے سر کو کپڑے سے باندھ دیا، پھر تم نے اسے اُس کے حال پر چھوڑ دیا اور تم نہیں جانتیں کہ اُس کا کیا حال ہوا؟ پھر فرمایا: بولو کیا یہ سچ ہے؟ کہنے لگی: امیر المومنین بخدا یہ سچ ہے اور اس کو میری امی اور میرے سوا کوئی نہیں جانتا۔ فرمایا: بیشک اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے باخبر کیا ہے، چنانچہ جب صبح ہوئی تھی تو بنو فلاں نے اسے اٹھا لیا تھا اور وہ اُن کے ہاں تربیت پاتا رہا یہاں تک کہ بڑا ہو گیا اور اُن کے ساتھ کوفہ آیا اور تو نے اُس کے ساتھ نکاح کر لیا حالانکہ وہ تیرا بیٹا ہے۔ پھر سیدنا علی ﷺ نے نوجوان کو فرمایا: اپنے سر سے پگڑی ہٹاؤ! اُس نے پگڑی اتاری تو اُس کے سر میں زخم کا داغ تھا۔ فرمایا: یہ تمہارا بیٹا ہے، اللہ تعالیٰ نے اِس کو اُس فعل سے محفوظ رکھا جو اس پر حرام ہے، اٹھو اپنے بیٹے کو گھر لیجاؤ! تمہارے درمیان کوئی نکاح نہیں ہوا''۔

(مطالب السؤول للعدوي ج۱ ص۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵؛ شواهد النبوة للجامي ص ۲۸۱)

علم باطن پر ایسے حقائق وواقعات کا احاطہ کرنا دشوار ہے۔ جب باطنی آنکھ وا ہو تو پھر اہل اللہ پر پوری کائنات ہی روشن وعیاں ہو جاتی ہے۔ اسی لیے سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کے ایک فرزندار جمند نے ارشاد فرمایا تھا:

نظرتُ إلىٰ بلادِ اللّٰه جمعاً

كخردلةٍ علىٰ حكم اتِّصالِ

''میں نے اللہ تعالیٰ کے تمام ملکوں کو یوں دیکھا جیسا کہ رائی کا دانہ ہتھیلی پر''۔

(قصيدة غوثية ملحق بسيرت غوث الثقلين لضياء اللّٰه قادري ص ۲۲۸)

جب صدیوں بعد فرزندِ مرتضیٰ، ابوصالح اورام الخیر فاطمہ کا تربیت یافتہ اور مصطفیٰ ومرتضیٰ صلوات اللہ وسلامہ علیہم کے لعاب سے فیض یافتہ کے عرفان کا یہ عالم ہے تو امام الانبیاء والمرسلین ﷺ کے تربیت یافتہ، لعاب یافتہ، دست یافتہ، دعا یافتہ اور فیض یافتہ کی عظمت کا عالم کوئی بیان کرے تو کیسے؟

سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ اور اہلیتِ خلافتِ اولیٰ

﴿۳۸﴾ قرىء على الشيخ أبي علي بن هبل الصالحي بجامع دمشق، وأنا أسمع عن أبي الحسن بن البخاري، قال: أخبرنا أحمد بن محمد القاضي في كتابه، أخبرنا أبو علي الحداد، أخبرنا أحمد بن عبد اللّٰه الحافظ، حدثنا سليمان بن أحمد، أخبرنا عبد اللّٰه بن وهيب، أخبرنا عن محمد ابن أبي السري، أخبرنا عبد الرزاق، أخبرنا نعمان بن أبي شيبة الجندي، عن سفيان الثوري، عن أبي إسحاق، عن زيد بن يثيع، عن حذيفة، قال:

قال رسول اللّٰه ﷺ: إن تستخلفوا علياً وما أراكم فاعلين تجدوه هادياً مهدياً يحملكم على المحجة البيضاء.

حديث حسن الإسناد، رجاله موثقون. وقد رواه أيضاً إبراهيم بن هراسة عن الثوري به.

﴿۳۸﴾ حضرت حذیفہ ﷺ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر تم علی کو خلیفہ بناؤ گے، اور میں نہیں سمجھتا کہ تم ایسا کرو گے، تو تم اس کو ہدایت دینے والا، ہدایت یافتہ پاؤ گے، وہ تمہیں روشن سیدھی راہ پر چلائے گا۔

اس حدیث کی سند حسن ہے، اس کے راویوں کی توثیق کی گئی ہے، اور اس کو ابراہیم بن ہراسہ نے بھی ثوری سے روایت کیا ہے۔

(حلية الأولياء ج١ ص٦٤ ؛ ١٠٤ ، وط: ج١ ص٦٤ ؛ تقريب البغية ج٣ ص١٠٣ حديث٣٣٠٧ ؛ جمع الجوامع ج١١ ص١٠٧ حديث٤٣٨ ؛ مسند الأصفهاني ج٢ ص٥٥٩ حديث٣٤٦٧)

اس حدیث میں یہ حقیقت واضح ہے کہ سیدنا علی المرتضیٰؓ کی ذات بابرکات میں خلافتِ ظاہری بلافصل کی اہلیت بھی بدرجۂ اتم موجود تھی۔ اگر کہا جائے کہ بلافصل کا مفہوم کہاں سے لے لیا گیا؟ تو جواباً عرض ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرما دیا: ''میں نہیں سمجھتا کہ تم ایسا کروگے'' یہ اولیت کی طرف اشارہ ہے ورنہ بعد میں تو (بشمول حضرات طلحہ، زبیر بن عوام اور ام المومنین سیدتنا عائشہ صدیقہؓ) تمام اربابِ عقد وحل سیدنا علی المرتضیٰؓ کی خلافت پر متفق تھے، ماسوا بعض طلقاء اور تنافس دنیوی میں مبتلا لوگوں کے۔ نیز دوسری احادیث میں ہے کہ صحابہ کرامؓ نے واضح سوال کیا کہ وہ حضور ﷺ کے بعد کس کو خلیفہ بنائیں؟ یہ سوال نہیں کیا کہ حضرت ابوبکر صدیق یا عمرؓ کے بعد کس کو خلیفہ بنائیں۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل حضرت زید بن یثیع کی روایت سے سیدنا علیؓ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں عرض کیا گیا:

يارسول الله! من نؤمر بعدك؟ قال: إن تؤمروا أبابكر تجدوه أميناً زاهداً في الدنيا راغباً في الأخرة، وإن تؤمروا عمر تجدوه قوياً أميناً، لايخاف في الله لومة لائم، وإن تؤمروا علياً، ولا أراكم فاعلين، تجدوه هادياً مهدياً، يأخذ بكم الطريق المستقيم.

''یارسول اللہ! ہم آپ کے بعد کس کو امیر بنائیں؟ فرمایا اگر تم ابوبکرؓ کو امیر بناؤ گے تو انہیں امین، دنیا سے کنارہ کش اور آخرت میں رغبت کرنے والا پاؤ گے، اور اگر تم عمرؓ کو امیر بناؤ گے تو انہیں قوی، امین اور اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت گر کی ملامت کی پرواہ نہ کرنے والا پاؤ گے، اور اگر تم علیؓ کو امیر بناؤ گے، اور میں گمان کرتا ہوں کہ تم ایسا نہیں کروگے، تو انہیں ہدایت دینے والا اور ہدایت یافتہ پاؤ گے، وہ تم کو صراطِ مستقیم پر لے کر چلے گا''۔

(مسند أحمد ج١ ص١٠٩ حديث٨٥٩، وط: ج٢ ص٢١٤ حديث٨٥٩، وط: ج١ ص٥٣٧ حديث ٨٥٩ ؛ فضائل الصحابة للإمام أحمد ج١ ص٢٨٤ حديث٢٨٤ ؛ السنة لعبد الله بن أحمد ص٢١٨

حديث۱۱۸٦؛وط: ج۲ص٥٣٦حديث۱۲٥۷؛مسند البزار ج۳ص۳۳حديث۷۸۳؛المستدرك للحاكم ج۳ص٦۹حديث٤٤۹۱؛معرفة علوم الحديث للحاكم ص۲۹؛المعجم الأوسط ج۳ ص۳٤۱حديث۲۸٦٦؛أسد الغابة ج٤ص۲۱؛الإصابة ج٤ص٤٦۸؛مشكاة ج۲ص٥۱۰حديث ٦۱۳۳؛كشف الأستار ج۲ص۲٥٥؛تاريخ دمشق ج٤۲ص٤۱۹،٤۲۰،٤۲۱؛مختصر تاريخ دمشق ج۱۸ص۳۲؛البداية والنهاية ج٥ص٤۷۷؛الشرف المؤبد لآل محمد للنبهاني ص٥۸)

صحابہ کرام ﷺ کے سوال میں یہ نہیں کہ ہم آپ کے بعد کس کس کو خلیفہ بنائیں بلکہ اُنہوں نے مطلقاً سوال کیا اور حضور ﷺ نے اُن کے مطلق سوال کا جواب دیا۔اس سوال وجواب اور خصوصاً سیدنا علی ﷺ کے حق میں حضور ﷺ کے الفاظ ”ولا أراكم فاعلين“ (میں تمہیں ایسا کرنے والا نہیں دیکھتا) سے صاف عیاں ہے کہ اس سے سیدنا علی ﷺ کی خلافتِ بلافصل کی اہلیت مراد ہے۔

مدنظر کیا تھا،افضلیت یا نظام؟

اس حدیث شریف میں سیدنا ابوبکر صدیق،فاروقِ اعظم اور مولیٰ علی ﷺ کے لیے جو الفاظِ نبوی ﷺ آئے ہیں اگر اُن کی معنویت میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حضور ﷺ نے جس کے حق میں جو جو الفاظ استعمال فرمائے اُس میں اِس بات کی پوری ضمانت موجود ہے کہ ان میں سے جس کو بھی خلیفہ بنایا جائے گا تو یقیناً وہ منہاجِ نبوت کے مطابق نظام کو چلائے گا،اور اگر مزید غور کیا جائے تو مولیٰ علی ﷺ کے حق میں جو الفاظ آئے ہیں اُن میں زیادہ وزن ہے۔بہر حال اس سے شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کی تائید ہوتی ہے کہ جو شخص پہلے خلیفہ ہوا وہ اپنی افضلیت کے باعث نہیں ہوا بلکہ خلافت کی اہلیت ہر خلیفہ کے دور میں اُس شخص میں بھی موجود تھی جو بعد میں خلیفہ ہوا۔راقم الحروف عرض کرتا ہے: بلکہ کتبِ احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفاء اربعہ ﷺ کے علاوہ بھی ایسے حضرات موجود تھے جن میں منہاجِ نبوت پر نظام چلانے کی مکمل صلاحیت موجود تھی۔اس پر چونکہ اٹھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے،اس لیے کہ میرے اور آپ کے نبی کریم ﷺ کی زبانِ اقدس سے یہ الفاظ صادر ہوئے:

لو استخلفت أحداً من غير مشورة لاستخلفت ابن أم عبد.

”اگر میں کسی کو بغیر مشورہ کے خلیفہ بناتا تو ابن مسعود ﷺ کو بناتا“۔

(فضائل الصحابة ج۲ص۱۰٥۹؛جامع الترمذي ص۸٦۳حديث۳۸۰۸،۳۸۰۹؛سنن ابن ماجه

ج۱ ص۹۲ حدیث۱۳۷؛ المستدرک ج۳ ص۳۱۸ حدیث ۵۴۴۰)

ایسا اظہارِ خیال ام المومنین سیدتنا عائشہ صدیقہ سے حضرت ابوعبیدہ بن الجراح اور حضرت زید بن حارثہ ؓ کے حق میں منقول ہے اور فاروقِ اعظم ؓ سے متعدد صحابہ کرام ؓ کے حق میں منقول ہے۔ اس لیے یہ سمجھنا درست نہیں کہ جو خلیفہ ہوا وہی کثرتِ ثواب وغیرہ تمام صورتوں میں سب سے افضل ہے۔ نہیں، بلکہ فضائل و مناقب اور عند اللہ کثرتِ ثواب الگ چیز ہے اور کسی میں کتاب و سنت کے مطابق نظام کو چلانے کی صلاحیت کا ہونا الگ چیز ہے۔

خلافتِ مرتضوی اور تمنائے فاروقی ؓ

جس طرح زیرِ بحث حدیث میں نبی کریم ﷺ کے مقدس ارشاد سے سیدنا علی المرتضیٰ ؓ کے اندر خلافت کی مکمل صلاحیت و اہلیت بیان فرمائی گئی ہے، ایسے ہی محدّثِ امت، لسانِ حق فاروقِ اعظم ؓ بھی سیدنا علی المرتضیٰ ؓ کو خلافت کے لیے موزوں ترین سمجھتے تھے مگر وہ مشورہ کے بغیر کچھ کرنے سے اجتناب فرماتے تھے۔ متعدد مرتبہ اُن کی زبان سے سیدنا علی المرتضیٰ ؓ کی خلافت کی موزونیت کے بارے میں الفاظ صادر ہوئے مگر وہ حکم صادر کرنے سے گریزاں رہے۔ چنانچہ سیدنا ابن عباس ؓ سے ایک حدیث کے آخر میں ہے کہ ایک مرتبہ سیدنا فاروق اعظم ؓ نے سرد آہ بھری تو میں نے عرض کیا:

والله ما أخرجَ هذا منك إلاّ هَمٌّ يا أمير المؤمنين. قال: هَمٌّ شديدٌ، هذا الأمرُ لو أجدُ له مَوضعاً، يعني الخلافة. ثم قال: لعلك تقول: إن صاحبك لها، يعني علياً. قال: قلتُ: يا امير المؤمنين، أليس هو أهلُها في هجرته، وأهلُها في صُحبته، وأهلُها في قرابته؟ قال: هو كما ذكرتَ، ولكن رجلٌ فيه دُعابةٌ.

''امیر المومنین! آپ نے یہ سرد آہ ضرور کسی خاص فکر کی وجہ سے بھری ہے۔ فرمایا: ہاں، شدید فکر ہے۔ کاش! میں اِس معاملہ یعنی خلافت کے لیے کوئی موزوں شخص پاتا۔ پھر فرمایا: شاید تم کہو گے کہ تمہارے صاحب اس کے اہل ہیں۔ میں نے عرض کیا: امیر المومنین! کیا وہ مہاجر ہونے کے حوالہ سے اس کے اہل نہیں، اور کیا وہ اپنی صحابیت کے حوالے سے اس کے اہل نہیں اور کیا وہ قرابت داری کی وجہ سے اس کے اہل نہیں؟ فرمایا: وہ اسی طرح ہی ہیں جیسا کہ آپ نے

ذکر کیا لیکن وہ ایسے شخص ہیں جن میں دعابة ہے"۔

(مختصر تاريخ دمشق ج١٩ ص٤٥؛ الاستيعاب ج٢ ص٥٩، وط: ج٣ ص٢١٥؛ جمع الجوامع ج ١١ ص٢٩٧، وط: ج١٦ ص٣٤٧ حديث ٢٩١٣؛ كنز العمال ج٥ ص٣٣٧ حديث ١٤٢٦٢؛ القول المستحسن للتركماني ص٣٢٣)

بعض مقامات پر ابن عباس ﷺ سے یہ الفاظ آئے ہیں:

إنه لأهل ذلك في سابقته وفضله.

"بیشک وہ اپنی سبقت اور فضیلت میں اس بات کے اہل ہیں"۔

اس پر سیدنا فاروق اعظم ﷺ نے فرمایا:

إنه لكما قلت، ولكنه امرؤ فيه دعابة.

"بیشک جیسا آپ نے کہا وہ اسی طرح ہیں، لیکن وہ ایسے شخص ہیں جن میں دُعابۃ ہے"۔

(جمع الجوامع ج١١ ص٢٩٦)

دعابة کا معنی اور مرتضوی خلافت

دعابة: فاروق اعظم ﷺ کی زبان مبارک پر سیدنا علی ﷺ کے بارے میں یہ لفظ آیا، اس لفظ کا معروف معنی مزاح ہے، اور ہر چند کہ سیدنا علی المرتضی ﷺ کی شخصیت ہر لحاظ سے کامل تھی لیکن اُن پر یہ معنی صادق نہیں آتا اس لیے کہ اُن کے مزاج میں اس قدر مزاح نہیں تھا جو اُن کے لیے عیب ثابت ہو۔ اس لفظ کا ایک معنی: الغلام الشاب البض" (موٹا تازہ باریک جلد والا نوجوان لڑکا) بھی ہے، لیکن یہ معنی بھی سیدنا علی ﷺ پر مکمل صادق نہیں آتا، اس لیے کہ اگر یہ بات فاروق اعظم ﷺ کی خلافت کے آخری ایام میں کہی گئی ہو تو اُس وقت سیدنا علی ﷺ کی عمر مبارک تقریباً چھیالیس برس تھی، اور ہر چند کہ عرب معاشرہ اور ایک عرصہ قبل ہمارے معاشرہ میں بھی ایسی عمر پر نوجوانی کا اطلاق ہوتا تھا مگر نقلاً سیدنا علی ﷺ پر یہ معنی بھی صادق نہیں آتا، اس لیے کہ نبی کریم ﷺ اس سے قبل اُن کے ذمہ اہم امور سپرد فرما چکے تھے اور وہ تمام امور سے عہدہ برآ ہوئے تھے، البتہ اس لفظ کا ایک معنی "الدفع" (دور کرنا، ہٹانا) بھی ہے۔

(لسان العرب ج٤ ص٣٥٠)

یہی معنی سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ پر مکمل طور پر صادق آتا ہے، اس لیے کہ وہ "أخشن في سبيل الله" (راہِ الٰہی میں سب سے زیادہ غضبناک تھے) وہ کرار غیر فرار تھے، باطل کو دفع کر کے دم لیتے تھے، دوسروں سے جو معرکہ سر نہ ہوتا وہ اسے سر فرما لیتے جیسا کہ غزوۂ خیبر وغیرہ کے احوال سے ظاہر ہے۔

اللہُ أکبر! غزوۂ خندق میں تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی "دعابة" (سختی) نے سب کو حیرت میں ڈال دیا، چنانچہ سیرت نگار حضرات لکھتے ہیں:

"جب عمرو بن عبدود خندق کی ایک تنگ جگہ کو عبور کر کے مسلمانوں کے قریب پہنچ کر للکارنے لگا تو سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس موقعہ پر خاموش رہے، بولے تو فقط حیدر کرّار غیر فرار ہی بولے، انہوں نے بارگاہِ رسالت میں عرض کیا: "أنا له يا رسول الله (یا رسول اللہ! اس کے لیے میں کافی ہوں) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اجلس إنه عمرو" (بیٹھ جاؤ! وہ عمرو ہے) اُس نے دوسری بار للکارا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر اُسی طرح عرض کیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی پہلے کی طرح فرمایا: بیٹھ جاؤ! عام بات نہیں، سامنے عمرو بن عبدود ہے۔ اُس نے پھر تیسری بار للکارا اور اپنی بہادری پر چند اشعار بھی پڑھ ڈالے تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ پھر تیسری مرتبہ کھڑے ہو کر عرض کرنے لگے: "أنا له يا رسول الله (یا رسول اللہ! اس کے لیے میں ہی ہوں) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "إنه عمرو" (یعنی دیکھ لو، وہ عمرو ہے!) عرض کیا "وإن كان عمروًا" (اگرچہ وہ عمرو ہی ہے)۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ اشعار پڑھتے ہوئے گئے اور ایک زوردار مکالمہ کے بعد اُسے فی النار کر دیا"۔

(عيون الأثر ج٢ ص٩٣؛ كتاب المغازي للواقدي ج٢ ص ٤٧٠، ٤٧١؛ الإكتفاء للكلاعي ج ٢ ص ١٢٥؛ تاريخ الخميس ج٢ ص٣٠٤، ٣٠٥؛ شرح الزرقاني على المواهب ج٣ ص٤٢)

ممکن ہے کہ کسی شخص کو میرا یہ لکھنا "سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس موقعہ پر خاموش رہے" برا لگا ہو تو میں اپنے الفاظ کو واپس لیتا ہوں اور بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے الفاظ ہی نقل کر دیتا ہوں۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ خلیفۂ ثانی امیر المؤمنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا:

جاء عمرو بن عبدوُد، فجعل يجول على فرسه، حتى جاوز الخندق وجعل يقول: هل من مبارز؟ وسكت أصحاب محمد ﷺ، ثم قال رسول الله ﷺ:

هل يبارزه أحد؟ فقام علي، فقال: أنا يارسول الله! فقال رسول الله ﷺ: هل يبارزه أحد؟ فقال علي: دعني يارسول الله! فإنما أنا بين حُسنيين: إما أن أقتله فيدخل النار، وإما أن يقتلني فأدخل الجنة، فقال رسول الله ﷺ: اخرج ياعلي.

''عمر بن عبد وُدّ آکر اپنے گھوڑے کو گھمانے لگا حتیٰ کہ خندق کو پھلانگ گیا اور کہنے لگا: ہے کوئی مقابلہ کے لیے آنے والا؟ اصحاب محمد ﷺ خاموش رہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہے کوئی اُس کا مدمقابل؟ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں ہوں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے دوبارہ فرمایا: ہے کوئی اُس کا مدمقابل؟ تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے اجازت دیں میں دو بھلائیوں کے درمیان ہوں گا: یا تو میں اُسے قتل کروں گا تو وہ جہنم رسید ہوگا یا وہ مجھے قتل کرے گا تو میں جنت میں داخل ہوں گا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے علی! میدان میں چلے جاؤ''۔

(جمع الجوامع ج١٦ ص١٦٥، ١٦٦ حديث ١٢٥٤٤؛ كنز العمال ج١٠ ص٤٥٦، ٤٥٧ حديث ٣٠١٠٦)

بعض روایات میں ہے:

وإنّ المسلمين يومئذٍ كأنّ على رؤوسهم الطّير، لمكان عمرو وشجاعته.

''مسلمان اُس دن عمر بن عبد ود کی شجاعت کی وجہ سے یوں دم بخود تھے گویا کہ اُن کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں''۔

(كتاب المغازي للواقدي ج٢ ص٤٧٠، ٤٧١)

علامہ دیار بکری لکھتے ہیں:

لأنهم كانوا يعلمون شجاعته.

''اس لیے کہ وہ اُس کی شجاعت کو جانتے تھے''۔

(تاريخ الخميس ج٢ ص٣٠٤)

معلوم ہوا کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مقابلہ میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اندر یہ دینی سختی سب سے زیادہ تھی جسے

حضرت عمر ﷺ نے "دعــابة" سے تعبیر فرمایا ہے۔ اسی سختی کی تائید نبی کریم ﷺ سے ایک اور حدیث میں بھی ثابت ہے۔ چنانچہ محدثین کرام لکھتے ہیں:

"ایک مرتبہ ایک نمازی کو حالتِ نماز میں قتل کرنے پر حکمِ نبوی ﷺ ہوا تو شیخین کریمین رضی اللہ عنہما اسے نماز میں دیکھ کر قتل کرنے سے باز رہے، سیدنا علی ﷺ نے عرض کیا: یہ کام میں کر کے آتا ہوں۔ نبی کریم ﷺ نے اُن کے دعویٰ کی تصدیق فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: "أنــــت إن أدركته" ہاں تم یہ کر سکتے ہو مگر یہ کہ وہ وہاں موجود ہو، اور وہ شخص جا چکا تھا"۔

(مسند أبي يعلى ج١ ص٥٩ حديث ٨٥ وج٢ ص٣٣٧ حديث ٢٢١٢ ،وط: ج١ ص٩٠، ٩١ حديث ٩٠، وج٧ ص١٦٨ حديث ٤١٤٣؛ مجمع الزوائد ج٦ ص٢٢٦ ،وط: ج٦ ص٣٣٦ حديث ١٠٤٠١ وص٣٣٨ حديث ١٠٤٠٣؛ المطالب العالية ج٤ ص٣٢٠، ٣٢١ حديث ٤٥٠٦، ٤٥٠٧، وط: ج ١٨ ص٢٢١ حديث ٤٤٤١، وص٢٢٦ حديث ٤٤٤٢؛ الباهر في حكم النبي ﷺ في الباطن والظاهر للسيوطي ص٤٣ ومابعدها)

حق کی حمایت اور باطل کو دفع کرنے کا یہ عزم و جرأت یا تو مرتضوی جبلت میں تھی یا پھر بچپن میں آغوشِ نبوی ﷺ میسر آنے کی برکت تھی۔ میں کہتا ہوں: دونوں باتیں جمع تھیں، یہی وجہ ہے کہ اعلانِ نبوت کے ابتدائی ایام میں جب نبی کریم ﷺ نے بنو عبد المطلب کو اسلام کی دعوت دی اور مشنِ نبوی کی تکمیل کے لیے اُن سے حمایت و نصرت چاہی تو مجلس میں سے کسی شخص نے بھی اس دعوت کو قبول نہ کیا، ماسوا ذاتِ مرتضوی کے، انہوں نے عرض کیا: میں آپ کا ساتھ دوں گا، حالانکہ اُس وقت اُن کی عمر فقط دس برس کی تھی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس دعویٰ کو محض بچپنے کا آوازہ نہیں سمجھا تھا بلکہ حقیقت سمجھا تھا اور اُن کے ہاتھ پر دستِ اقدس رکھتے ہوئے فرمایا تھا: ہاں، اے علي تم۔ پھر اس وعدہ کو انہوں نے اس شان سے نبھایا کہ حمایتِ اسلام میں ہر مشکل گھڑی میں وہ سب سے آگے رہے اور باطل پرستوں کا قلع قمع فرماتے رہے۔ سو اسی سختی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے سیدنا فاروقِ اعظم ﷺ نے فرمایا تھا "فيــه دعابة" (اُن میں دعابہ یعنی سختی ہے) اس سے فاروقِ اعظم ﷺ کا مطلب یہ تھا کہ چونکہ اُن کے ہاتھوں بڑے بڑے کفار مارے گئے اس لیے ممکن ہے کہ کچھ لوگ اُن کی خلافت پر جمع نہ ہوں۔ اس کی تائید سیدنا زید بن علی عليه وعلىٰ آبائه السلام کے اُس کلام سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے سیدنا علی ﷺ کی افضلیت کے ضمن میں بیان فرمایا ہے۔ علامہ ابو الفتح عبد الکریم شہرستانی نے اور علامہ ابو زہرہ نے اُن کا مذہب

نقل کیا ہے، اگر آپ اُس میں غور فرمائیں تو اُس میں آپ کو سیدنا علی ﷺ کی "دعـابة" (سختی) سمجھ آ جائے گی، وہ لکھتے ہیں:

وکان من مذهبه جواز إمامة المفضول مع قيام الأفضل. فقال: كان علي بن أبي طالب ﷺ أفضل الصحابة، إلا أن الخلافة فوضت إلى أبي بكر لمصلحة رأوها، وقاعدة دينية راعوها، من تسكين نائرة الفتنة، وتطييب قلوب العامة. فإن عهد الحروب التي جرت في أيام النبوة كان قريباً، وسيف أمير المؤمنين عليّ عن دماء المشركين من قريش وغيرهم لم يجفّ بعد، والضغائن في صدور القوم من طلب الثأر كما هي. فما كانت القلوب تميل إليه كل الميل، ولا تنقاد له الرقاب كل الانقياد. فكانت المصلحة أن يكون القائم بهذا الشأن مَن عرفوه باللين، والتؤدة، والتقدم بالسن، والسبق في الإسلام، والقرب من رسول الله ﷺ.

"سیدنا زید بن علی ﷺ کے مذہب میں افضل کی موجودگی میں مفضول کی خلافت جائز تھی، چنانچہ وہ فرماتے تھے: سیدنا علی بن ابی طالب ﷺ تمام صحابہ کرام ﷺ سے افضل تھے مگر مصلحت کی خاطر اور ایک دینی قاعدہ کی رعایت کرتے ہوئے خلافت سیدنا ابوبکر صدیق ﷺ کو سونپی گئی، تاکہ فتنہ نہ اٹھے اور عامۃ الناس کے دلوں کو تسکین ہو، کیونکہ وہ جنگیں جو عہد نبوت میں بپا ہوئی تھیں اُن کا زمانہ قریب تھا اور تلوار ذوالفقار مشرکین قریش وغیرہ کے خون سے ابھی تازہ تھی، اور قوم کے سینوں میں انتقام کے کینے ابھی قائم تھے، لہٰذا ایسی صورت حال میں لوگوں کے دل اُن کی طرف پوری طرح مائل نہ ہوتے اور وہ مکمل پیروی پر تیار نہ ہوتے۔ سو مصلحت اسی میں تھی کہ کوئی ایسا شخص کھڑا ہو جس کی نرم خوئی، شفقت، عمر اور اسلام میں تقدم اور نبی کریم ﷺ کے ساتھ اس کی قربت و صحبت کو سب جانتے ہوں"۔

(الملل والنحل للشهرستاني ص ۱۸۰؛ الإمام زيد لأبي زهرة ص ۸۳)

افضل کے باوجود مفضول کے تقرر میں حکمت

سیدنا زید بن علی رضی اللہ عنہما کے کلام میں دو باتیں انتہائی قابلِ توجہ ہیں:

۱۔ قاعدة دينية (دینی قاعدہ)

۲۔ ''الضغائن في صدور القوم'' (قوم کے سینوں میں کینے)

یہاں دینی قاعدہ سے مراد یہ ہے کہ جب فتنہ کا اندیشہ ہو تو افضل عمل کو ترک کر کے اُسی عمل کے اُس پہلو کو لیا جائے جس سے فتنہ کا اندیشہ نہ رہے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فتنے کے اندیشے کے پیشِ نظر حطیم کو بنیادِ ابراہیمی علیہ السلام کے مطابق بیت اللہ کی تعمیر میں شامل فرمانے سے اجتناب فرمایا اور قریش کی تعمیر کے مطابق ہی رہنے دیا۔ اسی طرح اگر افضل شخص کو امام و خلیفہ مقرر کرنے میں فتنہ کا اندیشہ ہو تو مفضول کو مقرر کرنے کا حکم ہے۔ چنانچہ قاضی عضد الدین الایجی اور سید شریف جرجانی لکھتے ہیں:

وفصل قوم في هذه المسألة، فقالوا: نصب الأفضل إن ألارفتنة لم يجب، كما إذا فرض أن العسكر والرعايا لاينقادون للفاضل بل للمفضول، وإلا وجب.

''علماء کی ایک جماعت نے اس مسئلہ میں فصل قائم کی ہے، انہوں نے فرمایا ہے: جب فتنہ پھیلنے کا خطرہ ہو تو افضل شخص کو مقرر کرنا واجب نہیں۔ مثلاً فرض کیجئے کہ لشکر اور رعایا افضل کی نہیں بلکہ مفضول کی پیروی کریں گے، اور اگر یہ اندیشہ نہ ہو تو افضل کا تقرر واجب ہے''۔

(شرح المواقف ج۸ ص ٤٠٥)

علامہ سعد الدین تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح لکھا ہے:

(شرح المقاصد ج۳ ص ٤٨٢)

اس سلسلے میں علامہ ابن قیم نے بہت خوب لکھا ہے، چونکہ اُن کا کلام طویل ہے اس لیے ہم ترجمہ پر ہی اکتفا کر رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''اور اسی پر نبی کریم ﷺ کی سنت جاری رہی کہ آپ افضل شخص کی موجودگی میں اُس شخص کو مقرر فرماتے جو مسلمانوں کے حق میں زیادہ مفید ہوتا، جیسا کہ حضرت خالد بن ولید کو اُن کے اسلام قبول کرنے کے بعد سے دشمن کو دفع کرنے کی غرض سے جنگوں میں سپہ سالار بناتے

رہے، اوران کو بعض اُن حضرات پر بھی مقدم فرمایا جو مہاجرین وانصار میں سابقین میں سے تھے، جیسا کہ عبدالرحمان بن عوف، سالم مولیٰ ابوحذیفہ اور عبداللہ بن عمرؓ۔ یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے قبل از فتح مکہ خرچ کیا اور جہاد کیا اور یہ اُن لوگوں سے افضل ہیں جنہوں نے بعد میں خرچ کیا اور جہاد کیا، اور حضرت خالدؓ کا شمار بعد والوں میں ہوتا ہے، کیونکہ وہ، عمرو بن العاص اور عثمان بن طلحہؓ صلح حدیبیہ کے بعد مسلمان ہوئے۔ پھر خالدؓ سے بنو جذیمہ کے معاملہ میں زیادتی ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے آسمان کی طرف ہاتھ بلند کر کے کہا: اے اللہ! جو کچھ خالد نے کیا میں اُس سے بری ہوں، اوراس کے باوجود انہیں معزول نہ فرمایا۔

حضرت ابوذرؓ السابقون الاولون میں سے تھے لیکن نبی کریم ﷺ نے اُنہیں فرمایا: اے ابوذر میں تمہیں کمزور پاتا ہوں اور میں تمہارے لیے وہ پسند کرتا ہوں جو اپنے لیے پسند کرتا ہوں لیکن میں تمہیں دو شخصوں پر بھی امیر مقرر نہیں کروں گا اور نہ ہی مالِ یتیم پر نگران مقرر کروں گا۔

آپ ﷺ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو غزوۂ ذات السلاسل پر امیر مقرر کیا، اس لیے کہ وہ اُن کے ننھیالی رشتہ دار تھے، اور حضور ﷺ جانتے تھے کہ وہ جتنی اُن کی بات مانیں گے اتنی کسی دوسرے کی نہیں مانیں گے، نیز حضرت عمرو بن العاصؓ کے حسنِ سیاست، تجربہ، ذکاوت اور فطانت کی وجہ سے بھی اُنہیں منتخب فرمایا گیا، کیونکہ وہ عرب کے ہوشیار ترین انسان تھے۔ عرب کے زیرک ترین انسان چار تھے جن میں سے ایک یہی تھے۔ پھر حضرت ابوعبیدہ کو عمرو بن العاص کا ردیف (شریکِ کار ساتھی) بنایا اور حکم کیا کہ ایک دوسرے کی اطاعت کرنا اور مخالفت نہ کرنا۔ پھر جب اُن کے مابین اس بات پر تنازع ہوا کہ نماز کون پڑھائے گا تو حضرت ابوعبیدہؓ نے نماز کی امامت اُن پر چھوڑ دی، وہ دونوں گروہوں کو نماز پڑھاتے تھے اور اُن میں سیدنا ابوبکرؓ بھی تھے۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ نے حضرت اسامہ بن زیدؓ کو اُن کے والد کی جگہ پر امیر مقرر فرمایا، اس لیے کہ وہ اس امارت کے لائق تھے، کیونکہ وہ اپنے والد کا بدلہ لینے میں دوسروں کی بہ نسبت زیادہ دل چسپی رکھتے تھے، اور ایک مرتبہ اُن کے والد زیدؓ کو امارت میں اپنے چچازاد سیدنا جعفر طیارؓ پر مقدم فرمایا حالانکہ زید غلام تھے، البتہ وہ جعفر سے اسلام میں مقدم

تھے، اور آپ ﷺ نے اس سلسلہ میں کسی کے اعتراض کو لائق توجہ نہ سمجھا اور فرمایا: اگر تم اسامہ بن زید کی امارت میں اعتراض کر رہے ہو تو اس سے قبل اُن کے والد کی امارت میں بھی تم نے اعتراض کیا تھا اور اللہ کی قسم وہ امارت کے لائق تھے اور مجھے تمام لوگوں سے زیادہ محبوب تھے۔

اس بحث کا اختتام علامہ ابن قیم نے ان الفاظ پر کیا ہے:

والمقصود أن هديه ﷺ تولية الأنفع للمسلمين وإن كان غيره أفضل منه.

''اور مقصود یہ ہے کہ آپ ﷺ کا اسوہ (موقعہ کی مناسبت سے) مسلمانوں کے حق میں زیادہ مفید شخص کو مقرر کرنا تھا، اگرچہ کوئی دوسرا شخص اُس سے افضل موجود ہوتا''۔

(إعلام الموقعين ج٢ص١٩٦ ومابعدها، وط: ج١ص١٠٩، ١١٠)

نبی کریم ﷺ نے جو حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو اکابر پر سپہ سالار مقرر کیا تھا، اس کے تحت حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وفيه جواز إمارة المولىٰ وتولية الصغار على الكبار، والمفضول على الفاضل، لأنه كان في الجيش الذي كان عليهم أسامة، أبوبكر وعمر.

''اور اس میں غلام کی امارت کی اور اکابر پر اصاغر اور افضل پر مفضول کی حکومت کے جواز کی دلیل ہے، اس لیے کہ جس لشکر پر اسامہ کو مقرر کیا گیا تھا اُس میں سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی تھے''۔

(فتح الباري ج٧ص٤٥٥، وط: ج٨ص٤٤٥ حديث ٣٧٥٠)

حافظ رحمہ اللہ نے ایسی دلیل حدیث نمبر ٧٢٠٧ کے تحت بھی بیان فرمائی ہے۔

(فتح الباري ج١٥ص١١٠، وط: ج١٧ص٤٥)

علامہ ابن حجر مکی لکھتے ہیں:

واعلم أنه يجوز نصب المفضول مع وجود من هو أفضل منه.

''اور جان لو کہ افضل کی موجودگی میں مفضول کو مقرر کرنا جائز ہے''۔

(الصواعق المحرقة ص٩)

امام الحرمین الجوینی رحمۃ اللہ علیہ امامتِ کبریٰ یعنی خلافت کی بحث میں لکھتے ہیں:

ولا معتصم لمن يمنع إمامة المفضول إلا أخبار آحاد في غير الإمامة

التي نتكلم فيها، كقوله ﷺ ﴿يؤمكم أقرؤكم﴾ ولا يفضي هذا وأمثاله إلى القطع، كيف ولو تقدم المفضول في إمامة الصلاة لصحت الإمامة وإن ترک الأولیٰ، فهذا قولنا إمامة المفضول.

"اور جو مفضول کی امامت (خلافت) کو ناجائز کہتا ہے اُس کے پاس کوئی مضبوط دلیل نہیں، ماسوا ایسی اخبار آحاد کے جو ہماری زیر بحث امامت (خلافت) کے متعلق نہیں، جیسا کہ ارشاد نبوی ﷺ: ﴿تمہاری نماز کا امام وہ ہوگا جو زیادہ پڑھا ہوا ہو﴾ یہ اور اس جیسی مثالیں قطعیت کا فائدہ نہیں دیتیں، بھلا یہ بات کیسے درست ہو سکتی ہے جبکہ اگر مفضول کو نماز کی امامت میں مقدم کیا جائے تو اُس کی امامت صحیح ہوگی اگرچہ ترک اولیٰ ہوگا، پس مفضول کی امامت (خلافت) میں بھی ہمارا قول یہی ہے"۔

(كتاب الإرشاد إلىٰ قواطع الأدلة في أصول الاعتقاد ص ۱۷۱)

اس سے قبل امام الحرمین رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

والذي صار إليه معظم أهل السنة أنه يتعين للإمامة أفضل أهل العصر إلا أن يكون في نصبه هرج وهيجان فتن، فيجوز نصب المفضول إذا ذاک إذا كان مستحقا للإمامة، وهذه المسألة لا أراها قطعية.

"اور جس بات کی طرف معتبر اہل سنت گئے ہیں وہ یہ ہے کہ زمانہ بھر کے افضل شخص کو امامت (خلافت) کے لیے مقرر کیا جائے، لیکن اگر اُس کے تقرر میں دشواری اور فتنوں کے سر اٹھانے کا اندیشہ ہو تو پھر مفضول کو مقرر کرنا جائز ہے، جبکہ وہ امامت کا اہل ہو، اور میں اس مسئلہ (افضل کے تقرر) کو قطعی نہیں سمجھتا"۔

(كتاب الإرشاد ص ۱۷۱)

اس سے قبل ایسی بات علامہ تفتازانی اور جرجانی وغیرہما کے حوالے سے بھی لکھی جا چکی ہے کہ اگر فتنوں کا اندیشہ ہو تو افضل کو چھوڑ کر مفضول کو خلیفہ بنانا عند اہل السنۃ جائز ہے، لیکن خوارج، معتزلہ، مرجئہ اور شیعہ کا مذہب یہ ہے کہ ہر حال میں افضل کا تقرر واجب ہے۔ چنانچہ علامہ ابن حزم لکھتے ہیں:

ذهبت طائفة من الخوارج وطوائف من المعتزلة وطوائف من المرجئة

منهم محمد بن الطيب الباقلاني ومن اتبعه، وجميع الرافضة من الشيعة إلى أنه لايجوز إمامة من يوجد في الناس أفضل منه.

''خوارج، معتزلہ اور مرجئہ کا ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ افضل کی موجودگی میں دوسرے شخص کی خلافت درست نہیں، محمد بن طیب باقلانی، اُن کے پیروکار اور شیعہ میں سے جملہ روافض بھی اسی طرف گئے ہیں''۔

(الفِصَل ج٤ ص١٦٣)

ہر چند کہ ہمیں علامہ باقلانی رحمۃ اللہ علیہ کے بعض اقوال سے اتفاق نہیں لیکن چونکہ وہ علماء اہل سنت سے ہیں، لہٰذا علامہ ابن حزم کا مذکورہ بالا فرقوں میں انہیں ذکر کرنا اگرچہ درست ہے لیکن مکمل درست نہیں، کیونکہ جہاں انہوں نے افضل کے تقرر کے وجوب کا قول کیا ہے وہیں انہوں نے استثناء کی گنجائش بھی رکھی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

إلا أن يمنع عارض من إقامة الأفضل فيسوغ نصب المفضول.

''مگر افضل کے تقرر میں کوئی مشکل ہو تو پھر مفضول کو مقرر کرنا جائز ہوگا''۔

(التمهيد للباقلاني ص١٨٢، وط: ص٤٧١)

اور ایسا قول علامہ تفتازانی اور جرجانی کی عبارات میں بھی آچکا ہے، بہر حال ان تمام عبارات میں جن مشکلات اور فتنوں کی طرف اشارے کیے گئے ہیں سیدنا عمر اور سیدنا امام زید بن علی رضی اللہ عنہ نے بھی مولیٰ علی رضی اللہ عنہ کے تقرر میں ایسے ہی فتنوں کے خدشات کی طرف اشارہ فرمایا ہے، اور نبی کریم ﷺ نے بھی ایسے فتنوں کی تصریح فرمائی ہے۔ چنانچہ ایک موقعہ پر آپ نے روتے ہوئے سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو فرمایا:

ضغائن في صدور أقوام لايبدونها لك إلا من بعدي.

''تمہارے بارے میں کچھ قوموں کے سینوں میں کینے ہیں جنہیں وہ میرے بعد ظاہر کریں گے''۔

(مسند أبي يعلىٰ ج١ ص٢٥٦ حديث ٥٦١، وط: ج١ ص٤٢٧ حديث ٥٦٥؛ مسند البزار ج٢ ص٢٩٣ حديث ٧١٦)

متعدد حوالہ جات کے ساتھ یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے۔

خود سوچیے! کیا سیدنا علی ﷺ نے کسی کا مال غصب کیا تھا، کیا کسی کی توہین کی تھی اور کیا کسی کو ناحق قتل کیا تھا؟ وہ تو اس حد تک خواہش نفسانی سے منزہ و مبراء تھے کہ جس شخص کو اللہ کی خاطر تہ تیغ فرمانا چاہتے تھے، جب اُس نے اُن پر تھوک دیا تو انہوں نے اُسے فوراً چھوڑ دیا تھا۔ لہٰذا اُن کے ساتھ کینہ کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں: حسد یا پھر وہی "دعابة" جسے سیدنا فاروقِ اعظم ﷺ نے بیان فرمایا، اور یہ دوسرا سبب تو بالکل واضح ہے، بڑے بڑے اہل علم بایں سبب سیدنا علی ﷺ سے عداوت رکھتے تھے اور معاذ اللہ شب و روز اُن پر لعنت کرتے تھے۔ مثلاً ایک شخص بہت بڑا محدث تھا، اس کی ثقاہت پر امام احمد بن حنبل ﷺ ایسے ائمہ کرام شاہد ہیں، بخاری، سنن ابی داود، جامع ترمذی، سنن النسائی اور سنن ابن ماجہ وغیرھا میں اس سے حدیث لی گئی، مگر اس بھاری علم کے باوجود وہ بدبخت شخص سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کا دشمن تھا۔ امام ذھبی اور حافظ رحمہم اللہ نے سند کے ساتھ لکھا ہے کہ وہ سیدنا علی ﷺ پر لعنت کرتا تھا اور کہتا تھا: لا أحبه قتل آبائي. (میں اُس کو پسند نہیں کرتا اس نے میرے آباؤ اجداد کو قتل کیا تھا)۔

(میزان الاعتدال ج۲ ص ۲۱۹؛ تهذيب التهذيب ج۲ ص ۲۲۱)

ایک اور بہت بڑا محدث جسے جوزجانی کہا جاتا ہے اور جس سے اکابر وائمہ نے حدیث لی ہے، وہ بھی سیدنا علی ﷺ کے ساتھ اُن کی اِسی اصولی سختی کے باعث شدید نفرت رکھتا تھا حتیٰ کہ ہر محب مرتضیٰ کے ساتھ بھی اُسے عداوت تھی۔ اس سے آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کو افضل، احریٰ، و اَحق ہونے کے باوجود خلافت سے مؤخر رکھنے میں یہ وجہ کتنا قوی ہے؟

جب صریح ارشادِ نبوی ﷺ ہے کہ تمہارے بارے میں کچھ لوگوں کے دلوں میں جو کینے ہیں وہ میرے بعد ظاہر ہوں گے تو خود غور فرمائیے کہ اگر سیدنا علی ﷺ کو وصالِ نبوی ﷺ کے فوراً بعد مسند خلافت پر بٹھا دیا جاتا تو وہ کینے کس شدت سے ظاہر ہوتے؟





کسی کو خلیفہ نامزد نہ کرنے کی حکمت

﴿۳۹﴾ ورواه شريک عن أبي اليقظان، عن أبي وائل، عن حذيفة، قال:

قالوا يارسول الله! ألا تستخلف علينا؟ قال: إن تولوا علياً تجدوه هادياً مهدياً يسلک بكم الطريق المستقيم.

وهذا بعض حديث.

﴿۳۹﴾ حضرت حذیفہ بیان کرتے ہیں کہ صحابہ کرام نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ ہم پر خلیفہ مقرر کیوں نہیں فرمادیتے؟ فرمایا: اگر تم علی کو خلیفہ بناؤ گے تو اس کو ہدایت دینے والا، ہدایت یافتہ پاؤ گے، وہ تمہیں سیدھی راہ پر چلائے گا۔ یہ حدیث کا کچھ حصہ ہے۔

مکمل حدیث نیچے ملاحظہ فرمائیں۔

﴿۴۰﴾ أخبرنا به على التمام، شيخنا العلامة أبوبكر محمد بن أحمد بن محمد الشريشي مشافهة، عن الإمام أبي جعفر أحمد بن إبراهيم بن الزبير، أخبرنا أبو الحسن الغافقي إجازة، أخبرنا عبد الله ابن محمد الحجري، أخبرنا محمد بن الحسين الحافظ، أخبرنا أبوعلي الصدفي، أخبرنا عبد الله بن محمد بن إسماعيل، أخبرنا أبوعمر الطلمنكي إجازة، أخبرنا محمد بن أحمد بن مفرج، حدثنا محمد ابن أيوب بن الصموت، حدثنا أبوبكر أحمد بن عمرو الحافظ، حدثنا عبد الله بن وضاح الكوفي، حدثنا يحي بن اليمان، حدثنا إسرائيل، عن أبي اليقظان، عن أبي وائل، عن حذيفة، قال:

قالوا: يارسول الله! ألا تستخلف علينا؟ قال إني إن أستخلف عليكم فتعصون خليفتي ينزل عليكم العذاب، قالوا: ألا تستخلف أبابكر؟ قال: إن تستخلفوه تجدوه ضعيفاً في بدنه، قوياً في أمر الله، قالوا: ألا تستخلف عمر؟ قال: إن تستخلفوه تجدوه قوياً في بدنه، قوياً في أمر الله، قالوا: ألا تستخلف علياً؟ قال: إن تستخلفوه، ولن تفعلوا يسلک بكم الطريق المستقيم، وتجدوه هادياً مهدياً.

رواه البزار، وقال: لانعلمه، يروى عن حذيفة إلا بهذا الإسناد، وأبو اليقظان إسمه عثمان

بن عمير.

قلت: أبو اليقظان هذا، روى له أبو داود، والترمذي، وابن ماجه ضعفوه، وقالوا: كان شيعياً، ولكن روى عنه مثل شعبة، وغيره من الكبار، ومع ذلک فلم ينفرد به، فقد رواه سفيان الثوري، عن أبي إسحاق السبيعي عن زيد بن يثيع كما تقدم.

﴿٤٠﴾ حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ ہم پر خلیفہ کیوں نہیں مقرر فرما دیتے؟ فرمایا: اگر میں تم پر خلیفہ مقرر کر دوں پھر تم اس کی نافرمانی کرو تو تم پر عذاب نازل کیا جائے گا۔ انہوں نے عرض کیا! آپ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کریں گے؟ فرمایا! اگر تم اُس کو خلیفہ بناؤ گے تو اُسے بدن میں کمزور اور حکم الٰہی کے نفاذ میں قوی پاؤ گے۔ انہوں نے عرض کیا: کیا آپ ہم پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنائیں گے؟ فرمایا اگر تم اس کو خلیفہ بناؤ گے تو اسے بدن میں بھی قوی اور احکام الٰہی کے نفاذ میں بھی قوی پاؤ گے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: آپ ہم پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کیوں نہیں خلیفہ مقرر کرتے؟ فرمایا اگر تم اس کو خلیفہ بناؤ گے اور تم ایسا نہیں کرو گے، تو وہ تمہیں صراط مستقیم پر چلائیگا اور تم اس کو ہدایت دینے والا، اور ہدایت یافتہ پاؤ گے۔

اس حدیث کو امام بزار نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: میں نہیں جانتا کہ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے اس سند کے علاوہ یہ حدیث روایت کی گئی ہو اور ابوالیقظان کا نام عثمان بن عمیر ہے، میں کہتا ہوں: اس ابوالیقظان سے امام ابوداود، امام ترمذی اور امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور اس کو ضعیف قرار دیا ہے، اور کہا ہے: یہ شیعی تھا، لیکن اس سے امام شعبہ اور اُن جیسے دوسرے حضرات نے بھی روایت لی ہے، اور اس کے باوجود وہ اس روایت میں منفرد بھی نہیں، اس حدیث کو سفیان ثوری نے از اسحاق السبیعی، از زید بن یثیع سے روایت کیا ہے، جیسا کہ گذر چکا ہے۔

(مسند البزار ج٧ ص٢٩٩ حديث٢٨٩٥؛ المستدك للحاكم ج٣ص ٦٩ حديث٤٤٩٢؛ كشف الأستار ج٢ ص٢٢٤ حديث ١٥٧٠؛ مجمع الزوائد ج٥ ص٧٦ حديث ٨٩١٠، وط: ج٥ ص ٢٣٠ حديث ٨٩١٠؛ حلية الأولياء ج١ ص١٠٤ حديث١٩٥، ١٩٦؛ الاستيعاب ج٣ ص٢١٢؛ تاريخ دمشق ج٤٢ ص٤١٩؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٨ ص٣٢؛ جمع الجوامع ج١٤ ص ٣٠٨ حديث ١٠٧٦٠؛ مختصر زوائد البزار ج١ ص٦٧٠ حديث ١٢٣٠)

خلیفہ کا انتخاب لوگوں پر کیوں چھوڑا گیا؟

نبی کریم ﷺ کی طرف سے کسی بھی شخص کو نامزد کر کے خلیفہ نہ بنانے کی حکمت اس حدیث میں صراحتاً آ گئی ہے، لہٰذا اہل سنت کے بعض علماء کا کہنا کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر فرمایا تھا اور شیعہ کا کہنا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر فرمایا تھا، دونوں درست نہیں۔

لطف کی بات یہ ہے کہ جس عظیم مفسر، محدث اور مؤرخ کو بعض لوگ شیعہ کہتے ہیں، اُن کا کہنا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر فرمایا تھا۔ اس سے میری مراد امام المفسرین، امام المحدثین اور امام المؤرخین امام ابوجعفر محمد بن جریر الطبری رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت مبارکہ ہے، لیکن اُن کا بھی یہ قول درست نہیں، اس لیے کہ سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو اُن کی خلافت کے آخری ایام میں جب عرض کیا گیا کہ وہ کسی کو خلیفہ مقرر فرما دیں تو انہوں نے فرمایا تھا:

إن استخلِفُ فقد استخلف من هو خير مني أبو بكر، وإن أترك فقد ترك من هو خير مني رسول الله ﷺ.

"اگر میں خلیفہ مقرر کروں تو مجھ سے بہتر شخص ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خلیفہ مقرر فرمایا تھا، اور اگر میں ترک کر دوں تو مجھ سے بہتر ہستی رسول اللہ ﷺ نے ترک فرمایا تھا"۔

(بخاري حديث ٧٢١٨)

البتہ اس صورت میں امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو درست سمجھا جا سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ اشاروں، کنایوں اور بعض اعمال سے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے لیے اپنی پسند ظاہر فرماتے اور راہ ہموار فرماتے رہے۔ باقی جو سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "اگر میں خلیفہ مقرر کروں تو مجھ سے بہتر شخص ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خلیفہ مقرر فرمایا تھا" اس سے مراد چھ افراد پر مشتمل مجلسِ شوریٰ کا قیام اور اُس میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار ہے، ورنہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے باقاعدہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر نہیں فرمایا تھا۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اظہارِ خیال کی طرح تو فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بجائے سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے حق میں اظہارِ خیال فرماتے رہے مگر مجلسِ شوریٰ میں نہیں بلکہ دوسرے حضرات کے سامنے۔ یہاں ہم اس کی کچھ تفصیل پیش کرتے ہیں تا کہ معلوم ہو سکے کہ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی نگاہ میں اُن کے بعد خلافت کے لیے زیادہ

موزوں کون تھا۔

مجلسِ شوریٰ کے مقابلہ میں فاروقی تمنا

سیدنا عمر بن خطاب ﷺ کی ذاتی آرزو یہ تھی کہ اُن کے بعد لوگ حضرت علی ﷺ کو خلیفہ منتخب کر دیں تو وہ زیادہ موزوں ہوں گے۔ چنانچہ حافظ عسقلانی اور امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہما لکھتے ہیں

''امام ابن راھویہ رحمہ اللہ نے ابومجلز سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر ﷺ نے دریافت فرمایا: ''من تستخلفون بعدي'' (میرے بعد تم لوگ کس کو خلیفہ بنا رہے ہو؟) تو اہل مجلس میں سے باری باری دو شخصوں نے حضرت زبیر بن العوام اور حضرت طلحہ ﷺ کا نام لیا جس پر فاروقِ اعظم ﷺ نے تحفظات کا اظہار فرمایا تو ایک اور شخص نے عرض کیا:

نستخلف علياً، فقال: إنكم لعمري لا تستخلفونه، والذي نفسي بيده لو استخلفتموه لأقامكم على الحق، وإن كرهتم.

''ہم علی کو خلیفہ بنائیں گے۔ فرمایا: مجھے میری زندگی کی قسم تم انہیں خلیفہ نہیں بناؤ گے، اُس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اگر تم نے انہیں خلیفہ بنا دیا تو وہ تمہیں حق پر قائم رکھیں گے اگرچہ تمہیں نہ پسند ہو''۔

(المطالب العالية ج۲ ص۱۹۶ حدیث۲۰۳۸، وط: ج۹ ص۵۷۲ حدیث۲۰۹۰؛ جمع الجوامع ۱۱ ص۲۹۵ حدیث۱۴۲۵، وط: ج۱۶ ص۵۷ حدیث۲۳۲۷؛ کنز العمال ج ۵ ص ۷۳۵ حدیث ۱۴۲۵۸)

جب سیدنا فاروقِ اعظم ﷺ پر حملہ ہوا تو عمرو بن میمون بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: علی، عثمان، طلحہ، زبیر، عبدالرحمان بن عوف اور سعد کو بلاؤ۔ وہ سب حضرات آئے، باہم گفت وشنید ہوئی:

فلمّا خرجوا من عند عمر، قال عمر: لو ولّوها الأجلح سلك بهم الطريق، فقال له ابن عمر: فما يمنعك يا أمير المؤمنين؟ قال: أكره أن أتحملها حيًا وميتًا.

''پھر جب لوگ حضرت عمر ﷺ کی مجلس سے اٹھ کر چلے گئے تو حضرت عمر ﷺ نے فرمایا: اگر یہ لوگ اجلح (جس کے سر سے کچھ بال جھڑ گئے ہوں، یعنی سیدنا علی ﷺ) کو خلافت سونپ دیتے تو

وہ انہیں سیدھی راہ پر چلاتے۔اس پر ابن عمرؓ نے عرض کیا: امیر المومنین آپ کو ایسا کرنے میں کیا چیز مانع ہے؟ فرمایا: میں پسند نہیں کرتا کہ زندگی میں اور بعد میں اس کی ذمہ داری اٹھاؤں"۔

(الطبقات الكبرىٰ لابن سعد ج٣ص١٨٢وط: ج٣ص٢٦٠؛شرح أصول الاعتقاد أهل السنة ج ٢ ص٣١٦؛تاريخ عمر بن الخطاب لابن الجوزي ص٢٠٦؛الاستيعاب ج٣ص٢٤١؛تاريخ دمشق ج٤٢ص٤٢٨؛فتح الباري ج٧ص٤٣٠ ؛ جمع الجوامع ج١١ص٣٠٣حديث ١٤٦١،وط: ج ١٥ص٦٥١حديث١٨٦٠؛القول المستحسن ص٣٣٣)

ایک اور مرتبہ تو فاروقِ اعظمؓ نے سیدنا علی المرتضیٰؓ کو سب سے افضل اور موزوں قرار دیا۔ چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"حضرت معمرؓ محمد بن عبداللہ بن عبدالرحمان بن عبدالقاریؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ اور ایک انصاری شخص بیٹھ کر گفتگو کر رہے تھے کہ عبدالرحمان بن عبدالقاری بھی جا کر اُن کے ساتھ بیٹھ گئے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: ہمیں پسند نہیں کہ ہماری بات بلند ہو (کر آگے پھیلے)، اس پر عبدالرحمان نے عرض کیا: امیر المومنین: میں اُن لوگوں کے ساتھ نہیں بیٹھتا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: کیوں نہیں، بیٹھ جاؤ اور ہماری بات بلند نہ کرنا۔ پھر حضرت عمرؓ نے انصاری سے فرمایا:

من ترى الناس يقولون يكون الخليفة بعدي؟ فعدد الأنصاري رجالاً من المهاجرين ،لم يسم علياً.فقال عمر:فمالهم عن أبي الحسن ؟فوالله إنه لأحراهم، إن كان عليهم أن يقيمهم على طريقة من الحق.

"لوگ کیا کہتے ہیں میرے بعد خلیفہ کون ہوگا؟ انصاری شخص نے چند مہاجرین کا ذکر کیا اور سیدنا علی کا نام نہ لیا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا: انہیں کیا ہوا، وہ ابوالحسن سے کیوں غافل ہیں؟ خدا کی قسم وہ ان سب سے زیادہ لائق ہیں، اگر وہ اُن پر خلیفہ ہوں تو انہیں راہِ حق پر قائم رکھیں گے"۔

(الأدب المفرد ج١ص٣٠٠حديث٥٨٢؛جمع الجوامع ج١١ص٢٩٥حديث ١٤٢٧، وط: ج ١٦ص٦٣٦؛كنز العمال ج٥ص٧٣٦،٧٣٧حديث١٤٢٦٠)

امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

عن ابن عمر رضي الله عنهما قال: قال عمر لأصحاب الشورى: لله درهم لوولوها الأصيلع كيف يحملهم على الحق وإن حمل على عنقه بالسيف، قال: فقلت تعلم ذلك منه ولا توليه؟ قال: إن استخلف فقد استخلف من هو خير مني وإن أترك فقد ترك من هو خير مني.

''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے مجلس شوریٰ کے حق میں فرمایا: اُن کی خوبی اللہ ﷻ کے لیے ہوگی اگر وہ ''اُصَیلِع'' (سیدنا علیؓ) کو خلافت سونپیں، وہ انہیں بڑی شان سے حق پر چلائے گا اگرچہ اُس کی گردن پر تلوار رکھ دی جائے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: میں نے عرض کیا: آپ اُن کی یہ اہلیت جانتے ہیں اور انہیں خلیفہ نہیں بناتے؟ فرمایا: اگر میں خلیفہ بناؤں تو مجھ سے بہتر شخص نے بھی خلیفہ بنایا تھا اور اگر میں ترک کردوں تو مجھ سے بہتر ہستی نے ترک کیا تھا''۔

(المستدرك ج٣ص٩٤،وط: ج٤ص٥٠ حديث٤٥٨٢؛الاستيعاب ج ٢ص٦٥،وط: ج٣ ص ٢٢٢؛تاريخ دمشق ج٤٢ص٤٢٨،جمع الجوامع ج ١١ص٢٩٤ حديث١٤٢١،وط: ج١٥ ص ٧٠٨ حديث١٩٧٤)

سیدنا ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ فاروقِ اعظمؓ نے سیدنا علی المرتضیٰؓ کو خلافت سپرد نہ کرنے کی ایک وجہ اُن کا کم عمر ہونا بھی بیان فرمایا، لیکن اس وجہ کا ابن عباس نے معارضہ کیا تو فاروقِ اعظمؓ خاموش ہوگئے۔

(تاريخ دمشق لابن عساكر ج٤٢ص٣٤٩)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ سیدنا فاروقِ اعظمؓ کے نزدیک سیدنا علیؓ خلافت کے لیے موزوں ترین تھے اور حضرت عثمان غنیؓ سے بھی افضل تھے مگر وہ شوریٰ کے بغیر کوئی حکم صادر کرنا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ خود سوچئے فاروقِ اعظمؓ کے ان ارشادات کے سامنے اس قول کی کیا حیثیت ہے کہ: ''افضلیت کی ترتیب خلافت کی ترتیب کے مطابق واجب ہے''؟





نبوی پیش گوئی: تم علی کو پہلا خلیفہ نہیں بناؤ گے

﴿٤١﴾ وأخبرنا الحافظ الكبير أبو الفضل عبد الرحيم بن الحسين فيما شافهني به، عن الخطيب أبي الفتح محمد بن محمد المصري، أخبرنا أبو الحسن علي بن أحمد القسطلاني إجازةً، عن يوسف بن عبد الله الشاطبي في كتابه من المغرب، أنبأنا عبد الرحمان بن عتاب، حدثني أبي، أنبأنا سليمان بن خلف، أنبأنا ابن مفرج، أنبأنا ابن الصموت، حدثنا أبوبكر أحمد بن عمرو الحافظ، حدثنا حفص بن عمرو الربالي، حدثنا زيد ابن الحباب، حدثنا فضيل بن مرزوق، حدثنا أبو إسحاق، عن زيد بن يثيع، عن علي ﷺ، قال: قال رسول الله ﷺ:

إن تولوا أبابكر تجدوه زاهداً في الدنيا، راغباً في الآخرة، وإن تولوا عمر تجدوه قويا أمينا لا تأخذه في الله لومة لائم، وإن تولوا علياً تجدوه هادياً مهدياً يأخذ كم إلى الصراط المستقيم، ولن تفعلوا.

رواه البزار في مسنده، وقال: لا نعلمه يروى إلا بهذا الإسناد.

قلت: وهو إسناد صحيح، رجاله كلهم ثقات على شرط مسلم، إلا زيد بن يثيع، فقد روى له أصحاب السنن، وذكره ابن حبان في الثقات.

﴿٤١﴾ حضرت زید بن یثیع سیدنا علی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اگر تم ابو بکر ﷺ کو امیر بناؤ گے تو انہیں دنیا سے کنارہ کش اور آخرت میں رغبت کرنے والا پاؤ گے، اور اگر تم عمر ﷺ کو امیر بناؤ گے تو تم انہیں قوی، امین پاؤ گے، وہ اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت گر کی ملامت کی پرواہ نہیں کریں گے، اور اگر تم علی ﷺ کو امیر بناؤ گے تو اُسے ہدایت دینے والا اور ہدایت یافتہ پاؤ گے، وہ تم کو صراط مستقیم پر لے کر چلیں گے، اور تم اُنہیں ہرگز نہیں بناؤ گے۔

اس حدیث کو امام بزار رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے، اور کہا ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ یہ اس سند کے علاوہ کسی اور سند سے روایت کی گئی ہو۔ میں کہتا ہوں: یہ سند صحیح ہے، اس کے تمام راوی امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی شرط کے مطابق ثقہ ہیں، ماسوا زید بن یثیع کے، اُس سے اصحاب سنن (امام ترمذی، ابوداود، نسائی اور امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہم) نے روایت کیا ہے اور امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے اسے (اپنی کتاب) "الثقات" میں

ذکر کیا ہے۔

(مسند البزار ج۳ ص۳۳ حدیث ۷۸۳؛ کشف الأستار ج۲ ص ۲۲۵ حدیث ۱۵۷۱؛ مسند أحمد ج ۱ ص ۱۰۹ حدیث ۸۵۹؛ فضائل الصحابة ج۱ ص ۲۸٤ حدیث ۲۸٤؛ السنة للإمام عبدالله بن أحمد ص ۲۱۸ حدیث ۱۱۸٦، وط: ج۲ ص ۵۳۷ حدیث ۱۲۵۷)

حافظ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''یہ حدیث امام احمد، امام طبرانی اور امام بزار رحمۃ اللہ علیہم نے روایت کی ہے اور امام بزار کے تمام راوی ثقہ (معتبر) ہیں''۔

(مجمع الزوائد ج۵ ص ۱۷٦ حدیث ۸۹۰۹، وط: ج۵ ص ۲۳۰ حدیث ۸۹۰۹)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے امام احمد کی سند کو جید (عمدہ) کہا ہے۔

(الإصابة ج٤ ص٤٦٨)

فضائل الصحابہ کے محقق شیخ وصی اللہ بن محمد عباس نے کہا: اس حدیث کی سند حسن ہے۔

(فضائل الصحابة للإمام أحمد ج۱ ص ۲۸٤ حدیث ۲۸٤)

خلیفہ کا ماضی مدنظر تھا یا مستقبل؟

اِن احادیث میں فضائل و مناقب کی نہیں بلکہ نظام کو چلانے کی بات فرمائی گئی ہے، یعنی یوں نہیں فرمایا گیا کہ فلاں سب سے پہلے مسلمان ہوا، اس کے یہ یہ کارنامے، فضائل، احسان اور خوبیاں ہیں لہٰذا تم اُسے خلیفہ بنانا بلکہ فرمایا گیا کہ اگر تم فلاں کو خلیفہ منتخب کرو گے تو وہ تمہیں یوں چلائے گا، یعنی فقط نظام کو بہتر چلانے کی صلاحیت کی بات فرمائی گئی۔ اس سے اُس نظریہ کی تردید ہوگئی کہ خلافت کی ترتیب افضلیت کی ترتیب کے مطابق رکھی گئی، خصوصاً سیدنا علی المرتضیٰ ؓ کے حق میں ''ما أراکم فاعلین'' (میں تمہیں ایسا کرنے والا نہیں دیکھ رہا) اور ''ولن تفعلوا'' (یعنی تم انہیں خلیفہ نہیں بناؤ گے) کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ خلافت کی ترتیب افضلیت کے تابع نہیں۔ یہ تو حضور ﷺ نے پیش گوئی فرمادی کہ تم علی کو اول خلیفہ نہیں بناؤ گے اور فاروقِ اعظم کی فراست وبصیرت نے بھی یہی دیکھا کہ اُن کے بعد سیدنا علی المرتضیٰ ؓ کو خلیفہ نہیں بنایا جائے گا جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں، ورنہ اگر مولیٰ علی ؓ کو اول خلیفہ بنادیا جاتا تو پھر افضلیت کا مسئلہ کہاں ہوتا؟

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ جب خلافتِ ظاہری میں اُن کی باری چوتھے نمبر پر آنے کے باوجود صحابہ کرام کی بڑی تعداد، تمام اہل بیت کرام، محدثین، فقہاء اور صوفیہ عظام ﷺ کی بھاری اکثریت اُن کی افضلیت کا قول کرتی ہے، اور اہل اسلام کے تمام فرقوں میں تقریراً اور تحریراً اس پر بحث ہوتی ہے، اور کسی دور میں بھی اس مسئلہ پر اتفاق نہیں ہوسکا تو اگر انہیں خلافتِ ظاہری بلافصل بھی سونپ دی جاتی تو کس کو اُن کی افضلیت میں کلام ہوتا؟

ایک اور زاویہ سے یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے تینوں خلفاء کرام (ابوبکر، عمر اور علی ﷺ) کے بارے میں جو الفاظ ادا فرمائے ہیں وہ اُن کے ماضی کے متعلق نہیں بلکہ مستقبل کے متعلق ہیں۔ چنانچہ سیدنا ابوبکر صدیق ﷺ کی مستقبل میں خلافت کی بہتر کارکردگی کو "تجدوہ زاهداً في الدنيا، راغباً في الآخرة" (تم انہیں دنیا سے کنارہ کش اور آخرت میں رغبت کرنے والا پاؤ گے) کے الفاظ میں بیان فرمایا، اور سیدنا عمر ﷺ کی بہتر کارکردگی کو "تجدوہ قويا أميناً لا تأخذه في الله لومة لائم" (تم انہیں قوی، امین پاؤ گے، وہ اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت گر کی ملامت کی پرواہ نہیں کریں گے) کے الفاظ ارشاد فرمائے اور سیدنا علی ﷺ کی بہتر کارکردگی کو "تجدوہ هادياً مهدياً يأخذ كم إلى الصراط المستقيم" (تم اُنہیں ہدایت دینے والا اور ہدایت یافتہ پاؤ گے، وہ تم کو صراطِ مستقیم پر لے کر چلیں گے) کے الفاظ میں ادا فرمایا۔ اِن تمام الفاظ میں ماضی کی نہیں، مستقبل کی بات ہے، عنداللہ ثواب اور فضائل و درجات کی نہیں بلکہ مستقبل میں نظام کو بہتر چلانے کی بات ہے۔ لہٰذا ترتیب افضلیت کو ترتیب خلافت کے مطابق واجب قرار دینا اپنی طرف سے شریعت گھڑنے کے مترادف ہے۔

یہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ثقیفہ بنوساعدہ میں بھی خلیفہ کے تقرر میں صحابہ کرام ﷺ کے مابین مفاضلہ وموازنہ زیر بحث نہیں آیا تھا۔

متن کی درجِ ذیل حدیث میں بھی مستقبل کو مدنظر رکھ کر بات فرمائی گئی ہے۔ ذرا غور سے پڑھیے!

﴿٤٢﴾ وأخبرناه أعلىٰ من هذا بدرجات، أبو عمر بن قدامة، أنا شيخنا السعدي أبو الحسن، أنا فرج، أنا هبة الله، أنا الحسن بن المذهب، أنا القطيعي، ثنا عبد الله ابن الإمام أحمد، حدثني أبي، ثنا أسود بن عامر، حدثني عبد الحميد بن أبي جعفر يعني: الفراء، عن إسرائيل، عن أبي إسحاق، عن زيد بن يثيع، عن علي قال: قيل:

يارسول الله امن يؤمر بعدك؟ قال: إن تؤمروا أبابكر تجدوه أميناً زاهداً في الدنيا راغباً في الأخرة، وإن تؤمروا عمر تجدوه قوياً أميناً، لا يخاف في الله لومة لائم، وإن تؤمروا

علياً، ولا أراكم فاعلين، تجدوه هادياً مهدياً، يأخذبكم الطريق المستقيم.

كذا رواه أحمد في مسنده.

﴿٤٢﴾ حضرت زید بن یثیع حضرت علی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کیا گیا: یارسول اللہ! آپ کے بعد کس کو امیر بنایا جائے؟ فرمایا: اگر تم ابوبکر ﷺ کو امیر بناؤ گے تو انہیں امین، دنیا سے کنارہ کش اور آخرت میں رغبت کرنے والا پاؤ گے، اور اگر تم عمر ﷺ کو امیر بناؤ گے تو انہیں قوی، امین اور اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت گر کی ملامت کی پرواہ نہ کرنے والا پاؤ گے اور اگر تم علی ﷺ کو امیر بناؤ گے، اور میں تمہیں ایسا کرنے والا نہیں دیکھ رہا، تو انہیں ہدایت دینے والا اور ہدایت یافتہ پاؤ گے، وہ تم کو صراطِ مستقیم پر لے کر چلے گا۔

جیسا کہ امام احمد نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے۔

(مسند أحمد ج١ ص١٠٩ حديث٨٥٩؛ فضائل الصحابة لأحمد ج١ ص٢٨٤ حديث٢٨٤؛ السنة لعبد الله بن أحمد ص٢١٨ حديث١١٨٦، وط: ج٢ ص٥٣٧ حديث١٢٥٧؛ مسند البزار ج٣ ص٣٣ حديث٧٨٣؛ المستدرك للحاكم ج٣ ص٦٩ حديث٤٤٩١؛ معرفة علوم الحديث للحاكم ص٢٩؛ المعجم الأوسط ج٣ ص٣٤١ حديث٢٨٦٦؛ أسد الغابة ج٤ ص٢١؛ الإصابة ج٤ ص٤٦٨، و ط: ج٧ ص٢٨٢؛ مشكاة ج٢ ص٥١٠ حديث٦١٣٣، وط: ص١٧٣١ حديث٦١٢٤؛ كشف الأستار ج٢ ص٢٥٥؛ تاريخ دمشق ج٤٢ ص٤١٩، ٤٢٠، ٤٢١؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٨ ص٣٢؛ البداية والنهاية ج٥ ص٤٧٧؛ جمع الفوائد ج١ ص٦٣٠ حديث٦٠١٨، وط: ج٢ ص٤٥٤ حديث ٦٠١٨)

شیخین ﷺ کی افضلیت کے بعض پہلو

اِن احادیث میں حضرات ابوبکر، عمر اور علی ﷺ کی ذواتِ مقدسہ میں اہلیتِ خلافت تقریباً برابر بیان کی گئی ہے، لیکن ہمارے بعض ائمہ نے شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کی اہلیتِ خلافت کو اُن کی افضلیت کی دلیل قرار دیا ہے۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک سوال ہوا:

سوال: اہل سنت کے نزدیک ثابت ہے کہ تفضیلِ شیخین ﷺ پر اجماع ہے تو حضرت علی المرتضیٰ

کرم اللہ وجہہ پر شیخین کی تفضیل ہر وجہ سے ثابت ہے یا نہیں؟

جواب: حضرات شیخین کی تفضیل حضرت علی المرتضیٰ پر ہر وجہ سے نہیں ہے بلکہ علماءِ محققین نے لکھا ہے کہ حضرات شیخین میں بھی کسی سے ایک صاحب کی تفضیل دوسرے صاحب پر ہر وجہ سے ثابت ہونا محال ہے۔اس واسطے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ جہاد سیفی وسنانی میں اور فن قضا و کثرت روایت حدیث میں اور ہاشمیت اور حسنیت میں اور علی الخصوص اس وجہ سے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ زوجیت کی قرابت ہے افضل ہیں۔ان وجوہ میں حضرت علیؓ کی تفضیل حضرت ابوبکرؓ پر قطعی طور پر ثابت ہے اور ایسا ہی حضرت علیؓ کی تفضیل حضرت عمرؓ پر قطعی طور پر ان امور میں ثابت ہے کہ حضرت عمرؓ سے پہلے حضرت علیؓ ایمان لے آئے اور ایسا ہی پہلے نماز بھی پڑھی۔ مراد اس امر سے کہ حضرات شیخین کو حضرت علیؓ پر فضیلت ہے یہ ہے کہ حضرات شیخین کو حضرت علی علیہ السلام پر صرف ان اُمور میں فضیلت ہے۔سیاست امت وحفظ دین وسدّ باب فتنہ وترویج احکام شریعہ وممالک میں اشاعت اسلام واقامت حدود وتعزیرات۔یہ ایسے اُمور ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے مانند انجام دینے میں حضرات شیخین کو حضرت علی علیہ السلام پر فضیلت ہے۔ ایسا ہی مقاصد خلافت کبریٰ کے ہیں اور اسی وجہ سے اس امر پر صحابہ کا اجماع ہوا کہ خلافت کبریٰ کے مقاصد میں حضرات شیخینؓ مقدم ہیں، بلکہ صواعق محرقہ اور دیگر کتب حدیث معتبرہ میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: سالتُ اللّٰہ ان یقدمک یاعلیُّ ویابی اللّٰہ الا تقدیم اَبی بَکرٍ ترجمہ: یعنی اے علی! میں نے سوال کیا اللہ تعالیٰ سے کہ وہ تم کو مقدم کرے اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکرؓ کے سوا کسی دوسرے کو مقدم کرنے سے انکار کیا"۔

(فتاوی عزیزی ص ٤١٢، ٤١٣)

سیدنا علی المرتضیٰ علیہ السلام کی ذاتِ مقدسہ کے تین پہلو ہیں:

۱۔ اہل بیت سے ہونا

۲۔ اہل بیت میں سے پھر اہلِ کساء سے ہونا

۳ صحابی، نبوی تربیت یافتہ اور خلیفہ ہونا۔

اس تیسرے اور مشترک پہلو کے لحاظ سے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اُن پر شیخین

کریمین رضی اللہ عنہما کی افضلیت بیان فرمائی اور وجہ یہ لکھی کہ انہوں نے خلافت کو نبوی طرز پر چلایا۔ بلاشبہ یہ ایک حقیقت ہے لیکن یہاں یہ بھی تو یاد رکھنا چاہیے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اگر تم علی کو خلیفہ بناؤ گے تو انہیں ھادی اور مھدی پاؤ گے اور وہ تمہیں صراطِ مستقیم پر چلائیں گے'' کیا صراط مستقیم اور منہاج نبوت میں کوئی فرق ہے؟ اگر نہیں تو پھر آپ کا کیا خیال ہے کہ اگر سیدنا علی المرتضیٰ ؓ کو پہلا خلیفہ بنایا جاتا تو اُن کے حق میں ''تجدوہ ھادیا مھدیا، یأخذ بکم الطریق المستقیم'' کے الفاظ والی نبوی پیش گوئی پوری نہ ہوتی؟ ضرور ہوتی مگر جو انہیں نہیں بنایا گیا تو یہ بھی نبوی پیش گوئی پوری ہوئی۔ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ بھی تو فرمایا تھا کہ ''لا اراکم فاعلین'' (میں تمہیں ایسا کرنے والا نہیں دیکھتا) اس سے معلوم ہوا کہ منہاجِ نبوی ﷺ کے مطابق امورِ خلافت کو چلانے میں بابُ مدینۃ العلم، بابُ دار الحکمۃ اور اقضی الامۃ ؑ کی ذات مقدسہ میں کوئی کمی نہیں تھی مگر بعض مصلحتوں اور حکمتوں کے پیشِ نظر خود اللہ تعالیٰ اور نبی کریم ﷺ نے انہیں پہلا خلیفہ نہ بنایا۔ وہ کونسی حکمتیں ہوسکتی ہیں؟ ان کا کچھ تذکرہ سیدنا فاروقِ اعظم اور امام زید بن علی ؓ کے الفاظ میں پہلے ہو چکا ہے اور بعض اہم حکمتیں علامہ ابن قیم الجوزیہ حنبلی نے بھی بیان کی ہیں اور انہیں ہم اپنی کتاب ''شرح خصائص علي ؓ'' (صفحہ ۳۴۹ وغیرھا) میں نقل کر چکے ہیں۔ زیر تشریح حدیث نمبر ۱۶۱۔

یہاں یہ حقیقت بھی مخفی نہ رہے کہ شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کی خلافت کے استحکام اور نسق و نظم کی بہتری میں بھی سیدنا علی المرتضیٰ ؓ کے علوم، تدبر اور مشوروں کی برکت شامل تھی۔ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

''پھر شیخین کے زمانہ میں مسائلِ دینیہ میں مشیر اور تدبیراتِ مُلکیہ میں وزیر بھی وہی ہوتے تھے''۔

(إزالۃ الخفاء ج ٤ ص ٥٠١)

مگر خود سیدنا علی المرتضیٰ ؑ کو اُن کے ایسا کوئی مدبر مشیر و وزیر میسر نہ آسکا، مگر قربان جاؤں کہ انتشار و شورش کے ماحول میں خلافت سنبھالنے کے باوجود انہوں نے ایسی بصیرت کے ساتھ حالات کا مقابلہ فرمایا کہ اُن کی علمی اور دینی شخصیتِ مقدسہ نہ صرف یہ کہ مکمل طور پر محفوظ رہی بلکہ ہر آنے والی ابتر حالت میں اُن کی دینی اور روحانی ترقی میں اضافہ بھی ہوتا رہا۔ وہ کیسے؟ اس کی دلچسپ تفصیل ہماری کتاب ''شرح خصائص علي ؓ'' کے صفحہ [۹۹۳] الطبعۃ الخامسۃ میں ملاحظہ فرمائیں۔

باپ اور بیٹے کے موقف میں تضاد

آپ نے پڑھا کہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے سیدنا علی المرتضیٰ پر جہاں شیخین کریمین ﷺ کی کلی افضلیت سے انکار فرمایا ہے وہیں حسب ذیل امور:

"جہاد سیفی وسنانی، فن قضا و کثرت روایت حدیث، ہاشمیت و حنفیت، علی الخصوص سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ زوجیت" کے باعث شیخین کریمین پر سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کی افضلیت کو قطعی قرار دیا ہے، جبکہ اُن کے والدِ گرامی شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کی کلی افضلیت کا قول کر دیا۔

چنانچہ ہمارے معاصر نے اُن کی عبارت مع ترجمہ نقل کی ہے، ہم فقط ترجمہ نقل کر رہے ہیں:

"شیخین کی افضلیت ایسا مسئلہ ہے جو شریعت سے ماخوذ ہے اور بحث کا حاصل یہ ہے کہ شریعت کے مطابق شیخین کو فضیلت کلی حاصل ہے۔ بس اس پر بحث کرتے وقت قرآن وسنت واجماع وقیاس سے شرعی دلائل پیش کرنے چاہییں نہ کہ صوفیاء کے مکاشفات، جان لو کہ صوفیاء کے مکاشفات سے کوئی شرعی حکم ثابت نہیں ہوتا (قرۃ العینین صفحہ ۳۱۸، ۳۱۷)

(ضرب حیدری ص 188)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ باپ بیٹے میں سے کس کی بات کو صحیح تسلیم کیا جائے؟ اس کا آسان جواب یہ ہے کہ یہاں بیٹے کے قول کو باپ کے قول پر نہ صرف یہ کہ ترجیح حاصل ہے بلکہ باپ کا قول کتاب وسنت کی روشنی میں مردود ہے، اور اس کا کوئی بھی ذی شعور کبھی قائل نہیں رہا۔ مطلع القمرین میں لکھا ہے:

"شیخین کی تفضیل من جمیع الوجوہ ماننے والے ذرہ سنبھل کر بتلائیں"۔

(مطلع القمرین ص ۹۱)

مطلع القمرین میں آگے صفحہ ۱۵۲، ۱۵۳ پر بھی افضلیتِ کلی کے قول کی تردید کی گئی ہے، مگر حیرت ہے کہ معاصر مذکور نے نہ صرف یہ کہ شاہ ولی اللہ کے مردود قول کو خاموشی سے قبول کر لیا بلکہ اس پر مہر تصدیق ثبت کرنے کی کوشش بھی کر ڈالی۔ چنانچہ وہ شاہ صاحب کے قول کے بعد لکھتے ہیں:

"عوام کا صوفیاء کے مکاشفات کو سمجھنا، خود صوفیاء کا اپنے مکاشفات کو سمجھنا، کشف کا صاحب کشف کے ظرف کے مطابق محدود ہونا، کشف کا بذاتِ خود ایک حجاب ہونا اور مکاشفات کا شرعی

حجت نہ ہونا ایسے دقائق اور لطائف ہیں کہ ہم ان پر مفصل بحث نہیں کرنا چاہتے البتہ اشارۃً ہم نے بہت کچھ عرض کر بھی دیا ہے۔اس قسم کی باتیں کر کے شریعت کا ڈسپلن خراب کرنے والے حبیب کریم ﷺ کی امت سے اچھا سلوک نہیں کر رہے"۔

(ضربِ حیدری ص188)

یہاں پیر سائیں نے صوفیہ کرام کے مکاشفات کو تسلیم کرنے کو شریعت کے ڈسپلن کی خرابی سے تعبیر کر دیا لیکن وہ اس سے قبل محدثین کرام کی تحقیق پر صوفیہ کے قول کو ترجیح دینے سے بھی باز نہیں آئے۔چنانچہ وہ ایک موضوع حدیث کو قابلِ قبول بنانے کی کوشش میں لکھتے ہیں:

"محدثین نے اسے حدیث مرفوع تسلیم نہیں کیا مگر بہت سے صوفیاء نے اسے حدیث مرفوع اور صحیح مانا ہے"۔

(ضربِ حیدری ص142)

پیر سائیں سے کوئی پوچھے کہ موضوع روایت کو فرمانِ رسول ﷺ بنا دینے سے کیا شریعت کا ڈسپلن خراب نہیں ہوتا؟ ایک اور مقام پر معاصر پیر سائیں نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے ایک آدھ بات کو تو کیا بلکہ بعض صوفیہ کرام کے بارے میں یہاں تک لکھ دیا کہ وہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ سے پوچھ پوچھ کر کتابیں لکھنے کے عادی تھے۔

(ضربِ حیدری ص189)

سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عدم ذکر کی وجہ

اس حدیث میں پہلے حضرت ابو بکر پھر حضرت عمر اور پھر سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا اور اُن کی خلافت کی اہلیت کا ذکر ہے اور حضرت عثمان غنی ذی النورین رضی اللہ عنہ کا ذکر نہیں ہے، حالانکہ تیسرے نمبر پر انہیں خلیفہ چنا گیا تھا۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا رسول اللہ ﷺ کے علم میں یہ بات نہیں ہوگی کہ لوگ انہیں بھی خلیفہ منتخب کریں گے؟

جواباً عرض ہے کہ یقیناً رسول اللہ ﷺ اپنے علم نبوت سے جانتے تھے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کیا جائے گا اور دوسری احادیث میں اس بات کا ذکر آیا بھی ہے، مثلاً وہ حدیث جس میں اُنہیں جنت کی بشارت دی گئی اور ساتھ ہی فرمایا گیا کہ ایک مصیبت انہیں پہنچے گی، اسی طرح وہ حدیث جس میں انہیں فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ

تمہیں ایک قمیص پہنائے گا جسے لوگ اتروانا چاہیں گے مگر تم نہ اتارنا وغیرھا۔ لیکن سوال پھر بھی قائم ہے کہ اِس حدیث میں اُن کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا؟ محدثین کرام نے اس حدیث کی تشریح میں یہ سوال اُٹھایا ہے اور اس کا جواب بھی دیا ہے۔ چنانچہ امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''حضرت عثمان غنی ﷺ کا صراحتاً ذکر نہیں کیا گیا لیکن سیدنا علی ﷺ کے حق میں حضور ﷺ کا ارشاد "وَلَا أُرَاكُمْ فَاعِلِيْنَ" (اور میں خیال کرتا ہوں کہ تم ایسا نہیں کرو گے) یعنی تم (سیدنا) عمر ﷺ کے بعد اُنہیں خلیفہ نہیں بناؤ گے، سے اشارہ ملتا ہے کہ حضرت علی ﷺ پر حضرت عثمان مقدم ہیں، یا پھر حضور اکرم ﷺ نے ان کا ذکر کیا ہوگا اور کاتب کے قلم سے رہ گیا ہوگا''۔

(شرح الطيبي على المشكاة ج۱۲ ص۳۸۹۹)

راقم الحروف کو جو بات سمجھ آتی ہے وہ یہ ہے کہ زیر بحث حدیث میں حضرات ابوبکر، عمر اور علی ﷺ کی خلافت کے ذکر کے ساتھ اُن کی خلافت کی کامیابی اور بہتری کے ذکر میں بھی نبی کریم ﷺ نے اپنے علم نبوت کی روشنی میں مخصوص جملے ارشاد فرمائے ہیں، اور ہر چند کہ سیدنا عثمان غنی ﷺ کا خلوص شکوک وشبہات سے بالاتر ہے مگر چونکہ اُن کے دور میں سازشی ٹولے کی ریشہ دوانیاں نگاہِ نبوت میں تھیں اور اُن سازشوں کی وجہ سے سیدنا عثمان غنی ﷺ کی خلافت کا دورانیہ مکمل بہتری پر مبنی نظر نہیں آرہا تھا اس لیے غیب دان نبی ﷺ نے اِس حدیث میں اُن کا ذکر نہ فرمایا۔ امام محمد بن شہاب الزھری ﷺ بیان کرتے ہیں:

''جب حضرت عثمان غنی ﷺ نے خلافت سنبھالی تو وہ بارہ برس خلیفہ رہے، انہوں نے پہلے چھ برس ایسے گذارے کہ لوگ اُن پر کوئی طعن نہ کر سکے، اور وہ حضرت عمر ﷺ سے قریش کو زیادہ محبوب تھے، اس لیے کہ حضرت عمر اُن پر سخت تھے، پس جب حضرت عثمان خلیفہ مقرر ہوئے تو انہوں نے قریش کے ساتھ نرم رویہ رکھا اور صلہ رحمی فرمائی، پھر وہ اُن کے معاملہ میں تساہل برتنے لگے اور آخری چھ سالوں میں اپنے عزیز واقارب کو عہدوں پر فائز فرمایا اور مروان کے لیے مصر کا خمس لکھ دیا، اور اپنے رشتہ داروں کو مال سے نوازا، اور فرمایا: حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کا جو حق بنتا تھا وہ انہوں نے چھوڑ دیا تھا اور میں نے اپنا حق لیا ہے اور اپنے رشتہ داروں میں تقسیم کیا ہے، پس اس وجہ سے لوگ اُن پر معترض ہوئے''۔

(الطبقات الكبرىٰ لابن سعد ج۳ ص۳۶، وط: ج۳ ص۶۰، وط: ج۳ ص۴۷؛ جمع الجوامع ج ۱۱

ص ۱۲۰)

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے لکھا ہے:

سیرت حضرت ذی النورین نسبت بسیرت حضرت شیخین مغایرتے داشت، زیراکہ گاہے از عزیمت برخصت تنزل می نمود۔

"حضرت ذوالنورین کی روش میں بہ نسبت شیخین (رضی اللہ عنہما) کی روش کے کچھ فرق تھا، کیونکہ حضرت ذوالنورین کبھی عزیمت سے رخصت کی طرف اتر آیا کرتے تھے"۔

(إزالة الخفاء فارسي مع ترجمه اردو ج۱ ص۵۸٦)

ایسا کیوں؟ اس لیے کہ اُن کی طبیعت میں نرمی اور صلہ رحمی ضرورت سے زائد تھی، حتیٰ کہ اسی نرم خوئی کی وجہ سے اُن سے عہدِ نبوت میں ایسا عمل ہو گیا جو نگاہِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں پسندیدہ نہیں تھا۔ فتح مکہ کے موقعہ پر جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "انتم الطلقاء" (تم آزاد ہو) کے الفاظ سے عام معافی کا اعلان فرمایا تھا وہیں چار افراد کے بارے میں فرمایا تھا:

اقتلوهم وإن وجدتموهم متعلقين بأستار الكعبة.

"انہیں قتل کر دینا اگر چہ وہ غلاف کعبہ کے ساتھ ہی چمٹے ہوں"۔

اِن چار میں ایک شخص عبداللہ بن سعد بن ابی سرح تھا، یہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا رضاعی بھائی تھا، یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آکر چھپ گیا، حتیٰ کہ اچانک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس کو لے آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کھڑا کر دیا اور عرض کیا: یارسول اللہ! اسے بیعت فرمائیے، تین مرتبہ عرض کیا اور تینوں مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انکار فرمایا: پھر تیسری مرتبہ کے بعد بیعت فرمالیا اور اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا:

اما كان فيكم رجل رشيد يقوم إلىٰ هذا حيث رآني، كففت يدي عن بيعته فيقتله؟ فقالوا ما ندري يارسول الله ما في نفسک، ألا أومات إلينا بعينک، قال: إنه لاينبغي لنبي أن تكون له خائنة الأعين.

"کیا تم میں کوئی ایسا اچھا آدمی نہیں تھا کہ جب اُس نے دیکھا کہ میں نے اُسے بیعت کرنے ہاتھ روک لیا تو وہ اُسے قتل کر دیتا؟ انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہم آپ کے ارادے کو نہیں جان سکے، آپ نے ہمیں آنکھ سے اشارہ کیوں نہ کیا؟ فرمایا: نبی کو زیب نہیں دیتا کہ اُس کی آنکھ

خیانت کرے"۔

(سنن أبي داود ج٣ ص٧٦ حديث ٢٦٨٣ و ج٤ ص١٦٩ حديث ٤٣٥٩؛ سنن النسائي ج٧ ص١٢٢ حديث ٤٠٧٨؛ مسند أبي يعلىٰ ج١ ص ٣٢١، ٣٢٢ حديث ٧٥٣، وط: ج٢ ص١٠٠ حديث ٧٥٧؛ شرح معاني الآثار ج٣ ص٣٣٠ حديث ٥٤٧٥؛ السنن الكبرىٰ للبيهقي ج٧ ص٤٠، وط: ج٧ ص٦٤ حديث ١٣٧٧٧؛ السيف المسلول علىٰ من سبّ الرسول للسبكي بتحقيق الغوج ص١٣٧ وبتحقيق أبوأسامة الهلالي ص١٥٢؛ الصارم المسلول لابن تيمية ص١١٥، ١١٦)

اسی وافر صلہ رحمی کے باعث حضرت عثمان ﷺ سے اُن کے رشتہ داروں نے ایسے نامناسب فوائد اٹھائے جو آل کار خود حضرت عثمان غنی ﷺ کے خلاف شورش بپا ہونے کا باعث قرار پائے، ایسے متعدد نامناسب فوائد میں ایک فائدہ وہ بھی ہے جو حضرت عثمان غنی ﷺ سے اُن کے چچا حکم بن ابوالعاص، مروان کے باپ نے اٹھالیا تھا، حضور ﷺ کو اُس کا مدینہ مقدسہ میں رہنا پسند نہیں تھا، آپ نے اُسے مدینہ بدر کردیا تھا لیکن وہ حضرت عثمان غنی ﷺ کی نرم خوئی یا صلہ رحمی سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں کامیاب ہوگیا اور مع فیملی سیدنا عثمان ﷺ کے دورِ خلافت میں مدینہ مقدسہ میں آدھمکا، پھر اس فیملی نے یہاں آکر وہ گل کھلائے جس کا خمیازہ اُمت آج تک بھگت رہی ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"حضرت عثمان غنی ﷺ کی شہادت کا سبب یہ ہوا کہ بڑے بڑے شہروں کے حکام اُن کے رشتہ دار تھے: شام پر مکمل طور پر حضرت معاویہ حاکم تھے، بصرہ میں سعید بن العاص تھا، مصر میں عبداللہ بن سعد بن ابی سرح تھے اور خراسان میں عبداللہ بن عامر تھے۔ جو لوگ حج کرنے آتے تو وہ اپنے امیر کی شکایت کرتے، اور حضرت عثمان ﷺ نرم خو، حلیم الطبع اور کثیر الاحسان تھے، وہ اپنے بعض گورنروں کو تبدیل فرما کر شکایت کناں لوگوں کو خوش کردیتے پھر انہیں گورنروں کو دوبارہ مقرر کردیتے، یہاں تک کہ اہل مصر عبداللہ بن ابی سرح کی شکایت لے کر آئے تو انہوں نے اسے معزول کر کے حضرت محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کے نام گورنری کا حکم لکھ دیا تو وہ لوگ راضی ہوگئے، پھر وہ لوگ ابھی راہ میں تھے کہ انہوں نے ایک اونٹ سوار کو دیکھا...... اس کے بعد مروان کی اُس آخری شرارت کا ذکر ہے جو قتلِ عثمان غنی ﷺ کا سب سے بڑا سبب بنی"۔

(الإصابة في تمييز الصحابة ج٤ ص٣٧٩، وط: ج٧ ص١٠٥)

سیدنا عثمانِ غنی ﷛ کے اِن رشتہ داروں کے گھس آنے پر محض عام لوگ ہی نہیں بلکہ صحابہ کرام ﷡ بھی نالاں تھے۔ عشرہ مبشرہ کے فضائل ومناقب میں مشہور ترین مصنف امام محب الدین طبری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس بات کی تصریح کی ہے، اور انہوں نے آخری چھ سالوں کی طرف بھی توجہ کرائی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ امام زھری ﷬ نے حضرت سعید بن المسیب ﷬ سے شہادتِ عثمان غنی ﷛ کا سبب پوچھا تو انہوں نے فرمایا:

''جب حضرت عثمان ﷛ خلیفہ مقرر ہوئے تو کچھ صحابہ کرام ﷡ نے اُن کی خلافت کو ناپسند کیا، اس لیے کہ حضرت عثمان ﷛ اپنی قوم کو محبوب رکھتے تھے۔ پس انہوں نے بارہ سال حکومت فرمائی اور بہ کثرت بنوامیہ کے اُن افراد کو والی بنایا جن کو رسول اللہ ﷺ کی صحبت میسر نہیں تھی، اُن کی کابینہ کے لوگوں کی حرکات کو رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام ﷡ مکروہ سمجھتے تھے، اُن کے خلاف شکایات آتیں تو حضرت عثمان غنی ﷛ توجہ نہ فرماتے، پھر جب آخری چھ سال آئے تو انہوں نے اپنے چچا کی اولاد کو گورنر اور امیر مقرر کر دیا اور عبداللہ بن ابی سرح کو مصر پر مقرر کیا......''۔

(تاریخ دمشق ج۳۹ ص۴۱۵ ومابعدها؛ الرياض النضرة ج۳ ص۵۶؛ موسوعة العشرة المبشرون بالجنة ج۱۰ ص۱۰۵، ۱۰۶)

اس عبارت میں ہے کہ سیدنا عثمان غنی ﷛ کی خلافت کو کچھ لوگوں نے ناپسند جانا، وہ کون لوگ ہیں؟ معلوم نہیں ہو سکا، البتہ اُن کے خلیفہ بنائے جانے پر سیدنا فاروقِ اعظم ﷛ کے وہی تحفظات تھے جو بالآخر خود حضرت عثمان غنی ﷛ اور قیامت تک امت کے لیے باعث تکلیف بنے۔ چنانچہ امام سیوطی بحوالہ امام اسحاق بن راھویہ حضرت ابومجلز ﷬ سے ایک مفصل روایت لائے ہیں، جس میں فاروقِ اعظم ﷛ کے سوال کے جواب میں خلافت کے لیے حضرات طلحہ اور زبیر بن العوام ﷞ کے نام پیش کرنے پر فاروقِ اعظم ﷛ نے اعتراض فرمایا، پھر کسی نے سیدنا علی المرتضیٰ ﷛ کا نام پیش کیا تو فاروقِ اعظم ﷛ نے اس کو بہت پسند کیا اور ساتھ ہی فرمایا: تم اُنہیں نہیں بناؤ گے۔ اتنے میں ولید بن عقبہ بول اٹھا:

قد علمنا الخليفة من بعدك، فقعد، فقال: من؟ قال: عثمان بن عفان، وكان الوليد أخا عثمان لأمه، قال: وكيف بحب عثمان المال وبره لأهل بيته؟.

''ہم آپ کے بعد خلیفہ کو جانتے ہیں، یہ کہہ کر بیٹھ گیا، حضرت عمر ﷛ نے فرمایا: کون ہے وہ؟ کہا:

عثمان بن عفان، اور ولید حضرت عثمانؓ کا ماں جایا بھائی تھا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا:
عثمان کی مال سے محبت اور اُن کی اپنے کنبہ سے رورعایت کے باوجود یہ معاملہ کیسے چلے گا؟"۔
(المطالب العالية ج٢ ص١٩٦ حديث ٢٠٣٨، وط: ج٩ ص٥٧٢ حديث ٢٠٩٠؛ جمع الجوامع ١١ ص٢٩٥ حديث ١٤٢٥، وط: ج١٦ ص٥٧ حديث ٢٣٢٧؛ كنز العمال ج٥ ص٧٣٥ حديث ١٤٢٥٨)

دوسری بات اس عبارت میں یہ ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ لوگوں کی شکایات پر توجہ نہیں کرتے تھے۔ ابن المسیبؒ کی معلومات کی حد تک یہ بات درست ہوگی لیکن جو معلومات مدوّن ہو کر ہم تک پہنچی ہیں اُن کی روشنی میں دیکھا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ ہر جائز شکایت پر توجہ کرتے اور اس کا ازالہ فرماتے تھے مگر اُن کا نچلہ عملہ کام خراب کر دیتا تھا۔ میرے اس خیال کی تائید اس کلام سے ہوتی ہے جسے بڑی تفصیل سے حافظ ابن کثیر نے نقل کیا ہے۔ طوالت سے بچنے کے لیے میں اس کا خلاصہ پیش کر رہا ہوں۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

"شوال المکرم ۳۵ھ میں مصریوں کا ایک لشکر مدینہ مقدسہ کی طرف آنے لگا تا کہ حضرت عثمان غنیؓ کے خلاف اعتراضات کو پیش کرے، اُن کے پہنچنے سے قبل ابن ابی سرح کے ذریعے حضرت عثمان غنیؓ کو اُن کی آمد کی اطلاع ہوگئی تو اُنہوں نے حضرت علیؓ سے کہا: آپ اُن لوگوں کو سمجھا بجھا کر مدینہ میں داخل ہونے سے پہلے واپس اُن کے شہروں کی طرف بھیج دیں۔ سیدنا علیؓ اُن لوگوں کی طرف گئے، وہ اُن کی تعظیم و توقیر کرتے تھے، اُنہوں نے انہیں سمجھایا، اُن کے اعتراضات کا شافی جواب دیا اور انہیں سخت سست کہہ کر لوٹا دیا...... پھر حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کے پاس آکر اُن کے اعتراضات کی اور اُن کے پلٹ جانے کی اطلاع دی اور مشورہ دیا کہ آپ لوگوں کو ایک خطبہ دیں اور اپنے اقارب کو عہدوں پر فائز کرنے پر اُن سے معذرت کریں، اور انہیں خود پر گواہ بنائیں کہ آپ نے پچھلے امور سے رجوع کر لیا ہے اور شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کی سیرت پر تسلسل کا عزم کر لیا ہے، جیسا کہ ابتدائی چھ سال گذرے ہیں۔ حضرت عثمانؓ نے اس نصیحت کو غور سے سنا اور اس کو قبول فرمایا۔ پھر جب جمعہ کا دن آیا تو انہوں نے لوگوں کو خطبہ دیا اور اثنائے خطبہ میں دونوں ہاتھ بلند کر کے فرمایا: یا اللہ! میں تیری بارگاہ میں استغفار اور توبہ کرتا ہوں، یا اللہ! جو کچھ مجھ سے صادر ہوا میں اُس سے توبہ کرتا ہوں۔ یہ الفاظ

ادا کرتے ہوئے سیدنا عثمانِ غنی ﷺ کی چشمانِ مقدس سے آنسو چھلکنے لگے تو تمام کے تمام لوگ رونے لگے، اور اُن پر اپنے امام کی وجہ سے شدید رقت طاری ہوئی۔ حضرت عثمان ﷺ نے لوگوں کو گواہ بناتے ہوئے فرمایا کہ انہوں نے خود پر پھر سے شیخین کریمین ﷺ کی سیرت لازم کرلی ہے۔......

اسی طرح بصرہ اور کوفہ کے لوگوں کے سامنے اُنہوں نے ایک خطبہ دیا تو اس پر حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہما نے کھڑے ہو کر عرض کیا: یا امیر المومنین! اللہ آپ کے مافی الضمیر کا مالک ہے، آپ نے جو کچھ فرمایا ہے اس کو پورا کرنا۔ پھر جب حضرت عثمان ﷺ اپنے گھر کی طرف پلٹے تو مروان آ کر کہنے لگا: یا امیر المومنین! میں کچھ بولوں کہ نہ بولوں؟ حضرت عثمان ﷺ کی زوجہ نائلہ بنت فرافصہ الکلبیہ پردہ کے پیچھے سے بولیں: بلکہ خاموش رہو، خدا کی قسم وہ لوگ تو انہیں قتل کر دیتے، اور یقیناً انہوں نے جو کچھ فرمایا ہے اُس سے رجوع کرنا مناسب نہیں۔ اس پر مروان کہنے لگا: تو کون ہوتی ہے؟ اللہ کی قسم تیرا باپ اس حال میں مرگیا کہ اُسے وضو کا طریقہ بھی نہیں آتا تھا۔ بی بی صاحبہ نے فرمایا: ماں باپ کے تذکرہ کو رہنے دے اور آڑے ہاتھوں مروان کے باپ الحکم کو لیا تو مروان اُن سے منہ پھیر کر کہنے لگا: امیر المومنین! میں بولوں کہ نہ بولوں؟ حضرت عثمان ﷺ نے فرمایا: بولو۔ کہنے لگا: امیر المومنین میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، جو کچھ آپ نے فرمایا ہے میری خواہش ہے کہ یہ اُس وقت فرمایا ہوتا جب آپ کا مکمل کنٹرول تھا تو سب سے پہلے اس بات کو میں قبول کرتا اور اس پر تعاون کرتا لیکن آپ نے تو اُس وقت فرمایا ہے جب پانی پل پر سے گذر چکا ہے، خدا کی قسم! اُس خطا پر قائم رہ کر بعد میں مغفرت مانگ لینا اُس توبہ سے بہتر ہے جس پر خوف کے سائے منڈلاتے ہوں۔ اگر آپ توبہ پر قائم رہتے ہیں اور ہمارے حق میں (اقارب کو مناصب پر فائز کرنے والی) اس لغزش کو قائم نہیں رکھتے تو لوگ تو اب بھی آپ کے دروازے پر پہاڑوں کی طرح جمع ہیں۔ اس پر حضرت عثمان ﷺ نے فرمایا: اٹھ کر باہر جاؤ اور اُن لوگوں کے ساتھ بات کرو، مجھے اب اُن کے ساتھ بات کرنے سے شرم آتی ہے۔ مروان باہر نکلا تو لوگ واپسی کے لیے ایک دوسرے کو سواریوں پر بٹھانے میں مشغول تھے، یہ کہنے لگا: تم کیوں آئے تھے؟ تمہاری شکلیں بگڑ جائیں گویا تم لوٹ مار کرنے

کے لیے آئے تھے، سب لوگ اپنے کانوں کو پکڑنے لگے۔ یہ پھر کہنے لگا: تم اس لیے آئے تھے کہ ہمارے قبضہ سے حکومت چھین لو؟ لوٹ جاؤ! ہم تمہارے ہاتھوں مغلوب ہونے والے نہیں۔ کچھ لوگ لوٹ گئے اور کچھ لوگوں نے سیدنا علی ﷜ کی خدمت میں آ کر شکایت کی تو سیدنا علی ﷜ نے غصہ کے عالم میں حضرت عثمان ﷜ کے پاس آ کر فرمایا: آپ مروان کی بات کو پسند کرتے ہیں اور وہ آپ پر راضی نہیں ہوگا یہاں تک کہ آپ اپنے دین اور فیصلہ سے پھر جائیں، آپ کی حالت اُس اونٹنی کی سی ہے جو بغیر نکیل کے جدھر مرضی آئے چلی جاتی ہے۔ خدا کی قسم مروان کی کوئی رائے نہیں، نہ دین میں اور نہ ہی اُس کے اپنے مفاد میں، خدا کی قسم وہ آپ کو گرداب ہلاکت میں ڈال کر آپ کی طرف مڑ کر دیکھے گا بھی نہیں، اور میں اپنی اس گفتگو کے بعد آپ کو کوئی نصیحت نہیں کروں گا، آپ نے اپنی عظمت داؤ پر لگا دی ہے اور آپ کے معاملہ پر غلبہ پا لیا گیا ہے۔

جب حضرت علی ﷜ چلے گئے تو حضرت نائلہ حاضر ہو کر کہنے لگیں: مجھے بولنے کی اجازت ہے؟ فرمایا: بولو، عرض کرنے لگیں: میں نے علی کی باتیں سنی ہیں، وہ آپ کی طرف دوبارہ نہیں آئیں گے اور آپ نے مروان کی بات مان لی ہے وہ آپ کو جیسے چاہے گا چلائے گا۔ فرمایا: پھر میں کیا کروں؟ عرض کیا: اللہ وحدہ لاشریک لہ کا تقویٰ اختیار فرمائیں اور اپنے ماقبل کے ساتھیوں کی سنت پر عمل فرمائیں، آپ نے جب بھی مروان کی بات مانی اُس نے آپ کو مروا دیا، کسی شخص کے دل میں مروان کی قدر و قیمت اور محبت نہیں ہے، آپ حضرت علی کی طرف آدمی بھیج کر انہیں طلب فرمائیں تاکہ وہ اصلاح کرا دیں، وہ آپ کے قرابت دار ہیں اور اُن کی بات کو بھی نہیں ٹالا جاتا۔ حضرت عثمان ﷜ نے حضرت علی ﷜ کی طرف آدمی بھیجا تو انہوں نے آنے سے انکار کرتے ہوئے فرمایا: میں انہیں آگاہ کر چکا ہوں کہ میں پلٹ کر نہیں آؤں گا۔ مروان کو حضرت نائلہ کی یہ بات پہنچی تو وہ حضرت عثمان ﷜ کے پاس آ کر کہنے لگا: میں بولوں کہ نہ بولوں؟ فرمایا: بولو، وہ کہنے لگا: نائلہ بنت فرافضہ، حضرت عثمان ﷜ نے اُسے ٹوکتے ہوئے فرمایا: اُن کے بارے میں کوئی ایسا حرف نہ بولنا کہ وہ تمہیں تمہارے منہ پر اُسی طرح کہہ دے۔ خدا کی قسم! وہ میرے حق میں تمہاری بہ نسبت میری زیادہ خیر خواہ ہے، اس پر مروان چپ سادھ گیا''۔

(البدایة والنهایة ملخصاً ج۷ ص ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۹؛ تاریخ ابن خلدون ج۱ ص ٦٦٩)

اس قدر طویل کلام کا خلاصہ نقل کرنے کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ سیدنا عثمان غنی ﷺ خلوصِ قلب سے دین کے خیر خواہ تھے اور ہر جائز بات یا شکایت پر توجہ فرماتے تھے مگر اُن کی نرم خوئی سے اُن کے رشتہ داروں نے ناجائز فائدے اٹھائے اور اُن کی تمام تر برائیوں کا خمیازہ اُس پیکرِ حلم و وفا کو بھگتنا پڑا، رضی اللہ عنہ و ارضاہ عنّا پھر اُن کے بعد سیدنا علی ﷺ کو بھگتنا پڑا اور اب تک امت بھگت رہی ہے۔

بہر حال یہ وجوہات تھیں جن کے مدنظر مطلع علی الغیب نبی کریم ﷺ نے زیرِ تشریح حدیث میں سیدنا عثمان غنی ﷺ کی خلافت کا ذکر نہیں فرمایا، کیونکہ اُن کے مستقبل کے حوالے سے کوئی ایسا جملہ نہیں فرمایا جا سکتا تھا جیسا کہ دوسرے تین خلفاء کرام ﷺ کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا، تاہم جیسا کہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ دوسری احادیث میں اُن کی خلافت کے بارے میں تلمیحات و اشارات موجود ہیں۔

ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب اُنہوں نے خلافت سنبھالی اُس وقت اُن کی عمر مبارک [۷۰] ستر برس سے تجاوز کر چکی تھی۔ جبکہ اُن سے پہلے خلیفہ [۶۳] تریسٹھ برس کی عمر میں وفات پا گئے اور وہ اپنی اُس عمر میں دعا مانگا کرتے تھے:

> اللهم كبرت سني، وضعفت قوتي، وانتشرت رعيتي، فاقبضني إليك غير مضيع ولا مفرط.
>
> ''اے اللہ! میں بوڑھا ہو چکا ہوں، میری طاقت میں کمی آگئی ہے اور میری رعایا پھیل گئی، لہٰذا کسی قسم کی افراط و تفریط کے بغیر مجھے اپنے پاس بلا لے''۔

(محض الصواب في فضائل عمر بن الخطاب ﷺ ص ۷۹٤)

تنبیہ

یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ چونکہ انسانوں میں انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ کوئی شخص معصوم نہیں ہے اس لیے سیدنا عثمانِ غنی ﷺ کا ہر وہ عمل جو شیخین کریمین ﷺ کی سنت کے خلاف تھا اُسے اُن کی لغزش سمجھنا تو جائز ہے مگر فسادِ نیت قرار دینا جائز نہیں۔ بیشک محتاط اہلِ علم نے اُن کے ایسے اقدام کو لغزش سمجھا اور لغزش کہا مگر کسی عقل مند اور خوفِ خدا رکھنے والے شخص نے اُن کے کسی اقدام کو بدنیتی پر مبنی نہیں کہا۔ چنانچہ اولیٰ عمل کو ترک کرنے کی حد تک محتاط اور متقی ہستی سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے سیدنا عثمان ﷺ کا دفاع کرتے ہوئے اُن کے ایسے اقدامات

کو "ذنباً صغيراً" تو فرمایا مگر اُن کی نیت پر کوئی حکم نہیں لگایا۔

(فضائل الصحابة ج۲ ص۷۳٦ حديث۱۰۱۲)

بھلا کوئی اور شخص اُن کی نیت پر کیا حکم لگا سکتا ہے جبکہ دلوں کے احوال جاننے والی ذات سید السادات سیدنا محمد علیہ التحیۃ والصلوات نے اُن کے حق میں فرمایا تھا:

ما علیٰ عثمان ما عمل بعد هذه.

''اس کے بعد عثمان جو بھی عمل کرے اُس پر کوئی مواخذہ نہیں''۔

ایک اور حدیث میں ہے:

ما ضر عثمان ما عمل بعد اليوم.

''آج کے بعد عثمان جو عمل کرے اُسے کوئی ضرر نہیں''۔

(الرياض النضرة ج٤ ص١٦)

اس ارشادِ نبوی ﷺ سے صاف ظاہر ہے کہ اعمال تو ایسے ضرور ہوں گے جو مواخذۂ الٰہی کا باعث ہوا کرتے ہیں لیکن چونکہ وہ بدنیتی سے پاک اور اچھی تاویل پر مبنی ہوں گے اس لیے وہ آخرت میں مواخذہ کا باعث نہیں ہوں گے، مگر دنیا میں وہ اعمال اُن کے لیے اذیت و شہادت کا باعث اور امت کے لیے قیامت تک پریشانیوں کا باعث ضرور ثابت ہوئے۔ وَاللّٰهُ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ.

کیا چوتھے خلیفہ فتنوں کا سبب تھے؟

بعض عقل و دل کے اندھے کہہ دیتے ہیں کہ فتنوں کا آغاز چوتھے خلیفہ کے دور سے ہوا۔ اس سے کچھ عوام یہ سمجھتے ہیں کہ شاید فتنوں کا سبب سیدنا علی المرتضیٰ ؓ کی ذات پاک تھی، لیکن یہ ضلالتِ بینہ ہے اور اگر عداوت کی وجہ سے ہو تو منافقت ہے۔ اِن فتنوں کا سبب وہ ذات کیونکر ہو سکتی ہے جس کے قلب و زبان کی حفاظت کی ضمانت خود لسانِ نبوی ﷺ نے دی ہو، اور جن کے بارے میں واضح ارشاد ہو کہ وہ تمہیں صراطِ مستقیم پر چلائیں گے۔ چونکہ یہ لوگ عقل و دل کے اندھے ہیں اس لیے انہیں یہ یاد نہیں رہتا کہ سیدنا علی المرتضیٰ ؓ اُس اہلِ بیت کے سردار ہیں جن کے تمسک میں ہدایت کی حتمی ضمانت ہے۔ اہلِ سنت کے نزدیک ان فتنوں کا سبب نہ تو سیدنا علی المرتضیٰ ؑ تھے اور نہ ہی سیدنا عثمان غنی ؓ تھے بلکہ اِن فتنوں کا واحد سبب سیدنا عثمان غنی ؓ کے وہ رشتہ دار تھے جو مستقبل میں

اقتدار کے خواہش مند تھے، بلکہ بعض مؤرخین نے اُن کے بعض مشہور رشتہ داروں کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اُنہیں مقتول دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ امام فسوی، امام ابن عساکر اور امام ذہبی لکھتے ہیں:

اقام عبد اللّٰه بن سعد بعسقلان، بعد قتل عثمان، وكره أن يكون مع معاوية، وقال: لم أكن لأجامع رجلا قد عرفته، إن كان ليهوي قتل عثمان.

''عبداللہ بن سعد بن ابی سرح، سیدنا عثمان غنی ﷺ کی شہادت کے بعد عسقلان میں رہنے لگا اور معاویہ کے ساتھ رہنا پسند نہ کیا اور کہا: میں اُس شخص کے ساتھ نہیں رہوں گا جس کے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ وہ حضرت عثمان ﷺ کا قتل چاہتا تھا''۔

(المعرفة والتاريخ ج١ ص١٠٢؛ تاريخ دمشق ج٢٩ ص٤٢؛ سير أعلام النبلاء ج٣ ص٣٥)

جو صاحب سیدنا عثمان بن عفان ﷺ کا مقتول ہونا چاہتے تھے، بعد میں اُنہوں نے اسی قتل پر اپنے معاملہ کو چلایا۔ چنانچہ ملا علی قاری مشہور حدیث "الفئة الباغية" کی تشریح میں لکھتے ہیں:

فتبين بهذا أنه كان في الباطن باغياً وفي الظاهر متستراً بدم عثمان مراعياً مرائياً، فجاء هذا الحديث عليه ناعياً وعن عمله ناهياً، لكن كان ذلك في الكتاب مسطوراً، فصار عنده كل من في القرآن والحديث مهجوراً.

''اس سے ظاہر ہوا کہ وہ باطن میں باغی تھے اور ظاہراً قصاصِ عثمان (ﷺ) کی آڑ لے کر دکھاوا کرنے والے تھے۔ پس یہ حدیث ان پر طعن کرنے والی ہے اور ان کی اتباع سے روکنے والی ہے، لیکن وہی ہو کر رہا جو تقدیر میں لکھا تھا تو ان کے نزدیک جو کچھ قرآن و حدیث میں مرقوم تھا سب متروک ہو گیا''۔

(مرقاة شرح مشكاة ج١٠ ص٢٠٠، ٢٠١)





عراق آمد پر سیدنا علی ﷺ سے استفسار

﴿٤٣﴾ وأخبرنا الثقات من شيوخنا ومنهم أبو العباس بن أحمد بن عبد الكريم إذنًا،أن عبد الخالق بن علوان أخبرهم،أنا ابن قدامة الإمام،أنا ابن البطي،أنا مالك بن أحمد، ثنا أبو الحسين بن بشران،أنا أبو الفضل بن خزيمة، ثنا عبد اللّٰه بن روح، ثنا شبابة، ثنا أبو بكر الهذلي،عن الحسن قال:لما قدم علي ﷺ البصرة قام إليه ابن الكواء وقيس بن عبادة فقالا: ألا تخبرنا عن مسيرك هذا الذي سرت فيه يضرب الناس بعضهم ببعض؟أعهد من رسول اللّٰه ﷺ؟ فحدثنا فأنت الموثوق المأمون فقال:أما أن يكون عندي عهد من النبي ﷺ في ذلك فلا،واللّٰه إن كنت أول من صدق به لاأكون أول من كذب عليه، ولو كان عندي منه عهد ما تركت أخا بني تميم بن مرة وعمر بن الخطاب يتوثبان على منبر،ولقاتلتهما بيدي ولو لم أجد إلا بردي هذا،ولكن رسول اللّٰه ﷺ لم يقتل قتلا،ولم يمت فجأة، مكث في مرضه أياماً وليالي، يأتيه المؤذن فيؤذنه بالصلاة فيأمر أبابكر فيصلي بالناس،وهو ﷺ يرى مكاني،ولقد أرادت امرأة من نسائه أن تصرفه عن أبي بكر فأبى وغضب،وقال:أنتن صواحب يوسف، مروا أبابكر يصلي بالناس، فلما قبض نظرنا في أمورنا فاخترنا لدنيانا من رضيه رسول اللّٰه ﷺ لديننا، وكانت الصلاة رأس الإسلام وقوامه، فبايعنا أبابكر،وكان لذلك أهلا،ولم يختلف عليه منا اثنان،ولم يشهد بعضنا على بعض،ولم يقطع منه البراء،فأديت إلى أبي بكر حقه،وعرفت له طاعته وغزوت معه في جنوده، وكنت آخذ منه إذا أعطاني، وأغزو إذا أغزاني، وأضرب بين يديه الحدود بسوطي، فلما قبض ولاها عمر، فأخذها بسنة صاحبه،وما يعرف من أمره، فبايعنا عمر،لم يختلف عليه منا اثنان، فأديت إليه حقه،وعرفت له طاعته،وغزوت معه في جنوده،وكنت آخذ إذا أعطاني، وأغزو إذا أغزاني،أضرب بين يديه الحدود بسوطي، فلما قبض تذكرت في نفسي قرابتي وسابقتي،وفضلي وأنا أظن أن لا يعدل بي،ولكن خشي أن لايعمل الخليفة بعده شيئاً،إلا لحقه في قبره،فأخرج منها نفسه وولده، ولو كانت محاباة منه لآثر بها ولده،فبرئ منها إلى رهط أنا أحد هم، فلما اجتمع الرهط تذكرت في نفسي قرابتي،

وسابقتي، وفضلي، وأنا أظن لايعدلوا بي،فأخذ عبد الرحمن مواثيقنا،أن نسمع،ونطيع لمن ولاه أمرنا،ثم أخذ بيد ابن عفان،فضرب بيده،أي بايعه،فنظرت في أمري فإذا طاعتي قد سبقت بيعتي،وإذا ميثاقي قد أُخِذ لغيري،فبايعنا عثمان، فأديت إليه حقه، وعرفت له طاعته، وغزوت معه في جيوشه،وكنت آخذ إذا أعطاني،وأغزو إذا أغزاني،وأضرب بين يديه الحدود بسوطي،فلما أصيب نظرت في أمري، فإذا الخليفتان اللذان أخذاها بعهد رسول الله ﷺ بالصلاة قد مضيا، وهذا الذي قد أخذله ميثاقي قد أصيب،فبايعني أهل الحرمين،وأهل هذين المصرين .

هذا إسناد جيد،وإن كان فيه أبوبكرالهذلي وقد ضعف، فقد رواه الإمام الحجة إسحاق بن راهويه في مسنده فقال:

﴿٤٣﴾ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ بصرہ تشریف لائے تو ابن الکواء اور قیس بن عبادہ نے کھڑے ہوکر دریافت کیا: آپ ہمیں اپنی اِس آمد کے متعلق بتلائیں جس میں لوگ ایک دوسرے کو مار رہے ہیں، آیا یہ رسول اللہ ﷺ کی جانب سے آپ سے کوئی عہد لیا گیا تھا تو بیان فرمائیے! آپ بااعتماد اور امین ہیں؟ فرمایا: اس سلسلے میں میرے پاس رسول اللہ ﷺ کی جانب سے کوئی عہد نہیں، اللہ کی قسم میں اُن کی تصدیق کرنے میں اول ہوں تو اُن پر جھوٹ باندھنے میں اول نہیں بنتا، اگر میرے پاس اُن کی جانب سے کوئی عہد ہوتا تو میں بنو تیم بن مرہ کی برادری کے فرد اور عمر بن خطاب کو اُن کے منبر پر نہ بیٹھنے دیتا، اور اپنی طاقت سے اُن سے لڑتا اور اگر اور کچھ نہ پاتا تو اس چادر سے ہی لڑتا، لیکن رسول اللہ ﷺ نہ قتل کیے گئے اور نہ ہی اُن کا اچانک وصال ہوا، وہ کئی شب و روز بیماری میں رہے، مؤذن اُن کی بارگاہ میں حاضر ہوکر نماز کی اطلاع کرتا تو وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حکم فرماتے کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں، اور آپ ﷺ میرے مقام کو سمجھتے تھے، اور اُن کی بعض ازواجِ مقدسہ نے چاہا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اس حکم کو پھیر دیا جائے تو حضور ﷺ نے انکار فرمایا اور غضب ناک ہوکر فرمایا: تم یوسف علیہ السلام کی عورتوں کی طرح ہو، ابوبکر کو کہو وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا تو ہم نے اپنے معاملات میں غور کیا تو اس شخص کو ہم نے اپنی دنیا کے لیے منتخب کر لیا جس کو رسول اللہ ﷺ نے ہمارے دین کے لیے منتخب فرمایا تھا، اور نماز اسلام کا طرہ اور اس کی بنیاد ہے، لہٰذا ہم نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی اور وہ اس کے اہل تھے، ہم میں سے دو شخص بھی اُن کے خلاف نہیں ہوئے اور نہ ہم

میں سے کوئی ایک دوسرے کا مخالف ہوا، اور نہ ہی ہم اُن سے دور ہوئے، میں نے حضرت ابوبکر ؓ کے حقوق ادا کئے اور اُن کی طاعت کا حق پہچانا اور اُن کے ساتھ غزوات میں شرکت کی، اور میں اُن کے ہدایا قبول کرتا رہا اور اُن کے حکم سے غزوات میں لڑتا رہا، اور اُن کے سامنے اپنے درّے سے حدود قائم کرتا رہا۔ پھر جب اُن کا انتقال ہوا تو حضرت عمر ؓ خلیفہ منتخب ہوئے تو انہوں نے اپنے ساتھی کی سنت اور اُن کے احکام کو اپنایا تو ہم نے عمر ؓ کی بیعت کرلی، اس پر ہم میں سے دو شخصوں نے بھی اختلاف نہ کیا، میں نے ان کے حقوق ادا کیے، ان کی طاعت پہچانی، ان کے ساتھ لشکر میں شامل ہوکر غزوات کئے، جب انہوں نے دیا میں نے قبول کیا، جب انہوں نے غزوہ میں بھیجا تو میں گیا، اُن کے سامنے اپنے درّے سے حد قائم کی، جب اُن کا انتقال ہوا تو میں نے اپنے دل میں اپنی قرابت، اسلام میں سبقت اور فضیلت کو یاد کیا اور میں نے گمان کیا کہ وہ کسی کو میرے برابر نہیں سمجھیں گے لیکن انہیں اندیشہ ہوا کہ اُن کے بعد خلیفہ جو کچھ بھی کرے گا اُس کا مزہ انہیں قبر میں پہنچے گا، لہٰذا انہوں نے خود کو اور اپنی اولاد کو اس کی ذمہ داری سے دور رکھا، اگر اُن کے دل میں کچھ لالچ ہوتا تو وہ اپنی اولاد کو ترجیح دیتے، لیکن وہ اس سے آزاد رہتے ہوئے اس کا معاملہ ایک مجلس شوریٰ پر چھوڑ گئے میں بھی اُن میں شامل تھا۔ پھر جب وہ مجلس جمع ہوئی تو میں نے اپنے دل میں اپنی قرابت، اسلام میں سبقت اور فضیلت کو یاد کیا اور گمان کیا کہ یہ لوگ کسی کو میرے برابر نہیں بنائیں گے لیکن حضرت عبدالرحمان بن عوف ؓ نے ہم سے عہد لیے کہ وہ ہم میں سے جس کو خلیفہ بنائیں گے ہم اس کا حکم سنیں گے اور اطاعت کریں گے، پھر انہوں نے حضرت عثمان ؓ کا ہاتھ پکڑ کر اُس پر اپنا ہاتھ مارا یعنی بیعت کرلی، سو میں نے اپنے معاملہ میں غور کیا تو میری اطاعت میری بیعت پر سبقت کر گئی اور مجھ سے عہد میرے غیر کے لیے لیا گیا، پس ہم نے حضرت عثمان ؓ کی بیعت کرلی اور ان کے حقوق ادا کیے اور ان کی طاعت کو پہچانا، اُن کے لشکر میں جہاد کیے، جب انہوں نے دیا میں نے قبول کیا اور جب انہوں نے غزوہ میں بھیجا تو میں گیا اور اپنے درّے سے ان کے سامنے حد قائم کی، پھر جب اُن پر آزمائش آپہنچی تو میں نے اپنے معاملہ میں غور کیا تو وہ دو خلیفے جن سے رسول اللہ ﷺ نے نماز کا عہد لیا تھا وہ گذر چکے تھے اور یہ جن کے لیے مجھ سے عہد لیا گیا شہید کر دیئے گئے تو اہل حرمین اور اِن دو شہروں کے لوگوں نے میری بیعت کرلی۔

یہ سند جید ہے، اگرچہ اس میں ابوبکر الھذلی ہے اور اس کو ضعیف کہا گیا ہے لیکن اس حدیث کو امام الحجۃ اسحاق بن راھویہ نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے، پس انہوں نے فرمایا:

ابوبکر الھذلی پر جرح

مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی سند کو جید قرار دیا ہے لیکن "أسنى المطالب في مناقب علي بن أبي طالب" کے محقق شیخ علی احمد عبدالعال الطہطاوی نے کہا ہے کہ اس حدیث کی سند میں ایک شخص ابوبکر الھذلی ہے اور اس کے ہوتے ہوئے یہ سند کیونکر حسن ہو سکتی ہے؟ ہر چند کہ شیخ طہطاوی جرح میں غیر معتدل ہیں مگر اُن کا یہ قول صحیح ہے۔ میں نے "تهذيب التهذيب" کا مطالعہ کیا تو ابوبکر الھذلی کی تعدیل میں مجھے ایک قول بھی نہیں ملا، سب نے اس پر جرح کی حتیٰ کہ بعض نے کہا:

كان يكذب.

"وہ جھوٹ بولتا تھا"۔

(تهذيب التهذيب ج ١٠ ص ٤٨)

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے "تقریب" میں جو خلاصہ پیش کیا ہے وہ یہ ہے:

أخباري متروك الحديث.

"قصہ گو ہے، متروک الحدیث ہے"۔

(تقريب التهذيب ج ٢ ص ٧٠٢)

اس روایت کے موضوع ہونے پر یہ بات بھی دلالت کرتی ہے کہ اس میں سیدنا علی المرتضیٰ ﷛ کی طرف یہ جملہ منسوب ہے کہ انہوں نے فرمایا: "لم يختلف علينا منا اثنان" (ہم میں سے دو شخصوں نے بھی حضرت ابوبکر ﷛ کی خلافت پر اختلاف نہیں کیا تھا) حالانکہ انصار کی ایک جماعت نے کہا تھا: "لم نبايع إلا عليا" (ہم علی المرتضیٰ ﷛ کے علاوہ بیعت نہیں کریں گے) [تاريخ الطبري ج ٢ ص ٢٣٣] اور خزرج کے سردار سیدنا سعد بن عبادہ بن دلیم الخزرجی الانصاری ﷛ نے تو تا وصال سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی بیعت نہیں فرمائی تھی، اور یہ عام شخص نہیں بلکہ جلیل القدر صحابی تھے۔ علماء و محدثین نے تفصیل سے ان کے حالات قلم بند کئے ہیں۔ ہم ان کا خلاصہ "الإصابة" سے نقل کر رہے ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"یہ سید الخزرج تھے، بیعت عقبہ میں شریک تھے، نقباء میں سے ایک نقیب تھے، غزوہ بدر میں ان کی شرکت کے بارے میں اختلاف ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اُن کی شرکت بیان فرمائی

ہے، انہیں کامل کہا جاتا تھا، یہ، ان کے والد، ان کے دادا اور ان کی اولاد جود وسخاوت میں مشہور تھے۔ ان کا ایک ٹیلہ تھا جس پر کھڑے ہوکر یہ ہر روز یہ آواز بلند فرمایا کرتے تھے: جس شخص کو گوشت اور کھانا مطلوب ہو وہ دلیم بن حارثہ کے ڈیرے پر آجائے۔ امام ابن سیرین فرماتے ہیں: جب شام ہوتی تو اصحاب صفہ میں سے کوئی شخص ایک صاحب کو، کوئی دو کو اور کوئی ایک ٹولی کو لے جاتا اور حضرت سعد اَسّی [۸۰] افراد کو لے جاتے تھے۔ حضرت سعد کا پیالہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ آپ کی تمام ازواجِ مقدسہ کے گھروں میں گھومتا تھا۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں: تمام غزوات میں نبی کریم ﷺ کے دو پرچم ہوتے تھے، ایک حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور دوسرا سیدنا سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ تھامتے تھے۔ مسند احمد میں ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ ان کے گھر پر تشریف لے گئے تو فرمایا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ، انہوں نے آہستگی سے جواب دیا تاکہ بار بار حضور ﷺ کی زبانِ اقدس سے یہ الفاظ نصیب ہوں، پھر حضور ﷺ نے اپنے ہاتھ مبارک بلند کر کے یوں دعا فرمائی: "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ صَلَوَاتِکَ وَرَحْمَتَکَ عَلٰی آلِ سعدِ بنِ عُبادة" (اے اللہ! سعد بن عبادہ کے گھرانے پر اپنے درود اور رحمتیں نازل فرما) اور ابو یعلیٰ کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ہماری طرف سے انصار کو جزائے خیر عطا فرمائے، خصوصاً عبداللہ بن عمرو بن حرام اور سعد بن عبادہ کو۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت سے ان کا پیچھے رہنا مشہور ہے۔ یہ مقامِ "حورَان" چلے گئے تھے اور وہیں ۱۵ یا ۱۶ھ میں ان کا انتقال ہوا"۔

(الإصابة ملخصاً ج ۳ ص ۵۵، ۵۶، وط: ج ٤ ص ۲۷٤، ۲۷۷)

بخاری، مسلم اور مسند احمد وغیرھا میں مذکور ہے کہ انہوں نے سیدنا ابوبکر صدیق اور فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہما کی بیعت نہیں کی تھی۔ کیا سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اس سے بے خبر تھے؟ نہیں، لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ یہ روایت ابوبکر الھذلی کی اخباری روایت ہے۔

سیدنا علی کا شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کی بیعت کرنا

ہر چند کہ اس حدیث کی سند میں ابوبکر الھذلی ہے لیکن "لم یختلف علیه منا اثنان" جملہ کے علاوہ اس روایت کے باقی مضامین دوسری قابلِ اعتبار احادیث سے ثابت ہیں۔ مثلاً سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم

کی بیعت کرنا، میدانِ جہاد میں شریک ہونا، اُن کے ہدایا کو قبول فرمانا اور اُن کا سب سے اول اسلام لانا وغیرہ۔

چوتھے خلیفہ نے مدینہ کیوں چھوڑا؟

اس حدیث میں ہے کہ ابن الکواء اور قیس بن عبادہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے اُن کی عراق آمد کے متعلق دریافت کیا، اسی سوال کو بعض ناصبی لوگ الٹ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ: خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم نے تو مدینہ منورہ کو دار الخلافہ بنائے رکھا مگر حضرت علی نے مدینہ کو خیرباد کہہ دیا تھا، کیوں؟ چونکہ اس قسم کے شیطانی اعتراضات سے سادہ لوح محبانِ اہل بیت کثرھم اللہ تعالیٰ پریشان ہوجاتے ہیں اس لیے ہم اس اعتراض کو دفع کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

ہر عقل مند جانتا ہے کہ کبھی کسی مقام سے نقل مکانی اس لیے ہوتی ہے کہ دوسرا مقام انسان کی نگاہ میں اُس سے زیادہ مرغوب ومحبوب ہوتا ہے اور کبھی انسان مجبوراً اور مصلحتاً اپنے محبوب مقام کو چھوڑ کر غیر محبوب مقام کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ بتلایئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکۃ المکرمۃ کو کیوں چھوڑا تھا؟ کیا آپ کو یہ مبارک مقام محبوب نہیں تھا؟ یقیناً محبوب تھا لیکن اعلیٰ مقاصد کے حصول کی خاطر اس آبائی اور مبارک شہر کو چھوڑنا پڑا تھا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو بھی مدینہ مقدسہ اور مکۃ المکرمۃ محبوب تھے لیکن اُن پر خلافت کی ذمہ داری اُس وقت آپڑی تھی جب سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے کچھ رشتہ داروں کی کوتاہیوں کی وجہ سے سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ شہید کردیئے گئے تھے اور فتنوں نے سر اٹھانا شروع کردیا تھا اور اُس نبوی پیش گوئی کے عملی ظہور کا وقت آپہنچا تھا جو کتبِ حدیث میں ان الفاظ کے ساتھ منقول ہے:

إن منكم رجلاً يقاتل الناس على تأويل القرآن كما قاتلتُ على تنزيله، قال أبو بكر: أنا؟ قال: لا، قال عمر: أنا؟ قال: لا، ولكن خاصف النعل.

”تم میں سے ایک شخص تفسیر قرآن پر اسی طرح جہاد کرے گا جس طرح میں نے تنزیلِ قرآن پر جہاد کیا ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: کیا وہ میں ہوں؟ فرمایا: نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: کیا وہ میں ہوں؟ فرمایا: نہیں، لیکن وہ جوتی کی مرمت کرنے والا ہے۔ (اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جوتی کی مرمت فرمارہے تھے)“۔

(السنن الكبرى للنسائي ج٧ص ٤٦٥ حديث ٨٤٨٨، وط: ج٥ ص ١٥٤ حديث ٨٥٤١؛ المصنف لابن أبي شيبة ج٦ص ٣٧٠ حديث ٣٢٠٧٣؛ مسند أحمد ج٣ ص٣١ حديث ١١٢٧٨ وص ٣٣ حديث ١١٣٠٩ وص ٨٢ حديث ١١٧٩٥؛ فضائل الصحابة ج٢ ص ٧٧٧؛ صحيح ابن حبان ج ١٥

ص ٣٨٥ حديث ٦٩٣٧، وط: ج ٩ ص ٤٦ حديث ٦٨٩٨؛ مسند أبي يعلیٰ ج ١ ص ٤٦٣ حديث ١٠٨١، وط: ج ٢ ص ٣٤١ حديث ١٠٨٦؛ المستدرك للحاكم ج ٣ ص ١٢٢ حديث ٤٦٧٩؛ دلائل النبوة للبيهقي ج ٦ ص ٤٣٥، ٤٣٦؛ حلية الأولياء لأبي نعيم ج ١ ص ١٠٨؛ البداية والنهاية ج ٥ ص ٤٧٨؛ تاريخ دمشق ج ٤٢ ص ٤٥١ تا ٤٥٥؛ مختصر تاريخ دمشق ج ١٧ ص ٣٨٩ و ج ١٨ ص ٤٦؛ إتحاف الخيرة المهرة ج ٧ ص ١٨٧ حديث ٦٦٤٠؛ شرح السنة ج ٦ ص ١٦٧ حديث ٢٥٥٧؛ المقصد العلي حديث ٨٤٩؛ الرياض النضرة ج ٤ ص ١٣٥؛ مجمع الزوائد ج ٩ ص ١٣٣ حديث ١٤٧٦٣؛ جمع الجوامع ج ١٥ ص ٥٦٢ حديث ١٥١٦٣؛ الخصائص الكبرىٰ ج ٢ ص ٢٣٤، وط: ج ٢ ص ٢٥٣ حديث ٢٣٩٤)

ظاہر ہے کہ یہ قتال مدینہ منورہ میں نہیں کیا جاسکتا تھا، لہٰذا ثابت ہوا کہ سیدنا علی ﷺ نے مدینہ منورہ کو قرآن کی عملی تفسیر کی تکمیل کی خاطر چھوڑا تھا، اور اس سے بڑھ کر کوئی خیر نہیں۔ اسی خیر کا تذکرہ ایک اور حدیث پاک میں اس سے بھی زیادہ وضاحت سے آیا ہے۔ حضرت ابوھریرہ ﷺ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ليخرجن أهل المدينة من المدينة خير ما كانت.

"اہل مدینہ کو مدینہ سے وہ خیر نکالے گی جو پہلے تھی"۔

(تاريخ المدينة المنورة لابن شبة ج ١ ص ٢٧٧؛ تحفة الأشراف مع النكت الظراف ج ٣ ص ٤٧؛ وفاء الوفا بأخبار دار المصطفى ج ١ ص ١٢٠، وط: ج ١ ص ٣٣٠)

یعنی وہ دین کی خاطر مدینہ منورہ کو چھوڑیں گے۔ حدیث پاک میں ہے: "**المدينة خير لهم لو كانوا يعلمون**" (اگر لوگ سمجھیں تو اُن کے حق میں مدینہ بہتر ہے) جب اس حدیث کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی عام مومن بھی مدینہ منورہ کو چھوڑنا گوارا نہیں کرتا تو پھر غور کرنا چاہیئے کہ کیا سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کسی اعلیٰ مقصد کے بغیر مدینہ چھوڑ سکتے تھے؟ ہرگز نہیں۔ ہر شخص کو اپنا وطن محبوب ہوتا ہے، حتیٰ کہ بعض لوگوں کو حج کے بعد مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں اپنے وطن کی یاد ستانے لگتی ہے، حالانکہ روئے زمین پر اِن مقامات سے افضل کوئی مقام ہی نہیں، تو پھر خود سوچئے کہ جس کا وطن ہی وہی افضل مقام ہو وہ کیونکر خوشی سے اُس کو خیرباد کہے گا؟ لیکن اعلیٰ مقاصد کی خاطر گھر بار تو کیا کعبہ کو بھی قربان کرنا پڑتا ہے۔ اس حقیقت کو حضرت محدث کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ نے بہترین انداز میں منظوم فرمایا ہے۔

مدینہ کا کچھ کام کرنا ہے سید
مدینہ سے بس اس لیے جارہا ہوں
ترے ساتھ میں بھی ہوں میرا خدا بھی
مجھے یہ دعا دیجیے، جارہا ہوں

(فرش پر عرش ص١٥٨)

یہی وہ تعظیم ہے جس کے سبب سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ اپنی ہی چاردیواری میں شہید ہوگئے، کیونکہ ایک طرف تو وہ شہرِ محبوب کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اور دوسری طرف وہ شہرِ محبوب کے تقدس کے پیشِ نظر ہر طرح کی ہنگامہ آرائی سے بھی گریزاں تھے، ورنہ مصری بلوائیوں کو دفع کرنے کے لیے جاں نثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور خود اُن کے اپنے غلاموں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ رضي الله عنه وارضاه عنا.

پھر وہ براجمان ہو بیٹھا جو میری مثل نہیں

﴿٤٤﴾ حدثنا عبدة بن سليمان، ثنا أبو العلاء سالم المرادي، سمعت الحسن فذكر نحوه وزاد فيه فوثب فيها من ليس مثلي، ولا قرابته كقرابتي، ولا علمه كعلمي، ولا سابقته كسابقتي، وكنت أحق بها منه، قالا له: فأخبرنا عن قتالك هذين الرجلين يعنيان: طلحة والزبير فقال: بايعاني بالمدينة وخالفاني بالبصرة، ولو أن رجلا ممن بايع أبابكر أو عمر خلعه لقاتلناه أيضاً.

وقد رواه أيضاً عن سالم يعني ابن عبيد الطنافسي وروى نحوه عن الحريري عن أبي نضرة العبدي أن رجلا قام إلى علي رضي الله عنه يوم صفين، فسأله، وساق الحديث بطوله، وهذه كلها طرق يقوي بعضها بعضاً، والنفس تركن إلى صحتها، والله تعالىٰ أعلم، ومما يشهد لذلك ما رويناه في سنن أبي داود قال:

﴿٤٤﴾ سالم مرادی بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ کو بیان فرماتے ہوئے سنا، پھر حسبِ سابق حدیث ذکر کی اور اس میں یہ اضافہ کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پھر وہ شخص براجمان ہو بیٹھا جو میرا ہمسر نہیں، نہ اُس کی قرابت میری قرابت کی طرح ہے، نہ اُس کا علم میرے علم کی مانند ہے اور نہ اُس کی سبقت

میری سبقت کی طرح ہے اور میں اُس کی بہ نسبت اس (خلافت) کا زیادہ حق دار ہوں۔ انہوں نے دریافت کیا: آپ ہمیں ان دو شخصوں یعنی حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے ساتھ جنگ کی وجہ بتلائیں۔ فرمایا: ان حضرات نے مدینہ منورہ میں میری بیعت کی اور بصرہ میں آکر توڑ دی۔ اگر کوئی شخص ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی بیعت کر کے توڑ دیتا تو میں اُس کے ساتھ بھی جنگ کرتا۔

نیز سالم یعنی ابن عبید الطنافسی نے روایت کیا ہے، اور اسی طرح جریری نے ابونضرہ العبدی سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے صفین کے دن کھڑے ہو کر سیدنا علی المرتضیٰؓ سے دریافت کیا، ابونضرہ نے یہ حدیث بہت طویل بیان کی، اور یہ تمام سندیں ایک دوسری کو قوی کرتی ہیں اور دل ان کی صحت کی طرف مائل ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔ نیز اس کی تائید اس سے ہوتی ہے جو سنن ابی داود میں روایت ہے۔

وہ میری مثل نہیں، سے کون مراد ہے؟

اس حدیث میں پہلا جملہ یہ ہے:

فوثب فيها من ليس مثلي، ولا قرابته كقرابتي، ولا علمه كعلمي.

''پھر وہ شخص براجمان ہو بیٹھا جو میری مثل نہیں، نہ اُس کی قرابت میری قرابت کی طرح ہے، نہ اُس کا علم میرے علم کی مثل ہے اور نہ اُس کی سبقت میری سبقت کی طرح ہے''۔

یہ اشارہ کسی خلیفۂ راشد کی طرف نہیں کیونکہ خلفاء راشدینؓ کی تو سیدنا علی المرتضیٰؓ نے بیعت کی تھی، بلکہ یہ اشارہ حضرت معاویہ کی طرف ہے اور واقعی اُن میں مذکورہ خوبیوں میں سے کوئی ایک خوبی بھی نہیں تھی۔ اس انداز گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا علی المرتضیٰؓ نے سائلین کو مدنظر رکھ کر جواب دیا ہے، کیونکہ اُن میں بہت سے تابعین تھے اور ظاہر ہے کہ بعد والوں کے سامنے تمام حقائق رکھنا ہوتے ہیں، ورنہ صحابہ کرامؓ پر تو یہ سارے حقائق از خود عیاں تھے۔ ہر صحابی جانتا تھا کہ طلقاء میں سے کسی فرد کا تقابل سابقین میں سے کسی شخص کے ساتھ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا بلکہ کسی غیر بدری کا بدری صحابی سے بھی کوئی تقابل نہیں تو پھر اولین صحابی سے کیا تقابل؟

سیدنا علیؓ کی تواضع

اس انداز میں سیدنا علیؓ نے کمال تواضع کا مظاہرہ فرمایا ہے، ورنہ وہ اُس انداز سے بے خبر تو نہیں تھے جو دوسرے حضرات کی زبانوں پر جاری ہو جاتا تھا۔ مثلاً امام ابن عبد البر اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہما

لکھتے ہیں:

”حضرات ابو ہریرہ اور ابوالدرداء رضی اللہ عنہما معاویہ کا پیغام سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کے پاس لے گئے کہ وہ خلافت سے دستبردار ہو کر مجلسِ شوریٰ پر اس کا فیصلہ چھوڑ دیں۔ جب یہ دونوں حضرات سیدنا علی ﷺ کے ساتھ ملاقات کر کے واپس لوٹے تو حمص کے مقام پر اُن سے حضرت عبدالرحمان بن غنم اشعری ﷺ کی ملاقات ہوئی، وہاں انہوں نے ان صاحبان کو دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا:

عجباً منكما كيف جاز عليكما ما جئتما به تدعوان عليًا أن يجعلها شورى وقد علمتما أنه قد بايعه المهاجرون والأنصار وأهل الحجاز والعراق، وأنّ من رضيه خير ممن كرهه ومن بايعه خير ممن لم يبايعه وأي مدخلٍ لمعاوية في الشورى وهو من الطلقاء الذين لايجوزلهم الخلافة وهو وأبوه رؤوس الأحزاب فندما علىٰ مسيرهما وتابا بين يديه.

”تم پر تعجب ہے، تم نے علی المرتضیٰ ﷺ کو کیونکر شوریٰ کی دعوت دے ڈالی؟ حالانکہ تم جانتے ہو کہ تمام مہاجرین، انصار، اہل حجاز اور اہل عراق اُن کی بیعت کر چکے ہیں، اور جو لوگ اُنہیں پسند کرتے ہیں وہ اُن سے بہتر ہیں جو اُنہیں پسند نہیں کرتے، اور جنہوں نے اُن کی بیعت کی ہے وہ اُن سے بہتر ہیں جنہوں نے اُن کی بیعت نہیں کی، اور معاویہ کا مجلسِ شوری سے کیا واسطہ؟ وہ تو طلقاء میں سے ہے جن کے لیے خلافت جائز نہیں، وہ اور اُن کے والد غزوہ احزاب میں لشکر کفار کے سردار تھے۔ اس پر یہ دونوں حضرات اپنی آمد پر نادم ہوئے اور اُن کے سامنے توبہ فرمائی“۔

(الاستیعاب ج۱ ص ۵۱۱، ۵۱۲، وط: ج۲ ص ۳۹۰، ۳۹۱؛ إزالة الخفاء عن خلافة الخلفاء ج۱ ص ۴۸، ۳۴۶، ۴۱۴)

حضرت عبدالرحمان بن غنم اشعری ﷺ نے ”طلقاء“ کے لفظ سے انہیں عار کیوں دلائی؟ اس کے لیے اس لفظ کا اصطلاحی معنیٰ سمجھنا ضروری ہے۔ مولانا عبدالشکور مجددی لکھتے ہیں:

”طلقاء جمع ہے طلیق کی، طلیق آزاد کردہ غلام کو کہتے ہیں، جو لوگ فتح مکہ کے بعد اسلام

لائے ان کو طلقاء کہتے ہیں، اس سبب سے کہ اُن پر مسلمانوں نے احسان کر کے چھوڑ دیا تھا"۔

(حاشية: إزالة الخفاء ج ١ ص ٣٤٦)

علامہ عبدالرشید نعمانی لکھتے ہیں:

"طلقاء" طلیق کی جمع ہے، "طلیق" اس قیدی کو کہتے ہیں جس کو رہا کر دیا جائے۔ یہاں فعیل بمعنی مفعول ہے۔ غزوہ حنین کی حدیث میں جو یہ آتا ہے کہ: "خرج ومعه الطلقاء" (آنحضرت ﷺ جب اس غزوہ میں تشریف لے گئے تو طلقاء آپ کے ہمرکاب تھے) اس میں "طلقاء" کا تعارف لغت کے مشہور امام علامہ ابوالفضل جمال الدین محمد بن مکرم نے جو ابن منظور کے نام سے مشہور ہیں، ان الفاظ میں کیا ہے: "هم الذين خلّى عنهم يوم الفتح" (یہ وہی لوگ ہیں جن کو فتح مکہ کے دن آنحضرت ﷺ نے چھوڑ دیا تھا (اور ان سے کوئی باز پرس نہیں کی تھی) اور ثعلب جو لغت وعربیت کے مشہور اکابر ائمہ میں سے ہیں، فرماتے ہیں:

"والطلقاء الذين أدخلوا في الإسلام كرهاً" (اور "طلقاء" وہ لوگ ہیں جو ناچاری کو اسلام میں داخل کر لیے گئے، یعنی ابھی اسلام ان کے دل میں رچا بسا نہ تھا"۔

(حضرت علی رضی اللہ عنہ اور قصاصِ عثمانِ غني رضی اللہ عنہ ص ٩)

علامہ نعمانی نے ثعلب سے جو لغوی اور اصطلاحی وضاحت نقل فرمائی ہے، اس کے شواھد بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے الفاظ میں بھی ملتے ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک اموی حکمران کو فرمایا تھا:

تأخر إسلامكم عن إسلامي إلى الوقت المكروه إليكم.

"تمہارا اسلام میرے اسلام کے مقابلہ میں مجبوری کے وقت تک مؤخر ہے"۔

(البداية ج ٨ ص ١٥٨)

یعنی طلقاء وہ لوگ ہیں جو آخر وقت تک اسلام کے خلاف لڑتے رہے اور جب مکہ فتح ہو گیا تو پھر اسلام لائے، اسی لیے حضرت عبدالرحمان بن غنم رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا تھا:

"وہ اور اُن کے والد غزوہ احزاب میں لشکر کفار کے سردار تھے"۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما صوفی منش اور نرم مزاج آدمی تھے، ایک مرتبہ وہ بھی حضرت معاویہ کو درج

ذیل جملہ کہنا چاہتے تھے مگر بخوفِ فتنہ خاموش رہے:

احق بهذا الأمر منک من قاتلک واباک علی الإسلام.

”تم سے زیادہ اس امر کا حقدار وہ ہے جس نے تم سے اور تمہارے باپ سے اسلام کے دفاع میں جنگ کی تھی“۔

(بخاري ص ٥٦٠، حديث ٤١٠٨؛ إزالة الخفاء عن خلافة الخلفاء ج١ ص ٤٧؛ تاريخ الإسلام للذهبي ج٢ ص ١٩٧)

خیال رہے کہ دوٹوک انداز میں بات کرنے والے صحابہ کرام ﷺ ایسے جملے حضرت معاویہ کو بھری مجلس میں بھی کہہ دیتے تھے۔ بہرکیف سیدنا علی ﷺ کا جواب انتہائی متانت وتواضع سے لبریز ہے۔

”ولاقرابته كقرابتي“ کا کیا مطلب؟

اس حدیث میں سیدنا علی ﷺ نے ایک بات یہ بھی فرمائی ہے کہ اُس کی قرابت بھی میری قرابت کی طرح نہیں۔ اس میں ایک بات تو واضح ہے کہ سیدنا علی ﷺ ہاشمی ہیں اور وہ قریشی ہیں، پھر سیدنا علی ﷺ حضور ﷺ کے سگے چچازاد اور داماد ہیں لیکن چونکہ حضرت معاویہ ﷺ بھی اوپر جا کر حضورِ اکرم ﷺ کے رشتہ دار بنتے ہیں اس لیے سیدنا علی ﷺ نے اُن کی قرابت داری کی نفی نہیں فرمائی بلکہ فرمایا: اُن کی قرابت داری میری قرابت داری کی مانند نہیں۔ یاد رہے کہ سسرالی قرابت داری بھی مفید چیز ہے اور حضرت معاویہ نبی کریم ﷺ کے سالہ ہیں، اسی لیے بعض لوگ خصوصاً انہیں خال المؤمنین کہتے ہیں اور دوسری امہات المؤمنین کے بھائیوں کو نہیں کہتے، حتیٰ کہ حضرت معاویہ کے بھائی یزید الخیر کو بھی اس شرف سے یاد نہیں کرتے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فقط حضرت معاویہ ہی خال المؤمنین کیوں؟ اس کے لیے ہماری کتاب ”شرح خصائص علي ﷺ“ صفحہ ۹۴۹، الطبعة الخامسة ملاحظہ فرمائیں۔

یہاں اتنی بات یاد رکھنا چاہیے کہ یہ رشتہ نہ نبی کریم ﷺ نے اِس خاندان سے مانگا تھا اور نہ ہی ازخود اس خاندان نے کوئی پیش کش کی تھی، بلکہ سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا اپنے سابق خاوند کے ساتھ ہجرت کر کے حبشہ گئی ہوئی تھیں، وہاں اُن کا خاوند نصرانی ہوگیا اور پھر مر گیا تو نبی کریم ﷺ نے شاہ حبشہ حضرت نجاشی ﷺ کے ہاں پیغام بھیجا کہ وہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا نکاح نبی کریم ﷺ کے ساتھ کر دیں۔ چنانچہ حکم کی تعمیل کی گئی، حبشہ ہی میں نکاح

پڑھایا گیا، مہر ادا کی گئی اور ام المومنین رضی اللہ عنہا کو حضور ﷺ کی بارگاہ میں بھیج دیا گیا۔ اُس وقت تک حضرت ابوسفیان مسلمان نہیں ہوئے تھے، یہی وجہ ہے کہ جب وہ ایک مرتبہ بستر نبوی ﷺ پر بیٹھنے لگے تو اُن کی بیٹی سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے انہیں نہ بیٹھنے دیا اور فرمایا: تم مشرک اور پلید ہو اور یہ اللہ کے رسول ﷺ کا بستر ہے۔ اس پر انہوں نے کہا: بیٹی! میرے بعد تم شر سے دوچار ہوگئی ہو۔

(صفة الصفوة ج٢ ص٣٣؛ السمط الثمين ص١٥٦؛ سبل الهدى ج١١ ص١٩٦)

یہاں یہ بھی خیال رہے کہ صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت ابوسفیان ؓ نے بارگاہِ نبوی ﷺ میں درخواست کی تھی کہ ان کی تین باتیں قبول کی جائیں:

١۔ اُن کی بیٹی کو نکاح میں قبول کیا جائے

٢۔ اُن کے بیٹے معاویہ کو بطور کاتب قبول کیا جائے

٣۔ اور خود انہیں کفار کے خلاف جنگ کا یوں ہی امیر بنایا جائے جیسا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف جنگوں میں امیر ہوتے تھے۔

صحیح مسلم کی اس حدیث پر محدثین کرام کے بہت تحفظات ہیں۔ اس کو صحیح ثابت کرنے کی بہت تاویلیں کی گئیں لیکن بات کسی سے بھی بن نہ پائی۔ اگر اہلِ علم حضرات سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے متعلق مختلف راویات کا معروضی جائزہ لیں تو اُن پر ضرور صحیح مسلم کی اس حدیث کی اور متاولین کی تاویلات کی حقیقت آشکار ہو جائے گی۔

خلفاء ثلاثہ ؓ کی خلافت کا حق ہونا

اس حدیث میں سیدنا علی ؓ کا دوسرا جملہ یہ ہے:

"اگر کوئی شخص ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی بیعت کر کے توڑ دیتا تو میں اُس کے ساتھ بھی جنگ کرتا"۔

اس سے معلوم ہوا کہ سیدنا علی المرتضیٰ ؑ کے نزدیک خلفاء ثلاثہ ؓ کی خلافت حق تھی۔ اس سے وہ بدباطن لوگ عبرت حاصل کریں جو خلفاء ثلاثہ ؓ کی خلافتِ حقہ پر طعن کرتے ہیں۔ انہیں جاننا چاہیے کہ یہ حقیقت خود "نهج البلاغة" میں بھی مذکور ہے۔ چنانچہ سیدنا علی المرتضیٰ ؓ نے جب معاویہ پر اپنی خلافت کی حقانیت

واضح فرمانا چاہی تو خلفاء ثلاثہ کی خلافت کو بطور دلیل پیش فرمایا۔ اُنہوں نے معاویہ کو بایں الفاظ ایک خط ارسال فرمایا تھا:

إنه بايعني القوم الذين بايعوا أبابكر، وعمر، وعثمان، على مابايعوهم عليه، فلم يكن للشاهد أن يختار، ولا للغائب أن يرد، وإنما الشورى للمهاجرين والأنصار، فإن اجتمعوا على رجلٍ، وسموه إماماً، كان ذلك لله رضي.

"یقیناً اُن لوگوں نے میری بیعت کرلی ہے جنہوں نے حضرت ابوبکر، عمر اور عثمان کی بیعت کی تھی، انہیں شرائط پر کی ہے جن شرائط پر اُن کی بیعت کی تھی، لہٰذا کسی حاضر کو اپنی مرضی کرنے کا اور کسی غائب کو مسترد کرنے کا اختیار نہیں، شوریٰ کا اختیار فقط مہاجرین وانصار کو ہے، پس جس شخص پر اُن کا اتفاق ہو جائے اور جس کو وہ امام کہہ دیں وہی اللہ کا پسندیدہ ہے"۔

(نهج البلاغة ص ٢٦٦، وط: ص ٣٦٦، ٣٦٧؛ شرح نهج البلاغة لابن أبي الحديد ج ١٤ ص ١٩)

سیدنا طلحہ وزبیر کے ساتھ جنگ کیوں؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے سیدنا علی کو یہ ذمہ داری نہیں سونپی تھی کہ وہ حضرات طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما کے ساتھ جنگ کریں تو انہوں نے جنگ کیوں کی تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یقیناً نامزد کر کے اُن کی ڈیوٹی نہیں لگائی گئی تھی کہ فلاں اور فلاں کے ساتھ جنگ کرنا لیکن یہ ارشاد ضرور فرمایا تھا کہ عہد شکن لوگوں کے ساتھ جنگ کرنا۔ چنانچہ علی بن ربیعہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سیدنا علی کو فرماتے ہوئے سنا:

عهد إلي رسول الله ﷺ في قتال الناكثين والقاسطين والمارقين.

"مجھ سے نبی کریم ﷺ نے نَاكِثِين، قَاسِطِين اور مَارِقِين کے خلاف جنگ کرنے کے بارے میں عہد لیا تھا"۔

(مسند البزار ج ٣ ص ٢٦، ٢٧ حديث ٧٧٤؛ مسند أبي يعلىٰ ج ١ ص ٢٤٣ حديث ٥١٥، وط: ج ١ ص ٣٩٧ حديث ٥١٩؛ أسد الغابة ج ٤ ص ١٢٤؛ كشف الأستار ج ٤ ص ٩٢ حديث ٤٢٦٩، ٤٢٧٠؛ المطالب العالية للعسقلاني ج ٤ ص ٢٩٧ حديث ٤٤٦٢، ٤٤٦٣)

حافظ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اسے امام بزار نے روایت کیا ہے، اور امام طبرانی نے اوسط میں روایت کیا ہے، اور امام بزار کی ایک سند کے راوی صحیح حدیث کے راوی ہیں ماسوا ربیع بن سعید کے، اور ابن حبان نے اُس کی توثیق کی ہے''۔

(مجمع الزوائد ج۷ص۲۳۸،وط: ج۷ص۴۸۱ حدیث۱۲۰۴۲،۱۲۰۴۳)

امام ابن عساکر اور حافظ ابن کثیر نے اس مضمون کی احادیث متعدد سندوں کے ساتھ سیدنا علی ﷛ کے علاوہ حضرات ابن مسعود، ابو سعید الخدری اور ابو ایوب الانصاری ﷡ سے بھی روایت کی ہیں، اور کہا ہے کہ ناکثین سے اہل جمل، قاسطین سے اہل شام اور مارقین سے خوارج مراد ہیں۔

(تاریخ دمشق ج۴۲ص۴۶۸،۴۶۹،۴۷۰؛البداية والنهاية ج۷ص۵۱۳،۵۱۵)

اِس ایک حدیث سے تمام جنگوں کا حکم معلوم ہو گیا۔

سیدنا علی ﷛ کا قِدمِ اسلام

اس حدیث میں سیدنا علی ﷶ سے یہ الفاظ بھی منقول ہیں: ''کنت أول من صدّق به'' (میں حضور ﷺ کی پہلا تصدیق کرنے والا ہوں) اس دعویٰ سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام ﷡ سے کوئی دوسرا مذکر انسان اُن پر سبقت نہیں کر سکا۔ نبی کریم ﷺ کی زبانِ اقدس سے بھی اس دعویٰ کی تائید متعدد احادیث سے ملتی ہے، ان میں ایک حدیث وہ بھی ہے جس میں سیدِ عالم ﷺ نے سیدتنا فاطمۃ الزہراء علیہا السلام کو اُن کے نکاح کے موقعہ پر فرمایا تھا کہ تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ میں نے تمہارا نکاح اسلام میں مقدم شخص کے ساتھ کیا ہے۔ یہ حدیث متعدد حوالہ جات کے ساتھ کئی بار گذر چکی ہے۔ نیز حسب ذیل حدیث تو اس معنیٰ میں انتہائی واضح ہے، حضرت سلمان فارسی ﷛ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

أولكم وروداً عليّ الحوض أولكم إسلاماً، علي بن أبي طالب ﷛.

''تم سب سے پہلے میرے پاس حوض کوثر پر وہ آئے گا جو اسلام میں تم سے اول ہے، یعنی علی بن ابی طالب ﷛''۔

(بغية الباحث ص۹۰۱،۹۰۲ حديث۹۸۰)

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ پہلے اس حدیث کو دو سندوں سے مذکورہ بالا الفاظ میں مرفوعاً لائے ہیں لیکن فرمایا ہے کہ ان دونوں کے راویوں میں بعض راوی کذاب ہیں، پھر بطور متابعت یہ حدیث لائے ہیں:

قال أبو بكر بن أبي عاصم: حدثنا أبو مسعود، حدثنا عبد الرزاق، عن سفيان، عن سلمة بن كهيل، عن أبي صادق، عن عليم الكندي، عن سلمان، قال: أول هذه الأمة وروداً على نبيها أولها إسلاماً علي بن أبي طالب ﷺ.

''اس امت کا سب پہلا شخص جو (حوضِ کوثر پر) اپنے نبی ﷺ کے پاس آئے گا وہ اسلام میں امت کا پہلا شخص علی بن ابی طالب ﷺ ہے''۔

اور اس پر لکھا ہے:

وهذه متابعة قوية جداً، ولا يضر إيراده بصيغة الوقف لأن له حكم الرفع.

''یہ قوی ترین متابعت ہے اور اس کا موقوفاً آنا مضر نہیں، اس لیے کہ یہ حکماً مرفوع ہے''۔

(اللآلي المصنوعة ج۱ ص۲۹۹، وط: ج۱ ص۳۲۶)

اسی بات کو امام سیوطی سے قبل امام ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہما یوں لکھ گئے:

ورفعه أولى، لأن مثله لا يدرك بالرأي.

''اور اس کا مرفوع ہونا اولیٰ ہے، اس لیے کہ ایسی بات اپنی عقل سے نہیں جانی جاتی''۔

(الاستيعاب ج۱ ص۴۳، وط: ج۳ ص۱۹۸)

یہ حدیث درج ذیل کتب میں مذکور ہے:

(المصنّف لابن أبي شيبة ج٦ ص٣٧٤ حديث ٣٢١٠٣، وط: ج١٧ ص١٢٥ حديث ٣٢٧٧٥ وج ١٩ ص٥٧٧ حديث ٣٧١٠٤، وط: ج١٠ ص٤٩٢ حديث ٣٢٧١٠، وط: ج١١ ص١٤٩ حديث ٣٢٦٤٨؛ الأوائل لابن أبي عاصم ص٧٧، ٧٨ حديث ٦٧، ٦٩؛ الآحاد والمثاني ج١ ص ١٤٩ حديث ١٨١؛ المعجم الكبير ج٦ ص٣٢٥، وط: ج٦ ص ٢٦٥ حديث ٦١٧٤؛ الأوائل للطبراني ص١٥٠؛ المستدرك ج٣ ص١٣٥ حديث ٤٧١٧؛ الاستيعاب ج٣ ص١٩٨؛ أسد الغابة ج٤ ص ١٠٣؛ إتحاف الخيرة المهرة ج٧ ص٨٨٩ حديث ٦٦٤٤؛ المطالب العالية ج٤ ص٥٧ حديث ٣٩٥٢، وط: ج١٦ ص٧٧ حديث ٣٩٢٥؛ معجم ابن المقرئ ص٢٢ حديث ٦٢؛ كتاب المعجم لابن الاعرابي ج٢ ص٦٥٣ حديث ١٢٩٨)

حافظ نور الدین ہیثمی نے اس حدیث کو امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہما سے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کے تمام

راوی ثقہ ہیں۔

(مجمع الزوائد ج۹ ص۱۲۴ حدیث ۱۴۵۹۹ موط: ج۹ ص۸٦ حدیث ۱۴۵۹۹)

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "المطالب العالیة" کے محقق عبداللہ بن ظافر نے اس حدیث کو پانچ سندوں سے ذکر کیا ہے، انہوں نے اس کی چوتھی سند کو ضعیف متابعت کہا ہے اور پانچویں سند ابن ابی شیبہ سے ذکر کی ہے اور اُس پر یوں تبصرہ کیا ہے:

"میں کہتا ہوں: ابن ابی شیبہ کی سند حسن ہے، اور سیوطی رحمہ اللہ کا اس کو حکماً مرفوع کہنا صحیح ہے، اس لیے کہ یہ غیب کی خبر ہے، اور صاحبِ شریعت ﷺ کی آگاہی کے بغیر ممکن نہیں کہ کوئی صحابی اپنی طرف سے وثوق سے ایسی بات فرمائے"۔

(تعلیقات: المطالب العالیة ج۱٦ ص۸۰)

میں کہتا ہوں: سابقیتِ مرتضوی میں نبی کریم ﷺ سے احادیث صحیحہ اور سیدنا علی ؓ سے آثار صحیحہ منقول ہیں مگر اس کے باوجود بعض معاصرین کو سیدنا علی ؓ کی یہ فضیلت گوارا نہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"یہ لوگ صدیق اکبر اور مولا علی رضی اللہ عنہما میں قِدمِ اسلام کا موازنہ لے کر بیٹھ گئے مگر علماء کا یہ لکھنا کہ صدیق اکبر تو سرکار کے اعلانِ نبوت سے پہلے شام کے تجارتی سفر کے دوران ہی ایمان لے آئے تھے۔ اس وقت مولیٰ علی ؓ کی ولادت باسعادت بھی نہیں ہوئی تھی (تاریخ الخلفاء صفحہ ۳۰)۔ اس میں صدیق اکبر ہی یکتا ہیں۔ صدیق کی یہ یکتائی آپ کو نظر کیوں نہ آئی؟"۔

(ضربِ حیدری ص 176)

اس اقتباس کا کچھ حصہ اس سے قبل نقل کر کے اس پر تبصرہ کیا جا چکا ہے۔

میمون بن مہران کے قول کا جائزہ

یہاں ہم اپنے بعض معاصرین سے پوچھتے ہیں کہ انہوں نے جن علماء کا یہ قول نقل کیا ہے اُن کو پردے میں کیوں رکھا ہے؟ اُن کا نام کیوں نہیں ذکر کیا؟ آیئے ہم بتلاتے ہیں کہ اس پردہ داری میں راز کیا ہے؟ دراصل یہ میمون بن مہران کا قول ہے جو سیدنا علی المرتضیٰ ؓ کے ساتھ عداوت رکھتا تھا۔ چنانچہ جس "تاریخ الخلفاء" سے پیر سائیں نے مذکورہ بالا قول نقل کیا ہے اُسی میں ہے:

''امام ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے فرات بن سائب سے روایت کیا ہے، انہوں نے کہا: میں نے میمون بن مہران سے دریافت کیا کہ: آپ کے نزدیک علی افضل ہیں یا ابوبکر وعمر؟ تو اُس پر کپکپی طاری ہوگئی حتیٰ کہ اُس کے ہاتھ سے اُس کی چھڑی گرگئی، پھر کہا: میرا گمان نہیں تھا کہ میں اُس زمانہ تک زندہ رہوں گا جب ان دونوں کے ساتھ برابری کی بات کی جائے گی، اُن دونوں کی خوبی اللہ کے لیے ہے، وہ دونوں اسلام کے سردار تھے۔ میں نے پوچھا: اسلام کے لحاظ سے ابوبکر اول ہیں یا علی؟ کہنے لگا:

اللہ کی قسم! ابوبکر نبی کریم ﷺ پر اُس وقت ایمان لا چکے تھے جب آپ بحیریٰ راہب کے زمانے میں اُس سے گذرے تھے، اور انہوں نے نبی کریم ﷺ اور سیدہ خدیجہ کے مابین کردار ادا کیا حتیٰ کہ اُن کا نکاح حضور ﷺ کے ساتھ کرا دیا، اور یہ سب کچھ اُس وقت ہوا جب علی پیدا ہی نہیں ہوئے تھے''۔

(تاریخ الخلفاء ص ۳۱، ۳۲)

محدثین کرام کے نزدیک یہ شخص اسی طرح ثقہ ہے جیسا کہ دوسرے نواصب، مثلاً مروان بن الحکم، جوزجانی اور حریز بن عثمان وغیرھم، مگر اس کی ثقاہت کے ساتھ ساتھ یہ اُس کی جہالت ہے کہ اُسے اتنا بھی علم نہیں تھا کہ تمام اہل بیت کرام علیہم السلام اور متعدد صحابہ کرام مثلاً حضرت سلمان فارسی، ابوذر، مقداد، خباب، جابر، ابوسعید خدری، زید بن ارقم اور حسان بن ثابت وغیرھم سیدنا علی المرتضیٰ علیہ السلام کو رسول اللہ ﷺ کے بعد تمام لوگوں سے افضل سمجھتے تھے، اور شروع سے یہ ایک مشہور وعام اختلاف ہے۔ خود غور فرمایئے! سیدنا علی کے چوتھا خلیفہ ہونے کے باوجود اگر لوگوں کے اذہان میں اُن کی افضلیت کا خیال گردش نہ کرتا ہوتا تو سائل اس (میمون بن مہران) سے سوال ہی کیوں کرتا؟ لیکن حیرت ہے کہ اس شخص کو اس سوال پر اس قدر اچنبھا ہوا کہ اس کے ہاتھ سے اس کا عصا گر گیا۔ یقین فرمایئے کہ راقم الحروف کا مطالعہ جب اہل بیت کرام کے بارے میں نہ ہونے کے برابر تھا اور اس وقت میری عمر تقریباً بیس یا اکیس [۲۰/۲۱] برس کی تھی تو بعض اردو کتب میں یہ واقعہ پڑھ کر مجھے تعجب ہوا تھا کہ یہ مسئلہ اتنا سخت ہے کہ اسلاف کرام میں سے ایک شخصیت اس پر اتنا حیرت زدہ ہوئی کہ اُن کی لاٹھی تک اُن کے ہاتھ سے گر گئی! لیکن اب جب دوبارہ یہ واقعہ میرے سامنے آیا تو اللہ ﷻ نے مجھ پر واضح فرمایا کہ یہ شخص اسلاف کرام میں سے نہیں بلکہ سلوف میں سے تھا۔ سو اس کا مذکورہ سوال پر حواس باختہ ہونا اس کے قلبی مرض کے باعث تھا،

کیونکہ اس کے دل میں بغضِ علی تھا۔ چنانچہ محدثین کرام لکھتے ہیں:

كان يحمل على عليّ ﷺ.

"یہ سیدنا علی ﷺ پر حملے کرتا تھا"۔

(تاريخ الثقات للعجلي ص ٤٤٥؛ تهذيب الكمال ج ١٠ ص ٢٢٦ ،وط: ج ٢٩ ص ٢١٤؛ تهذيب التهذيب ج ٤ ص ١٩٨ ،وط: ج ٨ ص ٤٤٧)

اس سے جو دوسرا سوال ہوا اُس کے جواب میں بھی اس نے اپنے بغض کی وجہ سے ڈنڈی ماری ہے، ورنہ ایسے لوگ اُن فرامینِ نبویہ سے بے بہرہ نہیں ہوتے جن میں سیدنا علی المرتضٰی ﷺ کے اوّل مسلم اور اول نمازی ہونے کا ذکر ہے۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق ﷺ کے دل میں یقیناً حضرت بحیری راھب ﷺ کے وقت سے سیدنا محمد ﷺ کے بارے میں ایک غیر معمولی عظمت گھر کر گئی ہوگی، کیونکہ وہ انتہائی زیرک و دانا تھے، جیسا کہ مشہور بادشاہ حضرت تبع حمیری اور خود حضرت بحیری راھب رضی اللہ عنہما کے دلوں میں بھی گھر کر گئی تھی، مگر بعد از اعلانِ نبوت سیدنا علی المرتضٰی ﷺ اُن پر سبقت لے گئے اور نبی کریم ﷺ نے بھی اس سبقت کو سبقت ہی قرار دیا اور اپنی لختِ جگر کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے آپ کا نکاح اپنی امت کے اُس شخص کے ساتھ کیا ہے جو اسلام میں اُن سب پر مقدم ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے معاصر شیخ الحدیث ہونے اور ایسی ساری احادیث کو جاننے کے باوجود ان احادیث پر اِس ناصبی کے قول کو ترجیح دینے سے باز نہیں آئے۔ نیز اُن سے اتنا انصاف بھی نہیں ہو سکا کہ جس "تاريخ الخلفاء" سے انہوں نے مذکور الصدر خلاصہ نقل کیا ہے اُسی میں ہے کہ حضرت ابن عباس، انس، زید بن ارقم، سلمان فارسی اور صحابہ ﷺ کی ایک جماعت کہتی تھی کہ سیدنا علی ﷺ اسلام قبول کرنے میں اول ہیں بلکہ بعض نے اس پر اجماع نقل کیا ہے، لیکن یہ بات سیدنا علی ﷺ کے حالات میں مذکور ہے، سو ممکن ہے کہ موضوع کے اندر رہنے کی وجہ سے ہمارے معاصر کی توجہ ادھر نہ گئی ہو، مگر اس کا کیا کیا جائے کہ جس مقام سے انہوں نے سیدنا ابوبکر صدیق ﷺ کی شان میں ناصبی کے قول کو "علماء کا یہ لکھنا" کے الفاظ سے نقل کیا ہے اُسی مقام پر سیدنا ابوبکر صدیق ﷺ کی سوانح میں امام سیوطی رحمہ اللہ نے بحث و نظر کے بعد ابن کثیر کا یہ قول بھی نقل کیا ہے:

قال ابن كثير: والظاهر أن أهل بيته ﷺ آمنوا قبل كل أحد: زوجته خديجة، ومولاه زيد، وزوجة زيد أم أيمن، و علي و ورقة.

"ابن کثیر نے کہا ہے: ظاہر یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے گھرانے والے ہر ایک سے پہلے ایمان

لائے: آپ کی زوجہ سیدہ خدیجہ، آپ کے غلام حضرت زید، زید کی بیوی حضرت ام ایمن، حضرت علی اور حضرت ورقہ بن نوفل ﷺ"۔

(تاريخ الخلفاء للسيوطي ص ٣٢)

اس قول کو کیوں نظر انداز کر دیا گیا، کیا یہ "علماء کالکھنا" نہیں؟

میمون بن مہران کے رجوع کی وجہ

یہ شخص پہلے سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کو افضل سمجھتا تھا لیکن بعد میں اس نے اس نظریہ سے رجوع کر لیا تھا، اس کے رجوع کا سبب کیا تھا؟ آیئے خود اس کی زبانی سنتے ہیں: امام مزی رحمۃ اللہ علیہ سند کے ساتھ لکھتے ہیں:

قال ميمون بن مهران: كنتُ أفضّل علياً علىٰ عثمان، فقال لي عمر بن عبد العزيز: أيهما أحب إليک؟ رجل أسرع في كذا؟ [يعني في الدماء. تهذيب التهذيب] أو رجل أسرع في المال؟ قال: فرجعت، وقلتُ: لا أعود.

"میمون بن مہران نے کہا: میں حضرت علی ﷺ کو حضرت عثمان ﷺ پر فضیلت دیتا تھا، ایک مرتبہ مجھ سے حضرت عمر بن عبد العزیز ﷺ نے پوچھا: تمہیں اُن دو میں سے کون زیادہ محبوب ہے؟ وہ شخص جس نے خون ریزی (جہاد) میں جلدی کی؟ یا وہ شخص جس نے مال خرچ کرنے میں جلدی کی؟ میمون نے کہا: اس پر میں نے (حضرت علی کی افضلیت سے) رجوع کر لیا اور میں نے کہا: میں آئندہ یہ قول نہیں لوٹاؤں گا"۔

(تهذيب الكمال ج ١٠ ص ٢٢٦، وط: ج ٢٩ ص ٢١٤؛ تهذيب التهذيب ج ٤ ص ١٩٨، وط: ج ٨ ص ٤٤٨)

مال خرچ کرنا افضل یا جان؟

خدا جانے یہ شخص واقعی پہلے سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کی افضلیت کا قائل تھا یا فقط اپنی بات بنانے کے لیے تمہیداً اس نے ایسا کہہ دیا ہے؟ کیونکہ اس کا یہ نظریہ کسی اور شخص نے نقل نہیں کیا بلکہ اس کا قائل یہ خود ہی ہے، البتہ سیدنا علی ﷺ کے بارے میں اس کی ہرزہ سرائی کو دوسرے حضرات نے نقل کیا ہے، اور ظاہر یہ ہے کہ سیدنا علی ﷺ پر طعن و تشنیع ہی اس کا اصل عقیدہ ہے۔ چنانچہ مذکور الصدر عبارت میں بھی اس نے سیدنا عثمان غنی ﷺ کی افضلیت

بیان کرتے ہوئے سیدنا علی ﷛ پر تعریض کی ہے۔

اس سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے حضرت عمر بن عبدالعزیز ﷬ سے جو مذکورہ بالا استفسار نقل کیا ہے، یہ اُن پر بہتان ہے۔ ہر چند کہ ہم کسی غیر نبی انسان کی عصمت کے قائل نہیں لیکن یہ بات قرینِ قیاس نہیں ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز ﷬ ایسا زیرک انسان مال خرچ کرنے کو جان خرچ کرنے پر ترجیح دے۔ کیا مال، جان سے زیادہ عزیز ہوتا ہے؟ ایک معمولی عقل والا شخص بھی سمجھتا ہے کہ جان کی بدولت مال حاصل ہوتا ہے لیکن مال کی بدولت جان حاصل نہیں ہوتی۔ کیا حضرت عمر بن عبدالعزیز ﷬ اس قدر واضح حقیقت سے بھی بے خبر تھے؟

یہاں یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ آیا حضرت عمر بن عبدالعزیز ﷬ ایسا معتدل اور عادل شخص سیدنا علی المرتضیٰ ﷛ کے جہادی کارناموں کو خون ریزی سے تعبیر کر سکتا ہے؟

نیز اس امر پر بھی غور و فکر کیا جائے کہ سیدنا علی المرتضیٰ ﷛ عہد نبوی میں مال خرچ کرنے کے معاملہ میں معاذ اللہ بخیل تھے یا دہ صاحب مال تھے ہی نہیں؟ اگر اتنا بھی ثابت ہو جائے کہ وہ حسب استطاعت خرچ کرنے سے بھی گریزاں رہتے تھے تو یقیناً یہ بات اُن کے حق میں عیب ہوگی، اور اگر یہ ثابت نہ کیا جا سکے تو پھر اُن پر اس سلسلے میں طعن ناصبیت کے علاوہ کچھ نہیں۔

فروسیت کی قسمیں

طاقت، شجاعت، سخاوت اور علم و فضل وغیرہ میں سبقت کو عرب لوگ "فـروسية" سے تعبیر کرتے ہیں۔ علامہ ابن قیم الجوزیہ نے اس موضوع پر مستقل ایک کتاب لکھی ہے۔ یہاں ہم اس سے چند سطور نقل کرتے ہیں، اُن سطور سے جہاں یہ معلوم ہوگا کہ سیدنا علی المرتضیٰ ﷛ فروسیت کے کس مقام پر تھے وہیں میمون بن مہران اور اُس کے ہم خیال لوگوں کی غباوت و حماقت بھی عیاں ہوگی۔ وہ لکھتے ہیں:

فـالفروسية فروسيتان: فروسية العلم والبيان، وفروسية الرمي والطعان، ولـمـا كـان أصحاب النبي ﷺ أكـمـل الـخـلق في الفروسيتين، فتحوا القلوب بـالحجة والبرهان، والبلاد بالسيف والسنان. وما الناس إلا هؤلاء الفريقان، ومن عداهما، فإن لم يكن ردء أو عونا لهما، فهو كل علىٰ نوع الإنسان.

"فروسیت کی دو قسمیں ہیں: علم اور بیان کی فروسیت اور تیر و سنان کی فروسیت، اور چونکہ

نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام ؓ دونوں قسم کی فروسیت میں ساری مخلوق سے زیادہ کامل تھے، اس لیے انہوں نے دلیل و برھان سے دلوں کو فتح کیا اور تیر و سنان سے شہروں کو فتح کیا، اور لوگوں کی ان دو قسموں کے علاوہ کوئی اور قسم قابل ذکر ہی نہیں، ان دو قسموں کے علاوہ جو باقی لوگ ہیں اگر وہ ان دونوں قسموں کے معاون و مددگار نہ ہوں تو وہ نوعِ انسانی پر بوجھ ہیں"۔

(الفروسية لابن القيم ص٤٨، ٤٩، وط: ص٨٤)

علامہ ابن قیم کی اس عبارت کو مدنظر رکھتے ہوئے سیدنا علی المرتضیٰ ؓ کے علم اور اُن کی قوت و شجاعت میں غور فرمایئے کہ اُنہوں نے اپنے علم و بیان سے کتنے قلوب فتح فرمائے اور اپنے تیر و سنان سے کتنے شہر فتح فرمائے۔ کیا عہدِ نبوی ﷺ میں ایسا کوئی غزوہ ہے جس کی فتح میں سیدنا علی ؓ کی شخصیت سب سے زیادہ نمایاں نہ ہو؟ جب اسلام کے بدترین دشمن یہود کا قلعہ اُن کے بغیر کسی سے فتح نہ ہوا تو کسی دوسرے معرکہ کا کیا پوچھنا۔ باقی رہیں اُن کی علمی فتوحات تو وہ تب سے اب تک برابر جاری ہیں۔ علم ظاہر ہو یا باطن پوری دنیا ان دونوں علموں میں اُن کی محتاج ہے، جیسا کہ ہم بالتفصیل لکھ چکے ہیں۔ اگر کوئی شخص اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں متامل ہو تو وہ اُن کی ایجاد کردہ عربی گرائمر کے بغیر عالم بن کے دکھلائے!

علامہ ابن قیم ایک اور مقام میں لکھتے ہیں:

والناس ثلاثة: رجل، ونصف رجل، ولاشيء: فالرجل من اجتمع له أصالة الرأي والشجاعة، فهذا الرجل الكامل، ماقال أحمد ابن الحسين المتنبي:

الرأي قبل شجاعة الشجعان ... هو أول وهي المحل الثاني
فإذا هما اجتمعا لنفس مرة[حرة، م] ... بلغت من العلياء كل مكان

ونصف الرجل: وهو من انفرد بأحد الوصفين دون الآخر

والذي هو لاشيء: من عرى من الوصفين جميعاً.

"لوگوں کی تین قسمیں ہیں:

١۔ مرد

٢۔ آدھا مرد

۳۔ لاشيء۔(بیکار)

مرد وہ ہے جو فکرِ صائب اور شجاعت دونوں کا جامع ہو، اور وہی کامل مرد ہے۔ احمد بن حسین متنبی کہتا ہے:

فکرِ صائب بہادروں کی بہادری پر مقدم ہوتی ہے، اِس کا درجہ اول ہے اور شجاعت کا درجہ دوسرا ہے، پس جب کسی شخص میں یہ دونوں صفتیں جمع ہو جائیں تو یہ اُسے ہر بلندی کی چوٹی پر پہنچا دیتی ہیں۔ (ديوان المتنبي ص ٤١٤)

اور آدھا مرد وہ ہے جس میں ان دونوں میں سے کوئی ایک خوبی ہو۔

اور لاشيء (بیکار) وہ شخص ہے جو اِن دونوں خوبیوں سے خالی ہو۔

(الفروسية لابن القيم ص ٢٥٣، وط: ص ٤٧١)

انصاف سے بتلایئے! کونسا امتی ہے جو اِن دونوں خوبیوں میں سیدنا علی ﷛ سے زیادہ ہو؟ کوئی بھی نہیں، اگر کوئی اُن سے زیادہ ہوتا تو نبی کریم ﷺ غزوۂ خیبر میں کیوں فرماتے: ''لأعطين الراية غداً رجلاً'' (کل میں ایک مرد کو بھیجوں گا؟) معلوم ہوا کہ نگاہِ نبوت میں شجاعۃً اور عقلاً سیدنا علی ﷛ سے افضل کوئی مرد نہیں تھا۔ چنانچہ محدث ابو العباس القرطبی اور شیخ محمد امین الاری العلوی ''لأعطين الراية'' کے تحت لکھتے ہیں:

وفيه مايدل علىٰ أن الأولىٰ بدفع الراية إليه من اجتمع له الرئاسة، والشجاعة وكمال العقل.

''اور اس حدیث میں دلیل ہے کہ پرچم اس کو سونپنا بہتر ہے جس میں ریاست، شجاعت اور کمالِ عقل جمع ہو''۔

(المفهم ج٦ ص ٢٧٥؛ الكوكب الوهاج، ج٢٣ ص ٤٤٦)

ایک اور مقام میں علامہ ابن قیم الجوزیہ شجاع اور بخیل کے موازنہ میں لکھتے ہیں:

والشجاع ضد البخيل، لأن البخيل يضن بماله، والشجاع يجود بنفسه، كماقال القائل:

كم بين قوم إنمانفقاتهم
مال وقوم ينفقون نفوسا

وقال الآخر:

تجود بالنفس إن ضن الجواد بها

والجود بالنفس أقصى غاية الجود

''شجاع اور بخیل ایک دوسرے کی ضد ہیں: بخیل اپنے مال خرچ کرنے پر بھی کبیدہ خاطر ہوتا ہے اور شجاع اپنی جان بھی خرچ کر دیتا ہے، جیسا کہ کسی شاعر نے کہا: کتنا فرق ہے اُن لوگوں میں جو اپنا مال خرچ کرتے ہیں اور اُن میں جو اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے:

تو اپنی جان کی سخاوت کرتا ہے، اگر چہ سخی اس معاملہ میں بخیل ہے، اور جان کی سخاوت جود وسخا کے میدان میں انتہائی درجہ کی سخاوت ہے''۔

(الفروسية لابن القيم ص ۲۵۰ ،وط: ص ٤٦٤، ٤٦٥)

قرآن مجید میں بھی مال پر جان کو مقدم فرمایا گیا ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ.

''یقیناً اللہ نے خرید لی ہیں ایمانداروں سے اُن کی جانیں اور اُن کے مال اس عوض میں کہ ان کے لیے جنت ہے''۔

(التوبة: ۱۱۱)

اس کے علاوہ قرآن کریم میں جہاں اَنفس پر اموال کا ذکر مقدم ہے تو وہ عملی ترتیب کی رعایت کے پیش نظر ہے، اس لیے کہ مجاھد اپنے مال سے سواری اور دوسرے اخراجات کا اہتمام پہلے کرتا ہے اور میدانِ جہاد میں جا کر جان کا نذرانہ بعد میں پیش کرتا ہے۔ جن لوگوں نے اس ترتیب میں غور نہیں کیا تو وہ جان پر مال کو ترجیح دے بیٹھے، حالانکہ یہ بداہۃً باطل ہے۔ غالبًا امام یافعی یمنی رحمۃ اللہ علیہ نے سیدنا عثمان غنی اور سیدنا علی المرتضی رضی اللہ عنہما کے مفاضلہ میں ایسے ہی لوگوں کی بابت الفاظ منظوم تردید فرمائی ہے:

إن الإمام شهيد الدار خاشعهم — الناسک الجامع القرآن والتالي

القانت المنفق الأموال حيث رضى — مولاه مولىً عفيفاً طاهراً أذيال

مجلل منه تستحيي ملائكة — وذو حياء وحلم غير مدلال

لیست فضائل ذي النورین منکرة / لکن کم قوم حاوي الفضل مفضال

لیس الذي ینفق الأموال محتسباً / في نصرة الدین سمحاً فیه بالمال

کباذل نفسه فی اللّٰه محتسباً / في کل هیجا جنود الکفر قتال

کُلٌ حمیدولکن لیس جودفتی / بالمال کالجود بالروح الزکي الغال

ولیس تالي کتاب اللّٰه جامعه / کناشر لمعالم دینه العالي

۱۔ ''بیشک شہید الدار امام اور صحابہ میں خشوع والے، عبادت گذار، جامع القرآن اور تلاوت کرنے والے،

۲۔ خلوص کے ساتھ اپنے مولیٰ کی رضا میں مال خرچ کرنے والے، پاکیزہ وپاکدامن ہیں،

۳۔ ایسی عظمت والے ہیں فرشتے جن سے حیا کرتے ہیں، اور شرم اور بردباری کا پیکر ہیں، کم تر نہیں،

٤۔ ذوالنورین کے فضائل سے انکار نہیں، لیکن بہت سے لوگ حاوی فضیلت کے حامل ہیں،

٥۔ وہ شخص جو مال کو ثواب کے ارادہ سے خرچ کرتا ہے، اور نصرت دین میں مالی سخاوت کرتا ہے،

٦۔ اُس شخص کی مانند نہیں جو گھمسان کی جنگ میں لشکر کفر کے ساتھ لڑتے ہوئے راہِ الٰہی میں جان خرچ کرتا ہے،

۷۔ سب خوبیوں والے ہیں لیکن کسی نوجوان کی مالی سخاوت، پاکیزہ اور قیمتی جان کی سخاوت کی طرح نہیں،

۸۔ قرآن کریم کی تلاوت کرنے والا، اسے حفظ کرنے والا، اللہ کے بلند دین کے مقاصد کو پھیلانے والے کی طرح نہیں ہے''۔

(مرآۃ الجنان ج۱ ص۹۱)

سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کا ''صدیق اکبر'' ہونا

زیر تشریح حدیث میں سیدنا علی ﷺ سے منقول ایک جملہ یہ ہے: ''کنتُ أول من صدّق به'' (میں پہلا ہوں حضور ﷺ کی تصدیق کرنے والا) اور قرآن کریم میں اللہ اور اُس کے رسولوں پر ایمان لانے والے ہر شخص کو صدیق فرمایا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ.

''جو لوگ ایمان لائے اللہ اور اس کے رسولوں پر وہی صدیقین ہیں''۔ (الحدید: ۱۹)

اور چونکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں، لہٰذا پہلے صدیق ہیں اور باقی لوگ بعد میں ایمان لانے والے صدیقین ہیں، اور چونکہ جو پہلا صدیق ہو وہی سب سے بڑا صدیق (صدیق اکبر) ہوتا ہے اس لیے سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ایک اور موقعہ پر صراحتاً فرمایا:

أنا الصديق الأكبر، امنت قبل أن يؤمن أبوبكر وأسلمتُ قبل أن يسلم.

''میں صدیق اکبر ہوں، میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے پہلے ایمان لایا اور ان سے پہلے اسلام لایا''۔

(تاريخ دمشق ج٤٢ ص٣٣؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٧ ص٣٠٤؛ ذخائر العقبىٰ ص٧٣)

اس سلسلے میں ایک حدیث یہ بھی ہے، امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں:

حدثنا محمد بن إسماعيل الرازي، ثنا عبيد الله بن موسىٰ، أنبأنا العلاءُ بن صالح، عن المنهال، عن عباد بن عبد الله، قال: قال علي: أنا عبد الله، وأخو رسوله وأنا الصديق الأكبر، لايقولها بعدي إلا كذاب، صليتُ قبل الناس بسبع سنين.

''عباد بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں اللہ کا بندہ ہوں اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بھائی ہوں اور میں صدیق اکبر ہوں۔ میرے بعد یہ دعویٰ نہیں کرے گا مگر جھوٹا شخص، میں نے لوگوں سے سات برس قبل نماز پڑھی تھی''۔

(سنن ابن ماجه ج١ ص٨٥ حديث ١٢٠؛ السنن الكبرىٰ للنسائي ج٧ ص٤٠٩ حديث ٨٣٣٨، وط: ج٥ ص١٠٧ حديث ٨٣٩٦؛ فضائل الصحابة ج٢ ص٧٢٦ حديث ٩٩٣؛ المستدرك للحاكم ج ٣ ص١١١ حديث ٤٦٤١؛ المصنف لابن أبي شيبة ج٦ ص٣٧٠ حديث ٣٢٠٧٥؛ كتاب السنة لابن أبي عاصم ص٥٨٤ حديث ١٣٢٤)

امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"هذا إسناد صحيح" (یہ سند صحیح ہے)۔

(زوائد ابن ماجه للبوصيري ص٤٦؛ مصباح الزجاجة ص١٦٠)

امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''یہ حدیث امام بخاری اور امام مسلم کی شرط پر صحیح ہے''۔

(المستدرك للحاكم ج٣ ص١١١ وط: ج٤ ص٧٥)

راقم الحروف کہتا ہے: لیکن اس میں ایک شخص عباد بن عبداللہ الاسدی الکوفی ہے، امام ابن حبان اور امام عجلی نے اس کو ثقہ اور حافظ رحمہم اللہ نے اس کو ضعیف کہا ہے۔

(كتاب الثقات ج٥ ص١٤١؛ تاريخ الثقات للعجلي ص٢٤٧ حديث٧٦٥؛ تقريب التهذيب ج١ ص٢٧٣)

اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو اگرچہ امام حاکم اور امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہما نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے لیکن سنداً اس کا صحیح ہونا مشکل ہے، تاہم جن لوگوں نے اس کو شدید ضعیف یا موضوع کہا ہے، اُن کا کہنا بھی درست نہیں، البتہ اس حدیث کو سنداً حسن قرار دینا انصاف کی بات ہے۔

حدیثِ ھٰذا کو موضوع کہنے کی عجیب وجہ

علامہ ابوالحسن سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں ایک عجیب اشارہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

قلت: فكان من حكم عليه بالوضع، حكم عليه لعدم ظهور معناه لا لأجل خلل في إسناده، وقد ظهر معناه بما ذكرناه.

''میں کہتا ہوں: پس جس شخص نے اس حدیث پر وضع کا حکم لگایا ہے تو وہ حکم اس کے معنیٰ ظاہر نہ ہونے کی وجہ سے لگایا ہے، اس کی سند میں خلل کی وجہ سے نہیں لگایا، حالانکہ اس کا معنیٰ ظاہر ہے، جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں''۔

(شرح سنن ابن ماجه ج١ ص٨٦)

علامہ سندھی نے اس سے قبل ''أنا الصديق الأكبر'' کے تحت یہ لکھا ہے:

كأنه أراد بقوله "الصديق الأكبر" أنه أسبق إيماناً من أبي بكر أيضاً، وفي "الإصابة" في ترجمة علي: هو أول الناس إسلاماً في قول الكثير من أهل العلم.

''گویا سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنے ارشاد ''أنا الصديق الأكبر'' سے یہ ارادہ کیا ہے کہ وہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بھی ایمان میں سابق ہیں، اور ''الإصابة'' میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے حالات میں مذکور ہے کہ اکثر اہل علم کے قول کے مطابق سیدنا علی رضی اللہ عنہ تمام لوگوں سے اسلام میں اول ہیں''۔

(شرح سنن ابن ماجه ج١ ص٨٦)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب علامہ سندھی کے نزدیک اس حدیث کا معنیٰ ظاہر ہے تو پھر جن لوگوں نے سند حدیث سے قطع نظر فقط اس کے معنیٰ ظاہر نہ ہونے کی وجہ سے اسے موضوع قرار دے دیا ہے تو اُنہیں کونسی معنوی مشکل در پیش آ گئی تھی؟ احقر کے نزدیک یہ معنوی مشکل وہ ہو سکتی ہے جو علامہ ابن تیمیہ کو بھی پیش آئی تھی، اور عنقریب اس کا ذکر آ رہا ہے۔

بہرحال اس حدیث میں سیدنا علی المرتضیٰ علیہ السلام کے صریح الفاظ سے اُن کا "صدیق اکبر" ہونا محقق ہوا، اور جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد ثابت ہے تو اُن کے اس دعویٰ کے حق ہونے میں شک کی کوئی گنجائش نہیں، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اُن کے قلب و زبان کے بارے میں حتمی ضمانت منقول ہے: "إن اللّٰه سيهدي قلبك ويثبت لسانك" (اللہ تعالیٰ تمہارے دل کو کھول دے گا اور تمہاری زبان کو ثابت رکھے گا) پھر جب ایمان میں مقدم ہونے کی وجہ سے وہ سب سے بڑے صدیق (صدیق اکبر) ہیں تو تصدیق میں مقدم ہونے کی وجہ سے سب سے بڑے متقی (أتقی) بھی وہی ہیں، کیونکہ قرآن کریم میں ہے:

وَالَّذِي جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ.

"وہ ہستی جو صدق کو لے آئی اور جنہوں نے اُس صدق کی تصدیق کی وہی متقین ہیں"۔

[الزمر:۳۳]

سو جس طرح اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے میں مقدم ہونے کی وجہ سے سیدنا علی علیہ السلام "صدیق اکبر" ہیں اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لائے ہوئے صدق (مکمل اسلام) کی قولی اور عملی تصدیق میں مقدم ہونے کی وجہ سے سب سے بڑے متقی بھی وہی ہیں۔ اس حقیقت کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے مذکورہ بالا حدیث میں "صليتُ قبل الناس بسبع سنين" کے الفاظ میں بیان فرمایا اور درج ذیل حدیث میں یوں ارشاد فرمایا:

أول من أسلم من الرجال أبوبكر، وأول من صلىٰ القبلة من الرجال مع النبي ﷺ علي.

"(بالغ و آزاد) مردوں میں سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ پہلے اسلام لائے اور رجال میں سے اول شخص جس نے قبلہ رخ ہو کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی وہ علی ہے"۔

(تاريخ مدينة دمشق ج٤٢ ص٣٣؛ مختصر تاريخ دمشق ج١٧ ص٣٠٤)

اسی لیے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا گیا:

السُّبَّقُ ثلاثة: فالسابق إلىٰ موسىٰ يوشع بن نون ،والسابق إلىٰ عيسىٰ صاحب يٰس، والسابق إلىٰ محمد علي بن أبي طالب.

''سبقت کرنے والے تین ہیں: حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سبقت کرنے والے یوشع بن نون ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سبقت کرنے والے صاحب یٰسین (حبیب نجار) ہیں اور [سیدنا] محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سبقت کرنے والے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں''۔

(المعجم الكبير ج٥ ص٢٧٧ حديث١٠٩٨٩؛ ذخائر العقبىٰ ص٧٣؛ الجامع الصغير ص٣٥٧ حديث٣٧٩٥؛ جمع الجوامع ج٣ ص٧٥٥ حديث١١٠٠٦؛ جامع الأحاديث الكبير ج٦ ص٣٢ حديث١٣١٨٣؛ الصواعق المحرقة ص١٢٥)

حافظ ہیثمی اور علامہ شوکانی لکھتے ہیں:

''اس حدیث کو امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں حسین بن حسن الاشقر ہے، امام ابن حبان نے اس کی توثیق اور جمہور نے تضعیف کی ہے اور اس کے باقی راوی حدیثِ حسن اور صحیح کے راوی ہیں''۔

(مجمع الزوائد ج٩ ص١٠٢، وط: ج٩ ص١٢٤ حديث١٤٥٩٨؛ در السحابة للشوكاني ص٢٠٦)

حسین بن حسن الاشقر کے بارے میں حافظ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''یہ سچا شخص تھا، اسے وہم ہوتا تھا اور تشیع میں غالی تھا''۔

(تقريب التهذيب ج١ ص١٢٣)

خیال رہے کہ تشیع غلو یا بلا غلو روایت حدیث میں مضر نہیں، البتہ رفض روایت حدیث میں مضر ہے۔ جیسا کہ ہم اس سے قبل ''میزان الاعتدال'' وغیرہ کے حوالے سے لکھ چکے ہیں۔ لہٰذا یہ وہمی تھا یا غالی سب باتیں اپنی جگہ مگر اس کی نقل کردہ حدیث متعدد احادیث حسنہ اور صحیحہ کے مطابق ہے، یعنی وہ احادیث جن میں سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے اول مسلم ہونے اور اول نمازی ہونے کا ذکر ہے، اور ایسی اکثر احادیث اور اُن کا حکم ہم اپنی کتاب ''شرح خصائص علي رضی اللہ عنہ'' کے صفحات ٣٧ تا ٦٥ پر لکھ چکے ہیں، وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

اگر آپ اُن سب احادیث کو سامنے رکھتے ہوئے اس فرمانِ الٰہی میں غور فرمائیں:

ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ. الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ

وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ.

''یہ بلند رتبہ کتاب ہے، اس میں کوئی شک نہیں، اس میں ہدایت ہے اُن متقین کے لیے جو غیب پر ایمان لاتے اور نماز قائم کرتے ہیں''۔

(البقرة:۲،۳)

تو آپ پر ''أتقی'' (سب سے بڑے متقی) ہونے کی حقیقت از خود واضح ہو جائے گی۔ دیکھئے اس آیت میں متقین کے لیے دو باتیں بیان فرمائی گئیں: [۱] ایمان بالغیب [۲] قیامِ نماز۔ لہٰذا جو ایمان میں مقدم ہوگا وہی صدیق اکبر ہوگا اور جو نماز میں مقدم ہوگا وہی ''أتقی'' ہوگا۔

اس کی تائید ایک اور حدیث سے یوں ہوتی ہے، ابن ابی لیلیٰ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

الصديقون ثلاثة: حبيب بن مري النجار مؤمن آل ياسين، حزقيل مؤمن آل فرعون، وعلي بن أبي طالب الثالث، وهو أفضلهم.

''صدیق تین ہیں: ایک آل یسین سے حضرت حبیب بن مری النجار، دوسرے فرعونی قوم سے حضرت حزقیل اور تیسرے حضرت علی بن طالبؑ ہیں، اور وہ سب سے افضل ہیں''۔

(فضائل الصحابة ج۲ ص۷۷۷ حديث۱۰۷۲؛ معرفة الصحابة لأبي نعيم ج۱ ص۱۰٤ حديث۳٤۰ وط: ج۱ ص۸۷ حديث۳٤۰؛ ذخائر العقبىٰ ص۷۰؛ الجامع الصغير ص۳۸۳ حديث۵۱٤۹؛ جمع الجوامع ج٤ ص۷ حديث۱۱۱۸۸؛ جامع الأحاديث الكبير ج٦ ص۱۱۱ حديث۱۳۷٤۱؛ الصواعق المحرقة ص۱۲۵)

کیا ''الصدیقون ثلاثة'' موضوع ہے؟

ہم اس سے قبل علامہ سندھی کے حوالے سے لکھ چکے ہیں کہ ایک حدیث کی سند میں تو کوئی خلل نہیں تھا مگر اُس کے معنیٰ ظاہر نہ ہونے کی وجہ سے بعض لوگوں نے اُسے موضوع قرار دے دیا، کچھ ایسی ہی صورتِ حال اس حدیث کی ہے۔ چنانچہ اس کو البانی وغیرہ نے موضوع کہا ہے لیکن امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر حسن کی رمز لگائی ہے اور امام مناوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر سکوت اختیار کیا ہے، گویا اُنہوں نے امام سیوطی کی موافقت فرمائی ہے۔ ہر چند کہ اس حدیث کی سند اتنی قوی نہیں ہے لیکن علامہ ابن تیمیہ کی نگاہ اس کی سند کی بجائے اس کے معنیٰ کی

طرف چلی گئی ہے اور انہوں نے اس کو جھوٹ قرار دے دیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

إن هذا كذب علىٰ رسول الله ﷺ فإنه قد ثبت عنه في الصحيح أنه وصف أبابكر رضی اللہ عنہ بأنه صديق.

''یہ رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ ہے، کیونکہ صحیح میں آپ سے ثابت ہے کہ آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حق میں فرمایا کہ وہ صدیق ہیں''۔

(منهاج السنة ج۳ ص۲۱۹)

اس سے آگے علامہ ابن تیمیہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ صدیقین کثیر ہیں، گویا انہوں نے تین کے حصر کی نفی میں یہ بات کہی ہے۔ ہم کہتے ہیں: بلاشبہ صدیقین کثیر ہیں بلکہ قرآن کے مطابق ہر مومن صدیق ہے، لیکن اس کے باوجود اگر اللہ عزوجل اور اُس کا رسول ﷺ جس کو صدیق فرمائیں تو یہ اس کی مخصوص شان ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جس شان سے حضور ﷺ کی نبوت کی اور دوسرے اہم واقعات کی (مومنِ آلِ فرعون کے برعکس بیانگ دہل) تصدیق کی ایسی تمام تصدیقات کی بدولت وہ صدیق قرار پائے، لیکن اس حدیث میں جن تین شخصوں کو صدیق فرمایا گیا ہے وہ ان کی اوّلیت کی بنا پر فرمایا گیا ہے، لہٰذا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صفتِ صدیقیت والی حدیث سے اس حدیث کی تکذیب درست نہیں۔

لیکن یہاں وصف ''صدیق'' پر نہیں بلکہ ''صدیق اکبر'' پر بات ہو رہی ہے، اور سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو فقط صدیق نہیں بلکہ صدیق اکبر فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

حدثنا علي بن إسحاق الوزير الأصبهاني، حدثنا إسماعيل بن موسىٰ السدي، ثنا عمر بن سعيد، عن فضيل بن مرزوق، عن أبي سخيلة، عن أبي ذر، وعن سلمان، قالا: أخذ رسول الله ﷺ بيد علي رضی اللہ عنہ، فقال: إن هذا أول من آمن بي، وهو أول من يصافحني يوم القيامة، وهذا الصديق الأكبر، وهذا فاروق هذه الأمة يفرّق بين الحق والباطل، وهذا يعسوب المؤمنين، والمال يعسوب الظالم.

''حضرت ابوذر اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے پکڑ کر فرمایا: یہ پہلا ہے جو مجھ پر ایمان لایا، اور یہ پہلا ہے جو قیامت

کے دن مجھ سے مصافحہ کرے گا، اور یہ صدیق اکبر ہے، اور یہ اس امت کا فاروق ہے، حق و باطل کے مابین فرق کرنے والا ہے اور یہ مومنوں کا سردار ہے اور ظالموں کا سردار مال ہے"۔

(المعجم الکبیر ج۳ ص۱۹۵ حدیث۶۱۸۴)

حافظ ہیثمی نے اس حدیث کو امام طبرانی اور امام بزار کی سند سے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ اس میں ایک شخص عمر بن سعید المصری ہے اور وہ ضعیف ہے۔

(مجمع الزوائد ج۹ ص۱۰۲، وط: ج۹ ص۱۲۴ حدیث۱۴۵۹۷)

قاضی شوکانی نے "المعجم الکبیر" کے تمام راویوں کو ثقہ کہا ہے۔

(در السحابة للشوکاني ص۲۰۶)

خیال رہے کہ الفاظ کے اضافے اور کچھ فرق سے ایسے راویوں سے بھی یہ حدیث منقول ہے جن کے باعث اس حدیث کو امام سیوطی اور دوسرے محدثین نے موضوع کہا ہے، تاہم اس سند میں وہ راوی نہیں ہیں۔

(اللآلي المصنوعة ج۱ ص۲۹۷، ۲۹۸؛ تنزیه الشریعة ج۱ ص۳۵۳)

ایک اشکال اور اس کا حل

اگر سوال کیا جائے کہ مشہور تو یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ "صدیق اکبر" ہیں تو جواباً عرض ہے کہ یہ شہرت بجا اور حق ہے مگر سیدنا ابوبکر صدیقؓ اہل بیت کے بعد امت میں "صدیق اکبر" ہیں، بعد از اہل بیت اُن سے بڑا صدیق کوئی نہیں۔ اگر یہ تطبیق نہ کی جائے تو مولیٰ علیؓ کے پہلے ایمان لانے کے ذکر پر مشتمل تمام احادیث، پہلے نماز پڑھنے کے ذکر پر مشتمل تمام احادیث، اُن کے "صدیق اکبر" ہونے کے ذکر پر مشتمل تمام احادیث کا اور مذکورہ بالا آیات کا انکار لازم آتا ہے۔

پھر یہ بھی خیال رہے کہ امیر المومنین سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے لقب "صدیق" کے بارے میں تو احادیث مذکور ہیں لیکن اُن کے لقب "صدیق اکبر" کے متعلق ہم نے احادیث نہیں پائیں۔ اگر کسی شخص کے مطالعہ میں ایسی احادیث آئی ہوں تو برائے کرم اس عاجز کو ضرور مطلع فرمائیں۔ جزاکم اللہ تعالیٰ۔

أَتْقٰی اور أَشْقٰی

باقی سورۃ اللیل کی آیات میں جو دو لفظ "الأشقٰی" اور "الأتقٰی" آئے ہیں تو وہ دونوں لفظ جس

شانِ نزول کے طور پر آئے ہمیشہ کے لیے اُن کے ساتھ مخصوص نہیں۔ شانِ نزول کے لحاظ سے "الأشقٰی" کا لفظ امیہ بن خلف کی مذمت میں آیا اور "الأتقٰی" کا لفظ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں آیا۔ اب اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ پوری امت میں لفظِ "الأشقٰی" اسم تفضیل کے معنی میں ہمیشہ کے لیے امیہ بن خلف کے ساتھ مخصوص ہے اور لفظِ "الأتقٰی" اسم تفضیل کے معنی میں ہمیشہ کے لیے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ مخصوص ہے تو اس تفسیر سے کئی خرابیاں لازم آتی ہیں:

۱۔ فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب لازم آتی ہے، کیونکہ ایک حدیث پاک میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علی و عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما سے فرمایا:

ألا أحدثكما بأشقى الناس رجلين ؟ قلنا: بلى يا رسول الله! قال: أحيمر ثمود الذي عقر الناقة، والذي يضربك يا علي على هذه، ووضع يده على قرنه، حتى يبل منها هذه، وأخذ بلحيته.

"کیا میں تمہیں دو "اشقی" (تمام لوگوں سے بڑھ کر دو بدبخت شخصوں) کے بارے میں نہ بتلاؤں؟ ہم نے عرض کیا یارسول اللہ! کیوں نہیں۔ فرمایا: قومِ ثمود کا احیمر نامی شخص جس نے اونٹنی کی کونچیں کاٹی تھیں اور (دوسرا وہ شخص) جو اے علی تجھے یہاں مارے گا، یہ فرماتے ہوئے آپ نے اپنا ہاتھ مبارک سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے سر اقدس پر رکھا، یہاں تک کہ اس ضرب سے جاری ہونے والے خون سے یہ تر ہو جائے گی، یہ فرماتے ہوئے آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ڈاڑھی مقدس کو ہاتھ مبارک لگایا"۔

(مسند أحمد ج٤ ص٢٦٣ حديث١٨٥١١؛ فضائل الصحابة ج٢ ص٨٥٤ حديث١١٧٢؛ السنن الكبرىٰ للنسائي ج٧ ص٤٦٤ حديث٨٤٨٥، وط: ج٥ ص١٥٣ حديث٨٥٣٨؛ المستدرك ج٣ ص١٤٠ حديث٤٧٣٤؛ الأحاد والمثاني ج١ ص١٤٧ حديث١٧٥؛ شرح مشكل الآثار ج٩ ص٢٣٦ حديث٣٦٦٠؛ دلائل النبوة لأبي نُعيم ص٥٥٢ حديث٤٩٠؛ دلائل النبوة للبيهقي ج٣ ص١٢، ١٣؛ السيرة النبوية لابن هشام ج١ ص١٩٠، ١٩١؛ البداية والنهاية ج٢ ص٢٤٨، ٢٤٩، وج٩ ص٢٠٤، ٢٠٥؛ السيرة النبوية لابن كثير ج٢ ص٣١٩؛ تاريخ دمشق ج٤٢ ص٥٤٩)

جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امیہ بن خلف کے علاوہ سیدنا علی المرتضیٰ کے قاتل کو "اشقی" فرمایا ہے اسی

طرح نہ صرف یہ کہ نبی کریم ﷺ نے بلکہ خود سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ نے بھی اپنے آپ کو "صدیق اکبر" فرمایا ہے جو کہ "الأتقی" کی ایک تفسیر ہے۔ پس اگر شانِ نزول کی تخصیص کو اتنا ضروری سمجھا جائے جتنا بعض لوگ اس کے مخصوص ہونے پر زور دیتے ہیں تو ان دونوں حدیثوں کی تکذیب لازم آئے گی۔

۲۔ تخصیص کے اس قول کو لازم ماننے سے نبی کریم ﷺ اور سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کی تفسیر دانی پر بھی حرف آتا ہے، حالانکہ سیدنا علی ﷺ صدر المفسرین ہیں، جیسا کہ ہم باحوالہ نقل کر چکے ہیں۔

۳۔ ایک حدیث پاک میں ہے کہ اس وقت تک تم قرآن کو نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ قرآن کی وجوہ کثیرہ کا لحاظ نہ رکھو، اگر اس تخصیص کو لازم سمجھا جائے تو یہ لزوم اس حدیث کے خلاف ہوگا۔ شاید ایسی ہی وجوہ کے پیش نظر حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

وَسَيُجَنَّبُهَا الأَتْقَى الَّذِيْ، وغير ذلك محتمل التاويل است، فلا يفيد القطع. "وَسَيُجَنَّبُهَا الأَتْقَى الَّذِيْ" وغیرہا آیات میں تاویل کا احتمال ہے، لہٰذا یہ قطعیت کا فائدہ نہیں دیتیں"۔

(فتاوی عزیزی فارسی ج۱ ص ۱۰۰؛ ومترجم ص ۲۴۷)

لہٰذا یہ کہنا قرینِ قیاس ہے کہ امیہ بن خلف اپنے ہم جنس معاصرین میں "اشقی" تھا، اور سیدنا ابو بکر صدیق ﷺ اہل بیت کرام علیہم السلام کے علاوہ باقی صحابہ کرام ﷺ میں "اتقی" تھے اور بایں معنیٰ صدیق اکبر تھے۔

فائدہ

اس آیت پر علمی تحقیق کے لیے سیدنا عبد القادر جیلانی مدظلہ کی کتاب "زبدة التحقيق" کا مطالعہ بہت مفید ہے۔

ہمارے دور میں ظلم کی حد دیکھئے کہ اس کتاب کے مصنف مدظلہ جمہور کے مطابق افضلیتِ ابو بکر کے قائل ہیں اور تمام صحابہ کرام ﷺ کے باادب ہیں لیکن اس کے باوجود بعض ظالم لوگ انہیں شیعہ اور رافضی قرار دینے سے باز نہیں آئے۔

ایمان ونماز میں تقدیم کے سبب قطعی تفضیل

افضلیت کو ترتیب خلافت واجب قرار دینے والے لوگ جب مولیٰ علی ﷺ کی شان میں منقول دلائل کی

کثرت سے گھبراتے ہیں تو پھر یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ افضلیت کا دارومدار کثرتِ ثواب پر ہے، پھر اس پر گرفت محسوس کرتے ہیں تو کہتے ہیں: کثرتِ ثواب کا معاملہ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ یہ ناکارہ عرض کرتا ہے کہ جب مآل کار اس بات کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے تو پھر ایسی بحث میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ہاں! اس قسم کی بحث سے عام قارئین ضرور مرعوب ہو جاتے ہیں، لیکن اگر کوئی شخص واقعی سنجیدہ طرز سے کثرتِ ثواب کی بات کرے تو اُسے انصاف بھی کرنا ہوگا۔ ہم اُن شاہانہ مزاج لوگوں سے پوچھتے ہیں جو سیدنا علی المرتضیٰ ﷛ پر شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کو کثرتِ ثواب کے لحاظ سے افضلیت دیتے ہیں وہ بتلائیں کہ سیدنا فاروقِ اعظم عمر بن الخطاب ﷛ چھٹے سال میں اسلام لائے جبکہ مولیٰ علی ﷛ دوسرے دن سے نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز کی سعادت میں شامل ہو گئے تھے، تو کیا اُن کے نزدیک ۵،۶ سالوں کی عبادت وطاعت خصوصاً نبوی صحبت کی برکات وغیرہا کسی حساب وشمار میں نہیں؟ یاد رکھئے! شارع ﷺ کے نزدیک چند دنوں کی عبادت کے ثواب سے بھی زمین وآسمان کا فرق ہو جاتا ہے، جیسا کہ ہم اس سے قبل باحوالہ لکھ چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کو انصاف کی بات کرنے پر اپنی جناب سے اجر عطا فرمائے کہ وہ روافض کے رد میں مشہور ہونے کے باوجود حق بات لکھ گئے، جیسا کہ ہم چند صفحات قبل نقل کر چکے ہیں، اور یہاں ایک خاص جملے کو پھر نقل کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

> ''ان وجوہ میں حضرت علی ﷛ کی تفضیل حضرت ابوبکر ﷛ پر قطعی طور پر ثابت ہے، اور ایسا ہی حضرت علی ﷛ کی تفضیل حضرت عمر ﷛ پر قطعی طور پر ان امور میں ثابت ہے کہ حضرت عمر ﷛ سے پہلے حضرت علی ﷛ ایمان لے آئے اور ایسا ہی پہلے نماز بھی پڑھی''۔

(فتاویٰ عزیزي مترجم ص ٤١٢)

''حَدُّ المُفتَرِي'' والے اثر کا مطلب

سیدنا علی المرتضیٰ ﷛ سے بایں الفاظ ایک اثر (قولِ صحابی) نقل کیا جاتا ہے: ''لا أجد أحداً فضلني علیٰ أبي بکر وعمر إلا جلدته حد المفتري'' (میں جسے پاؤں گا کہ مجھے ابوبکر وعمر سے افضل کہتا ہے اسے الزام تراشی کی سزا کے طور پر اسی کوڑے ماروں گا) اگر یہ اثر صحیح ہو تو پھر اس کا وہ مفہوم درست نہیں جسے وہ لوگ لیتے ہیں جنہیں مولیٰ علی ﷛ کی ہر افضلیت پر تاویلاتِ فاسدہ کا سہارا لینے کا روگ ہے۔ وہ مفہوم تو خود سیدنا علی المرتضیٰ

ﷺ کے اپنے ہی ارشادات کے منافی ہے۔اس لیے کہ انہوں نے خود کو پہلا مومن اور اول نمازی فرمایا اور یہ اُن کی اُن تمام لوگوں پر قطعی افضلیت ہے جن سے وہ سابق ہیں، پھر اِن ہی دو فضیلتوں کی بدولت انہوں نے خود کو "صدیق اکبر" بھی فرمایا اور اس سے بڑھ کر اور افضلیت کیا ہوتی ہے؟

غور کر کے بتلایئے! یہ ماحول جو بدقسمتی سے آج کل بنا ہوا ہے، اس میں اگر کوئی عالم و مقرر منبر پر سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کو "صدیق اکبر" قرار دے تو کیا آج کا کوئی ملاں فتویٰ لگانے اور بس چلے تو حد لگانے سے باز آئے گا؟ نہیں، اس لیے کہ یہ لفظ افضلیت کی اکثر جہتوں کو محیط ہے، حالانکہ آپ نے دیکھا کہ حدیث سے ثابت ہے کہ سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کو "صدیق اکبر" فرمایا گیا اور انہوں نے بھی خود کو صدیق اکبر فرمایا، اور دوسری حدیث میں حضرت ابوبکر ﷺ کے تقابل میں اور اُن کا نام لے کر خود کو "صدیق اکبر" قرار دیا۔ لہٰذا خود سوچئے کہ حدِ مفتری والا فرمانِ مرتضوی اور "أنا الصديق الأكبر" والا فرمانِ مرتضوی بہ ظاہر متصادم نہیں؟ یقیناً متصادم ہیں، تو کیا ان دونوں میں مطابقت کی کوئی ضرورت نہیں؟

علاوہ ازیں ہم ایسے متعدد صحابہ کرام ﷺ کے اسماء لکھ چکے ہیں جو سیدنا علی ﷺ کو رسول اللہ ﷺ کے بعد سب سے افضل سمجھتے تھے، اور سیدنا امام حسن مجتبیٰ ﷺ تو سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ کو تمام اولین و آخرین سے افضل سمجھتے تھے۔ انہوں نے شہادتِ مرتضوی کے بعد اپنے خطبۂ خلافت میں سب لوگوں کے سامنے فرمایا تھا:

لقد كان فيكم رجل ماسبقه الأولون ولا يدركه الآخرون.

"کل تمہارے درمیان ایک ایسا شخص تھا جس سے نہ اولین سبقت کر سکے اور نہ ہی انہیں بعد والے پہنچ سکیں گے"۔

(مسند أهل البيت للأحمد ص ۲۷، ۲۸ حديث ۲، ۳؛ مسند أحمد ج ۱ ص ۱۹۹ حديث ۱۷۱۹، ۱۷۲۰، وط: ج ۳ ص ۲۴۶، ۲۴۷ حديث ۱۷۱۹، ۱۷۲۰؛ كتاب الزهد للإمام أحمد ص ۱۹۵ حديث ۷۰۹؛ فضائل الصحابة ج ۱ ص ۶۷۴ حديث ۹۲۲ وج ۲ ص ۷۳۷ حديث ۱۰۱۳؛ السنن الكبرى للنسائي ج ۷ ص ۴۱۶ حديث ۸۳۵۴؛ صحيح ابن حبان ج ۱۵ ص ۳۸۳ حديث ۶۹۳۶؛ المصنف لابن أبي شيبة ج ۶ ص ۳۷۲ حديث ۳۲۰۸۵ وص ۳۷۳ حديث ۳۲۰۹۶ وص ۳۷۴ حديث ۳۲۱۰۱، وط: ج ۱۷ ص ۱۱۲ حديث ۳۲۷۵۷ وص ۱۱۹، ۱۲۰ حديث ۳۲۷۶۸ وص ۱۲۴ حديث ۳۲۷۷۳؛ مسند أبي يعلى ج ۱۲ ص ۱۲۵ حديث ۶۷۵۸؛ المستدرك للحاكم ج ۳ ص ۱۷۱

حديث٤٨٥٥؛البداية والنهاية ج٥ص٤٤٤وط: ج٧ص٥٥٣؛إتحاف الخيرة المهرة ج٩ ص ٢٨٥ حديث٨٩٨٩؛مجمع البحرين للهيثمي ج٣ص٣٩٢حديث٣٧٣٤؛مجمع الزوائد ج٩ ص١٤٦ حديث١٤٧٩٨؛تقريب البغية ج٣ص٨٥حديث٣٢٥٦؛ مختصر زوائد البزار ج٢ص ٣٢١ حديث ١٩٣٧؛المطالب العالية ج٤ص٣٢٤حديث٤٥١٤،٤٥١٥،وط: ج ١٨ ص٢٤٢،٢٤٣، حديث٤٤٤٨)

حافظ ہیثمی نے لکھا ہے: امام احمد کی سند اور مسند البزار کی بعض اسناد اور طبرانی کی سند حسن ہے۔

(مجمع الزوائد ج٩ص١٤٦حديث١٤٧٩٨)

امام سندھی نے بھی اس تحقیق سے اتفاق کیا ہے۔

(حاشية مسند أحمد ج٢ص٩٧)

شیخ احمد شاکر نے مسند احمد کی دونوں سندوں کو صحیح کہا ہے۔

(مسند أحمد بتحقيق أحمد شاكر ج٢ص٣٤٤)

امام ابن ابی شیبہ سے اس حدیث کی تین سندیں ہیں، اُن کی تیسری سند کو شیخ محمد عوامہ نے حسن کہا ہے۔

(تعليقات: المصنف لابن أبي شيبة ج١٧ص١٢٤)

شیخ شعیب الأرنؤوط نے امام احمد کی دونوں سندوں کو حسن قرار دیا ہے۔

(مسند أحمد بتحقيق شعيب الأرنؤوط ج٣ص٢٤٦،٢٤٧)

دکتور علی محمد الصلابی نے اس حدیث کو امام احمد کی "فضائل الصحابة" سے نقل کر کے لکھا ہے: "إسناده صحيح" (اس کی سند صحیح ہے)۔

(أسمى المطالب ص٩٦٥؛الحسن بن علي بن أبي طالب ص١٧٢)

"فضائل الصحابة" کے محقق وصی اللہ بن محمد عباس نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔

(فضائل الصحابة ج١ص٦٧٤وج٢ص٧٣٧)

"المطالب العالية" کے محقق ڈاکٹر سعد بن ناصر بن عبدالعزیز الشثری نے اس حدیث کی سند پر کافی بحث کی ہے اور اُنہوں نے امام ابن سعد کی سند کو حسن قرار دیا ہے اور "مسند أبي يعلى" کی سند پر کلام کرتے ہوئے یوں فیصلہ دیا ہے:

''فی الجملہ یہ حدیث مذکورہ تمام طرق کے ساتھ مل کر حسن لغیرہ کا درجہ اختیار کر چکی ہے''۔

(المطالب العالیۃ ج۱۸ ص۲۴۲،۲۴۳)

سیدنا امام حسن کا یہ عقیدہ بعد میں تمام ائمہ اہل بیت کرام علیہم السلام کا رہا۔ خود سوچئے! کیا امام حسن مجتبیٰ ﷺ جیسا جنتی سردار اور انتہائی نرم خو امام اور پھر اُن کے بعد تمام ائمہ کرام علیہم السلام اپنے بابا کے ایسے ارشاد کی خلاف ورزی کر سکتے ہیں جس پر اُن کے بابا نے حد مقرر فرمائی ہو؟ ہرگز نہیں۔ لہٰذا اگر اس اثر کی سیدنا علی ﷺ سے صحت ثابت ہو بھی جائے تو لازماً اس کا معنی یہ ہوگا کہ اگر کسی شخص نے سیدنا علی ﷺ کی ایسی افضلیت بیان کی جس سے شیخین کریمین ﷺ کی خلافتِ حقہ پر حرف آئے یا اُن کی تنقیص و توہین لازم آئے تو اُس پر مفتری کی حد جاری کی جائے گی۔

اس اثر کی شانِ ورود

یقین فرمایئے کہ جب ''شرح خصائص علي ﷺ'' کے منظر عام پر آ جانے کے بعد اس احقر کو اپنے بعض نئے احباب سے کتاب ''ضربِ حیدری'' کے بارے میں معلوم ہوا، اور پھر میں نے اُس میں سیدنا علی مرتضیٰ ﷺ کا یہ قول پڑھا تو میں حیرت زدہ نہیں ہوا، کیوں؟ اس لیے کہ مجھے دو باتوں میں سے کسی ایک کے پائے جانے کا راسخ یقین تھا:

۱۔ ایک یہ کہ یہ قول موضوع ہوگا

۲۔ دوسری یہ کہ اگر یہ قول درست ہوا تو پھر اس کی کوئی خاص وجہ ہوگی

الحمد للہ، میرا یقین صحیح ثابت ہوا، یہ اثر اگرچہ موضوع نہیں لیکن اس کے ورود کی وہ خاص اور معقول وجہ ضرور موجود ہے جو مجھ کم فہم کے ذہن میں آئی تھی۔ بلاشبہ یہ حد سیدنا علی مرتضیٰ ﷺ کی محض افضلیت کے قائلین کے بارے میں نہیں کیونکہ یہ کوئی جرم نہیں بلکہ یہ حد مولیٰ علی ﷺ کے ایسے نام نہاد مگر غالی محبین کے لیے ہے جو شیخین کریمین ﷺ کے بدخواہ تھے۔ چنانچہ فقیہ شام، شیخ الاسلام امام ابراہیم بن محمد المعروف بابی اسحاق الفزاری متوفی ۱۸۶ھ لکھتے ہیں:

ثنا شعبة عن سلمة بن كهيل، عن أبي الزعراء، أو عن زيد بن وهب أن سويد بن غفلة الجعفي، دخل على علي بن أبي طالب ﷺ في إمارته، فقال: يا أمير

المؤمنين! إني مررت بنفر يذكرون أبابكر وعمر بغير الذي هما له أهل من الإسلام ،لأنک يرون أنک تضمر لهما علىٰ مثل ذلک،وإنهم لم يجترء وا علىٰ ذلک إلا وهم يرون أن ذلک موافق لک،وذکر حديث خطبة علي وكلامه في أبي بكروعمر رضي الله عنهم وقوله في آخره:

ألا ولن يبلغني عن احد يفضلني عليهما إلا جلدته حد المفتري.

''حضرت شعبہ نے از سلمہ بن کہیل ، از ابوالزعراء، یا از زید بن وہب رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ حضرت سوید بن غفلہ جعفی نے سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: یا امیر المؤمنین! میرا گزر کچھ ایسے افراد سے ہوا جو حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کا ذکر اُن کے اُس حق سے ہٹ کر کر رہے تھے جس کے وہ اسلام میں مستحق ہیں، اس لیے کہ وہ گمان کرتے ہیں کہ آپ بھی اُن دونوں کے بارے میں یہی خیال رکھتے ہیں۔ انہوں نے یہ جرأت فقط اس لیے کی ہے کہ اُن کا گمان ہے کہ اُن کی یہ جرأت آپ کے موافق ہے۔ اور اُس نے سیدنا علی کے خطبہ کا ذکر کیا اور اُنہوں نے حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی جو شان بیان فرمائی اُس کا ذکر کیا اور آخر میں سیدنا علی کا یہ قول ذکر کیا: ''خبر دار جس کے متعلق مجھے معلوم ہوا کہ وہ مجھے شیخین پر فضیلت دیتا ہے تو میں اس پر جھوٹے کی حد لگاؤں گا''۔

(كتاب السير لأبي إسحاق الفزاري ص ٣٢٧)

یہ کون لوگ تھے؟ اس کی وضاحت اسی سند کے ساتھ اسی روایت میں موجود ہے، چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ اس روایت کو مکمل لائے ہیں، اُس میں ہے: ''ومنهم عبد الله بن سبا'' (عبداللہ بن سبأ یہودی بھی اُن میں تھا) جسے سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ملک بدر کر دیا اور فرمایا: تم کسی شہر میں نہیں ٹھہر سکو گے، پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ منبر پر جلوہ افروز ہوئے ، حتیٰ کہ لوگ جمع ہو گئے، اس کے بعد راوی نے مولیٰ علی رضی اللہ عنہ سے شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کی ثناء کے ساتھ طویل واقعہ ذکر کیا اور آخر میں مذکورہ اثر ''ألا ولا يبلغني عن أحد يفضلني......'' ذکر کیا۔

دیکھیے: (لسان الميزان ج٤ ص ٢٤ ،وط: ج٤ ص ٤٨٥)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ عبداللہ بن سبأ اور اُس کے ہمنوا لوگ تھے، اور ابن سباء بدبخت کی بدبختی محتاج بیان نہیں، یہ ایک طرف تو ''كان يقع في أبي بكروعمر رضي الله عنهما'' (حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی

برائی کرتا تھا) اور دوسری طرف سیدنا علی ﷺ کے بارے میں غلو کرتا تھا، حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے: اس کے پیروکاروں کو سبائیہ کہا جاتا ہے جو سیدنا علی ﷺ کے بارے میں الوہیت کا عقیدہ رکھتے تھے، انہیں سیدنا علی ﷺ نے آگ میں جلا دیا تھا۔

(لسان الميزان ج٤ ص ٢٤، وط: ج٤ ص ٤٨٥)

اس سے معلوم ہوا کہ ایسے فتنے پرور لوگوں کا سدباب کرنے کے لیے سیدنا علی ﷺ نے انتہائی سخت قدم اٹھایا اور ارشاد فرمایا: باقی باتیں تو اپنی جگہ آج کے بعد مجھے اتنا معلوم ہوا کہ کوئی شخص مجھے شیخین پر فضیلت دیتا ہے تو میں اس پر بھی جھوٹے کی حد لگاؤں گا۔

کونسا تفضیلی مفتری کی حد کا سزاوار ہے؟

اگر کوئی شخص اس واضح تصریح کے باوجود بھی اس حقیقت کا انکار کرے اور ایسے بدعقیدہ لوگوں کے علاوہ اُن لوگوں پر بھی حیدری ضرب کا فتوٰی دے جو نہ صرف یہ کہ شیخین کریمین کی خلافت کو حق مانتے ہوں بلکہ اُن کے فضائل ومناقب کا بھی اقرار واظہار کرتے ہوں تو اسے وضاحت کرنا ہوگی کہ یہ حد کس قسم کے تفضیلی پر جاری ہوگی؟ آیا فقط کلی افضلیت کے قائل پر یا جزوی کے قائل پر بھی؟ مثلاً ہمارے بعض معاصرین نے تفضیلیوں کے بارے میں جو یہ لکھا ہے کہ:

> "تفضیلی عقیدے والا آدمی اہل سنت سے خارج ہو جاتا ہے۔ اہل سنت وہ تہتر واں فرقہ ہے جسے نبی کریم ﷺ نے جنتی قرار دیا ہے ما انا علیہ و اصحابی۔ اور آپ اس کتاب میں تفصیل سے پڑھ چکے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا فیصلہ (ما انا علیہ) کیا ہے۔ اور صحابہ کرام (واصحابی) کا فیصلہ کیا ہے۔ باقی تمام فرقوں کو ہم نے اپنی جیب سے کاغذ نکال کر غلط نہیں کہا۔ بلکہ جناب محمد مصطفٰی علیہ التحیۃ والثناء نے انہیں اپنی زبانِ حق ترجمان سے جہنمی قرار دیا ہے (کلھم فی النار ترمذی حدیث رقم: ۲۶۴۱، مشکوۃ حدیث رقم: ۱۷۱)۔"

(ضرب حيدري ص 260)

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

> "علماء امت نے تفضیلیوں کو اہل سنت سے خارج قرار دیا ہے، ان کی نماز جنازہ تک ناجائز

لکھی ہے''۔

(ضرب حيدري ص 260)

یہ حکم کیسے تفضیلی کے بارے میں ہے؟ یہ وضاحت اس لیے لازمی ہے کہ بعض اسلاف کرام نے تفضیلیوں کی اقسام بیان فرمائی ہیں۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک استفتاء آیا تو انہوں نے تفضیلیوں کی دو قسمیں بیان فرمائیں۔ سوال و جواب دونوں ملاحظہ فرمایئے:

سوال: تفضیلیہ کو امام بنانا جائز ہے یا نہیں اور اگر اس کے پیچھے اہلِ سنت نماز میں اقتداء کریں تو اس بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب: تفضیلیہ کی دو قسمیں ہیں، پہلی قسم اُن لوگوں کی ہے جو حضرت علی ﷺ کو شیخین پر فضیلت دیتے ہیں مگر شیخین کی محبت، اُن کی تعظیم، اُن کے مناقب و مدائح بیان کرنے اور قول و فعل میں اُن کے طریقہ کی اتباع کرنے میں سرگرم اور ثابت قدم ہیں، اس قسم کے لوگ شیخین پر جنابِ مرتضٰی علی ﷺ کی مذکورہ بالا تفضیل کے باوجود اور حضرت علیؓ کی محبت اور اتباع میں سرگرم ہونے کے باوجود اہلِ سنت میں داخل ہیں، لیکن انہوں نے اس مسئلہ میں خطا کی ہے اور ان کے اس اختلاف کو یوں سمجھنا چاہیئے، جیسا کہ اشعریہ اور ماتریدیہ کے مابین اختلاف ہے۔ اس قسم کے تفضیلی کی امامت جائز ہے اور اہل سنت کے بعض علماء اور صوفیہ اس روش پر تھے۔ جیسا کہ محدث عبدالرزاق، سیدنا سلمان فارسی اور حضرت حسان بن ثابت اور بعض دوسرے صحابہ کرام ﷺ۔

اور تفضیلیہ کی دوسری قسم وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں: ہمیں حضرت علی مرتضٰی اور اُن کی اولاد کی محبت اور قول و فعل میں اُن کے طریقہ کی اتباع ہی کافی ہے، اور ہم شیخین اور دوسرے صحابہ کو بُرا نہیں کہتے لیکن ہمیں اُن سے کوئی سروکار بھی نہیں، نہ محبت نہ عداوت، نہ اتباع اور نہ ترکِ اتباع، نہ اُن کے قول و فعل پر عمل کرنا اور نہ اعراض کرنا، اس قسم کے تفضیلی بلاشبہ بدعتی ہیں اور ان کی امامت کا حکم وہی ہے جو بدعتی کی امامت کا ہے، اور معتبر اہل سنت میں سے کوئی شخص اس قسم کا تفضیلی نہیں ہوا''۔

(فتاوى عزيزي فارسي ص ۱۸۳، ۱۸۴ ومترجم ص ۴۱۲، ۴۱۳)

یہاں چند سوالات حل طلب ہیں:

أ۔ نبی اکرم ﷺ نے مولی علی ؓ کو پوری امت سے علم، حلم اور اسلام میں مقدم فرمایا، کیا یہ تفضیل ہے؟ اور اگر ہے تو کس قسم کی؟

ب۔ سیدنا علی المرتضیٰ ؓ نے خود کو اولین مصدق، اولین مسلم، اولین نمازی اور "صدیق اکبر" تک قرار دیا ہے، کیا یہ تفضیل ہے؟ اور اگر ہے تو کس قسم کی؟

ج۔ سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے فرمایا تمام اولین سیدنا علی المرتضیٰ علیہ السلام پر سبقت نہیں کر سکے اور آخرین اُن کے مرتبہ تک پہنچ نہیں سکیں گے، کیا یہ تفضیل ہے؟ اور اگر ہے تو کس قسم کی؟

د۔ حضرات سلمان فارسی، ابوذر، مقداد، خباب، جابر، ابوسعید خدری، زید بن ارقم، قیس بن سعد بن عبادہ اور حسان بن ثابت وغیرھم ؓ مولی علی ؓ کو افضل سمجھتے تھے، وہ تفضیلیہ کی کس قسم میں شمار ہوں گے؟ آیا یہ حضرات نماز کی امامت کے لائق تھے یا نہیں؟

ھ۔ سیدنا زید بن علی علیہما السلام شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کا نام لے کر اُن پر سیدنا علی المرتضیٰ ؓ کو فضیلت دیتے تھے، وہ تفضیلیوں کی کس قسم میں شمار ہوں گے؟ آیا ایسے تفضیلی کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں؟

و۔ ائمہ اہل بیت اور اہل سنت میں اکثر سادات کرام سیدنا علی المرتضیٰ ؓ کی تفضیل کے قائل رہے اور ہیں، ان کا شمار کس قسم کے تفضیلیوں میں ہوگا اور کیا ان پر حد لگے گی یا نہیں؟

ز۔ سیدنا علی المرتضیٰ ؓ چوتھے خلیفۂ راشد ہیں اور ارشادِ نبوی ﷺ ہے "عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين" تو کیا خلیفۂ راشد کا حد مفتری کا یہ حکم اُن کی اولاد پر بھی جاری ہوگا یا خلیفہ کی اولاد حدود و تعزیرات سے مستثنیٰ ہوتی ہے؟

تفضیلی سید اور غیر تفضیلی سید کے حکم میں فرق؟

ح۔ امام احمد رضا حنفی رحمۃ اللہ علیہ ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

"سید سنی المذھب کی تعظیم لازم ہے، اگرچہ اُس کے اعمال کیسے ہی ہوں، اُن اعمال کے سبب اُس سے تنفر نہ کیا جائے، نفس اعمال سے تنفر ہو بلکہ اس کے مذھب میں بھی قلیل فرق ہو کہ حد کفر تک نہ پہنچے جیسے تفضیل تو اس حالت میں اُس کی تعظیم سیادت نہ جائے گی"۔

(فتاوی رضویہ ج۲۲ ص۴۲۳)

اس فتویٰ کی روشنی میں امام حسن مجتبیٰ، امام زید بن علی اور اب تک دوسرے تفضیلی حسنی اور حسینی سادات کا حکم تو معلوم ہو گیا کہ اُن کی تفضیلی بدمذھبی حد کفر تک نہیں پہنچتی، (نہ معلوم کہاں تک پہنچتی ہے) لہٰذا اُن کی تعظیم سیادت نہ جائے گی، لیکن جو غیر سادات تفضیلی تھے جیسا کہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت میں حضرت سلمان فارسی، حضرت حسان بن ثابت وغیرھما رضی اللہ عنہم کا نام آیا ہے، آیا وہ لائق تعظیم ہیں یا نہیں؟

ط. امام حسن مجتبیٰ، امام زید بن علی اور دوسرے ائمہ اہل بیت علیہم السلام اپنے بابا کی تفضیل کے قائل ہو کر اپنے مذھب میں قلیل فرق کے باوجود جو لائق تعظیم رہے تو کون سے شرعی قاعدہ کی رو سے؟

ی. کیا یہ تفضیلی سادات کرام اپنے نسب کی وجہ سے حد مفتری کی سزا سے بھی مستثنیٰ ہوں گے؟ اگر مستثنیٰ ہوں گے تو کون سے شرعی قاعدہ کی رو سے؟

ك۔ کیا حدود و تعزیرات میں سادات اور غیر سادات کے حکم میں فرق ہے؟

''ضرب حیدری'' کے قائلین بتلائیں کہ یہ حیدری ضرب کس قسم کے تفضیلی پر لاگو ہو گی؟ آیا فقط عبداللہ بن سباء اور اُس کے ہمنوا تفضیلیوں پر لاگو ہو گی یا امام حسن مجتبیٰ، دوسرے اہل بیت، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، اکثر تفضیلی سادات (جو امام احمد رضا کے نزدیک قابل تعظیم ہیں) پر بھی لاگو ہو گی؟ وضاحت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔





کیا مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے کسی خاص جنگ کا عہد لیا گیا؟

﴿٤٥﴾ حدثنا إسماعيل بن إبراهيم الهذلي،ثنا ابن عُلية،عن يونس،عن الحسن،عن قيس بن عباد قال:قلت لعلي:أخبرنا عن مسيرک هذا، أعهد عهده إليک رسول الله ﷺ أم رأي رأيته؟ قال:ما عهد إلي رسول الله ﷺ بشيء ولكنه رأي رأيته.

وهذا إسناد صحيح لا شک فيه،فرضي الله عنه وأرضاه،لم يأل فيما قال عن الحق، ومحض الصدق، وهذا المظنون به رضوان الله عليه.

﴿٤٥﴾ قیس بن عباد بیان کرتے ہیں کہ میں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے اُن کی آمد کے متعلق پوچھا کہ آیا رسول اللہ ﷺ نے اُنہیں ذمہ داری سونپی تھی یا انہوں نے اپنے طور پر یہ قدم اٹھایا ہے؟ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے کوئی عہد نہیں لیا تھا لیکن یہ میں اپنی سوچ سے کر رہا ہوں۔

(سنن أبي داود ج٤ ص٢٨٤ حديث ٤٦٦٦)

یہ سند صحیح ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ اُن پر اپنی رضا اتارے اور انہیں راضی فرمائے، انہوں نے جو کچھ فرمایا سب حق اور خالص سچ ہے، اور اُن کے متعلق یہی یقین ہے، رضوان اللہ علیہ۔

مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ یہ سند صحیح ہے، لیکن یہ سند صحیح نہیں ہے، البتہ دوسری احادیث سے مل کر قابلِ قبول ہے، اسی لیے امام ابوداود امام منذری رحمۃ اللہ علیہما نے اس پر خاموشی اختیار فرمائی ہے۔

(عون المعبود شرح سنن أبي داود ج١٢ ص٢٧٦)

حدیث میں مذکور سوال وجواب سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ذمہ نام زد کر کے کسی مخصوص ومعین جنگ کا عہد نہیں لیا تھا۔ انہوں نے جو بھی قدم اٹھایا تھا کتاب وسنت کی روشنی اور اپنی فہم کے مطابق اٹھایا تھا۔

صفین کی جنگ سے قبل ایسا ہی سوال سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے بھی کیا گیا تھا تو اُنہوں نے یوں جواب دیا تھا۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”حضرت قیس بن عباد بیان کرتے ہیں: میں نے سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے پوچھا: یہ جو کچھ تم سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی حمایت میں کر رہے ہو، آیا یہ تم اپنی سوچ کے تحت کر رہے ہو یا اس کے

بارے میں رسول اللہ ﷺ نے تم سے عہد لیا تھا؟ اُنہوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے ہم سے کسی چیز کے متعلق ایسا عہد نہیں لیا جو تمام لوگوں سے نہ لیا ہو۔ پھر فرمایا:

ولكن حذيفة أخبرني عن النبي ﷺ قال: قال النبي ﷺ: في أصحابي اثنا عشر منافقاً فيهم ثمانية لايدخلون الجنة حتى يلج الجمل في سم الخياط ، ثمانية منهم تكفيهم الدبيلة.

''لیکن سیدنا حذیفہ ﷺ نے مجھے نبی کریم ﷺ کی حدیث سنائی تھی، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میرے صحابہ میں بارہ افراد منافق ہیں، اُن میں سے آٹھ جنت میں داخل نہیں ہوں گے، یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل ہو اور اُن آٹھ کو ''الدُّبَيْلَة'' (ایک قسم کا پھوڑا) کافی ہوگا''۔

(مسلم [بتحقيق الفريابي] ص١٢٨٢، حديث٢٧٧٩؛ مسند أحمد ج٣٨ص٣٤٥، حديث ٢٣٣١٩ وج٣١ص١٨٠، ١٨١، حديث١٨٨٨٥؛ مسند البزار ج٧ص٢١٥، حديث ٢٧٨٨؛ مسند أبي يعلىٰ ج٣ص١٩٠، حديث١٦١٦؛ دلائل النبوة للبيهقي ج٥ ص٢٦٢)

سیدنا علی ﷺ کی بصیرت

سائل نے سیدنا علی ﷺ سے اُن کی آمد کے متعلق جو سوال کیا وہ کسی خاص جنگ کے متعلق نہیں بلکہ اُس کا سوال مطلقاً سیدنا علی ﷺ کی عراق آمد اور تمام جنگوں کے متعلق تھا، اور اسی کے مطابق اُسے جواب دیا گیا۔ اس سے قبل ہم واضح کر چکے ہیں کہ نام زد کر کے سیدنا علی المرتضٰی ﷺ کو مخصوص لوگوں یا مخصوص علاقوں کے بارے میں نہیں فرمایا گیا تھا بلکہ ساری جنگیں انہوں نے اپنی بصیرت سے کی تھیں۔ ہاں زبانِ نبوت سے یوں پیش گوئی ضرور صادر ہوئی تھی کہ ''ہم نے تنزیلِ قرآن پر جنگیں کیں اور علی المرتضٰی ﷺ تاویلِ قرآن پر جنگیں کریں گے'' اس لیے انہوں نے جتنی جنگیں کیں سب میں وہ حق پر تھے اور مدمقابل لوگ خطا، بغاوت اور باطل پر تھے۔

اس فرمانِ نبوی ﷺ کی مفصل ومدلل تشریح کے لیے ہماری کتاب ''شرح خصائص علي ﷺ'' میں حدیث [نمبر ۱۵۲] کی تشریح ملاحظہ فرمائیں۔

یہ قلیل فضائلِ مرتضوی ہیں، مصنفؒ

مصنف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

قلت : فهذا نزر من بحر، وقل من كثر بالنسبة إلىٰ مناقبه الجليلة، ومحاسنه الجميلة، ولو ذهبنا لاستقصاء ذلک لطال الكلام بالنسبة إلىٰ هذا المقام، و لكن نرجو من اللّٰه تعالىٰ أن يسر إفراد ذلک بكتاب نستوعب فيه ما بلغنا من ذلک، واللّٰه الموفق للصواب.

میں کہتا ہوں: یہ فضائلِ مرتضوی سمندر میں سے ایک چلو ہیں اور ان کے کثیر مناقبِ جلیلہ اور اوصافِ جمیلہ کی بہ نسبت قلیل ہیں۔ اگر ہم تمام فضائل کے احاطہ کے درپے ہوتے تو کلام اس مقام کی گنجائش سے بہت طویل ہو جاتا، لیکن ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے امیدوار ہیں کہ وہ ہمارے لیے ایسی کتاب کو جمع کرنا آسان فرمائے گا جس میں ہم فضائل کا احاطہ کریں گے، اور اللہ تعالیٰ ہی بہتر توفیق عطا فرمانے والا ہے۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے: بھلا کما حقہ اُس ہستی کے فضائل کا احاطہ کیونکر ہوسکتا ہے جو علمی، عملی، ایمانی، ایقانی اور عرفانی تمام امور میں کمال رکھتی ہو۔ خود مصنف رحمہ اللہ نے اپنی اسی کتاب کے بقیہ حصے میں تلقینِ ذکر کی بحث میں ائمہ اہل بیت کی مسلسل سند سیدنا علی علیہ السلام تک پہنچا کر لکھا ہے:

فانتهت إليه رضوان اللّٰه تعالىٰ عليه جمع الفضائل من أنواع العلوم وجميع المحاسن وكرم الشمائل من الحديث، والقرآن، والفقه، والقضاء، والتصوف، والشجاعة، والولاية، والكرم، والزهد، والورع، وحسن الخلق، والعقل والتقوى، وإصابة الرأي، فلذلک أجمعت القلوب السليمة على محبته والفطرة السليمة على سلوک طريقته، فكان حبه علامة السعادة والإيمان، وبغضه محض الشقاء والنفاق والخذلان، كما تقدم في الأحاديث الصحيحة، وظهر بالأدلة الصريحة.

”پس اُنہیں رضوان اللہ تعالیٰ علیہ پر جمیع فضائل، علوم کی اقسام، جمیع محاسن، تمام برگزیدہ خصائل، قرآن، حدیث، فقہ، قضا، تصوف، شجاعت، ولایت، کرم، زھد، ورع، حُسنِ خلق، عقل، تقویٰ اور فکر کی درستگی کی انتہا ہوتی ہے، اسی لیے تمام قلوبِ سلیمہ اُن کی محبت پر اور فطرتِ سلیمہ اُن کے

سلوکِ طریقت پر متفق ہیں، پس اُن کی محبت سعادت اور ایمان کی علامت ہے اور اُن کے ساتھ بغض شقاوت، منافقت اور رسوائی کی علامت ہے، جیسا کہ اس پر احادیثِ صحیحہ اور دلائلِ صریحہ گزر چکے ہیں"۔

(أسنى المطالب في مناقب علي بن أبي طالب ص ١٠٥، وط: ص ١٤١)

الأحاديث المسلسلة

یہاں تک مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے سیدنا علی المرتضیٰ ؓ کے فضائل ومناقب میں احادیث درج فرمائیں اور آگے اُنہیں سے چند ایسی احادیث نقل فرمائیں جن کی سند مصنف رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر سیدنا علی المرتضیٰ ؓ تک مسلسل ہے لیکن وہ احادیث مختلف موضوعات سے متعلق ہیں۔ اکثر محدثین کرام حصولِ سعادت اور تحدیثِ نعمت کے طور پر ایسی احادیث جمع فرماتے ہیں، مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی سعادت کے حصول کے لیے احادیث مسلسلہ درج فرمائیں۔ لہٰذا اگر توفیقِ ایزدی شاملِ حال رہی تو یہ احقر آئندہ ایڈیشن میں اُن احادیث کی بھی تشریح کرے گا۔ إن شاء الله تعالىٰ.

خیال رہے کہ مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے فضائلِ مرتضوی میں اب تک جو احادیث درج فرمائیں وہ بھی احادیثِ مسلسلہ ہیں، اسی لیے وہ اُن میں تصنیفی ترتیب وتدوین کا رنگ نہیں بھر سکے، واللہ اعلم۔

خاتمہ

کتاب ھذا کے ترجمہ اور شرح کی تکمیل امام مناوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "إتحاف السائل بما لفاطمة من المناقب والفضائل" المعروف "مناقب الزهراء عليها السلام" کے ترجمہ اور شرح سے پہلے ہو چکی تھی فقط نظرِ ثانی اور فہرست مضامین کا عمل باقی تھا لیکن بوجوہ سیدہ کائنات علیہا السلام کی کتاب کو اِس کتاب پر مقدم کرنا ضروری ہو گیا۔ پھر اُس کتاب مستطاب کے بعد یہ فقیر بعض دنیوی امور میں مشغول ہوا تو کتابِ ھذا پر نظرِ ثانی میں تاخیر ہوتی چلی گئی۔ اس کے بعد بعض احباب نے Laptop کا بندوبست کر کے یہ کتاب اُس میں ڈال دی تو سفر میں بھی اس پر نظرِ ثانی کا کام ہوتا رہا۔ چنانچہ ۱۳ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ کو یہ فقیر جب سفر میں حتیٰ کہ جہاز میں بھی اس کتاب پر نظرِ ثانی کر رہا تھا تو دل سے لیپ ٹاپ مہیا کرنے والے (سید مجاہد حسین کاظمی صاحب مدظلہ، ایبٹ آباد) کے حق میں دل سے دعائیں نکل رہی تھیں۔ الحمد للہ آج بروز بدھ ۲۴ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ بمطابق

6 فروری 2013 کو نظر ثانی سے فراغت حاصل ہوگئی۔

دعا

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی اور اپنے حبیب کریم ﷺ کی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرمائے۔ اس کے مصنف رحمہ اللہ، شارح، معاونین، ناشرین اور قارئین وسامعین کی بلاحساب مغفرت فرمائے اور بروز قیامت ہم سب کو شفیع المذنبین ﷺ اور اُن کی آل واصحاب رضی اللہ عنہم کی شفاعت سے بہرہ ور فرمائے۔

يَارَبِّ بِالْمُصْطَفٰى بَلِّغْ مَقَاصِدَنَا

وَاغْفِرْلَنَا مَا مَضٰى يَاوَاسِعَ الْكَرَمِ

آمین، ثم آمین! بجاه حبيبک النبي الكريم عليه وعلىٰ آله

وأصحابه أفضل الصلاة والتسليم .

سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ. وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ.

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

قاری ظہور احمد فیضی
03004881239

أطراف الحديث والآثار

مآخذ ومراجع

بترتيب حروفِ تهجّي

حديث وأثر

١ـ	الآحاد والمثاني: إمام أبو بكر أحمد بن عمرو بن أبي عاصم، متوفّىٰ ٢٨٧ﻫ، دار الراية، الرياض، الطبعة الأولىٰ ١٤١١ﻫ.
٢ـ	الآداب: إمام أبو بكر أحمد بن حسين البيهقي، متوفّىٰ ٤٥٨ﻫ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٠٦ﻫ.
٣ـ	الأباطيل والمناكير والصحاح والمشاهير: أبو عبد الله بن إبراهيم الجوزقاني، متوفّى ٥٤٣ﻫ، دار الفكر، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٦ﻫ.
٤ـ	الإتقان ما يحسن من الأخبار الواردة على الألسن: نجم الدين محمد بن محمد الغزي، متوفّىٰ ١٠٦١ﻫ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٥ﻫ.
٥ـ	إتحاف الخيرة المهرة بزوائد المسانيد العشرة: أحمد بن أبي بكر بن إسماعيل البوصيري، متوفّىٰ ٨٤٠ﻫ، دار الوطن، الرياض، الطبعة الأولى ١٤٢٠ﻫ، وط: مكتبة الرشد، الرياض، الطبعة الأولىٰ ١٤١٩ﻫ.
٦ـ	الأحاديث الطوال: إمام أبو القاسم سليمان بن أحمد الطبراني، متوفّىٰ ٣٦٠ﻫ، المكتب الإسلامي، بيروت، الطبعة الثانية ١٤١٩ﻫ.
٧ـ	الأحاديث المختارة مما ليس في الصحيحين: ضياء الدين محمد بن عبد الواحد المقدسي، متوفّىٰ ٦٤٣ﻫ، مكتبة النهضة الحديثية، مكة المكرمة، الطبعة الأولىٰ ١٤١٠ﻫ.
٨ـ	الإحسان بترتيب صحيح ابن حبان: أبو حاتم محمد بن حبان البستي، متوفّىٰ ٣٥٤ﻫ، بترتيب: علاء الدين علي بن بلبان الفارسي، متوفّىٰ ٧٣٩ﻫ، مؤسسة الرسالة، بيروت،

الطبعة الثالثة ١٤١٨هـ. وط: دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٧هـ.

٩ـ الأدب المفرد: إمام أبو عبد الله محمد بن إسمعيل البخاري، متوفّىٰ ٢٥٦هـ، مكتبة المعارف الرياض، الطبعة الأولىٰ ١٤١٩هـ.

١٠ـ الأذكار، المنتخبة من كلام سيد الأبرار ﷺ: محي الدين أبو زكريا يحي بن شرف النووي، متوفّىٰ ٦٧٦هـ، دار ابن كثير، دمشق، الطبعة السادسة ١٤١٣هـ.

١١ـ الأسرار المرفوعة في الأخبار الموضوعة: علي بن سلطان محمد المشهور بملا علي القاري، متوفّىٰ ١٠١٤هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٠٥هـ.

١٢ـ الأسماء والصفات: إمام أبو بكر أحمد بن حسين البيهقي، متوفّىٰ ٤٥٨هـ، دار الكتاب العربي، بيروت، ١٤١٥هـ.

١٣ـ الإيماء إلىٰ زوائد الأمالي والأجزاء: نبيل سعد الدين الجرار، دار أضواء السلف، الرياض، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٨هـ.

١٤ـ أجوبة ابن حجر العسقلاني ملحق بمشكاة المصابيح: حافظ أحمد بن علي بن حجر العسقلاني، متوفّىٰ ٨٥٢هـ دار الأرقم بيروت، وط: المكتب الإسلامي، بيروت، الطبعة الثانية ١٣٩٩هـ.

١٥ـ أسنى المطالب في أحاديث مختلفة المراتب: شيخ محمد درويش الحوت، متوفّىٰ ١٢٧٦هـ، دار الكتاب العربي، بيروت، الطبعة الثانية ١٤٠٣هـ.

١٦ـ أطراف الغرائب والأفراد للدارقطني: حافظ أبو الفضل محمد بن طاهر المَقْدِسي، متوفّىٰ ٥٠٧هـ، دار التدمرية، الرياض، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٨هـ.

١٧ـ إعلاء السنن: شيخ ظفر أحمد عثماني التهانوي، متوفّىٰ ١٣٩٤هـ، دار الفكر، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢١هـ.

١٨ـ أمالي المحاملي، برواية يحيىٰ بن البيِّع: قاضي أبو عبد الله الحسين بن اسماعيل الضبي المحاملي، متوفّىٰ ٣٣٠هـ، دار ابن القيم، الطبعة الأولىٰ ١٤١٢هـ.

١٩ـ البحر الزخار المعروف بمسند البزار: إمام أحمد عمرو بن عبد الخالق البزار، متوفّىٰ

٢٩٢هـ، مكتبة العلوم والحكم، المدينة المنورة، الطبعة الأولى ١٤٠٩هـ.

٢٠ـ **البدر المنير في أحاديث البشير النذير ﷺ**: إمام عبد الوهاب الشعراني، متوفى ٩٧٣هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٠هـ.

٢١ـ **بغية الباحث في زوائد مسند الحارث**: حافظ نور الدين علي بن أبي بكر الهيثمي، متوفى ٨٠٧هـ، مركز خدمة السنة والسيرة النبوية، المدينة المنورة، الطبعة الأولى ١٤١٣هـ.

٢٢ـ **تحفة الأخيار بترتيب شرح مشكل الآثار**: إمام أبو جعفر أحمد بن محمد الطحاوي، متوفى ٣٢١هـ، دار بلنسية، مكة المكرمة، الطبعة الأولى ١٤٢٠هـ.

٢٣ـ **تحفة الأشراف بمعرفة الأطراف**: جمال الدين أبو الحجاج يوسف المزي، متوفى ٧٤٢هـ، المكتب الإسلامي، بيروت، الطبعة الثانية ١٤٠٣هـ.

٢٤ـ **تخريج إحياء علوم الدين**: أبو عبد الله محمود بن محمد الحداد، دار العاصمة، الرياض، الطبعة الأولى ١٤٠٨هـ.

٢٥ـ **التذكرة في الأحاديث المشتهرة**: إمام محمد بن عبد الله الزركشي، متوفى ٧٩٤هـ، المكتب الإسلامي، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٧هـ.

٢٦ـ **تذكرة الموضوعات** علامة محمد طاهر پٹني، متوفى ٩٨٦هـ، دار إحياء التراث العربي، بيروت، الطبعة ١٤١٥هـ.

٢٧ـ **الترغيب والترهيب**: إمام زكي الدين عبد العظيم بن عبد القوي المنذري، متوفى ٦٥٦هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٧هـ.

٢٨ـ **تقريب الأسانيد وترتيب المسانيد**: إمام عبد الرحيم بن الحسين، العراقي، متوفى ٨٠٦هـ، دار النوادر، سورية، الطبعة الأولى ١٤٣٣هـ.

٢٩ـ **تقريب البغية بترتيب أحاديث الحلية**: حافظ نور الدين علي بن أبي بكر الهيثمي، متوفى ٨٠٧هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٠هـ.

٣٠ـ **تمييز الطيب من الخبيث**: عبد الرحمان بن علي الأثري المعروف بابن الديبع، دار الكتاب العربي، بيروت ١٤٢٤هـ.

۳۱۔	تنزيه الشريعة المرفوعة عن الأحاديث الشنيعة الموضوعة: أبوالحسن علي بن محمدبن عراق الكناني، متوفی۹٦٣ھ، دارالکتب العلمية، بيروت، الطبعة الثانية۱٤۰۱ھ.
۳۲۔	تهذيب الآثاروتفصيل الثابت عن رسول الله ﷺمن الأخبار: الإمام أبوجعفرمحمد بن جرير الطبري، متوفیٰ۳۱۰ھ دارالکتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى۱٤۲۹ھ، وط: مطبعةالمدني، مصر، ۱۹۸۲ء.
۳۳۔	التمهيد لما في الموطا من المعاني والمسانيد: إمام ابن عبد البر، متوفیٰ٤٦٣ھ، مكتبة فضالةزنقة، ابن زيدون، المحمدية، المغرب.۱٤۱۲ھ، وط: دارالکتب العلمية، بيروت، الطبعةالأولیٰ۱٤۱۹ھ.
۳٤۔	جامع الأحاديث الكبير: حافظ جلال الدين عبدالرحمان بن أبي بكرالسيوطي، متوفیٰ ۹۱۱ھ، دارالفكر، بيروت۱٤۱٤ھ.
۳۵۔	جامع الأصول في أحاديث الرسول: إمام مجدالدين أبي السعادات المبارك بن محمد ابن الأثيرالجزري، متوفیٰ٦۰٦ھ، دارابن كثير، دمشق، الطبعةالأولیٰ۱٤۳۲ھ.
۳٦۔	الجامع الصحيح المسند من حديث رسول الله ﷺوسننه وأيامه: (بخاري)إمام محمد بن إسمعيل البخاري، متوفیٰ ۲۵٦ھ، دارالسلام، الرياض، الطبعةالثانية۱٤۱۹ھ.
۳۷۔	الجامع في الأحاديث: حافظ عبدالله بن وهب بن مسلم القرشي أبومحمدالمصري، متوفیٰ۱۹۷ھ، دارابن الجوزي، الطبعةالأولیٰ۱٤۱٦ھ.
۳۸۔	الجامع الصغيرفي أحاديث البشيرالنذيرﷺ: جلال الدين عبدالرحمان بن أبي بكر السيوطي، متوفیٰ۹۱۱ھ، مكتبة نزارالمصطفیٰ الباز، مكةالمكرمة، الطبعةالأولى۱٤۱۸ھ.
۳۹۔	الجامع المختصرمن السنن عن رسول الله ﷺومعرفة الصحيح والمعلول وماعليه العمل (جامع ترمذي): إمام أبوعيسیٰ محمدبن عيسیٰ الترمذي، متوفیٰ۲۷۹ھ، دارالسلام الرياض، الطبعةالأولیٰ۱٤۲۰ھ.وط: مكتبةالمعارف، الرياض.
٤۰۔	جامع المسانيد: أبوالفرج عبدالرحمن بن علي الجوزي الحنبلي، متوفیٰ۵۹۷ھ، مكتبة مكتبةالرشدالرياض، الطبعةالأولیٰ۱٤۲٦ھ.

٤١ـ	جامع المسانيد والسنن: حافظ أبو الفداء إسماعيل بن كثير الشافعي، متوفّىٰ ٧٧٤هـ، مكتبة النهضة الحديثية، مكة المكرمة، الطبعة الثانية ١٤١٩هـ.
٤٢ـ	الجامع لشعب الإيمان: إمام أبو بكر أحمد بن حسين البيهقي، متوفّىٰ ٤٥٨هـ، مكتبة الرشد، الرياض، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٣هـ.
٤٣ـ	جزء فيه طرق حديث: من كذب عليّ متعمداً: إمام أبو القاسم سليمان بن أحمد الطبراني، متوفّىٰ ٣٦٠هـ، دار البشائر الإسلامية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٧هـ.
٤٤ـ	جزء فيه ما انتقاه أبو بكر بن مردويه من حديث الطبراني لأهل البصرة: أبو بكر أحمد بن موسىٰ بن مردويه، متوفّىٰ ٤٤٠هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٥هـ.
٤٥ـ	الجمع بين الصحيحين: محمد بن فتوح الحُميدي، متوفّى ٤٨٨هـ، دار ابن حزم، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٩هـ.
٤٦ـ	جمع الجوامع: جلال الدين عبد الرحمان بن أبي بكر السيوطي، متوفّىٰ ٩١١هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢١هـ. وط: مطبعة السعادة، مصر، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٦هـ.
٤٧ـ	جمع الفوائد من جامع الأصول ومجمع الزوائد: محمد بن سليمان المغربي، متوفىٰ ١٠٩٤هـ، مكتبة ابن كثير الكويت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٨هـ.
٤٨ـ	جمهرة أجزاء الحديثية: محمد زياد بن عمر تكلة، مكتبة العبيكان، الرياض، الطبعة الأولىٰ ١٤٢١هـ.
٤٩ـ	حديث السراج: أبو العباس محمد بن إسحاق الثقفي، متوفىٰ ٣١٣هـ، الفاروق الحديثية، القاهرة، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٥هـ.
٥٠ـ	الدرر المنتثرة فى الأحاديث المشتهرة: حافظ جلال الدين عبد الرحمان بن أبي بكر السيوطي، متوفّىٰ ٩١١هـ، دار الفكر، بيروت ١٤١٥هـ.
٥١ـ	ذكر الأقران ورواياتهم عن بعضهم بعضاً: أبو محمد عبد الله بن محمد، المعروف بأبى الشيخ، متوفّىٰ ٣٦٩هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٧هـ.
٥٢ـ	ذيل اللآلي المصنوعة فى الأحاديث الموضوعة: جلال الدين عبد الرحمان بن أبي بكر

السيوطي، متوفّیٰ ۹۱۱هـ مطبع علوي لمحمد علي بخش خان لكهنوي ۱۳۰۳هـ.

۵۳- رسالة طرق الحديث من كنت مولاه فعلي مولاه: شمس الدين محمد بن محمد بن عثمان الذهبي، متوفّیٰ ۷۴۸هـ، مكتبة المحقق، الطباطبائي.

۵۴- الروض البسّام بترتيب وتخريج فوائد تمّام: تمّام بن محمد الرازي، متوفّیٰ ۴۱۴هـ، مرتب: أبو سليمان جاسم بن سليمان، دار البشائر الإسلامية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ۱۴۰۸هـ.

۵۵- الزهد: عبد الله بن المبارك، متوفّیٰ ۱۸۱هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ۱۴۱۹هـ.

۵۶- الزهد: أحمد بن عمرو بن أبي عاصم الشيباني، متوفّیٰ ۲۲۸هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الثانية ۱۴۰۸هـ.

۵۷- الزهد: إمام أحمد بن حنبل الشيباني، متوفّیٰ ۲۴۱هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الثانية ۱۴۱۴هـ.

۵۸- زوائد مسند أحمد: عبد الله بن أحمد بن حنبل، متوفّیٰ ۲۹۰هـ، دار البشائر الاسلامية، بيروت، الطبعة الأولى ۱۴۱۰هـ.

۵۹- زوائد ابن ماجة: أحمد بن أبي بكر البوصيري، متوفّیٰ ۸۴۰هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ۱۴۱۴هـ.

۶۰- سلسلة الأحاديث الضعيفة والموضوعة: محمد ناصر الدين الألباني، متوفّیٰ ۱۴۲۰هـ، مكتبة المعارف الرياض، الطبعة الأولىٰ ۱۴۱۶هـ.

۶۱- السلسلة الصحيحة: محمد ناصر الدين الألباني، متوفّیٰ ۱۴۲۰هـ، مكتبة المعارف الرياض، الطبعة الأولىٰ ۱۴۲۰هـ.

۶۲- السنة: إمام أحمد بن عمرو بن أبي عاصم الشيباني، متوفّیٰ ۲۸۷هـ، المكتب الإسلامي، بيروت، الطبعة الثالثة ۱۴۱۳هـ.

۶۳- السنة: إمام عبد الله بن أحمد بن حنبل متوفّیٰ ۲۹۰هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الثانية ۱۴۱۴هـ. وط: دار ابن الجوزي، الدمام، الطبعة الأولىٰ ۱۴۳۱هـ.

۶۴- السنة: أبو بكر أحمد بن محمد بن هارون بن يزيد الخلال، متوفّیٰ ۳۱۱هـ، دار الراية،

الرياض، الطبعة الأولىٰ ١٤١٠هـ، وط: الفاروق الحديثية، القاهرة، الطبعة الثانية ١٤٣٢هـ.

٦٥ـ سنن الأصفهاني: الحافظ الإمام الجليل أبونعيم صاحب الحلية، جامع: أبوعبدالله عبد السلام بن محمد، مكتبة الرشد الرياض، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٥هـ.

٦٦ـ سنن ابن ماجة: إمام أبوعبد الله محمد بن يزيد، متوفّىٰ ٢٧٣هـ، دار المعرفة، بيروت، الطبعة الثانية ١٤١٨هـ. وط: دار الرسالة، الطبعة الأولىٰ ١٤٣٠هـ.

٦٧ـ سنن أبي داود: إمام أبوداود سليمان بن الأشعث السجستاني، متوفّىٰ ٢٧٥هـ، دار المعرفة، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٣هـ وط: مكتبة المعارف، الرياض، بتحقيق الألباني.

٦٨ـ سنن الدارمي: إمام أبوعبدالله عبدالرحمان الدارمي، متوفّىٰ ٢٥٥هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٧هـ.

٦٩ـ سنن سعيد بن منصور: إمام سعيد بن منصور خراساني مكي، متوفّىٰ ٢٢٧هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٠٥هـ.

٧٠ـ السنن والأحكام عن المصطفىٰ عليه أفضل الصلاة والسلام: ضياء الدين محمد بن عبد الواحد المقدسي الحنبلي، متوفّىٰ ٦٤٣هـ، دار ماجد العسيري، جدة، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٥هـ.

٧١ـ السنن الكبرىٰ: أحمد بن شعيب النسائي، متوفّىٰ ٣٠٣هـ، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٢١هـ، وط: دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١١هـ.

٧٢ـ السنن الكبرىٰ: إمام أبو بكر أحمد بن حسين البيهقي، متوفّىٰ ٤٥٨هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٤هـ.

٧٣ـ السنن المجتبى (سنن النسائي): إمام أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب النسائي، متوفّىٰ ٣٠٣هـ، دار المعرفة، بيروت، الطبعة الثالثة ١٤١٤هـ.

٧٤ـ الشذرة في الأحاديث المشتهرة: محمد بن طولون الصالحي، متوفّىٰ ٩٥٣هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٣هـ.

٧٥ـ شرح السنة: إمام محي السنة حسين بن مسعود البغوي، متوفّىٰ ٥١٦هـ، دار الفكر، بيروت ١٤١٤هـ، وط: المكتب الإسلامي، بيروت، الطبعة الثانية ١٤٠٣هـ.

٧٦ـ شرح مشكل الآثار: إمام أبو جعفر أحمد بن محمد الطحاوي، متوفى ٣٢١هـ، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٥هـ.

٧٧ـ شرح معاني الآثار: إمام أبو جعفر أحمد بن محمد الطحاوي، متوفى ٣٢١هـ، عالم الكتب، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٤هـ.

٧٨ـ شعب الإيمان: إمام أبو بكر أحمد بن حسين البيهقي، متوفى ٤٥٨هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٠هـ.

٧٩ـ الشريعة: أبو بكر محمد بن حسين بن عبدالله الآجري، متوفى ٣٦٠هـ، دار الكتاب العربي بيروت، الطبعة الثانية ١٤٢٠هـ.

٨٠ـ شفاء العي بترتيب مسند الإمام الشافعي: أبو عمير مجدي بن محمد مصري، مكتبة ابن تيمية، القاهرة، الطبعة الأولى ١٤١٦هـ.

٨١ـ صحيح ابن خزيمة: إمام محمد بن إسحاق بن خزيمة، متوفى ٣١١هـ، المكتب الاسلامي، بيروت، الطبعة الثالثة ١٤٢٤هـ.

٨٢ـ صحيح كتاب الفقيه والمتفقه: أبو عبدالرحمان عادل بن يوسف العزازي، دار الوطن، الرياض، الطبعة الأولى ١٤١٨هـ.

٨٣ـ الصحيح المسند من فضائل أهل بيت النبوة: أم شعيب الوادعية، دار الآثار، يمن، الطبعة الأولى ١٤٢١هـ.

٨٤ـ الطيوريات: أبو الحسين المبارك بن عبدالجبار الطيوري، متوفى ٥٠٠هـ، مكتبة أضواء السلف، الرياض، الطبعة الأولى ١٤٢٥هـ.

٨٥ـ عمل اليوم والليلة: أبو بكر أحمد بن محمد الدينوري المعروف بابن السني، متوفى ٣٦٤هـ، مؤسسة الكتب الثقافية، الصنائع، الطبعة الأولى ١٤٠٨هـ.

٨٦ـ عمل اليوم والليلة: أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب النسائي، متوفى ٣٠٣هـ، مؤسسة الرسالة، بيروت.

٨٧ـ فتح البر في ترتيب الفقهي لتمهيد ابن عبد البر: محمد بن عبد الرحمان المغراوي،

مجموعة التحف النفائس الدولية، الرياض، الطبعة الأولى ١٤١٦هـ.

٨٨ـ **فتح المنان شرح وتحقيق لسنن الدارمي:** السيد أبو عاصم نبيل بن هاشم الغمري، دار البشائر الإسلامية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٩هـ.

٨٩ـ **فردوس الأخبار:** حافظ أبو شجاع شيرويه بن شهردار ابن شيرويه الديلمي، متوفّى ٥٠٩هـ، دار الريان، القاهرة، الطبعة الأولى ١٤٠٨هـ.

٩٠ـ **الفتن:** حافظ نُعيم بن حماد الخزاعي المروزي، متوفّى ٢٢٩هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٨هـ.

٩١ـ **الفردوس بمأثور الخطاب:** حافظ أبو شجاع شيرويه بن شهردار ابن شيرويه الديلمي، متوفّى ٥٠٩هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الثانية ٢٠١٠ء.

٩٢ـ **الفوائد:** حافظ عبد الوهاب بن محمد المعروف بابن مندة العبدي، متوفّى ٤٧٥هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٣هـ.

٩٣ـ **الفوائد المجموعة في الأحاديث الموضوعة:** محمد بن علي الشوكاني، متوفّى ١٢٥٠هـ، دار الكتاب العربي، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٠٦هـ.

٩٤ـ **الفوائد المنتخبة بتخريج الخطيب البغدادي:** أبو القاسم يوسف بن أحمد الهمداني، متوفى ٤٦٨هـ، الجامعة الإسلامية بالمدينة المنورة، الطبعة الأولى ١٤٢٢هـ.

٩٥ـ **الفوائد المنتقاة والغرائب الحسان عن شيوخ الكوفيين:** الحافظ أبو علي محمد بن علي الصوري، متوفّى ٤٤١هـ، دار الكتاب العربي، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٠٧هـ.

٩٦ـ **قطف الأزهار المتناثرة في الأحاديث المتواترة:** حافظ جلال الدين عبد الرحمان بن أبي بكر السيوطي متوفّى ٩١١هـ، المكتب الإسلامي بيروت، ١٤٠٥هـ.

٩٧ـ **الكافي الشاف في تخريج أحاديث الكشاف:** حافظ أحمد بن علي بن حجر العسقلاني، متوفّى ٨٥٢هـ، دار إحياء التراث العربي، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٨هـ.

٩٨ـ **كتاب الأربعين:** أبو الفتوح محمد بن محمد بن علي الطائي الهمداني، متوفّى ٥٥٥هـ، دار البشائر الاسلامية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٠هـ.

٩٩ـ كتاب الأربعين في شيوخ الصوفية: إمام أبو سعيد أحمد بن محمد الماليني، متوفى ٤١٢هـ، دار البشائر الإسلامية، الطبعة الأولى ١٤١٧هـ.

١٠٠ـ كتاب الأسماء والصفات: إمام أبو بكر أحمد بن حسين البيهقي، متوفى ٤٥٨هـ، دار الكتاب العربي، بيروت، الطبعة الثانية ١٤١٥هـ.

١٠١ـ كتاب الأغراب: إمام أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب النسائي، متوفى ٣٠٣هـ، دار المآثر، المدينة النبوية، الطبعة الأولى ١٤٢١هـ.

١٠٢ـ كتاب الأوائل: إمام أبو بكر أحمد بن عمرو بن أبي عاصم، متوفى ٢٨٧هـ، دار البشائر الاسلامية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٥هـ.

١٠٣ـ كتاب الإيمان: حافظ أبو بكر عبدالله بن محمد بن أبي شيبة، متوفى ٢٣٥هـ، المكتب الاسلامي، بيروت، الطبعة الثانية ١٤٠٣هـ.

١٠٤ـ كتاب الإيمان: حافظ محمد بن إسحاق بن يحي بن مندة، متوفى ٣٩٥هـ دار الفضيلة، الرياض، الطبعة الرابعة ١٤٢١هـ.

١٠٥ـ كتاب التوحيد: إمام محمد بن إسحاق بن خزيمة، متوفى ٣١١هـ، مكتبة الرشد، الرياض، الطبعة السادسة ١٤١٨هـ.

١٠٦ـ كتاب الدعاء: إمام أبو القاسم سليمان بن أحمد الطبراني، متوفى ٣٦٠هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٣هـ.

١٠٧ـ كتاب الزهد: إمام أبو داود سليمان بن الأشعث السجستاني، متوفى ٢٧٥هـ، الدار السلفية، بومبائي، الهند، الطبعة الأولى ١٤١٣هـ.

١٠٨ـ كتاب الزهد: إمام وكيع بن الجراح، متوفى ١٩٧هـ، دار الصميعي، الرياض، الطبعة الثانية ١٤١٥هـ.

١٠٩ـ كتاب الضعفاء الكبير: إمام أبو جعفر محمد بن عمرو العقيلي، متوفى ٣٢٢هـ، دار الصميعي، الرياض، الطبعة الأولى ١٤٢٠هـ.

١١٠ كتاب العظمة: إمام عبد الله بن محمد جعفر المعروف بأبي الشيخ، متوفى ٣٩٦هـ، دار

	الكتب العلمية، بيروت ، الطبعة الأولىٰ ١٤١٤هـ.
١١١ـ	**كتاب الغوامض والمبهمات**: إمام أبو القاسم خلف بن عبدالمالك ابن بشكوال، متوفّىٰ ٥٧٨هـ، دار الاندلس الخضراء ،جدة،الطبعة الأولى ١٤١٥هـ.
١١٢ـ	**كتاب الفقيه والمتفقه**: أبو بكر أحمد بن علي بن ثابت الخطيب البغدادي، متوفّىٰ ٤٦٢هـ، دار ابن الجوزي،الدمام،الطبعة الأولىٰ ١٤١٧هـ.
١١٣ـ	**كتاب الفوائد،الشهير بالغيلانيات**: حافظ أبو بكر محمد بن عبدالله بن إبراهيم، الشافعي،متوفّىٰ ٣٥٤هـ،دار ابن الجوزي، مكة المكرمة،الطبعة الأولىٰ ١٤١٧هـ.
١١٤ـ	**كتاب المعجم**: أبو سعيد أحمد بن محمد بن زياد ابن الاعرابي، متوفّىٰ ٣٤٠هـ، دار ابن الجوزي،الدمام،السعودية،الطبعة الأولىٰ ١٤١٨هـ.
١١٥ـ	**كتاب المعجم**: أبو بكر أحمد بن إبراهيم بن إسماعيل الإسماعيلي، متوفّىٰ ٣٧١هـ، مكتبة العلوم والحكم،المدينة المنورة،الطبعة الأولىٰ ١٤١٠هـ.
١١٦ـ	**كتاب اليقين**: حافظ أبو بكر عبدالله بن محمد ابن أبي الدنيا،متوفّىٰ ٢٨٠هـ،دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولى ١٤٠٧هـ.
١١٧ـ	**كشف الأستار عن زوائد البزار**: حافظ نور الدين علي بن أبي بكر الهيثمي،متوفّىٰ ٨٠٧هـ،موسسة الرسالة،بيروت،الطبعة الأولىٰ ١٤٠٤هـ.
١١٨ـ	**كشف الخفاء ومزيل الألباس**: علامة إسمعيل بن محمد العجلوني متوفّىٰ ١١٦٤هـ ، دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولى ١٤١٨هـ.
١١٩ـ	**كنز العمال في سنن الأقوال والأفعال** : علامة علي متقي بن حسام الدين برهانپوري، متوفّىٰ ٩٧٥هـ، موسسة الرسالة، بيروت،الطبعة الأولىٰ ١٤٠٥هـ.
١٢٠ـ	**كنوز الحقائق من حديث خير الخلائق**: إمام عبد الرؤف بن على المناوي متوفّىٰ ١٠٠٣هـ،دار الكتب العلمية، بيروت،الطبعة الأولىٰ ١٤١٨هـ.
١٢١ـ	**اللآلي المصنوعة في الأحاديث الموضوعة**: للسيوطي،متوفّىٰ ٩١١هـ،دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولىٰ ١٤١٧هـ،و ط: مكتبة الخانجي،القاهرة،١٤١٦هـ.

١٢٢ـ اللؤلؤ المرصوع فيما لا أصل له أو بأصله موضوع: محمد بن خليل القاوُقجي الطرابلسي، متوفى ١٣٠٥هـ، دار البشائر الاسلامية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٥هـ.

١٢٣ـ مجمع البحرين في زوائد المعجمين: حافظ نور الدين علي بن أبي بكر الهيثمي، متوفى ٨٠٧هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٩هـ.

١٢٤ـ مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: نور الدين علي بن أبي بكر الهيثمي، متوفى ٨٠٧هـ، دار الفكر، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٤هـ. وط: دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الثانية ٢٠٠٩م.

١٢٥ـ مجموع فيه مصنفات: أبي جعفر ابن البختري، محمد بن عمرو ابن البختري البغدادي الرزاز، متوفى ٣٣٩هـ، دار البشائر الإسلامية، بيروت.

١٢٦ـ المحصل لمسند الإمام أحمد بن حنبل: عبد الله بن إبراهيم بن عثمان القرعاوي، دار العاصمة، الرياض، الطبعة الثانية ١٤٢٧هـ.

١٢٧ـ مختصر زوائد مسند البزار: حافظ أحمد بن علي بن حجر العسقلاني، متوفى ٨٥٢هـ، مؤسسة الكتب الثقافية، الصنائع، الطبعة الثالثة ١٤١٤هـ.

١٢٨ـ مختصر سنن أبي داود: للحافظ عبد العظيم بن عبد القوي المنذري، متوفى ٦٥٦هـ، مكتبة المعارف الرياض، الطبعة الأولى ١٤٣١هـ.

١٢٩ـ المستدرك على الصحيحين: إمام أبو عبد الله محمد بن عبد الله الحاكم نيشابوري، متوفى ٤٠٥هـ، دار المعرفة، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٨هـ. وط: دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الثانية ١٤٢٢هـ.

١٣٠ـ مسند ابن الجعد: أبو القاسم عبد الله بن محمد البغوي، متوفى ٣١٧هـ، مؤسسة النادر، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٠هـ.

١٣١ـ مسند إسحاق بن راهويه: إسحاق بن إبراهيم بن مخلد الحنظلي المروزي، متوفى ٢٣٨هـ، مكتبة الإيمان، المدينة المنورة، الطبعة الأولى ١٤١٠هـ، ودار الكتاب العربي، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٣هـ.

١٣٢ـ مسند أبي يعلى: إمام أحمد بن علي المثنى التميمي، متوفى ٣٠٧هـ، دار المأمون، دمشق،

الطبعة الأولى ١٤٣٠هـ. وط: دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٨هـ.

١٣٣ـ المسند: إمام أبو بكر عبد الله بن محمد ابن أبي شيبة، متوفى ٢٣٥هـ، دار الوطن، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٨هـ.

١٣٤ـ المسند: إمام أحمد بن حنبل الشيباني، متوفى ٢٤١هـ، عالم الكتب، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٩هـ. وط: بتحقيق أحمد شاكر، دار الحديث القاهرة، الطبعة الأولى ١٤١٦هـ، وط: بتحقيق شعيب الأرنؤوط وشركاه، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢١هـ، وط: دار المنهاج، الرياض، ١٤٢٩هـ.

١٣٥ـ مسند الإمام أبو حنيفة: متوفى ١٥٠هـ، جمعه: أبو نعيم الأصفهاني، متوفى ٤٣٠هـ، مكتبة الكوثر، الرياض، الطبعة الأولى ١٤١٥هـ.

١٣٦ـ مسند أمير المؤمنين عمر بن عبد العزيز: أبو بكر محمد بن محمد بن سليمان الباغندي، متوفى ٣١٢هـ، دار المنهاج، جدة، الطبعة الرابعة ١٤٣٠هـ.

١٣٧ـ مسند أهل البيت: إمام أحمد بن حنبل الشيباني، متوفى ٢٤١هـ، مؤسسة الكتب الثقافية، الصنائع، الطبعة الأولى ١٤٠٨هـ.

١٣٨ـ المسند: عبد الله بن الزبير الحميدي، متوفى ٢١٩هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٠٩هـ.

١٣٩ـ مسند خليفة بن خياط: أبي عمرو خليفة بن خيّاط العصفري، متوفى ٢٤٠هـ، الشركة المتحدة، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٠٥هـ.

١٤٠ـ مسند سعد بن أبي وقاص رضي الله عنه: إمام أبي عبد الله أحمد بن إبراهيم بن كثير الدورقي البغدادي، متوفى ٢٤٦هـ، دار البشائر الإسلامية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٠٧هـ.

١٤١ـ مسند الشاميين: إمام أبو القاسم سليمان بن أحمد الطبراني، متوفى ٣٦٠هـ، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٦هـ.

١٤٢ـ مسند الشهاب: إمام محمد بن سلامة بن جعفر الشافعي القضاعي، متوفى ٤٥٤هـ، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٠٥هـ.

١٤٣ـ مسند الصحابة: إمام أبو بكر محمد بن هارون الروياني، متوفى ٣٠٧هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٧هـ.

١٤٤ـ مسند عابس الغفاري: لأبي عمر أحمد بن حازم بن أبي غرزة الغفاري، متوفى ٢٧٦هـ، دار الوطن، الرياض، الطبعة الأولى ١٤١٩هـ.

١٤٥ـ المسند: إمام سليمان بن داود بن جارود الطيالسي متوفى ٢٠٣هـ، دار المعرفة، بيروت، وط: دار الكتب العلمية، الطبعة الأولى ١٤٢٥هـ، وط: دار هجر، الطبعة الأولى ١٤١٩هـ.

١٤٦ـ المسند الجامع: دكتور بشار عواد معروف وشركاه، دار الجيل، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٣هـ.

١٤٧ـ مشكاة المصابيح: إمام عبد الله محمد بن عبد الله الخطيب التبريزي، متوفى ٧٤١هـ، دار الأرقم، بيروت. وط: المكتب الإسلامي، بيروت، الطبعة الثانية ١٣٩٩هـ.

١٤٨ـ مصابيح السنة: محي الدين حسين بن مسعود الفراء البغوي، متوفى ٥١٦هـ، دار المعرفة، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٠٧هـ.

١٤٩ـ مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه: أحمد بن أبي بكر البوصيري، متوفى ٨٤٠هـ، الجامعة الإسلامية، المدينة المنورة، الطبعة الأولى ١٤٢٥هـ.

١٥٠ـ المصنَّف: إمام عبد الرزاق بن همام الصنعاني، متوفى ٢١١هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢١هـ، وط: المجلس العلمي، جنوب إفريقة، الطبعة الأولى ١٣٩٠هـ.

١٥١ـ المصنَّف: أبو بكر عبد الله بن محمد بن أبي شيبة، متوفى ٢٣٥هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٦هـ، وط: دار قرطبة، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٧هـ، وط: الفاروق الحديثية، القاهرة، الطبعة الأولى ١٤٢٩هـ، وط: مكتبة الرشد، الرياض، الطبعة الأولى ١٤٢٥هـ.

١٥٢ـ المصنوع في معرفة الحديث الموضوع: علي بن سلطان محمد المعروف بملا علي القاري، متوفى ١٠١٤هـ، دار البشائر الإسلامية، بيروت، الطبعة الخامسة ١٤١٤هـ.

١٥٣ـ المطالب العالية بزوائد المسانيد الثمانية: حافظ أحمد بن علي بن حجر العسقلاني، متوفى ٨٥٢هـ، دار الباز، عباس أحمد الباز، مكة المكرمة، الطبعة الأولى ١٤٠٧هـ، وط: دار

العاصمة، الرياض، الطبعة الأولى ١٤١٩هـ.

١٥٤ـ **المعجم**: أبو بكر محمد بن إبراهيم الأصبهاني المعروف بابن المقرئ، متوفى ٣٨١هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٤هـ.

١٥٥ـ **المعجم الأوسط**: إمام أبو القاسم سليمان بن أحمد الطبراني، متوفى ٣٦٠هـ، مكتبة المعارف، الرياض، ١٤٠٥هـ.

١٥٦ـ **المعجم الصغير (الروض الداني)**: إمام أبو القاسم سليمان بن أحمد الطبراني، متوفى ٣٦٠هـ، مكتب الإسلامي، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٠٥هـ.

١٥٧ـ **المعجم الكبير**: أبو القاسم سليمان بن أحمد الطبراني، متوفى ٣٦٠هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٨هـ، وط: مكتبة ابن تيمية، القاهرة.

١٥٨ـ **معرفة السنن والآثار**: إمام أبو بكر أحمد بن الحسين البيهقي، متوفى ٤٥٨هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، وط: دار الوعي، القاهرة، الطبعة الأولى ١٤١٢هـ.

١٥٩ـ **المغني عن حمل الأسفار في الأسفار في تخريج ما في الإحياء من الأخبار**: (على هامش الإحياء) زين الدين أبي الفضل عبد الرحيم بن الحسين العراقي، متوفى ٨٠٦هـ، دار الكتب العلمية، بيروت الطبعة الأولى ١٤١٩هـ.

١٦٠ـ **المقاصد الحسنة في بيان كثير من الاحاديث المشتهرة**: شمس الدين محمد بن عبد الرحمن السخاوي، متوفى ٩٠٢هـ دار الكتاب العربي، بيروت، الطبعة الثالثة ١٤١٧هـ.

١٦١ـ **المقصد العلي في زوائد مسند أبي يعلى الموصلي**: حافظ نور الدين علي بن أبي بكر الهيثمي، متوفى ٨٠٧هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٩هـ.

١٦٢ـ **المنتقى**: إمام عبد الله بن علي بن جارود نيشابوري، متوفى ٣٠٧هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٧هـ.

١٦٣ـ **المنتخب من مسند عبد بن حُميد**: حافظ أبو محمد عبد بن حُمَيْد، متوفى ٢٤٩هـ، دار بلنسية، الرياض، الطبعة الثانية ١٤٢٣هـ.

١٦٤ـ **موارد الظمآن إلى زوائد ابن حبان**: حافظ نور الدين علي بن أبي بكر الهيثمي، متوفى

٨٠٧هـ مؤسسة الرسالة، بيروت.

١٦٥ـ موافقة الخُبْر الخَبَر في تخريج أحاديث المختصر: حافظ أحمد بن علي بن حجر العسقلاني، متوفى ٨٥٢هـ، مكتبة الرشد، الرياض، الطبعة الثالثة ١٤١٩هـ.

١٦٦ـ موسوعة الحافظ ابن حجر العسقلاني الحديثية: جمع وإعداد: وليد بن أحمد الزبيري وشركاءه، سلسلة إصدارات الحكمة، برطانية، ومدينة المنورة، الطبعة الأولى ١٤٢٢هـ.

١٦٧ـ موسوعة الإمام ابن أبي الدنيا: حافظ الإمام أبي بكر عبدالله بن محمد القرشي، متوفى ٢٨١هـ، دار التوفيقية للتراث القاهرة.

١٦٨ـ المؤطا: إمام مالك بن أنس، متوفى ١٧١هـ، دار المعرفة بيروت، الطبعة الثانية ١٤٢٠هـ.

١٦٩ـ موطا الإمام مالك، رواية محمد بن الحسن الشيباني: [مؤطا محمد] متوفى ١٨٩هـ، دار القلم، دمشق، الطبعة الأولى ١٤١٣هـ.

١٧٠ـ المهذب في اختصار السنن الكبير للبيهقي: شمس الدين محمد بن عثمان الذهبي، متوفى ٧٤٨هـ، دار الوطن، الرياض، الطبعة الأولى ١٤٢٢هـ.

١٧١ـ نصب الراية في تخريج أحاديث الهداية: حافظ جمال الدين عبد الله بن يوسف الزيلعي، متوفى ٧٦٢هـ، دار الكتب العلمية، الطبعة الأولى ١٤١٦هـ.

١٧٢ـ نوادر الأصول في أحاديث الرسول: أبو عبدالله محمد الحكيم الترمذي، متوفى ٣٢٠هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٣هـ.

١٧٣ـ نهج البلاغة: سيدنا علي عليه السلام، متوفى ٤٠هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٨هـ، وط: دار الكتاب المصري، القاهرة، الطبعة الرابعة ١٤٢٥هـ.

تفسير

١٧٤ـ الاكليل في استنباط التنزيل: حافظ جلال الدين عبدالرحمان بن أبي بكر السيوطي، متوفى ٩١١هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٨هـ.

١٧٥ـ أحكام القرآن: أبو بكر بن عبد الله المعروف بابن العربي، متوفى ٥٤٣هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة ١٤١٦هـ.

١٧٦- إرشاد العقل السليم إلى مزايا الكتاب الكريم (تفسير أبو السعود): أبو السعود محمد العمادي الحنفي، متوفى ٩٨٢ هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٩ هـ.

١٧٧- أسباب نزول القرآن: أبو الحسن علي بن أحمد الواحدي، متوفى ٤٦٨ هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١١ هـ.

١٧٨- أضواء البيان في إيضاح القرآن: علامة محمد أمين بن محمد مختار جكني شنقيطي، دار إحياء التراث العربي بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٧ هـ.

١٧٩- إعراب القرآن: إمام أبو جعفر أحمد بن محمد بن إسماعيل النحاس، متوفى ٣٣٨ هـ، عالم الكتب، بيروت، الطبعة الثانية ١٤٠٥ هـ.

١٨٠- أنوار التنزيل وأسرار التأويل: قاضي عبد الخير عبد الله بن عمر البيضاوي شيرازي، متوفى ٦٨٥ هـ، دار الفكر، بيروت، الطبعة ١٤١٦ هـ.

١٨١- أنوار القرآن وأسرار الفرقان الجامع بين أقوال علماء الأعيان وأحوال الأولياء ذوي العرفان: نور الدين علي بن سلطان الهروي المكي الحنفي الشهير بملا علي القاري، متوفى ١٠١٤ هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٣٤ هـ.

١٨٢- بحر العلوم (تفسير سمرقندي): إمام أبو الليث نصر بن محمد السمر قندي، متوفى ٣٧٥ هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٣ هـ.

١٨٣- البحر المحيط: علامة أبو الحيان بن محمد بن يوسف الأندلسي، متوفى ٧٥٤ هـ، دار الفكر، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٢ هـ.

١٨٤- بصائر ذوي التمييز في لطائف الكتاب العزيز: إمام مجد الدين محمد بن يعقوب الفيروزآبادي، متوفى ٨١٧ هـ، المكتبة العلمية، بيروت.

١٨٥- تأويلات أهل السنة (تفسير ماتريدي): أبي منصور محمد بن محمود الماتريدي السمرقندي الحنفي، متوفى ٣٣٣ هـ، مؤسسة الرسالة الطبعة الأولى ١٤٢٥ هـ.

١٨٦- التأويلات النجمية: إمام أحمد بن عمر نجم الدين الكبرى، متوفى ٦١٨ هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ٢٠٠٩ م.

۱۸۷۔	تبیان القرآن: علامة غلام رسول سعیدی، متوفیٰ ۱٤۳۷ھ، فرید بك سٹال، لاهور.
۱۸۸۔	التحریر والتنویر: شیخ محمد طاهر ابن عاشور، الدار التونسیة، تونس ۱۹۸٤ء
۱۸۹۔	التسهیل لعلوم التنزیل: أبو القاسم محمد بن أحمد بن جزی الکلبي، متوفیٰ ۷٤۱ھ، دار الکتب العلمیة، بیروت، الطبعة الأولی ۱٤۱٥ھ.
۱۹۰۔	تفسیر التُستري: أبو محمد سهل بن عبدالله التستري، متوفیٰ ۲۸۳، دار الکتب العلمیة، بیروت، الطبعة الأولی ۱٤۲۳ھ.
۱۹۱۔	تفسیر عبدالرزاق: إمام عبد الرزاق بن همام الصنعاني، متوفیٰ ۲۱۱ھ، دار الکتب العلمیة، بیروت، الطبعة الأولیٰ ۱٤۱۹ھ.
۱۹۲۔	تفسیر عثماني: مولانا شبیر أحمد العثماني، متوفیٰ ۱۳٦۹ھ، مجمع الملك فهد للطباعة المصحف الشریف، مدینة منورة، سنة الطبع ۱٤۰۹ھ.
۱۹۳۔	تفسیر القرآن العزیز: إمام عبد الرحمن بن محمد إدریس بن أبي حاتم الرازي، متوفیٰ ۳۲۷ھ، مکتبة نزار مصطفی الباز، مکة المکرمة، الطبعة الثانیة ۱٤۱۹ھ.
۱۹٤۔	تفسیر القرآن العظیم: اسماعیل بن عمر بن کثیر الشافعی، متوفیٰ ۷۷٤ھ، دار المعرفة، بیروت، سنة الطبع ۱٤۰٦ھ. وط: الفاروق الحدیثیة، القاهرة، الطبعة الأولیٰ ۱٤۲۱ھ.
۱۹٥۔	التفسیر الکبیر: مجاهد بن جبر القرشي المخزومي، متوفیٰ ۱۰٤ھ، دار الکتب العلمیة، بیروت، الطبعة الأولی ۱٤۲٦ھ.
۱۹٦۔	التفسیر المظهري: قاضي ثناء الله پاني پتي، متوفیٰ ۱۲۲٥ھ، دار إحیاء التراث العربي، بیروت، الطبعة الأولی ۱٤۲٥ھ.
۱۹۷۔	التفسیر المنیر: دکتور وهبة الزحیلي، (معاصر) دار الفکر، دمشق، الطبعة الأولیٰ ۱٤۱۲ھ.
۱۹۸۔	جامع البیان عن تأویل آي القرآن (تفسیر طبري): إمام أبو جعفر محمد بن جریر الطبري، متوفیٰ ۳۱۰ھ، دار الفکر، بیروت الطبعة ۱٤۱٥ھ. وط: مرکز البحوث والدراسات العربیة والإسلامیة، بدار هجر، القاهرة، الطبعة الأولیٰ ۱٤۲۲ھ.
۱۹۹۔	جامع البیان في تفسیر القرآن: محمد بن عبدالرحمان الإیجي، متوفیٰ ۹۰٥ھ، دار الکتب

العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٤هـ.

٢٠٠ـ الجامع لأحكام القرآن: أبو عبد الله محمد بن أحمد المالكي القرطبي، متوفىٰ ٦٦٨هـ، دار الكتاب العربي، بيروت، الطبعة الثانية ١٤٢٠هـ.

٢٠١ـ الجواهر الحسان في تفسير القرآن: عبد الرحمن محمد بن مخلوف الثعالبي الشافعي، متوفىٰ ٨٧٥هـ، دار إحياء التراث العربي، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٨هـ.

٢٠٢ـ حاشية الصاوي علي تفسير الجلالين: أحمد بن محمد الصاوي، متوفىٰ ١٢٤١هـ، دار الفكر، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٩هـ.

٢٠٣ـ حاشية القونوي علىٰ تفسير البيضاوي: عصام الدين إسماعيل بن محمد الحنفي، متوفىٰ ١١٩٥هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٢هـ.

٢٠٤ حاشية محي الدين شيخ زاده علىٰ تفسير البيضاوي: محمد بن مصلح الدين مصطفىٰ القوجوي الحنفي، متوفىٰ ٩٥١هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٩هـ.

٢٠٥ـ حدائق الروح والريحان في روابي علوم القرآن: محمد أمين بن عبد الله الأرمي، دار طوق النجاة، ١٤٢١هـ.

٢٠٦ـ الدر المنثور في التفسير بالمأثور: جلال الدين عبد الرحمان بن أبي بكر السيوطي، متوفىٰ ٩١١هـ، دار الفكر، بيروت، الطبعة ١٤١٤هـ. وط: مركز هجر للبحوث والدراسات العربية والإسلامية، القاهرة، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٤هـ.

٢٠٧ـ رموز الكنوز في تفسير الكتاب العزيز: حافظ عز الدين عبد الرزاق بن رزق الله الرسعني الحنبلي، متوفىٰ ٦٦١هـ، مكتبة الأسدي مكة المكرمة، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٩هـ.

٢٠٨ـ روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني: أبو الفضل سيد محمود آلوسي الحنفي البغدادي، متوفىٰ ١٢٧٠هـ، دار الفكر، بيروت، الطبعة ١٤١٤هـ، وط: مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٣١هـ.

٢٠٩ـ زاد المسير في علم التفسير: أبو الفرج عبد الرحمن بن علي بن محمد الجوزي الحنبلي، متوفىٰ ٥٩٧هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٤هـ.

٢١٠ـ	السراج المنير: محمد بن أحمد الخطيب الشربيني، متوفّیٰ ٩٧٧هـ، دار إحياء التراث العربي، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٥هـ.
٢١١ـ	الصحيح المسبور من التفسير بالمأثور: دكتور حكمت بن بشير، دار المآثر، المدينة النبوية، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٠هـ.
٢١٢ـ	صفوة التفاسير: شيخ محمد علي الصابوني، دار إحياء التراث العربي، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٩هـ.
٢١٣ـ	ضياء القرآن: جسٹس پیر محمد کرم شاه الأزهري، متوفّیٰ ١٤١٨هـ، ضياء القرآن، پبلی کیشنز، لاهور.
٢١٤ـ	عمدة الحفاظ في تفسير أشرف الألفاظ: أحمد بن يوسف المعروف بالسمين الحلبي متوفّیٰ ٧٥٦هـ، عالم الكتب، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٤هـ.
٢١٥ـ	عناية القاضي وكفاية الراضي: علامة أحمد شهاب الدين الخفاجي المصري، الحنفي متوفّیٰ ١٠٦٩هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٧هـ.
٢١٦ـ	العجاب في بيان الأسباب: حافظ أحمد بن علي بن حجر العسقلاني، متوفّیٰ ٨٥٢هـ، دار ابن الجوزي، الدمام، الطبعة الأولىٰ ١٤١٨هـ.
٢١٧ـ	غرائب القرآن ورغائب الفرقان (تفسير نيشاپوري): علامة نظام الدين بن محمد القُمي، متوفّیٰ ٧٢٨هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٥هـ.
٢١٨ـ	فتح البيان في مقاصد القرآن: نواب صديق حسن خان بهوپالي، متوفّیٰ ١٣٠٧هـ، المكتبة العصرية، بيروت، الطبعة ١٤١٢ هـ.
٢١٩ـ	فتح القدير: قاضي محمد بن علي الشوكاني، متوفّیٰ ١٢٥٠، دار ابن كثير، دمشق، الطبعة الأولىٰ ١٤١٤هـ.
٢٢٠ـ	الفتوحات الإلٰهية بتوضيح تفسير الجلالين للدقائق الخفية (تفسير جمل): سليمان بن عمير العجيلي الشهير بالجمل متوفّیٰ ١٢٠٤هـ دار الكتب العلمية، بيروت ١٤١٦هـ.
٢٢١ـ	كتاب تفسير القرآن: أبو بكر محمد بن إبراهيم بن المنذر، متوفّیٰ ٣١٨هـ، دار المآثر،

المدينة النبوية، الطبعة الأولى ١٤٢٣هـ.

٢٢٢- الكشاف عن حقائق التأويل: علامة محمود بن عمر الزمخشري، متوفّى ٥٣٨هـ، دار إحياء التراث العربي، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٧هـ.

٢٢٣- الكشف والبيان (تفسير الثعلبي) أبو إسحاق أحمد الثعلبي، متوفّى ٤٢٧هـ، دار إحياء التراث العربي، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٢هـ.

٢٢٤- لباب التأويل في معاني التنزيل: علي بن محمد البغدادي الشهير بالخازن، متوفّى ٧٥٢هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٥هـ.

٢٢٥- اللباب في علوم الكتاب: أبو حفص عمر بن علي ابن عادل الحنبلي، متوفّى ٨٨٠هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٩هـ.

٢٢٦- لباب النقول في أسباب النزول: جلال الدين عبد الرحمان بن أبي بكر السيوطي، متوفّى ٩١١هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، وط: دار الرسالة العالمية، بيروت، ١٤٣١هـ.

٢٢٧- لطائف الإشارات (التفسير القشيري): إمام أبو القاسم عبد الكريم بن هوازن القشيري، متوفّى ٤٦٥هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٠هـ.

٢٢٨- مجالسٌ في تفسير قوله تعالى "لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ الخ: محمد بن أبي بكر عبد الله القيسي المعروف بابن ناصر الدين الدمشقي، متوفّى ٨٤٢هـ، مؤسسة الريان، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢١هـ.

٢٢٩- محاسن التأويل (التفسير القاسمي): علامة محمد جمال الدين القاسمي، متوفّى ١٣٣٢هـ، دار احياء التراث العربي بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٥هـ.

٢٣٠- المحرر الوجيز في تفسير الكتاب العزيز: قاضي عبد الحق بن غالب بن عطية الأندلسي متوفّى ٥٤٦هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٣هـ.

٢٣١- مدارك التنزيل وحقائق التأويل: أبو البركات أحمد بن محمد النسفي، متوفّى ٧١٠هـ، دار القلم بيروت، الطبعة الأولى ١٤٠٨هـ.

٢٣٢- معالم التنزيل في التفسير والتأويل: أبو محمد الحسين بن مسعود الفراء البغوي، متوفّى

٥١٦هـ، دار المعرفة، بيروت، الطبعة الثالثة ١٤١٣هـ. وط: دار طيبة، الرياض، الطبعة الأولى ١٤٠٩هـ.

٢٣٣- معاني القرآن وإعرابه: إمام أبو إسحق إبراهيم بن محمد الزجاج، متوفى ٣١١هـ، عالم الكتب، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٠٥هـ.

٢٣٤- مفاتيح الغيب (التفسير الكبير): فخر الدين محمد بن عمر التميمي البكرى، الرازي، متوفى ٦٠٤هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١١هـ.

٢٣٥- نظم الدرر في تناسب الآيات والسور: أبو الحسن إبراهيم بن عمر البقاعي، متوفى ٨٨٥هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٥هـ.

٢٣٦- النكت والعيون (تفسير ماوردي): أبو الحسن علي بن محمد بن حبيب الماوردي، متوفى ٤٥٠هـ، مؤسسة الكتب الثقافية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٢هـ.

٢٣٧- الوسيط في تفسير القرآن المجيد: أبو الحسن علي بن أحمد الواحدي النيشابوري، متوفى ٤٦٨هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٥هـ.

عُلُوم قرآن

٢٣٨- الإتقان في علوم القرآن: جلال الدين عبد الرحمان بن أبي بكر السيوطي، متوفى ٩١١هـ، دار الكتاب العربي، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٩هـ، وط: مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٩هـ.

٢٣٩- البرهان في علوم القرآن: إمام بدر الدين محمد بن عبد الله الزركشي، متوفى ٧٩٤هـ، دار المعرفة، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٩هـ.

٢٤٠- التفسير والمفسرون: دكتور محمد حسين الذهبي، دار إحياء التراث العربي، بيروت، الطبعة الثانية ١٩٩٦ء.

٢٤١- كتاب المصاحف: أبو بكر عبد الله بن أبي داود السجستاني، متوفى ٣١٦هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٠٥هـ.

شُرُوْحِ حدِيْث

٢٤٢ـ الإستذكار فيما تضمنه الموطامن معاني الرأي والآثار: أبوعمريوسف بن عبدالبر، متوفى٤٦٣هـ،دارقتيبة،دمشق،الطبعةالأولىٰ١٤١٤هـ.وط:دارالكتب العلمية، بيروت، الطبعةالثالثة٢٠١٠م.

٢٤٣ـ إرشاد الساري لشرح صحيح البخاري: أحمدبن أبي بكرالخطيب القسطلاني،متوفىٰ ٩٤٢هـ،دارالكتب العلمية، بيروت،الطبعة الأولىٰ١٤١٦هـ.

٢٤٤ـ أعلام الحديث في شرح صحيح البخاري: أبوسليمان حمدبن محمدالخطابي،متوفىٰ ٣٨٨هـ،مركزإحياء التراث الإسلامي،مكةالمكرمة،الطبعةالأولىٰ١٤٠٩هـ.

٢٤٥ـ إكمالُ إكمالِ المُعْلِم: أبوعبد اللّٰه محمدبن خليفة الوشتاني أبي المالكي،متوفىٰ ٨٢٨هـ،دارالكتب العلمية،بيروت الطبعة الأولىٰ ١٤١٩هـ.

٢٤٦ـ إكمال المعلم بفوائد مسلم :قاضي عياض بن موسىٰ مالكي الأندلسي،متوفىٰ٥٤٤هـ، دارالوفا،المنصورة،الطبعة الأولىٰ ١٤١٩هـ.

٢٤٧ـ إنجاح الحاجة شرح سنن ابن ماجه: شيخ عبدالغني المجددي،الدهلوي،بيت الأفكارالدولية،الأردن،الطبعةالأولىٰ بدون تاريخ.

٢٤٨ الأجوبة المرضية من الأحاديث النبوية: حافظ شمس الدين محمدبن عبدالرحمن السخاوي،متوفىٰ٩٠٢هـ،دارالراية،الرياض،الطبعةالأولى١٤١٨هـ.

٢٤٩ـ بحرالفوائد المشهور بمعاني الأخبار: حافظ أبوبكرمحمدبن إبراهيم الكلاباذي، متوفىٰ٣٨٠هـ،دارالسلام،القاهرة،الطبعةالأولىٰ١٤٢٩هـ.

٢٥٠ـ البيان والتعريف في أسباب وُرود الحديث الشريف: إبراهيم بن محمدالشهيربابن حمزةالحسيني،متوفىٰ١١٢٠هـ،دارالمعرفة،بيروت،الطبعةالأولىٰ١٤٢٤هـ.

٢٥١ـ تأويل مختلف الحديث: عبداللّٰه بن مسلم بن قتيبة الدينوري،متوفىٰ٢٧٦هـ،دارالفكر بيروت،الطبعةالأولىٰ١٤١٥هـ.

٢٥٢ـ تحفة الأحوذي بشرح الجامع الترمذي : شيخ عبد الرحمن مبار كفوري، متوفىٰ

١٣٢٥هـ،دار إحياء التراث العربي،بيروت،الطبعة الأولىٰ١٤١٩هـ.

٢٥٣ـ تحفة الأخيار بإحياء سنة سيد الأبرار: أبو الحسنات محمد عبد الحي اللكنوي الهندي، متوفىٰ١٣٠٤هـ،دار القلم ،دمشق،الطبعة الأولىٰ١٤١٢هـ.

٢٥٤ـ تحقيق الكواكب الدراري شرح البخاري: محمد بن يوسف الكرماني،متوفىٰ٧٨٢هـ، دار إحياء التراث الإسلامي،بيروت،الطبعة الثانية١٤٠١هـ.

٢٥٥ـ التعليق الصبيح على مشكاة المصابيح: علامة محمد إدريس الكاندهلوي،متوفىٰ ١٣٩٤هـ،دار إحياء التراث العربي،بيروت،الطبعة الأولى١٤٢٥هـ.

٢٥٦ـ تلخيص الحبير في تخريج أحاديث الرافعي الكبير: حافظ أحمد بن علي بن حجر العسقلاني،متوفىٰ٨٥٢هـ،دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولى١٤١٩هـ، وط: مؤسسة قرطبة،الطبعة الأولىٰ١٤١٦هـ.

٢٥٧ـ التوشيح شرح الجامع الصحيح: جلال الدين عبد الرحمٰن بن أبي بكر السيوطي، متوفىٰ ٩١١،مكتبة الرشد،الرياض،الطبعة الأولىٰ١٤١٩هـ.

٢٥٨ـ التوضيح لشرح الجامع الصحيح: أبو حفص عمر بن علي المعروف بابن الملقن، ٨٠٤هـ،دار الفلاح،مصر،الطبعة الأولىٰ١٤٢٩هـ.

٢٥٩ـ تيسير الباري شرح صحيح البخاري: علامة وحيد الزمان،متوفىٰ ١٣٢٨هـ،تاج كمپني پاكستان.

٢٦٠ـ جامع العلوم والحكم في شرح خمسين حديثاً من جوامع الكلم: حافظ عبد الرحمان ابن رجب الحنبلي،متوفىٰ٧٩٥هـ،مؤسسة الرسالة،بيروت الطبعة الرابعة ١٤١٣هـ.

٢٦١ـ الجواهر البهية في شرح الأربعين النووية: محمد بن علي بن سالم الشبشيري،متوفىٰ ٩٨٩هـ،مكتبة نزار مصطفىٰ الباز،مكة المكرمة.

٢٦٢ـ حاشية السندي على النسائي: أبو الحسن محمد بن عبد الهادي السندي، التتوي، المدني،متوفىٰ١١٣٨هـ،دار المعرفة،بيروت،الطبعة الثالثة١٤١٤هـ.

٢٦٣ـ حاشية مسند الإمام أحمد بن حنبل: أبو الحسن محمد بن عبد الهادي السندي، التتوي

	المدني، متوفى ١١٣٨هـ، وزارة الأوقاف والشؤون الإسلامية، قطر، الطبعة الأولى ١٤٢٨هـ.
٢٦٤ـ	الديباج على صحيح مسلم بن الحجاج: جلال الدين عبدالرحمن بن أبي بكر السيوطي، متوفى ٩١١، دار ابن عفان، الخبر، السعودية، الطبعة الأولى ١٤١٦هـ.
٢٦٥ـ	ذخيرة العقبى في شرح المجتبى [نسائي]: علامة علي بن آدم بن موسى، دار المعراج الدولية، الرياض، الطبعة الأولى ١٤١٦هـ.
٢٦٦ـ	زهر الربى على المجتبى (شرح سنن النسائي): جلال الدين عبدالرحمن بن أبي بكر السيوطي، متوفى ٩١١، دار المعرفة، بيروت، الطبعة الثالثة ١٤١٤هـ
٢٦٧ـ	شرح صحيح البخاري لابن بطال: أبو الحسن علي بن خلف القرطبي، متوفى ٤٤٩هـ، مكتبة الرشد، الرياض، ١٤٢٠هـ.
٢٦٨ـ	شرح نهج البلاغة: أبو حامد عزالدين بن هبة الله بن محمد ابن أبي الحديد المدائني، متوفى ٦٥٥هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الثالثة ٢٠٠٩م.
٢٦٩ـ	ظلال الجنة في تخريج السنة: محمد ناصر الدين الألباني، متوفى ١٤٢٠هـ، المكتب الإسلامي، الطبعة الثالثة ١٤١٣هـ.
٢٧٠ـ	عارضة الأحوذي بشرح صحيح الترمذي: أبو بكر محمد بن عبد الله ابن العربي، متوفى ٥٤٣هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٨هـ.
٢٧١ـ	عمدة القاري شرح صحيح البخاري: حافظ بدر الدين محمود بن أحمد العيني الحنفي، متوفى ٨٥٥هـ، إدارة الطباعة المنيرية، مصر، الطبعة الأولى ١٣٤٨هـ، وط: دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢١هـ.
٢٧٢ـ	عون الباري لحل أدلة صحيح البخاري: أبو الطيب صديق بن حسن الحسيني القنوجي البخاري، متوفى ١٣٠٧هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٩هـ.
٢٧٣ـ	عون المعبود شرح سنن أبي داود: شمس الحق عظيم آبادي متوفى ١٣٢٩هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٠هـ.
٢٧٤ـ	غوث المكدود بتخريج منتقى ابن الجارود: أبو إسحاق الحويني الأثري، دار الكتاب

العربي، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٠٨هـ.

٢٧٥- **فتح الباري شرح صحيح البخاري**: حافظ أحمد بن علي بن حجر العسقلاني، متوفىٰ ٨٥٢هـ، دار الفكر، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٦هـ، وط: دار الحديث، القاهرة، سنة الطبع ١٤٢٤هـ، وط: دار طيبة، الرياض، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٦هـ.

٢٧٦- **فتح الملك العلي بصحة حديث بابُ مدينة العلم علي**: أحمد بن محمد الصديق الغماري، مكتبة القاهرة.

٢٧٧- **فتح الملهم بشرح صحيح الإمام مسلم، مع تكملة**: شبير أحمد عثماني، متوفىٰ ١٣٦٩هـ، دار الضياء، الكويت، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٦هـ.

٢٧٨- **الفجر الساطع على الصحيح الجامع**: محمد الفضيل بن الفاطمي المغربي، متوفىٰ ١٣١٨هـ، مكتبة الرشد، الرياض، سنة الطبع ١٤٣٠هـ.

٢٧٩- **فيض الباري شرح صحيح البخاري**: شيخ محمد أنور شاه الكشميري، متوفىٰ ١٣٥٢هـ، دار إحياء التراث العربي، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٦هـ.

٢٨٠- **فيض القدير شرح الجامع الصغير**: محمد عبد الروف المناوي الشافعي، متوفىٰ ١٠٢١هـ، دار المعرفة، بيروت، الطبعة الثانية ١٣٩١هـ، وط: مكتبة نزار مصطفىٰ الباز، مكة المكرمة الطبعة الأولىٰ ١٤١٨هـ.

٢٨١- **قطر الولي على حديث الولي**: محمد بن علي بن محمد بن عبد الله الشوكاني الصنعاني، متوفىٰ ١٢٥٠هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٣٢٢هـ.

٢٨٢- **قوت المغتذي على جامع الترمذي**: عبد الرحمان بن أبي بكر السيوطي، متوفىٰ ٩١١هـ، دار النوادر، سورية، الطبعة الأولىٰ ١٤٣٣هـ.

٢٨٣- **القول المسدد في الذبّ عن المسند للإمام أحمد**: حافظ أحمد بن علي بن حجر العسقلاني، متوفىٰ ٨٥٢هـ، عالم الكتب، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٠٤هـ.

٢٨٤- **الكاشف عن حقائق السنن (شرح الطيبي على المشكوة)**: حسين بن محمد الطيبي متوفىٰ ٧٤٣هـ، مكتبة نزار مصطفىٰ الباز، مكة المكرمة، الطبعة الأولىٰ ١٤١٧هـ.

٢٨٥ـ كفاية الحاجة في شرح سنن ابن ماجه: أبو الحسن محمد بن عبد الهادي السندي التتوي، متوفى ١١٣٨ هـ، دار المعرفة، بيروت، الطبعة الثانية ١٤١٨ هـ.

٢٨٦ـ الكوكب الدري على جامع الترمذي: علامة رشيد أحمد گنگوهي، متوفى ١٣٢٣ هـ، مطبعة ندوة العلماء لكهنو، الهند ١٣٩٥ هـ.

٢٨٧ـ الكوكب الوهاج والروض البهاج في شرح صحيح مسلم بن الحجاج: محمد أمين بن عبد الله الأرمي، دار المنهاج، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٣٠ هـ.

٢٨٨ـ لامع الدراري على جامع البخاري: مولانا محمد زكريا سهارنپوري، متوفى ١٤٠٢ هـ مكتبة ايچ ايم سعيد كمپنی، كراچي.

٢٨٩ـ مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح: علي بن سلطان محمد المعروف بملا علي القاري، متوفى ١٠١٤ هـ، المكتبة التجارية، مكة المكرمة.

٢٩٠ـ معالم السنن شرح سنن أبي داود: أبو سليمان حمد بن محمد الخطابي، متوفى ٣٨٨ هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١١ هـ.

٢٩١ـ المفهم لما أشكل من تلخيص كتاب مسلم: إمام أبو العباس أحمد بن عمر القرطبي المالكي، متوفى ٦٥٦ هـ، دار ابن كثير، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٧ هـ.

٢٩٢ـ مكمل إكمال الأكمال: علامة محمد بن محمد السنوسي المالكي، متوفى ٨٩٥ هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٥ هـ.

٢٩٣ـ منحة الباري بشرح صحيح البخاري: شيخ الإسلام أبو يحيى زكريا الأنصاري، متوفى ٩٢٦ هـ، مكتبة الرشد، الرياض، الطبعة الأولى ١٤٢٦ هـ.

٢٩٤ـ المنهاج بشرح صحيح مسلم لابن الحاج: يحيى بن شرف النووي، متوفى ٦٧٦ هـ، دار المعرفة، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٤ هـ.

٢٩٥ـ نخب الأفكار في تنقيح مباني الأخبار في شرح معاني الآثار: محمود بن أحمد، المعرف بدر الدين العيني، متوفى ٨٥٥ هـ، إدارة الشؤون الإسلامية، قطر، الطبعة الأولى ١٤١٩ هـ.

٢٩٦ـ نيل الأوطار شرح منتقى الأخبار: قاضي محمد بن علي الشوكاني، متوفى ١٢٥٥ هـ، دار

٢٩٧ـ المعرفة، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٩هـ، وط: دار ابن الجوزي، الدمام، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٧هـ.

٢٩٨ـ نيل الخير بحديث الطير: فخر الدين الغلاني، معاصر، إدارة الدعوة الإسلامية، كراچي.

سيرت و فضائل

٢٩٩ـ الإشارة إلى سيرة المصطفى: حافظ علاء الدين أبو عبدالله بن قليج المغلطائي، متوفّىٰ ٧٦٢هـ، دار القلم، دمشق، الطبعة الأولىٰ ١٤١٦هـ.

٣٠٠ـ الإكتفاء من مغازي رسول الله والثلاثة الخلفاء: أبو الربيع سليمان بن موسىٰ الكلاعي الأندلسي، متوفىٰ ٦٣٤هـ، عالم الكتب، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٧هـ.

٣٠١ـ إمتاع الأسماع: تقي الدين أحمد بن علي المقريزي، متوفىٰ ٨٤٥هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٠هـ.

٣٠٢ـ إنسان العيون في سيرة الأمين المأمون (السيرة الحلبية): علي بن برهان الدين الحلبي متوفّىٰ ١٠٤٤هـ، دار المعرفة، بيروت.

٣٠٣ـ الأنوار في آيات النبي المختار ﷺ: عبد الرحمان الثعالبي، متوفّىٰ ٨٧٥هـ، دار ابن حزم، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٦هـ.

٣٠٤ـ الأنوار في شمائل النبي المختار: الإمام محي السنة الحسين بن مسعود بن محمد الفراء البغوي، متوفّىٰ ٥١٠هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٦هـ.

٣٠٥ـ الأنوار المحمدية من المواهب اللدنية: الشيخ يوسف بن إسماعيل النبهاني، متوفّىٰ ١٣٥٠هـ، الطبعة الأدبية، بيروت ١٣٢١هـ.

٣٠٦ـ إشراق مصابيح السيرة المحمدية بمزج أسرار المواهب اللدنية: محمد عبد الباقي الزرقاني، متوفّىٰ ١١٢٢هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٧هـ.

٣٠٧ـ أشرف الوسائل إلى فهم الشمائل: شهاب الدين أحمد بن حجر الهيثمي المكي، متوفّىٰ ٩٧٤هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٩هـ.

٣٠٨ـ أعلام النبوة: أبو الحسن علي بن محمد الماوردي، متوفّىٰ ٤٥٠هـ، دار الكتاب العربي، بيروت

الطبعة الأولى ١٤٠٨هـ .

٣٠٩- **ألفية السيرة النبوية[نظم الدرر السنية في السيرة الزكية]** إمام زين الدين عبدالرحيم بن الحسين العراقي،متوفّىٰ ٨٠٦هـ،دار المنهاج،بيروت،الطبعة الأولى١٤٢٦هـ.

٣١٠- **بهجة المحافل وبغية الأماثل:** أبوزكريا عماد الدين يحي بن أبي بكر العامري اليمني،متوفّىٰ ٨٩٣هـ،دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولى١٤١٧هـ.

٣١١- **الباهر في حكم النبي ﷺ في الباطن والظاهر:** الإمام الحافظ جلال الدين عبدالرحمان بن أبي بكر السيوطي، متوفّىٰ ٩١١هـ،دار السلام،القاهرة،الطبعة الأولى١٤٠٧هـ.

٣١٢- **تاريخ الخميس في أحوال أنفس نفيس ﷺ:** حسين بن محمد الديار بكري، متوفّىٰ ٩٦٦هـ،دار صادر،بيروت،و ط:دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولى ٢٠٠٩ء.

٣١٣- **تهذيب الخصائص النبوية الكبرىٰ:** الشيخ عبدالله التليدي،دارا لبشائر الإسلامية، بيروت،الطبعة الثانية ١٤١٠هـ.

٣١٤- **جامع الآثار في السير ومولد المختار:** إمام ابن ناصر الدين الدمشقي،متوفّىٰ٨٤٢هـ،دار الفلاح،مصر،الطبعة الأولى١٤٣١هـ.

٣١٥- **جلاء الأفهام في الصلاة والسلام على خير الأنام:** محمد بن أبي بكر ابن قيم الجوزية متوفّىٰ٧٥١هـ،دار الكتاب العربي،بيروت١٤١٧هـ و ط:دار عالم الفوائد،مكة المكرمة، الطبعة الأولى ١٤٢٥هـ.

٣١٦- **جمع الوسائل في شرح الشمائل:** علي بن سلطان محمد القاري،متوفّىٰ١٠١٤هـ، نور محمد كارخانه تجارت كتب آرام باغ كراچی.

٣١٧- **جواهر البحار في فضائل النبي المختار:** يوسف بن إسماعيل النبهاني،متوفّىٰ ١٣٥٠هـ، مصطفى البابي الحلبي،مصر١٣٧٩هـ،و ط:دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولىٰ ١٤١٧هـ.

٣١٨- **حجة الله على العالمين في معجزات سيد المرسلين:** الشيخ يوسف بن إسماعيل النبهاني،متوفّىٰ ١٣٥٠هـ،دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولى١٤١٧هـ.

٣١٩- **حدائق الأنوار ومطالع الأسرار في سيرة النبي المختار:** محمد بن عمر بحرق الحضرمي

٣٤٣ـ شرح الشفاء: علي بن سلطان محمد القاري، متوفّىٰ ١٠١٤هـ، دار الكتب العلمية، بيروت.

٣٤٤ـ شرح الشمائل: شمس الدين محمد عبد الرؤف المناوي الشافعي، متوفّىٰ ١٠٠٣هـ، نور محمد كارخانه تجارت كتب آرام باغ كراچي.

٣٤٥ـ شرف المصطفى ﷺ: أبو سعد عبد الملك بن أبي عثمان محمد بن إبراهيم الخركوشي النيسابوري، متوفّىٰ ٤٠٦هـ، دار البشائر الإسلامية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٤هـ.

٣٤٦ـ الشفا بتعريف حقوق المصطفىٰ ﷺ: قاضي عياض بن موسىٰ، متوفّىٰ ٥٤٤هـ، دار الكتاب العربي، بيروت، وط: موسسة الكتب الثقافية، الطبعة الثانية ١٤٢١هـ، وط: المكتبة العصرية، بيروت، سنة الطبع ١٤٣٠هـ.

٣٤٧ـ الشمائل المحمدية: إمام أبو عيسىٰ محمد بن عيسىٰ الترمذي، متوفّىٰ ٢٧٩هـ، المكتبة التجارية، مكة المكرمة، الطبعة الرابعة ١٤١٦هـ.

٣٤٨ـ شواهد النبوة: إمام عبد الرحمان جامي، متوفّىٰ، مكتبة نبوية، لاهور، بارهفتم ٢٠٠٨ء.

٣٤٩ـ ضياء النبي: پير محمد كرم شاه الأزهري، متوفّىٰ ١٩٩٨ء، ضياء القرآن، لاهور، سنة الطبع ١٤١٥هـ.

٣٥٠ـ الطبقات الكبرىٰ: إمام محمد بن سعد بن منيع الظهري، متوفّىٰ ٢٣٠هـ، دار إحياء التراث العربي، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٧هـ، وط: مكتبة الخانجي القاهرة، الطبعة الأولىٰ ١٤٢١هـ وط: دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الثانية ١٤٣٣هـ.

٣٥١ـ العجالة السنية علىٰ ألفية السيرة النبوية: أبو الفضل زين الدين عبد الرحيم العراقي، متوفّىٰ ٨٠٦هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٤هـ.

٣٥٢ـ عيون الأثر في فنون المغازي والشمائل والسير: حافظ أبو الفتح محمد بن محمد بن محمد بن سيد الناس، متوفّىٰ ٧٣٤هـ، مكتبة دار التراث، المدينة المنورة، الطبعة الأولى ١٤١٣هـ.

٣٥٣ـ غاية السول في خصائص الرسول ﷺ: إمام أبي حفص عمر بن علي الأنصاري ابن الملقن، متوفّىٰ ٨٠٤هـ، دار البشائر الإسلامية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٤هـ.

٣٥٤ـ فتح المتعال في مدح النعال: أبو العباس شهاب الدين أحمد بن محمد التلمساني المالكي،

متوفّیٰ ۱۰۴۱ھ،دار الکتب العلمية،بیروت الطبعة الأولیٰ ۱۴۲۷ھ.

۳۵۵۔ الفروسية المحمدية: محمد بن أبي بكر بن أيوب ابن قيم الجوزية، ۷۵۱ھ،دار عالم الفوائد،مكة المكرمة،الطبعة الأولیٰ ۱۴۲۸ھ،وط: المكتبة التوفيقية،القاهرة.

۳۵۶۔ الفصول في سيرة الرسول: أبو الفداء إسماعيل الحافظ ابن كثير،متوفّیٰ ۷۷۴ھ،دار التراث المدينة المنورة،الطبعة السادسة ۱۴۱۳ھ.

۳۵۷۔ فضائل درود شریف: محمد زکریا سهارنپوري،متوفّیٰ ۱۴۰۲ھ ،دار البشائر الإسلامية، بیروت.

۳۵۸۔ القول البديع في الصلاة على الحبيب الشفيع ﷺ: محمد بن عبد الرحمٰن السخاوي، متوفّیٰ ۹۰۲ھ،دار الکتاب العربي،بیروت الطبعة الأولیٰ ۱۴۰۵ھ ومؤسسة الريان، بيروت، الطبعة الأولیٰ ۱۴۲۲ھ

۳۵۹۔ كفاية الطالب اللبيب في خصائص الحبيب ﷺ(الخصائص الکبریٰ): جلال الدين عبد الرحمان بن أبي بكر السيوطي،متوفّیٰ ۹۱۱ھ،دار الکتب العلمية،بیروت،الطبعة الأولیٰ ۱۴۰۵ھ، وط: دار التوفيقية،القاهرة، سنة الطبع ۱۰۱۱،وط: دار الکتب الحديثية،القاهرة.

۳۶۰۔ اللفظ المكرم بخصائص النبي المعظم ﷺ: محمد بن محمد الخيضري الشافعي، متوفّیٰ ۸۹۴ھ،دار الکتب العلمية،بیروت،الطبعة الأولیٰ ۱۴۱۷ھ، وط: الجامعة الإسلامية بالمدينة النبوية،الطبعة الأولیٰ ۱۴۱۶ھ.

۳۶۱۔ محمد ﷺ الإنسان الكامل: السيد محمد ابن السيد علوي المالكي الحسيني،متوفّیٰ،دار الکتب العلمية،بیروت،الطبعة الأولیٰ ۱۴۲۹ھ.

۳۶۲۔ مختصر سيرة الرسول: محمد بن عبد الوهاب النجدي،متوفّیٰ ۱۲۰۶ھ، مكتبة نزار مصطفى الباز،مكة المكرمة،الطبعة الأولیٰ ۱۴۱۹ھ.

۳۶۳۔ مطالع المسرات بجلاء دلائل الخيرات: إمام محمد مهدی الفاسي،متوفّیٰ ۱۱۰۹ھ المكتبة النورية الرضوية، لائلپور(فیصل آباد).

۳۶۴۔ المِنَحُ المكّية في شرح الهمزيّة: شهاب الدين أحمد بن محمد بن علي بن حجر المكي

الشافعي، متوفیٰ ٩٧٤هـ، دار المنهاج، بيروت، الطبعة الثانية ١٤٢٦هـ.

٣٦٥_ المواهب الدنية بالمنح المحمدية: إمام أحمد بن محمد القسطلاني، متوفیٰ ٩٢٣هـ، المكتب الإسلامي بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٤١٢هـ.

٣٦٦_ موسوعة سيرة سيد الأنام عليه الصلاة والسلام: دكتور السيد جعفر مصطفیٰ سبيه المكتبة المكية، مكة المكرمة، الطبعة الأولیٰ ١٤٢٢هـ.

٣٦٧_ نبيِّ رحمت: سيد أبو الحسن علي ندوي، متوفیٰ ١٤٢٠هـ، مجلسِ نشريات اسلام، كراچي.

٣٦٨_ نسيم الرياض في شرح الشفا القاضي عياض: أحمد شهاب الدين الخفاجي المصري، متوفیٰ ١٠٦٩هـ، المطبعة الأزهرية المصرية، الطبعة الأولیٰ ١٣٢٧هـ، وط: دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٤٢١هـ.

٣٦٩_ نشر الطيب في ذكر النبي الحبيب ﷺ: مولانا أشرف علي تهانوي، متوفیٰ ١٣٦٤هـ، تاج كمپنی، كراچی.

٣٧٠_ نظام الحكومة النبوية، المسمیٰ: التراتيب الإدارية: سيد محمد عبد الحي الكتاني، متوفیٰ ١٣٨٢هـ، شركة دار الأرقم، بيروت.

٣٧١_ الوفا بأحوال المصطفیٰ ﷺ: أبو الفرج عبد الرحمن علي بن الجوزي، متوفیٰ ٥٩٧هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٤٠٨هـ.

أُصُولِ حَدِيْث

٣٧٢_ الإسناد من الدين: شيخ عبد الفتاح أبو غدة، متوفیٰ ١٤١٧هـ، مكتبة المطبوعات الإسلامية، بحلب، الطبعة الأولیٰ ١٤١٢هـ.

٣٧٣_ البحر الذي زخر في شرح ألفية الأثر: جلال الدين عبد الرحمان بن أبي بكر السيوطي، متوفیٰ ٩١١هـ، مكتبة الغرباء الأثرية، المدينة النبوية، الطبعة الأولیٰ ١٤٢٠هـ.

٣٧٤_ بلغة الأريب في مصطلح آثار الحبيب: إمام الحافظ سيد مرتضیٰ الحسيني الزبيدي، متوفیٰ ١٢٠٥هـ، دار البشائر الإسلامية، بيروت، الطبعة الثانية ١٤٠٨هـ.

٣٧٥- **بهجة المنتفع**: لأبي عمر عثمان بن سعيد الداني المقري، متوفى ٤٤٤هـ، دار عبد الأول محمد الأنصاري، المدينة المنورة، الطبعة الأولى ١٤٢٨هـ.

٣٧٦- **قواعد في علوم الحديث**: ظفر أحمد عثماني تهانوي، متوفى ١٣٩٤هـ، مكتب المطبوعات الإسلامية، حلب، الطبعة الخامسة ١٤٠٤هـ.

٣٧٧- **التقريب والتيسير لأحاديث البشير النذير**: أبو زكريا محي الدين يحي بن شرف النووي، متوفى ٦٧٦هـ، مكتبة المعارف، الرياض، الطبعة الأولى ١٤٣١هـ.

٣٧٨- **التبصرة والتذكرة**: الحافظ الشيخ زكريا بن محمد الأنصاري السنكي، متوفى ٩٢٥هـ، دار الكتب العلمية، بيروت.

٣٧٩- **التقييد والإيضاح لما أطلق وأغلق من مقدمة ابن الصلاح**: إمام زين الدين عبد الرحيم بن الحسين العراقي، متوفى ٨٠٦هـ، موسسة الكتب الثقافية، الطبعة الرابعة ١٤١٦هـ.

٣٨٠- **جامع شروح مقدمة ابن الصلاح**: أبو حفص سراج الدين عمر بن رسلان البلقيني، متوفى ٨٠٥هـ، دار الغد الجديد، القاهرة، الطبعة الأولى ١٤٣٢هـ.

٣٨١- **الجامع لأخلاق الراوي وآداب السامع**: أبو بكر أحمد بن علي بن ثابت الخطيب البغدادي، متوفى ٤٦٣هـ، مكتبة المعارف، الرياض، الطبعة الأولى ١٤٠٣هـ.

٣٨٢- **الرفع والتكميل في الجرح والتعديل**: محمد عبد الحي اللكنوي الهندي، متوفى ١٣٠٦هـ، مكتبة المطبوعات الإسلامية، بحلب، الطبعة الثالثة ١٤٠٨هـ.

٣٨٣- **شرحُ شرح نخبة الفكر في مصطلحات أهل الأثر**: علي بن سلطان محمد الهروي القاري، متوفى ١٠١٤هـ، شركة دار الأرقم بن أبي الأرقم، بيروت.

٣٨٤- **شرح علل الترمذي**: عبد الرحمن بن أحمد بن رجب الحنبلي، متوفى ٧٩٥هـ، عالم الكتب، بيروت، الطبعة الثانية ١٤٠٥هـ، وط: دار الملاح للطباعة والنشر، دمشق، ١٣٩٨هـ.

٣٨٥- **شرف أصحاب الحديث**: أبي بكر أحمد بن علي بن ثابت الخطيب البغدادي، متوفى ٤٦٣هـ، عالم الكتب، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٣هـ.

٣٨٦- **الشذ الفياح من علوم ابن الصلاح**: الشيخ برهان الدين الأبناسي، متوفى ٨٠٢هـ، مكتبة

الرشد،الرياض،الطبعة الأولىٰ١٤١٨هـ.

٣٨٧- **ظفر الأماني في شرح مختصر السيد الشريف الجرجاني:** محمد عبد الحي اللكنوي الهندي،متوفىٰ١٣٠٤هـ،مكتب المطبوعات الإسلامية،بحلب،الطبعة الثالثة١٤١٦هـ.

٣٨٨- **فتح المغيث شرح ألفية الحديث:** المحدث الحافظ أبي الفضل عبد الرحيم بن الحسين العراقي،متوفّىٰ٨٠٦هـ،دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة١٤٢١هـ.

٣٨٩- **فتح المغيث شرح ألفية الحديث:** محمد بن عبد الرحمن السخاوي،متوفّىٰ٩٠٢هـ،دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولىٰ١٤١٤هـ، وط:دار المنهاج،الرياض،الطبعة الأولىٰ١٤٢٦هـ.

٣٩٠- **الكفاية في علم الرواية:** أبوبكر أحمد بن علي بن ثابت الخطيب البغدادي، متوفّىٰ ٤٦٣هـ،دار الكتب العلمية بيروت،الطبعة الأولى١٤٢٧هـ.

٣٩١- **لمحات من تاريخ السنة وعلوم الحديث :** عبد الفتاح أبوغدة،متوفّىٰ١٤١٧هـ،مطبوعة دار البشائر الاسلامية،بيروت،الطبعة الأولىٰ ١٤٠٤هـ .

٣٩٢- **مجموعة رسائل في علوم الحديث:** للنسائي والخطيب البغدادي، تحقيق:نصر أبوعطايا (معاصر)دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولىٰ١٤١٣هـ.

٣٩٣- **مختصر في مصطلح الحديث:** مير سيد شريف علي الجرجاني،متوفّىٰ٨١٦هـ،مكتب المطبوعات الإسلامية،بحلب،الطبعة الثالثة١٤١٦هـ.

٣٩٤- **المدخل إلىٰ كتاب الإكليل:** للإمام ابن عبدالله الحاكم النيسابوري،المتوفّىٰ ٤٠٥هـ، المكتبة التجارية،مكة المكرمة.

٣٩٥- **المدخل في أصول الحديث:** إمام ابوعبدالله الحاكم النيسابوري،متوفّىٰ٤٠٥هـ،دار ابن حزم،الطبعة الأولىٰ١٤٢٨هـ.

٣٩٦- **معرفة علوم الحديث:** إمام ابوعبدالله الحاكم النيسابوري،متوفّىٰ٤٠٥هـ، المكتبة العلمية،المدينة المنورة،الطبعة الثانية١٣٩٧هـ.

٣٩٧- **مفتاح الجنة في الاحتجاج بالسنة:** إمام جلال الدين عبدالرحمن بن أبي بكر السيوطي،

متوفى ۹۱۱ھ،مکتبہ الصحابۃ جدۃ،الطبعۃ الثانیۃ ۱٤۱۳ھ۔

۳۹۸۔ **مقدمۃ ابن الصلاح مع التقید والإیضاح:** إمام أبوعمروعثمان بن عبدالرحمان المشھور بابن الصلاح،متوفیٰ ٦٤۳ھ،مؤسسۃ الکتب الثقافیۃ،الطبعۃ الرابعۃ ۱٤۱٦ھ۔

۳۹۹۔ **الموقظۃ في علم مصطلح الحدیث:** شمس الدین محمدبن أحمد الذھبي، متوفیٰ ۷٤۸ھ،دارالبشائر الإسلامیۃ،بیروت،الطبعۃ الثانیۃ ۱٤۱۲ھ۔

٤۰۰۔ **نتیجۃ النظر في نخبۃ الفکر:** حافظ کمال الدین محمدبن محمد الشُّمُني، متوفیٰ ۸۲۱ھ ،مکتبۃ دارالمنھاج،الریاض،الطبعۃ الأولیٰ ۱٤۳۱ھ۔

٤۰۱۔ **نصیحۃ أھل الحدیث:** أحمدبن علي بن ثابت الخطیب البغدادي،متوفیٰ ٤٦۳ھ،مکتبۃ المنار،الزرقاء،الأردن،الطبعۃ الأولیٰ ۱٤۰۸ھ۔

٤۰۲۔ **النکت:** حافظ شھاب الدین أحمد بن علي بن حجر العسقلاني،متوفیٰ ۸۵۲ھ،دار الکتب العلمیۃ، بیروت،الطبعۃ الأولیٰ ۱٤۱٤ھ۔

أسماء الرجال

٤۰۳۔ **الاستیعاب في معرفۃ الأصحاب:** أبو عمرو یوسف ابن عبدالبرالقرطبي،متوفیٰ ٤٦۳ھ، دارالکتب العلمیۃ،بیروت،الطبعۃ الأولیٰ ۱٤۱۵ھ،وط:دارالفکر،بیروت ۱٤۲٦ھ۔

٤۰٤۔ **الإصابۃ في تمییز الصحابۃ:** أحمدبن علي بن حجرالعسقلاني،متوفیٰ ۸۵۲ھ،دارالکتب العلمیۃ،بیروت،الطبعۃ الأولیٰ ۱٤۱۵ھ،وط:دارھجر،القاھرۃ،الطبعۃ الأولیٰ ۱٤۲۹ھ۔

٤۰۵۔ **الإنابۃ إلیٰ معرفۃ المختلف فیھم من الصحابۃ:** أبوعبداللہ علاؤالدین بن قلیج الحنفي، متوفیٰ ۷٦۲ھ،مکتبۃ الرشد،الریاض،الطبعۃ الأولیٰ ۱٤۲۰ھ۔

٤۰٦۔ **أحوال الرجال:** أبوإسحاق إبراھیم بن یعقوب الجوزجاني،متوفیٰ ۲۵۹ھ، مؤسسۃ الرسالۃ،بیروت،الطبعۃ الأولیٰ ۱٤۰۵ھ۔

٤۰۷۔ **أسد الغابۃ في معرفۃ الصحابۃ :** إمام أبو الحسن علي بن محمدالمعروف بابن الأثیر الجزري،متوفیٰ ٦۳۰ھ،دارإحیاء التراث العربي، بیروت،الطبعۃ الأولیٰ ۱٤۱۷ھ۔

٤۰۸۔ **إکمال تھذیب الکمال في أسماء الرجال:** حافظ علاؤ الدین مغلطائي بن قلیج الحنفي،

متوفى ٧٦٢ھ،دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولى ٢٠١١ء.

٤٠٩ـ **تاريخ الثقات:** حافظ أبوالحسن أحمدبن عبدالله بن صالح العجلي،متوفى ٢٦١ھ،دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولى ١٤٠٥ھ.

٤١٠ـ **تذهيب تهذيب الكمال في أسماء الرجال:** شمس الدين محمد بن أحمد الذهبي، متوفى ٧٤٨ھ،الفاروق الحديثية،القاهرة،الطبعة الأولى ١٤٢٥ھ.

٤١١ـ **تقريب التهذيب:** حافظ شهاب الدين أحمدبن علي بن حجر العسقلاني،متوفى ٨٥٢ھ، دار الفكر،بيروت،الطبعة الأولى ١٤١٥ھ ،و ط:دار العاصمة،الرياض.

٤١٢ـ **تهذيب التهذيب:** حافظ شهاب الدين أحمدبن علي بن حجر العسقلاني،متوفى ٨٥٢ھ، دار الفكر،بيروت،الطبعة الأولى ١٤١٥ھ،و ط:مؤسسة الرسالة،بيروت..

٤١٣ـ **تهذيب الكمال في أسماء الرجال:** جمال الدين يوسف المزي،متوفى ٧٤٢ھ،مؤسسة الرسالة،بيروت،الطبعة الثانية ١٤٠٣ھ،و ط:دار الكتب العلمية، بيروت،الطبعة الأولى ١٤٢٥ھ.

٤١٤ـ **الثقات:** الحافظ زين الدين قاسم بن قطلوبغا الحنفي،متوفى ٨٧٩ھ،مكتبة عباس، الطبعة الأولى ١٤٣٢ھ.

٤١٥ـ **ذيل ميزان الاعتدال:** أبوالفضل عبدالرحيم بن الحسين العراقي،متوفى ٨٠٦ھ،دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولى ١٤١٦ھ.

٤١٦ـ **علل الحديث ومعرفة الرجال والتاريخ:** إمام أبوالحسن علي ابن المديني،متوفى ٢٣٤ھ، دار ابن الجوزي،الدمام،الطبعة الثانية ١٤٣٠ھ.

٤١٧ـ **الكامل في ضعفاء الرجال:** إمام الحافظ أبي أحمد عبدالله بن عدي الجرجاني،المتوفى ٣٦٥ھ،دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولى ١٤١٨ھ.

٤١٨ـ **الكنى والأسماء:** حافظ أبوبشر محمدبن أحمد الدولابي،متوفى ٣١٠ھ،دار ابن حزم، الطبعة الأولى ١٤٢١ھ.

٤١٩ـ **لسان الميزان:** أحمد بن علي بن حجر العسقلاني،متوفى ٨٥٢ھ،دار إحياء التراث العربي بيروت،الطبعة الأولى ١٤١٥ھ،و ط:المطبوعات الإسلامية،الحلب،الطبعة الأولى ١٤٢٣ھ.

٤٢٠ـ معجم الصحابة: القاضي أبي الحسنين بن قانع البغدادي، متوفىٰ ٣٥١ھ، دار الكتب العلمية بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٦ھ.

٤٢١ـ ميزان الاعتدال في نقد الرجال: شمس الدين محمد بن أحمد الذهبي، متوفىٰ ٧٤٨ھ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٥ھ.

كتب عقائد و كلام

٤٢٢ـ الإبانة عن شريعة الفرق الناجية ومجانبة الفرق المذمومة: أبو عبدالله عبيدالله بن محمد بن بطة العكبري الحنبلي متوفىٰ ٣٨٧، دار الرية، الرياض، الطبعة الأولىٰ ١٤٠٩ھ.

٤٢٣ـ أبكار الأفكار في أصول الدين: أبو الحسن علي بن محمد بن سالم المعروف بسيف الدين الآدمي، متوفىٰ ٦٣١ھ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٤ھ.

٤٢٤ـ أثر الحديث الشريف: شيخ محمد عوامة، متوفىٰ ١٤٣٦ھ، دار البشائر الإسلامية، بيروت، الطبعة الرابعة ١٤١٨ھ.

٤٢٥ـ الأجوبة الفاضلة للأسئلة العشرة الكاملة: علامة عبدالحي اللكهنوي، متوفىٰ ١٣٠٤ھ، مكتب المطبوعات الإسلامية، بحلب، الطبعة الثالثة ١٤١٤ھ.

٤٢٦ـ إتحاف الزائر وأطراف المقيم السائر: إمام أبو اليمن عبدالصمد بن عبدالوهاب بن عساكر، متوفىٰ ٦٨٦ھ، دار أرقم بن أبي الأرقم، بيروت.

٤٢٧ـ الإشاعة لأشراط الساعة: السيد محمد البرزنجي الحسيني، متوفىٰ ١١٠٣ھ، دار الكتاب العربي، بيروت، سنة الطبع ١٤٢٥ھ.

٤٢٨ـ الإعتقاد والهداية إلى سبيل الرشاد: أبو بكر أحمد بن الحسين البيهقي، متوفىٰ ٤٥٨ھ، اليمامة، دمشق، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٠ھ، وط: دار الفضيلة، الرياض، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٠ھ.

٤٢٩ـ أكابر صحابة پر بهتان: محمد عبدالرشيد النعماني، متوفىٰ، مكتبة الحسن، لاهور.

٤٣٠ـ البريلوية كا تحقيقي اور تنقيدي جائزه: محمد عبدالحكيم شرف قادري، متوفىٰ، مكتبة قادرية، لاهور، اشاعت دوم ١٤٢٧ھ.

٤٣١ـ تحفة اثناء عشريه: حضرت شاه عبدالعزيز محدث دهلوي، متوفىٰ ١٢٢٩ھ، مير محمد

كتب خانه،آرام باغ كراچي.

٤٣٢ـ تصفية مابين سني وشيعة: سيد پير مهر علي شاهؒ متوفیٰ١٣٥٦ھ،پاكستان انٹرنيشنل پرنٹرز لميٹڈ،لاهور١٤٠٦ھ.

٤٣٣ـ التعظيم والمنة في أن أبوي رسول الله ﷺ في الجنة(الرسائل العشر): عبد الرحمان بن أبي بكر السيوطي،متوفیٰ٩١١ھ،دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولیٰ ١٤٠٩ھ.

٤٣٤ـ تقوية الإيمان مع تذكير الإخوان: شاه محمد إسماعيل دهلوي،متوفیٰ١٢٤٦ھ،نور محمد كارخانه تجارت كتب،كراچي،سنة الطبع ١٩٧٦ء.

٤٣٥ـ تمهيد الأوائل وتلخيص الدلائل:قاضي أبوبكر محمد بن الطيب الباقلاني،متوفیٰ٤٠٣ھ ،مؤسسة الكتب الثقافية،الصنائع،الطبعة الثانية١٤١٤ھ،وط:دار الفكر العربي.

٤٣٦ـ حضرت علي ﷺ اور قصاصِ عثمان غني ﷺ:مولانا محمد عبد الرشيد نعماني،متوفیٰ الرحيم اكيڈمي كراچي،طبع دوم١٤٢٥ھ.

٤٣٧ـ خانوادهٔ نبوى وعهد بني اُميه،حقائق واوهام:الدكتور سيد رضوان علي الندوي (معاصر) العربي إدارة تصنيف ونشر كراچي.

٤٣٨ـ الدرج المنيفة في الأباء الشريفة (الرسائل العشر) جلال الدين عبد الرحمان بن أبي بكر السيوطي،متوفیٰ٩١١ھ،دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولیٰ ١٤٠٩ھ.

٤٣٩ـ الدين الخالص :السيد محمد صديق حسن القنوجي البخاري،متوفیٰ١٢٥٣ھ،دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولى١٤١٥ھ.

٤٤٠ـ الرّوح:محمد بن أبي بكر بن قيم الجوزية،متوفیٰ٧٥١ھ،دار الفكر،بيروت،الطبعة الأولیٰ ١٤١١ھ وط:دار إحياء العلوم، بيروت،الطبعة الثانية ١٤١٤ھ، وط:دار ابن تيمية، الرياض، الطبعة الأولیٰ١٤٠٦ھ.

٤٤١ـ السيف المسلول على من سب الرسول ﷺ:الشيخ تقي الدين علي بن الكافي السّبكي متوفیٰ٧٥٦ھ،دار ابن حزم،بيروت،الطبعة الأولى١٤٢٦ھ،وط:دار الفتح عمان، الأردن، الطبعة الأولیٰ١٤٢١ھ.

٤٤٢ـ **السيف المسلول:** قاضي ثناء الله فاني فتي، متوفى ١٢٢٥هـ، مطبع أحمدي دهلي، سنة الطبع ١٢٦٨هـ.

٤٤٣ـ **شرح أصول اعتقاد أهل السنة والجماعة:** هبة الله بن الحسن الطبري الشافعي المعروف باللالكائي، متوفى ٤١٨هـ دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٣هـ.

٤٤٤ـ **شرح العقائد النسفية:** سعد الدين مسعود بن عبد الله الشهير بسعد الدين التفتازاني، متوفى ٧٩٣هـ، مكتبة الحسن، اردو بازار، لاهور.

٤٤٥ـ **شرح المقاصد:** مسعود بن عبد الله الشهير بسعد الدين التفتازاني، متوفى ٧٩٣هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٢هـ.

٤٤٦ـ **شرحُ المواقف:** السَّيد الشَّريف علي بن مُحمَّد الجرجاني، متوفى ٨١٦هـ، دار الكتب العلمية بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٩هـ.

٤٤٧ـ **شفاء السقام في زيارة خير الأنام:** تقي الدين علي بن عبد الكافي السبكي، متوفى ٧٥٦هـ، نوريه رضويه پبلی کیشنز، لاهور، الطبعة الأولى ١٤٢٥هـ.

٤٤٨ـ **شمُّ العوارض في ذمِّ الروافض:** الشيخ العلامة علي بن سلطان مُحمد القاري، متوفى ١٠١٤هـ، دار الأثرية عمان، أردن.

٤٤٩ـ **صراطِ مستقيم:** شاه محمد إسماعيل دهلوي، متوفى ١٢٤٦هـ، فخر المطابع دهلي.

٤٥٠ـ **الصارم المسلول على شاتم الرسول:** أحمد بن عبد الحليم ابن تيمية، متوفى ٧٢٨هـ، المكتب الإسلامي، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٤هـ.

٤٥١ـ **الصواعق المحرقة في الرد على أهل البدع والزندقة:** أحمد بن حجر الهيثمي المكي الشافعي، متوفى ٩٧٥هـ، مطبوعة مكتبة القاهرة، مصر، الطبعة الثانية ١٣٨٥هـ.

٤٥٢ـ **طلوع الثريا بإظهار ما كان خفيا، من: الحاوي للفتاوي:** جلال الدين عبد الرحمان بن أبي بكر السيوطي، متوفى ٩١١هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٠٩هـ.

٤٥٣ـ **العلم الظاهر والباطن، في: مجموعة الرسائل المنيرية:** أبو العباس أحمد بن عبد الحليم ابن تيمية الحنبلي، متوفى ٧٢٨هـ، إدارة الطباعة المنيرية، دمشق، سنة الطبع ١٣٤٣هـ.

٤٠٤ـ **الكبريت الأحمر:** عبدالوهاب الشعراني،متوفىٰ٩٧٣هـ،مصطفى البابي الحلبي،مصر، وط:دار إحياء التراث العربي،بيروت،سنة الطبع١٤١٨هـ،

٤٠٥ـ **كتاب الإرشاد إلى قواطع الأدلة في أصول الإعتقاد:** إمام الحرمين عبدالملك بن عبد الله الجويني الشافعي،متوفىٰ٤٧٨هـ،دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولىٰ١٤١٦هـ.

٤٠٦ـ **كتاب الإعتقاد:** قاضي أبوالعلاء صاعدبن محمدبن أحمدالأستوائي النيسابوري، متوفىٰ ٤٣٢هـ،دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولىٰ١٤٢٦هـ.

٤٠٧ـ **كتاب الباعث على إنكار البدع والحوادث:** إمام شهاب الدين أبومحمدعبدالرحمن المعروف بابن أبي شامة،متوفىٰ٦٦٥هـ،دار الراية،الرياض،الطبعة الأولىٰ ١٤١٠هـ.

٤٠٨ـ **لوامع الأنوار البهية:** محمدبن أحمدبن سالم السفاريني،متوفىٰ١١٨٨هـ،دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولىٰ١٤٢٩هـ.

٤٠٩ـ **مختصر كتاب الموافقة بين أهل البيت والصحابة:** حافظ إسماعيل بن علي بن الحسن ابن زنجويه الرازي،متوفىٰ ٤٤٥هـ، **اختصره:** جار الله أبوالقاسم محمودبن عمر الزمخشري،متوفىٰ ٥٣٨هـ،دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ١٤٢٠هـ.

٤٦٠ـ **مسالك الحنفاء في والدي المصطفىٰﷺ:(الرسائل العشر):** جلال الدين عبد الرحمان بن أبي بكر السيوطي،متوفىٰ٩١١هـ،دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولىٰ١٤٠٩هـ.

٤٦١ـ **مطلع القمرين في إبانة سبقة العمرين:** إمام أحمد رضا حنفي،متوفىٰ١٣٤٠هـ،مكتبة بهار شريعت،لاهور١٤٣١هـ.

٤٦٢ـ **مقالات الإسلاميين وإصلاح المصلين :** أبوالحسن علي بن إسماعيل الأشعري، متوفىٰ ٣٢٤هـ،تحقيق محي الدين عبدالحميد،مكتبة النهضة المصرية.

٤٦٣ـ **المقامة السندسية في النسبة المصطفوية:(الرسائل العشر)** عبد الرحمان بن أبي بكر السيوطي،متوفىٰ٩١١هـ،دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولىٰ١٤٠٩هـ.

٤٦٤ـ **الملل والنحل:** أبي الفتح محمدبن عبدالكريم بن أبي بكر أحمدالشهرستاني،متوفىٰ ٥٤٨هـ،دار المعرفة بيروت،الطبعة التاسعة١٤٢٩هـ.

٤٦٥ـ **النبراس شرح شرح العقائد:** محمد عبد العزيز الفرهاروي، متوفى، مكتبة حقانية، ملتان، وط: مكتبة رشيدية كوئٹه،

٤٦٦ـ **نشر العِلْمَينِ المُنِيفَيْنِ في إحْياءِ الأبَوَيْنِ الشَّرِيْفَيْن: [الرسائل العشر]** جلال الدين السيوطي، متوفى ٩١١هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٠٩هـ.

٤٦٧ـ **اليواقيت والجواهر:** عبد الوهاب الشعراني، متوفى ٩٧٣هـ، مصطفى البابي الحلبي، مصر، وط: دار إحياء التراث العربي، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٨هـ.

كُتُبِ فقه حنفي

٤٦٨ـ **بچوں کے اسلامی احکام (جامع أحكام الصغار):** فقيه محمد بن محمود بن حسين الأستروشني الحنفي، متوفى ٦٣٢هـ، فريد بك سٹال، لاهور، الطبع الأول ١٤٢٨هـ.

٤٦٩ـ **البحر الرائق:** زين الدين بن إبراهيم بن محمد المعروف بابن نجيم المصري الحنفي، متوفى ٩٧٠هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٨هـ.

٤٧٠ـ **بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع:** أبو بكر بن مسعود الكاساني، متوفى ٥٨٧هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٨هـ.

٤٧١ـ **البناية شرح الهداية:** بدر الدين محمود بن أحمد العيني الحنفي، متوفى ٨٥٥هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الاولى ١٤٢٠هـ.

٤٧٢ـ **الجامع الصغير:** إمام محمد بن الحسن الشيباني، متوفى ١٨٩هـ، دار ابن حزم، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٣٢هـ.

٤٧٣ـ **درمختار شرح تنوير الأبصار:** محمد بن علي الملقب علاء الدين الدمشقي المروف بالحصكفي، متوفى ١٠٨٨هـ، دار إحياء التراث العربي، بيروت ١٤١٩هـ.

٤٧٤ـ **رد المحتار على الدر المختار:** سيد محمد أمين ابن عابدين الشامي، متوفى ١٢٥٢هـ، دار إحياء التراث العربي، بيروت ١٤١٩هـ، وط: دار عالم الكتب، الرياض، سنة الطبع ١٤٢٣هـ.

٤٧٥ـ **شرح الفقه الأكبر:** علي بن سلطان محمد القاري، متوفى ١٠١٤هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٠٤هـ.

٤٧٦ـ شرح الوقاية: صدر الشريعة عبدالله بن مسعود المحبوبي، متوفى ٧٤٧هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ٢٠٠٩م.

٤٧٧ـ عمدة الرعاية على شرح الوقاية: عبدالحي بن عبدالحليم اللكنوي، متوفى ١٣٠٤هـ، دار الكتب العلمية بيروت، الطبعة الأولى ٢٠٠٩م.

٤٧٨ـ الفتاوى التاتارخانية: عالم بن العلاء الأنصاري الهندي، متوفى ٧٨٦هـ، دار إحياء التراث العربي، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٥هـ.

٤٧٩ـ فتاوى رضوية: إمام أحمد رضا حنفي، متوفى ١٣٤٠هـ، مكتبة رضوية آرام باغ كراچى، و ط: رضافاؤنڈيشن، جامعية نظامية، رضوية، لاهور.

٤٨٠ـ فتاوى عزيزي: شاه عبدالعزيز محدث دهلوي، متوفى ١٢٢٩هـ، كتاب فروشي حاجي محمد عليم وپسران، بازار كتاب فروشي كابل افغانستان، ومترجم اردوايچ ايم سعيد كمپنى، كراچى، سنة الطبع ١٣٨٧هـ.

٤٨١ـ الفتاوى الهندية المعروفة بالفتاوى العالمكيرية: العلامة الهمام الشيخ النظام وجماعة من علماء الهند، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢١هـ.

٤٨٢ـ فتح باب العناية بشرح النقاية: علي بن سلطان محمد القاري، متوفى ١٠١٤هـ، دار أرقم، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٨هـ.

٤٨٣ـ فتح القدير في شرح الهداية: إمام كمال الدين بن الهمام، متوفى ٨٦١هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٥هـ.

٤٨٤ـ كتاب الاختيار لتعليل المختار: عبدالله بن محمود بن مودود الموصلي الحنفي، متوفى ٦٨٣هـ، دار المعرفة، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٩هـ.

٤٨٥ـ كنز الدقائق بشرح البحر الرائق: أبو البركات عبدالله بن أحمد النسفي، متوفى ٧١٠هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٨هـ.

٤٨٦ـ المبسوط: شمس الأئمة أبو بكر محمد بن أحمد بن أبي سهل السرخسي، متوفى ٤٩٠هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢١هـ، و ط: دار المعرفة، بيروت.

٤٨٧ـ **مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر**: عبدالرحمان بن محمدبن سليمان الكليوبي المعروف بداماد آفندي، متوفى١٠٧٨هـ، دارالكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى١٤٢١هـ.

٤٨٨ـ **مجمع البحرين وملتقى النيرين**: مظفرالدين أحمدبن علي بن ثعلب المعروف بابن الساعاتي، الحنفي، متوفى٦٩٤هـ، دارالكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى١٤٢٦هـ.

٤٨٩ـ **المحيط البرهاني في فقه النعماني**: برهان الدين أبوالمعالي محمودبن أحمدبن عبد العزيزبن مازةالبخاري الحنفي، متوفى٦١٦هـ، دارالكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٤هـ.

٤٩٠ـ **المختار[مع الاختيار]** عبدالله بن محمودبن مودودالموصلي الحنفي، متوفى٦٨٣هـ، دار المعرفة، بيروت، الطبعة الأولى١٤١٩هـ.

٤٩١ـ **ملتقى الأبحرمع مجمع الأنهر**: إمام إبراهيم بن محمدبن إبراهيم الحلبي الحنفي، متوفى٩٥٦هـ، دارالكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى١٤٢١هـ.

٤٩٢ـ **النتف في الفتاوى**: قاضي القضاة أبي الحسن علي بن الحسين بن محمد السغدي، متوفى ٤٦١هـ، دارالكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى١٤١٧هـ.

٤٩٣ـ **النقاية مع فتح باب العناية**: إمام عبيدالله بن مسعودمحبوبي الحنفي، متوفى٧٤٧هـ، دار أرقم، بيروت، الطبعة الأولى١٤١٨هـ.

٤٩٤ـ **وقاية الرواية في مسائل الهداية**: إمام محمود بن أحمد محبوبي، متوفى هـ، دارالكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى٢٠٠٩م.

٤٩٥ـ **الهداية شرح بداية المبتدي**: أبوالحسن علي بن أبي بكرالمرغيناني، متوفى٥٩٣هـ، دار إحياء التراث العربي، بيروت، الطبعة الأولى١٤١٦هـ.

فقه شافعي

٤٩٦ـ **الإعلام بفوائد عمدة الأحكام**: سراج الدين أبوحفص عمربن علي الأنصاري الشافعي ابن الملقن، متوفى٨٠٤هـ، دارالكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى١٤٢٨هـ.

٤٩٧ـ **البيان في مذهب الإمام الشافعي**: أبو الحسين يحيي بن أبي الخيربن سالم العمراني الشافعي، متوفى٥٥٨هـ، دارالمنهاج، بيروت، الطبعة الأولى١٤٢١هـ.

٤٩٨ـ	الحاوي الكبير: أبوالحسن علي بن محمد بن حبيب الماوردي الشافعي، متوفیٰ ٤٥٠هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٤١٤هـ.
٤٩٩ـ	الحاوي للفتاوي: إمام جلال الدين السيوطي متوفیٰ ٩١١هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٤٠٢هـ، وط: دار الكتاب العربي، بيروت سنة الطبع ١٤٢٥هـ.
٥٠٠ـ	روضة الطالبين وعمدة المفتيين: أبوزكريا محي الدين يحي بن شرف النووي، متوفیٰ ٦٧٦هـ، المكتب الإسلامي، بيروت، الطبعة الثانية ١٤١٢هـ.
٥٠١ـ	فتاویٰ إمام نووي: مرتب علاؤ الدين علي بن إبراهيم بن العطار الدمشقي متوفیٰ ٧٢٤هـ، دار الفكر، دمشق، الطبعة الأولی ١٤١٩هـ.
٥٠٢ـ	الفتاویٰ الحديثية: علامة أحمد بن محمد علي بن حجر المكي، متوفیٰ ٩٧٥هـ، دار إحياء التراث العربي، بيروت، الطبعة الأولی ١٤١٩هـ.
٥٠٣ـ	فتح الجواد بشرح الإرشاد: شهاب الدين أحمد بن محمد بن علي ابن حجر المكي، متوفیٰ ٩٧٤هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٤٢٦هـ.
٥٠٤ـ	كشف الغمة عن جميع الأمة: عبد الوهاب الشعراني، متوفیٰ ٩٧٣هـ، دار الفكر، بيروت، سنة الطبع ١٤٠٨هـ.
٥٠٥ـ	المجموع مع شرح المهذب: محي الدين يحي بن شرف النووي، متوفیٰ ٦٧٦هـ، دار إحياء التراث العربي، بيروت، وط: دار الحديث، القاهرة، سنة الطبع ١٤٣١هـ.
٥٠٦ـ	مغني المحتاج إلى معرفة معاني ألفاظ المنهاج: شمس الدين محمد الخطيب الشربيني، متوفیٰ ٩٧٧هـ، دار المعرفة، بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٤١٨هـ.
٥٠٧ـ	الوسيط في المذهب: إمام محمد بن محمد بن محمد الغزالي، ٥٠٥هـ، دار السلام، الأزهر، مصر، الطبعة الأولیٰ ١٤١٧هـ.

فقه حنبلي

٥٠٨ـ	الإقناع لطالب الانتفاع: شرف الدين موسیٰ بن أحمد أبو النجا الحجاوي المقدسي، متوفیٰ ٩٦٨هـ، دار هجر، الطبعة الثالثة ١٤٢٣هـ.

٥٠٩ـ **الإنصاف في معرفة الراجح من الخلاف:** علاؤ الدين أبوالحسن علي بن سليمان المرداوي، متوفى ٨٨٥هـ، بتحقيق محمد حامد الفقي، الطبعة الأولى ١٣٧٤هـ.

٥١٠ـ **أحكام النساء:** أبوالفرج عبد الرحمن علي بن الجوزي الحنبلي، متوفى ٥٩٧هـ، دار الفكر، بيروت، الطبعة الثالثة ١٤١٦هـ.

٥١١ـ **إعلام الموقعين عن رب العالمين:** محمد بن أبي بكر ابن قيم الجوزية الحنبلي متوفى ٧٥١هـ، دار الكتاب العربي، بيروت، الطبعة الثانية ١٤١٨هـ، وط: دار ابن الجوزي، الدمام، الطبعة الأولى ١٤٢٣هـ.

٥١٢ـ **تحفة المودود بأحكام المولود:** محمد بن أبي بكر ابن قيم الجوزية، متوفى ٧٥١هـ، دار عالم الفوائد، مكة المكرمة، الطبعة الأولى ١٤٣١هـ، وط: مكتبة ابن تيمية، القاهرة، الطبعة الأولى ١٤٢٠هـ.

٥١٣ـ **شرح الزركشي على متن الخرقي،** شمس الدين أبوعبدالله محمد بن عبدالله الزركشي، متوفى ٧٧٢هـ، مكتبة الأسدي، مكة المكرمة، الطبعة الثالثة ١٤٣٠هـ.

٥١٤ـ **الشرح الكبير مع المغني:** شمس الدين عبدالرحمان بن محمد ابن قدامة المقدسي، متوفى ٦٨٢هـ، دار الحديث، القاهرة، سنة الطبع ١٤٢٥هـ.

٥١٥ـ **كتاب الفروع:** شمس الدين محمد بن مفلح المقدسي، متوفى ٧٦٣هـ، دار المؤيد، الرياض، الطبعة الأولى ١٤٢٤هـ.

٥١٦ـ **الكافي:** موفق الدين أبومحمد بن عبدالله بن أحمد بن محمد بن قدامة المقدسي، الدمشقي الحنبلي، متوفى ٦٢٠هـ، دار هجر، القاهرة، الطبعة الأولى ١٤١٧هـ.

٥١٧ـ **كشاف القناع:** منصور بن يونس البهوتي، دار إحياء التراث العربي، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٠هـ.

٥١٨ـ **مجموعة الفتاوى:** أبو العباس أحمد بن عبدالحليم ابن تيمية الحنبلي، متوفى ٧٢٨هـ، دار ابن حزم، بيروت، الطبعة الثانية ١٤٢٢هـ.

٥١٩ـ **المغني لابن قدامة:** أبومحمد عبدالله بن أحمد بن محمد بن قدامة المقدسي، الدمشقي

الحنبلي، متوفیٰ ۶۲۰ھ، دار الحدیث القاهرة، الطبعة ۱۴۲۵ھ.

۵۲۰۔ المقنع: موفق الدين أبو محمد بن عبد الله بن أحمد بن محمد بن قدامة المقدسي، الدمشقي الحنبلي، متوفیٰ ۶۲۰ھ، دار هجر، الطبعة الأولیٰ ۱۴۱۴ھ.

فقه مالکي

۵۲۱۔ الإحكام في تمييز الفتاویٰ عن الأحكام: إمام شهاب الدين أبي العباس أحمد بن إدريس المصري المالكي، متوفیٰ، مكتب المطبوعات الإسلامية، بحلب، الطبعة الثانية ۱۴۱۶ھ.

۵۲۲۔ الإكليل شرح مختصر الخليل: محمد بن محمد بن أحمد بن عبد القادر السنباوي المعروف بالأمير، متوفیٰ ۱۲۳۲ھ، مكتبة القاهرة، مصر.

۵۲۳۔ تبصرة الحكام في أصول الأقضية ومناهج الأحكام: برهان الدين بن فرحون اليعمري المالكي، متوفیٰ ۷۹۹ھ، دار عالم الكتب، الطبعة ۱۴۲۳ھ.

کتب مذاہب اربعة

۵۲۴۔ الفقه الإسلامي وأدلته: دكتور وهبة الزحيلي، دار الفكر، دمشق، الطبعة الثالثة ۱۴۰۹ھ.

ترغیب وترہیب، فضائل أعمال

۵۲۵۔ الآداب الشرعية والمنح المرعية: شمس الدين أبو عبد الله محمد بن مفلح المقدسي الحنبلي، متوفیٰ ۷۶۳ھ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولیٰ ۱۴۱۷ھ.

۵۲۶۔ إغاثة اللهفان من مكائد الشيطان: شمس الدين محمد بن أبي بكر ابن قيم الجوزية متوفیٰ ۷۵۱ھ، المكتبة التجارية، مكة المكرمة، الطبعة الأولیٰ ۱۴۱۶ھ.

۵۲۷۔ تبلیغی نصاب: مولانا محمد زکریا سہارنپوری متوفیٰ ۱۴۰۲ھ، اداره اشاعتِ دینیات انارکلی، لاهور.

۵۲۸۔ التبصرة: جمال الدين أبو الفرج عبد الرحمان بن الجوزي، متوفیٰ ۵۹۷ھ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولیٰ ۱۴۰۶ھ.

۵۲۹۔ التبيان في آداب حملة القرآن: أبو زكريا محي الدين يحي بن شرف النووي، متوفیٰ

٦٧٦هـ، دار الكتاب العربي، بيروت، الطبعة الثانية ١٤١٧هـ.

٥٣٠ـ الترغيب والترهيب: حافظ زكي الدين عبدالعظيم بن عبدالقوي المنذري، متوفیٰ ٦٥٦هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٤١٧هـ.

٥٣١ـ جامع بيان العلم وفضله: إمام أبو عمرو يوسف بن عبد الله بن محمد بن عبد البر القرطبي، متوفیٰ ٤٦٣هـ، دار ابن الجوزي، الدمام، الطبعة الرابعة ١٤١٩هـ.

٥٣٢ـ حادي الأرواح إلى بلاد الأفراح: شمس الدين محمد بن أبي بكر ابن قيم الجوزية متوفیٰ ٧٥١هـ، مكتبة نزار مصطفیٰ الباز، مكة المكرمة، الطبعة الأولیٰ ١٤١٨هـ.

٥٣٣ـ حجة الله البالغة: شاه ولي الله بن عبد الرحيم الدهلوي، متوفیٰ ١١٧٦هـ، دار إحياء العلوم بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٤١٠هـ.

٥٣٤ـ الرحلة في طلب الحديث: أبو بكر أحمد بن علي بن ثابت الخطيب البغدادي، متوفیٰ ٤٦٣هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٣٩٥هـ.

٥٣٥ـ روضة المحبين ونزهة المشتاقين: محمد بن أبي بكر ابن قيم الجوزية، متوفیٰ ٧٥١هـ، مكتبة نزار مصطفى الباز، مكة المكرمة، الطبعة الأولى ١٤١٧هـ.

٥٣٦ـ سفر السعادة: مجد الدين محمد بن يعقوب الفيروز آبادي الشيرازي، متوفیٰ ٨٢٦هـ، دار القلم، بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٤٠٦هـ.

٥٣٧ـ شرح سفر السعادة: شيخ عبد الحق محدث دهلوي، متوفیٰ ١٠٥٢هـ، مكتبة نوريه رضويه، سكهر، سنة الطبع ١٣٩٨هـ.

٥٣٨ـ شرح الصدور بشرح حال الموتى والقبور: جلال الدين عبد الرحمن السيوطي، متوفیٰ ٩١١هـ، دار المعرفة، بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٤١٧هـ.

٥٣٩ـ العلم الهيب من الكلم الطيب: محمود بن أحمد بدر الدين العيني، متوفیٰ ٨٥٥هـ، مكتبة الرشد، الرياض، الطبعة الأولیٰ ١٤١٩هـ.

٥٤٠ـ علموا أولادكم محبة آل بيت النبي ﷺ: دكتور محمد عبده يماني، مؤسسة علوم القرآن، بيروت، الطبعة الرابعة ١٤٢٤هـ.

٥٤١ـ فضائل صدقات: مولانا محمد زكريا سهارنپوري، متوفىٰ ١٤٠٢هـ، تاج كمپني، كراچی.

٥٤٢ـ فضائل القرآن: إمام أبو عبيد القاسم بن سلّام، متوفىٰ ٢٢٤هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١١هـ.

٥٤٣ـ كتاب الذريعة إلىٰ مكارم الشريعة: أبو القاسم الحسين بن محمد المعروف بالراغب الأصفهاني، متوفىٰ ٥٠٢هـ، دار السلام، القاهرة، الطبعة الثالثة ١٤٣١هـ.

٥٤٤ـ لطائف المعارف فيما لمواسم العام من الوظائف: زين الدين أبو الفرج عبد الرحمان بن أحمد بن رجب الحنبلي، متوفىٰ ٧٩٥هـ، دار ابن كثير، دمشق، الطبعة الرابعة ١٤١٩هـ.

٥٤٥ـ لواقح الأنوار القدسية في بيان العهود المحمدية: عبد الوهاب الشعراني، متوفىٰ ٩٧٣هـ، دار إحياء التراث العربي، بيروت، سنة الطبع ١٤١٨هـ.

٥٤٦ـ المواعظ والاعتبار بذكر الخطط والآثار: تقيّ الدين أبي العباس أحمد بن علي المقريزي، متوفىٰ ٨٤٥هـ، الطبعة بدون تاريخ، مكتبة الدينية، القاهرة.

٥٤٧ـ الوابل الصيب من الكلم الطيب: محمد بن أبي بكر ابن قيم الجوزية، متوفىٰ ٧٥١هـ، المكتب الإسلامي، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٨هـ.

كتب أخلاق و تصوف

٥٤٨ـ إتحاف السادة المتقين بشرح إحياء علوم الدين: سيد محمد بن محمد الحسيني الزبيدي، متوفىٰ ١٢٠٥هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٠٩هـ.

٥٤٩ـ إحياء علوم الدين: إمام محمد بن محمد الغزالي، متوفىٰ ٥٠٥هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٩هـ.

٥٥٠ـ البرهان الجلي في تحقيق انتساب الصوفية إلىٰ سيدنا علي: أحمد بن محمد بن الصديق الغماري، مكتبة القاهرة.

٥٥١ـ التعرف لمذهب أهل التصوف: أبو بكر محمد بن إسحاق الكلاباذي، متوفىٰ ٣٨٠هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٢هـ.

٥٥٢ـ حالة أهل الحقيقة مع الله: أبو العَلَمَيْن سيد أحمد بن علي الرفاعي، متوفىٰ ٥٧٨هـ، دار

صادر، بيروت، الطبعة الثانية ١٤٣٠هـ.

٥٥٣ـ **حقائق عن التصوف:** فضيلة الشيخ العارف بالله عبدالقادر عيسى، متوفى ١٤١٢هـ، دار العرفان، سورية حلب، الطبعة الثانية عشر ١٤٢٥هـ.

٥٥٤ـ **حلية الأولياء وطبقات الأصفياء:** أبونُعَيم الأصبهاني، متوفى ٤٣٠هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٨هـ، وط: مكتبة الخانجي، القاهرة، ١٤١٦هـ.

٥٥٥ـ **رسالة البيان والتبيان في أن الصوفية مذهبها السنة والقرآن:** سيدي المختار بن أحمد فال العلوي التجاني الشنقيطي، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٣هـ.

٥٥٦ـ **رسائل الجنيد:** الدكتور جمال رجب سيدبي، دار إقرا، دمشق، الطبعة الأولى ١٤٢٥هـ.

٥٥٧ـ **الرسالة اللدنية: من مجموعة الرسائل الغزالي:** إمام محمد بن محمد الغزالي، متوفى ٥٠٥هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٤هـ.

٥٥٨ـ **الرّسالة القشيرية:** أبوالقاسم عبد الكريم بن هوازن القشيري، متوفي ٤٦٥، دار إحياء التراث العربي، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٩هـ.

٥٥٩ـ **روض الرياحين في حكايات الصالحين:** عفيف الدين أبوالسعادات عبدالله بن أسعد بن علي اليافعي اليمني، متوفى ٧٦٨هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢١هـ.

٥٦٠ـ **سراج الطالبين:** الشيخ إحسان محمد دحلا الجمفسي، الكديري، مكتبة الحرمين، جدة.

٥٦١ـ **شرح حكم الإمام ابن عطاء الله السكندري:** عبدالمجيد الشرنوبي، متوفى ١٣٤٨هـ، دار ابن كثير، دمشق، الطبعة السابعة ١٤٢٠هـ.

٥٦٢ـ **شرح الرسالة القشيرية:** شيخ الإسلام زكريا بن محمد الأنصاري، متوفى ٩٢٦هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٠هـ.

٥٦٣ـ **شمس القلوب:** أبوالقاسم عبدالرحمان بن يوسف اللجائي، متوفى ٥٩٩هـ، دار صادر، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٣هـ.

٥٦٤ـ **فوائد الفواد، ملفوظات حضرت خواجه نظام الدين أولياء:** متوفى ٧٢٥هـ، مرتب: أمير حسن علاء سنجري، محكمه اوقاف، پنجاب، طبع پنجم ١٤٢٢هـ.

٥٦٥ـ	الفتوحات المكية: أبو عبدالله محمدالمعروف بابن عربي متوفّیٰ٦٣٨هـ، دار الفكر، بيروت، ١٤١٤هـ، وط: دارالكتب العلمية، بيروت، الطبعة الثالثة ٢٠١١ء.
٥٦٦ـ	قطب العارفين في العقائد والتصوف: أبوالقاسم عبدالرحمان بن يوسف اللجائي، متوفّیٰ٥٩٩هـ، دارصادر، بيروت، الطبعة الثانية ١٤٣٠هـ.
٥٦٧ـ	القول المستحسن في فخر الحسن: مولاناأحسن الزمان حيدرآبادي، متوفّیٰ، مطبوعة بحيدرآباد الدكن، الهند، سنة الطبع ١٣١٢هـ.
٥٦٨ـ	كشف المحجوب (فارسی): علي بن عثمان الهجويري، متوفّیٰ٤٦٥هـ، نوائے وقت پرنٹرز، لاهور، سنة الطبع ١٣٨٧هـ، وط: نسخهٔ سمر قند، سنگ ميل پبلكيشنز، لاهور.
٥٦٩ـ	الكواكب الدرية في تراجم السادة الصوفية: زين الدين محمدعبدالرؤوف المناوي، متوفّیٰ١٠٢١هـ، دارصادر، بيروت، الطبعة الأولیٰ١٩٩٩ء.
٥٧٠ـ	اللمع في تاريخ التصوف الإسلامي: أبونصرعبدالله بن علی السراج الطوسي متوفّیٰ٣٧٨هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولیٰ ١٤٢١هـ.
٥٧١ـ	مثنوي مترجم اردو: قاضي سجادحسين، الفيصل، ناشران وتاجران كتب، لاهور.
٥٧٢ـ	مدارج السالكين: محمدبن أبي بكرابن قيم الجوزية، متوفّیٰ٧٥١هـ، دارالكتاب العربي، بيروت، الطبعة الرابعة ١٤١٧هـ، وط: دارالكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولیٰ بدون تاريخ .
٥٧٣ـ	مقابيس المجالس (اشاراتِ فريدي) ملفوظات خواجه غلام فريد: متوفّیٰ ١٣١٩هـ، جمع وترتيب: مولانا ركن الدينؒ، تحقيق وترجمه: كپتان واحدبخش سيالوي، الفيصل ناشران وتاجران، لاهور سنة الطبع ٢٠٠٥ء.
٥٧٤ـ	المنقذ من الضلال: من مجموعة الرسائل الغزالي: إمام محمد بن محمدالغزالي، متوفّیٰ ٥٠٥هـ، دارالكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولی ١٤١٤هـ.
٥٧٥ـ	المنن الكبرىٰ: إمام عبد الوهاب الشعراني، متوفّیٰ٩٧٣هـ، دارالكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولی ١٤١٨هـ.

فضائل ومناقب

٥٧٦ـ الإشراف على مناقب الأشراف: حافظ أبوبكر عبدالله بن محمدبن أبي الدنيا، متوفى ٢٨١هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٢هـ.

٥٧٧ـ الانتقاء في فضائل الأئمة الثلاثة الفقهاء: حافظ أبي عمر يوسف بن عبدالبر الأندلسي، متوفى ٤٦٢هـ، مكتب المطبوعات الإسلامية بحلب، الطبعة الأولى ١٤١٧هـ.

٥٧٨ـ الأنوار الباهرة بفضائل أهل البيت النبوي والذرية الطاهرة: أبوالفتوح عبد الله بن عبد القادر التليدي، مكتبة الإمام الشافعي، الرياض، الطبعة الأولى ١٤١٧هـ.

٥٧٩ـ إتحاف السائل بما لفاطمة من المناقب والفضائل: محمد عبدالروف بن علي بن زين العابدين المناوي، متوفى ١٠٣١هـ، مكتبة القرآن، القاهرة.

٥٨٠ـ إحياء الميت بفضائل أهل البيت: امام جلال الدين عبدالرحمان بن أبي بكر السيوطي متوفى ٩١١هـ، دار المدينة المنورة، الطبعة الأولى ١٤٢٠هـ.

٥٨١ـ أخبار أبي حنيفة وأصحابه: قاضي أبوعبدالله حسين بن علي الصيمري، متوفى ٤٣٦هـ، عالم الكتب، بيروت، الطبعة الثانية ١٤٠٥هـ.

٥٨٢ـ أخبار الأخيار: شيخ عبدالحق المحدث الدهلوي، متوفى ١٠٥٢، النورية الرضوية پبلشنگ كمپني، لاهور، سنة الطبع ٢٠٠٩ء.

٥٨٣ـ إسعاف الراغبين في سيرة المصطفى وفضائل أهل بيته الطاهرين: شيخ محمد بن علي الصبان، مصطفى البابي الحلبي وأولاده، بمصر، الطبعة الأخيرة ١٣٦٧هـ.

٥٨٤ـ أسمى المطالب في سيرة أمير المومنين علي بن أبي طالب عليه السلام: دكتور علي محمد محمد الصلابي، دار ابن كثير، دمشق، الطبعة الأولى ١٤٢٥هـ.

٥٨٥ـ بهجة الأسرار ومعدن الأنوار: أبوالحسن علي بن يوسف بن جرير اللخمي الشطنوفي متوفى ٧١٣هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٣هـ.

٥٨٦ـ تذكرة الخواص: يوسف بن قزاوغلي بن عبدالله، المعروف بسبط ابن الجوزي، متوفى ٦٥٤هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٦هـ.

٥٨٧-	تكريم المؤمنين بتقويم مناقب الخلفاء الراشدين: نواب سيدمحمدصديق حسن قنوجي،متوفى١٣٠٧ھ،قادري كتب خانه، سيالكوٹ.
٥٨٨-	توالي التأسيس لمعالي محمدبن إدريس: حافظ أحمدبن علي بن حجر العسقلاني، متوفى٨٥٢ھ،دار الكتب العلمية، بيروت،الطبعة الأولى١٤٠٦ھ.
٥٨٩-	تهذيب: خصائص الإمام علي: أبوعبدالرحمان أحمدبن شعيب النسائي،متوفى٣٠٣ھ أبوإسحاق الحويني الأثري،دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى١٤٠٥ھ.
٥٩٠-	الثغور الباسمة في مناقب فاطمة: امام جلال الدين عبدالرحمان بن أبي بكر السيوطي، متوفى٩١١ھ،دار الصحابة،طنطا،الطبعة الأولى١٤١١ھ.
٥٩١-	جامع كرامات أولياء: إمام يوسف بن إسماعيل النبهاني،متوفى١٣٥٠ھ،دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولى١٤١٧ھ.
٥٩٢-	جمال الأولياء: مولانا أشرف علي تهانوي،متوفى١٣٦٤ھ،مكتبة إسلامية،لاهور.
٥٩٣-	جواهر العقدين في فضل الشرفين: نورالدين علي بن عبدالله السمهودي،متوفى ٩١١ھ،دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولى١٤١٥ھ.
٥٩٤-	حدائق بخشش: إمام أحمدرضاحنفي،متوفى١٣٤٠ھ ،پروگريسو بكس،لاهور.
٥٩٥-	حكاياتِ صحابة(مع تبليغي نصاب) : مولانامحمدزكرياالكاندهلوي،سهارنپوري متوفى ١٤٠٢ھ،تاج كمپني،پاكستان.
٥٩٦-	حياة الحسن البصري: دكتورقروضة الجمال الحصري(معاصرة)دار الكلم الطيب، بيروت، الطبعة الأولى١٤٢٢ھ.
٥٩٧-	خامس الخلفاء الراشدين أمير المؤمنين الحسن بن علی بن أبي طالب ﷺ: الدكتور علي محمد الصلاّبي،دارابن كثير،دمشق،الطبعة الأولى١٤٢٥ھ.
٥٩٨-	خصائص أمير المؤمنين علي بن أبي طالب ﷺ: أبوعبدالرحمان أحمدبن شعيب النسائي،متوفى٣٠٣ھ،دار الكتاب العربي،بيروت،الطبعة الثانية ١٤١٧ھ،وط:مكتبة ودي الحور الشارقة،الطبعة الثانية١٤٢١ھ.

۵۹۹ـ	**خلاصة المفاخر في مناقب شيخ عبد القادر**: امام محمد عبدالله اليافعي اليمني، متوفى ۷۶۸ھ،تصوف فاؤنڈیشن،لاھور.
۶۰۰ـ	**الخيرات الحسان في مناقب الإمام الأعظم أبي حنيفة النعمان**: شهاب الدين أحمد بن حجر الهيتمي المكي،متوفىٰ ۹۷۴ھ،دار أرقم بيروت.
۶۰۱ـ	**درر من آل بيت خير المرسلين محمد ﷺ**: علي سعد علي حجازي،دار الكتب العلمية، بيروت،الطبعة الأولىٰ سنة الطبع ۲۰۰۹ء.
۶۰۲ـ	**در السحابة في مناقب القرابة والصحابة**: قاضي محمد بن علي الشوكاني،متوفىٰ ۱۲۵۰،دار الفكر،دمشق،الطبعة الأولىٰ ۱۴۰۴ھ.
۶۰۳ـ	**دستور معالم الحكم ومأثور مكارم الشيم**: إمام القاضي أبي عبدالله محمد بن سلامة القضاعي،متوفىٰ ۴۵۴ھ،شركة دار أرقم بن أبي الأرقم بيروت،الطبعة الأولىٰ ۱۴۱۸ھ.
۶۰۴ـ	**ذخائر العقبىٰ في مناقب ذوى القربىٰ**: محب الدين أحمد بن عبدالله الطبري، متوفىٰ ۶۹۴ھ،دار الكتب العلمية بيروت،الطبعة الأولىٰ ۱۴۲۷ھ.
۶۰۵ـ	**الذرية الطاهرة النبوية**: حافظ أبو بشر محمد بن أحمد الدولابي،متوفىٰ ۳۱۰ھ، الدار السلفية،الكويت،الطبعة الأولى ۱۴۰۷ھ.
۶۰۶ـ	**رشفة الصادي من بحر فضائل بنى النبي الهادي ﷺ**: سيد أبوبكر شهاب الدين العلوي الحضرمي،دار الكتب العلمية،بيروت،الطبعة الأولى ۱۴۱۸ھ.
۶۰۷ـ	**الرياض النضرة في مناقب العشرة**: محب الدين الطبري،متوفىٰ ۶۹۴ھ، دار الغرب الإسلامي،بيروت،الطبعة الأولىٰ ۱۹۹۶ء وط:دار المعرفة، بيروت، الطبعة الأولىٰ ۱۴۱۸ھ.
۶۰۸ـ	**السمط الثمين في مناقب أمهات المؤمنين**: محب الدين أحمد بن عبدالله الطبري، متوفىٰ ۶۹۴ھ،دار الحديث،القاهرة. سنة الطبع ۱۹۸۹ء.
۶۰۹ـ	**الشرف المؤبد لآل محمد**: علامة يوسف بن إسماعيل النبهاني،متوفىٰ ۱۳۵۰ھ.
۶۱۰ـ	**صفة الصفوة**: أبو الفرج عبدالرحمان ابن الجوزي، متوفىٰ ۵۹۷ھ،دار الكتب العلمية، بيروت،الطبعة الأولىٰ ۱۴۰۹ھ.

٦١١ـ	عصر الصحابة: عبدالمنعم الهاشمي، دار ابن كثير بيروت، الطبعة الرابعة ١٤٢٤هـ.
٦١٢ـ	فضائل أبي حنيفة وأخباره ومناقبه: عبدالله بن محمد، المعروف بابن أبي العوام، متوفى ٣٣٥هـ، المكتبة الإمدادية، مكة المكرمة، الطبعة الأولى ١٤٣١هـ.
٦١٣ـ	فضائل أمير المؤمنين علي بن أبي طالب، من خلال لحديثي العترة وباب المدينة: سامي أنور جاهين (معاصر) دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٧هـ.
٦١٤ـ	فضائل الصحابة: أبوعبدالله أحمد بن محمد بن حنبل، متوفى ٢٤١هـ، دار ابن الجوزي، الدمام، الطبعة الثالثة ١٤٢٦هـ، وط: دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٩هـ.
٦١٥ـ	فضائل الصحابة: إمام أبوعبدالرحمن أحمد بن شعيب النسائي، متوفى ٣٠٣هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٠٥هـ.
٦١٦ـ	فضائل فاطمة الزهراء: الإمام الحافظ أبي عبدالله الحاكم النيسابوري، متوفى ٤٠٥هـ، دار الفرقان، القاهرة، الطبعة الأولى ١٤٢٩هـ.
٦١٧ـ	فضل آل البيت: تقي الدين أحمد بن علي المقريزي، متوفى ٨٤٥هـ، دار الاعتصام، القاهرة.
٦١٨ـ	الفتح المبين في فضائل الخلفاء الراشدين وأهل البيت الطاهرين: سيد أحمد بن زيني دحلان المكي، متوفى ١٣٠٤هـ، دار الفكر، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٣هـ.
٦١٩ـ	قضاء علي بن أبي طالب رضي الله عنه: لعبدالمنعم، مكتبة الرشد، السعودية، الطبعة الأولى ١٤٢٧هـ.
٦٢٠ـ	قلائد الجواهر في مناقب عبدالقادر: محمد بن يحي التاذفي الحلبي، متوفى ٩٦٣هـ، مصطفى البابي الحلبي، مصر، الطبعة الثالثة ١٣٧٥هـ.
٦٢١ـ	كتاب الأربعين في فضائل آل البيت الطاهرين: عبدالله بن صالح بن محمد العبيد، دار البشائر الإسلامية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٣١هـ.
٦٢٢ـ	كتاب تحقيق منيف الرتبة لمن ثبت له شرف الصحبة: علامة خليل بن كيكلدي العلائي، متوفى ٧٦١هـ، دار العاصمة، الرياض، النشرة الأولى ١٤١٠هـ.
٦٢٣ـ	كراماتِ صحابه: مولانا أشرف علي تهانوي متوفى ١٣٦٤هـ، دار الإشاعت، كراچي.
٦٢٤ـ	لواقح الأنوار وطبقات الأخيار (الطبقات الكبرى): عبد الوهاب الشعراني، متوفى

٩٧٣هـ،دار الكتب العلمية، بيروت،الطبعة الأولى ١٤١٨هـ.

٦٢٥ـ **مثيلِ عيسىٰ علي مرتضىٰ**: ڈاکٹر اسرار أحمد،متوفیٰ،مکتبۂ مرکزي انجمن خدام القرآن ،لاهور،سن اشاعت ١٩٩٥ء.

٦٢٦ـ **مرتضىٰ مشكل كشا مولىٰ علي**: صاحبزاده محمد محب الله نوري،معاصر،فقيه اعظم پبلی کیشنز،بصیرپورشریف،اشاعت چهارم ٢٠٠٥ء.

٦٢٧ـ **مطالب السؤل في مناقب آل الرسول**: أبوسالم كمال الدين محمد بن طلحة بن محمد بن الحسن القرشي العدوي الشافعي، متوفّىٰ ٦٥٢هـ،دار الكتب التجارية،النجف الأشرف،وط:مطبع أنوار محمدي،لكهنو،الطبعة الأولىٰ.

٦٢٨ـ **معرفة القراء الكبار على الطبقات والأعصار**: شمس الدين أبو عبدالله محمد بن أحمد بن عثمان الذهبي،متوفّىٰ ٧٤٨هـ،مؤسسة الرسالة،بيروت،الطبعة الثانية ١٤٠٨هـ.

٦٢٩ـ **معالي الرتب لمن جمع بين شرفي الصحبة والنسب**: مساعد سالم العبد الجادر، متوفّىٰ ١٤٢٤هـ،دار البشائر الاسلامية،بيروت،الطبعة الأولى ١٤٢٥هـ.

٦٣٠ـ **مناقب الأئمة الأربعة**: قاضي أبو بكر محمد بن الطيب الباقلاني،متوفّىٰ ٤٠٣هـ، دار المنتخب العربي،بيروت،الطبعة الأولىٰ ١٤٢٢هـ.

٦٣١ـ **مناقب الإمام أبي حنيفة**: للموفق الخوارزمی متوفّىٰ ٥٦٨هـ،دائرة المعارف النظامية، حيدر آباد دكن سنة الطبع ١٣٣٢هـ.

٦٣٢ـ **مناقب الإمام أبي حنيفة وصاحبيه**: شمس الدين أبو عبدالله محمد بن أحمد بن عثمان الذهبي،متوفّىٰ ٧٤٨هـ،ناشر:لجنة إحياء المعارف النعمانية،حيدر آباد الدكن بالهند، الطبعة الرابعة ١٤١٩هـ.

٦٣٣ـ **مناقب إمام أحمد بن حنبل**: إمام عبد الرحمٰن ابن الجوزي،متوفّىٰ ٥٩٧هـ،مكتبه الخانجي، مصر،الطبعة الأولى ١٣٩٩هـ.

٦٣٤ـ **مناقب الإمام الشافعي**: حافظ أبو الفداء إسماعيل بن كثير الشافعي،متوفّىٰ ٧٧٤هـ، مكتبة الإمام الشافعي،الرياض،الطبعة الأولى ١٤١٢هـ.

٦٣٥-	مناقب أمير المؤمنين علي بن أبي طالب: حافظ أبو الحسن علي بن محمد الواسطي المعروف بابن المغازلي، متوفى ٤٨٣هـ، دار الآثار، يمن، الطبعة الأولى ١٤٢٤هـ.
٦٣٦-	مناقب علي والحسنين وأمهما فاطمة الزهراء ﷺ: الشيخ محمد فواد عبد الباقي، دار الحديث، القاهرة، سنة الطبع ١٤٢٣هـ.
٦٣٧-	المرتضى سيرة أمير المؤمنين علي بن أبي طالب ﷺ: علامة أبو الحسن علي الندوي، متوفى ١٤٢٠هـ، دار القلم، دمشق، الطبعة الثانية ١٤١٩هـ.
٦٣٨-	المرتضى، اردو: علامة أبو الحسن علي الندوي، متوفى ١٤٢٠هـ، مجلس تشرياتِ اسلام ناظم آباد كراچي، ١٤١٢هـ.
٦٣٩-	المناقب: الموفق أحمد بن محمد المكي الخوارزمي، متوفى ٥٦٨هـ، مؤسسة النشر الإسلامي، قم إيران.
٦٤٠-	موسوعة آل بيت النبي الأطهار: صلاح الدين محمود السعيد، دار الغد الجديد القاهرة، الطبعة الأولى ١٤٣٢هـ.
٦٤١-	موسوعة آل بيت النبي ﷺ: دكتور مجدي محمد سرور باسلوم، والأستاذة السيدة سميرة جميل مسكي، معاصران، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ٢٠١١ء.
٦٤٢-	موسوعة العشرة المبشرون بالجنة: الشيخ أحمد عزو عناية، علي محمد مصطفى، دار نظير عبود، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٩هـ.
٦٤٣-	نساء أهل البيت في ضوء القرآن والحديث: أحمد خليل جمعة، معاصر، دار اليمامة دمشق، الطبعة الخامسة ١٤٢٣هـ.
٦٤٤-	نور الأبصار في مناقب آل بيت النبي المختار ﷺ: الشيخ مومن بن حسن الشبلنجي، متوفى بعد ١٢٩٠هـ، شركة مطبعة مصطفى البابي الحلبي، مصر الطبعة الأخيرة ١٣٢٧ هـ.

لُغَتْ

٦٤٥-	البلغة في أصول اللّغة: السيد محمد صديق حسن خان القنوجي، متوفى ١٣٠٧هـ، دار البشائر الإسلامية بيروت، الطبعة الأولى ١٤٠٨هـ.

٦٤٦ـ **تاج العروس من جواهر القاموس**: سيد محمد مرتضىٰ الحسيني الزبيدي، متوفّىٰ ١٢٠٥هـ، دار الفكر، بيروت ١٤١٤هـ.

٦٤٧ـ **تاج اللغة وصحاح العربية (الصحاح)**: أبو نصر إسماعيل بن حماد الجوهري، متوفّىٰ ٤٤٠هـ، دار الفكر، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٨هـ.

٦٤٨ـ **تهذيب الأسماء واللغات**: يحيىٰ بن شرف النووي، متوفّىٰ ٦٧٦هـ، دار الفكر، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٦هـ.

٦٤٩ـ **الغريبين في القرآن والحديث**: أبو عبيد أحمد بن محمد الهروي، متوفّىٰ ٤٠١هـ، مكتبة نزار مصطفى الباز، مكة المكرمة، الطبعة الأولىٰ ١٤١٩هـ.

٦٥٠ـ **الفائق في غريب الحديث**: محمود بن عمر الزمخشري، متوفّىٰ ٥٨٣هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٧هـ.

٦٥١ـ **القاموس المحيط**: إمام مجد الدين محمد بن يعقوب الفيروز آبادي، متوفّىٰ ٨١٧هـ، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الثالثة ١٤١٣هـ.

٦٥٢ـ **كتاب التعريفات**: علامة مير سيد شريف علي بن محمد الجرجاني، متوفّىٰ ٨٢٦هـ، دار الفكر، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٨هـ.

٦٥٣ـ **كتاب الدلائل في غريب الحديث**: أبو محمد القاسم بن ثابت السرقسطي، متوفّىٰ ٣٠٢هـ، مكتبة الرشد، الرياض، الطبعة الثانية ١٤٢٢هـ.

٦٥٤ـ **كتاب العين**: أبو عبد الرحمان الخليل بن أحمد الفراهيدي، متوفّىٰ ١٧٥هـ، دار إحياء التراث العربي، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٢١هـ.

٦٥٥ـ **لسان العرب**: إمام محمد بن مكرم المعروف بابن منظور الأفريقي، متوفّىٰ ٧١١هـ، دار إحياء التراث العربي بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٦هـ.

٦٥٦ـ **لغات الحديث**: علامة وحيد الزمان، متوفّىٰ ١٣٢٨هـ، نعماني كتب خانه، لاهور، تاريخ اشاعت ٢٠٠٥ء.

٦٥٧ـ **مجمع بحار الأنوار**: محمد طاهر فتني متوفّىٰ ٩٨٦هـ، مكتبة دار الإيمان المدنية المنورة،

الطبعة الثالثة ١٤١٥هـ.

٦٥٨- مشارق الأنوار على صحاح الآثار: قاضي أبو الفضل عياض بن موسى اليحصبي المالكي متوفى ٥٤٤هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٣هـ.

٦٥٩- مصباح اللغات: عبدالحفيظ بلياوي، مدينة پبلشنگ كمپني، كراچي، الطبعة الأولى ١٩٨٢ء.

٦٦٠- المصباح المنير: أحمد بن محمد علي المقري الفيومي، متوفى ٧٧٠هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٤هـ.

٦٦١- معجم المقاييس في اللغة: أبو الحسين أحمد بن فارس بن زكريا، متوفى ٣٩٥هـ، دار الفكر، بيروت، الطبعة الثانية ١٤١٨هـ.

٦٦٢- المفردات في غريب القرآن: إمام حسين بن محمد راغب الأصفهاني، متوفى ٥٠٢هـ، مكتبة نزار مصطفى الباز، مكة المكرمة، الطبعة الأولى ١٤١٨هـ.

٦٦٣- المنجد عربي اردو: خزينة علم وادب، اردو بازار، لاهور.

٦٦٤- المنجد: لويس معلوف اليسوعي، متوفى ١٩٤٦ء، المطبعة الكاثوليكية، لبنان، الطبعة الثانية عشرة ١٣٩٤هـ.

٦٦٥- النهاية في غريب الحديث: علامة محمود بن أثير الجزري، متوفى ٦٠٦هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٨هـ.

سِيَرُو تاريخ

٦٦٦- الإمام زيد: محمد أبو زهرة، متوفى، دار الفكر العربي، مصر.

٦٦٧- إتمام الوفاء في سيرة الخلفاء: الشيخ محمد بن عفيفي الباجوري، متوفى ١٣٤٥هـ، دار ابن حزم، الطبعة الأولى ١٤٢٣هـ.

٦٦٨- إزالة الخفاء عن خلافة الخلفاء: شاه ولي الله محدث دهلوي، متوفى ١١٧٦هـ، قديمي كتب خانه، آرام باغ كراچي.

٦٦٩- البداية والنهاية: حافظ عماد الدين إسماعيل بن كثير الدمشقي الشافعي، متوفى ٧٧٤هـ، دار ابن كثير دمشق، الطبعة الأولى ١٤٢٨هـ، وط: دار الفكر، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٦هـ

وط: دار هجر، القاهرة، الطبعة الأولىٰ ١٤١٧هـ.

٦٧٠ـ بُلوغ الأرب في معرفة أحوال العرب: السيد محمود شكري الألوسي البغدادي، المكتبة العصرية بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٣٠هـ.

٦٧١ـ تاريخ الإسلام ووفيات المشاهير والأعلام: أبو عبدالله شمس الدين محمد بن أحمد بن عثمان الذهبي، متوفىٰ ٧٤٨هـ، دار الكتاب العربي، بيروت، الطبعة الثانية ١٤١٠هـ.

٦٧٢ـ تاريخ أصبهان: أبو نعيم أحمد بن عبدالله بن مهران الأصبهاني، متوفىٰ ٤٣٠هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٠هـ.

٦٧٣ـ تاريخ بغداد: أبو بكر أحمد بن علي بن ثابت الخطيب البغدادي، متوفىٰ ٤٦٣هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الثالثة ٢٠١١م.

٦٧٤ـ تاريخ الخلفاء: الإمام الحافظ جلال الدين عبدالرحمان بن أبي بكر السيوطي، متوفىٰ ٩١١هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٩هـ.

٦٧٥ـ تاريخ الأمم والملوك: إمام أبو جعفر محمد بن جرير الطبري، متوفىٰ ٣١٠ دار الكتب العلمية بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٤هـ.

٦٧٦ـ تاريخ دعوت وعزيمت: سيد أبو الحسن علي الندوي، ١٤٢٠هـ، مجلس نشرياتِ إسلام كراچي.

٦٧٧ـ تاريخ عمر بن الخطاب ﷺ: أبو الفرج عبدالرحمان ابن الجوزي، متوفىٰ ٥٩٧هـ، دار المعرفة، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٥هـ.

٦٧٨ـ تاريخ مدينة: أبو زيد عمر بن شبة النميري المصري، متوفىٰ ٢٦٢هـ، دار التراث، بيروت، الطبعة الأولىٰ ١٤١٠هـ.

٦٧٩ـ تاريخ مدينة دمشق: إمام أبي القاسم علي بن الحسن ابن هبة الله بن عبدالله بن عساكر الشافعي، متوفىٰ ٥٧١هـ، دار الفكر، بيروت ١٤١٦هـ.

٦٨٠ـ تذكرة الحفاظ: شمس الدين محمد بن أحمد بن عثمان الذهبي، متوفىٰ ٧٤٨هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الثانية ١٤٢٩هـ.

٦٨١ـ تلقيح فهوم أهل الأثر في عيون التاريخ والسير: أبوالفرج عبدالرحمان ابن الجوزي متوفى ٥٩٧هـ، شركة دار أرقم بن أبي الأرقم، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٨هـ.

٦٨٢ـ جمهرة أنساب العرب: لأبي محمد علي بن أحمد بن سعيد بن حزم الأندلسي، متوفى ٤٥٦هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٤هـ.

٦٨٣ـ حياة الصحابة: محمد يوسف الكاندهلوي، متوفى ١٩٦٥ء، دار احياء التراث العربي، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٠٦هـ.

٦٨٤ـ رأس الحسين: لابن تيمية متوفى ٧٢٨هـ، مع استشهاد الحسين للإمام ابن جرير الطبري، دار الكتاب العربي، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٠٦هـ.

٦٨٥ـ سير أعلام النبلاء: شمس الدين محمد بن أحمد بن عثمان الذهبي، متوفى ٧٤٨هـ، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الحادية العشرة ١٤٢٢هـ.

٦٨٦ـ شذرات الذهب في أخبار من ذهب: أحمد بن محمد العكري الحنبلي، متوفى ١٠٨٩هـ، دار ابن كثير، دمشق، الطبعة الأولى ١٤٠٦هـ.

٦٨٧ـ طبقات الحنابلة: قاضي أبو الحسين محمد بن أبي يعلى الفراء البغدادي الحنبلي، متوفى ٥٢٦هـ، مكتبة العبيكان، الرياض، الطبعة الأولى ١٤٢٥هـ.

٦٨٨ـ طبقات الشافعية الكبرى: عبدالوهاب بن علي بن عبدالكافي السُّبكي، متوفى ٧٧١هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٠هـ، وط: مطبعة عيسى البابي الحلبي وشركاه، الطبعة الأولى ١٣٨٣هـ.

٦٨٩ـ طبقات المحدثين بأصبهان والواردين عليها: أبومحمد عبدالله بن محمد بن جعفر بن حيان الأنصاري، متوفى ٣٦٩هـ، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الثانية ١٤١٢هـ.

٦٩٠ـ الكامل في التاريخ: عز الدين أبوالحسن علي بن محمد الشهير بابن الأثير الجزري، متوفى ٦٣٠، بيت الافكار الدولية، الأردن.

٦٩١ـ كتاب المغازي: محمد بن عمر بن واقد، متوفى ٢٠٧هـ، عالم الكتب، بيروت، الطبعة الثالثة ١٤٠٤هـ.

٦٩٢ـ **كتاب السير**: إبراهيم بن محمد أبو إسحاق الفزاري، متوفّى ١٨٦هـ، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٠٨هـ.

٦٩٣ـ **مختصر تاريخ دمشق**: إمام محمد بن مكرم المعروف بابن منظور، متوفّى ٧١١هـ، دار الفكر، دمشق، الطبعة الأولى ١٤٠٩هـ.

٦٩٤ـ **مرآة الزمان في تواريخ الأعيان**: شمس الدين أبو المظفر يوسف، المعروف بسبط ابن الجوزي، متوفّى ٦٥٤هـ، الرسالة العالمية، دمشق، الطبعة الأولى ١٤٣٤هـ.

٦٩٥ـ **المعارف**: أبو محمد عبد الله بن مسلم بن قتيبة الدينوري، متوفّى ٢٧٦هـ، دار لكتب العلمية، بيروت، الطبعة الثانية ١٤٢٤هـ.

٦٩٦ـ **المعرفة والتاريخ**: أبو يوسف يعقوب بن سفيان الفسوي، متوفّى ٢٧٧هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٩هـ.

٦٩٧ـ **المنتظم في تاريخ الملوك والأمم**: أبو الفرج عبد الرحمان ابن الجوزي، متوفّى ٥٩٧هـ، دار الكتب العلمية، بيروت ١٤١٢هـ.

٦٩٨ـ **وفاء الوفاء بأخبار دار المصطفى ﷺ**: علي بن أحمد السمهودي، متوفّى ٩١١هـ، دار إحياء التراث العربي، بيروت، وط: مكتبة دار الزمان، المدينة النبوية الطبعة الأولى ١٤٢٩هـ.

٦٩٩ـ **وفيات الأعيان وانباء أبناء الزمان**: شمس الدين أحمد بن محمد بن أبي بكر بن خلكان متوفّى ٦٨١هـ، دار صادر، بيروت، سنة الطبع ١٤١٤هـ.

كتب متفرقة

٧٠٠ـ **أخبار الظراف والمتماجنين**: أبو الفرج عبد الرحمان بن علي الجوزي، متوفّى ٥٩٧هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٧هـ، وط: دار ابن حزم، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٨هـ.

٧٠١ـ **أدب الدنيا والدين**: إمام أبي الحسن علي بن محمد بن حبيب البصري الشافعي، متوفّى ٤٥٠هـ، دار ابن كثير، الطبعة الثالثة ١٤٢٣هـ.

٧٠٢ـ **أسنى المطالب في صلة الأقارب**: شهاب الدين أحمد بن محمد بن حجر الهيتمي،

متوفّىٰ ٩٧٤ھ،دار الكتب العلمية بيروت،الطبعة الأولى ١٤٢٤ھ.

٧٠٣ـ **بدائع الفوائد:** شمس الدين محمد بن أبي بكر ابن قيم الجوزية، متوفّىٰ ٧٥١ھ، مكتبة نزار مصطفى الباز،مكة المكرمة،الطبعة الأولى ١٤١٦، وط:دار عالم الفوائد، مكة المكرمة، الطبعة الأولىٰ ١٤٢٩ھ.

٧٠٤ـ **ديوان إمام شافعي** ﷺ :إمام محمد بن إدريس الشافعي،متوفىٰ ٢٠٤ھ،تحقيق محمد عبدالرحيم،دار الفكر،بيروت،الطبعة الأولىٰ ١٤١٥ھ .

٧٠٥ـ **ديوان إمام شافعي** ﷺ **مترجم اردو:** مولانا محمد عبدالله كاپودروي الهندي،مكتبة بيت العلم، كراچي،سنة الطبع ١٤٣٢ ھ.

٧٠٦ـ **ديوان الإمام علي بن أبي طالب:** علي بن أبي طالب بن عبد المطلب ﷺ:متوفّىٰ ٤٠ھ، الدكتور يوسف فرحات،دار الكتاب العربي،الطبعة السادسة ١٤٢٠ھ.

٧٠٧ـ **ديوان الإمام علي** ﷺ:علي بن أبي طالب بن عبد المطلب ﷺ:متوفّىٰ ٤٠ھ،جمع وتعليق:الدكتور أحمد بن أحمد ستيوي، دار الغد الجديد،مصر،الطبعة الأولىٰ ١٤٢٤ھ.

٧٠٨ـ **ديون المتنبي:** أبو الطيب أحمد بن الحسين الجعفي المتنبي، متوفىٰ ٣٥٤ھ، دار بيروت، بيروت،سنة الطبع ١٤٠٣ھ.

٧٠٩ـ **الطرق الحكمية في السياسة الشرعية:** محمد بن أبي بكر ابن قيم الجوزية،متوفىٰ ٧٥١ھ،المكتبة التجارية،مصطفى أحمد الباز،مكة المكرمة،الطبعة الأولى ١٤١٦ھ.

٧١٠ـ **ظفر اللاضي بما يجب في القضاء على القاضي:** محمد صديق حسن القنوجي البخاري،متوفىٰ ١٣٠٧ھ،دار ابن حزم بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٢ھ.

٧١١ـ **عقلاء المجانين:** أبو القاسم الحسن بن محمد بن حبيب النيسابوري،متوفّىٰ ٤٠٦ھ، دار الكتب العليمية،بيروت،الطبعة الأولىٰ ١٤٠٥ھ.

٧١٢ـ **الفوائد:** محمد بن أبي بكر ابن قيم الجوزية، متوفّىٰ ٧٥١ھ، مكتبة نزار مصطفى الباز، مكة المكرمة،الطبعة الأولى ١٤١٧ھ، وط:دار عالم الفوائد، مكة المكرمة،الطبعة الأولىٰ ١٤٢٩ھ.

٧١٣ـ	**كتاب الأذكياء**: أبوالفرج عبدالرحمان بن علي الجوزي، متوفى ٥٩٧ھ، مؤسسة الكتب الثقافية، الصنائع الطبعة الأولىٰ ١٤٠٨ھ.
٧١٤ـ	**كلياتِ اقبال (اُردو)**: علامة محمد إقبالؒ، متوفىٰ ١٩٣٨ء، مطبع شيخ غلام علي اينڈ سنز، لاهور.
٧١٥ـ	**كلياتِ اقبال (فارسی)**: علامة محمد إقبالؒ، متوفىٰ ١٩٣٨ء، مطبع شيخ غلام علي اينڈ سنز، لاهور.
٧١٦ـ	**ماذا خسر العالم بإنحاط المسلمين**: سيدأبوالحسن علي الندوي، متوفىٰ ١٤٢٠ھ، دارابن كثير، دمشق، الطبعة الرابعة ١٤٢٦ھ.
٧١٧ـ	**المجالسة وجواهر العلم**: أبوبكر أحمد بن مروان بن محمد الدينوري، متوفىٰ ٣٣٣ھ، دار ابن حزم، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٣ھ.
٧١٨ـ	**مهر منير**: علامة مولانا سيد پير مهر علي شاهؒ متوفىٰ ١٣٥٦ھ، مولانا محمد فيض أحمد فيضؒ، پاكستان انٹرنيشنل پرنٹرز لميٹڈ، لاهور ١٤٠٦ھ.

فہرستِ مضامین

شَرحُ خَصَائِصِ عَلِيٍّ ﷺ (مطبوع، الطبعة الخامسة)

چند خصوصیات:

- مکمل عربی متن مع سند
- سابقہ عربی طبعات کی غلطیوں کی اصلاح
- ہر حدیث کی مکمل تخریج وتشریح
- سند کے لحاظ سے علماء اصولِ حدیث سے ہر حدیث پر حکم
- ہر حدیث پر وارد ہونے والے تمام اعتراضات کا متین جواب
- مصنف (امام نسائی ﷫) کے قائم فرمودہ عنوانات کی روشنی میں خصوصیاتِ مرتضوی
- متن میں مذکور پنجتن پاک ﷺ کا تعارف اور ان کے اہم فضائل وخصائص
- جدید وقدیم تمام ناصبی اعتراضات کا انتہائی علمی اور مہذب رد
- علماء ومشائخ اہلِ سنت دامت برکاتہم کی گرانقدر تقریظات
- پانچ سو سے زائد مآخذ ومراجع (کتابیات) کی فہرست مع سنہ طباعت اور مطبع وغیرہ
- صفحات (1150) گیارہ سو پچاس
- مکمل بیروتی طرزِ طباعت وبائنڈنگ اور امپورٹڈ کاغذ۔



اذانِ مغرب واقامت کے مابین وقفہ (مطبوع)

مغرب کی اذان اور اقامت (تکبیر) کے درمیان مناسب وقفہ کے ثبوت میں پہلی کاوش۔

مناقب الزہراء (مطبوع)

شرح

إتحاف السائل بما لفاطمة من المناقب والفضائل

المعروف

مناقب الزہراء

تصنیف

امام زین الدین محمد بن عبد الرؤف المناوی
متوفی ۱۰۳۱ھ

ترجمہ، تخریج، تحقیق، تشریح
قاری ظہور احمد فیضی

مکتبہ باب العلم
جامعہ علی المرتضیٰ، لاہور

أسماء القرآن (مطبوع)

شرح

أنوار العرفان

في

أسماء القرآن

اسماء قرآن کی روشنی میں فضائل و علوم قرآن اور مقام

صاحب قرآن ﷺ پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب

تصنیف

قاری ظہور احمد فیضی

ریسرچ سکالر جامعہ اسلامیہ لاہور

مکتبہ باب العلم

جامعہ علی المرتضیٰ، لاہور

الأربعين (مطبوع)

كتاب

الأربعين

في فضائل آل البيت الطاهرين

تصنيف
عبد الله بن صالح بن محمد العبيد
استاذ كلية الشريعة و وكيل مركز دراسات الطالبات
بجامعة الإمام محمد بن سعود الإسلامية، الرياض

ترجمة، تخريج، تحقيق، تشريح
قاري ظهور احمد فيضي

مكتبة باب العلم
جامعة علي المرتضى، لاهور

لطافتِ جسدِ مصطفیٰ ﷺ (مطبوع)

لطافتِ جسدِ مصطفیٰ ﷺ

نبی کریم ﷺ کے جسمِ اقدس کی نفاست ولطافت
اور فضلات شریفہ کی طہارت وبرکت کے موضوع پر
اپنی مثال آپ کتاب۔

تصنیف:
قاری ظہور احمد فیضی

مکتبۃ باب العلم
جامعہ علی المرتضیٰ، لاہور

زیر طبع و زیر ترتیب تصانیف و شروح

الشمائل المحمدية

للإمام أبي عيسى محمد بن عيسى الترمذي

(۲۰۹ - ۲۷۹ھ)

ترجمة، تخريج، تحقيق، تشريح

قاری ظهور احمد فیضی

مكتبة باب العلم

جامعة علي المرتضى، لاهور